ماہنامہ

پیامِ تعلیم

جنوری ۱۹۸۳ء جلد ۲۰ شمارہ ۱

اڈیٹر: ولی شاہجہاں پوری

قیمت فی پرچہ ۱/۷۰
سالانہ ۱۶ روپے
غیر ممالک ۔۔ روپے

بچوں سے باتیں

پچھلا سال بہت سی تباہیوں کی تلخ یادیں چھوڑ کر رخصت ہو رہا ہے۔ یہ زخم جلد بھرنے والے نہیں ہیں۔ دعا ہے کہ نیا سال ان برائیوں سے پاک ہو۔ آمین۔

پیامِ تعلیم میں "بچوں کی کوششیں" کا مقصد یہ تھا کہ بچوں میں از خود لکھنے کا شوق پیدا ہو۔ اس مہینے آدھی ملاقات میں آپ کو کچھ شکایتی خط ملیں گے۔ انھیں پڑھ کر آپ کو افسوس ہوگا۔ ہمیں بھی ہوا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں زیادہ دکھ ہوا کہ اس کی ذمہ داری ہم پر ڈالی گئی ہے۔ ہمیں اس کو قبول کرنے سے انکار نہیں۔ لیکن اپنی صفائی میں اتنا کہنے کی ضرور اجازت چاہتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ عملاً ممکن نہیں ہے کہ تمام کتابیں اور رسالوں کو ذہن میں رکھیں۔ ہم تو بچے کی معصومیت پر اس وقت تک یقین کرتے ہیں جب تک وہ گنہ گار ثابت نہ ہو جائے۔ اب احتیاط کی جائے گی۔

بچوں کو چھوڑیے، شہرت کے بھوکے بڑوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان خطوں کے بعد ہم نے ایک صاحب کا مضمون اس لیے روک لیا کہ انھوں نے "توبۃ النصوح" جیسی مشہور کتاب سے نقل کر کے بھیجا تھا۔

بعض بچے ہندی سے ترجمہ کر کے بھیج دیتے ہیں۔ ترجمہ کرنا کوئی عیب نہیں ہے مگر یہ ضروری ہے کہ اس کا حوالہ دیا جائے۔ نقل کرنا تو بہت برا ہے۔ اس سے ہمیشہ بچیے۔ اپنے ارد گرد کے واقعات کو کہانی کے انداز میں لکھنے کی کوشش کیا کیجیے۔ شاعری سے ابھی پرہیز کیجیے۔ یہ شوق بعد میں پورا کر لیجیے گا۔

اس شمارے سے بیگم امۃ الرحمٰن محسن کے ایک دلچسپ ناول "دوشکاری" کی شروعات کی جا رہی ہے۔ دوسرے مضامین بھی یقین ہے کہ پسند آئیں گے۔ ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

اور آخری بات یہ کہ رسالہ کے خریدار بڑھانے میں ہمارا ہاتھ بٹانا نہ بھولیے گا۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

سطوت رسول

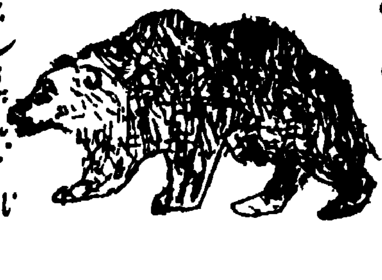
ایشیاڈ ۸۲

جواہر لال نہرو اسٹیڈیم کا اندرونی حصّہ

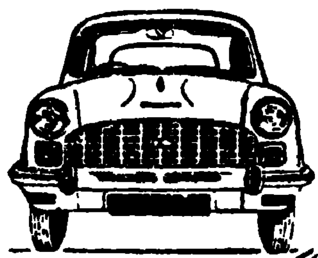
پہلا منظر:۔

منظر کتنا پیارا ہے
دیکھو سب سے نیارا ہے
ہاتھوں میں غبارے ہیں
آسمان پر تارے ہیں
دیکھو بچے رنگ بہ رنگ
پھولوں جیسے ان کے اَنگ
کوئی لگائے نکلا ہیٹ
کوئی بنا ہے اپٹوڈیٹ
کوئی بنا انگریز ہے
کوئی بچہ تیز ہے
رنگیں جتنی کاریں ہیں
پھولوں کی مہکاریں ہیں
دیکھو کیسا جادو ہے
بالوں والا بھالو ہے





آنکھوں میں جو کاجل ہے
پیروں میں جو پایل ہے
اُس میں کھنکتے گھنگرو ہیں
ٹھُم ٹھُم ٹھمک، موٹو ہیں
دیکھو دیکھو اپّو کو
اُس کے موٹے ابّو کو
اُس کی ممّی ہار لیے
ممتا جیسا پیار لیے
دیکھ رہی ہے دور بہت
خوشیوں سے مسرور بہت
منظر کتنا پیارا ہے
جنّت کا نظارا ہے
بینڈ بجانے والے ہیں
کچھ گورے کچھ کالے ہیں
بین بجاتے جاتے ہیں
ناچتے گاتے جاتے ہیں



جھنڈے اب لہرائیں گے
اُچھلیں کودیں گائیں گے
ایشیاڈ کے سارے کھیل!
ہیں وہ کتنے پیارے کھیل
گھلتے ملتے پیارے رنگ
سارے بچے کھیل کے سنگ!!

کورس:۔
ناچتے گاتے سارے بچے، مستقبل کے دھارے
روشن خواب ہمارے
جگمگ جگمگ ان سڑکوں پر، رقص کریں اُجیارے
روشن خواب ہمارے
اپنی آنکھیں جھپکاتے ہیں، سورج چاند ستارے
روشن خواب ہمارے
پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی ہیں، اُڑتے ہیں غبارے
روشن خواب ہمارے
آسمان پر بکھرے بکھرے، مٹک رہے ہیں تارے
روشن خواب ہمارے
روشن خواب ہمارے

جواہر لال نہرو اسٹیڈیم کا باہری حصہ

دوسرا منظر:۔
ننھے منے چلتے پاؤں
کتنے روپ بدلتے پاؤں
چلتے ہیں وہ اکڑے اکڑے
ممی کی ہیں انگلی پکڑے



ہاتھوں میں کچھ پھول لیے
ٹھوکر میں ہیں دھول لیے
آنٹی یہ گلدستہ لو
دیکھو؟ اپنا رستہ لو!
چُنّو مُنّو، ہا ہا ہا
سارے گاما، گا گا گا
دُھن قدموں کی ساتھ چلے
صبح چلے اور رات چلے
کاروں کی بارات چلے
گھیرا باندھے ہات چلے
رنگوں والی بس میں ہم
سارے رنگ و رس میں ہم

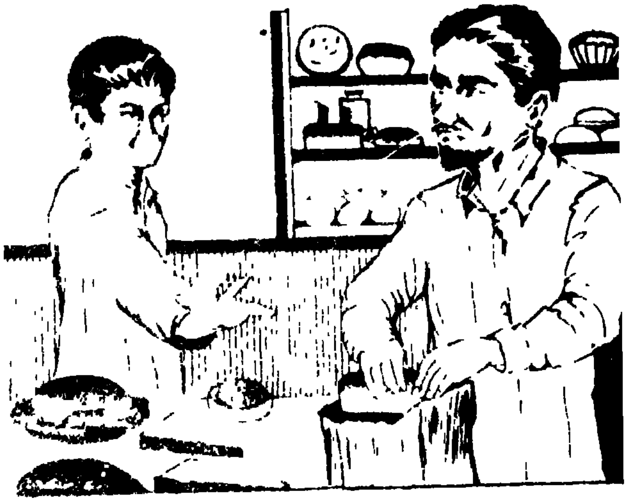
شام

تیسرا منظر:۔
نیزہ کھینچے، تیر لیے
پھولوں کی شمشیر لیے
آگے آگے چلتے رنگ
کتنے روپ بدلتے رنگ
روشنیوں میں ڈھلتی شام
جاگتی ہنستی چلتی شام
اُجلے اُجلے کومل ہات
پھولوں کی لے کر سوغات
اپنے گھر کو جاؤ تم
دودھ ملیدہ کھاؤ تم!!

مسعود احمد برکاتی

کاغذ کی تھیلی

سلمان ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ وہ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں پڑھا تھا کہ کوئی چیز ٹھنڈی کرنی ہو تو اسے منہ سے پھونک پھونک کر ٹھنڈا نہیں کرنا چاہیے۔



پھونکنے سے منہ کے جراثیم اس چیز میں پہنچ جاتے ہیں [illegible] ہیں۔ جب سے اس نے کتاب میں یہ بات پڑھی وہ خود بھی [illegible] کرنے لگا اور دوستوں اور بھائی بہنوں کو بھی [illegible] کھانا یا چائے ٹھنڈی کرنے سے روکنے لگا۔

ایک دن وہ ڈبل روٹی لینے بیکری گیا۔ بیکری والا جس کاغذ کی تھیلی میں ڈبل روٹی رکھ کر دینا چاہتا تھا وہ ہاتھ سے نہ کھلی تو اس نے منہ کے قریب تھیلی لا کر زور زور سے پھونکیں ماریں۔ تھیلی کا منہ کھل گیا۔ سلمان یہ دیکھ رہا تھا، جب بیکری والے نے ڈبل روٹی تھیلی میں رکھنی چاہی تو سلمان چیخ کر بولا "بس بس، ہاتھ روکو

معرفت ماہ نامہ نونہال کراچی

منہ سے پھونک کر تھیلی نہیں کھولتے، تمہارے منہ کے سارے کیڑے تھیلی میں چلے گئے، وہ گندی ہو گئی، دوسری تھیلی ہاتھ سے کھولو اور مجھے اس میں روٹی رکھ کر دو!"

سلمان نے اس سختی سے یہ بات کہی کہ بیکری والے کو غصہ آ گیا وہ کہنے لگا کہ "ہمارا منہ گندا تھوڑی ہے۔ نہ میرے پاس اتنا وقت ہے کہ تھیلی کو ہاتھ سے کھولوں" سلمان نے اپنی بات دہرائی تو بیکری والا بھی اپنی بات پر اڑ گیا اس نے کہا "لینا ہے تو لو ورنہ جاؤ، میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔" سلمان خالی ہاتھ گھر آ گیا۔ جب اس کے ابو کو قصہ معلوم ہوا تو انھوں نے سلمان سے کہا "بات تو تمھاری بالکل صحیح ہے۔



لیکن [illegible] کا انداز اور تمھارے الفاظ سخت تھے، اس لیے وہ [illegible] کا انداز ہوتا ہے۔ اچھی بات کو اچھے الفاظ اور [illegible] کہنا چاہیے، اسی کو اخلاق اور اسی کو تہذیب [illegible] جہالت عام ہے، ابھی تمام لوگ پڑھے لکھے نہیں [illegible] بہت سی باتیں نہیں معلوم، اسی لیے وہ بیمار رہتے ہیں اور ان کو اخلاق سے کام لینا نہیں آتا۔ بیکری والا بھی ان ہی لوگوں میں سے ہے، اگر تم اس کو میٹھی زبان میں منہ سے پھونکنے کے نقصانات بتاتے اور نرمی سے کہتے کہ تمہارا منہ گندا نہیں ہے لیکن جراثیم ہر ایک انسان کے جسم میں ہوتے ہیں، جو دوسروں کے لیے مضر ہوتے ہیں۔ اس لیے ذرا سی تکلیف اٹھا کر کاغذ کی تھیلی کا منہ ہاتھ سے کھول لیا کرو۔ تو وہ شاید بات مان جاتا۔ بیکری والے نے

جو طریقہ اختیار کیا وہ بھی صحیح نہ تھا، نہ انسان کی حیثیت سے اور نہ تاجر کی حیثیت سے، اس انداز سے بات کرنے سے اس کا بھی نقصان ہوا، مگر اس کی جہالت اور اخلاقی کمزوری نے اس کو یہ نقصان برداشت کرنے پر مجبور کیا۔

اپنے ابّو کی یہ باتیں سلمان کی سمجھ میں آگئیں۔ وہ شام کو پھر اسی بیکری والے کے پاس گیا اور اس کو اخلاق و محبت سے یہ ساری باتیں سمجھاتا رہا۔ شروع شروع میں بیکری والا الجھنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن سلمان کی باتوں کی مٹھاس نے اس کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ آخر وہ سلمان کی بات مان گیا۔

سلمان خوش خوش گھر واپس آیا۔ اس نے آج ایک اخلاقی سبق خود سیکھا تھا اور صحت کا ایک اصول ایک دوسرے انسان کو سکھایا تھا۔

(بہ شکریہ نونہال کراچی)

حشمت کمال پاشا

نئی بہار

بھول کر سالِ رفتہ کا ہر غم
آؤ مل کر دعا یہ کریں ہم
سالِ نو لائے خوشیوں کا موسم
راس آئے سبھوں کو یہ عالم

آیا آیا نیا سال آیا

سالِ نو رت نئی لے کے آیا
دھن نئی، عزمِ نو ہم نے پایا
دشمنی اور نفرت مٹا کر
اک نئی روشنی ساتھ لایا

آیا آیا نیا سال آیا



اس برس دل لگا کر پڑھیں گے
وقت کے ساتھ آگے بڑھیں گے
اپنی محنت سے کوشش سے پاشا
ہم ترقی کے زینے چڑھیں گے

آیا آیا نیا سال آیا

(پی۔ ۲۲۲، رابنسن پور روڈ، کلکتہ۔ ۲۴)

شمع علم کے پروانے

علم کی جو اہمیت اور فضیلت اسلام میں ہے وہ محتاجِ تشریح نہیں، جو ہماری کتاب میں علم کے اشارات و کنایات سے بھری ہوئی ہے۔ ہمارے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السّلام کو خدائے تعالیٰ نے سب سے پہلے اِس علمِ اسما کا درس دیا تھا "وعلمہ آدم الاسماء کلھا"۔ احادیث نبویؐ میں بھی جا بہ جا اِس کی تاکید آئی ہے۔ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَۃٍ۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ فِی الصِّیْنِ۔ یہ اور اِس قسم کے کتنے کنایات وارشادات ہیں جو تلاش کرنے پر مل سکتے ہیں۔ جنگ بدر میں جو کفّار گرفتار ہو کر آئے تھے، اُن کی رہائی کے لیے آں حضرتؐ نے صرف یہی شرط لگائی تھی کہ تم میں سے ہر وہ شخص جو پڑھا لکھا ہو چند مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے وہ آزاد ہے۔ آپؐ نے اپنے غلام حضرت زید بن حارثؓ کو عبرانی زبان پڑھنے کی ہدایت فرمائی تاکہ اِس سے عیسائیوں اور یہودیوں کی آسمانی کتابوں اور اُن کے مذہب کا صحیح پتا چل سکے۔ اسلام اور تاریخ اسلام کا ایک ایک صفحہ اِس قسم کے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے علم کی پوری اہمیت کو سمجھا اور اِس کی صحیح قدروں کو پہچانا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ جیسے بزرگ نے بھی علم کو خدا شناسی کا ذریعہ سمجھا اور اُس کے لیے شمع کی طرح پگھلنے کی نصیحت فرمائی ؎

چو شمع از پئے علم باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

ہمارے بزرگ علم کے اتنے پیاسے تھے کہ باوجود مسلسل فقر و فاقہ کے کئی کئی سو میل تک صرف چند مجہول چیزوں کے معلوم کرنے کے شوق میں بادیہ پیمائی کرتے۔ راستے کی مشکلات، بے آب و گیاہ میدانوں کا سفر، جنگلی جانوروں کا خوف، بھوک اور پیاس کی شدّت، اُن کے شوقِ طلب اور حصولِ مقصد میں قطعاً مانع نہ ہوتے۔

وہ عراق سے مصر، مصر سے شام، شام سے ایران پیدل چلنا محض رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے چند قول و فعل معلوم کرنے کے لیے ایک معمولی بات خیال کرتے۔ جنگلوں میں جڑی بوٹیوں کی تحقیقات اور اُن کے خواص معلوم کرنے کے لیے مارے مارے پھرتے۔ ایک معمولی نحوی یا صرفی غلطی کی تصحیح سالہا سال شہروں اور ملکوں کی خاک چھنوائی۔ وہ حصولِ علم میں مرنا اپنے لیے شہادت تصوّر کرتے۔

آج کل جتنی آسانیاں طالب علم کو حاصل ہیں اُسی نسبت سے اُس زمانے میں مشکلات تھیں۔ آمد و رفت کے جو آسان وسائل آج موجود ہیں، اُس وقت نہ تھے۔ کتابوں اور کتب خانوں کا آج جو ڈھیر ہے، یہ اُن لوگوں کے لیے عنقا تھا۔ وہ استاد کی تقریروں کو نوٹ کرتے اور یہی اُن کی کل کائنات ہوتی جو بجائے کتب خانے کے کام دیتی۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے وہ مسودات جن کو انھوں نے اپنے استاد سے سُن کر لکھا تھا۔ جب ڈاکوؤں کے ہاتھ چلے گئے تو گویا اُن کا گراں مایہ

کتب خانہ ختم ہوگیا، جو اُن کا کُل سرمایۂ حیات تھا۔

آج جس قدر کتب خانوں کی کثرت اور کتابوں کے انبار دکھائی دیتے ہیں، اُن میں سے زائد حصّہ انھیں بزرگوں کی جدوجہد کے نتائج ہیں، جن کا مطمحِ نظر علم کی تلاش اور جستجو تھی۔ ہمارے اِن بزرگوں کی یہ علمی کدوکاوش نہ ہوتی تو یہ بیش بہا خزانے آج عالمِ وجود میں نہ آتے۔ آج کی صحبت میں ہم اِن بزرگوں کی طویل فہرست میں سے صرف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو جو استاد المحدّثین ہیں، پیش کرتے ہیں۔

آپ کا اسمِ گرامی ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری ہے۔ شوال ۱۹۴ھ میں آپ پیدا ہوئے۔ بخارا آپ کا اصل وطن ہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے وطن ہی میں ہوئی لیکن اُسی وقت سے آپ کی فطری ذہانت اور غیر معمولی قوتِ حافظہ سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ آگے چل کر یہ ہونہار پودا پروان چڑھے گا۔ اور دُنیا کے لیے روشن چراغ اور راہ نما ثابت ہوگا۔ ذہین اور سمجھ دار ہونے کے علاوہ آپ کی خاص خوبی یہ تھی کہ آپ کو بچپن ہی سے علم کا صحیح ذوق، خصوصاً علم حدیث اور رجال کا چسکا لگ گیا تھا۔ چنانچہ آپ ابھی گیارہ برس کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ سماعت حدیث شروع کر دی۔ اور اسی عمر میں ابن مبارک کی تمام تصنیفات کے حافظ بن گئے۔ چودہ برس تک بڑے بڑے ائمۂ حدیث سے جو بخارا اور بخارا کے اردگرد تھے، حدیثیں سنتے اور انھیں حفظ کرتے رہے۔ جتنی ہی حدیثوں کی سماعت اور اُن کے حفظ کرنے میں ترقی ہوتی جاتی، اتنا ہی اُن کو اپنی معلومات کی کمی محسوس ہوتی۔ بالآخر اس ہونہار طالب علم کو یہ تاب نہ رہی کہ اپنا احاطۂ علم انھیں اردگرد کے شیوخ تک محدود رکھے۔ آخر شوقِ علم نے بادیہ پیمائی پر مجبور کیا اور مدتوں بلخ، بغداد، مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، شام، عسقلان، حمص، دمشق وغیرہ کی خاک چھانتے رہے۔ بعض مقامات پر آپ برسوں وہاں کے اساتذہ اور شیوخ کرام کی خدمت میں رہے اور احادیث کا صحیح مجموعہ فراہم کرتے رہے۔ بعض بعض حالتوں میں ایک حدیث کی تحقیق اور اُس کی تفتیش میں برسوں حیران رہے اور اگر وہ حل ہوتا دکھائی نہ دیتا تو اُسی کی دُھن میں دُور دور اساتذۂ فن کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ان سیاحتوں میں امام موصوف کو جن جن مصائب اور تکالیف سے دوچار ہونا پڑا، وہ احاطۂ تحریر سے باہر ہیں۔ ایک سفر کا واقعہ ہے کہ ایک بار آپ اس درجہ بھوک اور پیاس سے پریشان ہوئے کہ تین دن تک صرف جنگل کی جڑی بوٹیوں پر قناعت کی۔ اسی طرح ایک دوسرا واقعہ ہے کہ جب بصرہ میں اپنے شیخ کے پاس سماعت حدیث کے لیے آپ کئی روز تک نہ گئے تو عمر بن حفص اشقر جو آپ کے ساتھ سماعت حدیث میں شریک تھے، سبب معلوم کرنے کے لیے آپ کے گھر گئے تو وہاں آپ نے اس فقیر کو بالکل برہنہ پایا۔ آپ کے پاس اتنا بھی سامان نہ تھا کہ تن ڈھانکنے کا سامان کرتے۔ بالآخر کہیں سے چند درہموں کا انتظام کر کے ستر پوشی کا انتظام ہوا۔

اس قسم کے صدہا واقعات ہیں جو آپ کو حدیثوں کی چھان بین میں پیش آئے اور اس سے آپ کے عزم و استقلال کے ساتھ علمی تحقیق اور اُس کے لیے کاوش و جستجو میں لگے رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔

مفلسی اور تہی دستی کی وجہ سے بعض اوقات روشنی کا بھی سامان نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ تاریخ کی ایک کتاب "آستانۂ نبوت پر" چاندنی راتوں میں لکھی گئی۔ محنت کا یہ حال تھا کہ ایک لاکھ صحیح حدیثیں حفظ تھیں اور غیر صحیح حدیثوں کا اندازہ لاکھ دو لاکھ تک کیا جاتا ہے۔ بغداد کے سفر میں بعض لوگوں نے ان کا اس طور پر امتحان لیا کہ دس دس حدیثیں جن میں اسناد اور متون بدلے ہوئے تھے آپ کے سامنے پیش کیں، آپ نے بغیر غور اور فکر کے ان کی فوراً تصحیح کر دی۔

یہ وہ واقعات ہیں جو آپ کے طلب علمی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ آپ کی مفلسی اور ناداری، مصائب کی برداشت، شوقِ طلب علم سے کبھی آسودہ اور سیر نہ ہونا، اور سب سے آخر حصول مقصد کے لیے سخت محنت و مشقت برداشت کرنا، ان میں ہر ایک ہمارے لیے درسِ عبرت ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

امۃ الرحمٰن محسنی

دو شکاری

باب ۱

ابھی میں بہ مشکل چار ماہ ہی کا ہوا تھا کہ میری امّی اچانک بیمار ہوئیں اور ان کا انتقال ہو گیا۔ میری پرورش اور دیکھ بھال کی پوری ذمّہ داری میرے ابّو پر آ گئی۔ میرے کوئی بھائی بہن بھی نہیں تھا۔ چار ماہ کی عمر سے ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھی رہے۔ میں اور میرے ابّو۔ ابّو کے پاس ایک چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا تھا۔ اسی پر لکڑی کے ایک کمرے کا ہمارا گھر تھا۔ اس کے سامنے ابّو کا ایک فلنگ اسٹیشن تھا اور وہی اُن کی روزی کمانے کا ذریعہ تھا۔ یہ اسٹیشن چھوٹا سا ہی تھا۔ ایک قصباتی سڑک پر آنے جانے والی گاڑیوں کی ضروریات پوری کر دیتا تھا۔ امّی کے انتقال کے بعد ابّو ہی مجھے نہلاتے دھلاتے، کھلاتے، پلاتے اور میرے کپڑے بدلتے اور دوسرے سب کام کرتے جو ماں بچوں کے لیے کرتی ہے۔ مگر وہ سب کام کرنا ایک مرد کے لیے کوئی آسان نہیں ہوتا، جب کہ اُسے اپنی روزی پیدا کرنے کے لیے کاروں کی مرمت اور گاہکوں کی گاڑی میں تیل بھرنے جیسے کام بھی ہوں اور وہ بھی بلا کسی مددگار کے۔ لیکن میرے ابّو میری پرورش اور دُکان دونوں ذمّہ داریاں بہت خوشی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔

اب میں سوچتا ہوں کہ ابّو کے دل میں میری امّی کے لیے جو محبت تھی وہ اُن کے بعد انھوں نے سب میرے لیے وقف کر دی تھی۔ جب میں بہت چھوٹا تھا تو نہ تو میں کبھی بیمار ہوا اور نہ ہی کبھی اُداسی اور تنہائی جیسی کسی پریشانی سے واسطہ پڑا تھا۔

مسکن دودھ پور۔ علی گڑھ

مجھے اپنی پانچویں سالگرہ کا زمانہ کچھ تھوڑا سا یاد ہے۔ میں تیل کی چکنائیوں میں لتھڑا ہوا بہت گندہ سا رہتا تھا۔ وہ اس لیے کہ میں پورا دن ابّو کے ساتھ اُن کی ورک شاپ میں رہتا تھا اور چیزیں اُٹھا لانے میں اُن کی مدد کیا کرتا تھا۔

ابّو کے دو بڑے ڈول پمپ تھے اور ان کے پیچھے لکڑی کا ایک چھوٹا سا کھوکھا تھا جو آفس کا کام دیتا تھا۔ اس میں ایک میز کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میز کی دراز میں حساب رکھنے کا ایک رجسٹر رکھا رہتا تھا۔ وہ میز مجھے بہت ہی پسند تھی۔ اس میں ایک بٹن لگا ہوا تھا۔ اُس کے دبانے سے ایک گھنٹی بجتی تھی اور دراز کھڑکھڑاتی ہوئی باہر نکل آتی تھی۔

آفس کے سامنے ایک بڑی سی چوکور عمارت تھی۔ یہ ابّو کی ورک شاپ تھی۔ اسے ابّو نے بڑے شوق سے خود ہی بنایا تھا۔ بس ابّو کی زمین پر یہی اینٹ پتھر سے بنی ہوئی پختہ عمارت تھی۔ ابّو مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میں اور تم دونوں انجینیر ہیں۔ ہم دونوں لوگوں کی کاریں مرمّت کر کے اپنی روزی کماتے ہیں۔ ہم دونوں کسی باقاعدہ ورک شاپ میں کام نہیں کر سکتے۔

ورک شاپ کافی کشادہ تھی۔ ایک کار بہت سہولت سے اس میں کھڑی ہو جاتی تھی اور چاروں طرف کام کرنے کے لیے اُس میں کافی جگہ بچتی تھی۔ اس میں ٹیلی فون بھی تھا تاکہ گاہک اپنی گاڑیاں مرمت کے لیے لانے اور لے جانے کے سلسلے میں وقت طے کر سکیں۔

جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے ہمارا گھر لکڑی کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس کی پچھلی دیوار میں اوپر نیچے دو تختے لگے ہوئے تھے۔ یہ ہمارے پلنگ تھے۔ اوپر ابّو کا بستر تھا اور نیچے والے پر میرا۔ اگرچہ ہماری ورک شاپ میں بجلی تھی۔ لیکن گھر میں نہیں تھی۔

کیوں کہ اس کی لکڑی کی دیواریں اتنی پُرانی اور بوسیدہ ہوگئی تھیں کہ بجلی والوں نے اس میں بجلی تار لگوانا خطرناک بتایا تھا۔ اس لیے رات کی روشنی اور کھانا پکانے کا سب کام ہمارے گھر میں مٹی کے تیل سے پُرانے طریقے پر ہوتا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں لکڑی کے ایک تختے پر ایک بڑا سا مٹی کے تیل کا چولھا رکھا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں لمبی سی چمنی تھی۔ جس کا منہ کمرے کی چھت سے باہر نکلا ہوا تھا۔ کمرے کی چھت میں بیچوں بیچ ایک ہُک میں مٹی کے تیل سے ہی جلنے والی ایک لالٹین ٹنگی رہتی تھی جس سے ہمارا کمرہ خوب روشن رہتا تھا۔ کمرے میں دو کرسیاں اور ایک چھوٹی سی میز تھی اور کپڑے رکھنے کی ایک الماری تھی۔ بس اس کمرے میں یا ہمارے گھر کا کل یہ سامان تھا اور اس سے ہماری سب ضرورتیں آسانی سے پوری ہوجاتی تھیں۔

ہمارے گھر کے پیچھے تھوڑے فاصلے پر لکڑی ہی کا بنا ہوا پاخانہ تھا۔ یہ گرمیوں میں تو بہت اچھا تھا۔ لیکن سردی کے موسم میں یہ برف خانہ ہوتا تھا۔ اس میں بیٹھنا آسان نہیں ہوتا تھا۔

گھر کی پچھلی دیوار سے ملا ہوا ایک امرود کا درخت تھا جو بہت ہی بڑا اور گھنا تھا اور اس پر پھل بھی خوب آتے تھے، بہت بڑے اور میٹھے ہوتے تھے۔ اکتوبر سے ہی پکنے شروع ہوجاتے تھے اور دو تین ماہ تک اس کے پکے ہوئے پھل گرتے رہتے تھے اور ہم کھاتے اور اپنے ملنے والوں کے یہاں بھیجتے رہتے تھے۔

مجھے اپنا یہ چھوٹا سا گھر بہت ہی اچھا لگتا تھا اور خاص طور پر رات کو، جب ابّو مجھے لحاف میں لپیٹ کر بستر پر لٹا دیتے تھے اور اوپر لٹکے ہوئے لیمپ کی روشنی ہلکی کر کے میرے بستر کے قریب کرسی پر یا اور پیر والے تختے پر بیٹھ یا اپنے بستر پر لیٹ کر مجھے اُس وقت تک کہانیاں سناتے رہتے تھے جب تک کہ میں سو نہ جاؤں۔

باب ۲

میرے ابّو بے حد دل چسپ، بہت عجیب اور عام لوگوں سے مختلف مزاج کے انسان تھے۔ ایک اجنبی آدمی اُن کو دیکھ کر سنجیدہ اور خشک طبیعت کا کہہ سکتا تھا۔ مگر وہ ایسے تھے نہیں۔ وہ تو مسخرے پن کی حد تک خوش طبع، خوش مزاج تھے۔ وہ سنجیدہ اس لیے نظر آتے تھے کہ وہ ہونٹوں سے نہیں بلکہ آنکھوں سے مسکرایا کرتے تھے۔ اُن کی آنکھیں بھوری، چمک دار اور بے حد تیز اور ذہین تھیں۔ جب کوئی خاص خیال ان کے ذہن میں ہوتا تھا تو ان کی آنکھیں جھلملانے لگتی تھیں۔ اگر اس وقت کوئی غور سے دیکھتا تو ان کی آنکھوں میں ایک ننھا سا سنہرا ستارہ ناچتا ہوا بھی اسے نظر آسکتا تھا۔ مگر اُس وقت بھی ان کا منہ جما ہوا اور بلا حرکت کے ہی رہتا تھا۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ میرے ابّو آنکھوں سے مسکرانے والوں میں سے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے مجھے کبھی مصنوعی مسکراہٹ نہیں دی تھی۔ آنکھوں سے بناوٹی طرز پر مسکرایا ہی نہیں جا سکتا۔ آنکھوں میں اُس وقت تک مسکراہٹ آ ہی نہیں سکتی، جب تک دل میں مسکراہٹ کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ منہ سے مسکرانا بالکل مختلف بات ہے۔ بناوٹی مسکراہٹ کسی بھی وقت ہونٹوں کی جنبش سے پیدا کی جا سکتی ہے۔

میں نے اکثر غور کیا ہے کہ اصلی منہ کی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیشہ آنکھیں مسکرانے لگتی ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض وقت کوئی شخص کسی کے لیے مسکرا رہا ہے مگر آنکھوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اُس وقت وہ مسکراہٹ یقیناً مصنوعی اور بناوٹی معلوم ہوتی ہے۔

میرے ابّو آج کل کے مطابق تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی میں شاید ہی پندرہ بیس کتابیں پڑھی ہوں گی۔ اس کے باوجود ان میں کہانی سنانے کی بڑی زبردست صلاحیت تھی۔ وہ ہر رات مجھے ایک نئی کہانی بنا کر سنایا کرتے تھے اور اُن کی وہ کہانیاں سب سے اچھی ہوتی تھیں، جو کئی کئی راتوں تک چلتی رہتی تھیں۔ اور ان میں سے بھی بہترین وہ کہانی تھی جو پچاس راتوں تک چلی تھی۔ وہ کہانی ایک عجیب و غریب مخلوق کی تھی جو ایک جن تھا۔ مگر بہت ہی رحم دل اور انسانوں کا دوست تھا۔ اسے سب احترام اور محبت سے دادا کہتے تھے۔ پورا نام اس کا جرت تھا۔ مگر کہلاتے تھے جرو دادا۔ بے حد لمبے، عام آدمیوں سے تین گنا بڑے تھے۔ ان کے ہاتھ چھکڑے کے پہیوں کے برابر تھے۔ وہ زمین کے اندر ایک

بہت بڑے غار میں رہتے تھے اور وہ جگہ ہمارے فلنگ اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ رات کے اندھیرے میں ہی غار سے نکلتے تھے اور غار کے اندر ان کا ایک کارخانہ تھا جس میں وہ سینکڑوں طرح کے جادو کے پاؤڈر بنایا کرتے تھے۔

کبھی کبھی ابّو کہانی سناتے ہوئے اُٹھ جاتے اور ٹہلنے لگتے۔ لیکن زیادہ تر وہ میرے تختے کے کنارے پر بیٹھ جاتے تھے اور ہلکے ہلکے کہانی سناتے تھے۔ وہ کہتے جرت جن اپنے جادو کا پاؤڈر بچوں کے ان خوابوں سے بناتا ہے جو وہ سوتے میں دیکھا کرتے ہیں۔

"کیسے؟" میں نے پوچھا۔ "بتائیے ابو کیسے؟"

"دانی پیارے!" وہ بتانا شروع کرتے۔ "خواب عجیب اور پُراسرار سے ہوتے ہیں۔ وہ رات کو ہواؤں میں گھل مل کر تیرتے رہتے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے اور سوتے ہوئے لوگوں کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں۔

"ابو! آپ انھیں دیکھ سکتے ہیں!" میں نے پوچھا۔ "نہیں پیارے میں تو کیا، کوئی بھی انھیں دیکھ نہیں سکتا۔" ابو نے جواب دیا۔

"تو پھر جرو دادا ان کو کیسے پکڑ لیتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بڑی دل چسپ بات ہے۔" ابو نے کہا۔ "جب خواب رات کو ہواؤں میں مل کر تیرتے ہیں تو ان میں سے ہلکی سی بھنبھناہٹ کی آوازیں نکلتی رہتی ہیں۔ وہ آوازیں اتنی ملائم اور دھیمی ہوتی ہیں کہ ہم انسانوں کے لیے ان کا سننا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ لیکن جرو دادا انھیں بہت آسانی سے سُن لیتے ہیں۔ ان کے سننے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔"

ابو جب مجھے کہانی سناتے تھے تو ان کے چہرے کا پُرشوق انداز مجھے بہت ہی اچھا لگتا تھا، ان کا سیلا، پُرسکون، سرد، گردوپیش سے لاتعلق چہرہ میں بڑے شوق سے دیکھا کرتا تھا۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتے۔ "جرو دادا کے سننے کی حس اتنی تیز ہے کہ وہ ایک لاروے کے پتوں پر چلنے اور کھسکنے تک کی آوازیں سن لیتے ہیں۔ ایسے ہی زمین پر چلتی چیونٹیوں کی سرگوشیاں بھی ان کو سنائی دیتی ہیں۔

"دانی پیارے!" وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ "ہمارے آس پاس دنیا میں طرح طرح کی آوازیں ہیں۔ لیکن ہم انسانوں کے کان انھیں سن نہیں سکتے۔"

"ابو! وہ خوابوں کو پکڑ کر کیا کرتے ہیں؟"

"جرو دادا ان کو پکڑ کر ایک شیشی میں بند کر لیتے ہیں۔" ابّو نے بتایا اور اُس پر خوب مضبوطی سے ڈاٹ لگا دیتے ہیں۔ غار میں اُن کے پاس ایسی سینکڑوں شیشیاں ہیں۔"

میرا اگلا سوال تھا۔ "ابو! کیا وہ اچھے خوابوں کے ساتھ بُرے خواب بھی پکڑ لیتے ہیں؟"

"ہاں! وہ دونوں طرح کے خواب پکڑتے ہیں۔" ابو نے جواب دیا۔

"اور بُرے خوابوں کا کیا کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بُرے خوابوں کو وہ پھینک دیتے ہیں۔" ابو نے کہا۔

میں اپنے ابّو کو کتنا چاہتا تھا، یہ بتانا میرے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ جب وہ میرے قریب تخت کے کنارے بیٹھے ہوتے تو میں کھسک کر ان کے زیادہ قریب ہو جاتا اور اپنا ہاتھ لحاف کے اندر سے ہی لے جا کر اُن کے ہاتھ کے اوپر رکھ دیتا تھا اور وہ اپنی لمبی بڑی انگلیوں میں میری مٹھی لے کر بند کر لیتے۔ اُس وقت میں بتا نہیں سکتا کہ مجھے کتنا سکون ملتا تھا اور ان پر کتنا پیار آتا تھا۔

میں سوال کرتا۔ "جرو دادا اُس کا پاؤڈر بنا کر کیا کرتے ہیں؟"

"وہ یہ کرتے ہیں کہ آدھی رات کو گاؤں کے گھروں میں بچوں کے سونے کی جگہ تلاش کرتے ہیں۔ وہ بہت زیادہ لمبے ہونے کی وجہ سے بہت اونچی کھڑکیوں تک میں جھانک کر دیکھ لیتے ہیں اور جب کوئی سوتا بچہ دیکھ لیتے ہیں تو اپنا بکس کھولتے ہیں۔......"

"اپنا بکس کھول لیتے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

ابو نے جواب دیا۔ "جرو دادا ہمیشہ ایک بکس اور پھونکنا ساتھ لے کر نکلتے ہیں۔ ان کا پھونکنا اتنا بڑا ہوتا ہے جیسے نالی کا پائپ۔ اور ان کے بکس میں پاؤڈر بھرا ہوتا ہے۔ ہاں تو جب کوئی سوتا ہوا بچہ انھیں مل جاتا ہے تو وہ اپنا بکس کھول کر کوئی مناسب پاؤڈر اُس میں سے لے کر پھونکنے میں رکھ دیتے ہیں اور بچے کے کمرے کی طرف پھونکنا کر کے پھونک مارتے ہیں۔ پاؤڈر کمرے کے اندر پہنچ کر ہوا میں تیرنے لگتا ہے اور سانس کے ذریعے بچے کے اندر پہنچ جاتا ہے۔"

"اور پھر کیا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اور پھر یہ ہوتا ہے کہ بچہ صبح تک میٹھی نیند سوتا ہے اور

عجیب و غریب خواب دیکھتا ہے اور پھر اچانک خواب ختم ہو جاتا ہے۔ بچّہ کی آنکھ کھُل جاتی ہے۔ اسے اصلی دنیا کی چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں اور وہ جاگ کر اُٹھ جاتا ہے اور اپنے روز کے کام میں لگ جاتا ہے۔"

"دانی! دیکھو تو رات بہت ہو گئی ہے۔ بس اب باقی باتیں کل رات کو کریں گے۔ شب بہ خیر!"

ابّو نے مجھے پیار کیا اور لیمپ بجھا کر چولھے کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ چولھا جل رہا تھا۔ اس کی وجہ سے اب بھی کمرے میں ہلکا ہلکا اُجالا ہو رہا تھا۔

میں نے سرگوشی کے انداز میں ابو کو آواز دی: "ابّو!"

"کیا بات ہے دانی؟"

"آپ نے جرو دادا کو کبھی سچ مچ دیکھا ہے؟"

"ہاں! دیکھا ہے۔" ابّو نے جواب دیا۔ "مگر صرف ایک مرتبہ۔"

"آپ نے انھیں کہاں دیکھا تھا؟"

ایک دفعہ رات میں اس کمرے سے باہر ٹہل رہا تھا۔" ابّو نے کہا۔ "آسمان بادلوں سے صاف تھا۔ چاندنی خوب کھلی ہوئی تھی۔ اتفاق سے میری نگاہ اوپر اُٹھ گئی۔ میں نے اس عجیب و غریب مخلوق کو ٹیلے کی چوٹی پر بھاگتے، چھلانگیں لگاتے دیکھا تھا۔ اُس کے بھاگنے کا انداز عجیب اچھل کود جیسا تھا۔ اس کا کالا چوغہ اُس کے پیچھے ایسے اُڑ رہا تھا جیسے کسی پرندے کے پر ہوں۔ اس کے ایک ہاتھ میں بڑا ابکس تھا۔ دوسرے میں پھونکنا۔ وہ اونچے ٹیلوں پر سے ایسے گزر رہا تھا جیسے وہ ہموار زمین ہوں۔"

"ابّو! کیا آپ اُسے دیکھ کر ڈر گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ مجھے تو اُسے دیکھنے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ ہاں، میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ مگر ڈر بالکل نہیں لگ رہا تھا۔

"دانی! بس سو جاؤ، شب بہ خیر!"

(باقی اگلے شمارے میں)



(بہ شکریہ نونہال کراچی)

نعمان شفیق

بالشتیے کے جوتے

کسی قصبے میں دو بچے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکی تھی اور ایک لڑکا۔ لڑکے کا نام منان تھا اور اسے ماں باپ پیار سے منّو کہا کرتے تھے اور لڑکی کا نام مانی تھا۔ یہ دونوں بہت شریر تھے۔ ایسے شریر اور شوخ کہ محلے کا کوئی بچہ ان کے ساتھ کھیلنا پسند نہیں کرتا تھا۔

ایک روز ان دونوں کو قصبے کے قریب جنگل میں سیر کرنے کی سوجھی اور وہ چپ چاپ نکل گئے۔ جب وہ جنگل میں کافی دور تک چلے گئے تو اچانک مانی کسی چیز کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی اور بولی:

"دیکھو منّو! یہ کیا چیز ہے؟" "ارے یہ تو چھوٹے چھوٹے جوتے ہیں۔"



"مانی! یہ تو اتنے چھوٹے ہیں کہ تمھاری گڑیا کے پیر میں بھی نہیں آئیں گے۔"

"یہ تو کسی پری کے جوتے معلوم ہوتے ہیں۔"

"یہ پری وری کچھ نہیں ہوتی مانی، دادی اماں کہتی تھیں یہ سب جھوٹی باتیں ہیں۔"

"تو پھر یہ جوتے کس کے ہو سکتے ہیں؟ کسی انسان کے تو ہو نہیں سکتے۔ کیا کبھی تم نے اتنا چھوٹا آدمی دیکھا ہے جو میری گڑیا سے بھی چھوٹا ہو۔ تم مانو یا نہ مانو یہ کسی پری کے ہی جوتے ہیں، جو شاہ بلوط کے اس درخت میں رہتی ہے۔ جس کے پاس یہ جوتے رکھے ہیں۔ پری نے اپنے جوتے دھو کر یہاں سوکھنے کے لیے رکھ دیے ہیں۔"

منّو نے درخت کے تنے پر زور زور سے ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟" مانی نے پوچھا۔

"میں اس درخت میں دروازہ تلاش کر رہا ہوں۔ جب پری اس درخت کے تنے میں رہتی ہے تو اس نے دروازہ بھی بنایا ہوگا۔"

"تم نہیں سمجھتے منّو، پریوں کے رہنے کی جگہ ہمیں نظر نہیں آسکتی۔"

"تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"میرا خیال ہے ہم ان جوتوں کو گھر لے کر چلیں۔"

"ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔" منّو نے کہا۔

پھر یہ دونوں جوتے اٹھا کر گھر لے آئے اور میز پر رکھ کر انھیں غور سے دیکھنے لگے۔ انھیں ایک جوتے میں جوڑ لگا ہوا نظر آیا، جیسے اس کی مرمّت کی گئی ہو۔

"دیکھو منّو، اس جوتے کی مرمّت بھی کی گئی ہے۔ ضرور یہ کسی پری ہی کے جوتے ہیں۔"

"ایسا کرتے ہیں کہ ان کو کھڑکی پر رکھ دیتے ہیں اور پھر دیکھتے ہیں ان جوتوں کو کون لینے آتا ہے۔ جو کوئی بھی ہوگا جوتوں کو لینے رات کے وقت ضرور

بمعرفت ماہنامہ نونہال کراچی

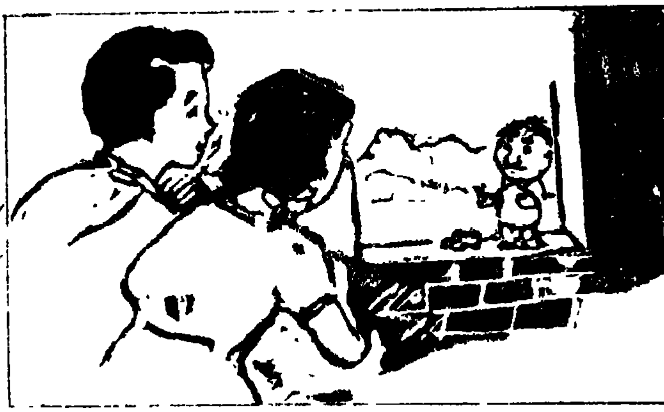
آئے گا،" مُنّو نے کہا۔

"بے وقوف، پھر تو ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔"

"میں بے وقوف نہیں ہوں، میری سمجھ میں ایک ترکیب آئی ہے۔ جوتوں کے تلے میں اور اندر کی جانب گوند لگا دینا چاہیے۔ جب جوتے لینے والا اسے پہن کر جائے گا تو ہل نہیں سکے گا اور ہم اسے پکڑ لیں گے۔"

"یہ تو بڑی اچھی ترکیب ہے اور میں نے تو سُنا ہے کہ پریاں جب قابو میں آجاتی ہیں تو خود کو آزاد کرانے کے لیے انسان کی تین خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کرتی ہیں۔" مانی نے کہا۔

آخر ان دونوں شریر بچّوں نے گوند لگا کر جوتوں کو کھڑکی میں رکھ دیا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جب رات ہو گئی اور چاند نکل آیا تو یہ دونوں ایک کونے میں تاک میں بیٹھ گئے۔ اچانک انھیں ایک آہٹ سی محسوس ہوئی اور پھر ایک چھوٹا سا بالشت بھر کا انسان کھڑکی میں



نمودار ہوا اور یہاں جوتوں کو دیکھ کر ٹھہر گیا۔ دونوں بچّے حیرت سے اسے دیکھتے رہے، پھر اس نے ان جوتوں کو پہن لیا اور جیسے ہی وہاں سے جانے کی کوشش کی اس کے پیر جم کر رہ گئے۔ اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اتنی دیر میں بچّے بھی سامنے آگئے۔ بالشتیا غصّہ ہو کر بولا:

"تمھیں ان جوتوں کو اٹھا کر نہیں لانا چاہیے تھا۔ میں نے ان کو مرمّت کرنے کے لیے درخت کے نیچے چھوڑ دیا تھا۔ میں گلہری کو ان جوتوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ گیا تھا اور جب تم جوتے لے کر یہاں آئے تو وہ بھی تمھارا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک پہنچ گئی، ورنہ مجھے پتا بھی نہ چلتا کہ میرے جوتے کون لے گیا۔ وہی مجھے یہاں تک چھوڑ گئی۔ تم دونوں بہت شریر بچّے ہو۔"

بچّے خاموش رہے، وہ اس بالشتیے کو دیکھ کر سہم گئے تھے، کیوں کہ اس کی شکل بڑی بھیانک تھی۔ بالشتیا پھر بولا:

"اور اب تم نے مجھے قید کر لیا ہے۔"

"تم ہماری تین خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کرو تو ہم تمھیں آزاد کر دیں گے۔" مُنّو نے ہمّت کر کے کہا۔

"تم میری مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔" بالشتیے نے ناراض ہو کر کہا۔

"بس یہی شرط ہے ہماری ورنہ صبح ہو جائے گی اور ہماری آپا آئے گی اور تمھیں پکڑ کر شوکیس میں سجا دے گی۔"

"ٹھیک ہے، تمھاری کوئی سی بھی تین خواہشیں پوری ہو جائیں گی، لیکن یاد رکھو، اچھے لوگ اچھی تمنّا کرتے ہیں اور بُرے لوگ بُری۔ تمھیں یہ شرطیں منوا کر کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ خیر تم جانو۔ بہر حال اب مجھے آزاد کر دو۔"

مُنّو اور مانی یہ سُن کر خوش ہو گئے اور مُنّو نے چاقو سے گوند کھرچ کر بالشتیے کو آزاد کر دیا۔

"اب ہماری تین خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔" مانی نے خوش ہو کر کہا۔

"تم سمجھتی ہو جو کچھ اس بالشتیے نے کہا ہے وہ سچ ہے۔"

"ہاں مجھے تو یقین ہے۔" مانی نے جواب دیا۔

"لڑکیاں ہوتی ہی بے وقوف ہیں۔"

"اور لڑکے بد تمیز جنگلی ہوتے ہیں، آپا نے بھی یہی کہا تھا کہ لڑکے بہت بد تمیز ہوتے ہیں۔" مانی نے جل کر کہا۔

"بکواس مت کرو۔" یہ کہہ کر منّو نے مانی کے بال زور سے کھینچ لیے۔

مانی رونے لگی اور منّو کے چٹکی بھرتے ہوئے کہنے لگی، "میری خواہش ہے کوئی تمھیں یہاں سے لے جا کر ایسا جھنجھوڑے ایسا جھنجھوڑے کہ تمھیں مزا آجائے۔"

"اور میری بھی یہی تمنا ہے۔" منّو نے جل کر جواب دیا۔

ابھی ان دونوں کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ دونوں کو محسوس ہوا کہ کوئی انھیں اوپر اٹھا رہا ہے۔ تین چار منٹ تک وہ ہوا میں اس طرح قلابازیاں کھاتے رہے کہ سانس تک نہ لے سکے۔ اس کے بعد ان کے پیر زمین سے لگ گئے۔ اب کسی نے ان کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ بے سُدھ ہو کر زمین پر گر گئے جب ہوش آیا تو انھوں نے خود کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں پایا، جہاں دو چھوٹے چھوٹے لیمپ جل رہے تھے۔ اس کمرے میں سامان بالکل نہیں تھا حتیٰ کہ زمین پر کوئی فرش بھی بچھا ہوا نہیں تھا۔

مانی نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا: "ہم کون سی جگہ آگئے ہیں؟"

"ہم دونوں نے دو غلط خواہشوں کا اظہار کیا تھا یہ اس کا نتیجہ ہے۔" منّو نے جواب دیا۔

"لیکن اب ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" مانی نے پریشان ہو کر کہا، پھر یہ دونوں شریر بچّے کمرے کی دیواروں کو غور سے دیکھنے لگے، لیکن اس کمرے میں نہ کوئی دروازہ تھا اور نہ کوئی کھڑکی۔ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ دونوں فرش پر بیٹھ گئے اور ناامیدی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"شاید کچھ دیر بعد کوئی شخص یہاں آکر ہمیں نکال دے، انتظار کرنا چاہیے۔" منّو نے مایوسی کے عالم میں کہا۔

"لیکن منّو، ابھی ہماری ایک خواہش باقی ہے۔ کیا ہمیں بہت زیادہ مال دار ہونے کی تمنا کرنی چاہیے؟"

"نہیں، ہمیں شاہ زادہ اور شاہ زادی بننے کی خواہش کا اظہار کرنا چاہیے۔" منّو نے تجویز پیش کی۔

"نہیں منّو، ہمیں بادشاہ اور ملکہ بننے کی خواہش کرنی چاہیے۔" مانی نے جواب دیا۔

"نہیں ہمیں ایسی کسی خواہش کے اظہار کی ضرورت نہیں، بلکہ ہمیں چاند پر چلے جانا چاہیے۔"

"نہیں منّو، اگر ہم چاند پر چلے گئے تو وہاں سے ہمیں کون واپس لائے گا؟ ہو سکتا ہے ہم اس وقت چاند پر ہی ہوں، میرے خیال میں اس سے بہتر خواہش اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ ہم واپس اپنے کمروں میں پہنچ جائیں۔"

"یہ تو اپنی آخری خواہش کو ضائع کرنا ہوا۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ کوئی نہ کوئی ہمیں یہاں سے نکالنے کے لیے ضرور آئے گا۔" منّو نے کہا اور پھر دونوں بچے کچھ دیر خاموش بیٹھ گئے۔ اچانک، انی نے کہا، "منّو، تمھیں یاد ہے بالشتیے نے ہمیں شریر بچّے کہا تھا۔"

"چھوڑو اس بات کو تمہیں تو ہر کوئی شریر سمجھتا ہے"۔

"تو پھر ہم یقیناً شریر ہوں گے۔ میں اب ہر ایک سے دوستی کروں گی، اپنی گڑیاں سہیلیوں کو دکھاؤں گی اور ان کے ساتھ پیار محبت کا برتاؤ کروں گی۔ منّو، تم بھی ایسا ہی کرنا اور اپنا بیٹری کا انجن اپنے ساتھیوں کو بھی دکھانا۔"

"ہاں مانی، تم ٹھیک کہتی ہو ہمیں اچھے بچّے بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"تو پھر ہمیں اچھا بننے کی تمنّا کرنی چاہیے۔" مانی نے کہا۔

"لیکن اس کا فائدہ کیا ہوگا۔ ہمیں یہاں سے کون نکالے گا۔ مجھے تو اب، یہاں پر بڑی اکتاہٹ اور گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ مانی، ہماری آخری خواہش یہی ہونی چاہیے

کہ گھر پہنچ جائیں ۔"
"سنو ایسا کرتے ہیں کہ گھر پہنچنے کی خواہش بھی کریں اور اچھا بننے کی بھی ۔"
"لیکن یہ تو دو خواہشیں ہو جائیں گی ۔" مُنّو نے کہا "ہمیں چاہیے کہ پہلے گھر پہنچنے کی تمنا کریں اور بعد میں اچھا بننے کی ۔ خواہش کا پہلا حصّہ تو پورا ہو ہی جائے گا ممکن ہے دوسرا حصّہ بھی پورا ہو جائے ۔"
"ہاں یہ ٹھیک ہے ۔ پہلے گھر پہنچنے کے الفاظ زبان سے ادا کریں اور بعد میں اچھا بننے کے ۔"
آخر ان دونوں نے یہی الفاظ ادا کیے ۔ اس کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ جیسے انھیں نیند آرہی ہو اور واقعی انھیں نیند آگئی ۔ جب آنکھ کھلی تو وہ اپنے کمرے میں بستر پر تھے ۔ انھیں اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ بالشتیے کے



ساتھ انھوں نے اچھا سلوک نہیں کیا تھا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ جو ان کا رویہ رہا تھا اس پر بھی انھیں بڑی شرمندگی ہو رہی تھی ۔

(بہ شکریہ ماہنامہ نونہال ۔ کراچی)

مضامین	صاف، خوشخط، کاغذ کے ایک طرف اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں ۔ ورنہ مضامین واپس کر دیے جائیں گے ۔ ایڈیٹر

عزیز مرادآبادی

جمہوریت کا دن ہے

پل پل خوشی مناؤ جمہوریت کا دن ہے
دکھ درد بھول جاؤ جمہوریت کا دن ہے
سب کو گلے لگاؤ جمہوریت کا دن ہے
محفل نئی سجاؤ جمہوریت کا دن ہے
مفلس کی بھی کٹی میں ہو آج تو اُجالا
تاریکیاں مٹاؤ جمہوریت کا دن ہے
اوتار اولیا کا مسکن ہے ملک اپنا!
سب کو یہ پھر سناؤ جمہوریت کا دن ہے
"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا"
سب کو یقیں دلاؤ جمہوریت کا دن ہے
" سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"
دنیا کو یہ دکھاؤ جمہوریت کا دن ہے
خوشیاں لہک رہی ہیں سانسیں مہک رہی ہیں
میرے چمن میں آؤ جمہوریت کا دن ہے
اس دن کی آرزو تھی ہم کو عزیزؔ کب سے
آؤ خوشی مناؤ جمہوریت کا دن ہے

بستی کرت پور، ضلع بجنور، یوپی

بغداد کا حجام

سید محمود نقوی



کردار
غلام علی　حجام
عبدالحسن لکڑہارا
خلیفہ اور درباری

پہلا منظر

وقت - صبح
جگہ - غلام علی حجام کی دوکان کے باہر
(غلام علی اپنی دکان میں بیٹھا استرے تیز کر رہا ہے
عبدالحسن خچر پر لکڑیاں لادے ہوئے وہاں پہنچتا ہے)

عبدالحسن - (آواز لگاتا ہے) لکڑی لے لو، سوکھی لکڑی (غلام علی کو دیکھتے ہوئے) آداب، عرض جناب! بہت اچھی سوکھی لکڑی ہے کیا آپ اپنی دکان کے لیے خریدنا پسند کریں گے؟

غلام علی - میں عام لکڑہاروں سے لکڑی نہیں خریدتا

عبدالحسن - لیکن جناب والا اس سے اچھی لکڑی آپ کو یہاں نہیں مل سکتی

غلام علی - سچ کہہ رہے ہو؟ اچھا دکھاؤ (خچر پر لدے بوجھ لکڑی کے گٹھر کو دیکھتا ہے) تم اس کی کتنی قیمت لگا رہے ہو؟

عبدالحسن - آپ کیا دیں گے جناب؟

غلام علی - میں تمھارے خچر پر لدی ہوئی ساری لکڑی کے لیے پانچ درہم دوں گا۔

عبدالحسن - صرف پانچ درہم۔ اس لکڑی کے کاٹنے میں میرا بہت وقت لگا ہے پھر بھی میں آپ کی پیش کش قبول کرتا ہوں۔ لکڑی اتار کر یہاں آپ کے دروازے کے پاس رکھے دیتا ہوں (لکڑیاں دروازے کے پاس رکھتا ہے اور غلام علی اسے دیکھتا رہتا ہے) لیجیے جناب اب مجھے رقم دے دیجیے۔

غلام علی - تم نے سب لکڑی مجھے نہیں دی۔

عبدالحسن - میں نے ساری لکڑی اتار دی ہے۔ اب خچر کی پیٹھ پر ایک لکڑی بھی نہیں رہ گئی ہے۔

غلام علی - ایک لکڑی بھی نہیں ہے؟ (کاٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اور یہ کیا ہے؟

عبدالحسن - وہ تو کاٹھی ہے۔

غلام علی - کیا کاٹھی لکڑی کی بنی ہوئی نہیں ہے میں لے خچر کی پیٹھ پر لدی ہوئی ساری لکڑی کے لیے پانچ درہم دینے کو کہے تھے اور تم نے اسے مان بھی لیا تھا۔ سودا اسی طرح طے ہوا تھا۔

۱- نیو برج پوری - نئی دہلی - ۵۱

مجھے کاٹھی بھی دے دو اور بات ختم کرو۔

عبدالحسن۔ آپ مذاق کر رہے ہیں جناب۔ مہربانی کر کے میری رقم دے دیں اور مجھے جانے دیں۔

غلام علی۔ (بلند آواز سے) مجھے کاٹھی دے دو۔ میں کہہ رہا ہوں تمھیں اس وقت تک ایک درہم بھی نہیں ملے گا جب تک کہ تم خچر کی پیٹھ پر لدی ہوئی ساری لکڑی مجھے نہیں دے دیتے۔

عبدالحسن۔ لیکن اس طرح کی سودے بازی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی آپ ایک غریب لکڑہارے کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ یہ ناانصافی ہے ظلم ہے۔

غلام علی۔ کیا۔؟ تم مجھے ظالم کہہ رہے ہو۔ میں ابھی بتاتا ہوں (وہ لکڑہارے کو دھکا دیتا ہے اور خچر کی پشت سے کاٹھی اتار کر کچھ سکّے زمین پر پھینک دیتا ہے) لو اپنے پانچ درہم اور یہاں سے دفع ہو جاؤ، فوراً چلے جاؤ ورنہ میں ...

(وہ اس طرح ہاتھ ہلاتا ہے جیسے اسے مارنے جا رہا ہو)

عبدالحسن۔ (جلدی سے سکّے اٹھاتا ہے اور فریاد کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے) آہ.. ! میرے ساتھ فریب کیا گیا، اب میں کیا کروں۔ (ایک لمحہ کے لیے ٹھہرتا ہے جیسے کوئی اچھا خیال ذہن میں آگیا ہو) ہاں، میں ایسا ہی کروں گا میں خلیفہ کے پاس جاؤں گا اور انصاف کا مطالبہ کروں گا۔

دوسرا منظر

وقت - کچھ گھنٹے بعد

جگہ - خلیفہ کا دربار

(خلیفہ ایک مرصع دیوان پر بیٹھے ہیں اور چاروں طرف درباری موجود ہیں)

خلیفہ۔ (اپنے ایک درباری سے) کیا اور کوئی ہے جو مجھ سے انصاف کا خواہش مند ہو۔

درباری۔ (آگے بڑھتے ہوئے) صرف ایک غریب لکڑہارا ہے جو آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے ساتھ بہت ناانصافی ہوئی ہے۔

خلیفہ - اسے فوراً اندر آنے دو۔ ہم اپنی رعایا میں سے ہر ایک کی شکایت سنتے ہیں چاہے وہ غریب ہو یا امیر۔

(عبدالحسن کو فوراً لایا جاتا ہے۔ وہ جھک کر زمین کو بوسہ دیتا ہے اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

خلیفہ - ہاں بھائی! بتاؤ، تم یہاں کیوں آئے ہو، تمھارے ساتھ کس نے زیادتی کی ہے، اپنی بات کہنے میں خوفزدہ نہ ہو۔

عبدالحسن - محترم خلیفہ! میرے ساتھ غلام علی حجام نے فریب کیا ہے۔ اس نے چال بازی سے سودا کیا اور میرے خچر کی کاٹھی بھی چھین لی۔

خلیفہ - سودا کس طرح طے ہوا تھا؟

عبدالحسن۔ اس نے کہا تھا کہ میرے خچر کی پیٹھ پر لدی ہوئی ساری لکڑی کے لیے وہ پانچ درہم دے گا میں نے اس کی پیش کش کو مان لیا تھا اور لکڑی کا گٹھر اسے دے دیا تھا۔ لیکن اس نے کاٹھی بھی مانگی کیونکہ اس کے کہنے کے مطابق خچر پر لدی ہوئی ساری لکڑی کی بات ہوئی تھی۔ جب میں نے اس سے کہا کہ یہ بے انصافی ہے تو اس نے مجھ سے زبردستی کاٹھی چھین لی، مجھے مارنے کی دھمکی دی اور بھگا دیا۔

خلیفہ - یقیناً یہ عجیب و غریب واقعہ ہے۔ تم کہتے ہو کہ تم نے خچر کی پشت پر لدی ہوئی ساری لکڑی کے لیے حجام کی پانچ درہم کی پیش کش منظور کر لی تھی

عبدالحسن - جی ہاں جناب!

خلیفہ ۔ اور اس نے کاٹھی کا دعوا اس لیے کیا کہ وہ بھی لکڑی کی بنی ہوئی تھی اور خچر کی پشت ہی پر تھی ۔

عبدالحسن ۔ جی ہاں جناب، لیکن .....

خلیفہ ۔ (اس کی بات کاٹتے ہوئے) ذرا ٹھہرو، قانونی طور پر حجام کا دعوا صحیح ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ تمھارے ساتھ انصاف نہیں ہوا ۔ بہر حال قانون کی پابندی تو کی ہی جانی چاہیے۔ (سنجیدگی سے کچھ سوچتے ہوئے) لیکن ہم چاہیں گے کہ انصاف بھی ہو۔ دوست ذرا قریب آؤ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ (خلیفہ چپکے سے کچھ کہتا ہے۔ عبدالحسن مسکراتے ہوئے سنتا ہے اور بات ختم ہونے پر احتراماً جھکتا ہے۔)

عبدالحسن ۔ شکریہ جناب والا۔ اے غریبوں کے سرپرست اس نیک صلاح کے لیے بہت بہت شکریہ۔ میں یقیناً اس پر جلدی ہی عمل کروں گا ۔

(وہ باہر چلا جاتا ہے)

تیسرا منظر

وقت ۔ کچھ دن بعد

جگہ ۔ غلام علی کی دکان

(غلام علی اپنی دکان میں بیٹھا ہے، عبدالحسن داخل ہوتا ہے)

غلام علی ۔ (خود سے) لکڑہارا پھر آرہا ہے۔ میرے خیال میں پھر اپنی کاٹھی مانگنے آرہا ہے، عجب بے وقوف آدمی ہے۔

عبدالحسن: السلام علیکم جناب ۔

غلام علی ۔ وعلیکم السلام۔ کیوں آئے ہو؟ دیکھو اگر تم کاٹھی مانگنے آئے ہو تو میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ سوائے وقت کی بربادی کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

عبدالحسن ۔ نہیں جناب، آپ اطمینان رکھیں میں کاٹھی لینے نہیں آیا، سودا جو ہوگیا سو ہوگیا اور اب میں اس بارے میں آپ سے کچھ نہیں کہوں گا، میں تو کسی اور کام سے آیا ہوں۔

غلام علی ۔ (حیرت سے) بتاؤ کیا کام ہے ؟

عبدالحسن ۔ کیا مہربانی کرکے آپ میرے اور میرے ایک دیہاتی دوست کے بال بنا دیں گے ؟

غلام علی ۔ کیوں نہیں، اگر تم بال بنوائی کی اجرت دو۔

عبدالحسن ۔ کتنی اجرت آپ لیتے ہیں ؟

غلام علی ۔ ویسے تو میری اجرت زیادہ ہے لیکن تم دونوں کے بال صرف دو درہم میں بنا دوں گا۔ (خود سے) میرے خیال سے یہ بے چارا بال بنوانے کے لیے اتنی رقم کبھی نہیں خرچ کر سکے گا ۔

عبدالحسن ۔ دو درہم دونوں کے لیے یہی بتایا نا آپ نے؟ لیجیے دو درہم (غلام علی کو رقم دیتا ہے اور وہ حیرت سے وصول کرتا ہے) اب پہلے میرے بال بنا دیجیے (عبدالحسن دکان میں بیٹھ جاتا ہے اور غلام علی بال بنانا شروع کرتا ہے)

غلام علی ۔ (کچھ دیر بعد) تمھارے بال بن گئے، تمھارا دیہاتی دوست کہاں ہے ؟

عبدالحسن ۔ وہ باہر کھڑا ہے، میں اسے ابھی اندر لاتا ہوں (وہ باہر جاتا ہے اور اپنے خچر کو لیے ہوئے اندر آتا ہے) یہ ہے میرا دوست، اب اس کے بال بنا دیجیے ۔

غلام علی۔ کیا ؟ خچر کے بال بنا دوں، کیا تمھارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔

عبدالحسن ۔ لیکن جناب آپ نے دو درہم میں میرے اور میرے دوست کے بال بنانا منظور کیا تھا، یہی سودا طے ہوا تھا ۔

غلام علی۔ کیا حماقت ہے۔ میں نے تمھارے بال بنا کر غلطی کی، میں بغداد کا مشہور حجام ہوں اور

اب تم اپنے خچر کے بال بنوانے کو کہہ کر میری بے عزتی کر رہے ہو، جلدی چلے جاؤ، فوراً بھاگو ورنہ میں تمھاری ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔ (وہ لکڑہارے اور خچر کو دکان سے باہر نکال دیتا ہے۔)

چوتھا منظر

وقت ۔ دو گھنٹے بعد

جگہ ۔ خلیفہ کا دربار

(خلیفہ پہلے کی طرح اپنے درباریوں کے ساتھ تخت نشین ہے ۔ عبدالحسن دست بستہ اس کے سامنے کھڑا ہے)

خلیفہ ۔ کہو دوست، کیا تم نے ویسا ہی کیا جیسا میں نے کہا تھا؟

عبدالحسن ۔ جی ہاں جناب، غلام علی نے دو درہم میں میرے اور میرے دوست کے بال بنانا منظور کر لیا تھا لیکن جب میں اپنے خچر کو دکان کے اندر لے گیا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور دھکا دے کر باہر نکال دیا۔

خلیفہ ۔ اچھا (ایک درباری سے) غلام علی کو بال بنانے کے سازو سامان کے ساتھ فوراً حاضر ہونے کا حکم دیا جائے ۔ (درباری احتراماً جھکتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر میں وہ غلام علی کو لے کر حاضر ہوتا ہے جو جھک کر زمین کو بوسہ دیتا ہے)

خلیفہ ۔ کیا تم غلام علی حجام ہو؟۔

غلام علی ۔ جی ہاں جناب والا ۔

خلیفہ ۔ کیا آج صبح تم نے دو درہم میں اس لکڑہارے اور اس کے دوست کے بال بنانے منظور کیے تھے ۔

غلام علی ۔ ہاں جناب والا ایسا ہی ہوا تھا ۔

خلیفہ ۔ پھر تم نے اس شخص کے دوست کے بال بنانے سے کیوں انکار کر دیا جبکہ سودا اسی طرح طے ہوا تھا

غلام علی ۔ میرے محترم خلیفہ! یہ صحیح ہے کہ سودا اسی طرح طے ہوا تھا لیکن آج تک کسی نے خچر کو اپنا دوست نہیں بنایا اور خچر کے بال کبھی پہلے کسی کسی نے نہیں بنوائے ۔

خلیفہ ۔ ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن کاٹھی کو بھی لکڑی کے گٹھروں میں پہلے کبھی نہیں شامل کیا گیا تھا۔ اب تو لکڑہارے سے جو سودا طے ہوا ہے اسے تمھیں پورا ہی کرنا ہوگا۔ جلدی سے خچر کے بال بناؤ ورنہ تم جانتے ہی ہو تمھارے ساتھ وعدہ خلافی کے جرم پر کیا سلوک کیا جائے گا (حجام کافی مقدار میں صابن تیار کرتا ہے، خچر کے سر سے پیر تک صابن لگاتا ہے اور قہقہوں کے درمیان خلیفہ اور سارے درباریوں کی موجودگی میں خچر کے بال بناتا ہے)

خلیفہ ۔ اب تم جا سکتے ہو، آیندہ کے لیے یاد رکھو سیدھے اور ایماندار لوگوں کے ساتھ چالاکی سے کام لینا ٹھیک نہیں ۔

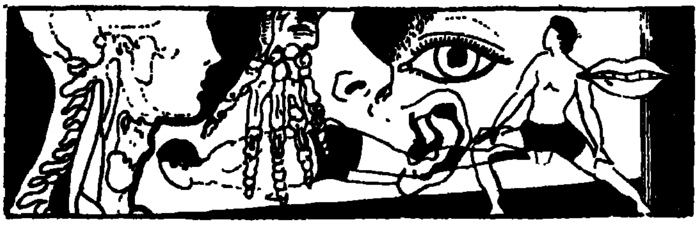
(غلام علی شرمندگی کے ساتھ تیزی سے باہر نکل جاتا ہے ۔ خلیفہ عبدالحسن سے مخاطب ہوتا ہے اے ایماندار لکڑہارے ادھر آؤ، لو یہ رقم اس سے تم کئی کاٹھیاں خرید سکتے ہو)

عبدالحسن ۔ (جھک کر عطیہ لیتے ہوئے) ہمارے خلیفہ زندہ باد

درباری ۔ (ایک آواز ہو کر) غریبوں کے آقا پایندہ باد

(پردہ گرجاتا ہے)

ننھے فنکار کا انعام	دسمبر ۸۲ء کا ننھے فنکار کا انعام روزینہ انصاری کو دیا گیا۔ روزینہ انصاری اپنی تصویر اور پورا پتا فوراً لکھیں



حکیم محمد سعید

طب کی روشنی میں

سر کا درد :-

س :- میرے سر میں درد رہتا ہے۔ خصوصاً پڑھنے کے وقت زیادہ ہوتا ہے۔ جسم اور چہرے پر سفید داغ ہیں جیسے خشکی کے ہوتے ہیں۔ میری عمر ۱۵ سال ہے۔ سید سبط علی

ج :- آپ کی صحت یقیناً اچھی نہیں ہے۔ اور بظاہر آپ کی آنتیں بھی صاف نہیں ہیں۔ اگر قبض ہے تو مناسب طریقہ سے دور کرنا چاہیے۔ قبض رفع کرنے کے لیے ملین یا درست آور دوائیں اکثر حالات میں غیر مفید رہتی ہیں۔ بکثرت پانی پینے سے نہ صرف رفع قبض ہوتا ہے بلکہ گردے بھی خوب دُھل جاتے ہیں۔ غذائیں ایسی کھائیں جو باریک نہ ہوں۔ مثلاً میدا وغیرہ۔ موٹا آٹا آنتوں کی صحت کے لیے اچھا رہتا ہے۔ سبزیاں کچی یا ادھ کچی چبا کر کھائیں تو اُن سے آنتیں قوی اور متحرک ہو جاتی ہیں۔ اور قبض نہیں رہتا۔ جو لوگ سست ہیں اور ورزش نہیں کرتے اُن کی آنتوں کی حرکت (دُودیہ) کم رہتی ہے۔ اگر آپ کا نظام ہضم درست ہوگا تو دردِ سر بھی رفع ہو جائے گا اور جسم اور چہرے کے سفید داغ بھی جاتے رہیں گے۔

سبق بھول جاتا ہوں :-

س :- میں آٹھویں جماعت کا طالب علم ہوں۔ پڑھنے سے میری آنکھوں میں پانی بھر آتا ہے۔ پھر جو سوال اور سبق یاد کرتا ہوں، تھوڑی دیر میں بھول جاتا ہوں۔ میرا حافظہ بہت کمزور ہے۔ محمد ریاض الدین

ج :- اس صورتِ حال کو حکیم صاحبان دماغ کی کمزوری کہتے ہیں۔ آپ کو یقیناً اپنی عام صحت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔

اور یہ یقین کرلینا چاہیے کہ ملک اور وطن کو ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے کہ جن کے جسم بھی مضبوط ہوں اور دماغ بھی تازہ اور قوی ہوں، تاکہ وہ اپنے فکر و نظر سے اور اپنی جسمانی طاقت سے دشمنوں کا صرف مقابلہ ہی نہ کریں بلکہ ملک کو ہمیشہ قائم رکھنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

آپ کو ورزش کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہ ضروری ہے۔ پھر نیند کا بھی خیال رہے اور یہ زرّیں اصول نظر انداز نہ ہو کہ جلد سونا اور صبح جلد بیدار ہونا اسلامی ہدایات کے عین مطابق ہے اور فطرت اِس کا مطالبہ کرتی ہے۔

میری رائے میں ۱۲ دانے بادام شیریں اور ۱۸ گرام کشمش رات کو بھگو کر صبح کھانے سے صحت اور حافظہ درست ہو سکتا ہے یا صبح شام خمیرہ ہمدرد ۶ - ۶ گرام کھائیے۔

کھجلی :-

س :- میری عمر ۱۵ سال ہے۔ تین ماہ سے پورے بدن میں کھجلی ہے اور جگہ جگہ دانے بھی ہیں جن میں پانی بھرا ہوا ہے۔ رات کو سوتے وقت اور اسکول سے آکر کھجلی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مہربانی فرما کر اِس کا علاج بتائیں؟ محمد ادریس

ج :- یقیناً یہ فسادِ خون ہے، خون کے توازن میں فرق آگیا ہے ہو سکتا ہے کوئی وائرس (انتہائی ننھے جراثیم) خون کو جائے فساد بنا رہے ہوں۔ رات کو چرائتہ، شاہترہ، خاکسی ۴-۴ گرام، گرم پانی میں بھگو دیں، صبح ململ سے چھان کر پی لیں۔ شام کو اسپغول ۶ گرام کا لعاب تازہ پانی میں نکال کر ۶ گرام خاکسی چھڑک کر پی لیں۔

(بشکریہ نونہال فروری)

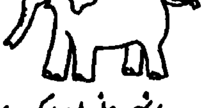
معرفت ماہنامہ نونہال کراچی

جانوروں کا انقلاب

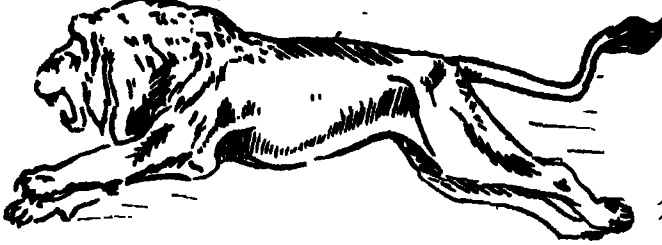
سید اصغر حسین رضوی

صدیوں پہلے جب اس دنیا میں ہر طرف جنگل ہی جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ پہاڑوں اور جھیلوں سے دنیا اَٹی پڑی ہوئی تھی۔ ہر چہار طرف جدھر بھی نگاہ اُٹھتی سرسبز و شاداب شاخیں جھومتی نظر آتیں اور خودرو جنگلی جھاڑیاں جھولتی دکھائی دیتیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کہیں کسی گوشے میں کوئی انسان نظر نہ آتا تھا۔ شیر، چیتے، تیندوے، ہاتھی، ہرن، چکارے، سیار، بھیڑیے، بندر، بن مانس، گھوڑے، گدھے، اونٹ، زرافہ، سیاہ گوش، کنگارو، بارہ سنگھے، خرگوش، گلہری، سارس، قازیں، بگلے، ہنس، مور، کوّے، مینا، بلبل، کبوتر، توتے، باز، مرغ، مرغیاں، تیتر، بٹیر، مرغابیاں، غرض کہ ہر چہار طرف چرند اور پرند ہی، چرتے، چہکتے، کلیلیں اور چہلیں کرتے ہوئے دکھائی پڑتے، پرندے پرواز کرتے، پھڑپھڑاتے، مست رہتے۔ مگر اُس وقت بھی ان جانوروں میں اپنے قاعدے اور قوانین تھے، اصول تھے۔ وہ قبیلوں اور جرگوں کی شکل میں اپنی اپنی جنسوں کے ہمراہ الگ الگ جنگلی خطّوں میں بستے تھے۔





انہی دنوں ایک بہت ہی بڑے اور گھنے جنگل میں ایک بہت ہی رحم دل اور انصاف پسند شیر بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ یوں تو ہر جنگل کا بادشاہ شیر ہی ہوا کرتا تھا۔



مگر اور تمام جنگلوں کے بادشاہ بہت ہی بے رحم، بے پروا اور ظالم تھے۔ برعکس ان کے یہ رحم دل، انصاف پسند، ہوشیار اور رعایا پرور بادشاہ تھا۔ وہ اپنے جنگل کے تمام چھوٹے بڑے جانوروں کی ہر ممکن حفاظت کرنا، ان کا خیال رکھنا اور باہری حملوں اور خطروں کا مقابلہ کرنا اور جنگلی امن و امان کو برقرار رکھنے کی سعی کرنا۔

جنگل کے سبھی جانور اپنے حکمراں سے خوش تھے۔ بادشاہ کے حسنِ سلوک نے اُن کے دلوں کو خرید لیا تھا۔ سبھی جانور خوش خوش رہ رہے تھے کہ اچانک ایک دن بادشاہ مرگیا۔ جنگل کے سبھی جانور غمگین تھے اور اپنے ہونے والے بادشاہ کی طرف سے فکرمند تھے۔ یوں تو ان جانوروں کا بادشاہ اُن کے پہلے بادشاہ کی اولاد ہی کو ہونا تھا۔ مگر وہ اپنے باپ کی طرح بہادر اور منکسر مزاج نہ تھا۔ اُس میں جنگل کے دوسرے جانوروں کے لیے دردمندی تھی اور نہ ہی انصاف پسندی بلکہ وہ نہایت ہی لاابالی طبیعت اور سُست و کاہل واقع ہوا تھا۔ دوسرے جانوروں کی جان کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ بس وہ دن بھر کھاتا پیتا اور

مٹرگشتی کرتا اور اِدھر اُدھر غاروں اور گپھاؤں میں پڑا سویا کرتا۔

اُس کی اِن تمام عادتوں سے جنگل کے سبھی جانور واقف تھے۔ مگر بادشاہ شیر کے مرنے کے بعد جنگل کے سبھی جانور اسے غم گین خیال کرکے اُس کی تمام لاپروائیوں کو نظر انداز کرتے رہے اور اُس کے کھانے پینے اور آرام و آسائش کا پورا پورا انتظام کرتے رہے۔ جس طرح اپنے پہلے بادشاہ کا خیال کیا کرتے تھے۔

ایک دن جنگل میں ایک اجتماعی جلسہ ہوا جس میں جنگل





کے مشہور اور ذی عزّت جانوروں (چیتے، تیندوے، بندر اور ہاتھی وغیرہ) نے اپنی اپنی نسلوں کی فلاح و بہبود اور ترقیاتی نقطوں پر تقریریں کیں اور بعد میں مرحوم بادشاہ کے بیٹے کی تاج پوشی کی رسم ادا کی گئی۔ پھر کھانے پینے اور ناچنے گانے کے بعد جلسہ ختم ہو گیا۔

بادشاہ ہونے کے بعد مرحوم شیر کا بیٹا بلا روک ٹوک اپنی من مانیاں کرنے لگا۔ اُس کی من مانیاں اور آوارگیاں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھتی گئیں۔ ایک بادشاہ کو کس طرح حکومت کرنی چاہیے اِس سے اس کو کوئی مطلب نہیں تھا۔ بس وہ تھا اور اُس کا عیش و آرام۔

جنگل کے بڑے بوڑھے زمانہ شناس جانوروں نے خوب خوب سمجھایا، اُسے پہلے بادشاہ جیسا نیک نیّت اور رعایا پرور بادشاہ بننے کی تلقین کرتے رہے۔ مگر بزرگوں کی نصیحتوں اور دوستوں کے مشوروں کا اِس کُند ذہن اور ناکارہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ حد یہ ہے کہ اب تو وہ ظلم اور بربریت پر اُتر آیا تھا۔ بندر اپنی پرانی دوستی کے ناتے مشورہ دینے گیا تو شیر نے دو چار کرارے پنجے اس کو رسید کر دیے، چیتا گیا تو اُس کی بزرگی کا بھی پاس و لحاظ نہ کیا اور اُس کی ایک آنکھ بھی پھوڑ دی۔ بیس پچیس ننھے منّے خرگوش اپنی معصومیت کے ساتھ گئے۔ لیکن دس بارہ ہی واپس آئے وہ بھی نچے کھچے اور جگہ جگہ سے اُدھڑے ہوئے زخمی حالت میں۔

دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کا امن و امان خواب بن گیا۔ ہر دل میں نئے بادشاہ کے لیے نفرت اور حقارت نے گھر کر لیا۔ جنگل کا ہر ایک جان دار سہما اور بیزار نظر آنے لگا۔ اور ایک دن مجبور ہو کر جنگل کے سبھی جانوروں نے سر جوڑ کر یہ فیصلہ کیا کہ آخر اس ظلم و جور کی حکومت کب تک ہم پر چلتی رہے گی۔ ہم اور برداشت نہیں کر سکتے۔ ہمیں ایسے ظالم، آرام پسند اور نا اہل بادشاہ کو جنگل سے نکال باہر کرنا چاہیے۔ اور پھر ان سبھوں نے ایک فیصلہ کرنے کے بعد نئے بادشاہ کی آرام گاہ پر حملہ کر دیا۔

چاروں طرف گھُپ اندھیرا، جنگل کا بھیانک سنّاٹا، بادشاہ اپنی اندھیری غار نما آرام گاہ میں دنیا کی تمام جھنجھٹوں اور اپنے خلاف ہونے والے انقلاب سے بے نیاز نیند کی نرم آغوش میں ہلکورے کھا رہا تھا کہ اچانک شور سُن کر اُس کی آنکھیں کھُل گئیں۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ گینڈے کا نوکیلا سینگ اُس کے پیٹ میں اُتر چکا تھا۔ پھر کیا تھا۔ غیض و غضب کے ساتھ ہاتھی، ہرن، چیتا اور نیل گائے وغیرہ سبھی اُس پر ٹوٹ پڑے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے جانوروں نے بادشاہ کے مضبوط جسم کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

ایم عرفان علیمی

ایک جان لیوا مچھلی



مچھلیاں دیکھنے میں کتنی خوبصورت لگتی ہیں۔ مگر سب مچھلیاں خوبصورت نہیں ہوتی ہیں۔ جس طرح انسانی دینا میں ہر طرح کے لوگ ہیں، کچھ پستہ قد ہیں تو کچھ دراز قامت۔ کچھ گورے ہیں تو کچھ کالے۔ غرضکہ مختلف قسم کے لوگ دنیا میں آباد ہیں۔ اسی طرح مچھلیاں بھی ہیں۔ کچھ مچھلیاں ایسی ہیں جن میں جہاز کو الٹ دینے کی طاقت ہے۔ جیسے "وہیل"۔ کچھ آدم خور ہوتی ہیں جیسے شارک اور کچھ انسان دوست مچھلیاں بھی ہوتی ہیں جیسے "ڈولفن"۔ اور کچھ مچھلیاں اپنے لذیذ گوشت کے لیے مشہور ہیں جیسے مہاشہ اور ٹراوٹ۔ اسی طرح کچھ مچھلیاں بہت بھاری اور بھدّی ہوتی ہیں جنھیں دیکھ کر ہی خوف معلوم ہوتا ہے اور کچھ انتہائی خوبصورت اور سبک بدن ہوتی ہیں۔ غرضکہ خالق کائنات نے مختلف اقسام کی مچھلیاں بھی پیدا کی ہیں۔

آج میں آپ کو جس مچھلی کے بارے میں بتا رہا ہوں، وہ بھی بہت ہی چمکدار اور خوبصورت ہوتی ہے۔ لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ دیکھنے میں اتنی خوش رنگ اور ننھی سی مچھلی اگر کسی کو کاٹ لے تو اس کا بچنا مشکل ہو جاتا ہے اور اس کے زہریلے اثرات سے صرف ۳۰ سکنڈ میں انسان ہلاک ہو جاتا ہے۔ آج تک اس مچھلی کے زہر کا کوئی تریاق معلوم نہیں کیا جا سکا۔ سائنس اپنی تمام ترقی کے باوجود اس کے زہریلے اثر کو ختم کرنے کے لیے کوئی دوا ایجاد نہیں کر سکی۔

درگاہ اسٹریٹ بیگم سرائے، الہ آباد ـــ ۱۲

اکثر ماہی گیر اور سیاح تیراکی کے دوران اس مچھلی کے زہریلے اثرات کا شکار ہو کر موت سے ہم کنار ہو جاتے ہیں۔ کچھ سال پہلے جب آسٹریلیا کے شمالی ساحل پر تیراکی کے دوران کچھ تیراک اس مچھلی کے زہریلے ڈنک کا شکار ہو کر چل بسے تو ماہرینِ فن نے اس سلسلے میں تحقیق شروع کر دی۔

دیکھنے میں خوبصورت مگر جان لیوا اثر رکھنے والی مچھلی عموماً سرخ بھورے اور پیلے رنگ کی ہوتی ہے۔ اس کے جبڑے میں لگ بھگ پچاس دانت ہوتے ہیں اور ان دانتوں میں ساڑھے سات لاکھ ڈنک مارنے کے سیل موجود ہوتے ہیں۔ اور ان سیلوں کا زہر ناگ کے زہر سے زیادہ خطرناک اور مہلک ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ بحر ہند اور بحر الکاہل کے پانی میں پائی جاتی ہیں۔ اور اسے 'ریڈ میڈوسا' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

تمام ماہرین فن اس کوشش میں سرگرداں ہیں کہ اس مچھلی کے زہر کا تریاق معلوم کر سکیں مگر ابھی تک اس سلسلے میں کوئی خاص کامیابی نہیں مل سکی ہے۔

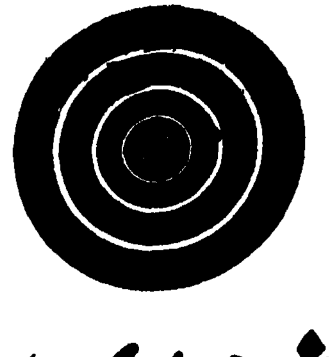
یاد رکھیے

"بچوں کی کوششیں" میں اب صرف ان بچوں کی کہانیاں شائع ہوں گی جو اپنے نام کے ساتھ اپنی عمر بھی لکھیں گے۔

اڈیٹر

محمد جیلانی





شرم بُری بَلا ہے

یوں تو شرم انسان کا جوہر ہے مگر کسی اچھی سے اچھی چیز کا بھی غلط استعمال اچھے نتائج نہیں پیدا کرتا۔ چنانچہ جو لڑکے پڑھائی کے وقت استاد سے شرم کے مارے کوئی بات اس لیے نہیں پوچھتے کہ دوسرے لڑکے مذاق اُڑائیں گے اُن کے لیے یہی شرم تریاق کے بجائے زہر بن جاتی ہے۔

احمد اپنے گانو کا غریب اور شریف اور اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے باپ مر چکے تھے۔ ماں کے نام سے تھوڑی سی جائداد تھی۔ احمد کی ماں احمد کو دیکھ کر جیتی تھی ورنہ اس کا جینا بھی محال تھا۔ احمد بہت چھوٹا تھا ایک روز اس کے دروازے پر ایک جیوتشی آیا جس نے احمد کو دیکھتے ہی بتلا دیا کہ یہ لڑکا بڑا ہونہار ہے اور آگے چل کر بہت بڑا آدمی بنے گا۔ احمد کی ماں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے سلامی دے کر دروازے سے رخصت کیا۔

احمد کے گھر سے تھوڑی دور کے فاصلے پر ایک سڑک تھی جس سے لڑکے اسکول جایا کرتے تھے۔ احمد ان سب کو دیکھتا اور سوچتا تھا آخر یہ سب کہاں لجاتے ہیں؟ ایک دن اس نے اپنی ماں سے پوچھا کہ "ماں! وہ سب لڑکے جو روز اس سڑک سے جاتے ہیں کہاں جاتے ہیں؟" ماں نے کہا "بیٹا وہ اسکول جاتے ہیں"۔ اس نے پوچھا "کس لیے؟" ماں نے کہا "پڑھنے"۔ احمد بولا "ماں! پڑھنا کیا چیز ہے؟ اور اس سے کیا فائدہ ہے؟" ماں نے جواب دیا۔ "بیٹا پڑھنا علم حاصل کرنے کو کہتے ہیں جس سے لوگ بہت بڑے آدمی بن جاتے ہیں۔ ان کی ہر جگہ قدر ہوتی ہے اور دوسرے لوگ انھیں اچھی نظر سے دیکھتے ہیں اور نیک سمجھتے ہیں"۔

احمد۔ ماں! تب تو میں بھی اسکول جاؤں گا اور پڑھنا شروع کروں گا۔

ماں۔ بیٹا! تم کیسے پڑھوگے تم تو غریب ماں کے بیٹے ہو۔ تمھارے پڑھنے کے لیے رقم کہاں سے آئے گی؟

احمد۔ نہیں ماں ہم غریب نہیں ہیں ہمارے پاس جو زمین ہے اسے بیچ کر پڑھیں گے۔

ماں۔ اچھا بیٹا جب تمھیں پڑھنے کا شوق ہی ہے تو کل اسکول چلنا پہلے تمھارا داخلہ ہوگا اس کے بعد تمھاری پڑھائی

بھلوار محلہ عیدگاہ روڈ۔ امجھر شریف، ہسپورہ ۔ ۸۲۴۱۲۰

شروع ہو جائے گی۔

دوسرے دن ماں نے اپنے بیٹے کا داخلہ اسکول میں کرادیا۔ اب احمد روزانہ اسکول جانے لگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کے کئی دوست بھی ہو گئے۔ مگر اس کا دوستوں سے لگاؤ بہت کم رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ پڑھنے میں مصروف رہتا تھا۔ ماسٹر جو بھی سبق پڑھاتے یہ غور سے سنتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اس کو ماسٹر سے کئی کئی بار پوچھتا اور اچھی طرح سمجھ لیتا۔ اس کے دو تین بار پوچھنے پر دوسرے لڑکے اس کا مذاق اڑاتے اور اسے ناسمجھ سمجھتے تھے۔ لیکن پھر بھی احمد ان لوگوں کی باتوں پر توجہ نہ دیتا اور نڈر ہو کر بلا شرم کیے ماسٹر سے دو بار تین بار پوچھتا اور سبق کو سمجھتا۔ اگر کوئی سبق اسکول میں سمجھ لیتا اور گھر آنے پر بھول جاتا تو کسی پڑھے لکھے سے پوچھتا اور سمجھ لیتا۔ یعنی احمد کا پڑھنے کا ڈھنگ بڑا ہی نرالا تھا۔ نہ اس کے پاس شرم تھی نہ کسی قسم کی جھجک۔ وہ ہر چیز کی جانکاری میں برابر لگا رہتا تھا۔

سال پورا ہوا لڑکوں کا سالانہ امتحان ہوا جس میں احمد سب سے اچھے نمبر لے کے پاس ہوا اور اسکول بھر میں اوّل رہا۔ آج وہی لڑکے جو اسے ناسمجھ سمجھتے تھے اپنی ناکامیابی پر سر جھکائے ہوئے اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ •

قلمی دوستی

نواب عتیق اطہر زاہدی عمر ۱۴ سال
مشغلہ: روزہ رکھنا، قرآن شریف کی تلاوت کرنا
پتا: اطہر نیکیتن گرجہ پاڑہ، رانی گنج - بردوان (ویسٹ بنگال)

پرویز قاسم عمر ۱۹ سال
مشغلہ: قلمی دوستی کرنا اور ڈاک ٹکٹ جمع کرنا
پتا: ۱۰ اسلطان اسٹریٹ بھٹکل، پن - ۵۸۱۳۲۰ کرناٹک

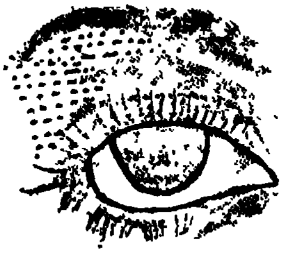
تنویر ذکی عمر ۷ سال
مشغلہ: کتابیں پڑھنا اور نماز پڑھنا
پتا: تنویر بک ڈپو ۱/۱۰۳ جی، ٹی روڈ، دکان نمبر ۶ نیو سنیما، آسنسول

ذکیہ انجم عمر ۵ سال
مشغلہ: دوسروں کی نقل کرنا۔
پتا: ذکی بک ڈپو، ایلیپارہ، کے، ٹی، رود، آسنسول ۲۔

ایم - اے - رفیق
شوق: نماز پڑھنا۔ بزرگوں کی تعظیم کرنا، قلمی دوستی کرنا
پتا: ۳۰-۶-۲، عربی اسٹریٹ - پڈاپلی - ۵۰۵۱۷۲

شکیل احمد ناگوری سال ۱۷
شوق: مستی کرنا، نماز پڑھنا
پتا: شا۔ بہ۔ او۔ ما۔ وی۔ مہد پور، ضلع اوجین ۴۵۶۴۴۳

الیاس احمد حامد
مشغلہ: قرآن شریف کو حفظ کرنا، "پیام تعلیم" پڑھنا۔
پتا: معرفت: - تاج احمد تاج نرملی، نرمل، ۵۰۴۱۰۶



مرتبہ: موثق الدین

ادھر ادھر سے

میونسپل اردو اسکول کرلا میں "یوم اطفال"

بمبئی ۱۰ نومبر آج یہاں بازار وارڈ میونسپل اردو اسکول کرلا میں بچوں نے "یوم اطافال" بڑی دھوم سے منایا۔ ننھے منّے معصوم بچوں نے اپنے اپنے پروگرام پیش کیے کسی نے تقریر کی تو کسی نے لطائف سنائے۔

۱۴ نومبر پنڈت جواہر لال نہرو کا یوم پیدائش بھی تھا اور چونکہ ۱۴ نومبر کو اسکول میں چھٹی رہتی ہے اس لیے پروگرام قبل از وقت منایا گیا اس پروگرام کی صدارت علاقہ کے مقبول کارپوریٹر شری دشرتھ کے بدھ کنھا نے کی۔ آپ نے بچوں کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور ان کی محنت و کاوش کو سراہا۔ آپ نے اپنے ہاتھوں سے غریب بچوں کو یونیفارم تقسیم کیے اور مزید ۳۰ یونیفارم دینے کا اعلان کیا۔

حسن پور میں "تحریک اردو"

حسن پور (مراد آباد) ۲ دسمبر (بھارتی) اپنی روایت کے مطابق بزم اردو حسن پور نے اردو کی واقفیت کے بارے میں طلبہ کا ایک مقابلہ منعقد کیا۔ جس میں شہر کے سرکاری غیر سرکاری بارہ اسکولوں کے ۳۹۲ بچوں نے حصّہ لیا۔ مقابلے میں اول، دوم، سوم بچوں کو ۲۰ روپے سے پندرہ روپے کی قیمت کے انعامات دیے گئے۔ اس کے علاوہ اپنے اسکول میں اوّل آنے والے ہر بچے کو تین روپے کی قیمت کا ایک انعام ہمت افزائی کے لیے دیا گیا۔ مقابلے میں شریک ہونے والے سبھی طلبہ و طالبات کو ایک ایک بن اور ناشتہ بھی دیا گیا۔

معرفت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بمبئی ۳

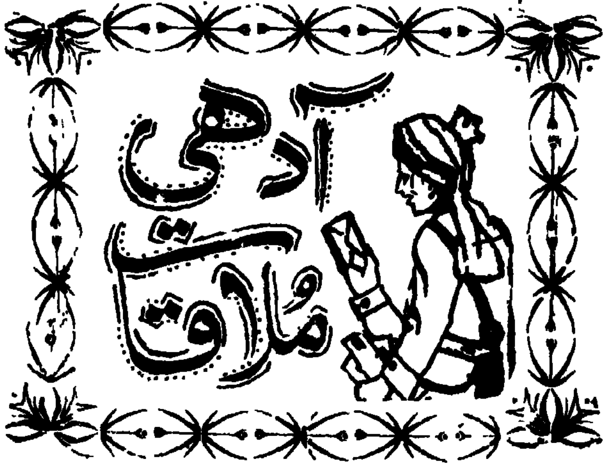
تھانہ میں "یوم مدرسین" اور بچوں کو انعامات

تھانہ: تعلیمی میدان میں ترقی کے لیے مدرسین کے مسائل پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ آج کا سماج ان کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ ان خیالات کا اظہار ضلع پریشد کے نائب صدر ایجوکیشن کمیٹی کے چیرمین مسٹر جیونت راؤ پوار نے انجمن ترقی اردو تھانہ کے زیر اہتمام منعقدہ ایک جلسہ میں کیا۔ تھانہ ضلع کی اردو ہائی اسکولوں میں سب سے اچھا رزلٹ (۵۶۱٫۹۲ فیصد) لانے پر "غلام شیخ میموریل رننگ ٹرافی" حاجی عبدالصمد مومن گرلز ہائی اسکول بھیونڈی کی پرنسپل مسز طاہرہ قریشی کے سپرد کرتے ہوئے جیونت پوار نے انھیں مبارکباد دی۔

جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک اور نعت سے ہوا۔ معتمد عمومی انجمن مسلمان، ہاشمی صاحب نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور اردو میں امتیازی نمبر حاصل کرنے والوں کو انعام دینے کا فیصلا کیا گیا۔

کھیر نگر میونسپل اسکول میں درخت اگاؤ مہم

کھیر نگر میونسپل اسکول میں درخت اگاؤ مہم کے سلسلے میں ایک پروگرام مورخہ ۸ ستمبر کو صبح ۱۱ بجے اسکول ہٰذ میں منعقد کیا گیا جس میں شری پروفیسر قاضی کونسلر وارڈ آفیسر ایچ رالیسٹ شری کلکرنی سپرنٹنڈنٹ حمیدہ دار اے۔ او/ و نمالی اور ڈاکٹر ضمیر خاں کے علاوہ، دیگر زبان کے افسران نے شرکت کی اساتذہ و بچوں کو اپنے زریں خیالات سے نوازا ساتھ ہی اس تقریب میں پریسیڈنٹ ایوارڈ یافتہ شری منصور صاحب نیشنل ایوارڈ یافتہ شریمتی راجہ بائی اور میئر ایوارڈ یافتہ شری عثمان غنی اسماعیل صاحب کو اسکول ہٰذ کی جانب سے گلہائے عقیدت پیش کیا گیا۔



نومبر ۱۹۸۲ء کا پیام تعلیم نظر نواز ہوا۔ دیکھ کر پہلے حیرت اور بعد میں کوفت ہوئی کہ بچوں کی کوشش عنوان کے تحت سید شمس العارفین رضوی (ہائی اسکول ہسپورا اورنگ آباد) نے میری اپنی تخلیق "عید مبارک" نظم کو چند ناموں کے تصرف کے ساتھ ہوبہو نقل کر کے اپنے نام سے چھپوایا ہے۔

"بچوں کی کوششیں" اس عنوان سے بچوں کی تخلیقات کا شائع کرنا نہایت مفید اور کارآمد بات ہے لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ان کی نقل نویسی اور سرقہ کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس قسم کی نقل نویسی اور سرقہ بری بات اور ان کے لیے نقصان رساں ہے۔ عزیزی شمس العارفین رضوی جیسے ننھے پیامی کو میں اس لیے مورد الزام نہیں ٹھہراتا کہ کہیں انھوں نے بعض ناموں کے تصرف کے ساتھ نقل نویسی ہی کو "بچوں کی کوشش" نہ سمجھ لیا ہو۔

• حافظ عبدالرزاق حافظ باقوی

• گورنمنٹ آرٹس کالج۔ نند نم۔ مدراس ۳۵

ماہ دسمبر کا پیام تعلیم موصول ہوا مجموعی طور پر پسند آیا کہانیوں میں "مگر مچھ کے آنسو" سید محمود نقوی کی کہانی "قصہ گوئی کا مقابلہ" اور سلطانہ واحدی کی کہانی "درخت کی گواہی" بہت پسند آئی۔ اس کے علاوہ "انعامی کوپن اور موٹر کار" اور "میرا خواب" وغیرہ بھی خوب رہیں۔

زیڈ۔ اے ذکی

ڈومن پورہ، مئوناتھ بھنجن، اعظم گڑھ

"یوم اسپیس نمبر" اور دسمبر ۸۲ء کا پیام تعلیم موصول ہو چکا ہے۔ جامعہ کے بچے اتنے ذہین و فہیم ہیں۔ مجھے حیرت ہے، اگر ہمارے بچے یوں ہی محنت کرتے رہیں تو یقیناً "بچے مستقبل کے معمار" ہوں گے۔ امید ہے کہ یہ بچے جامعہ کا نام روشن کریں گے۔ جامعہ کے تمام اساتذہ، طالب علموں کو میری طرف سے دلی مبارک باد، آپ اور آپ کا ادارہ بھی مبارکباد کے قابل ہے کہ آپ نے ان کے لیے کئی شمارے وقف کر کے ان کی ہمت افزائی کی ہے امید ہے کہ آپ اسی طرح اردو کے ساتھ تعاون کرتے رہیں گے۔

• شفیق احمد محمد صدیق

مسلم نگر سروے ۱۵۹/۷ اقبال سیٹھ کے سامنے مالیگاؤں

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا اسپیس نمبر اور نومبر کا شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ و طالبات نے جس کارکردگی کا مظاہرہ کیا وہ قابل تحسین ہے۔ نومبر کے شمارے میں "چار کٹوری چاول" "غرور کا انجام" اور "بچوں کی کوششیں" تو بے انتہا پسند آئی۔ میں تمام قلم کار اور ننھے فنکاروں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

• شیخ متین

قاضی محلہ بھوکردن، جالنہ مہاراشٹر

"پیام تعلیم" کے سبھی مضامین بہت پسند آئے۔ کارٹونی کہانی سے پیام تعلیم کا قیمتی صفحہ برباد ہوتا ہے اس لیے اس جگہ معلوماتی مضامین شائع کریں۔ ڈاکٹر معز الدین فاروقی اور ڈاکٹر اعجاز علی ارشد صاحبان کے مضامین بہت اچھے لگے۔ قلمی دوستی اور گدگدیاں ہمارے لیے بہت پسندیدہ کالم ہیں صرف سوال و جواب کے کالم کی کمی ہے۔

• شاہ عقیل الرحمن

لکھنیاوی۔ نواب کلینک، در بھنگا

بچوں کی کوشش



★ محنت کا پھل

چلو نا یار۔ دیکھو تین بجنے میں بیس منٹ رہ گئے ہیں اگر دیر ہو گئی تو پکچر نکل جائے گی۔" صغیر نے اکرم سے کہا اور دونوں رکشا کر کے ریگل ٹاکیز کی طرف چل دیے۔

جمیل جب سے اسکول میں داخل ہوا تھا وہ صغیر اور اکرم کو دیکھ رہا تھا کہ وہ دونوں روزانہ سینما جاتے ہیں۔ نت نئی شرارتیں کرتے ہیں۔ ماسٹر صاحب کا کہنا نہیں مانتے ہیں۔ دونوں محنت سے بہت جی چراتے ہیں۔ اور سال بھر شرارتیں کرتے رہتے ہیں۔ امتحان کے وقت نقل سے کام چلاتے ہیں ان کے برعکس جمیل ایک نہایت ہی ہونہار سلیقہ مند فرمانبردار اور محنتی لڑکا تھا جو ہر سال فرسٹ آتا تھا لیکن غریب تھا۔

جب امتحان کا وقت قریب آیا تو دونوں گھبرا اٹھے کہ اب کیا ہوگا۔ سال بھر اسکول میں آئے مگر ایک بھی کاپی مکمل نہ کی۔ جمیل پرسکون تھا اسے سب کچھ یاد تھا۔

ادھر صغیر کے ذہن میں ایک خیال نے جنم لیا اس نے اکرم سے کہا کہ "کیوں نہ ہم جمیل کی کاپیاں چرالیں۔" اس رائے سے اکرم خوش ہو گیا اور دوسرے دن وہ جمیل کی کاپیاں چرانے کے لیے جمیل کے گھر گیا جمیل کی امی باورچی خانے میں تھیں اس کے والد دفتر گئے ہوئے تھے اور جمیل باہر گیا ہوا تھا اکرم نے جمیل کے بستے میں سے جلدی جلدی کاپیاں نکالیں اور سڑک پر آ گیا۔ دوسری طرف سے جمیل کو آتے دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور جلدی میں سامنے سے آنے والی کار کی طرف اس کا دھیان بھی نہ گیا اور کار والا لاکھ کوشش کے باوجود اکرم کو نہ بچا سکا اور وہ کار کی زد میں آ گیا کار والے نے جمیل کی مدد سے اکرم کو کار میں ڈالا اور اسپتال لے گیا جمیل نے اکرم کے والدین کو خبر دی، وہ روتے پیٹتے اسپتال آئے۔ اچانک جمیل کی نظر اکرم کے ہاتھوں پر پڑی جس میں اس کی کاپیاں تھیں اور فوراً اس کی سمجھ میں آ گیا کہ کیا معاملہ ہے۔ صغیر بھی اکرم کو دیکھنے دواخانے آیا اکرم کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ اکرم نے جمیل کو اپنے پاس بلایا اور کاپیاں دیتے ہوئے اکھڑی ہوئی سانس میں کہا: "جم... جم... یل... مجھ... کو معا... ا... ا... ف... ک... کر..." اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ لیکن صغیر کے دل پر گہرا نقش چھوڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ برے کام کا برا نتیجہ نکلتا ہے اور محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ صغیر جمیل کے گھر گیا اس نے صغیر سے کہا: "اکرم کو چاہیے تھا کہ مجھ سے کاپیاں مانگ لیتا چوری کرنے اور جان گنوانے کی کیا ضرورت تھی۔ خیر ابھی تمھیں کاپیاں چاہیے تو لے لو۔ میں سب یاد کر چکا ہوں تم اسے لے جا کر خوب محنت کرو اور نقل مت کرنا۔ صغیر کی سمجھ میں سب آ گیا اور اس نے بچے ہوئے دنوں میں خوب محنت کی اور امتحان کے پرچے حل کیے نتیجہ کا دن آیا تو وہ مطمئن تھا کیونکہ اس نے محنت کی تھی اور اسے جمیل نے بتایا تھا کہ محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ جب پہلا نام پکارا گیا کہ صغیر احمد ولد عبدالرشید احمد

تو وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اسٹیج پر گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس کی قمیض پر سونے تمغہ لگایا۔

آپ بھی عہد کیجیے کہ محنت سے پڑھیں گے اور صغیر کی طرح پھل پائیں گے۔

● محمد شفیق الرحمان خان
موہن پورہ - ناگپور

★ "کتاب چور"

کسی شہر میں ایک بڑا خوبصورت اسکول تھا۔ جس کا نام پورے شہر میں مشہور تھا۔ اسی اسکول میں احمد نام کا لڑکا بھی پڑھا کرتا تھا۔ وہ اسکول میں سب سے زیادہ ذہین اور ہوشیار بھی تھا۔ اسے پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق تھا اسی وجہ سے پورے اسکول میں اس کے نام کا چرچا تھا۔ اپنا نام روشن ہوتے دیکھ کر اس کے دل میں اور زیادہ پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ دن بھر کچھ نہ کچھ پڑھتا ہی رہتا۔ پڑھنے لکھنے کی وجہ سے اس نے اپنا نام ایک بڑی لائبریری میں لکھوا دیا اور وہاں جاکر روز کتابیں پڑھا کرتا۔ جس کتاب میں اسے جو پیراگراف پسند آتا وہ اسے اپنی کاپی میں نوٹ کر لیتا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جارہا تھا اس کا شوق بھی بڑھتا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ پیراگراف اتارنے کے بجائے کتاب کے پورے ورق پھاڑنے لگا اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ پوری پوری کتاب لے جاکر اپنے گھر رکھنے لگا۔ ایک دن (لائبریرین) کو معلوم ہوا کہ لائبریری کی کتابیں کم ہوتی جارہی ہیں۔ تو اس نے لائبریری کے باہر ایک پہرے دار بیٹھا دیا۔ حسب معمول جب احمد لائبریری میں داخل ہوا تو پہرے دار نہیں تھا۔ لیکن جب وہ لائبریری کے باہر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک پہرے دار ہر باہر جانے والی کی تلاشی لے رہا ہے۔ احمد گھبرا گیا کیونکہ اس کے ہاتھ میں لائبریری کی کتاب تھی جو وہ چرا کر لے جارہا تھا۔ پہرے دار کی نظر اچانک احمد پر پڑی جو کتاب لیے کھڑا تھا۔ پہرے دار نے احمد کو پکڑ لیا اور لائبریرین کے پاس لے گیا۔ لائبریرین اس کی حرکت دیکھ کر بہت غصہ ہوئے اور اسے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے پاس لے گئے ہیڈ ماسٹر بھی بہت ناراض ہوئے اور اس کے گلے میں ایک تختی لٹکا دی جس پر "کتاب چور" لکھا ہوا تھا۔ احمد کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی احمد کو پورے اسکول میں گھمایا گیا۔ بچے اسے دیکھ کر ہنسنے لگے جس طرح احمد کا نام پورے اسکول میں تیزی سے بڑھا تھا اسی طرح اس کا نام بدنام بھی ہو گیا۔

● روبینہ انجم
ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی ۳

★ میری سہیلی

میری سہیلی بہت اچھی ہے۔ اس کا نام فرح ہے۔ وہ عادت کی بہت اچھی ہے۔ وہ سب سے بہت اچھی طرح بولتی ہے۔ وہ تیسری کلاس میں پڑھتی ہے۔ بڑوں کی عزت کرتی ہے۔ وہ چھوٹوں سے پیار کرتی ہے۔ وہ اوکھلا میں رہتی ہے۔ وہ مجھ سے خوش رہتی ہے۔ وہ سب سے ہمدردی کرتی ہے۔ وہ سب کی مدد کرتی ہے۔ وہ پڑھنے میں تیز ہے۔ وہ پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہے۔ وہ کبھی کسی کی چغلی نہیں کرتی ہے۔ وہ بڑی نیک ہے۔ فرح کی تین بہن اور ایک بھائی ہیں۔ اس کے پاپا کا نام ابرار احمد صاحب ہے۔ فرح بہت اچھی لڑکی ہے وہ ضرورت کے وقت میرے بہت کام آتی ہے اور وہ ہمیشہ صاف ستھری رہتی ہے وہ اپنی کلاس کو بھی صاف ستھرا رکھتی ہے۔ وہ اپنی کتابوں کاپیوں کو صاف ستھرا رکھتی ہے وہ کبھی اسکول میں غیر حاضر نہیں ہوتی وہ ہمیشہ وقت پر اور پابندی کے ساتھ اسکول آتی ہے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتی ہے۔ نہ دوسری لڑکیوں سے لڑتی جھگڑتی ہے اور کلاس میں خاموشی سے بیٹھتی ہے۔ گھر پر اپنی امی کے کام میں ہاتھ بٹاتی ہے۔ فرح کے بال بہت اچھے ہے۔ اس کو ہرن گلے بہت پسند ہیں ویسے وہ ہر چیز کھا لیتی ہے اور کسی چیز کو برا نہیں کہتی۔ اس طرح فرح میری بہت اچھی دوست ہے۔

● لبنیٰ دانی (درجہ سوم)
ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

★ دس دن کا کیمپ

اس کیمپ میں آنے سے پہلے ہمارا خیال تھا کہ یہ کیمپ کسی بورڈنگ میں لگے گا۔ اس خیال کی وجہ سردی تھی کیونکہ اس سردی میں تو ہم خیموں میں رہنے کی بابت سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ دس دن کا کیمپ تھا اس لیے سامان کافی لانا تھا۔ ہم نے سارا سامان باندھا پھر یہ سوچ کر آرام سے بیٹھ گئے کہ ابھی کوئی اسپیشل بس ہمارے سامان کو لے جانے کے لیے آئے گی مگر افسوس بہت انتظار کے بعد کوئی بس نہیں نظر آئی تو ہم بہ مشکل تمام سامان لے کر یہاں آئے یہاں سارا سامان ایک دری پر رکھوا کر ہم سے میدان کی صفائی کروائی گئی۔ پھر جب کافی حد تک میدان چٹیل نظر آنے لگا تو پھر گروپ بانٹے گئے۔ اس گروپ کے لحاظ سے ہمیں اپنا کام کرنا تھا۔ رات کے وقت لڑکیوں کے سونے کے لیے دو خیموں کا الگ انتظام تھا۔ ہم اپنے گروپ کے ساتھ کافی دیر تک کام کرتے رہے پھر کھانے کے لیے دوڑے۔ باہر میدان میں دری پر کھانے کا انتظام تھا۔ کھانے کا انتظام خاصا مشکل تھا لیکن پھر بھی بہت اچھا کھانا بنایا گیا تھا۔

پھر ہمیں آرام کے لیے آدھا گھنٹہ دیا گیا لیکن بچے آرام کرنا نہیں جانتے۔ ہم نے اس آدھے گھنٹے میں اپنے آپ کو اس ماحول سے مانوس کر لیا۔ پھر ہم کو بستر لگانے تھے اپنے گروپ کا خیمہ اور اپنا سونے والا خیمہ صاف کرنا تھا۔ بہت دیر تک ہم ایک کوٹھری سے پلنگ نکال کر لاتے رہے۔ اس پر بستر بچھاتے رہے۔ اسی درمیان "پلنگ چوری" ہوتی رہی۔ لیکن خوب مزہ آتا رہا بالکل تھکن بھی نہیں ہوئی۔

اس کے بعد چائے کا وقت تھا۔ شاید چائے میں زعفرانی پتا، ادرک، نمک اور جانے کیا کیا ڈالا گیا تھا جس سے تھوڑی چائے بدمزہ ہو گئی تھی۔ ہم نے شکایت کی۔ فوراً اس بات کو نوٹ کیا گیا اور اگلے دن سے چائے ٹھیک ملنے لگی مزہ کی بات یہ ہے کہ ساتھ میں کیلا یا بریڈ پکوڑا یا کوئی اور چیز بھی ملنے لگی۔

اس کے بعد کھیلوں کا وقت ہوتا تھا۔ اسی وقت میں والدین اپنے بچوں سے ملنے کے لیے آ سکتے تھے۔ یہ بات پہلے تو ہمیں بہت بری لگی مگر بعد میں سمجھ میں آیا کہ یہی بات ٹھیک ہے۔ والدین کے ملنے کے لیے ایک ملاقات کا کمرہ تھا۔ جس میں ملنے والے بچوں سے مل سکتے تھے

اس کے بعد ہم لوگوں کو اپنے رات کے پروگرام (کیمپ فایر) کی تیاری کرنی ہوتی تھی۔ جس میں ہر گروپ کو کوئی SKIT کچھ GROUP SONGS یا کوئی پروگرام پیش کرنا ہوتا تھا۔ ہم لوگ اپنی پوری قوت سے تیاری کرتے تھے۔ پھر کھانے کا وقت ہو جاتا تھا۔ کھانا خلاف توقع بہت اچھا دیا جاتا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد ہمارا کیمپ فایر کا پروگرام ہوتا تھا جس میں ہر گروپ کے طرف سے تھوڑا بہت پروگرام ہوتا تھا۔ کیمپ فایر بڑی پابندی سے ہوتا رہا اور تمام بچے پوری دلچسپی سے اس میں حصہ لیتے رہے۔

اس کے بعد ہم لوگ بستر میں پہنچ جاتے تھے اور ۱۰½ بجے تک لائٹ بند ہو جاتی تھی مگر ہم لوگ اندھیرے میں ہی سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہتے اور ۱۱½ بجے تک ہم خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے تھے۔

اگلے دن سے ہمیں صبح ۶ بجے اٹھایا جانے لگا یہ ایک بڑی مشکل تھی کیونکہ صبح صبح سردی میں اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر اسمبلی کے لیے ۷ بجے تک پہنچ جانا وہاں پر دو چکر لگانے کے بعد بھولتی سانس سے ترانہ پڑھنا بہت ہی مشکل ہوتا تھا۔ اس کے بعد P.T. پھر فٹبال کھیلنا اور اگر فٹ بال ناک پر لگ جائے تو برداشت کرنا تو بہت ہی مشکل کام تھا۔ مگر ہم نے کبھی شکوہ نہیں کیا۔ اکثر ہم دیر سے اٹھتے تو ہمیں پورے میدان کا چکر لگانا پڑتا تھا۔

P.T. کے بعد ہماری نظر ناشتہ کی طرف جاتی تو اعلان ہوتا کہ تمام کیمپ کاونسلر اور بچے اپنے TENT

کی صفائی کریں۔

پھر ہم لوگ صفائی کرتے اور سب کو چڑاتے کہ آج تو ہم Ist آئیں گے پھر ناشتہ ہوتا جس میں ہمیں چائے اور اس کے ساتھ کوئی اور چیز ملتی پھر ہمارے خیموں کا معاینہ ہوتا اور پچھلے دن کے معاینہ کا نتیجہ سنایا جاتا تھا۔

اگلے SESSION میں مختلف کام ہوتے کبھی کرافٹ کبھی ڈرائنگ کبھی STORYTELLING اور کبھی ڈاکومینٹری فلم دکھائی جاتی تھی۔ ایک بار ہم لوگ 'چشایر ہوم' گئے۔ وہاں ہم نے اپاہجوں کے لیے ایک ڈھائی گھنٹے کا کلچرل پروگرام کیا۔ جس سے انھیں بہت خوشی ہوئی اور وہاں کے ڈائرکٹر نے ہم سے کہا کہ آپ ہر مہینے یہاں آکر ان کے لیے اسی طرح کا پروگرام کریں۔ ایک دن ہم بستی میں گئے وہاں ہم نے بچوں کے ساتھ مختلف کھیل کھیلے اور کلچرل پروگرام کیا۔

اس کیمپ میں کاونسلر اور سب کا رویہ ہمارے ساتھ بہت اچھا رہا۔ اور بہت مزہ آیا یہ کیمپ ایک خوشگوار یاد بن کر ہمارے دل میں ہمیشہ رہے گا اور اگلی دفعہ جب NSS کا کیمپ لگے گا تو ہم اگلی دفعہ اور زیادہ دلچسپی کے ساتھ اس میں حصّہ لیں گے اور پوری پوری کوشش کریں گے کہ کیمپ اس دفعہ سے زیادہ اچھا ہو۔

● صوفیہ خاتون (درجہ ہفتم الف)

جامعہ مڈل اسکول جامعہ نگر، نئی دہلی

★ خزانہ

ایک کسان تھا جس کا نام رامو تھا۔ وہ بہت محنتی تھا۔ وہ کڑی محنت کر کے اپنے خاندان کی گزر بسر کرتا تھا رامو کے چار بیٹے تھے۔ رامو سوچتا کہ جب میرے بیٹے بڑے ہوں گے تو مجھ کو آرام ملے گا۔ لیکن اس کے سبھی لڑکے کام چور نکلے۔ اس لیے رامو بڑی فکر میں پڑ گیا۔ اس کے چاروں بیٹے اتنے کام چور تھے کہ گھر کا سارا کام بھی رامو کو خود ہی کرنا پڑتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رامو بہت بوڑھا ہو گیا اور ایک دن اچانک سخت بیمار پڑ گیا۔ جب رامو کا آخری وقت آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور کہا کہ میں نے آج تک تم سب کو اپنے خزانے کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن میں آج بتا دیتا ہوں۔ رامو نے کہا کہ میرے کھیت میں خزانہ دفن ہے۔ اتنا کہہ کر رامو مر گیا۔ رامو کے مرنے کے بعد اس کے لڑکوں نے کدال اُٹھائے اور جا کر سارا کھیت اچھی طرح کھود ڈالا، مگر خزانہ کہیں نہ ملا ہاں کھیت فصل بونے کے لیے تیار ضرور ہو گیا۔ رامو کے لڑکوں نے سمجھ لیا کہ ہمارے باپ نے ہمیں محنت کی عادت ڈالنے کے لیے یہ سبق دیا ہے۔

● سیّد ممتاز خالد (گیا)

★ سب سے بڑا بادشاہ

کشمیر میں ایک بادشاہ رہتا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس آ رہا تھا کہ ایک ہرن نظر آیا۔ بادشاہ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کا پیچھا کیا، بادشاہ کا گھوڑا البتہ تیز دوڑ رہا تھا اس کے ساتھی پیچھے رہ گئے تھے۔ بادشاہ بہت دور چلا گیا تھا مگر وہ ہرن کو پکڑ نہ سکا۔ بادشاہ کو سخت بھوک لگ رہی تھی اس نے دیکھا کہ ایک کسان ہل چلا رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کے پاس جا کر کہا میں بھوکا ہوں، کچھ ہو تو دو۔ کسان نے اپنی روٹیاں بادشاہ کو دے دیں۔ بادشاہ کھا پی کر آرام کرنے لگا۔ بادشاہ نے جاتے وقت بتایا کہ میں یہاں کا بادشاہ ہوں۔ اور تم ہمارے یہاں ضرور آنا میں تم کو انعام دوں گا۔

ایک دن کسان بادشاہ کے یہاں جانے کے لیے روانہ ہوا۔ وہ بادشاہ کے محل کے نزدیک جا کر کھڑا ہوا اور دربان سے کہا کہ میں بادشاہ سے ملنا چاہتا ہوں، دربان نے اس کو پہلے ڈانٹ دیا مگر اس پر بھی وہ نہ ہٹا تو دربان نے جا کر بادشاہ کو خبر دی۔ بادشاہ نے کسان کو بلوانے کے لیے کہا۔ کسان محل کے اندر گیا تو بادشاہ نے اس کو بٹھا دیا کیوں کہ وہ نماز پڑھنے کے لیے جا رہا تھا۔

کسان بیٹھا رہا۔ بادشاہ نے نماز پڑھی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے دعا مانگنے کے بعد بادشاہ کسان سے ملا۔ کسان نے بادشاہ سے کہا آپ ہاتھ اٹھا کر کیا مانگ رہے تھے جب کہ آپ خود بادشاہ ہیں دوسروں کو بہت کچھ دیتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا میں بادشاہ ضرور ہوں مگر دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اسی کا دیا ہوا ہے اور میں اس سے روز مانگتا ہوں۔ یہ سن کر کسان وہاں سے جانے لگا اور بادشاہ نے روکا اور جانے کی وجہ پوچھی تو کسان نے جواب دیا جب آپ خود ہی دوسروں سے مانگتے ہیں تو ہم کو کیا دیں گے ہمیں تو آپ کے انعام کی ضرورت نہیں۔ جس سے آپ مانگتے ہیں ہم بھی اسی سے مانگ لیں گے۔ کیونکہ وہ سب سے بڑا بادشاہ ہے۔

• محمد ہارون

★ پکنک

ہر سال کی طرح اس سال بھی ہماری پکنک گئی ہماری پکنک تین جگہ گئی تھی۔ پکنک جانے والوں میں پہلی کلاس سے تیسری کلاس کی لڑکیاں گئی تھیں۔ ہم اسکول سے سوا دس بجے روانہ ہوئے۔ دو بسیں گئی تھیں۔ ہم سب سے پہلے ہمایوں کا مقبرہ گئے وہاں ہم نے ہمایوں بادشاہ کی قبر دیکھی یہ بادشاہ مغل خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمایوں بادشاہ بابر کا بیٹا تھا۔ ہمایوں بہت بہادر تھا اس نے کئی تاریخی عمارتیں بنوائیں ہمایوں کا مقبرہ بہت خوبصورت بنا ہوا ہے وہاں بہت صفائی تھی۔ وہاں موسم بھی اچھا ہو گیا تھا ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی ہم سب بھیگتے ہوئے بس میں دوسری جگہ کے لیے روانہ ہوئے۔ دوسری جگہ ہم گڑیوں کے گھر گئے۔ وہاں ہم نے ملک ملک کی گڑیاں اور گڈے دیکھے۔ ہم کو سب ملکوں کے لوگوں اور ان کے لباس کے بارے میں معلوم ہوا۔ ہم کو سب ملکوں کے لوگ اچھے لگے۔ تیسری جگہ ہم بچوں کے پارک گئے، وہاں ہم نے کھانا کھایا وہاں کھیلے کودے جھولا جھولے، چیزیں کھائیں ہم کو بہت مزا آیا۔ ساڑھے چار بجے ہم واپس اسکول روانہ ہوئے۔

• سطوت خانم
مدرسۃ البنات الاسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

★ سبق

ایک بوڑھا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ اسے سنائی بھی کم دیتا تھا۔ ہاتھ، پیر کانپنے لگے تھے۔ جب وہ کھانے بیٹھتا تو بڑی مشکل سے روٹی کا ٹکڑا منہ تک لے جاتا۔ کبھی کبھی جب دال چاول، اس کے کپڑوں پر گر جاتے تھے تو اس کا لڑکا باپ کو برا بھلا کہتا تھا۔

ایک دن بوڑھے کے ہاتھ سے پلیٹ گر کر ٹوٹ گئی۔ اس پر لڑکے کی بیوی نے اسے ڈانٹا اور کھانے کے لیے ایک مٹی کا برتن الگ کر دیا۔ لیکن بوڑھے کے ہاتھ کانپنے کی وجہ سے وہ مٹی کا برتن بھی گر کر ٹوٹ گیا۔ اس پر لڑکے نے اسے بہت برا بھلا کہا اور اسے کھانے کے لیے ایک لکڑی کا برتن لا دیا۔ بوڑھے کو اپنے بیٹے کی ان باتوں سے بہت تکلیف ہوتی مگر کرتا تو کیا کرتا۔

ایک دن بوڑھے کا پوتا کھیلتے کھیلتے اس کے پاس آیا اور مٹی کے برتن کے ٹکڑے کو جوڑنے لگا۔ بوڑھے نے بچے سے پوچھا "ارے بیٹے۔ تم یہ کیا کر رہے ہو"۔

بچے نے جواب دیا۔ دادا جان میں مٹی کے برتن کے ٹکڑوں کو جمع کر رہا ہوں۔ ٹکڑے جوڑ کر برتن کو سنبھال کر رکھ دوں گا۔ میرے ماں باپ جب بوڑھے جائیں گے، تب میں ان کو اس برتن میں ہی کھلایا کروں گا۔

بچے کی بات کو سن کر اس کے ماں باپ بہت شرمندہ ہوئے اور پھر اپنے ماں باپ کی عزت کرنے لگے۔

• جاوید احمد خاں
عالم گنج، پٹنہ

★ افیمچی

ایک شہر میں ایک افیمچی رہتا تھا۔ وہ روزانہ رات کو سونے سے پہلے دودھ پیا کرتا تھا۔ مگر ہر روز اپنی بیوی سے یہی شکایت کیا کرتا تھا کہ دودھ والا بہت بے ایمان ہے اس کے دودھ میں بالکل بالائی نہیں ہوتی۔ ایک رات جب اسے دودھ پینے کے لیے ملا تو وہ بالائی دیکھنے کی غرض سے پیالے کی طرف جھکا اور اتفاق سے اس کی سفید پلودار ٹوپی دودھ میں گر گئی اور اسے افیم کی پنک میں ٹوپی گرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ افیمچی نے پیالے کو یہ کہتے ہوئے رکھ دیا کہ ابھی دودھ بہت گرم ہے ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو پیوں گا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دودھ کا پیالہ منہ سے لگایا تو اس کی ٹوپی اس کے منہ میں آگئی اور بہت خوش ہو کر بولا: واہ کیا بالائی ہے اور ٹوپی کو بالائی سمجھ کر کھا گیا۔

● نواب عتیق اطہر زاہدی
رانی گنج، بردوان

★ "سوا لاکھ کی انگوٹھی"

کسی ملک میں ایک راجا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے ملک میں یہ اعلان کرا دیا کہ جو بھی شخص میری سالگرہ کے موقع پر سب سے بڑا جھوٹ بولے گا اسے سوا لاکھ کی ایک انگوٹھی دی جائے گی۔ جس روز راجا کی سالگرہ تھی ملک کے چھوٹے بڑے امیر و غریب سب ہی اس جشن میں شریک ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے اپنی اپنی جھوٹی باتیں سنائیں لیکن راجا نے تمام باتوں کو سچ کہا۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ میں نے گیہوں کا ایک پودا دیکھا۔ وہ پودا پانی کی سطح پر سیدھا کھڑا تھا۔ میں اس پودے کے بالائی سرے پر ۲۴ گھنٹے تک کھڑا رہا۔ راجا نے یہ سنتے ہی کہا "سچ ہے" سب لوگ راجہ کا فیصلہ سن کر حیرت میں پڑ گئے اور راجہ کے خلاف آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔ کچھ لوگ بددل ہو کر وہاں سے چلے گئے۔

ان لوگوں میں ایک ایسا لڑکا بھی تھا جو بڑا عقل مند تھا۔ اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور اس نے کہا: "مہاراج! اب مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت ہو تو عرض کروں۔" راجا نے کہا "سناؤ"۔ "مہاراج!" لڑکے نے کہنا شروع کیا "آپ کے والد صاحب نے میرے والد صاحب سے مرتے وقت ڈھائی لاکھ روپے قرض لیا تھا۔ اگر سچ ہے تو ڈھائی لاکھ روپے دیجیے جھوٹ ہے تو سوا لاکھ کی انگوٹھی"

راجا یہ سن کر بہت شرمندہ ہوا اور کہا۔ میرے والد صاحب راجا تھے اور تمہارا باپ ایک غریب مزدور کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ڈھائی لاکھ روپے قرض لیے ہوں۔ میرے والد نے تو لاکھوں روپے مزدوروں میں اسی طرح تقسیم کر دیے تھے۔ میں یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ یہ سچ ہے، یہ سراسر جھوٹ ہے۔"

راجا کے اس فیصلے کے بعد فوراً اس لڑکے کے گلے میں پھولوں کی مالا ڈال دی گئی اور اس کی انگلی میں سوا لاکھ کی انگوٹھی پنہا دی گئی۔

● محمد علی ظفر
کلٹی، بردوان

★ بہادر لڑکا

ایک لڑکا جنگل میں گھوم رہا تھا اور اپنا راستہ بھول گیا۔ وہ جنگل اونچی پہاڑیوں پر تھا۔ چاروں طرف ڈھونڈنے پر جب اسے پگڈنڈی نہیں دکھائی دی تو اس نے پیڑ سے ایک ٹہنی توڑی اور ایک طرف چلنے لگا اور تھوڑا سستانے کے لیے ایک پیڑ کے نیچے لیٹ گیا۔ اچانک اس نے پیڑ کے اوپر رینگتے سانپ کو دیکھا۔ اس پیڑ پر ایک گھونسلہ تھا اور اس میں چڑیا کے بچے تھے۔ سانپ

سانپ کو دیکھتے ہی چڑیا کے بچّے مدد کے لیے چلّانے لگے۔ لیکن وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ تھا۔ تب سانپ نے پھنکار بھری اور اپنے پھن کو پھیلا کر زبان باہر نکالی اور گھونسلے کے قریب پہنچ گیا۔ پہلے تو لڑکا گھبرایا مگر چڑیوں کے بچوں پر اسے ترس آگیا۔ اس نے ہمت کی، اپنی چھڑی اٹھائی اور سانپ پر وار کیا۔ سانپ جو پیڑ سے لپٹا ہوا تھا اپنے کو الگ کیا اور بچے پر حملا کر دیا۔ وہ سانپ بہت لمبا موٹا اور طاقتور تھا۔ وہ لڑکے پر حملہ کرنے لگا مگر لڑکے نے ایسا وار کیا کہ سانپ کا کام تمام ہو گیا۔ وہ لڑکا دو بارا جھاڑی کے نیچے لیٹ گیا اور گہری نیند سو گیا۔ اچانک تیز ہوا چلنے لگی سب جانور اپنے گھونسلوں میں دبک کر بیٹھ گئے۔ لڑکا بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ بڑی سی چڑیا پیڑ پر گھونسلے کی طرف آرہی ہے۔ لڑکے کو دیکھ کر وہ خوفناک آواز میں بولی "ہو۔ او۔ او۔ میں اس آدمی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی۔ "ممی۔ ممی بچے چلائے۔" اس لڑکے نے ہمیں سانپ سے بچایا ہے۔ اس بات کو سن کر وہ چڑیا زمین پر اتری اور اپنے بڑے بڑے پروں کو پھیلا کر لڑکے کو ڈھک لیا۔ جس سے ہوا اور بارش سے بچ گیا۔ لڑکا ڈر گیا۔ چڑیا بولی۔ "تم نے میرے بچوں کی جان بچائی ہے۔ اب جو تم چاہو وہ میں کروں گی۔" لڑکا فوراً بولا۔ "مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ چڑیا نے کہا۔ "میرے پیچھے پیچھے آؤ" اور اس طرح چڑیا نے اس لڑکے کو اس کے گھر پہنچا دیا

• فوزیہ افضال
مظفر نگر

★ جھوٹ

آصف یوں تو بڑا اچھا لڑکا تھا۔ اس میں بس ایک خامی تھی، جھوٹ بولنے کی۔

گرمیوں کی دوپہر تھی۔ اسکول الگ بند تھا۔ لہٰذا حضرت گھر میں بور ہو رہے تھے۔ یکایک آصف کو خیال آیا کیوں نہ فلم دیکھی جائے۔ تفریح بھی ہو جائے گی اور تھوڑی دیر گرمی سے بھی نجات مل جائے گی۔ مگر سوال پیسوں کا تھا۔ یکایک ایک ترکیب سمجھ میں آگئی اور وہ سیدھا امی کے پاس پہنچا اور بولا "امی! مجھے کچھ روپے چاہئیں۔"

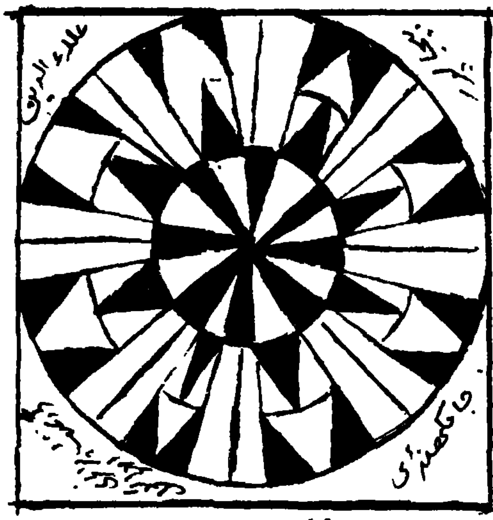
"کیوں کیا کام ہے روپوں کا؟" امی نے پوچھا۔

"امی، ماموں جان سے ملے بہت دن ہو گئے ان سے ملنے جانا چاہتا ہوں" آصف نے بڑے ادب کے ساتھ کہا۔ امی بولیں۔

"ضرور جاؤ بیٹا مگر کہیں سینما دیکھنے نہ بیٹھ جانا۔" "نہیں نہیں توبہ کیجیے فلموں سے" آصف نے انھیں اطمینان دلایا۔ آصف نے امی سے روپے لیے اور سیدھے سینما گھر پہنچے اور مزے سے فلم دیکھی۔ گھر جو لوٹے تو دیکھا ماموں جان وہاں موجود تھے۔ ان کو دیکھتے ہی پیر تلے کی زمین نکل گئی۔ ڈرتے ڈرتے ماموں جان کو سلام کیا تو انھوں نے پوچھا "بیٹا کہاں تھے؟"

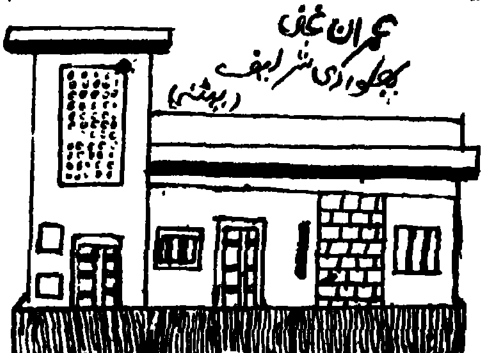
"جی آپ سے ملنے گیا تھا مگر آپ گھر پر نہیں تھے۔" "میں گھر پر نہیں، سینما دیکھنے گیا تھا لہٰذا تم مجھ سے ملنے سینما گھر پہنچ گئے!" ماموں جان نے کہا۔ اب تو آصف کی حالت دیکھنے کے قابل تھی یہ عالم تھا کہ کاٹو تو خون نہیں بدن میں آصف خوب جانتا تھا کہ معافی مانگنے میں ذرا بھی دیر ہوئی تو امی اس کی اچھی طرح خبر لے لیں گی۔ لہٰذا ماموں سے معافی مانگ لی اور وعدہ کیا کہ پھر کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔

• شاہد سعید
بمبئی ۳





تکھیے: کون سی تصویر پہلے انعام کی مستحق ہے











بچّے کی بھلائی
عورت کا احترام
مُلک کی شان



ننھا پودا بنتا گلشن
کل کی جوانی آج کا بچپن
بچّہ مُلک کا پاسدار ہے
اس پر مُستقبل کا بار ہے

نئے 20 نکاتی پروگرام کے تحت بچوّں کی صحت، بھلائی اور مربُوط نشو ونما کا ایک پروگرام چلایا جا رہا ہے۔

ماں، بچّے کو محض جنم ہی نہیں دیتی بلکہ اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار بھی ہے۔ اس طرح وہ صحیح معنوں میں ملک کی معمار ہے۔

عورت اور بچوّں کی فلاح پر ہی ملک کی بہبودی کا دار ومدار تحفّظ کا انحصار ہے۔ اس لیے بچوّں کی بھلائی اور عورت کی توقیر و احترام کے لئے اس پروگرام میں ایک نئی روح پھونکی جا رہی ہے۔

بچّے کو پُر غذا خوراک تبھی میسّر ہوگی
جب کُنبہ مختصر ہو

davp 82/449

تفصیلی معلومات کے لئے اس کوپن کا استعمال کیجئے:

ڈپٹی ڈائریکٹر،
ماس میلنگ یونٹ،
ڈائریکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژول پبلسٹی،
"بی" بلاک، کستوربا گاندھی مارگ،
نئی دہلی 110001
نئے 20 نکاتی پروگرام کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لئے براہ کرم مجھے اُردو/ہندی/انگریزی میں کتابچے روانہ کریں۔

نام ______________

پتہ ______________

____

پن کوڈ نمبر ______________

نیا 20 نکاتی پروگرام





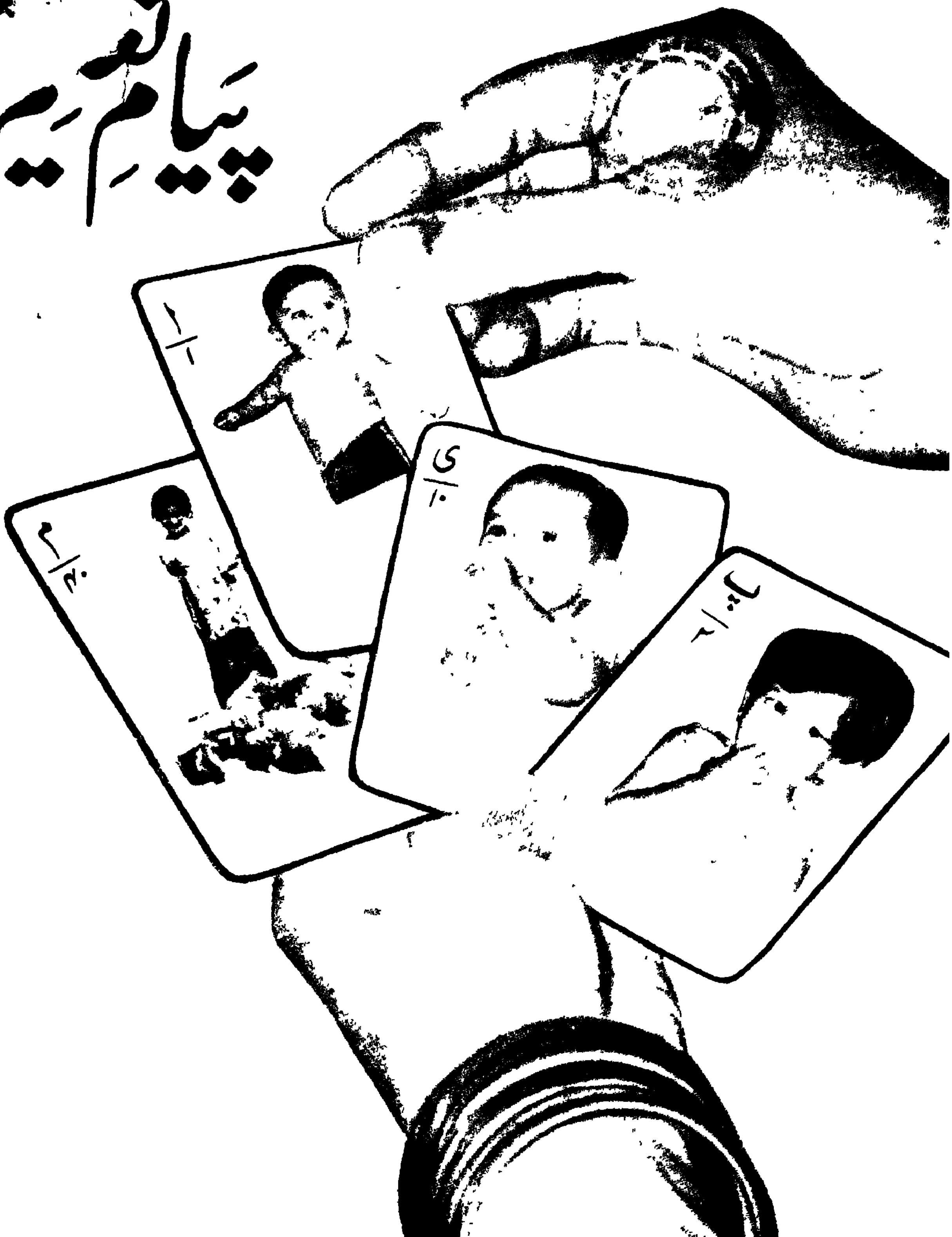
Regd No. D(SE)-043 Jan. 1983

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی ۲

پیام تعلیم



ماہنامہ
پیامِ تعلیم
نئی دہلی

فروری ۱۹۸۳ء　جلد ۲۰　شمارہ ۲

اڈیٹر: ولی شاہجہاں پوری

قیمت فی پرچہ: ۱/۷۰

سالانہ ۱۶ روپے

غیر ممالک سے ۷۵ روپے

بچوں سے باتیں

جنوری کے شمارے میں پریس میں ایک غلط فہمی کی بنا پر سردار احمد صاحب کا ایک مضمون "بچوں کے ایک عظیم شاعر" شامل ہونے سے رہ گیا۔ غلطی یہ ہوئی کہ مضمون کا صفحہ تو نکال لیا گیا مگر فہرست میں نام رہنے دیا گیا۔ اس کی وجہ سے سردار احمد صاحب کو شکایت کا موقع ملا۔ شکایت بجا تھی اور ہمیں اس کا افسوس ہے۔ اس شمارے میں یہ مضمون شامل کیا جا رہا ہے۔

اس شمارے میں "نخچیر" کے عنوان سے ایک معلوماتی مضمون پڑھیے۔ یہ طبی مضمون ڈاکٹر سنجیو رائے اگروال کا ہے جو ہماری بزم میں پہلی بار شریک ہوئے ہیں۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے شکریے کے ساتھ اسے شائع کر رہے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا۔

ناول "دوشکاری" کی دوسری قسط بھی شریکِ اشاعت ہے۔ کہانیوں میں "ایک شیر ایک ہرن" (سید فتح علی انوری) اور "ایک غریب مچھیرا" (لیوٹالسٹائی) بھی دلچسپ ہیں۔ ان کے علاوہ حفیظ حارث صاحب کی "بھینس" دلچسپ ہے۔ جاوید احمد خاں صاحب کی کہانی بھی سبق آموز ہے۔ محمد زبیر آفاق صاحب نے کیلنڈر کی تاریخ لکھ کر آپ کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔

حصۂ نظم میں لمبے عرصے کے بعد خالد رحیم صاحب دلچسپ قوالی سے آپ کی تفریح کا سامان لے کر ہماری بزم میں پھر شریک ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ نورالعین علی کی نظم "شبری کے بیر" اور الف قدم کی "جاڑا" بھی اچھی نظمیں ہیں۔ یقیناً آپ کو پسند آئیں گی۔

... نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا



قوالی



ل رحیم

پہلا گروپ: سدا اپنے ٹیچر کی عزت کرو تم
کتابوں سے اپنی محبت کرو تم
بھلائی کا رستہ دکھاتے ہیں ٹیچر
برائی سے تم کو بچاتے ہیں ٹیچر
سنو بات ٹیچر کی تم دل لگا کے
پڑھو دھیان سے جو پڑھاتے ہیں ٹیچر
پڑھائی لکھائی میں محنت کرو تم
سدا اپنے ٹیچر کی عزت کرو تم

دوسرا گروپ: سنیں ٹیچروں کی نصیحت کہاں تک
اٹھاتے رہیں ہم مصیبت کہاں تک
ابھی دل کے معنی "کنواں" کہہ رہے ہیں
ابھی اس کو "اچھا" بتاتے ہیں ٹیچر
کبھی سن کو سورج، کبھی سن کو بیٹا
سبق اتنا مشکل پڑھاتے ہیں ٹیچر
کریں ٹیچروں کی شکایت کہاں تک
اٹھاتے رہیں ہم مصیبت کہاں تک

پہلا گروپ: جو ٹیچر کی باتوں کو سنتے نہیں ہیں
وہ بچے کبھی آگے بڑھتے نہیں ہیں
سدا فیل ہو کر بہاتے ہیں آنسو
جو محنت سے دن رات پڑھتے نہیں ہیں
پڑھائی میں دن رات محنت کرو تم
سدا اپنے ٹیچر کی عزت کرو تم

دوسرا گروپ: جو بی یو ٹی "بٹ" ہے تو پی یو ٹی "پٹ" کیوں؟
اگر بٹ ہے جائز تو پھر پٹ بھی بولیں
اگر پٹ روا ہے تو پھر بٹ نہیں کیوں؟
تلفظ بدلنے کا کچھ راز کھولیں
سنے کوئی دن بھر ہدایت کہاں تک
اٹھاتے رہیں ہم مصیبت کہاں تک

پہلا گروپ: کرو اچھی باتیں، بنو اچھے انساں
جو کہتے ہیں ٹیچر سنو دل لگا کے
کتابوں سے تم کو ملے گی ہدایت
تم اپنی کتابیں پڑھو دل لگا کے
کبھی ٹیچروں سے نہ حجت کرو تم
سدا اپنے ٹیچر کی عزت کرو تم

دوسرا گروپ: یہ ہوتی ہے سب کی لڑکپن میں حالت
کیا کرتے ہیں ٹیچروں کی شکایت
ہماری شکایت سے یہ مت سمجھنا
ہمارے دلوں میں نہیں قدر و عزت
ہمیشہ ہی ہم اُن کی عزت کریں گے
کتابوں سے اپنی محبت کریں گے

۴۔ بخشی بازار، کٹک ۷۵۳۰۰۱

لیو ٹالسٹائی

ایک غریب مچھیرا

سمندر کے قریب ایک مچھیرے کی چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ اس جھونپڑی میں مچھیرے کی بیوی بیٹھی ہوئی پرانے بادبان کی مرمت کر رہی تھی۔ جھونپڑی میں ایک طرف آگ جل رہی تھی تاکہ جھونپڑی گرم رہے اور بچوں پر باہر کی سردی کا اثر نہ ہو۔ جھونپڑی کے باہر گھپ اندھیرا بھی تھا اور سخت سردی بھی۔ تیز ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ کیوں کہ سمندر میں طوفان آیا ہوا تھا۔ لیکن جھونپڑی کا اندرونی حصہ گرم تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ جھونپڑی لکڑی کے مضبوط تختوں سے اس طرح بنائی گئی تھی کہ ہوا اندر نہ آسکے۔ یہ خاصی مضبوط بھی تھی تاکہ سمندر کی تیز ہواؤں اور طوفان کا مقابلہ کر سکے۔ پھر جھونپڑی کے اندر آگ بھی جل رہی تھی۔ جھونپڑی کا فرش کچا تھا۔ لیکن مچھیرے کی بیوی اس فرش کو لیپ پوت کر صاف ستھرا رکھتی تھی۔ اس مچھیرے کے پانچ بچے تھے۔ یہ سب اس وقت جھونپڑی کے ایک کونے میں بچھے ہوئے پلنگ پر آرام سے سو رہے تھے۔ مچھیرے کی بیوی کا نام زینا تھا۔ زینا ابھی تک جاگ رہی تھی۔ کیوں کہ مچھیرا صبح سے اپنی کشتی میں بیٹھ کر مچھلیاں پکڑنے سمندر میں گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔

مچھیرا ہر روز صبح سویرے مچھلیاں پکڑنے اسی طرح سمندر میں دور تک نکل جاتا تھا۔ کبھی کبھی اس کی واپسی میں دیر بھی ہو جاتی تھی۔ زینا کو معلوم تھا کہ مچھلیاں پکڑنا آسان کام نہیں، اسی لیے جب مچھیرے کو دیر ہو جاتی تو اسے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن آج وہ پریشان تھی باہر طوفان جو تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کے غریب شوہر کو اپنی جان کی بھی پروا نہیں۔ وہ اتنی سخت سردی اور طوفان میں بھی اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ اسی وقت جھونپڑی کی دیوار میں لگی ہوئی گھڑی نے دس بجائے اب زینا کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ بے چارا غریب مچھیرا صبح سے شام تک سخت محنت کرتا ہے۔ وہ خود بھی دن بھر کام میں لگی رہتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی آمدنی اتنی نہیں ہوتی تھی کہ وہ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ آرام سے زندگی گزار سکیں۔ ان کی آمدنی اتنی کم تھی کہ وہ اپنے بچوں کے لیے جوتے نہیں خرید سکتے تھے چناں چہ ان کے بچوں کو سردی ہو یا گرمی ہو یا برسات ہر موسم میں ننگے پیر گھومنا پڑتا۔ لیکن زینا تو اس بات پر خدا کا شکر ادا کرتی کہ اس کے بچوں میں سے کوئی بیمار نہیں ہے اور پانچوں بچے تن درست ہیں۔

اپنے شوہر کے بارے میں زینا کی فکر اب بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ غریب مچھیرا اس طوفان میں کہاں ہو گا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ خدا سے دعا مانگتی کہ اللہ تو ہی مچھیرے کی حفاظت کرنا۔ دس تو بج ہی چکے تھے بچے سو چکے تھے، زینا چاہتی تو خود بھی سو جاتی۔ لیکن ابھی اس کے سونے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ اس نے پھٹا ہوا بادبان دیا

بشکریہ نونہال کراچی

تہہ کرکے ایک طرف رکھ دیا۔ ایک موٹی سی چادر اوڑھی، دوسری لالٹین جلائی اور جھونپڑی کا دروازہ کھول کر



وہ باہر نکل آئی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ طوفان کم ہوا یا نہیں۔ سمندر پُرسکون ہوا یا اب بھی طوفان میں گھرا ہوا ہے۔ لائٹ ہاؤس پر جہازوں کو راہ دکھانے والی لائٹ اب تک جل رہی ہے یا نہیں۔ وہ لالٹین کی روشنی میں مچھیرے کی کشتی دیکھنا چاہتی تھی لیکن باہر اتنا گھپ اندھیرا تھا کہ اسے کوئی چیز نظر نہ آسکی۔

زینا کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ پھر اچانک اُسے خیال آیا کہ اُسے تو اپنے پڑوس میں بھی جانا تھا پڑوس کی جھونپڑی میں ایک غریب بیوہ عورت رہتی تھی۔ زینا کو معلوم تھا کہ ان دنوں اس کی پڑوسن بیمار بھی ہے۔ تھوڑی دیر پڑوسن کے پاس بیٹھ کر وہ پڑوسن کا دل بہلا سکتی ہے۔ یہ سب کچھ دل ہی دل میں سوچ کر وہ پڑوسن کی جھونپڑی کی طرف چل دی۔ جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ آخر زینا دروازہ کھول کر جھونپڑی میں داخل ہوگئی۔ اس جھونپڑی میں گھپ اندھیرا

تھا ـــــ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اندر سخت سردی بھی تھی۔ زینا نے لالٹین کی بتی اونچی کی تاکہ اس کی روشنی میں وہ یہ دیکھ سکے کہ وہ بیمار عورت کہاں لیٹی ہے؟

بیمار عورت دروازے کے سامنے ہی ایک چھوٹے سے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ بالکل خاموش اور بے سُدھ پڑی تھی۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ چہرے کا رنگ دُھلی ہوئی چادر کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ پلنگ سے نیچے لٹک رہا تھا۔

زینا کو اندازہ ہوگیا کہ وہ بیمار عورت مرچکی ہے۔ زینا کچھ اور آگے بڑھی تو اسے اسی پلنگ پر اس عورت کے دونوں بچے بھی سوتے ہوئے نظر آئے۔ دونوں کے گھونگریالے بال اب زینا کو صاف نظر آرہے تھے۔ دونوں بڑے معصوم اور پیارے بچے تھے۔ دونوں ایک گرم شال اور اپنی ماں کے پھٹے پرانے لباس میں اس طرح لپٹے ہوئے تھے کہ سونے میں ان کے جسم نہ کھل جائیں اور انھیں سردی نہ لگے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی ماں نے مرتے مرتے بھی انھیں سردی سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ اسی لیے بچے اطمینان سے سو رہے تھے۔ انھیں تو شاید یہ بات معلوم بھی نہ تھی کہ اب ان کی ماں ہمیشہ کے لیے اُن سے چھوٹ چکی ہے۔

زینا نے عورت پر ایک چادر ڈالی۔ بچوں کو اپنی چادر میں اچھی طرح لپیٹا اور اپنے گھر لے آئی اور دونوں بچوں کو اپنے بچوں کے ساتھ سلا دیا۔ پلنگ کے سامنے اس نے ایک پردہ ڈال رکھا تھا۔ پڑوسن کے دونوں بچوں کو پلنگ پر سلاتے ہی اس نے پردہ کھینچ دیا۔ اب باہر سے آنے والوں کو آسانی سے اندازہ نہیں ہوسکتا کہ اس پلنگ پر کتنے بچے سو رہے ہیں۔ زینا پڑوسن کے بچے تو خیر لے ہی آئی تھی اور انھیں اپنے بچوں کے ساتھ سلا بھی دیا تھا لیکن اب وہ پریشان ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی اس کا شوہر نہ جانے اس بات کو پسند کرے گا یا نہیں۔ کیوں کہ خود ان کے اپنے بچوں

کے لیے ٹھیک طرح سے کھانے پینے کی چیزیں میسر نہیں تھیں۔ اب ان بچوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے تو اور تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ یہی سوچتے سوچتے وہ آگ کے قریب بیٹھ گئی۔

زینا کو آگ کے قریب بیٹھے بیٹھے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ باہر آہستہ آہستہ موسم بدلنے لگا تھا۔ طوفانی ہوائیں ختم ہو چکی تھیں۔ آسمان میں تارے چمکنے لگے تھے۔ اُسی وقت جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر آ گیا۔ یہ ایک لمبا آدمی تھا۔ اس کا رنگ جھلسا ہوا تھا۔ اُس نے اپنا اوورکوٹ اُتارتے ہوئے کہا۔

"میں آ گیا ہوں زینا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ تم آ گئے۔" زینا نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے کہا۔

"آج تو موسم بڑا خراب تھا۔" مچھیرے نے کہا۔ "آج میں ایک بھی مچھلی نہ پکڑ سکا۔ بس یہی بڑی خوش قسمتی ہے کہ میں زندہ گھر لوٹ آیا۔ ہاں تم بتاؤ یہاں تمھارا کیا حال رہا۔ تم کیا کرتی رہیں۔ تمھارا وقت کیسے گزرا؟"

"میں ...... ا" زینا نے کہا۔ اب اس کی رنگت اور زیادہ پیلی پڑ گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پڑوسن کے ان دو بچوں کے بارے میں کیسے بتائے۔ کہیں مچھیرا ناراض نہ ہو جائے۔ لیکن پھر ہمت کر کے کہا: "میں پرانا بادبان سیتی رہی۔ وہ بہت زیادہ پھٹا ہوا تھا۔ تمھارے لیے میں بہت زیادہ پریشان تھی۔" اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔ ذرا سی دیر رک کر اُس نے دوبارہ کہا۔

"وہ ہماری پڑوسن تھی نا جو بہت دن سے بیمار تھی"..

"تمھی کیا مطلب، کیا ہوا اسے؟" مچھیرے نے پوچھا۔

"وہ بے چاری مر گئی۔ بے چاری بڑے دکھ میں مری۔ اپنے چھوٹے چھوٹے دو بچوں کے لیے بڑی بے چین رہتی تھی۔" زینا اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔

مچھیرے نے زینا کی بات خاموشی سے سنی۔ اُس کے چہرے کی رنگت اور زیادہ دھندلا گئی۔ اُسے اپنے پڑوسن کے مرنے پر بہت دکھ ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ ایسے بیٹھا اور زینا کو ایسے دیکھتا رہا جیسے اُس کی سمجھ میں نہ آیا ہو کہ زینا نے کیا کہہ دیا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے چہرے کی رنگت اپنے معمول پر آ گئی۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں اور وہ کچھ سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گردن اُٹھائی اور زینا سے کہا۔

"زینا، ہمیں اُن دونوں بچوں کو اپنے پاس لے آنا چاہیے۔ ہم لوگ کسی نہ کسی طرح زندگی گزار لیں گے۔ ان بچوں کو بھی پال لیں گے۔ جاؤ زینا، تم جلدی جاؤ اور ان بچوں کو لے آؤ۔"

زینا نے مچھیرے کی باتیں سنیں۔ اُسے بڑی خوشی ہوئی کہ دونوں معصوم بچوں کے متعلق اُس نے جو فیصلہ کیا وہی فیصلہ مچھیرے نے بھی کیا ہے۔ مچھیرا بھی غریب ہونے کے باوجود ہمدرد ہے۔ اُس نے مسکرا کر مچھیرے کی طرف دیکھا۔ لیکن اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ بچوں کو لانے کے لیے اُٹھی نہیں۔ مچھیرے نے جب دیکھا کہ زینا اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی ہے تو اس نے کہا:

"کیا بات ہے زینا، تم گئیں نہیں۔ کیا تم اُن معصوم بچوں کو لانا نہیں چاہتیں۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

اب زینا اپنی جگہ سے اُٹھی اور جھونپڑی کے کونے میں بچھے ہوئے پلنگ کے سامنے کا پردہ ہٹاتے ہوئے اُس نے پلنگ کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

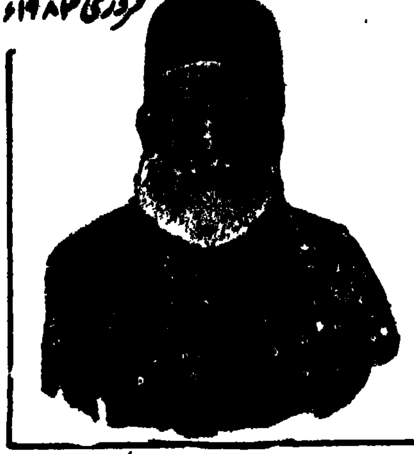
"وہ دونوں یہاں ہیں۔ میں پہلے ہی انھیں یہاں لا چکی ہوں۔"

اب مچھیرے نے بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر دونوں بچوں کو دیکھا وہ دونوں اب بھی بے خبر سو رہے تھے۔

یاد رکھیے

بچوں کی کوششیں میں اب صرف ان بچوں کی کہانیاں شائع ہوں گی جو اپنے نام کے ساتھ اپنی عمر بھی لکھیں گے۔

اڈیٹر



احمد (علیگ)

بچّوں کے ایک عظیم شاعر

بچّو! آپ نے محمد اسماعیل میرٹھی کا نام ضرور سُنا ہوگا جنھوں نے بچّوں کے لیے بچّوں ہی کی زبان میں بڑی پیاری، دل نشیں اور نصیحت آمیز نظمیں لکھی ہیں وہ اُن کی دل چسپی۔ مذاق اور پسند و ناپسند سے خوب واقف تھے۔ اتنا عرصہ گزرنے پر آج بھی اُن کی نظمیں بچّوں کے لیے پہلے ہی جیسی مفید، پُرکشش اور پُرتاثیر ہیں۔ "پیامِ تعلیم" پڑھنے والے بچے اپنے اِس عظیم شاعر کی زندگی اور شاعری کے اِس مختصر تعارف کو پڑھ کر یقیناً خوش ہوں گے۔

محمد اسماعیل صاحب میرٹھ میں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے سترہ سال کی عمر ہی سے ملازمت کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ اپنی قابلیت و صلاحیت کی بدولت آپ ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ اس سلسلے میں آپ کا قیام سہارن پور اور آگرہ میں بھی رہا۔ ۱۸۹۹ء میں آپ ملازمت چھوڑ کر مستقل طور سے میرٹھ میں اپنے گھر ہی پر آ گئے۔ ۱۹۱۷ء میں آپ نے اِس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔

اسماعیل میرٹھی کی نظموں میں بچّوں کے لیے بہترین انسان بننے اور بہترین اخلاق و کردار کا مالک ہونے کی دعوت ہے۔ زبان میں مٹھاس، سادگی و سلاست اور بچّوں کی سی معصومیت ہے جو دل کو موہ لیتی ہے۔ ان کی اپنی زندگی بھی انھیں خوبیوں سے عبارت تھی۔ وہ ایک صوفی منش انسان تھے، جن کے دل میں سب کی محبت تھی۔

آپ کی نظموں میں درویشانہ انداز اور قدرت کی حکمت و دانائی کو سمجھنے کی جستجو ملتی ہے۔ اِس قسم کی نظموں میں ایک نظم ہے۔ "ایک لڑکی بگھارتی ہے دال"۔ اسماعیل صاحب نے دکھایا ہے کہ ایک لڑکی دال بگھار رہی ہے اور دال اُس سے اپنی بپتا سُناتی ہے کہ کس طرح اُس کے ہرے بھرے کھیت سے اُس کو ظالم کسان نے جُدا کیا اور اُس کی آزادی چھین کر اُسے دال منڈی تک پہنچا دیا چند شعر کا آپ بھی لطف اُٹھائیں۔

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال — دال کرتی ہے عرض یہ احوال
ایک دن تھا ہری بھری بستی میں — ساری آفات سے بری بستی میں
تھا ہرا کھیت میرا گہوارا — وہ وطن تھا مجھے بہت پیارا
مینہ برستا تھا، جھونکے آتے تھے — گودیوں میں مجھے کھلاتے تھے
یہی سورج زمیں تھے ماں باوا — مجھ سے کرتے تھے نیک برتاوا
جب کیا مجھ کو پال پوس بڑا — آہ ظالم کسان آن پڑا
کیا بتاؤں کہاں کہاں کھینچا — دال منڈی میں مجھ کو جا بیچا

آگے دال اپنے حالات بتاتی ہوئی کہتی ہے کہ دال منڈی میں اُس کے ساتھ یہ سلوک ہوا۔

ایک ظالم سے واں پڑا پالا — جس نے چکّی میں مجھ کو دل ڈالا
ہوا تقدیر کا لکھا پورا — دونوں پاٹوں نے کر دیا چورا

اُس کے بعد دال کو بنیے نے خریدا اور چھان پھٹک کر مٹکے میں بند کر دیا۔ بنیے کے مٹکے سے نکل کر دال اُس لڑکی کے گھر آ گئی جو اُسے بگھار رہی ہے، دال کہتی ہے ؎

بشکریہ سہ ماہی "اکائی" اٹاوہ۔ یو پی

پھر مقدر مجھے یہاں لایا　　تم نے تو اور بھی غضب ڈھایا
کھال کھینچی الگ کیے چھلکے　　زخم کیوں کر ہرے نہ ہوں دل کے
ڈالیں مرچیں، نمک لگایا خوب　　رکھ کے چولھے پہ جی جلایا خوب

دال جب اپنی پریشانی اور تکلیف بیان کر چکی تب لڑکی نے اُسے جو جواب دیا۔ اس میں اسماعیل میرٹھی صاحب نے زندگی کی پریشانیوں کا راز بیان کیا ہے لیکن اس طرح کہ بچّوں کی سمجھ میں آسکے۔

کہا لڑکی نے میری پیاری دال　　مجھ کو معلوم ہے ترا سب حال
تو اگر کھیت سے نہیں آتی　　خاک میں مل کے خاک ہو جاتی
یا کوئی گائے بھینس چر لیتی　　پیٹ میں اپنے تجھ کو بھر لیتی
میں تو رتبہ ترا بڑھاتی ہوں　　اب جیالی سے تجھ کو کھاتی ہوں
نہ ستانا نہ جی جلانا تھا　　یوں تجھے آدمی بنانا تھا

اگلی بیتی کا تو نہ کر کچھ غم
مہربانی تھی سب نہ تھا یہ ستم

مناظرِ قدرت، حسین موسموں اور بچّوں کی روزمرّہ دلچسپ چیزوں، جانوروں، پرندوں اور کیڑوں پر بھی اسماعیل صاحب نے بڑی خوب صورت نظمیں کہی ہیں جو بچے بڑی آسانی سے یاد کر لیتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک نظم "بچّہ اور جگنو" بھی ہے جو یوں شروع ہوتی ہے۔

سناؤں تمھیں بات، اک رات کی
کہ وہ رات اندھیری تھی برسات کی
چمکنے سے جگنو کے تھا اک سماں
ہوا میں اُڑیں جیسے چنگاریاں
پڑی ایک بچّے کی اُن پر نظر
پکڑ ہی لیا ایک کو دوڑ کر
چمک دار کیڑا جو بھایا اُسے
تو ٹوپی میں جھٹ پٹ چھپایا اُسے

جگنو نے بچّے سے التجا کی کہ اُسے آزاد کر دیا جائے۔ لیکن بچّے نے بڑی معصومیت کے ساتھ جگنو سے کہا۔

کروں گا نہ آزاد اُس وقت تک　　کہ میں دیکھ لوں دن میں تیری چمک

جگنو نے جواب دیا۔

چمک میری دن میں نہ پاؤگے تم　　اُجالے میں ہو جائے گی وہ تو گم

لیکن بچّہ اس بات پر اصرار کرتا رہا کہ وہ دن کی روشنی میں جگنو کی چمک کا راز معلوم کرے گا۔

آخر میں جگنو کی زبان سے اسماعیل میرٹھی صاحب نے یہ نصیحت آمیز جواب کہلایا ہے۔

یہ قدرت کی کاریگری ہے جناب!
کہ ذرّے کو چمکائے جوں آفتاب
مجھے دی ہے اس واسطے یہ چمک
کہ تم دیکھ کر مجھ کو جاؤ ٹھٹھک
نہ اُلٹا پلٹے سے کر دو کمال
سنبھل کر چلو آدمی کی سی چال

اسماعیل صاحب کی نظمیں آپ کی تیار کی ہوئی ریڈروں اور اُن کے کلیات میں پڑھ سکتے ہیں۔ اُنھوں نے اونچی جماعتوں کے بڑے لڑکوں کے لیے بھی کتابیں لکھی ہیں۔



دو شکاری

[illegible] حسنی

(قسط ۲)

میرے ابّو ایک ماہر مستری تھے۔ لوگ اپنی گاڑیاں پاس کے گیراجوں میں مرمت کرانے کے بجائے دور دور سے ان کے ورک شاپ میں لایا کرتے تھے۔ انھیں انجنوں سے گہری دلچسپی تھی۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا تھا۔ یہ پٹرول انجن بالکل جادو ہوتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے۔ ہزاروں مختلف قسم کے دھات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اگر ایک خاص ترتیب سے جوڑ دیے جائیں اور اس میں پٹرول اور تیل بھر دیا جائے اور پھر ایک خاص بٹن دبا دیا جائے تو ان میں کیسی ایک دم جان پڑ جاتی ہے اور وہ کیسے گھوں گھوں.... گھر گھر.... کرتے موٹر کار کے پہیوں کو چکر دیتے ہوئے تیز رفتار سے چلانے لگتے ہیں۔

اور یہ بات بھی صاف تھی کہ مجھے بھی انجنوں اور کاروں سے بہت دلچسپی اور محبت تھی۔ کیونکہ میں نے تو انھیں کے درمیان آنکھیں کھولی تھیں، ورک شاپ ہی میرا کھیل کا کمرہ تھا۔ اس کے علاوہ میرے لیے اور کون سی جگہ ہو سکتی تھی جہاں میرے ابّو ہر وقت میری دیکھ بھال کر سکتے تھے۔

میرے کھلونے رنچ، پیچ کش، ہتوڑیاں، پسٹن اور تیل سے چکنے ہوئے اسپرنگ تھے جو کہ ہر طرف بکھرے رہتے تھے اور ان سے کھیلنا بہ نسبت ان پلاسٹک کے کھلونوں کے جو آج کل عام طور پر بچوں کو دیے جاتے ہیں میرے لیے کہیں دلچسپ تھا۔

اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ میں پیدائشی مستری ہوں تو غلط نہیں ہوگا۔ اب جبکہ میں پانچ سال کا ہو گیا تھا تو مجھے اسکول جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ والدین کے لیے ضروری ہو جاتا تھا کہ جب بچہ پانچ سال کا ہو جائے تو وہ اسے اسکول بھیجیں اور یہ بات میرے ابو خوب اچھی طرح جانتے تھے۔

[illegible] ورک شاپ میں تھے۔ میں ایک فورڈ

کے بریک درست کرنے میں اپنے ابو کی مدد کر رہا تھا کہ اچانک انھوں نے مجھ سے کہا: "دانی میں تمھیں ایک بہت دلچسپ بات بتانے والا ہوں۔ وہ یہ کہ تم دنیا کے سب سے چھوٹے یعنی پانچ سال کے مستری ہو۔"

انھوں نے میری یہ اتنی بڑی تعریف کی تھی جو اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ اس تعریف سے میں بے انتہا خوش ہوا تھا اور پھر پوچھا: "دانی! اس کوڑے کباڑ میں لتھڑے ہوئے انجنوں کا کام تم کو پسند ہے؟"

"جی ہاں ابو، یہ انجن مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

انھوں نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور مجھے دیکھنے لگے۔ پھر بڑی ملائمیت اور محبت سے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا: "دانی! میں تم کو ایک بہت بڑا اور مشہور مستری بنانا چاہتا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ تم بڑے ہو کر ایک ماہر ڈیزائن انجینیر بنو اور موٹر کاروں، ہوائی جہازوں کے نئے نئے ڈیزائن بنانے میں مشہور ہو۔ اس کے لیے تم کو بہت عمدہ تعلیم کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے لیے میں تم کو بہت جلد اسکول بھیجنا نہیں چاہتا۔ بلکہ میری خواہش ہے کہ آئندہ دو سال میں تم اتنا سیکھ جاؤ کہ بلا کسی کی مدد کے ایک چھوٹا سا انجن کھول لو اور پھر اسے بلا تکلف خود ہی دوبارہ فٹ کر لو۔ بس پھر تم اسکول جا سکتے ہو۔"

اس طرح دو سال گزر گئے۔ اس عرصے میں مجھے انجن کو پورا کھول کر دوبارہ فٹ کرنا آگیا تھا۔ اس کے بعد میرے اسکول جانے کا وقت بھی آگیا تھا۔

دو میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں میرا اسکول تھا۔ میں وہاں پیدل آدھ گھنٹے میں پہنچ جاتا تھا۔ میرے ابّو اکیلا مجھے کبھی نہیں جانے دیتے تھے۔ بلکہ میرے ساتھ چلنے پر ان کو بہت اصرار تھا اور چاہ

بجے اسکول ختم ہونے کے بعد وہ ہمیشہ میرا انتظار کرتے ہوئے وہاں موجود ہوتے تھے۔

اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ میری دنیا پٹرول پمپ، ورک شاپ لکڑی کا اپنا گھر، میدان، جنگل اور گاجو کی ندی اور اسکول تھی۔ ابو کے ساتھ رہ کر مجھے نہ کبھی تنہائی کا احساس ہوا نہ اداسی اور بوریت کا تجربہ ہوا۔ ان کے مزاج میں عجیب ولولہ اور جوش تھا۔ طرح طرح کے کھیل وہ ایجاد کرتے رہتے تھے۔ تفریحی پروگرام بناتے رہتے تھے۔ اور ہم دونوں دوستوں کی طرح برابر کے شریک رہتے۔

ہفتے کی ایک صبح کو ابو کہنے لگے کہ پتنگ اڑانے کے لیے آج بہت اچھی ہوا چل رہی ہے۔ آؤ دانی پتنگ بنائیں اور پتنگ بنانے کا سامان اکٹھا کر لیا۔ بانس کی کھپچیوں کو ستارے کی شکل میں جوڑنا انھوں نے مجھے بتایا۔ دو کھپچیاں لمبائی اور چوڑائی میں لگانی سکھائیں۔ اس کے بعد ایک پرانا نیلا قمیص کاٹ کر پتنگ کے ڈھانچے پر مڑھا۔ ایک موٹے دھاگے کی لمبی سی دم لگا کر قمیص کے بچے ہوئے ٹکڑوں سے چھوٹی چھوٹی کترنیں کاٹ کر اس میں دم چپکائیں اور ایک ڈورے کا گولا ورک شاپ سے لا کر کھپچیوں کے فریم کے بیچ میں باندھ دیا اور بتایا کہ یہ پتنگ اڑانے کے لیے لگایا جاتا ہے۔

اور پھر ہم دونوں پٹرول پمپ کے پیچھے والے ٹیلے پر پتنگ کو اڑانے کے لیے چڑھ گئے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ کھپچیوں اور پرانے قمیص سے بنائی ہوئی چیز اڑنے لگے گی۔ لیکن میری حیرت کی حد نہیں رہی جب وہ سچ مچ اڑنے لگی۔

میں ڈور کا گولا پکڑے ہوئے تھا۔ ابو نے پتنگ پکڑ رکھی تھی اور جیسے ہی انھوں نے اسے ہوا میں اچھال کر چھوڑا ہوا نے فوراً ہی تھام لیا اور پھر اوپر کی طرف ایسے اٹھنے لگی جیسے ایک بڑا نیلا پرندہ اڑ رہا ہو۔ ابو نے کہا: "دانی! ڈور کو چھوڑتے رہو اور جتنا دل چاہے اسے آگے بڑھاتے رہو۔" پتنگ اونچی ہوتی جا رہی تھی اور جلدی ہی وہ صرف ایک چھوٹے سے نیلے نقطے کی طرح آسمان پر ناچتی ہوئی نظر آنے لگی۔

اس وقت یہ سوچ کر میری خوشی کی انتہا نہیں تھی کہ میں ایک ایسی چیز کو پکڑے ہوئے ہوں جو اتنی جاندار ہے کہ اتنی دوری پر سے بھی وہ مزید ڈور لینے کی کوشش میں ایک مچھلی کی طرح جھٹکے دے رہی ہے۔ جب اندھیرا ہونے لگا تو ابو نے کہا: "چلو اسے گھر لے چلیں۔"

ہم ڈور کو پکڑے ہوئے اور پتنگ کا رخ موڑنے کے لیے اسے زور سے کھینچتے ہوئے ٹیلے سے اترے۔ گھر کے قریب آئے تو اسے امرود کی شاخوں میں الجھنے سے بچاتے ہوئے گھر کے دروازے تک لے آئے۔ ابو نے کہا: "اب ہم اسے گھر کی چوکھٹ سے باندھ دیں گے۔"

میں نے پوچھا: "ابو! کیا یہ ایسے ہی اوپر چڑھی رہے گی؟"

"ہاں اگر ایسے ہی ہوا چلتی رہی تو یہ اوپر ہی رہے گی۔"

اور ہوا چلتی رہی تھی عجیب بات یہ ہوئی کہ وہ پتنگ ساری رات اوپر ہی اڑتی رہی اور جب صبح سویرے ہم اسے دیکھنے گئے تو وہ ایک نیلے نقطے کی طرح آسمان پر ناچ اور تھرک رہی تھی۔

ناشتے کے بعد میں نے اسے نیچے کھینچ لیا تھا اور کسی دن ایسے ہی ہوا چلنے تک اسے ورک شاپ کی دیوار پر احتیاط سے لٹکا دیا تھا۔

چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک شام کو جب ہوا بند تھی، ابو نے کہا: "کیا بہترین اور پرسکون شام ہے۔ آج تو قندیل اڑانے کے لیے بہترین موسم ہو رہا ہے۔"

شاید اس کا پروگرام انھوں نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ کیونکہ چار رنگ برنگے باریک کاغذوں کے تختے اور ایک شیشی گوند کی تیار رکھی تھی۔ انھوں نے کاغذ، پتلے تار، گوند اور قینچی استعمال کر کے پندرہ منٹ میں ایک بہت بڑا قندیل میرے لیے تیار کر دیا۔ تلی کے کھلے حصے میں روئی کا ایک چھوٹا سا گولا لگا دیا اور قندیل اڑانے کے لیے ہم تیار تھے۔ جب اندھیرا ہونے لگا تو ہم اپنا قندیل لے کر میدان میں آگئے۔ اپنے ساتھ اسپرٹ ملے موم کی شیشی اور ماچس بھی لیتے آئے۔ میں بالکل سیدھا رکھنے کے لیے قندیل کے کونے پکڑے رہا۔ ابو نے نیچے جھک کر بہت احتیاط سے تھوڑا سا موم روئی کے گالے پر ٹپکا دیا اور اس میں آگ لگا دی اور کہا: "تو بس اب یہ اڑنے کے لیے تیار ہے۔ دانی! اسے مضبوطی سے پکڑے رہنا۔"

ایک لمبا سا پیلا شعلہ روئی میں سے نکل کر قندیل میں پہنچ گیا تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ شعلہ کاغذ کی دیواروں کو نہ جلا ڈالے۔ ابو نے مجھے اطمینان دلایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، بس دیکھتے جاؤ۔ ہم قندیل کو سیدھا پکڑے ہوئے یہ کوشش کر رہے تھے کہ یہ پہلا لمبا شعلہ اس کی دیواروں تک نہ پہنچے۔ جلدی ہی قندیل میں دھواں بھر گیا اور خطرہ ٹل گیا تھا۔

ابو نے کہا: "بس اب یہ اڑنے والا ہے۔ کیا تم کو ایسا لگ رہا ہے یہ تمھارے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے؟"

"جی ہاں"۔ میں نے کہا۔ "ٹگ تو رہا ہے۔ کیا میں اسے چھوڑ دوں؟"

"نہیں۔ ذرا ٹھہرو۔ اس وقت تک پکڑے رہو جب تک تمھیں محسوس ہو کہ یہ اڑنے کے لیے جھٹکا دے رہا ہے۔"

ایک منٹ بعد میں نے کہا: "ابو! اب یہ جھٹکا دینے لگا ہے۔"

"بس اب اسے چھوڑ دو۔" ابو نے کہا۔

اور اس کے بعد قندیل خاموشی اور وقار کے ساتھ آہستہ آہستہ رات کے اندھیرے میں آسمان کی طرف بڑھ رہا تھا اور میں اچھلتے تالیاں بجاتے ہوئے چلا کر کہہ رہا تھا: "وہ تو اڑ رہا ہے۔ وہ تو بہت دور چلا گیا ہے۔ دیکھیے تو سہی کیسے جا رہا ہے"؟ اسے اڑتے دیکھ کر ابو بھی ایسے ہی جوش اور خوشی میں تھے جیسے میں تھا۔ کہنے لگے "دیکھو تو کیسا خوبصورت لگ رہا ہے۔ اڑنے سے پہلے اس کی خوبصورتی نظر ہی نہیں آ سکتی تھی۔ دیکھا تم نے اڑتے ہوئے اس کے سب رنگ کیسے چمک رہے ہیں۔ یہ تو آسمان پر جاتا ہوا ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی جادو کی چیز ہو۔"

میں نے ابو سے پوچھا: "کیا اور لوگ بھی اسے آسمان پر اڑتے دیکھ رہے ہوں گے؟"

"ہاں ضرور دیکھ رہے ہوں گے۔ کیونکہ اب یہ اتنا اونچا ہو گیا ہے کہ میلوں دور سے دیکھا جا سکتا ہے۔"

"ابو! اسے اڑتا دیکھ کر لوگ کیا سمجھیں گے؟"

"لوگ اسے اڑن تشتری سمجھیں گے۔ شاید گھبرا کر پولیس کو بھی خبر کر دیں۔"

ہوا کی ایک ہلکی سی لہر قندیل کو گاؤں کی طرف لے جا رہی تھی ابو نے کہا: "چلو چل کر دیکھیں وہ کہاں جاتا ہے؟ اور جب یہ نیچے اترنے لگے تو شاید ہمیں پا بھی جائے۔"

اس کی سیدھ میں ہم بھی دوڑنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ابو نے کہا: "دانی! دیکھو تو وہ نیچے آتا ہوا لگ رہا ہے۔ اس کے اندر روشنی ختم ہو چکی ہے" اور پھر وہ ہم کو نظر آنا بھی بند ہو گیا۔ اب ہم یہ اندازہ لگا کر دوڑ رہے تھے کہ وہ کس میدان میں اترا ہو گا۔ آدھ گھنٹے تک اندھیرے میں اسے ڈھونڈا مگر وہ ہم کو نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کر ہم گھر واپس آ گئے۔

دوسرے روز صبح میں اکیلا ہی اس کی تلاش میں گیا۔ کئی جگہ ڈھونڈنے کے بعد آخر ایک جگہ جہاں گائیں بھینسیں چر رہی تھیں وہ مل گیا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ گایوں نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ میں نے اسے لا کر ورک شاپ کی دیوار پر پتنگ کے برابر کسی اور دن اڑانے کے لیے لٹکا دیا۔

ابو نے کہا: "دانی! پتنگ جب تمھارا جی چاہے تم اکیلے اڑا سکتے ہو۔ لیکن قندیل کو اکیلے اڑانے کی کبھی کوشش نہ کرنا۔ یہ بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔"

"بہت اچھا ابو"۔ میں نے کہا۔ "نہیں دانی!" ابو نے کہا: "تم مجھ سے وعدہ کرو کہ بلا میرے تم کبھی اسے اڑانے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

"ابو میں وعدہ کرتا ہوں"۔ میں نے کہا۔

ہمارے میدان کے کنارے پر ایک برگد کا درخت تھا۔ اس پر ہم نے ایک گھر بھی بنایا تھا اور میرے پاس ایک چار فٹ کی کمان اور ایک تیر بھی تھا۔ جس سے فاختائیں، بٹیریں تک ماری جا سکتی تھیں اور میری آٹھویں سالگرہ کا تحفہ تو بہت ہی عجیب اور دلچسپ تھا۔ سالگرہ کے دن سے دو روز پہلے سے ابو نے مجھے ورک شاپ میں آنے سے منع کر دیا تھا۔ کیونکہ ابو وہاں کوئی بہت رازدارانہ کام کر رہے تھے جو مجھے بھی بتانا نہیں چاہتے تھے۔

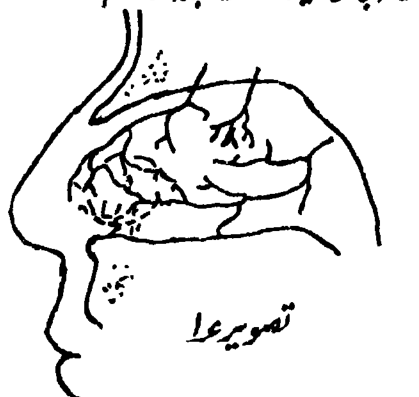
سالگرہ کی صبح کو ورک شاپ میں سے ایک بہت ہی حیرت انگیز چیز باہر نکلی۔ یہ چیز چار سائیکل کے پہیوں پر بہت سے صابن کے بڑے ڈبوں سے بنی ہوئی ایک گاڑی یا کار تھی۔ لیکن یہ کوئی معمولی کھلونا نہیں تھی۔ اس میں وہ تمام ضروری چیزیں تھیں جو ایک کار میں ہوتی ہیں۔ اس میں ایک بریک بھی تھا۔ اسٹیرنگ وھیل، ایک ملائم آرام دہ سیٹ، جھٹکے سے بچانے کے لیے ایک مضبوط بمپر بھی اس میں لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کا نام "سوپو" رکھا تھا۔ میں اسے ہر روز اپنے گھر کے پیچھے کے ٹیلے پر لے جاتا تھا اور پھر جب نیچے لاتا تو وہ بہت تیزی سے بھاگتی ہوئی نیچے آتی تھی۔

آپ نے دیکھا۔ آٹھ سال کی عمر تک میں نے ابو کے ساتھ کیسی مصروف اور دلچسپ زندگی گزاری تھی اور اب مجھے اپنے نو سال کے ہونے کا انتظار تھا اور میں یقین کیے ہوئے تھا کہ نویں سال کی دلچسپیاں اور بھی زیادہ ہوں گی۔ (باقی آئندہ)

ڈاکٹر سنجیو راٹھے اگروال

نکسیر

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ کوئی بچہ گر گیا اور اس کی ناک سے خون نکلنے لگا۔ اس کو نکسیر پھوٹنا کہتے ہیں۔ نکسیر صرف گرنے سے ہی نہیں پھوٹتی بلکہ سردیوں میں یا تیز گرمیوں میں موسم بدلنے پر اپنے آپ پھوٹ پڑتی ہے۔ اکثر بچے ناک میں انگلی ڈالتے رہتے ہیں۔ اس سے بھی اکثر نکسیر پھوٹ پڑتی ہے۔ یہ نکسیر پھوٹنا ہوتا کیا ہے؟ ناک کی اندرونی سطح میں کچھ خون کی نالیاں ہوتی ہیں۔ یہ سب نالیاں ایک جگہ پر کافی پاس پاس آجاتی ہیں۔ اس جگہ کا نام little'sarea



تصویر ۱

ہوتا ہے۔ (تصویر نمبر ۱) یہ ناک کے چھید کے بالکل پیچھے ہوتا ہے۔ یہ بہت نازک جگہ ہوتی ہے۔ ذرا سی چوٹ لگنے سے یہ نالیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور خون نکلنے لگتا ہے۔ یہ چوٹ گرنے سے یا انگلی ڈالنے سے یا تنکا، قلم یا کوئی بھی چیز ڈالنے سے لگتی ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ناک میں کچھ نہیں ڈالنا چاہیے۔

اسی پر ایک کہاوت مشہور ہے۔ کہ:-

"ناک میں انگلی، کان میں تنکا، مت کر، مت کر، مت کر
آنکھ میں انجن، دانت میں منجن، نت کر، نت کر، نت کر"

نکسیر کو روکنے کے کیا طریقے ہیں؟ جب بھی کبھی کسی کو نکسیر پھوٹے تو اس کو فوراً نیچے لکھے طریقے سے روکنا چاہیے۔

۱۔ کبھی بھی گھبرانا نہیں چاہیے۔
۲۔ ناک کو پانی سے دھونا چاہیے۔
۳۔ دو انگلیوں سے ناک کو کس کر پکڑیے، جس سے کہ ناک سے خون نکلنا بند ہو جائے
۴۔ منہ کھول کر سانس لینی چاہیے۔
۵۔ سر کو جسم سے نیچے لٹکا کر لیٹنا چاہیے۔



تصویر ۲

۶۔ اس طرح پانچ یا دس منٹ تک لیٹے رہیں۔
۷۔ اگر پھر بھی خون بند نہ ہو تو صاف روئی ناک میں ڈال کر فوراً کسی ڈاکٹر کے پاس جائیں۔
۸۔ اگر کسی کو بار بار ایسا ہوتا ہے تو ڈاکٹر کی صلاح لینی چاہیے۔ ایسا بعض بیماریوں کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ اس میں خاص خاص یہ ہیں۔

'Blood Pressure;' Blood Cancer, Severe Malaria,

وجہ معلوم کر کے اس کا علاج کرنے سے نکسیر پھوٹنا بند ہو جائے گی۔ اگر کوئی بیماری نہ ہو اور اس کی وجہ صرف چوٹ لگنا ہو تو ڈاکٹر اس جگہ پر نالی کو بند کرنے کے لیے دوا لگا دیتے ہیں۔ جس سے پھر نکسیر نہیں پھوٹتی۔ کبھی کبھی اس کا آپریشن، بھی

پڑ جاتا ہے۔ تکلیف ہونے سے احتیاط برتنا زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ بچوں، نیچے لکھا کرنا چاہیے۔

۱۔ ناک میں کبھی انگلی، تنکا یا کوئی بھی سخت چیز نہیں ڈالنی چاہیے۔
۲۔ ناک کو صاف رکھنا چاہیے۔
۳۔ نکسیر پھوٹنے پر خون بند کرنے کا طریقہ جو اوپر لکھا ہے کرنا چاہیے۔
۴۔ جب نکسیر بار بار پھوٹے تو ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔

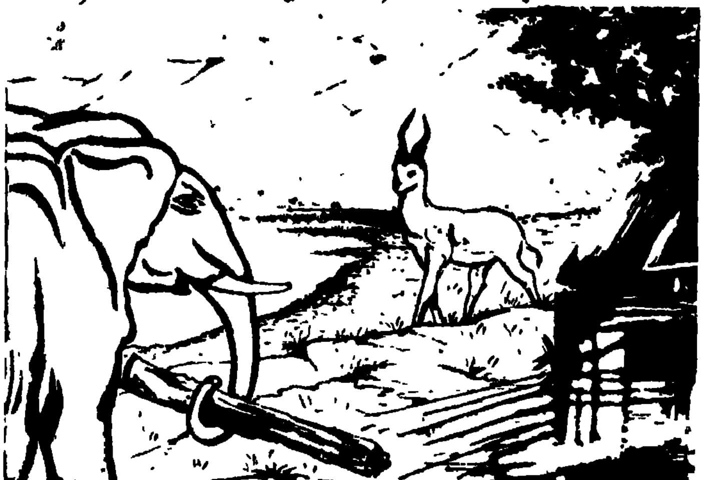
اگر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھا جائے تو نکسیر پھوٹنے کی تکلیف نہیں سہنی پڑے گی۔ (ترجمہ: عارج بن حیرت)



ایک شیر ایک ہرن

سید فتح علی انوری

ایک سنہری شام کو ایک ہرن سیر و تفریح کی غرض سے اپنے تنگ و تاریک گھر سے نکلا۔ اس کا گھر پہاڑی کے اندر چھپا ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا غار تھا جس کو جنگلی درختوں پودوں اور گھاس پھوس نے چھپا رکھا تھا۔ درندوں کے ڈر سے ہرن بے چارہ اسی غار میں چھپا بیٹھا رہتا۔ بیٹھے بیٹھے اس کی پتلی پتلی ٹانگیں سُن ہونے لگتیں۔ اندھیرا چھا جانے کے بعد وہ غار سے نکلتا، ادھر اُدھر قلانچیں لگاتا۔ چنے کا ساگ اس کا مرغوب کھانا تھا۔ مگر اس کے لیے اُسے بہت لمبا سفر



کرنا پڑتا۔ اِدھر اُدھر سے کچھ سبز پتے اور تازہ کونپلیں کھا کر پیٹ بھرتا۔ جنگلی درندوں کے شکار کی تلاش میں نکلنے سے پہلے ہرن اپنے گھر واپس لوٹ آتا تھا۔

یہ سنہری شام بھی بڑی دل کش تھی۔ ہلکی سی بارش ہونے کے بعد جنگل کا رنگ نکھر آیا تھا۔ ہر سبز چیز زیادہ سبز نظر آرہی تھی۔ ہر چیز شفق کے رنگ میں سنہری معلوم ہورہی تھی۔ ہرن اپنے غار سے نکلا تو اس نے عجیب سی فرحت محسوس کی۔ تازہ ہوا میں اس نے دو چار لمبے لمبے سانس لیے اور قلانچیں لگاتا ہوا ایک سمت میں روانہ ہوگیا۔ ایک لومڑی نے اُسے اچھلتا ہوا دیکھا اور اُس کی برق رفتاری پر رشک کرنے لگی۔ ایک درخت پر کچھ بندر طرح طرح کی آوازیں نکال کر کودنے لگے ہرن نے ایک جست لگا کر جوہڑ عبور کیا اور کھلی وادی میں داخل ہوگیا۔

وہاں کچھ اور ہی بہار تھی۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ڈھلوانوں پر لاکھوں جنگلی پھول رنگ بکھیر رہے تھے۔ ایک طرف تالاب کا شفاف پانی آسمان کو آئینہ دکھا رہا تھا۔ دوسری طرف درختوں سے چھپی ہوئی پہاڑی تھی۔ جس کے بعد درختوں کے جھنڈ تھے۔ اس علاقے میں زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے نے ہرن کو بہت متاثر کیا۔ اور اس کا جائزہ لینے ہرن یہاں آکر ٹھہر گیا۔ یہ ٹکڑا تین طرف سے بالکل محفوظ تھا۔ ہرن نے ایسا حسین اور محفوظ علاقہ کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ یہاں اپنا گھر بنالے اور آرام سے رہنے لگے۔ یہ خیال آتے ہی ہرن نے اپنے خیال میں گھر کا نقشہ بنا ڈالا اور یہ فیصلہ کر کے واپس لوٹا کہ وہ کل شام ادھر آکر دیواریں چننے کا انتظام کرے گا اور پھر چھت ڈالنے کا بھی کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا

ہرن ابھی واپس لوٹا ہی تھا کہ ایک شیر بھی ادھر آ نکلا۔ اسے بھی یہ مقام بہت پسند آیا۔ اس نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ اپنا گھر یہیں بنائے گا اور اس خیال کے ساتھ لوٹا کہ کل گھر بنانے کا کام شروع کر دے گا۔

بشکریہ ہمدرد نونہال کراچی

اگلے دن شام سے پہلے ہی ہرن اسی مقام پر آیا۔ اپنے کھروں سے اس نے دو کمرے کے مکان کے نشان لگائے۔ دوسرے جانوروں نے ہرن کو اس طرح مصروف دیکھا تو سب نے مل کر اس کی مدد کی اور دیکھتے ہی دیکھتے نیو تیار ہو گئی۔ ہاتھی بھی جب اس طرف سے گزرا اور ہرن کو مصروف پایا تو وہ ٹوٹے ہوئے درختوں کے تنے اٹھا لایا اور دیواریں بن گئیں۔ اب اندھیرا ہو چلا تھا۔ ہرن منصوبہ بنا کر لوٹا کہ آدھا گھر تو بن ہی گیا ہے۔ ہاتھی بھائی کی مہربانی سے کل چھت بھی پڑ جائے گی۔ ادھر دن ڈھلے شیر بھی آ پہنچا۔ اس نے جو اپنے پسندیدہ پلاٹ پر آدھا مکان بنا ہوا دیکھا تو بڑا حیران ہوا۔ مگر اس نے سوچا کہ میں تو ٹھہرا جنگل کا بادشاہ۔ جب جنگل کے جانوروں نے یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں نے یہ جگہ اپنے گھر کے لیے منتخب کر لی ہے تو انھوں نے مل کر دیواریں کھڑی کر دی ہوں گی۔ کل وہ چھت بھی ڈال دیں گے۔ یہ سوچ کر شیر اپنے گھر لوٹ گیا۔

دوسرے دن ہرن اپنے وقت پر آیا۔ ہاتھی سے اس کی دوستی ہو چکی تھی۔ ہاتھی بھی وہاں موجود تھا۔ درختوں کی ٹہنیاں اور گھاس پھوس لائی گئی اور چھت بھی پڑ گئی۔ مکان تیار تھا۔ ہرن نے رات وہیں بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک کمرے میں آرام سے سو گیا۔



شیر کو توقع ہی تھی کہ جانوروں نے چھت ڈال دی ہوگی۔ وہ رات گئے تھکا ہارا ادھر آیا تو گھر کو تیار دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ایک کمرے میں لمبی تان کر سو گیا۔

صبح جب دونوں کی آنکھ کھلی تو اپنی اپنی کھڑکیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں حیران ہوئے۔ ہرن بہت پریشان تھا کہ یہ کیا ہوا؟ گھر میں نے محنت سے بنایا اور شیر خان نے زبردستی قبضہ کر ڈالا۔ شیر دل ہی دل میں خوش تھا کہ ہرن بھلا کب تک میرے سامنے ٹھہرے گا۔ خود بہ خود بھاگ کھڑا ہوگا۔ شیر کو مذاق سوجھا وہ کہنے لگا بھائی ہرن تم ڈرو مت ہم دونوں پڑوسی ہیں۔ پڑوسیوں پر ایک دوسرے کا حق ہوتا ہے۔ تم آرام کرو میں چلتا ہوں تاکہ ناشتے کا انتظام کروں۔ ہرن بے چارہ حیران پریشان تھا۔ اتنے میں شیر ایک چھوٹا سا ہرن منہ میں دبوچے واپس آگیا اور مزے لے لے کر ہرن کا گوشت کھانے لگا۔ شیر کو معلوم تھا کہ جب اس کا پڑوسی دیکھے گا کہ میں ہرن کا ناشتا کرتا ہوں تو وہ دم دبا کر بھاگ جائے گا۔

جب شیر ناشتے سے فارغ ہوا تو ہرن کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا کہ آپ تو ناشتا کر چکے اب ذرا میں بھی ناشتا کر آؤں۔ ہرن وہاں سے چلا۔ وہ پریشان تھا کہ کیا کرے۔ اچانک ہاتھی آتا دکھائی دیا۔ ہاتھی نے جب تمام ماجرا سنا تو کہنے لگا۔ فکر مت کرو۔ ذرا ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔

ہرن کی سمجھ میں نہ آیا کہ شیر کے آگے ہاتھی بھلا کیا کر سکتا ہے۔ مگر تھوڑی دیر میں ہاتھی واپس آیا۔ اس کی سونڈ میں ایک شیر دبا ہوا تھا۔ ہاتھی نے کسی ترکیب سے اسے مار ڈالا تھا۔ کہنے لگا میاں ہرن تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی ہاتھی سے دوستی کی تھی۔ اب تم اس شیر کو کسی طرح دانت سے کھینچتے ہوئے اپنے گھر لے جاؤ۔ جب شیر کو معلوم ہوگا کہ تم شیر کا ناشتا کرتے ہو تو وہ گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوگا۔

اور ہوا بھی یہی کہ جب شیر نے دیکھا کہ ہرن ایک شیر کو مار کر ناشتے کے لیے لا رہا ہے تو شیر کے اوسان خطا ہو گئے۔

اس دن تو دونوں ڈرے سہمے اپنے اپنے کمروں میں چھپے رہے۔ مگر رات کا اندھیرا چھاتے ہی شیر چپکے سے مشرق کی جانب نکل گیا اور ہرن مغرب کی طرف۔

(بہ شکریہ نونہال کراچی)

حکیم محمد سعید



س: دُودھ اُبل کر کیوں گر جاتا ہے؟
محمد سلیم احمد

ج: دُودھ حرارت جذب کرتے کرتے نقطۂ جوش پر آجاتا ہے اور کھولنے لگتا ہے لیکن چوں کہ وہ ایک غذائی شے ہے اور زیادہ حرارت پا کر اُس کے حجم میں بھی اُسی نسبت سے اضافہ ہوتا ہے اِس لیے وہ پھول جاتا ہے اور باہر گر جاتا ہے۔

س: بڑھاپا کیوں آتا ہے؟ کیا سر کے بال سفید ہوتے ہی انسان بوڑھا ہو جاتا ہے۔
شازیہ بدر

ج: بڑھاپا کیوں آتا ہے۔ اُس کا سادہ جواب تو یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر چیز پرانی ہو جاتی ہے اور پھر ختم بھی ہو جاتی ہے۔ انسانی جسم اصل میں ایک پیچیدہ مشین ہے اور خاصی مضبوط اور پائدار ہونے کے باوجود پھر بھی وقت کے ہاتھوں مجبور ہے۔ بہت مدّت گزر جانے کے بعد ہمارے اعضا جواب دینے لگتے ہیں۔ بعض صورتوں میں جوانوں پر بھی بڑھاپا آجاتا ہے۔ کیوں کہ بیماری ان کے جسم کو بے کار کر دیتی ہے۔ جو لوگ شروع سے اپنی صحت کا خیال رکھتے ہیں اور قدرتی قانون کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتے ہیں اُن پر بہت مدّت تک بڑھاپا نہیں آتا۔ ہمارے جسم کی بناوٹ کچھ ایسی ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ہمارے سر کے بال بھی کم ہوتے چلے جاتے ہیں اور سفید بھی ہونے لگتے ہیں۔ لیکن یہ قانون نہیں ہے۔ بعض لڑکوں کے بال بھی سفید دیکھے گئے ہیں اور بعض لوگوں کے بال بڑھاپا آنے سے پہلے ہی سفید ہو جاتے ہیں۔ اِس لیے دونوں کو لازم و ملزوم نہیں کہا جا سکتا۔

س: انسان نے کب اور کیوں زراعت کا پیشہ اختیار کیا؟
خالد مقبول

ج: اِس کی کوئی تاریخ تو مقرر نہیں کی جا سکتی۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ انسان اب سے ہزاروں سال پہلے بالکل جانوروں کی سی زندگی بسر کرتا تھا۔ یعنی جنگلوں اور غاروں میں رہتا تھا۔ کپڑوں کا استعمال نہیں جانتا تھا۔ آگ بھی دریافت نہیں ہوئی تھی۔ اِس لیے پھل پھول اور جانوروں کا گوشت اپنی اصلی حالت میں اُس کی غذا تھے۔ رفتہ رفتہ انسان نے ترقّی کی اور جب یہ دیکھا کہ زمین میں بیج گرنے اور پانی پڑنے سے پودا اُگتا ہے تو اُس نے زراعت کا فن سیکھا اور یوں یہ فن ترقّی کرتے کرتے ایک سائنس بن گیا۔

س: موٹروں کی بیٹریاں کس طرح چارج کی جاتی ہیں؟
محمد اشرف

ج: موٹروں کی بیٹریاں چارج کرنے کے لیے ایک مشین استعمال کی جاتی ہے جسے چارجر کہتے ہیں۔ بیٹری میں دراصل ایک تیزابی مائع ہوتا ہے اُس میں سے کرنٹ گزار کر اُسے تقویت دی جاتی ہے اور یوں تھکی ہوئی بیٹری پھر سے کام کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

بمعرفت ماہنامہ نونہال کراچی

رئیس صدیقی



مہمان

برات آچکی تھی۔ نکاح ہو چکا تھا۔ اب ایک وسیع میدان میں کھانا کھلانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لوگ کرسیوں پر بیٹھ رہے تھے کہ سڑک پر ایک یکہ آکر رکا اور اس سے ایک بوڑھی سواری اُتری۔

اس کے پاؤں میں پلاسٹک کی چپل تھی جس کے پٹے کئی جگہ سے موچی کی اعلا کاری گری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ چپل کے ساتھ ساتھ پیر بھی گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ کمر پہ پاجامہ لٹک رہا تھا مگر مٹیلے رنگ کا۔ یہ اس کا اپنا رنگ نہیں تھا۔ بلکہ وقت کی دھوپ چھاؤں سے اس کی جلد کی طرح اس پاجامہ کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ بدن پر قمیص اور اس پر ایک سفید کھادی کی صدری تھی جو گرد کھاتے کھاتے سیاہی مائل ہو گئی تھی۔

بال کچھ سفید، کچھ کالے مگر سوکھے، میلے اور بے ترتیب اُلجھے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ دیدے اندر کی طرف دھنسے ہوئے تھے۔ چہرے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔

اس کی نگاہیں کچھ تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ اس نے ماحول کا بھرپور جائزہ لیا اور اس کے قدم دعوت گاہ کی طرف بڑھنے لگے۔ لوگ اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اس طرح راستہ چھوڑنے لگے جیسے کوئی زہریلا ناگ ان کو ڈسنے کے لیے ان کی طرف لپک رہا ہو۔

مہمان کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ صرف ایک کونے میں ایک کرسی خالی پڑی تھی۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ اس کی چولیں ڈھیلی تھیں۔ وہ غریب مہمان اسی کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا اور کھانا کھانے لگا۔

اسی اثناء میں ایک خوبرو جوان وارد ہوا۔ اُس کا قیمتی اور خوبصورت سوٹ اس کی کار کے رنگ سے میل کھا رہا تھا۔

وہ بہت جلدی میں تھا۔ وہ جلد سے جلد کھانا کھانے کی زحمت سے چھٹکارا پانا چاہ رہا تھا۔ لیکن تمام کرسیاں پہلے ہی سے پُر تھیں۔

وہ ایک انتظام کار کے پاس گیا اور آہستہ سے کچھ کہا۔ اس پر اُنھیں انتظام کار کی نگاہیں اِدھر اُدھر سرچ لائٹ کی طرح گھومنے لگیں اور اس طرح اُس بوڑھے مہمان پر آکر رک گئیں جیسے وہ غیر قانونی طور پر سرحد پھاند کر کسی ملک میں گھس آیا ہو۔

ایں! یہ بڈھا کون ہے؟ یہ کہاں سے گھس آیا؟ زیر لب کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"ابے تو یہاں کیسے بیٹھ گیا۔ چل باہر۔ ابھی کھانا بھجواتا ہوں۔ نہ جانے کمبخت کہاں سے چلے آتے ہیں۔ چل اٹھ شرافت سے اُٹھ جا۔ نہیں تو ابھی جوتے کی ٹھوکر مار کر اٹھاؤں گا۔"

سی-۲۸ — گرورام داس نگر — لکشمی نگر- دہلی-۹۲

اس لئے میرا دل ... [illegible]

[illegible]

... معلوم نہیں تھا کہ یہ کیسی مہمان نوازی ہے
کیسا سلوک ہے۔ یہ سلوک تو کسی بھکاری کے ساتھ ہوتا
ہے لیکن یہ تو فقیر نہیں ہے۔ بھکاری نہیں ہے۔ اگر بھکاری
ہوتا تو ... اتنے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا
کھانے کی ہمت نہ ہوتی۔ یہ مہمان ہے۔ البتہ غریب ہے۔ اس
کے رشتہ داروں نے شادی میں ملنے کو بلا لیا لیکن کسی
نے معمولی طور سے بھی خیر مقدم نہیں کیا۔

ابھی میں اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا
کہ میرے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔ یا خدا!
اس پر ایک صرف ایک لمحے کے لیے کچھ لوگوں
کے کان کھڑے ہوئے، نگاہیں اٹھیں اور دماغ نے سوال کیا
کہ کیا ہوا؟

لمحہ بیتتے ہی پھر سب اپنے کام میں مشغول
ہو گئے۔ کھانے میں، باتیں کرنے میں، استقبال کرنے
میں۔

لیکن میرا دل نہ مانا۔ میں باہر کی طرف لپکا۔ وہاں
... کے سامنے سڑک پر ایک بوڑھا غریب مہمان
... اس کی ناک سے خون نالا ول پانی

[illegible]

شبری کے بیر

شری رام جی کا یہ قصہ سنو
کہ گھر سے چلے جب وہ بن باس کو
... جہاں ...
چلے رام جنگل کو چھوڑ ...
خبر سارے بیروں جوان نے سنی
انہیں میں سے اک بھیل عورت بھی تھی
اور اُس بھیل عورت کا ...
جپا کرتی تھی رات دن رام رام
خبر اُن کی آمد کی جس دم سنی
بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی
کہ اب میرے جنگل میں ...
کروں اُن کی خاطر ...
اکٹھے کیے اس نے جنگل سے بیر
اور اک ٹوکری میں لگا ان کا ڈھیر
وہ چکھنے لگی ...
کہ ان میں ...
کیے نام کو ...
شری رام ...
اور ان ...

بھینس

بھینس ایک جغادری قسم کا جگالی کرنے والا جانور ہے۔ رنگت دو قسم کی ہوتی ہے۔ بھوری اور سیاہ۔ ! چال کسی بدمست شرابی کی سی ہوتی ہے۔ یہ جب چلتی ہے تو دور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خشکی پر ناؤ چل رہی ہے۔ اس کی آواز کسی پکا گانا گانے والے گویے کی سی ہوتی ہے کہنے والے کہتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ غلط کہتے ہوں۔ حکیم مومن خاں مومن نے بھینس کی آواز کے بارے میں ہی اپنا یہ مشہور زمانہ شعر کہا تھا

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

بھینس کو موسیقی سے بہت رغبت ہے کہتے ہیں تمام سازوں میں اسے بین بہت پسند ہے۔ بین کی آواز سنتے وقت اس انداز سے جگالی کرتی ہے جیسے داد و تحسین کے خزانے لٹا رہی ہے۔

بھینس کو لاٹھی سے بہت محبت ہوتی ہے۔ اس لیے جس کے پاس لاٹھی رہتی ہے اس کے ساتھ رہنا زیادہ پسند کرتی ہے۔ پانی سے اسے خاص رغبت ہے اس لیے زیادہ تر پانی ہی میں بیٹھنا پسند کرتی ہے۔ پانی سے اس کی والہانہ محبت کو دیکھتے ہوئے گوالے اسے ہمیشہ پانی سے قریب رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں تاکہ یہ خوش رہے۔ ! اسے مزید خوش رکھنے کے لیے اس کے دودھ میں ڈھیروں پانی بھی ملا دیتے ہیں۔ !!

بھینس، دودھ تیار کرنے کا ایک چھوٹا موٹا کارخانہ ہے جسے گوالے کے اشتراک سے چلایا جاتا ہے۔ دودھ کے مقدار کی کمی و بیشی بھینس کی اپنی صلاحیتوں پر کم، گوالوں کی حکمت و دانش مندی پر زیادہ منحصر ہوتی ہے۔ ! بعض ہوشیار قسم کے گوالے دودھ کے اس چھوٹے موٹے کارخانے کی بدولت کئی بڑے بڑے کارخانوں اور فیکٹریوں کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آج کے ہندستان کے بڑے بڑے سرمایہ دار اپنی ابتدائی زندگی میں گوالے ہی تھے اور بھینس کے دودھ کا کاروبار کرتے تھے۔ !

بھینس کے دودھ سے کئی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ جن میں سب سے اہم چیز چائے ہے۔ جس طرح ہندستان کی نوّے فی صدی آبادی شہروں کی بہ نسبت دیہاتوں میں بستی ہے۔ اسی طرح بھینس کا دودھ بھی اور چیزوں کی بہ نسبت نوّے فی صد چائے کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ ہندستان کے نوّے فی صدی لوگ چائے استعمال کرتے ہیں اور جو دس فی صدی لوگ چائے کے استعمال سے بچ رہتے ہیں وہ چائے کے باغات لگا کر چائے اگاتے ہیں۔ اس طرح ہندستان کی سو فیصدی آبادی چائے سے تعلق رکھتی ہے یعنی بھینس کے دودھ کی محتاج ہے۔ !

بھینس کے دودھ میں پروٹین، وٹامن اور کاربو ہائیڈریٹس تمام اجزا مناسب مقدار میں ہوتے ہیں۔ صرف پانی ہی غیر مناسب مقدار میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کی ذمہ داری بھینس پر نہیں، ''بھینس والے'' پر عائد ہوتی ہے۔ ! دودھ میں پانی کی یہ غیر مناسب مقدار صحت کے لیے مضر ہوتی ہے۔ چونکہ خالص دودھ [illegible]



نیا سویرا

خورشید حیات

ندیم آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا۔ وہ پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھا۔ ہمیشہ اپنے کلاس میں اوّل آتا تھا۔ گھر سے باہر تک سبھی اُسے بہت پیار کرتے تھے۔ پیار کرتے بھی کیوں نہیں کرتے وہ ذہین جو ٹھہرا۔

لیکن اِدھر گذشتہ سات دنوں سے ندیم اسکول نہیں جا رہا تھا۔ وہ گھر سے تو روزانہ اسکول جانے کے لیے نکلتا، لیکن دن بھر سڑکوں کا طواف کرنے کے بعد شام کو واپس "چھٹی" کے وقت گھر پہنچ جاتا۔

بات دراصل یہ تھی کہ ندیم کی دوستی اِدھر سات دنوں سے غنڈے قسم کے لڑکوں سے ہو گئی تھی۔ اُن کی بُری صحبت میں پڑ کر وہ مونگ پھلی والوں سے اُدھار خریدنا اور نصابی کتابوں کو بیچ کر فلم دیکھنا سیکھ گیا تھا۔

ایک روز ندیم اسی طرح اسکول سے بھاگ کر فلم دیکھنے کے لیے جا رہا تھا۔ لیکن نہ معلوم کیوں اُس دن وہ کچھ زیادہ سنجیدہ تھا اُسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ بُری صحبتوں میں پھنس کر کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ وہ تو ایک اچھا لڑکا تھا لیکن وہ اچھائی کے راستوں سے بھٹک کر بُرائی کے راستوں پر کیسے آ گیا؟ اُسے یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ سات سال سے لگاتار اپنے کلاس میں اوّل آتا رہا۔ اگر اس سال خدا نہ خواستہ وہ امتحان میں فیل ہو گیا تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں [illegible] پاپا کو میری حرکتوں کا علم نہیں ہوا ہے اگر یہ خبر اُن تک پہنچ گئی تو..... پاپا نے مجھ سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کر رکھی ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ میں پڑھ لکھ کر ایک بڑا آدمی بن سکوں۔ اور میں اِدھر ایک ہفتہ سے شیطان نما دوستوں کے چکّر میں پڑ گیا ہوں۔ بہ قول نیوٹن "ہر عمل کا برابر اور برعکس ردّ عمل ہوتا ہے۔" اس اصول کے مطابق جس طرح کا عمل سات دنوں سے میں کر رہا ہوں اور یہ سلسلہ اگر اسی طرح جاری رہا تو اس کا ردّ عمل بہت بھیانک ہوگا۔ ابھی جس راستے پر وہ چل رہا ہے اس راستے سے لوٹ سکتا ہے کیوں کہ ابھی اُس نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا ہے۔

سکینڈ کلاس، پانچ روپے..... پانچ روپے.....!

اس کے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی اور اُس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

وہ جس منزل کو طے کرنے کے لیے نکلا تھا وہ اب سامنے تھی۔ آج ہی نئی فلم لگی تھی، جس کی وجہ سے کافی بھیڑ جمع ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پورا شہر اُمڈ کر چلا آیا ہو۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے لمبی قطار لگی تھی۔ آج نہ جانے کیوں فلم کے عاشقوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر یہ تشبیہ اُس کے ذہن میں آئی۔

"سینما گھر ایک ایسی بوسیدہ لاش ہے جس سے بے شمار چیونٹیاں چپکی ہوئی ہیں۔"

سینما ہال کے بائیں طرف کھڑے ندیم کے ساتھیوں نے آواز دی: "کیوں یار ندیم! تم اُدھر کھڑے سوچ رہے ہو؟ فلم دیکھنا ہے کیا؟"

دوست! میں آج فلم نہیں دیکھوں گا۔"
"پیسے نہیں ہیں تیرے پاس؟"
"تو ہیں!"
"پھر کیوں نہیں چلتے! یہ زندگی چار دن کی ہے پیارے۔ جو چاہے، موج کر لے۔"
"نہیں میرے دوست! پہلے میں بھٹک گیا تھا۔ لیکن اب لوگوں کی باتوں میں آنے والا نہیں۔ جانتے ہو یہ فلم ہم جیسے معصوم ذہنوں پر کیسے برے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اور پھر اسلام نے فلم دیکھنا گناہ قرار دیا ہے۔ میرے دوست! ابھی تم نے کہا 'یہ زندگی چار دن کی ہے جتنا جی چاہے موج کر لے!' لیکن زندگی کے دوسرے پہلو پر بھی غور کیا تم نے؟ کیا تم نے آخرت کی کبھی سوچی؟ میرے دوست! یہ دنیا ایک امتحان ہال ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ یہ دنیا ایک اسکول کی مانند ہے۔ اس اسکول کے پرنسپل کا نام اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے ہم لوگوں کو پوری زندگی گزارنے کا طریقہ بتا دیا ہے۔ اب اگر ہم اس کے بتائے ہوئے اصول کی خلاف ورزی کریں گے تو اس کی سزا ہمیں بھگتنی پڑے گی۔ اس اسکول کے پرنسپل یعنی اللہ تعالیٰ نے ہم پر بہت سارے سبجکٹ لازم قرار دیے ہیں۔ اس اسکول میں بہت سارے طالب علم ہیں۔ ان میں جو اچھے ہیں وہ سال بھر پورے جوش اور جذبے کے ساتھ امتحان کی تیاری کرتے رہتے ہیں اور جب ان کی سال بھر کی محنت ایک کاغذ پر منتقل کر دی جاتی ہے جسے "رپورٹ بک" کہتے ہیں تو پھر رپورٹ پڑھتے ہی وہ خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں۔ اس کے برعکس رونے والے وہ ہوتے ہیں جو تعلیمی سال کو کھیل کود اور دوسرے مشاغل، فلمیں دیکھنے اور سڑکوں کا طواف کرنے اور قہوہ خانوں کی زینت بننے میں گزار دیتے ہیں۔ نصابی کتب کو ہاتھ نہیں لگاتے اور امتحان میں نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں تم جیسے انسان نما شیطانوں کے جھانسے میں آکر بھٹک گیا تھا۔ آج میں نے توبہ کر لی ہے۔ اس لیے میرا نیک مشورہ ہے کہ تم بھی [illegible] ہے ہو آؤ کو چھوڑ دو اور پھر ہمارا سالانہ امتحان بھی قریب ہے۔ اگر تیاری نہ کی تو فیل ہو جاؤ گے۔"

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے ندیم! بوڑھوں جیسی باتیں کر رہے ہو؟ یہ عمر بھی بھلا مولوی ٹائپ کی باتیں کرنے کی ہے۔" اور پھر اس کا دوست اسے تھپڑ مار کر ہنسنے لگتا ہے "ہا ہا... ہا ہا، خیر تم کو نہیں دیکھنا ہے تو مت دیکھو۔ ہمارے پاس تو بارہ ٹکٹ ہیں۔ ان سب کو بلیک کرنے پر پیسے بھی حاصل ہو جائیں گے اور فلم بھی دیکھ لوں گا۔ کیا آئیڈیا ہے۔ ہا ہا.... ہا ہا.....!"

اتنے میں پولیس کا آدمی آتا ہے اور ندیم کے دوست کو بلیک کرنے کے جرم میں پکڑ کر لے جاتا ہے۔

ادھر ندیم کے ڈگمگاتے قدم سنبھل سنبھل کر مسجد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور مؤذن اونچی آواز میں پکار رہا تھا۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ

بقیہ صفحہ ۱۸

پر بار ہوتا ہے اس لیے اس سے نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔ پانی ملے پتلے دودھ میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ اس قسم کا دودھ بہت ہی لطیف اور زود ہضم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بھی ایسا ہی دودھ پینے کی صلاح دیتے ہیں۔ (ڈاکٹروں اور گوالوں میں ضرور کوئی خفیہ تجارتی معاہدہ ہے۔!)

بھینس کے دودھ سے صحت بنتی ہے۔ خرید کے پینے والوں کی بھی اور بیچنے والوں کی بھی۔! اس لیے اگر آپ کی صحت خراب رہتی ہے تو آپ ان دو کاموں میں سے کوئی ایک کام ضرور کیجیے۔ یا تو دودھ خرید کر پیجیے یا پھر دودھ فروخت کیجیے۔! لیکن دوسری بات زیادہ مفید ہے کہ اس میں صحت بننے کے ساتھ ساتھ مالی حالت بھی مستحکم ہوتی ہے۔!! کہیے تو پھر کب سے شروع کر رہے ہیں آپ بھینسوں کے دودھ کا کاروبار!؟

جاوید احمد خاں معصوم

اپنا کام اپنے آپ

بچّو! آپ نے سارس کا نام تو سُنا ہی ہوگا شاید آپ میں سے کسی ایک نے اُسے دیکھا ہو۔ میں آج آپ لوگوں سے اُس کی ملاقات کرائے دیتا ہوں۔ سارس ایک ایسا پرندہ ہے جس کی چونچ لمبی ہوتی ہے اور دریا یا پانی کے قریب رہتا ہے۔ آپ مٹّی اور اینٹ کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ آپ اچھی اچھی غذائیں کھاتے ہیں اور سارس مچھلی اور مینڈک کو اپنی غذا بناتا ہے، جنگل اور کھیتوں میں بھی اگر کچھ مِل گیا تو کھا پی کر پیٹ بھر لیا کرتا ہے۔

برسات کے دن تھے۔ سارس کا ایک جوڑا کسی تالاب کے کنارے رہتا تھا اور تالاب کے بغل ہی میں ایک کسان کا کھیت تھا۔

مادہ سارس نے اسی کھیت میں دو انڈے دیے۔ سارس کا جوڑا ان انڈوں کی دیکھ ریکھ کرتا رہا۔ چند دنوں میں ان انڈوں سے دو ننھے منّے بچے نکل آئے تھے اور وہ رفتہ رفتہ بڑھنے بھی لگے تھے۔

ایک دن کسان اپنے لڑکے کے ہمراہ کھیت دیکھنے آیا۔ گیہوں کی فصل پک چکی تھی۔ کسان نے اپنے لڑکے سے کہا: فصل اب تیار ہو چکی ہے۔ کل گاؤں کی مدد سے کھیت کو کاٹ لیا جائے گا۔"

کسان کی باتیں سُن کر سارس کے بچے بہت گھبرائے۔ شام کے وقت جب اُن کے ماں باپ آئے تو بچّے بولے:

"آج کسان اپنے لڑکے کے ساتھ آیا تھا اور [illegible] کاٹنے کی بات کر رہا تھا۔ ہم لوگوں کو بہت جلد [illegible] کہیں اور چلے جانا چاہیے۔"

سارس نے پوچھا: "کسان کیا کہہ رہا تھا؟"

بچّوں نے گھبرائے ہوئے انداز میں جواب دیا: "کسان کہہ رہا تھا کہ کل گاؤں کے لوگوں کی [illegible] فصل کاٹ لوں گا۔"

سارس: "ڈرو مت! کل کھیت نہیں کٹے گا۔"

دوسرے دن کسان پھر اپنے لڑکے کے ساتھ [illegible] آیا۔ کھیت کے چاروں طرف دیکھ بھال کر بولا:

"آج تو گاؤں والے اپنا اپنا کھیت کاٹنے [illegible] ہماری مدد کو کوئی بھی نہ آیا۔ اب کل ہم اپنا کھیت [illegible] لگوا کر کٹوا لیں گے۔"

کسان کی باتیں سُن کر سارس کے بچے اور زیادہ [illegible] شام کو جب اُن کے ماں باپ اُن کے کھانے چیزیں لے کر آئے تو بچّے پھر بولے:

"آج کسان پھر آیا تھا۔ کل وہ کھیت کاٹنے [illegible] بہت سویرے ہی یہاں سے کہیں اور [illegible]

سارس نے پوچھا: "کسان کیا کہہ [illegible]

بچّوں نے کہا: "کسان کہہ رہا تھا کل [illegible] جمع کر کے کھیت کاٹ لوں گا۔"

سارس نے کہا: "ڈرو مت بچّو! [illegible] نہیں کٹے گا۔"

بقیہ [illegible]

کسان پھر آیا، اُس کے ہمراہ اُس کا لڑکا
کھیت پر نظر ڈال کر بولا:
۔۔۔سے مزدور کہیں اور کام کرنے چلے گئے۔
کھیت کو آپ ہی کاٹیں گے۔"
۔۔۔کے بچوں نے یہ بات بھی شام کو اپنے باپ
۔۔۔دی اور کہا کہ آج پھر آیا تھا۔ کل وہ کھیت ضرور
۔۔۔ ہمیں بہت سویرے کہیں اور چلے جانا

سارس نے پوچھا: "کسان کیا کہہ رہا تھا؟"
بچے بولے: "کسان کہہ رہا تھا کہ کل ہم اپنے آپ
کھیت کاٹ لیں گے۔"

سارس بولا: "اب ہمیں بہت سویرے دوسرے کھیت
میں ضرور جانا ہی ہوگا۔ کل کسان کھیت ضرور کاٹے گا۔
اپنا کام وہ اپنے آپ کرلے گا۔ اب وہ دوسروں کی مدد
نہیں لینا چاہتا۔"

دوسرے دن کسان کھیت کاٹنے آپہنچا اور اس کے
آنے سے پہلے ہی سارس کا جوڑا اپنے بچوں کے ساتھ
دوسری جگہ جا چکا تھا۔

اس لیے پیارے بچو! آپ کو بھی اپنا کام خود کرنے
کی عادت ڈالنا چاہیے۔ دوسروں پر اپنے کام کو انحصار رکھنے
والا ہمیشہ دھوکے میں رہتا اور نقصان اٹھاتا ہے۔

جاڑا

الف قدم

جاڑا آیا جھوم کے
آٹھ مہینا گھوم کے
ٹھنڈی ٹھنڈی چلے ہوا
بدن میں مرے لگے ہوا
کہیں کہرا کہیں پہ اُولا
ٹھنڈک کا ہے گرتا گولا
اوڑھ پہن کر چلنا بچو!
سردی سے تم بچنا بچو!
بوڑھے بچے اور جوان
سردی سے ہیں سب حیران
دھوپ بدن میں لگ نہیں پائے
سردی سب کو خوب ستائے
ہوا ہے چلتی سر سر سر
کانپے دنیا تھر تھر تھر!
کوٹ اور جوتا موزہ پہنو
تب تم گھر سے باہر نکلو!
جاڑے کی ہے دھوپ نرالی
لگتی ہے سونے کی تھالی

منزلگاڈ کرسی
لوکو بازار، گوہ۔ دھنباد

کیلنڈر کی تاریخ

محمد زبیر آفاق

۱۹۹۴

					مئی	اگست	فروری مارچ نومبر	جون	ستمبر دسمبر	اپریل جولائی
۲۹	۲۲	۱۵	۸	۱	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ
۳۰	۲۳	۱۶	۹	۲	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
۳۱	۲۴	۱۷	۱۰	۳	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار
	۲۵	۱۸	۱۱	۴	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر
	۲۶	۱۹	۱۲	۵	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل
	۲۷	۲۰	۱۳	۶	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ
	۲۸	۲۱	۱۴	۷	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات

پیارے پیامیو!

آپ نے کیلنڈر تو ضرور دیکھا ہوگا۔ موجودہ دور میں کیلنڈر ایک اہم ضرورت بن گیا۔ ہمارے پرانے پیامی بھائی عبدالمجید صاحب آنکلی ہر سال آپ کے لیے مختصر کیلنڈر مرتب کر کے پیام تعلیم میں شائع کرواتے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ کیلنڈر دراصل کیا چیز ہے؟ اگر نہیں تو لیجیے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

عیسوی تقویم کی تاریخ نہایت ہی دل چسپ ہے۔ کسی زمانے میں سال کا آغاز جنوری سے نہیں بلکہ مارچ سے ہوا کرتا تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں گریگورین کیلنڈر اختیار کیا گیا۔ یہ کیلنڈر مسیحوں کے پاپائے اعظم گریگوری سیزدہم نے اہم مسیحی سلطنتوں کے مشورے سے مارچ ۱۸۸۲ میں رائج کیا تھا۔ اسے جولین کیلنڈر کی جگہ نافذ کیا گیا جسے محققین کے اندازے کے مطابق جولیس سیزر نے ۴۵ قبل مسیح میں رائج کیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ اس میں سال کے ۳۶۵ دن رکھے گئے تھے جو اصل سے گیارہ منٹ پندرہ سکنڈ زیادہ تھے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ یہ فرق پیچیدگیاں پیدا کرتا تھا۔ جدید ترکیہ میں کمال اتاترک نے سن عیسوی مکمل طور پر نافذ کر دیا۔ ایران میں رضا شاہ کبیر نے بھی شمسی سال [illegible] کے نام ایرانی رکھے یعنی آذر، دے، بہمن [illegible] اردی بہشت، خورداد، تیر، امرداد، شہریور، مہر، آبان۔ ایرانی سال ۲۱ مارچ کو شروع ہوتا ہے۔ اس طرح موجودہ ایرانی سال ۱۳۷۳ [illegible] کو شروع ہوا۔

نظام تقویم یا کیلنڈر لاطینی زبان کا لفظ (KALENDAS) سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں "حساب چکانے کا دن"۔ اب اسے عام مقاصد کے لیے دنوں اور وقت کی دوسری تقسیم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ابتدائی دور کے انسان کو کیلنڈر کی ضرورت مذہبی رسوم اور تہوار منانے کے لیے تھی۔ پھر جب اس نے زرعی بستیاں بسائیں تو متعلقہ موسموں کے لیے ایک شمسی کیلنڈر کی ضرورت محسوس ہوئی۔

موجودہ دور کے انسان کے [illegible]

[illegible]	ڈاکٹر شمیم حنفی
[illegible]	آصفہ مجیب
[illegible]	ریاض احمد خاں
[illegible]	ڈاکٹر اطہر پرویز
اس نے کیا کر نہ جانا	آصفہ مجیب
دُم کا سانپ	محمد قاسم صدیقی
صحت کی الف بے	مسعود احمد برکاتی
موم کا محل	پروفیسر محمد انیس
پہیلیاں	ڈاکٹر حسینی پریمی
چھوٹا لڑکا	عبدالغفار مدھولی
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	کوثر بانو
شہزادہ اور ٹھگ	
لال مرغی	عبدالواحد سندھی
چپاوت کا آدم خور شیر	محمد معین
ایک کچوری تیل میں راجا جی	اسرار ندوی
چوری کی عادت	عبدالغفار مدھولی
داوا نہرو	منور لکھنوی
نابینا خاں	محمد حسین حسان جامعی
میگھ نگر کا راجا	ریاض احمد خاں
سرکس	[illegible]
[illegible] جوتے	بیگم قدسیہ زیدی
[illegible]	یوسف ناظم
[illegible]	قرۃ العین حیدر
[illegible]	[illegible]
چنبیلی	[illegible]

…ت یار وشنی کے بعد…
…ر تھے۔ لیکن دن یا قمری ما…
…ے لیے ناکافی تھے۔ اس لیے
…ری سے کیا جاتا تھا' مثلاً ایک
…ں برفباریاں دیکھ چکا ہے وہ
…ا تھا یہی وجہ ہے کہ بیشتر قومی کیلنڈرز
…ں چلتے ہیں۔ ہجری کیلنڈر جو قمری
…سلم کے مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے
…ے کی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔
…ہجری کا نام دیا گیا ہے۔ ہجرت کا واقعہ
…ئی ۶۲۲ء کو پیش آیا تھا۔ اسے باقاعدہ
…ں خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق ؓ نے دی۔
…در قمری سال کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ جو
…مہینوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ مہینے باری باری
…انتیس دن کے ہوتے ہیں اور رویت ہلال کے
…روع ہوجاتے ہیں۔ اس طرح سال کے ۳۵۴ دن
…ن لیکن بعض اوقات آخری مہینے یعنی ذی الحجہ میں
…اضافہ ہوجاتا ہے جس سے اس مہینے میں دنوں
…تیس اور سال کے دنوں کی تعداد ۳۵۵
…کیلنڈر چاند کی گردش پر مبنی ہے۔ اس لیے
…ے ہمیشہ ایک ہی موسم میں نہیں آتے اور
…ل کی مدت میں یکے بعد دیگرے ہر موسم سے
…۔ مہینہ نیا چاند نظر آنے کے بعد شروع ہوتا

…کیلنڈر بھی قمری تھا۔ مسیحی ملکوں میں سرکاری
…نڈر کے استعمال کیے جانے کے باوجود کلیسا
…ی کیلنڈر استعمال کیا جاتا ہے۔ ان تمام
…ے علاوہ دنیا کے مختلف ادوار میں یونانی کیلنڈر
…ہندی کیلنڈر، بابل کا کیلنڈر،
… [illegible] …رہا ہے۔



ایک شاگرد کو استاد نے کرکٹ میچ پر مضمون لکھنے کو کہا۔ دوسرے دن بچے نے کاپی استاد کے سامنے کھولی اوپر کرکٹ کا عنوان تھا اور نیچے لکھا تھا بارش کی وجہ کھیل نہیں ہو سکا۔

● سید قمر العارفین رضوی

ایک دن دو افیمی ایک کانچ کی دکان پر پہنچے اور دکاندار سے کہا: گلاس ہیں؟۔ دکاندار نے کہا: جی ہیں۔

افیمی: دکھاؤ۔ (دکاندار نے گلاس الٹا کر کے رکھ دیا)

پہلا: یہ گلاس تو اوپر سے بند ہے

دوسرا: (نیچے ہاتھ کرتے ہوئے) ارے یہ اوپر سے بند تو بند اس میں نیچے تلی بھی نہیں ہے۔

● ممتاز علی بیگ

باپ: (بیٹے سے) کیوں بیٹا پیدل چلیں یا سواری پر؟

بیٹا: آپ کی مرضی، ویسے اگر پیدل چلنا ہے تو مجھے گود میں اٹھا لیں۔

لڑکا: (ماں سے) اس بوتل میں کون سا تیل ہے۔ اس میں تو ذرا بھی خوشبو نہیں؟

ماں: ارے بیٹا! اس میں تیل نہیں گوند ہے۔

لڑکا: جب ہی میرے سر سے ٹوپی نہیں اتر رہی ہے۔

● وسیمہ بیگم

قلمی دوستی

انور حسین ناگوری — عمر ۱۶ سال

شوق: نماز پڑھنا: قلمی دوستی کرنا۔ پیام تعلیم پڑھنا۔

پتا: صابر حسین ناگوری ناگراہ والے، ناگوری محلہ ہیدپور پن: ۳۴۱۳۰۳۔۴۵۹

محمد احسان — عمر ۱۵ سال

مشغلہ: کرکٹ کھیلنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ نئی اور پرانی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔

پتا: معرفت عبد القیوم انصاری۔ بیتیانہ محلہ کلٹی۔ ضلع بردوان۔

محمد اسلم

مشغلہ: رسالہ پیام تعلیم کا مطالعہ کرنا۔ اخبار پڑھنا۔

پتا: ابراہیم نرسری ریلوے روڈ مالیر کوٹلہ پن: ۱۴۸۰۲۳

سید ابو تراب نقوی — عمر ۱۵ سال

مشغلے: کمنٹری سننا، ڈاک ٹکٹ جمع کرنا، ریڈیو پر بچوں کے پروگرام سننا۔

پتا: سید ابو تراب نقوی، ڈاکٹر ذاکر حسین ہائی اسکول شاہ بازار اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۱۔ مہاراشٹر،

سید شمیم انور نقوی — عمر ۱۴ سال

شوق: پیام تعلیم کا مطالعہ کرنا،

پتا: سید شمیم انور نقوی، فراشخانہ دہلی ۶

سراج احمد خاں — عمر ۱۵ سال

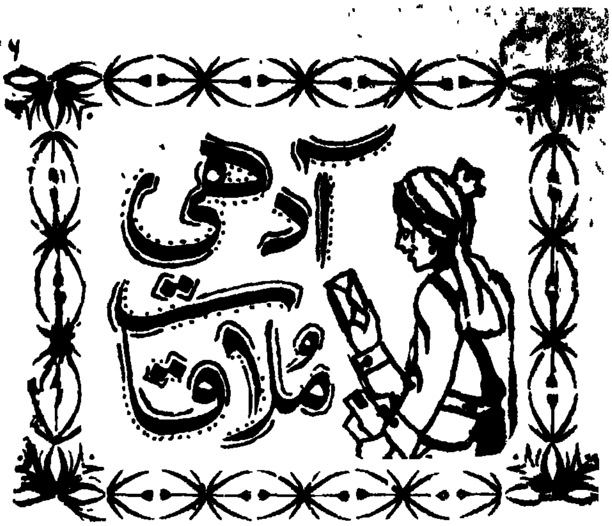
مشغلہ: نماز پڑھنا۔ کرکٹ کھیلنا۔ اشعار لکھنا۔

پتا: مکان نمبر ۲۶۵-۸۱۱ فتح گنج ناندیڑ ۴۳۱۶۰۱

آفتاب احمد — عمر ۱۲ سال

مشغلہ: اردو، انگریزی رسائل پڑھنا۔ کرکٹ کھیلنا۔

پتا: ۶۷-۲-۲۲ دبیر پورہ حیدر آباد ۲۴۰-۵۰۰۰۲۴ اے پی۔



ماہ جنوری ۱۹۸۳ء کا "پیام تعلیم" باصرہ نواز ہوا، سرورق کا فوٹو خوب صورت ہے۔ "پیام تعلیم" جیسے ہی ہمارے گھر آتا ہے۔ ہم بھائی بہنوں میں چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی ہے۔ ہاں اس جنگ میں بڑے لوگ بھی پیچھے نہیں رہتے۔ اس شمارے میں خاں شفیق کی کہانی "بالشتیے کے جوتے"، مسعود احمد برکاتی کی کہانی "کاغذ کی بھیلی"، محمد جیلانی کی کہانی "شرم بڑی بلا ہے"۔ سطوت رسول کی نظم "ایشیاڈ-۸۲" اور عزیز مرادآبادی کی نظم "جمہوریت کا دن ہے" کافی دلچسپ اور معلومات کا خزانہ ہے۔ میرے طرف سے تمام "پیام تعلیم" کے قلم کاروں کو مبارک باد ہے۔

محمد انور عادل عثمانی

محلہ پتیانہ۔ پوسٹ آفس کلٹی ۱۳۳۷۱۳، بردوان مغربی بنگال

★ ★ ★

نومبر کے پیام تعلیم کے مندرجات سے جو میں نے تاثر لیا ہے۔ وہ کچھ اس طرح ہے، جاوید نہال حشمی کی کارٹونی تصاویر نہایت دلچسپ ہے ابراہیم فکری صاحب کا مترجمہ مضمون "ڈرپوک مرغی" کافی متعارف پلاٹ ہے، اس سے قبل اس کہانی کا اردو ترجمہ بارہا ہو چکا ہے، سلطان احمد صاحب کی کہانی "چار کٹوری چاول"، بھی ادب عربی کا پس منظر ہے، کاش کہانی نگار مذکورہ کہانی کے سابقہ کردار کو بحال رکھتے ہوئے چند اصلاحی پہلو اپنی طرف سے شامل کر دیتے تو یہ کہانی زیادہ موثر ثابت ہوتی،

پورے پرچہ میں سب سے زیادہ بامقصد موضوع اور ایک انوکھے اور اچھوتے پلاٹ کو صفحۂ قرطاس پر لانے والے جناب غلام صابر قدیری سندیلوی صاحب ہیں جن کا انداز نگارش ادیبانہ ہونے کے ساتھ ساتھ ناصحانہ بھی ہے، پیامی قلم کار "محنت کی کمائی" سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں، "بچوں کی کوششوں میں" بچے اگر بڑوں سے مضمون لکھوا کر اپنے نام سے شائع نہ کریں تو یہ بچوں کے لیے زیادہ سودمند ثابت ہوگا۔

اردون ملک، اکاؤنٹنٹ

کے۔ آر۔ پی۔ گرگل۔ جموں کشمیر

★

ماہ دسمبر ۱۹۸۲ء کا پیام تعلیم دستیاب ہوا۔ سبھی کہانیاں پسند آئیں۔ یوسف ناظم کی کہانی "سوکھا میوہ" سید کاظم رضا کی کہانی "مگرمچھ کے آنسو"، سلطانہ واحدی کی کہانی "درخت کی گواہی" اور محبوب راہی کی نظم "ٹامی میرا نام" اچھی لگی۔

"بچوں کی کوششیں" میں انور عادل عثمانی کی کہانی "غرور کا سر نیچا" بہت پسند آئی

ناہید افشاں

پتیانہ محلہ۔ کلٹی بردوان

★ ★

دسمبر ۸۲ء پیام تعلیم کا تازہ ترین شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ انسائیکلو پیڈیا کافی معلوماتی ہے۔ آپ نے یوسف ناظم کی کہانی "سوکھا میوہ"، سید کاظم کی کہانی "مگرمچھ کے آنسو"، تسکین جہاں کی کہانی "میرا خواب"، اختر الواحد شاکرہ کی کہانی "رمضانی شعبانی" اور محبوب راہی کی نظم "ٹامی میرا نام"، کو شامل کر کے رسالے کی زینت میں چار چاند لگا دیے۔

محمد اختر عادل عثمانی

پتیانہ۔ کلٹی۔ بردوان

★ ★



مرتبہ: موثق الدین

ادھر ادھر سے

ننھی کتاب کی اشاعت

مشہور ادیب شاعر بدیع الزماں خاور کی بچوں کے لیے لکھی ہوئی کامیاب نظموں کا مجموعہ "ننھی کتاب" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ اس کی قیمت چھ روپے ہے۔ ●

نیشنل بک ٹرسٹ کا، اُردو ایوارڈ بشرہ سلیم کو

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے اپنی سلور جبلی تقریبات کے سلسلہ میں طلبہ کے لیے قومی سطح پر انشا پردازی کے ایک مقابلہ کا اعلان کیا تھا۔ جو تمام دستوری زبانوں کے لیے تھا۔ اُردو بھی اس میں شامل تھی۔ موضوع تھا "میں کتاب کیوں پڑھتا/پڑھتی ہوں اور کیا پڑھتا/پڑھتی ہوں"۔ دہلی پبلک اسکول کی طالبہ بشرہ سلیم نے اُردو کا انعام جیتا ہے۔ ●

بہترین طالبہ کو انعام

دہلی ۹ر جنوری کو شکشت سماج کی طرف سے اچھے طلبہ وطالبات اور سماجی خدمات انجام دینے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہوئے وزیر قانون جناب جگن ناتھ کوشل نے انعامات تقسیم کیے جس میں گورنمنٹ گرلز مڈل اسکول بلیلی خانہ کی طالبہ نسیم جہاں نے بہترین طالبہ کا انعام پایا اور محترمہ شمیم بیگم ہیڈ مسٹریس اسکول ہذا نے سرسوتی ایوارڈ حاصل کیا۔ ●

معرفت: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بمبئی ۳

انجمن اسلام کے اُردو میڈیم بوائز اسکولوں کا سیمینار

بمبئی ۸۰ر نومبر، اُردو بوائز بورڈ آف انجمن کی جانب سے آج صابو صدیق پالی ٹیکنیک کے المالطیفی ہال میں انجمن اسلام گروپ کے اُردو میڈیم بوائز اسکولوں کا ایک روزہ سیمینار منعقد ہوا اس سیمینار کا مقصد اُردو ذریعہ تعلیم کے اداروں میں تعلیم کا معیار کیوں بہت پست ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس کو اونچا کرنے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس پر بحث کرنا تھا۔

سیمینار کا انعقاد انجمن اسلام کے بوائز بورڈ کے چیرمین اسحاق جمخانہ والا کی معرفت ہوا تھا۔

انجمن کے صدر جناب معین الدین حارث نے سیمینار کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ ●

دروازوں کا درخت

سمرنا (ترکی) میں ایک ایسا درخت ہے جس کا تنا قدرتی طور پر اس طرح سے تین حصوں میں بٹا ہوا ہے کہ تین دروازے سے بن گئے ہیں۔ تینوں دروازوں میں سے ایک ایک سڑک گزرتی ہے۔ سمرنا آنے والے سیاح اس عجیب کو درخت کو دیکھتے ہیں اور اس کی تصویریں یادگار کے طور پر ساتھ لے جاتے ہیں۔ ●

سب سے بڑی بسیں

دنیا کی سب سے بڑی بسیں واٹن کارپوریشن آف انڈیانا نے مشرق وسطیٰ میں استعمال کے لیے بنائی ہیں۔ ان کی لمبائی ۷۶ فٹ ہے اور ان میں ۱۲۱ سیٹیں ہیں۔ ●

ہمارے دفتر میں رسالہ نہ ملنے کی شکایتیں آتی رہتی ہیں ہم پوری ذمہ داری سے پرچہ پوسٹ کرتے ہیں لیکن پھر بھی آپ کو رسالہ نہیں ملتا۔ ایسی صورتوں میں اسی مہینے کے پہلے ہفتے میں اطلاع دینا ضروری ہے۔ ورنہ پرچہ دوبارہ بھیجنا ممکن نہ ہو سکے گا۔

(سرکولیشن منیجر)

بچوں کی کوشش



علم کی دولت

جاوید ہر سال کی طرح اس سال بھی ساتویں کلاس میں اوّل آیا۔ وہ بے حد غریب تھا۔ لیکن بچپن ہی سے اس کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بہت ذہین تھا۔ ہمیشہ اپنے کلاس میں فرسٹ آتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ساتویں کلاس تک پہنچا۔ لیکن اب اس نے اپنی مالی حالت سے مجبور ہو کر پڑھائی چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے والد رکشا چلاتے تھے۔ جس سے اس کے گھر کا خرچ بہت مشکل سے چلتا تھا۔ جاوید کے ابّا کو جاوید کو پڑھانے کا بہت شوق تھا اب تک تو انھوں نے جاوید کو کسی نہ کسی طرح سے ساتویں کلاس تک پڑھا دیا لیکن اب نئے سال کی فیس اور کتاب کا انتظام کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔

سال کے آخر میں اسکول کا جلسہ ہوتا۔ اس جلسہ میں شہر کے معزز لوگ اور اسکول کے ماسٹر، ہیڈ ماسٹر، اسکول کے تمام لڑکے شریک ہوتے۔ ہر سال کی طرح آج بھی سالانہ جلسہ تھا۔ جاوید بھی اس جلسہ میں شریک ہوا۔ آج تمام لڑکے جلسہ میں نئے نئے لباس پہن کر آئے۔ لیکن جاوید کے جسم پر روز کی طرح آج بھی پھٹے پرانے کپڑے تھے۔ تمام لڑکے جاوید کا مذاق اُڑا رہے تھے جاوید چپ چاپ ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔

جلسہ شروع ہوا، کسی نے نظم سنائی، کسی نے ترانہ گایا اور کسی نے چھوٹی موٹی تقریر کی۔ آخر میں پرنسپل صاحب نے تقریر کی۔ تقریر کے بعد انھوں نے ایک لڑکے کو رجسٹر لانے کے لیے کہا۔ جب پرنسپل صاحب اسکول کے تمام لڑکے کی حاضری دیکھ رہے تھے تو ان کی نظر جاوید کی حاضری پر پڑی۔ یہ دیکھ کر انھیں بہت تعجب اور خوشی ہوئی کہ پورے اسکول میں جاوید ہی ایک ایسا لڑکا تھا جو سال بھر میں ایک دن بھی غیر حاضر نہیں ہوا تھا۔

انھوں نے فوراً جاوید کو اپنے پاس بلایا اور وفورِ مسرت سے اپنے گلے لگایا اور کہا کہ "مجھے بہت خوشی ہے کہ تم اپنے کلاس میں اوّل آئے اور ایک دن بھی کلاس سے غیر حاضر نہ ہوئے۔ تمہارے ہی جیسے ہونہار اور محنتی لڑکے ملک کا نام روشن کرتے ہیں۔ اس خوشی میں آج سے تمہارے تعلیم و تربیت کا ذمّہ میں لیتا ہوں۔"

جاوید کا یہ سن کر خوشی کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ اس نے پرنسپل صاحب کا شکریہ ادا کیا اور دوڑ کر اپنے ماں باپ کو یہ خوشخبری سنائی۔ ماں باپ اور جاوید نے خدا کا شکر ادا کیا۔

● فیروز سعید، برنپور، بردوان

رشکِ وطن

اے وطن عظمت تری ہے
شان اور شوکت تری ہے
تو زمیں پر آسماں ہے
ہر طرف شہرت تری ہے
ہے محبت تجھ سے سب کو
ہر جگہ عزت تری ہے

گنگا، جمنا اور ہمالہ
تاج بھی عظمت تری ہے
گاندھی، آزاد، و جواہر
تجھی بھی قسمت تری ہے
رشک ہونا تجھ پہ سب کا
اے وطن حکمت تری ہے
بے سہاروں کا سہارا
تو بنا، رحمت تری ہے
خدمتیں موقوف تیری
ہر جگہ خدمت تری ہے
گرتوں کو اونچا اٹھانا
آج بھی فطرت تری ہے
سربلندی ہو جہاں میں
سب کو ہی رغبت تری ہے
تیری منزل سب سے آگے
ارتقا خصلت تری ہے
دھرم کی تہمتیں پھر بھی
ایک ہی ملت تری ہے
پاسباں ہر فرد تیرا
ایکتا قوت تری ہے
ہے زمانہ تجھ سے روشن
آج بھی وقعت تری ہے

● جاوید اختر روشن
(انسان اسکول، کشن گنج (پورنیہ)

شہید اشفاق اللہ خاں

اشفاق اللہ خاں کی پیدائش شاہجہاں پور کے ایک عالی نسب پٹھان خاندان میں ہوئی تھی۔ اشفاق اللہ خاں ایک سچے اور فرائضِ دینی کے پابند کھرے مسلمان تھے۔ وہ کھلتے ہوئے گندمی رنگ کے لمبے چوڑے اور خوش اخلاق شخص تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے ادیب، خطیب شاعر اور مفکر بھی تھے۔

اپنے ملک کی آزادی کے لیے ان کے دل میں تڑپ [illegible] تھی۔ لہٰذا انھوں نے انقلاب کا راستہ اپنایا اور ۱۹۲۳ء میں ہند[illegible] پبلک اسوسی ایشن میں شمولیت اختیار کرلی۔ اس جماعت میں چندر شیکھر آزاد، بھگت سنگھ، اختر حسین، رام پرشاد بسمل [illegible] مجاہدینِ آزادی شامل تھے۔ اس جماعت کی جھڑپ انگریزی فوج سے برابر ہوا کرتی تھی اس لیے انگریز سرکار ان لوگوں پر کڑی نظر رکھتی تھی۔ اس جماعت کا آخری کارنامہ کاکوری ٹرین ڈکیتی تھا۔ اس وقت اس جماعت کو اسلحہ اور روپیوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لیے ان کے ساتھیوں نے کاکوری ٹرین میں ڈکیتی کا منصوبہ بنایا۔ اشفاق اللہ خاں نے اس منصوبے کی مخالفت کی کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ وہ بہت دور کی سوچ رہے تھے۔ لیکن ان کے ساتھیوں نے ان کی بات سنی ان سنی کردی۔ ۹/ اگست ۱۹۲۵ء کو ۸ ڈاؤن ٹرین کو روک لیا گیا اور سرکاری خزانہ لوٹ لیا گیا۔ اشفاق اللہ خاں نے اختلاف کے باوجود بڑی دیانتداری سے اپنے کام کو انجام دیا۔ اس ڈکیتی کے بعد انگریز پاگل ہوگئے۔ جگہ جگہ چھاپے پڑے اور بہت سے مجاہدین گرفتار کرلیے گئے۔ اشفاق اللہ خاں بہت دنوں تک روپوش رہے لیکن بعد میں وہ بھی گرفتار کرلیے گئے۔ ان سبھوں پر کیس چلا اور پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ اس کیس میں رام پرشاد بسمل روشن سنگھ کے ساتھ ساتھ اشفاق اللہ خاں کو بھی پھانسی دے دی گئی۔

"پھانسی کی سزا سننے کے باوجود اشفاق اللہ خاں ہمیشہ مسکراتے ہوئے سبھوں سے ملتے تھے۔ گرفتاری کے وقت ان کا وزن ۱۷۸ پونڈ تھا اور جب پھانسی دی جانے والی تھی تو ان کا وزن بڑھ کر ۲۰۳ پونڈ ہو چکا تھا آج تک ایسا کوئی ریکارڈ نہیں دیکھا گیا ہے۔"

رام پرشاد بسمل اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں:
"اشفاق اللہ خاں جیسے چند نوجوان ہندوؤں میں بھی پیدا ہوجاتے تو آزادی بہت پہلے حاصل ہوجاتی۔"

پھانسی سے ایک دن قبل انھوں نے اپنی والدہ کے نام ایک خط میں اس طرح لکھا تھا، "میری پیاری امی جان! کل صبح سے

عورت میں تمہارے سامنے آئے تو آنسو مت بہانا بلکہ مجھے ایسے رخصت کرنا جیسے ماں اپنے بیٹے کو دولھا بنا کر دلھن ساتھ لانے کے لیے بارات کے ساتھ بھیجتی ہے۔ ماں تمہارا بیٹا آزادی کی دلھن کو لے کر ضرور آئے گا۔"

پھانسی کے وقت ان کی زبان پر کلمہ طیبہ جاری تھا جب پھانسی کے پھندے پہ لٹکایا جا رہا تھا تو ان کے زبان پر درج ذیل شعر تھا ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

● سید ظفر اسلم
پٹنہ مسلم ہائی اسکول پٹنہ ۴

باڑھ

"باڑھ آگئی! باڑھ آگئی"
کا شور
چاروں طرف سے آنے لگا ہے۔
باڑھ سے پریشان حال انسانوں کا،
برا حال ہونے لگا ہے۔
سبھی ان کی حالت پر، بہت زور شور سے
ماتم منا رہے ہیں۔
اور انھیں دیکھنے کے لیے،
گنگا جی کی طرف جا رہے ہیں۔
لیکن جب ان کی امداد کے لیے،
گھر گھر جا کر،
دروازے کھٹ کھٹا کر،
چندا مانگا جاتا ہے۔ تو!
"ہم خود ہی غریب و پریشان ہیں"
کہہ کر
ایک جھٹکے سے
دروازہ بند کر دیا جاتا ہے!

● شنو بنت ہنر

لالچ

بہت پرانی بات ہے کہ کسی گاؤں میں ایک بہت ہی غریب کسان رہتا تھا۔ اس کے پاس چھوٹا سا کھیت تھا۔ ایک دن وہ کھیت جوت رہا تھا تو اچانک کیا دیکھتا ہے کہ ایک سارس اس کے کھیت کے ایک کونے میں پڑا تڑپ رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی وہ فوراً وہاں پہنچ گیا اور اس کو اٹھایا۔ دیکھتا کیا ہے کہ اس کا ایک پیر بہت زخمی ہے اور خون بہہ رہا ہے۔ کام کاج چھوڑ، وہ سارس کو گھر لے آیا۔ گھر لا کر اس نے اس کی مرہم پٹی کی۔ کچھ دن میں سارس ٹھیک ٹھاک ہو گیا اور وہ اڑنے کے قابل تھا۔ کسان نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے اس کو اڑا دیا اور دعا دی جہاں بھی رہو خوش رہو اور دوسری بار ایسی تکلیف میں نہ پڑو۔

دوسرے دن کسان پھر صبح کھیت میں ہل جوت رہا تھا کہ دیکھتا کیا ہے کہ وہی سارس اڑتا ہوا چلا آ رہا ہے اس نے سارس کی طرف دیکھا سارس نے کھیت کے اوپر تین چکر لگا کر اپنے منہ سے تین تربوز کے بیج زمین پر گرا دیے اور واپس لوٹ گیا۔ کسان نے وہ بیج اٹھائے اور زمین میں بو دیے۔ پانچ چھ دن کے بعد اس میں انکھوے پھوٹ آئے۔ ہری پتی نکل آئی۔ پھر پھول نکل آئے۔ کچھ دنوں میں اتنے بڑے بڑے تربوز لگے۔ کہ شاید ہی پہلے کسی نے دیکھے ہوں ــــ کسان وہ تینوں تربوز توڑ کر گھر لایا۔ اس کسان کے رشتہ دار بھی اسی کے طرح بالکل غریب تھے۔ اس نے سب رشتہ داروں کو دعوت دی۔ تھوڑی دیر میں مہمان جمع ہونے لگے اور بڑے بڑے تربوز دیکھ کر حیران ہوئے۔ کبھی تربوزوں کو دیکھتے تو کبھی اس کسان کو۔ آخر کار جب سب جمع ہو گئے تو پہلا تربوز کاٹا تو اس میں سونے کی اشرفیاں بھری ہوئی تھیں اب سب حیران ہوئے۔ دوسرا اور تیسرا تربوز کاٹا تو اس میں بھی اشرفیاں بھری ہوئی تھیں۔

تربوزوں سے اشرفیاں نکلنے کی خبر آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ کسان نے سب اشرفیاں اپنے رشتہ داروں میں برابر برابر بانٹ دیں۔

اسی گاؤں میں ایک لالچی شخص بھی رہتا تھا۔ جب اس نے سنا تو

وہ کسان کے گھر آیا اور اس نے کسان سے اشرفیوں کا قصہ پوچھا۔ کسان نے اس کو سارا قصہ سنا دیا۔

لالچی آدمی سارا قصہ سُن کر کھیتوں کی طرف چل پڑا اور سارس کو تلاش کرنے لگا۔ تلاش کرتے کرتے آخر شام کو اسے ایک سارس نظر آیا۔ سارس ایک کھیت میں آرام کر رہا تھا۔ لالچی آدمی آہستہ آہستہ سارس کے پاس گیا اور ڈنڈا مار کر اس کے پیر کو زخمی کر دیا۔ خود زخمی کر کے لالچی آدمی نے سارس کو گود میں اُٹھایا اور گھر لے آیا۔ گھر لا کر اس نے نوکر کو حکم دیا اس کے پیر کی مرہم پٹی کر کے اس کی دیکھ بھال کرو۔ مالک کا حکم سنتے ہی نوکر اس کی خدمت میں لگ گئے۔

جب سارس اڑنے کے قابل ہو گیا تو اس نے بھی سارس کو اُڑا دیا۔ اس کے بعد وہ روز اپنے کھیت جاتا تو دن بھر سارس کا انتظار کرتا کہ سارس تربوز کا بیج لائے اور اس کے کھیت میں پھینک دے روزانہ ہی وہ اسی انتظار میں بیٹھا رہتا اور شام کو مایوس گھر لوٹتا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ وہی سارس اُڑتے ہوئے آ رہا ہے اس نے چکر لگا کر اپنے مُنہ سے تربوز کے تین بیج گرا دیے۔ لالچی نے لپک کر وہ تینوں بیج اٹھا لیے اور زمین میں بو دیے۔

کچھ دنوں بعد تربوز کی بیل نکل آئی اور اس میں تین تربوز نکل آئے۔ جب وہ تینوں تربوز بڑے ہو گئے تو لالچی نے اس کو توڑا اور اپنے رشتہ داروں کو بلایا۔ جب سب رشتے دار جمع ہو گئے تو بولا کہ اس امید میں نہ رہے کہ اس کو اشرفیاں ملیں گی اس نے کہا۔ یہ میری محنت کا پھل ہے اور میں ہی اس پھل کا فائدہ اٹھاؤں گا۔ یہ سن کر سب اٹھ کر چلے گئے۔ اب اس نے چھری لے کر تربوز کاٹنا شروع کر دیا۔ تربوز کاٹا تو اس میں سے بھن بھن کرتی ہوئی بھڑیں نکلیں اب تو لالچی گھبرا کر بھاگا مگر بھڑوں نے اس کو دبوچ لیا اور اتنے ڈنک مارے کہ وہ پھول کر کُپّا ہو گیا۔ کئی مہینے تکلیف الگ رہی۔

سبق: کسی کو تکلیف پہنچا کر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔

● عبدالخالق، ناگپوری،
بڑگانو، جی ٹی روڈ، ناگپور

دعا

اے خدا، اے خدا
سُن لے میری دعا
نیک رہ پر چلا
مجھ کو میرے خدا
بد کی صحبت سے تو
مجھ کو ہر دم بچا
تو حسد سے مجھے
دُور رکھنا سدا
پیار کی شمع تو
میرے دل میں جلا
اے خدا سُن لے اب
نالہ جاوید کا

● جاوید نہال حشمی
۲۸، این سی۔ روڈ، کانکی نارہ ۔ ۷۴۳۱۲۶

سبق

امّی آؤ ابّو آؤ
آج ہمیں تم سبق سناؤ
ابّو تم کیوں دیر سے آئے
امّی کیوں چیز نہ لائے
امّی کیوں ہے صورت لٹکی
کل تم نے کیوں ہنڈیا پٹکی
سمجھے سمجھے جان گئے ہم!
چہروں سے پہچان گئے ہم!
تم دونوں میں جنگ ہوئی ہے
عقل ہماری دنگ ہوئی ہے
تم سے تو ہم بچے اچھے
جھگڑا کرتے پھر مل جاتے
چھوڑو جھگڑا کھانا کھاؤ
آج ہمیں تم سبق سناؤ

● ایم اقتدار خاں
غیبی نگر بھیونڈی۔

بھائی بہن

کسی جھگڑے کی وجہ سے بھائی بہن کی بول چال بند ہوگئی۔ جب کافی دن بیت گئے تو بھائی سے نہیں رہا گیا اور اس کو ایک ترکیب سوجھی۔ ایک دن دوپہر کو وہ ٹارچ جلا کر کچھ ڈھونڈنے کا بہانہ کرنے لگا۔ اس عجیب حرکت کو دیکھ کر بہن سے چپ نہ رہا گیا۔ اس نے پوچھ لیا: "آخر تم دن کے وقت اتنی روشنی میں ٹارچ جلا کر کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

بھائی نے جھٹ جواب دیا: "میں اپنی بہن کی زبان ڈھونڈ رہا ہوں جو اب مل گئی۔"

بھائی کی بات سن کر بہن کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔

● قاضی شہاب ظہیر
آسنسول۔ مغربی بنگال

دوستانہ

گئی بیت چھٹی کھلی پاٹھ شالہ
ہر اک طفل مکتب نے بستہ سنبھالا
پڑا پھر سے بچوں کو اسکول جانا
پلٹ آیا ہے گویا گزرا زمانا
چھڑیں پھر سے پڑھنے پڑھانے کی باتیں
سوالات لکھنے لکھانے کی باتیں
وہی ماسٹر جی وہی ہیں پرنسپل
وہی چھوٹے قد والا چپراسی منگل
وہی اپنے ساتھی شرارت کے پیکر
پریت اور وجے لارنس وجیدر
کتابوں میں پھر سر کھپانا پڑے گا
سبق یاد کر کے سنانا پڑے گا
نہیں یاد ہوگا تو مرغا بنیں گے
کہ ہم آدمی ککڑوکوں بھی کریں گے
رہائی سے الجھیں گے سائنس پڑھیں گے
یہی سب تو پڑھ ہم پڑھ کے آگے بڑھیں گے
سوالوں جوابوں سے کاہے کو ڈرنا
ہمیں اس برس اور محنت ہے کرنا

● محمد احتشام الدین
محلہ بنولیہ، بہار شریف (نالندہ)

چالاک دوست

ایک مرتبہ چار دوست سفر کر رہے تھے۔ ان میں ایک برطانوی دوسرا امریکی تیسرا اسپینی اور چوتھا فرانسیسی تھا۔ اتفاق سے فرانسیسی دوست کا راستے میں انتقال ہوگیا۔ جس کا ان تینوں کو بڑا صدمہ ہوا۔ چنانچہ جب لاش کو سپرد خاک کرنے کا وقت آیا تو برطانوی دوست نے اس کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے کہا:

"دوستو! اس بے چارے کی زندگی میں تو ہم لوگوں نے اس کی کوئی قدر نہیں کی لیکن اب جب وہ ہم میں موجود نہیں ہے، اس وقت تو اس کے لیے ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہیے اور میری رائے یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک آدمی اس کی قبر میں دس دس روپے رکھ دے تاکہ ضرورت کے وقت یہ رقم اس کے کام آسکے۔"

اتنا کہہ کر اس نے فوراً دس کا نوٹ نکال کر قبر میں رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر امریکی ذرا جھجکا اور کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا کہ خواہ مخواہ یوں روپے ضائع جائیں گے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے جیب سے چیک بک نکال کر دس روپے کا چیک قبر میں رکھ دیا اور اطمینان سے کھڑا ہوگیا۔ کیونکہ اس کو یقین تھا

کہ یہ چیک مردہ زندہ ہوکر بینک سے بھنا نہیں سکتا ہے مگر اس کے بعد ہی جب اسپینی کی باری آئی تو اس نے بیس روپے کا ایک چیک لکھ کر قبر میں رکھ دیا اور قبر میں سے برطانوی دوست کا رکھا ہوا دس روپے کا نوٹ اٹھا لیا۔

● سید قمر العارفین مضطر
ضلع اورنگ آباد (بہار)

گلی ڈنڈا کھیلیں گے

گلی ڈنڈا کھیلیں گے
گلی ڈنڈا کھیلیں گے

پوچھیں گے نہ ممی سے
چھپتے چھپاتے ڈیڈی سے
پچھلے در سے بھاگیں گے
گلی ڈنڈا کھیلیں گے

چپکے سے اسکول سے بھاگیں
گول پڑھائی کر ڈالیں
فیل ہوں تب سوچیں گے
گلی ڈنڈا کھیلیں گے

پانی پڑتا ہے تو پڑے
پاؤں چاہے پھسلا کرے
گر جائیں تو دیکھیں گے
گلی ڈنڈا کھیلیں گے

چوٹ لگے تو لگنے دو
خون بہے تو بہنے دو
گر جائیں تو دیکھیں گے
گلی ڈنڈا کھیلیں گے

چاہے کوئی چغلی کرے
کہہ دے خالد ڈیڈی سے
مار پڑی تو کھائیں گے
گلی ڈنڈا کھیلیں گے

● اسحاق احمد خالد معرفت خواجہ تاج احمد
پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف آفس۔ نرمل۔۵۰۴۱۰۶

بے وقوف مالی

وارانسی کے راجا کے باغ کی رکھوالی ایک مالی کرتا تھا۔ ایک بار مالی کا دوست اس کے پاس آیا اور بولا: "کل شہر میں میلا ہو رہا ہے۔"

"بڑے مزے دار تماشے ہوں گے نا؟ کاش میں بھی وہاں جا پاتا۔" مالی نے کہا۔

اس کے دوست نے پوچھا: "کیا تم وہاں نہیں جا رہے ہو؟"

"چلا جاؤں گا تو باغ کون سینچے گا۔" مالی نے کہا۔

"بات تو ٹھیک ہے۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس کا دوست چلا گیا۔ بے چارا مالی اداس ہوکر باغ میں بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا۔ آج اگر میرا بیٹا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا وہ کام سنبھال لیتا اور میں مزے سے میلا دیکھتا۔ تب مالی کے پاس ایک بندر آیا اور بولا: "ارے مالی، تم آج اتنے اداس کیوں ہو؟"

مالی نے کہا: "کیا کروں بندر بھائی! بات یہ ہے کہ کل شہر میں میلا ہو رہا ہے۔ میں بھی وہاں جانا چاہتا ہوں۔ لیکن میری غیر حاضری میں یہاں باغ سینچنے والا کوئی نہیں ہے۔"

بندر بولا: "بس! اتنی سی بات کے لیے منہ پھلائے بیٹھے ہو! ارے بھائی آخر ہم کس کام آئیں گے۔ سینچائی ہم کریں گے۔ تم مزے سے چلے جاؤ۔"

مالی نے کہا: "سچ تم کتنے اچھے ہو۔ بندر بھائی۔ میلے سے واپس آتے وقت تمہارے لیے کوئی اچھی سی

لے کر آؤں گا! اچھا تو اب میں چلتا ہوں۔" مالی بڑا
ان ہوا اور باغ کو بندر کے حوالے کر کے شہر چل دیا
اور بندر باغ سینچنے کا پروگرام بنانے لگا۔ بندر نے
سوچا۔ کل باغ کی سینچائی کرنی ہے، اس لیے اپنے
سارے ساتھیوں کو جمع کرنا چاہیے۔ بندر اپنے ساتھیوں
کے پاس گیا اور بولا" دوستو ہمارا دوست مالی میلا
دیکھنے کے لیے شہر گیا ہے۔ اس لیے کل باغ
کی سینچائی کا کام ہمیں کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے ہم سینچائی ضرور کریں گے۔"
بندروں نے کہا۔

دوسرے دن بندروں نے باغ کی سینچائی شروع
کردی۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک بندر نے سوچا۔ کچھ
پیڑ بڑے ہیں اور کچھ چھوٹے کس میں کتنا پانی دیا جائے؟
سردار سے پوچھتا ہوں اور وہ بندر سردار کے پاس
پہنچا اور بولا" سردار کچھ پودے بڑے ہیں اور کچھ چھوٹے
کس میں کتنا پانی دیا جائے"؟

سردار نے کہا:" سب سے کہہ دو کہ پانی دینے
سے پہلے ایک بار پودا اکھاڑ کر دیکھا جائے اگر اس کی
جڑ چھوٹی ہے تو اس میں ایک بالٹی پانی ڈالو اور اگر
اس کی جڑیں بڑی ہیں تو اس میں دو بالٹی پانی ڈالو!
سمجھے؟"

بندر نے کہا:" واہ سردار آپ کے دماغ کی داد
دینی پڑے گی! کتنے عقل مند ہیں آپ!" بیوقوف
بندروں نے سارے پودے اکھاڑ دیے اور سارا
باغ اجاڑ ڈالا۔ مالی دوسرے دن واپس آیا تو بے چارا
سر پکڑ کر رہ گیا۔

اس سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟ "اپنا کام
ایسے آدمی کے سپرد کرنا چاہیے جو عقلمند ہو۔ ورنہ
مالی کی طرح اسے بھی پچھتانا ہوگا۔"

● شہلا نسیم
ڈاکٹر ڈبلیو۔ اے۔ ہاشمی، محلہ کمار اچوک، مظفرپور





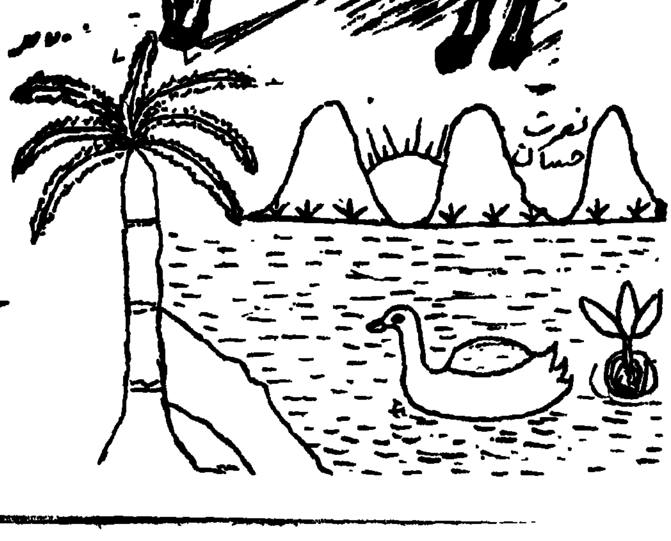






لکھیے: کون سی تصویر پہلے انعام کی مستحق ہے





Payam-i-Taleem Feb 83

Regd No D(SE)-043

Feb. 1983

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی ۶


پیام تعلیم

ماہنامہ
پیامِ تعلیم
نئی دلی

مارچ ۱۹۸۳ء | جلد: ۲۰

اڈیٹر: ولی شاہجہاں پوری

قیمت فی پرچہ: ۱/۷۰

سالانہ ۱۲ روپے
غیر ممالک سے ۷۵ روپے

بچوں سے باتیں

کہیے فروری کا شمارہ کیسا لگا؟

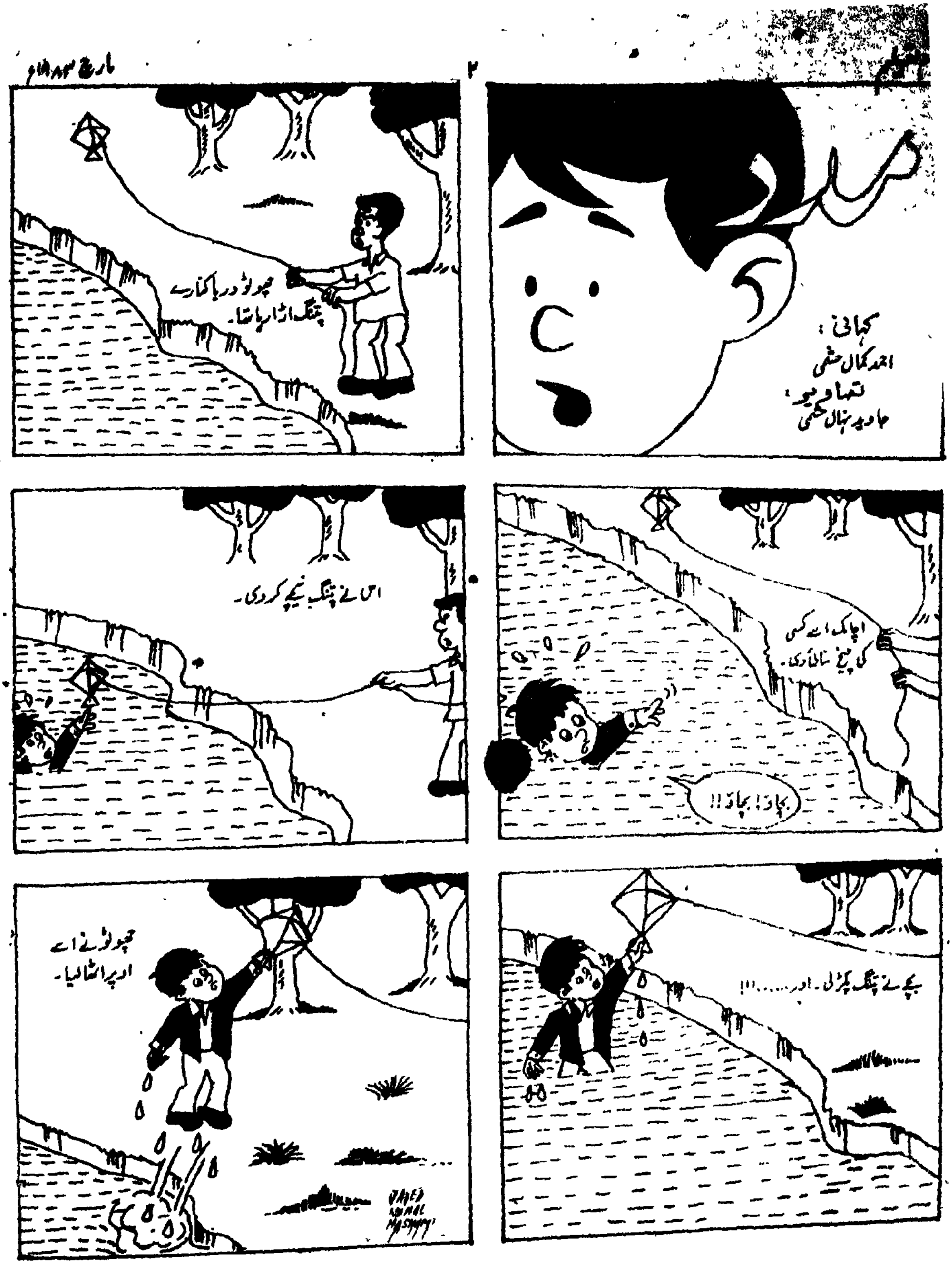
لیجیے مارچ کا پرچہ بھی حاضر ہے۔ اس مرتبہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا نام اپنی بزم میں دیکھ کر آپ چونک پڑیں گے۔ فاروقی صاحب کا شمار بڑے ادیبوں بلکہ بہت بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے پیام تعلیم کو بھی توجہ کے قابل سمجھا اور اچھی سی نظم عنایت فرمائی۔

ڈاکٹر قمر رضوی نے وعدہ کیا ہے کہ جلد ہی ایک دلچسپ سلسلہ جغرافیائی مضمون کا شروع کرنے والے ہیں۔ اس شمارے میں عراق سے متعلق مزید جانکاری حاصل کیجیے۔ دوستکاری میں اب دلچسپی پیدا ہونا شروع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ آپ "مچھلی کا بیاہ" (نادم سیتاپوری)، دور کی کوڑی (معین الدین الہ آبادی)، "سائنس کو آنچ نہیں" (سلطان آزاد) جیسی دلچسپ کہانیوں سے لطف حاصل کیجیے اور راجا رام موہن رائے سے بھی ملاقات کیجیے۔

نظموں میں "اچھی گڑیا" (الف قدم)، تتلی رانی (اشفاق احمد) اور ہمت کا ترانہ (سکندر ضمیر) بھی پڑھیے اور تمام مضامین کے بارے میں اپنی رائے لکھیے۔

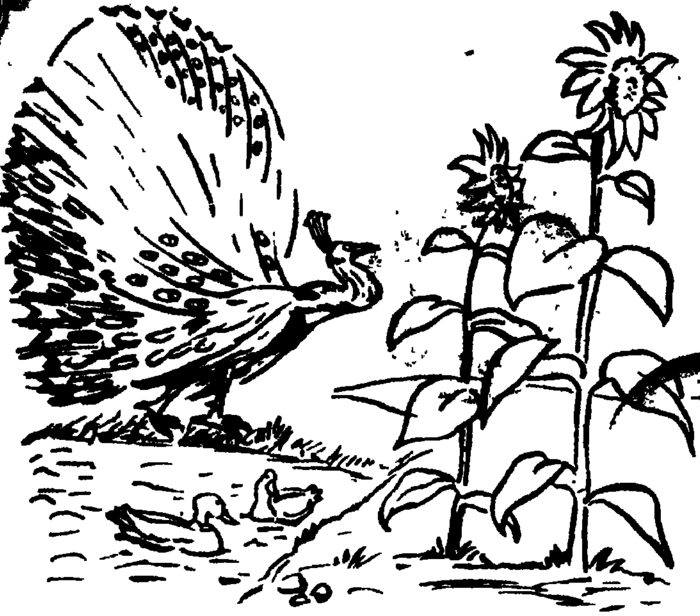
حفیظ جالندھری پر آپ کے اعجاز جی ارشد نے بڑا اچھا مضمون لکھا ہے آئندہ مہینے ملاحظہ فرمائیں۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔


مدد
کہانی:
احمد کمال حشمی
تصاویر:
جاوید نہال حشمی
چھوٹو دریا کنارے
پتنگ اڑا رہا تھا۔
اچانک اسے کسی
کی چیخ سنائی دی۔
بچاؤ! بچاؤ!!
اس نے پتنگ نیچے کر دی۔
بچے نے پتنگ پکڑ لی۔ اور......!!!
چھوٹو نے اسے
اوپر اٹھا لیا۔
JAVED NIHAL HASHMI

شمس الرحمٰن فاروقی

مورنامہ



اس جنگل میں مور بہت ہیں
نیلے پیلے چور بہت ہیں
دن بھر موروں کی جھنکار
اُوپر نیچے چیخ پکار
شیر میاں کو نیند نہ آئی
لے کر اک لمبی سی جمائی
لومڑی بی سے کہلایا
موروں کو کس نے بلوایا
مور تو کرتے شور بہت ہیں
اس جنگل میں مور بہت ہیں
نیلے پیلے چور بہت ہیں
رات کا آنگن چاندی جیسا
دن کا چہرہ تھالی جیسا
رات کے گھر میں کتنے گھوڑے
دن کے کپڑے کتنے جوڑے
مور کے کپڑے کیسے انوکھے
نیلے سُرخ سُنہرے سے
مور کی دُم میں سونے کے چھلّے
اس سے کہنا ہم سے بدل لے
بھورے سُنہرے پروں کو کھولے
مور اُڑا تو سب یہ بولے
اس کے پر کم زور بہت ہیں
اس جنگل میں مور بہت ہیں
نیلے پیلے چور بہت ہیں

ڈی ۱۱/۸۵ کاکا نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

ریحان کی نانی اماں

ریحان کو سب سے زیادہ محبت اپنی نانی اماں سے تھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اُسے دوسروں سے نسبت نہیں تھی۔ اُسے اپنی امی سے بھی پیار تھا، ابو سے بھی گہرا لگاؤ تھا، مگر نانی اماں کو دیکھ کر تو وہ گویا جیتا تھا۔ اس کی نانی اماں تھیں بھی بڑی شفیق۔ بچوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتی تھیں۔ کسی پر اس طرح ناراض نہیں ہوتی تھیں کہ اس سے بولنا، بات کرنا بند کردیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرتی تھیں کہ ریحان یا اس کا بڑا یا چھوٹا بھائی کوئی بُری حرکت کر بیٹھتا تو کہتیں "بیٹا! تم سے یہ امید نہیں تھی۔ تم تو بڑے اچھے لڑکے ہو۔" اگر ریحان کی بہن سے ایسی حرکت سرزد ہو جاتی تو وہ یہی الفاظ کہتیں۔ ہاں بیٹا کے بجائے اسے بیٹی کہہ کر مخاطب کرتیں۔

ریحان کو اس کے ماموں نے گرمیوں کی چھٹیوں میں کراچی آنے کے لیے کہا تو اُسے یہ خیال کر کے دُکھ ہوا کہ وہ چند روز نانی اماں سے دور ہو جائے گا۔ مگر ماموں کی بات بھی ٹال نہیں سکتا تھا۔ وہ کراچی ہی میں تھا کہ ایک روز اس کے ماموں بڑی غم زدہ حالت میں گھر آئے اور انھوں نے بتایا کہ ابھی ابھی ٹیلی فون آیا ہے، "امی فوت ہوگئیں ہیں۔" ریحان کی سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے، مگر جب اس نے دوبارہ سوچا تو اس کی سمجھ میں آگیا کہ اس کی شفیق نانی اماں دنیا سے رخصت ہوگئی ہیں۔

وہ ماموں اور ممانی کے گھر آیا۔ نانی اماں دفنائی جا چکی تھیں۔ انتہائی صدمے کی وجہ سے وہ رو بھی نہ سکا۔ گھر میں گھر کے سارے لوگ موجود تھے، مگر نانی اماں کہیں بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ رات کے وقت اس کی نانی اماں اصرار کر کے اسے دودھ پلاتی تھیں، اس رات وہ چارپائی پر لیٹا رہا اور نانی اماں نہ آئیں تو وہ رونے لگا اور اس وقت تک روتا رہا جب تک اس کی اماں نے آکر اسے صبر کی تلقین کرکے چپ نہ کرا دیا۔



نانی اماں کے بغیر اسے چاروں طرف اداسی ہی اداسی محسوس ہوتی تھی۔ کوئی بھی کام کرتا اس میں دل نہ لگتا۔ اس کی یہی حالت تھی کہ کراچی سے اس کے دوست افضال کا خط آیا کہ وہ ایک مہینے کے لیے لاہور آرہا ہے اور وہ سات بجے اسٹیشن پر پہنچ جائے۔

[illegible] جہان روڈ کرشن نگر لاہور

ریحان کو ایک عارضی سی خوشی ہوئی کہ اس کا بڑا پیارا دوست ایک ماہ تک اس کے پاس رہے گا۔ نانی اماں کی زندگی میں اگر وہ یہ خبر سنتا تو اسے بے اندازہ خوشی ہوتی، مگر اب کیا خوشی ہو سکتی تھی۔

افضال اس کا پرانا دوست تھا۔ پہلی جماعت میں اس سے دوستی کا آغاز ہوا تھا جو آٹھویں جماعت تک رہی دوستی تو اب بھی اس سے تھی، مگر خطوں کے ذریعے سے، کیوں کہ افضال کے ابا جان کا لاہور سے کراچی تبادلہ ہو گیا تھا اور وہ اپنے والدین کے ساتھ چلا گیا تھا۔

ریحان چھے بجے ہی اسٹیشن پہنچ گیا۔ ایک گھنٹہ اس نے ریلوے کے بُک اسٹالوں پر جا جا کر رسالوں کی ورق گردانی کرتے، اِدھر اُدھر گھومتے اور چائے پینے میں گزارا آخر گاڑی پلیٹ فارم پر آ گئی۔

اتنا شور و غل برپا ہوا کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ریحان کو اپنے دوست سے ملنے کا اتنا شوق تھا کہ وہ بار بار دھکے کھاتا تھا، گرتا تھا اور پھر اٹھ کر اس کی تلاش میں مصروف ہو جاتا تھا۔

جن لوگوں کو لاہور اسٹیشن پر اُترنا تھا ان کی بیشتر تعداد اُتر چکی تھی اور باقی لوگ بھی اُتر رہے تھے، مگر افضال کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

انجن نے پہلی سیٹی دی، پھر دوسری ریحان نے دیکھا کہ ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔ اس نے سوچا افضال بھی وہیں ہوگا۔ وہ بھاگ کر اُدھر گیا، گاڑی چل پڑی اور افضال وہاں بھی نہیں تھا۔

"وہ نہیں آیا" ریحان نے دل میں کہا اور اسٹیشن سے باہر نکل کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

کھانا کھا کر وہ کرسی سے اٹھا ہی تھا کہ اس کے دل میں خیال آیا، "ممکن ہے افضال آ گیا ہو۔ گاڑی سے سیکڑوں لوگ اُترے ہیں، وہ بھی اُتر کر چلا گیا ہو اور مجھے نظر نہ آیا ہو" یہ سوچ کر وہ مضطرب ہو گیا اور پھر پاؤں میں بوٹ پہننے لگا اس کی امّی نے دیکھا تو بولیں۔

"ابھی ابھی تو آئے ہو اب ...
ریحان نے انھیں بتایا کہ اس ...
"اب افضال کے گھر جا رہے ہو ...
"جی امّی! اسٹیشن سے وہ سیدھا ...
اس کی امّی نے جانے کی اجازت دے دی ...
افضال کا گھر اس کے گھر سے کافی دور تھا ...
رکشا لیا اور پندرہ بیس منٹ میں اپنی منزل پر ...
ریحان افضال کے گھر بیسیوں مرتبہ گیا ...
افضال کے ابا جان کا کراچی میں تبادلہ نہیں ہوا تھا تو اس گھر میں افضال کے ابا امّی، اس کے تین بھائی اور دو ... بھی رہتی تھیں۔ تبادلے کے بعد اب یہاں افضال کی نانی اماں، اس کی بڑی خالہ اور خالو رہتے تھے اور کوئی نہیں رہتا تھا۔

ریحان نے دروازے پر دستک دی، دروازہ نہ کھلا۔ دوسری بار دستک دی پھر بھی یہی حالت ہوئی تیسری بار دستک دینے پر دروازہ کھل گیا اور دروازہ کھولنے والی افضال کی خالہ تھیں، جن کا چہرہ بڑا مغموم دکھائی دیتا تھا۔



"آؤ بیٹا ریحان!" انھوں نے ...

...اشارہ کیا۔

...وہاں افضال نہیں تھا۔

"...خالہ جان! افضال کہاں ہے؟"

"...کہاں بیٹا! وہ تو آیا ہی نہیں۔"

"...نہیں آیا!"

"آیا ہوتا تو تمھیں نظر نہ آجاتا۔ سات والی گاڑی سے تو ... آیا، ہو سکتا ہے ساڑھے نو بجے والی گاڑی سے آجائے ... بیٹا!"

ریحان کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب اس نے دیکھا کہ افضال کی نانی امّاں پلنگ پر لیٹی ہیں اور ان کے سرہانے کے قریب تپائی کے اوپر دواؤں کی بہت ساری بوتلیں رکھی ہیں۔ ریحان نے سمجھ لیا کہ وہ بیمار ہیں۔

"نانی جان بیمار ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! کئی دن سے بیمار ہیں۔ شام کو تو حالت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ تمھارے خالو دوپہر سے ہسپتال میں ہیں ان کے ایک دوست کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا تھا۔"

ریحان نے اپنی کرسی نانی جان کے پلنگ کے قریب کھسکا لی۔ اس نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بند ہیں اور چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا ہے۔

"چائے پیو گے نا؟" خالہ جان نے پوچھا۔

"نہیں خالہ جان! اسٹیشن پر چائے پی لی تھی۔"

"ایک پیالی اور سہی، آج بڑی سردی ہے۔" اور یہ کہہ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

ریحان نے چائے پی۔ دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ ساڑھے آٹھ بج گئے، پھر نو ہو گئے، خالہ بولیں:

"ریحان بیٹا! سردی بڑھ رہی ہے۔ کیا خبر افضال آتا ہے یا نہیں آتا۔ تم گھر چلے جاؤ۔ صبح آجانا۔"

مگر ریحان گھر جانے پر رضامند نہیں تھا۔ وہ اپنے دوست کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔

"خالہ جان! میں امی سے اجازت لے کر آیا ہوں۔ کسی وقت بھی گھر جا سکتا ہوں۔"

اس دوران میں نانی امّاں چپ چاپ لیٹی رہیں ان کی آنکھیں بند رہیں اور انھوں نے گفتگو میں کوئی حصّہ نہ لیا۔

ساڑھے نو بج گئے تو خالہ جان کہنے لگیں: "اب افضال صبح ہی کی گاڑی سے آئے گا۔ تم جاؤ بیٹا!" ریحان کہنے لگا "نانی جان سے تو کوئی بات ہی نہیں کی" اور خالہ جان کو خیال آگیا۔

"اب امی کو دوا پلانی ہے۔" اور انھوں نے نیلے رنگ کی ایک بوتل اٹھائی۔ اس میں سے ایک خوراک دوا گلاس میں ڈالی اور گلاس ہاتھ میں لے کر ان پر جھک گئیں۔

"لیجیے امی۔"

نانی امّاں نے نہ تو آنکھیں کھولیں نہ منہ۔ خالہ جان پریشان ہو گئیں۔ وہ پکارنے لگیں: "امی جان، امی جان" انھوں نے ان کا شانہ پکڑ کر ہلانے کی کوشش کی، مگر وہ نہ ہلیں۔

ریحان بھی گھبرا کر خالہ جان کے پاس آگیا تھا۔

"کیا ہوا خالہ جان؟"



"پتا نہیں امی کو کیا ہو گیا ہے۔ شام کے بعد تو بالکل ٹھیک تھیں جب ڈاکٹر آیا تھا۔"

خالہ جان نے انھیں بار بار آوازیں دیں۔ ان کے ہونٹ ذرا ہلے، لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔

"خالہ جان! ڈاکٹر کو بلا لاؤں؟" ریحان نے کہا۔
"تمھارے خالو کے دفتر کا ڈاکٹر ہے، سمن آباد میں رہتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں خالہ جان، پتا بتایئے۔"

خالہ جان سے پتا پوچھ کر ریحان روانہ ہو گیا۔

تاریکی کافی بڑھ گئی تھی، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بارش ہوئی نہیں تھی، مگر آثار ایسے تھے کہ ابھی شروع ہو جائے گی۔ سردی سے ریحان کا جسم کانپ رہا تھا اور اسے چلنے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔

اسے بڑی مشکل سے رکشا ملا۔ آدھا گھنٹہ ڈاکٹر کا گھر ڈھونڈنے میں صرف ہو گیا۔

جب گھر ملا تو بدقسمتی یہ ہوئی کہ ڈاکٹر گھر میں نہیں تھا۔ پندرہ بیس منٹ انتظار کرنے کے بعد وہ آیا تو تیار ہونے میں اس نے مزید پندرہ بیس منٹ لگا دیے۔ آخر خدا خدا کر کے وہ بڑی منت سماجت کر کے ڈاکٹر کو رکشا میں بیٹھنے پر رضامند کر سکا۔ ڈاکٹر ٹیکسی میں بیٹھنا پسند کرتا تھا رکشا میں نہیں اور اس وقت ٹیکسی کہاں مل سکتی تھی۔

ڈاکٹر نے نانی جان کو دیکھا، انھیں انجکشن لگایا دس منٹ کے بعد ایک اور انجکشن لگایا۔ چند منٹ کے بعد نانی اماں نے آنکھیں کھول دیں۔

ریحان جب ڈاکٹر کو چھوڑ کر واپس آیا تو رکشا والے نے جتنی رقم مانگی اس سے اس کی جیب بالکل خالی ہو گئی وہ اندر گیا تو نانی اماں اور خالہ جان باتیں کر رہی تھیں۔

اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کی کوشش کامیاب ہوئی اور جب نانی اماں نے اسے اپنے پاس بلایا، بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں تو اسے ایک دم یوں محسوس ہوا جیسے اس کی اپنی نانی اماں اسے پیار کر رہی ہیں اور یہ خیال کر کے اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

اب گیارہ بج چکے تھے اور وہ اپنے اندر بڑی ہمت بڑا حوصلہ اور بڑی توانائی پا کر جلدی جلدی اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

(بشکریہ نونہال کراچی)

الف قدم

اچھی گڑیا



می دیکھو پاپا آئے
ساتھ میں اپنے گڑیا لائے

کتنی اچھی کتنی نیاری
ننھی منی پیاری پیاری

آنکھیں اس کی چھوٹی سی ہیں
پلکیں اس کی موٹی سی ہیں

گڑیا کے سنگ کھیلوں گی میں
گود میں اپنے لے لوں گی میں

میری گڑیا بھولی بھالی
دونوں ہاتھوں بجائے تالی

اس کو ساتھ سلاؤں گی
دودھ اور بھات کھلاؤں گی

میری گڑیا چھوٹی رانی
کپڑا پہنے ہے یہ دھانی

میرے سنگ اسکول چلے گی
آ با تا ثا خوب پڑھے گی

لوکو بازار۔ گوہ۔ دھنباد



گڈے اور گڑیا کا بیاہ تو سب نے سُنا ہوگا، مگر مچھلی کا بیاہ شاید ہی کسی نے سنا ہو۔ پھر آج ہم ایک مچھلی کے بیاہ کی کہانی سناتے ہیں جس نے ایک امیر آدمی کو تباہی سے بچالیا۔

بابو درگاہی خاں ضلع رائے بریلی (اودھ) کے ایک بڑے زمین دار تھے جن کے باپ دادا نے غدر میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ اِس لیے انگریزوں نے اُن کو "تعلقہ دار" یعنی چھوٹا موٹا راجا بنا دیا تھا۔

جب درگاہی خاں کے باپ مرے تو یہ بہت چھوٹے تھے۔ اِس لیے اُن کی چھوٹی سی ریاست "اونچا پار" کو سرکار نے اپنے انتظام میں لے لیا مگر بابو جی کے جوان ہوتے ہی اُن کی ریاست اُن کے حوالے کر دی گئی۔

اودھ کے امیروں، نوابوں اور دوسرے تعلقہ داروں کی طرح بابو جی بھی بڑے ہی فضول خرچ دکھانے اڑانے والے آدمی تھے۔ بلا محنت کے اتنی بڑی ریاست اور مال تال دیکھتے ہی ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ روپیا پانی کی طرح بہنے لگا خود غرض اور مطلبی دوستوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ناچ گانے ٹھاٹ باٹ، ناچ رنگ کی محفلیں اور سیر و شکار سبھی کچھ شروع ہوگیا۔ بابو جی کو مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا۔ آئے دن جیسے ڈیرے ڈالے گومتی ندی کے کنارے بیٹھے رہتے۔ سارا دن بابو جی دھوپ میں بیٹھے بیٹھے پسینے پسینے ہوجاتے۔ ایک دن یوں ہی مچھلی کے شکار کے لیے ندی کے کنارے گئے ہوئے تھے۔ سارا دن دھوپ میں تپتے گزر گیا۔ کوئی مچھلی بھی ہاتھ نہ آئی۔ بہت پریشان ہوئے۔ آخر شام ہوتے ہوتے ایک بڑی خوب صورت سنہری مچھلی ہاتھ آئی۔ جب محنت و مشقت سے کوئی چیز ملتی ہے تو آدمی اس کی بڑی قدر کرتا ہے۔ یہی حال اس مچھلی کا ہوا۔ بابو جی نے حکم دیا کہ یہ مچھلی زندہ گھر پہنچائی جائے۔ میں اس کا بیاہ کروں گا۔ بابو جی کے حکم کی دیر تھی۔ ایک بڑے سے مٹکے میں صاف پانی بھر کر مچھلی ان کے گاؤں پہنچائی گئی۔ اور وہاں ایک چھوٹا سا خوب صورت حوض بنا کر اس میں مچھلی چھوڑ دی گئی۔ اس مچھلی کا دل بہلانے کے لیے اور بہت سی مچھلیاں اس حوض میں ڈال دی گئیں اور مچھلی کے بیاہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

سچے موتی کے ہار اور سونے چاندی کے بہت سے گہنے مچھلی کے لیے بنوا کر شادی کے خط چھپے۔ لکھنؤ سے بھانڈ بلوائے گئے اور طرح طرح کے ناچ رنگ کا انتظام کیا گیا۔ دلہن کے لیے ایک دولھا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ماہی گیروں نے ایک "مہاشیر" مچھلی دولھا بنانے کے لیے ڈھونڈ لی۔ بیاہ کا دن آیا۔ آس پڑوس کے ہزاروں چھوٹے بڑے زمین دار، راجا، نواب اور امیر شادی میں شرکت کے لیے آپہنچے۔ سینکڑوں

دراج بجے کھانے پکے۔ رنگ رنگ کے باجے بجے۔ ایک شیشے کی بہت بڑی لگن میں جس پر موتیوں سے گندھا ہوا بار پڑا تھا۔ تھیلیوں کا یہ جوڑا تیر رہا تھا۔ یہ لگن محفل میں لا کر رکھی گئی۔ ایک بھوٹے موٹے کے مولوی نے آ کر ان کا نکاح پڑھایا اور مبارک سلامت کا غل مچنے لگا۔

جب دعوت ختم ہوئی تو ناچ رنگ شروع ہو گیا۔ بابو جی اور بہت سے بڑے بڑے راجے اور امیر گاؤ تکیوں سے لگے بیٹھے گانا سن رہے تھے کہ پشاوری پگڑی باندھے "ایک خان بابو جی کے پاس آیا۔ اُس نے بھری محفل میں اُن سے اپنے روپے کا تقاضا کیا۔ بابو جی پر اس پٹھان کا روپیا پانچ باقی تھا۔ مگر اس بھری محفل میں تقاضا کر کے اس پٹھان نے ان کی بڑی بے عزتی کی۔ لیکن اس بے عزتی نے بابو جی کی آنکھیں بھی کھول دیں۔ خان کا روپیا تو اسی وقت ادا کر دیا۔ مگر فوراً ہی ناچ رنگ کی محفل بھی ٹھکرا دی گئی۔ سب مچھلیاں اُسی وقت گومتی ندی میں ڈلوا دی گئیں۔ نظر بچتے ہی بابو جی پہلے سے نہ رہے۔ تمام امیری کے ٹھاٹ باٹ ختم کر دیے۔ شان و شوکت کی تمام چیزیں بیچ ڈالیں۔ مسخروں اور مصاحبوں کو نکال دیا۔

فضول نوکروں کو جواب دے دیا اور شرعی سادی زندگی بسر کرنے لگے۔ چالیس پچاس سال کی یہ بات ہے، بابو درگاہی خان جب مرے تو اُن کے خزانے میں لاکھوں روپے کی تھیلیاں اور چاندی سونے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔



اشفاق احمد

تتلی رانی

باغ کے ہیں ماحول سہانے
ہر جانب خوشبو کے فسانے

آئی کہاں سے اک البیلی
گلشن میں اڑتی ہے اکیلی

رنگوں کا ہے ایک خزانہ
گلشن ہے جس کا دیوانہ

کالی، لال، سفید اور پیلی
کچھ ہے اودی کچھ ہے نیلی

ننھی منی ایک پری ہے
کچھ ہے سنہری تو کچھ ہری ہے

گلشن کی دیوانی ہے
آہا تتلی رانی ہے

فرمان، پلورہ ۵، اچلپور - ۴۴۴۸۰۶

حضرت شیث علیہ السلام

بچّو! حضرت آدمؑ کے کئی بیٹے اور بیٹیاں تھیں۔ آپ کے بیٹوں میں ایک کا نام قابیل اور دوسرے کا نام ہابیل تھا۔ آسمانی کتاب توراۃ میں قابیل کا نام قائن اور ہابیل کا ایبل بتایا ہے۔ قابیل کھیتی باڑی اور ہابیل چوپانی یعنی بھیڑ اور بکریوں کو پالنے، چرانے کا کام کیا کرتے۔ تاریخ کی کتابوں میں ان دونوں بھائیوں کے درمیان ہونے والے فتنہ و فساد کا تذکرہ ملتا ہے۔ اسی طرح توراۃ میں بھی ایسے واقعات درج تھے، مگر خدا کی اس کتاب میں ردو بدل کر دیا گیا اس لیے ان واقعات میں شبہ پایا جاتا ہے۔ تاہم آخری کتاب قرآن شریف میں جو رہتی دنیا تک محفوظ رہے گی اُس میں اس واقعہ کے ایک ایک پہلو کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

اُس زمانے میں قربانی کی رسم جاری تھی جیسا کہ آج ہے۔ مگر اس کی صورت اور تھی، یعنی خدا کی بارگاہ میں قربانی کے قبول ہونے کی یہ روایت تھی کہ قربانی کی چیز کسی بلند مقام پر رکھ دی جاتی۔ آسمان سے آگ ظاہر ہوتی اور جس کی چیز جلا کر راکھ کر دیتی اُس کی قربانی قبول تصوّر کی جاتی۔ ہابیل اور قابیل نے بھی اپنی قربانی کی چیزیں پیش کیں۔ دستور کے مطابق آگ نے ظاہر ہو کر ہابیل کی نذر کو جلا دیا اور قابیل کے پھل اپنی جگہ پر پڑے رہ گئے۔ قرآن مجید کی سورۂ مائدہ میں اس بات کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے۔

"اور جب دونوں نے خدا کی بارگاہ میں کچھ نیاز چڑھائی تو ایک کی نیاز قبول ہو گئی اور دوسرے کی نہ ہوئی۔" (ترجمہ)

آگ نے جب ہابیل کی قربانی اور نذر کو جلا دیا اور اُسے قبول کر لیا گیا، تو اس بات کا قابیل کو بہت دکھ ہوا اور اُس نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ اُس نے ہابیل کو دھمکی دی کہ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ قابیل نے ہابیل کو کتنے عرصے کے بعد قتل کیا، اس کا یقینی علم نہیں۔ تاہم اُس نے غصے کے تحت ہابیل کو قتل کر دیا۔

بچّو! یہ دُنیا کا پہلا قتل تھا۔ جو ایک بھائی نے دوسرے بھائی کی جان لے کر کیا تھا۔ اور ہابیل دُنیا کا پہلا انسان تھا جس نے پہلی بار موت کا مزہ چکھا۔ کیوں کہ اُس وقت دُنیا میں آنے والا کوئی شخص ابھی موت سے ہم کنار نہیں ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو اُسے بے حد پریشانی لاحق ہوئی کہ وہ اُس کی نعش کا کیا کرے؟ اسے اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ جب انسان مر جائے تو اُس کی نعش کا کیا کیا جاتا ہے۔

قابیل اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا، وہ پریشان کھڑا بھائی کی نعش کو دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں اُس نے دیکھا کہ سامنے ایک کوّا اپنی چونچ سے زمین کھود رہا ہے۔ قابیل اُسے بغور دیکھنے لگا پھر اُس نے دیکھا زمین کھودنے والے کوّے کے پاس ہی ایک مُردہ کوّا پڑا ہے۔ کوّے نے زمین کھود لی تو شور مچانے لگا۔ اُس کی آواز سُن کر دوسرے کوّے بھی جمع ہو گئے اور اُنھوں نے مُردہ کوّے کو زمین میں دفن کر کے مٹّی ڈال دی۔ قرآن مجید کی سورۂ مائدہ ہی میں اس بات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"پھر اللہ تعالیٰ نے ایک کوّے کو بھیجا، جو زمین کُریدنے لگا، تاکہ اُسے دکھائے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کیسے چھپائے۔" (ترجمہ)

اس طرح قابیل نے کوّے کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر بھائی کی لاش کو دفنایا۔

بچّو! کسی کی ناحق جان لے لینا، یعنی قتل کر دینا، اس سے

بڑھ کر اور کوئی گناہ نہیں۔ کیوں کہ زندگی تو خدا کی امانت ہے، اور وہی موت و حیات کا مالک ہے۔ اسی لیے ایک حدیث مبارکہ میں حضور نبی کریم نے ارشاد فرمایا "جب بھی کوئی ظلم سے قتل ہوتا ہے اُس کا گناہ آدمؑ کے بیٹے یعنی قابیل کو ضرور پہنچتا ہے۔"

حضرت آدم علیہ السّلام کے تیسرے بیٹے کا نام شیثؑ تھا۔ "شیثؑ" کے لفظی معنی "عطیہ" کے ہیں۔ حضرت شیث علیہ السّلام ہابیل کے قتل کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ اور حضرت آدمؑ کے بعد نبی ہوئے اور تمام پیغمبروں کا ظہور آپ ہی کی نسل سے ہوا۔ آپ کی پیدائش کا پس منظر واقعۂ ہابیل اور قابیل ہے، اور چوں کہ اس واقعے کے بعد آپ پیدا ہوئے، اس لیے آپ کا نام شیث یعنی (عطیۂ خداوندی) رکھا گیا۔ اللّٰہ تعالیٰ نے آپ پر اپنی کتاب اُتاری اور خدائی تعلیم سے بھی آگاہ کیا۔ تاکہ آپ اپنی بھٹکی ہوئی قوم کو توحید کی تعلیم دیں اور اُن کے اخلاق کو سنواریں۔

آپ کی کتنی عمر تھی: اس کے بارے میں کوئی بات یقینی نہیں ہے۔ تاریخ کی کتابوں اور مختلف حوالوں میں بعض جگہ آپ کی عمر ۸۰۰ سال کہیں ۹۰۰ سال، بعض جگہ ۳۰۰، اور ۲۵۰ سال بھی لکھی ہے۔ بہرحال اتنی بات یقینی ہے کہ آپ ہابیل کے قتل کے بعد پیدا ہوئے تھے، اور آپ نے طویل عمر پائی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی رحم دلی، جود و سخا، محنت، اخلاق اور شرافت سے بے شمار لوگ آپ کے گرویدہ ہو گئے اور آپ کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ آپ نے اپنی قوم کے سامنے جو تعلیمات پیش کیں قوم کے افراد برسوں اُن پر عمل کرتے رہے۔ لیکن بعد میں لوگوں نے اُن کی تعلیمات پر عمل کرنا چھوڑ دیا اور سیدھی سچی راہ سے بھٹک گئے یہاں تک کہ حضرت ادریس علیہ السّلام کی پیدائش ہوئی جنھوں نے اس بگڑی ہوئی قوم کو دوبارہ اللّٰہ کی توحید اور سیدھے راستے پر لگایا۔ تاریخ میں آتا ہے کہ حضرت شیثؑ حضرت ادریسؑ کے استاد بھی تھے۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے۔

دو شکاری

امتہ الرحمٰن حسنی

(قسط ۳)

اب میں نویں سال میں آگیا ہوں۔ اب تک میں دنیا کی فکروں سے آزاد تھا۔ جس طرح مجھے بڑے ہو کر پتا چلا، تم کو بھی بڑے ہو کر معلوم ہو گا کہ کوئی باپ مکمل اور بے داغ نہیں ہوتا. ہمارے بزرگ بڑی عجیب پیچیدہ مخلوق ہوتے ہیں۔ نہ معلوم کن کن الجھنوں میں خود کو پھنسائے رکھتے ہیں اور ان میں سے کچھ تو بہت ہی گہرے راز اپنے سینوں میں بند رکھتے ہیں۔ ایسے ہی ہمارے اپنے باپوں کی بھی کچھ خاص پوشیدہ باتیں ہوتی ہیں کہ اگر ہم سن لیں تو حیرت میں رہ جائیں۔

اس کتاب کے باقی حصّہ میں اپنے ابّو کے ایک بہت گہرے راز کی بات سناؤں گا اور ایک دل چسپ مہم کی بھی جس میں انھوں نے مجھے بھی شریک کیا تھا۔

یہ کہانی ایک سنیچر کی شام سے شروع ہوئی تھی تقریباً شام کے چھ بجے روز کی طرح ہم دونوں نے کھانا کھایا۔ میں سونے کے لیے اپنے بستر پر چلا گیا۔ ابّو نے مجھے ایک بڑھیا سی کہانی سنائی اور مجھے خوب اچھی طرح ڈھک لپیٹ کر پیار کر کے شب بخیر کہا۔ میں بہت جلد بے خبر سو گیا۔

رات میں نہ معلوم کیوں میری آنکھ کھل گئی اور کافی دیر تک میں لیٹا ہوا اپنے اوپر کے تختے پر کان لگائے ابّو کے سانس لینے کی آواز سننے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ وہاں نہیں ہیں تو میں نے سوچا کہ وہ اپنا کام ختم کرنے

مسکن دودھ پور۔ علی گڑھ



ورک شاپ چلے گئے ہیں۔ وہ اکثر وہاں چلے جاتے تھے۔ اس کے بعد ورک شاپ سے آنے والی آوازوں کی طرف میں نے اپنا دھیان کر دیا۔ مگر وہاں بھی بالکل خاموشی تھی۔ پٹرول پمپ سے بھی کوئی آہٹ سرسراہٹ سنائی نہیں دی۔ تب میں اپنے بستر سے اٹھ گیا۔ دیا سلائی کی ایک تیلی جلا کر دیوار پر لگے گھنٹے کو دیکھا۔ وہاں سوا گیارہ بج رہے تھے۔

پھر میں نے کمرے کے دروازے پر جا کر ہلکے سے آواز دی۔ ابّو! ابّو آپ کہاں ہیں؟ مگر جواب نہیں ملا۔ ہمارا گھر زمین سے کافی اونچائی پر تھا۔ گھر کے سامنے لکڑی کا چبوترہ تھا اس کے نیچے زمین پر اترنے کے لیے تین سیڑھیاں تھیں میں جا کر اس چبوترے پر کھڑا ہو گیا۔ ہر طرف نظریں دوڑائیں چلّا چلّا کر ابّو کو آوازیں دیں۔ مگر جواب کوئی نہیں تھا۔

میں اپنے سونے ہی کے کپڑوں میں ننگے پیر اتر کر ورک شاپ گیا اور بجلی جلا دی۔ وہ پرانی کار جس پر دن میں ہم کام کر رہے تھے وہاں موجود تھی۔ ابّو وہاں بھی نہیں تھے۔ مجھے یقین تھا کہ بلا کسی بہت ضروری کام کے ابّو مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ میرے دماغ میں بڑے بُرے خیالات آ رہے تھے کہ وہ کہیں کسی اچانک بیماری سے بے ہوش ہو کر گر نہ پڑے ہوں۔ ان کے سر میں چوٹ نہ آ گئی ہو۔

اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ انھیں ڈھونڈنا چاہیے۔ اور اندھیرے میں ڈھونڈنے کے لیے ٹارچ کی بھی ضرورت

ہوگی۔ ورک شاپ کی بینچ سے میں نے ٹارچ اٹھائی اور آفس کا ایک چکر لگا کر اندر گیا۔ ورک شاپ کی طرف آیا اور اس کے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا۔ وہاں سے میدان میں سے ڈھونڈتا ہوا پاخانہ کی طرف گیا، اس کے اندر جھانکا مگر وہ بھی دوسری جگہوں کی طرح خالی تھا۔ وہیں میدان میں کھڑے ہو کر اور چلا کر میں نے "ابو آپ کہاں ہیں؟" آوازیں دیں، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر ناامید ہو کر میں گھر آگیا اور ان کی غیر موجودگی کا ایک مرتبہ پھر یقین کرنے کے لیے ان کے بستر پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ وہ وہاں تھے ہی نہیں۔

میں اندھیرے کمرے میں کھڑا تھا اور زندگی میں پہلی بار مجھے ڈر اور گھبراہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ خیال آیا کہ میں بالکل تنہا ہوں۔ قریب کا گاؤں بھی اس جگہ سے کافی فاصلے پر ہے۔ میں نے اپنے بستر سے کمبل اٹھا کر خود کو لپیٹ لیا اور باہر آکر چبوترے پر بیٹھ گیا۔

چاند نکلا ہوا تھا، اس کی ہلکی روشنی میں خالی سڑک اور میدان دور تک نظر آرہے تھے۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

معلوم نہیں چبوترے پر پیر لٹکائے میں کتنی دیر بیٹھا رہا۔ گھنٹہ بھر یا ممکن ہے دو گھنٹے۔ لیکن اس دوران ایک لمحہ کے لیے بھی میری پلک نہیں جھپکی تھی۔ میری پوری توجہ کسی ایک آہٹ سننے پر لگی ہوئی تھی۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ ابو کے بارے میں کوئی سرسراہٹ، کوئی آواز ہو تو میرے کان میں آجائے۔

آخر کار سڑک پر بہت دور سے قدموں کی ہلکی ہلکی ٹپ ٹپ سنائی دی اور وہ آواز ہر لمحہ قریب تر ہوتی گئی۔ پھر چاند کی پیلی دھندلی روشنی میں ایک انسانی ہیولا ابھرتا نظر آیا اور اس خاکے کو میں نے پہچان لیا تھا، یہ ان ہی کا تھا۔ میں سیڑھیوں سے کود کر ان سے ملنے سڑک کی طرف بھاگا۔ انھوں نے دور ہی سے چلا کر کہا "دانی تم؟ کیا بات ہے؟" ابو مجھے خیال آرہا تھا کہ کہیں آپ کو کچھ ہو تو نہیں گیا۔ انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور خاموشی سے مجھے گھر لے آئے اور بستر میں لٹا کر کمبل لپیٹتے ہوئے کہا: "میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے تم کو اکیلے چھوڑ کر کبھی نہ جانا چاہیے۔ لیکن دانی! تم رات کو عام طور پر جاگا نہیں کرتے یا کبھی کبھی جاگ جاتے ہو؟"

"ابو! آپ کہاں گئے تھے؟"

"تم تھک گئے ہوگے" انھوں نے کہا۔

"نہیں تو میں بالکل نہیں تھکا۔ ابو تھوڑی دیر کے لیے روشنی کیوں نہ کر لی جائے" میں نے کہا۔

ابو نے فوراً ہی چھت میں لٹکے ہوئے لیمپ کو روشن کر دیا اور کمرہ پیلی روشنی سے بھر گیا۔ ابو نے پوچھا۔

"تمھارا کیا خیال ہے۔ کیا کچھ گرم چیز پی جائے؟"

"ہاں ابو ضرور پی جائے" میں نے کہا۔

انھوں نے چولھا جلایا اور اس پر ابلنے کے لیے پانی رکھ دیا۔

تھوڑا رک کر انھوں نے کہا: "میں نے ایک بات کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ یہ کہ میں اپنی زندگی کے سب سے گہرے راز میں تم کو شریک کروں گا۔"

میں بستر پر لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور پوچھا "کیا ابو؟" اور ان کو تکنے لگا۔

انھوں نے وقفہ دے کر کہا: "تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کہاں گیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں شہباز کے جنگل میں گیا تھا۔"

"شہباز کے جنگل میں! وہ تو یہاں سے بہت دور ہے ابو۔"

"ہاں یہاں سے ساڑھے چھ میل دور ہے" ابو نے کہا "میں پھر کہتا ہوں کہ مجھے وہاں اس طرح جانے پر بہت شرمندگی ہے۔ لیکن میں وہاں جانے کی زبردست خواہش کو روک نہیں سکا تھا" یہ کہتے ہوئے ان کی آواز مدھم ہوتی گئی اور وہ خاموش ہو گئے۔

"ابو! آپ شہباز کے جنگل میں کیوں جانا چاہتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

انھوں نے میری بات سن لی تھی اور کوکو پاؤڈر، شکر ڈبوں میں سے نکال کر ایسے جانچنے تولنے لگے جیسے وہ کوئی دوا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ دو مگوں میں ڈال دیا اور مجھ سے سوال کیا۔

"تم کو معلوم ہے کہ پوچنگ شکار کیا ہوتا ہے؟"

"نہیں مجھے تو معلوم نہیں کہ وہ کیا ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو سنو!" ابو نے کہنا شروع کیا: "اس کے معنی ہیں کہ اندھیری رات میں جنگل جانا اور ہنڈیا کے لیے کچھ لے کر آنا۔"

"پوچر یا شکاری دوسری جگہوں پر تو ہر طرح کے شکار کرتے ہیں، لیکن اس طرف ہمیشہ تیتروں ہی کا شکار ہوتا ہے۔ آپ کا مطلب ہے کوئی چیز چرانا۔" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"ہم اس شکار کو اس معنی میں نہیں لیتے۔ پوچنگ شکار تو ایک فن ہے۔ اس قسم کا ہر بڑا شکاری بڑا فن کار کہلاتا ہے۔"

"ابو! تو پھر آپ شہباز کے جنگل میں ایسا ہی شکار کرنے گئے تھے۔ یعنی تیتروں کی پوچنگ کے لیے؟"

"ہاں صرف، اس فن کی مشق کرنے گیا تھا۔" ابو نے کہا۔

یہ سُن کر مجھے ایک دھکا سا لگا۔ میں نے سوچا کہ میرا اپنا باپ ایک چور ہے؟ یہ پیارا اور شریف انسان! مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسی کے جنگل میں گھس کر اس کے قیمتی پرندے چوری چھپے لا سکتے ہیں۔ میں نے کیتلی کی طرف اشارہ کر کے کہا: "دیکھیے پانی ابلنے لگا ہے۔"

ہاں! انھوں نے پانی دونوں مگوں میں ڈالا اور میرا مگ مجھے لاکر دیا اور اپنا اٹھا کر میرے تخت کے کنارے پر لے آئے اور بات شروع کی۔

"تمھارے دادا، میرے ابا ایک ماہر فن شکاری تھے۔ میں جب دس سال کا تھا تو انھوں نے اس شکار کے سارے گُر مجھے بتا دیے تھے۔ جب سے میں اس بارے میں کچھ نہیں بھولا۔

اور ہاں سب سے پہلے ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ اس زمانے میں ہمارے گاؤں کا ہر آدمی شکار کرنے جاتا تھا۔ وہ یہ شکار محض تفریح کے لیے نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنے بھوکے خاندان کے لیے کچھ کھانے کی چیز مہیا کرنے کے لیے کرتے تھے۔ اس زمانے میں یہاں اور پورے ہی ملک میں کام بہت ہی کم ملتا تھا۔ کچھ خاندان تو سچ مچ بھوک سے مر جاتے تھے۔ ایک طرف یہ حال تھا، دوسری طرف چند میل دور امیر لوگ اپنے ہزاروں تیتروں کو دن میں دو مرتبہ شاہانہ خوراک کھانے کو دیتے تھے۔ ایسے حالات میں کیا تم میرے ابا کو اپنے بھوکے خاندان کے لیے کبھی کبھی دو ایک پرندے پکڑ لانے پر الزام دوگے؟"

"نہیں ایسے حالات میں الزام دیا ہی نہیں جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "مگر ابو ہم یہاں بھوکے تو نہیں رہتے۔"

"دانی میاں! تم ایک بات بھول رہے ہو، بلکہ پوری بات سمجھے ہی نہیں ہو، سنو! یہ شکار بہت ہی عجیب قسم کا جوش پیدا کر دیتا ہے۔ اگر کسی نے ایک دفعہ اس کھیل کو شروع کر دیا تو وہ اس کے خون میں رچ بس جاتا ہے وہ اسے پھر چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ ذرا سوچو تو! کوئی شخص اندھیرے جنگل میں اکیلا ہو اور وہ یہ بھی جانتا ہو کہ جنگل میں درختوں کے پیچھے چوکیدار بندوقیں لیے چھپے ہوتے ہیں۔"

"بندوقیں!" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "نہیں، نہیں، بندوقیں نہیں ہو سکتیں۔"

"سب چوکیداروں کے پاس بندوقوں کا ہونا ضروری ہے اور وہ اس لیے کہ جنگلی جانور جیسے لومڑی، نیولا وغیرہ تیتروں کی تاک میں رہتے ہیں اور چوکیداروں کو ہمیشہ پوچروں کا بھی کھٹکا رہتا ہے اور اگر وہ ان کا پتا لگا لیں تو!..."

"ابو آپ تو مذاق کر رہے ہیں۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر قنبر رضوی

عراق
دجلہ اور فرات کا عطیہ

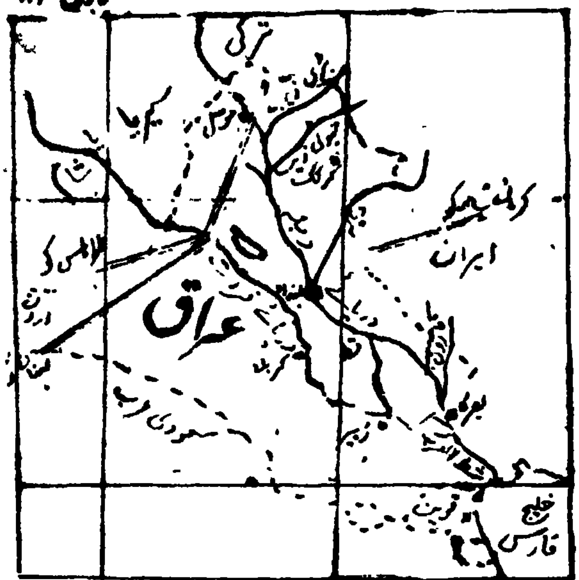
ملکِ عراق قدیم تہذیب کا گہوارہ رہ چکا ہے دراصل یہ ملک دو ندیوں دجلہ اور فرات کا عطیہ ہے۔ اس لیے عراق کا نام میسو پوٹامیہ،، رکھ دیا گیا تھا۔ یہ یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی 'دوآبہ' ہوتے ہیں۔ دجلہ اور فرات کے دوآبہ میں واقع موجودہ ملک عراق کا رقبہ ۴۳۸۵۵۶ مربع کلو میٹر ہے۔

دریائے دجلہ شمال میں آرمینیا کی کوہستانی چوٹیوں سے کردستان کے پٹھار (پلیٹو) کو پار کر کے جنوب کی طرف تیز گامی سے بہتی ہوئی بصرہ شہر کے قریب دریائے فرات سے ہم آغوش ہو کر شط العرب کی صورت میں نمودار ہوتی ہے جو تقریباً سو کلو میٹر بہنے کے بعد خلیج فارس سے مل جاتی ہے۔

دریائے دجلہ سے مختلف معاون ندیاں ملک کے مشرقی کوہستانی سلسلے "زیگراس،، سے آکر ملتی ہیں جن میں بڑی زیب، چھوٹی زیب، دیالہ اور قارون ندیاں خاص ہیں۔ شمال اور شمال مشرقی برفیلی چوٹیوں سے آنے والی دجلہ اور زیب ندیوں کا پانی سال بھر رواں رہتا ہے۔ دجلہ ندی کی گہرائی بھی زیادہ ہے اور یہ نسبتاً تیز رفتار بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم سے یہ ندیاں ملک کو آبپاشی ـــــ اور آمد و رفت کے ذرائع فراہم کرتی رہی ہیں۔ اب یہ برقی طاقت بھی عطا کرتی ہیں۔

دریائے فرات شمال مغرب کی طرف سے ملک میں داخل ہوتی ہے۔ اس کی گہرائی بھی دریائے دجلہ کی بہ نسبت کم ہے اور رفتار بھی سست ہے۔ اس میں پانی کی مقدار بھی کم ہے۔ فرات کا مغربی ساحل شام کے ریگستان کا ہی ایک حصہ ہے جو بہت اجاڑ اور ریتیلا ہے۔ البتہ

شعبۂ جغرافیہ۔ اے۔ کے کالج شکوہ آباد۔ یوپی



مشرقی ساحل پر شمال سے جنوب کی طرف پہاڑی سلسلہ بدل کر قدم بہ قدم دوآبہ کے میدانی علاقے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دوآبہ کا جنوبی حصہ دلدلی ہے اور ڈھال بھی بہت کم ہے۔

زمین کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ عراق کی آب و ہوا میں بھی خاصی تبدیلی اور اختلاف نمایاں ہوتا ہے۔ گرمیوں میں عراق کا اوسط درجۂ حرارت ۲۷ سینٹی گریڈ اور جاڑوں میں ۱۰ درجہ سینٹی گریڈ سے بھی کم ہو جاتا ہے۔ گرمی اور سردی کے درجۂ حرارت میں اوسط فرق ۱۰ درجہ کا ہوتا ہے۔ گرمیوں میں دن کا درجۂ حرارت بہت کم بلکہ اکثر نقطۂ انجماد تک پہنچ جاتا ہے۔ شمالی مشرقی عراق میں کردستانی علاقے میں ۷۵ سینٹی میٹر بارش ہوتی ہے۔ یہ کم ہو کر نشیبی عراق میں ۲۵ سینٹی میٹر سے بھی کم رہ جاتی ہے۔

اگر ہم شمالی عراق میں کردستان کے پہاڑی علاقے سے جنوب کی طرف چلیں تو سب سے پہلے برفانی چوٹیوں کے بعد اوک اور اخروٹ کے درخت ملیں گے۔ کردستان کے ڈھال پر اسٹیپ کے گھاس کے میدان اور ریگستانی پٹھار پر کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ جنوب میں عراق کے نشیبی میدان پر اور شط العرب کے دونوں کناروں پر دور تک گھاس اور کھجور کے درختوں کے طویل جنگلات کا سلسلہ ہے۔ جنگلات نے عراق میں تقریباً ۱۸ لاکھ ہیکٹر رقبہ گھیر رکھا ہے۔

عراق کے عوام کا خاص ذریعۂ معاش زراعت ہے۔

←

یہاں ۷۰ فیصدی لوگ کاشت کرتے ہیں۔ دوآبہ کی زمین زرخیز ہے مگر سنچائی کی سہولتیں فراہم نہ ہونے کی بنا پر ملک کے صرف چھوٹے حصّے پر کھیتی ہوتی ہے۔ کل مزروعہ رقبے کے ۲۰ فیصد حصّے پر ہی آبپاشی کی جاتی ہے۔ زراعت کو ناموافق آب وہوا سیلاب اور قدیم طرز کاشت کی وجہ سے کافی نقصان پہنچتا ہے۔ سنچائی کے لیے کچھ منصوبے بنائے گئے ہیں جن کے تحت دریائے فرات و دجلہ اور ان کی معاون ندیوں پر وادی مرمر، ہندیہ، حوانیہ، دخان، قط، دربندی خان وغیرہ —— پروجکٹ قائم کیے گئے ہیں۔ ان منصوبوں کی تکمیل کے بعد سارے عراق کی کاشت میں بے حد ترقی ہونے کا امکان ہے۔ جن علاقوں میں آبپاشی کی سہولتیں فراہم نہیں وہاں گھاس ہوتی ہے اور چراگاہیں موجود ہیں جن میں بھیڑ بکریاں اونٹ گدھے اور گھوڑے پالے جاتے ہیں۔ شمالی مشرقی کوہستانی ڈھالوں پر زیادہ تعداد میں بکریاں اور بھیڑیں پالی جاتی ہیں ان سے مُہر نامی بیش قیمتی اون حاصل کیا جاتا ہے۔

عراق کی سب سے بڑی دولت معدنی تیل یا پٹرولیم ہے معدنی تیل سب سے پہلے ۱۹۲۷ء میں عراق کے باباگرگر مقام پر برآمد کیا گیا۔ اب معدنی تیل موصل آئین ضلع، کرکک، زنبور، خان کوئین، نفت خانہ کے علاوہ دورہ، قائرہ، رومیلہ، زبیر نہر عمر میں نکالا جاتا ہے۔ موجودہ جنگ سے قبل پٹرولیم کی پیداوار میں عراق کا دنیا میں آٹھواں اور ایشیا میں چوتھا نمبر آتا تھا۔ موصل اور کرکک کے علاقوں سے تیل پائپ لائن کے ذریعے بحرروم کے ساحل پر ہیفہ (اسرائیل)، بنیاس (سیریا) اور تریپولی واقع لبنان تک پہنچایا جاتا ہے جہاں سے صاف کرکے بیرونجات کو برآمد کیا جاتا ہے۔

عراق کی زرعی پیداوار میں جو، گیہوں، چاول اور کپاس کو اہمیت حاصل ہے۔ ۹ لاکھ ٹن جو ۲۸ لاکھ ٹن گیہوں ۴ لاکھ ٹن چاول اور ۱۰ ہزار ٹن کپاس پیدا کی جاتی ہے۔ عراق میں سب سے زیادہ کاشت کھجور کی ہوتی ہے جس کی اوسط پیداوار ۳۶۴ ہزار ٹن ہے۔ دنیا میں پیدا ہونے والی کھجوروں کا ۴۰ فیصد حصّہ صرف عراق پیدا کرتا ہے۔ اس کے لیے سب سے زیادہ زرخیز حصّہ شط العرب کے دونوں کناروں پر ۱۶۰ کلو میٹر لمبا اور تین کلو میٹر چوڑا علاقہ ہے۔ دجلہ ندی کے کنارے بغداد کے قریب اور فرات کے کنارے کربلا سے نجف تک کافی تعداد میں کھجور پیدا کی جاتی ہے۔ عالمی تجارت میں ۸۰ فیصد کھجور صرف عراق سے برآمد کی جاتی ہے۔ کھجور سے گڑ، چینی، سرکا اور شراب بھی تیار کی جاتی ہے۔

صنعتی میدان میں عراق ابھی آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ بڑی صنعتوں کی بہت کمی ہے۔ ہاں گھریلو صنعتوں کی شکل میں شال، اونی کپڑے، تیل، کپاس اوٹنا، سوت کاتنا، کرگھوں سے کپڑا بننا جاری ہے۔

بڑی صنعتوں میں سیمنٹ کے کارخانے، چینی ملیں، جوتے کے کارخانے، کپڑے کی ملیں اور کیمیاوی اشیاء کے کارخانے ہیں۔ بغداد، بصرہ، خانہ کوئین اور قائرہ میں چھ کارخانوں میں ہر سال ۷ لاکھ ٹن سیمنٹ تیار کی جاتی ہے۔ چمڑے کے پندرہ کارخانے بغداد، موصل، بصرہ، کرکک وغیرہ شہروں میں ہیں جن میں صرف بغداد میں نو کارخانے ہیں۔ موصل سلیمانیہ اور کرکک میں چقندر سے اور کربلا میں کھجور سے چینی بنائی جاتی ہے۔ بصرہ میں کاغذ بنایا جاتا ہے۔ 'دورہ' میں چکنائی یا LUB RKANT بنائی جاتی ہے اور بغداد، بصرہ اور کرکک میں شراب کے کارخانے ہیں۔ ہادیہ، قائرہ، خانہ کوئین، اور دورہ، میں معدنی تیل صاف کرنے کے کارخانے ہیں۔

عراق میں زمانۂ قدیم سے وسائل آمدورفت میں ترقی ہوتی رہی۔ خلیج فارس سے شط العرب میں داخل ہوکر بصرہ تک جہاز آتے جاتے رہتے ہیں۔ دخانی کشتیاں دجلہ کے گہرے پانی میں بغداد تک پہنچ جاتی ہیں۔ موجودہ دور میں بغداد اور سامرّی سے بصرہ، اربیل، کرکک، خانہ کوئین اور کربلا کو ریلوے لائین سے ملا دیا گیا ہے۔ ملک میں ۲۱۴۰ کلو میٹر لمبی ریلیں ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً دس ہزار کلو میٹر لمبی سڑکیں بھی ہیں۔ جن میں خاص سڑکیں بغداد سے کرکک، اربیل، موصل ہوتے ہوئے ترکی کی سرحد تک۔ بغداد سے ایران کی سرحد تک اور بغداد سے اردن

←

کی سرحد تک، اور بغداد سے حلّہ اور کربلا و نجف تک بنائی گئی ہیں۔ یہ شاہراہیں بہت پائیدار اور وسیع ہیں۔ بصرہ اور بغداد مخصوص بین الاقوامی ہوائی اڈے بھی ہیں۔

عراق میں تقریباً دو کروڑ لوگ آباد ہیں اور تقریباً ۲۵ لوگ فی مربع کلومیٹر پر آباد ہیں۔ زیادہ تر آبادی دجلہ اور فرات کے دوآبے میں آباد ہے۔ آبادی کا زیادہ تر حصّہ شیعہ اور سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ کچھ یہودی عیسائی اور قبائلی بھی اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ آبادی کے شہر بغداد، بصرہ موصل اور کرکک ہیں ان کے علاوہ نجف اور کربلا مذہبی اور تاریخی اہمیت کے مقامات ہیں جو ہزاروں زائرین کی آماجگاہ ہیں۔ نجف میں رسولؐ کے خلیفہ حضرت علی علیہ السلام کا مزار مقدس ہے جہاں شیعہ اور سنی مسلمان جوق در جوق زیارت کے لیے جاتے رہتے ہیں۔

کربلا دریائے فرات کے مغربی ساحل کے قریب وہ مقام ہے جہاں محرّم ۶۱ھ میں یزید کی فوج نے حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے احباب و خاندان والوں کو شہید کیا۔ یہاں بھی زائرین کا ہجوم ہر سال زیارت کے لیے بہت بڑی تعداد میں جاتا رہتا ہے کربلا میں آج جدید بازار نئے نئے کارخانے قائم کر دیے گئے ہیں۔ اور آبادی بڑھتی جارہی ہے شمال میں معدنی تیل پیدا کرنے والے علاقے میں دورِ جدید کی نمایندگی کرنے والے شہر موصل اور کرکک واقع ہیں، جو دن بدن ترقی کرتے جارہے ہیں۔



ہمت کا ترانا

سکندر ضمیر

ہمت کا ہے ترانا
آگے ہی بڑھتے جانا

ڈر ہے تمھارا دشمن — پکڑو نہ اس کا دامن
ہمت نہیں ہے جس میں — ہے خاک اس کا جیون

جیون نہ یوں بتانا
آگے ہی بڑھتے جانا

انسان وہ ہے پیارے — کوشش سے جو نہ ہارے
مٹھی میں ہیں تمھاری — یہ چاند یہ ستارے

تم جیت کر دکھانا
آگے ہی بڑھتے جانا

غم سے نہ خوف کھاؤ — دکھ میں بھی مسکراؤ
کانٹے چمن بنیں گے — آگے قدم بڑھاؤ

قدموں میں ہے زمانا
آگے ہی بڑھتے جانا

ڈاکٹر حلیم کوثر چاند پوری

یرقان

انسان کسی بھی عمر میں اپنی زندگی کے سب سے حسین اور یادگار دور کو نہیں بھولتا اور عمر کا یہ دور بچپن ہوتا ہے اور ہر آدمی اپنے اُس ماضی کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔ آپ کے بڑے بھائی، بہن اور والدین آپ کے ساتھ کھیلتے ہیں آپ کے چھوٹے بھائی بہنوں کو منہ بنا بنا کر کچھ تتلا کر بولیاں بول کر کھلاتے ہیں۔ اس میں ان کا پیار اور محبت تو شامل ہوتی ہی ہے لیکن اس کا ایک نفسیاتی پہلو یہ ہے کہ وہ ان بچوں میں خود اپنے بچپن کو تلاش کرتے ہیں۔ "پیام تعلیم" بچوں کا رسالہ ہے لیکن بڑے بھی اس کو پڑھتے ہیں۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ اس بار آپ کو کسی ایسی بیماری کے بارے میں بتاؤں جو بچوں اور بڑوں دونوں میں ہوتی ہے اور اس طرح سے "یرقان" کا انتخاب کیا ہے۔

'یرقان'، جس کو عام لوگ "پیلیا" بھی کہتے ہیں خود کوئی بیماری نہیں بلکہ جگر کی کچھ بیماریوں کی صرف ایک علامت یا نشانی ہے۔ جن بیماریوں کی طرف یہ اشارہ کرتا ہے اس کا نام لے کر میں کسی کو خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا کیونکہ وہ سب کم ہوتی ہیں۔ یہاں میں صرف اس بیماری کا ذکر کروں گا جو سب سے زیادہ ہوتی ہے اور جس کا دوسرا نام ہی "یرقان" عام طور سے پڑ گیا ہے۔ اس بیماری کو ہم INFECTIVE HEPATITIS یا "جگر کی سوجن" کہتے ہیں۔

جگر کی یہ سوجن ایک وائرس کی وجہ سے ہوتی ہے جس کا نام وہی ہے جو اس بیماری کا یعنی "ہیپیٹائٹس

۱۸/۱۲۲۱ کینال روڈ۔ اوکھلانٹی دہلی ۲۵

وائرس"۔ یہ جسم میں عام طور سے پانی، کھلے ہوئے کھانے، ہوا کے ذریعے جسم میں داخل ہوتا ہے۔ مکھیوں کی زیادتی اور عام گندگی اس بیماری کے پھیلنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ایک سے دوسرے کو یہ بیماری لگتی ہے۔ اس لیے اس مرض کے مریض کو سب سے الگ تھلگ رکھنا ضروری ہے۔ عام طور سے یہ بیماری وبا کی شکل میں ہوتی ہے۔

INFECTIVE HEPATITIS میں مریض کو سب سے پہلے بھوک کم لگتی ہے۔ پیٹ میں بے چینی، تھکاوٹ، متلی، قے، اور اس کے ساتھ بخار اس کی دوسری علامتیں ہیں۔ تین دن سے ایک ہفتہ تک یہ صورت رہنے کے بعد آنکھوں کی سفیدی زردی مائل ہونا شروع ہوگی۔ ہفتہ کے آخر تک یہ زردی شدت اختیار کر لیتی ہے۔ غذا سے پوری طرح نفرت ہو جاتی ہے اور شدید کمزوری محسوس ہوتی ہے۔

اس بیماری کا خصوصی علاج کچھ نہیں ہے۔ اس لیے روک تھام پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ عام صفائی، پانی کی اچھی سپلائی، کھلے لیٹرین کی روک تھام، عام حفظانِ صحت کے اصولوں کو اپنانا اس بیماری کو بہت کم کرتا ہے۔

بیماری کا حملہ ہو جانے کے بعد مریض کو سخت آرام کرانا ضروری ہے۔ جسمانی اور دماغی آرام پورا لینا چاہیے۔ کیونکہ پانی اس کی اصل وجہ ہے اس لیے حملہ کے دوران پانی اُبال کر دینا چاہیے۔ غذا میں چکنی، تلی چیزیں اور پروٹین یعنی گوشت، انڈا، دودھ وغیرہ کم کر دینا چاہیے۔ اُن کی جگہ وہ چیزیں زیادہ استعمال کرنا چاہییں جو کاربوہائیڈریٹ دیتی ہیں۔ یعنی چاول، آلو، چقندر، شلجم، گلوکوز اور تمام میٹھی چیزیں جو گھر میں ہی بنائی گئی ہوں۔ گنے کا رس گلوکوز کا سب سے اچھا خزانہ ہے اور اس کو اس بیماری میں زیادتی سے استعمال کرنا چاہیے۔ ہری سبزیوں میں مولی، گاجر خوب استعمال کریں۔

بچوں کو خوشی ہوگی کہ چاکلیٹ اچھی قسم کی جو ڈاکٹر عام طور سے ان کو کھانے کو منع کرتے ہیں اس بیماری میں خوب کھانے کی اجازت ہے۔ دن میں دو تین اچھی قسم کی

چاکلیٹ جیسے CADBURY'S MILK CHOCLATE ہی بچّے کے لیے اِس بیماری میں علاج کا کام کرتی ہیں۔ جام، کسٹرڈ سے دلچسپی رکھنے والے بچّے بھی خوب زیادتی سے اِس کا استعمال کریں تو جلد ہی اس بیماری سے چھٹکارا پائیں گے۔

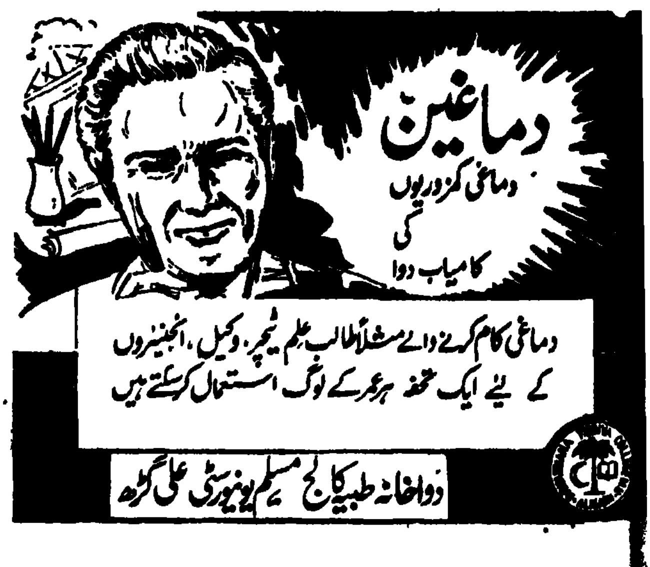
دواؤں کے نام پر صرف وٹامن کا استعمال ہوتا ہے جو جگر کے فعل کو نارمل لانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

کیونکہ اس بیماری کے پھیلنے کی سب سے بڑی وجہ گندگی ہے اس لیے بچّو! اس کا ہمیشہ خیال رکھو کہ اسکول کے کینٹین، بازار، خوانچہ والوں سے کچھ بھی کھانے میں بھی بہت احتیاط رکھو اور پرہیز کرو۔ کھانے سے پہلے اور اجابت سے فارغ ہونے کے بعد اچھی طرح صابن سے ہاتھ دھونے کو اپنی عادت بناؤ کیونکہ یہ کیڑا آنتوں کے راستے باہر آتا ہے ناخن کبھی بڑھنے مت دو اور ہاں جس کو بتا سکتے ہو بتاؤ، کہ اگر تم کسی گاؤں یا قصبے میں رہتے ہو، تو اس کی سڑکوں پر کھلے یلٹرین نہ بناؤ کیونکہ اس وجہ سے ہمارے اپنے علاقے کو کبھی بھی اس بیماری کا خطرہ ہو سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے اس بیماری کے بارے میں معلوم ہونے کے بعد تم لوگ وہم تو نہیں کرو گے مگر احتیاط ضرور کرو گے۔



(بہ شکریہ نونہال کراچی)



آدم ناگپوری



دماغی گردش

میٹرک کے امتحان ہوئے پورے دو ماہ ہو چکے تھے۔ واحد اپنی کامیابی کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اتفاق سے وہ سائیکل پر گھر کے کسی کام سے شہر کی طرف آرہا تھا کہ اُس کا ذہن بورڈ کے نتیجے کی طرف چلا گیا اور وہ اپنے خیالوں میں کھو گیا۔

اِدھر سائیکل کہاں جارہی ہے۔ کچھ معلوم نہ ہوا، اپنی دُھن میں چلا جا رہا ہے، جب میں پاس ہو جاؤں گا تو کالج میں داخلہ لوں گا اور اگر اچھے نمبر آئے تو سائنس میں داخلہ لوں گا۔ بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اپنے ملک کے مریضوں کی خدمت دل و جان سے کروں گا اور جو طرح طرح کی بیماریاں ہیں ان سب پر ریسرچ کر کے ملک سے ان سب بیماریوں کا خاتمہ کر دوں گا۔

اِدھر سائیکل بڑھتی جا رہی ہے ـــ اگر فیل ہو جاؤں گا تو والد صاحب بہت خفا ہوں گے اور طرح طرح کے خیالوں میں مبتلا ہوں گے اور کیا کیا سوچیں گے، معلوم نہیں۔ مجھ کو گھر سے باہر کر دیں گے۔ یا کسی ہوٹل میں نوکر رکھا دیں گے۔ "بتاؤ واحد تم اتنے اچھے لڑکے ہو۔ یہ کیا کیا تم نے محنت نہیں کی۔ نہیں ابّا جان میں نے تو پوری محنت سے امتحان کی تیاری کی اور پھر بورڈ کا امتحان دیا۔ نہیں تم نے کچھ بھی محنت نہیں کی۔ میں نے تم پر بہت روپیا صرف کیا اور میں یہ امید کرتا تھا کہ آگے چل کر تم میرا کچھ ساتھ دو گے اور تم نے ہماری کوششوں پر ناامیدی کا پانی ڈال دیا۔ مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی لاپرواہی برتو گے۔ نکل جاؤ میرے گھر سے، اگر ایک پل بھی تم میرے سامنے نظر آئے تو پھر تمھاری خیر نہیں۔ اِدھر واحد پسینے میں لت پت ہو چکا تھا۔ امی جان بولیں: "بچے سے کوئی غلطی ہو گئی ہو گی اس لیے پاس نہیں ہو سکا۔"

تم چُپ رہو۔ مجھ کو معلوم ہے۔ آدمی اپنی زندگی میں کس کس مصیبت کا سامنا کرتا ہے۔ اگر شروع میں ہی یہ حال رہا تو آگے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تم کو کیا معلوم تم تو صرف گھر کے کاروبار، روٹی، چوُلھے چکّی اور گھر کی صفائی کے بارے میں جانتی ہو دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ دنیا کہاں سے کہاں ترقی کر رہی ہے۔ تم کو معلوم ہے؟

ابا جان مجھ کو معاف کر دو، اگلے سال اچھے نمبر سے پاس ہو کر میں اپنے ملک میں اچھا ڈاکٹر، اچھا انجینئر، اچھا آفیسر، اچھا عہدے دار بن کر دکھاؤں گا۔" میرے بچے! جو اپنی پہلی منزل سے گر گیا وہ دوبارہ چڑھ نہیں سکتا۔ یہ تو بعد کی بات ہے، تم اپنے مارک کیسے لائے، اس کے لیے تو میرٹ کے نمبر چاہییں اور تم زندگی میں کبھی بھی میرٹ نہیں لا سکتے۔"

"نہیں نہیں ابّا جان، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" واحد کا جوش اور بڑھ گیا۔ "میں جا رہا ہوں اُس سمندر کی طرف جو ہزاروں کی جان لے چکا ہے۔" "واحد تم سوچ لو کہ جان دینے سے تو کوئی فائدہ نہیں۔ خدا نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ اپنی زندگی میں آخر

بورگاؤں۔ جی۔ ٹی۔ روڈ۔ ناگپور

کے لیے اچھی تیاری کر کے تم جنت کے حق دار ہو جاؤ۔ یہ تو دنیا کا ایک چھوٹا سا امتحان ہے اور تم اتنے چھوٹے سے امتحان میں گھبرا گئے۔ ابھی تمھارا بڑا امتحان تو باقی ہے۔

وہ کونسا امتحان ہے۔ وہ تو قیامت کے بعد ہونے والا ہے۔" "مرنے سے پہلے اپنے امتحان کی تیاری کر کے مروگے تو خدا بھی تم سے بہت خوش ہوگا اور تم کو جنت کا حق دار بنا دے گا اور قبر میں بھی آرام سے رہوگے۔ نہیں تو جیسے زندگی کی پہلی منزل میں ناکامیاب ہوئے۔ بعد میں بھی کامیاب نہ ہوگے۔ اگر تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آرام چاہتے ہو تو مرنے سے پہلے اُس امتحان کی تیاری مضبوطی سے کرلو۔ اگر دل مضبوط رکھوگے تو پہلا امتحان قبر کا ہے اگر وہاں پر پاس نہیں ہوئے تو آخرت میں بھی ناکامیاب ہو جاؤ گے اور تم دوزخ کے حق دار ہو جاؤ گے اور نہ ہی کوئی پوچھنے والا ہوگا اور طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا رہو گے۔ تم کو تو معلوم ہی ہے۔" ہاں واحد کی سائیکل تیزی سے ایک دریا کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جو گھر سے شہر کی طرف آتے ہوئے ملتا ہے۔ اچانک کسی کی آواز اُس کے کان سے ٹکرائی۔ "او لڑکے آگے ندی ہے۔ اِدھر راستہ نہیں ہے۔ اِدھر راستہ نہیں ہے اور اس آدمی نے دوڑ کر سائیکل پکڑلی۔ "نہیں بابوجی ایسی زندگی سے مرنا بہتر ہے۔" "لڑکے تم کچھ پریشان نظر آتے ہو۔ کسی سے لڑ جھگڑ کے آرہے ہو۔ اتنے پسینے سے لت پت کیوں ہو۔" نہیں بابوجی میں اپنے میٹرک کے امتحان میں ناکامیاب ہو گیا ہوں۔ میرے جینے سے مرنا بہتر ہے۔ میرے والد نے مجھ کو گھر سے باہر کر دیا ہے۔" کیا ہوا لڑکے ابھی تم معصوم ہو۔ تم کو زندگی کا کچھ بھی معلوم نہیں۔ زندگی کیسے گزاری جائے۔ زندگی بار بار ٹھوکر کھا کر ہی سنورتی ہے۔ تم اپنی زندگی کو خوشگوار بناؤ اور ہنسی خوشی بسر کرو۔ تم پہلی منزل سے ہی گھبرا گئے۔ کیا ہوا ناکامیاب ہو گئے۔ دوسری بار پاس کر لینا۔ جاؤ اپنے گھر اور وہاں جاکر آرام کرو۔ تمھارے ماں باپ کچھ نہیں کہیں گے۔ میں سمجھا دوں گا۔ تم ہو کون؟" واحد بولا: "میرے والد والدہ تم کو جانتے بھی نہیں۔" "میں اُنھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

اِدھر گھر کے لوگ سب پریشان تھے کہ صبح سے واحد گیا ہے ابھی تک لوٹا نہیں ہے۔ واحد کے ابا بھی آفس سے گھر لوٹ گئے تھے شام کے پانچ بجے تھے۔ امی اور چھوٹی بہن بہت پریشان تھیں۔ سب پوچھ کر گھر لوٹ رہے تھے امی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چھوٹی بہن فرزانہ رو رہی تھی۔ میرے بھائی جان کہاں چلے گئے۔

سامنے سے ایک آدمی سائیکل پر تیزی سے آتا ہوا نظر آیا اور پوچھتا ہے واحد کا مکان کونسا ہے واحد کے والد گھبرا کر بولے کیا بات ہے یہ ہی واحد کا مکان ہے۔" آپ کا لڑکا اسپتال میں بھرتی ہے۔" سب کے منہ سے ایک آواز نکلتی ہے۔" میرے سامنے اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور ہم اسے بھرتی کر کے آرہے ہیں۔ خون اور گلوکوز کی بوتلیں لگی ہوئی ہیں۔" اُدھر اسپتال میں ۱۹ گھنٹے سے واحد کو ہوش نہیں تھا۔ ڈاکٹر کمرے سے نکلتے ہوئے ایک نظر واحد کے والد صاحب پر ڈالتے ہوئے کہتا ہے۔ "اب خطرہ نکل چکا ہے۔ آدھا ایک گھنٹے میں ہوش آجائے گا۔" سب کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ والدہ واحد کے سر کے پاس قرآن کی آیات پڑھ کر پھونک رہی ہیں اور چھوٹی بہن فرزانہ کی آنکھیں واحد کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں۔ واحد تھوڑی دیر میں آنکھیں کھولنا شروع کرتا ہے اور سب کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ اتنے میں واحد کہتا ہے کہ میں کہاں ہوں میری سائیکل کہاں ہے۔ یہاں مجھ کو کون لایا۔ یہ میرا گھر نہیں ہے۔" "واحد خاموش رہو۔ تم اسپتال میں ہو۔" مگر میں اسپتال میں نہیں آیا تھا۔ میں تو بازار سے گھر لوٹ گیا تھا۔" "واحد خاموش رہو۔ ابھی تم کو آرام کی ضرورت ہے۔" "ابا جان آپ یہاں پر کیوں آئے۔ ابا جان پہلے یہ بتائیے فرزانہ کہاں ہے۔ فرزانہ کیا میں پاس ہو گیا۔ ابا جان کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔" "آؤ بیٹے تم تو میرٹ میں آئے ہو۔" "سچ ابا جان" "ہاں۔ ہاں۔"

واحد جلدی سے اُٹھ کر ابا جان سے لپٹ گیا اور کہنے لگا میری امید ناکام نہیں ہوئی اور مجھ کو خدا نے مرنے سے بچا لیا۔ ایک گھنٹے کے بعد سب گھر واپس آتے ہیں۔

(باقی صفحہ

معین الدین الہ آبادی

دُور کی کوڑی



گرمیوں کے دن تھے۔

سورج کا لال گولا آسمان پر پوری طرح سے چمک رہا تھا۔ لگتا تھا ہر طرف آگ ہی آگ برس رہی ہے۔ لو کا بھی کچھ ویسا ہی عالم تھا۔ لو کے گرم گرم تھپیڑے جب جسم پر پڑتے تو لگتا جیسے بھٹی میں سے گرم گرم سلاخیں نکال کر کوئی جلد پر چھوا رہا ہے۔

ایسی غضب کی گرمی میں جنگل کے سارے چرند و پرند اپنے اپنے گھونسلوں اور ماندوں میں دبکے پڑے تھے۔ باہر نکلنے کی کون سوچے، باہر دیکھنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ سر پر آسمان اور نیچے زمین چولھے پر چڑھے توے کی مانند تپ رہی تھی۔

پورے جنگل میں ایک عجیب سی خاموشی چھائی تھی۔ جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ ہاں، جب لو کے تیز جھونکے چلتے تو پیڑ کی شاخیں آپس میں ٹکرا جاتیں جس سے لمحہ بھر کو اک شور اٹھتا اور پھر ویسا ہی سناٹا چھا جاتا۔

مگر جیٹھ کی اس تپتی دوپہر میں کما لو بندر ہی ایک ایسا جانور تھا جس کا کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں تھا۔ نہ رہنے کو کوئی گھونسلہ اور نہ کوئی ماند۔ بیچارا برگد کی ایک ڈال سے چپکا بیٹھا، سورج کی آگ اور لو کے تھپیڑوں کو سہہ رہا تھا۔

اُسے رہ رہ کر نیند آ رہی تھی۔ پیڑ کی ڈال بار بار اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی تھی۔ پسینے کی وجہ سے بیچارے کا برا حال تھا۔ نہ تو وہ سو پا رہا تھا اور نہ ہی جاگ پا رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت اس کے کانوں میں کسی کے بات کرنے کی آواز سنائی دی۔

آواز چوں کہ آدمیوں کی تھی اس لیے اس کے کان چوکنے ہو گئے، کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جانوروں میں اگر سب سے خطرناک جانور کوئی ہے تو وہ آدمی ہے جس کے آگے شیر، گینڈے اور ہاتھی جیسے طاقت ور جانوروں کی طاقت ختم ہو جاتی ہے اور جس کے دماغ کے آگے لومڑی جیسے چالاک جانور کی عقل بھی کام نہیں کر پاتی۔

سچ پوچھا جائے تو اُسے آدمی نام کے جانور سے نفرت تھی اور ایسا ہونا صحیح بھی تھا۔ جب کبھی وہ آدمیوں کو دیکھتا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور اس کی آنکھوں کے آگے وہ دن گھوم جاتے جب وہ ایسے ہی ایک آدمی کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب اُس کی عمر مشکل سے دو تین سال کی رہی ہوگی۔ یہ دو پیروں والا جاندار جسے آدمی کہتے ہیں اُسے اسی جنگل سے پکڑ لے گیا تھا۔ اس نے اس کی گردن میں ایک پتلی سی ڈور باندھ دی تھی۔ چھوٹے چھوٹے پھٹے کپڑوں کا ایک لباس بنا دیا تھا جسے پہنا کر وہ ڈمرو کی تھاپ پر دن بھر اسے نچایا کرتا تھا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ کما لو ایک دن کسی طرح چھوٹ کر بھاگ نکلا ورنہ شاید اس کی پوری زندگی اِدھر سے اُدھر ناچنے ہی میں ختم ہو جاتی۔

یہی وجہ تھی کہ پیڑ کے نیچے کی آواز جب اس نے سنی تو اُس کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ سمجھ گیا کہ کہیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا نیچے دو آدمی جن کے کاندھوں پر بندوقیں تھیں اور

نیوٹیشنل مڈل اسکول پُرانی بستی روڈ، جگسلائی، جمشید پور

جن کی حالت گرمی کی وجہ سے پتلی ہو رہی تھی بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اس نے اُدھر ہی کان لگا دیے۔ پہلا آدمی دوسرے سے کہہ رہا تھا —— "آج تو غضب کی گرمی ہے...... پیاس کے مارے تو جان نکلی جا رہی ہے......"

"جانے کس کی شکل دیکھ کر چلے تھے کہ دن بھر میں ایک بھی شکار ہاتھ نہیں آیا۔ دن بھر بھوکے پیاسے اِدھر سے اُدھر بھٹکتے رہے سو الگ..." دوسرے نے کہا۔

اس کے بعد دونوں چپ ہو گئے شاید انھیں بھی جھپکی آ گئی تھی کیوں کہ اوپر بیٹھے کمالو نے دیکھا کہ دونوں نے کاندھوں پر سے بندوقیں اتار کر زمین پر رکھ دی ہیں اور وہیں لیٹ گئے ہیں۔ مگر کمالو ادھر ہی کان لگائے رہا اور سوچتا رہا کہ آج پتا نہیں کس کی شامت آئے گی۔

ابھی تھوڑی ہی دیر بیتی ہوگی کہ ان میں سے ایک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے دوسرے کو جگاتے ہوئے کہا "آؤ چلو گھر لوٹ چلیں زوروں کی بھوک لگ رہی ہے..."

لیکن شاید دوسرے کی طبیعت اٹھنے کی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اسی طرح لیٹے لیٹے بولا —— "تھوڑی دیر اور رکو۔ ذرا سستا لوں تو چلوں..."

"دیکھتے نہیں آسمان کا رنگ کس تیزی سے بدل رہا ہے۔ شاید آندھی آنے والی ہے اور اگر کہیں آندھی آ گئی تو بڑے پھنس جائیں گے اور تب ڈھونڈنے پر بھی راستہ نہیں ملے گا......" پہلا بولا۔

دوسرا آدمی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک بار آسمان کی طرف دیکھا اور بولا —— "ہوں...... شاید کافی تیز آندھی آئے گی۔"

وہ دونوں آندھی کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے ہوئے چل دیے۔ مگر پیڑ پر بیٹھا کمالو کچھ عجیب ہی چکر میں پڑ گیا۔ ان دونوں کی باتیں سن کر اس کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ آندھی کون سی بلا ہے جس سے یہ دو پیروں والے جاندار بھی ڈرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی بہت ہی خطرناک بلا ہو۔ اس لیے سبھوں کو خبردار کر دینا چاہیے کہ آندھی ادھر ہی آنے والی ہے۔ اتنا سوچتے ہی کمالو بندر ایک جھٹکے سے اٹھا اور جنگل کے سارے جانوروں کو خبر کرنے کے لیے ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر کودتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔

ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ بھوبھو بھالو سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ اُسے اس طرح بھاگتا دیکھ کر بھوبھو بھالو نے پوچھا —— "ارے بھائی کمالو! اتنی تیزی سے کدھر جا رہے ہو؟"

"بھاگو دادا...... بھاگو... آج ادھر آندھی آنے والی ہے کسی کی خیر نہیں۔" کمالو بغیر رکے کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اسے اس طرح بے تحاشا بھاگتے دیکھ بھوبھو بھالو بھی بنا کچھ سوچے سمجھے اسی کے پیچھے ہو لیا۔

راستے میں کمالو سے خرگوش نے پوچھا —— "نانا... بڑی جلدی میں ہو۔ کیا بات ہے؟"

"ارے بھاگو.... بھاگو.... وہ آندھی آ رہی ہے.... آندھی ہم سب کی موت۔" کمالو بندر نے کہا۔

اسی طرح راہ میں جو بھی ملتا بندر کو دوپہر میں اس طرح پریشان بھاگتے دیکھ کر ضرور ہی پوچھ لیتا —— "بھائی کمالو! اتنی تیزی میں آخر کدھر جا رہے ہو؟" اور کمالو بندر کا جواب ہوتا "بھاگو۔ بھاگو آندھی آ رہی ہے آندھی.... ہم سب کی موت!" اور موت کا نام سنتے ہی لوگ اس کے پیچھے ہو لیتے۔

دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً پورا جنگل خالی ہو گیا۔ آگے آگے کمالو بندر اور پیچھے پیچھے جنگل کے سارے جانور چاہے وہ شیر ہو یا ریچھ، سانبھر ہو کہ چیتل، لومڑی ہو کہ خرگوش سبھی بھاگے جا رہے تھے۔

بھاگتے بھاگتے وہ لوگ ایک کھلے میدان میں آ پہنچے۔ شام ہو چکی تھی۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ کی وجہ سے سبھوں کی حالت خراب تھی۔ پسینے سے ان کا جسم شرابور تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ بھوک اور پیاس سے ادھ مرے ہو رہے تھے مگر اس کھلے میدان میں نہ تو کہیں پانی تھا اور نہ ہی کچھ کھانے کو تھا۔ اب ان میں اتنی بھی طاقت نہیں تھی کہ اٹھ کر کھانا پانی تلاش کرتے۔ جھک مار کر وہ وہیں پڑ گئے۔ سبھوں کے چہرے پر تکان اور پریشانی کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ ایک طرف تو بھوک اور پیاس سے ان کی حالت خراب تھی اور دوسری طرف آندھی آنے کا ڈر سا لگا تھا۔

کہتے ہیں کہ جب موت سر پر آ جاتی ہے تو دماغ کافی تیزی سے کام کرتا ہے۔ وہی ان کے ساتھ بھی ہوا۔ شیر جو جنگل کا راجہ

[illegible] کے حکم سے چار چار جانور میدان کے چاروں طرف پہرہ دینے کے لیے مقرر کر دیے گئے کہ وہ آندھی کے آتے ہی دوسروں کو خبردار کر دیں [illegible] کے لیے تیار ہو جائیں۔ کمالو بندر کو ان سبھوں کا سردار مقرر کیا گیا جو رات بھر جاگ کر ان سبھوں کی نگرانی کرتا رہے گا یہاں تک کہ شیر نے بھی رات بھر جاگ کر پہرہ دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔

دھیرے دھیرے رات گزرتی گئی اور رات کے ساتھ ساتھ وہاں کا ڈراؤنا پن بھی بڑھتا گیا۔ اس میدان میں ایک عجیب سا منظر رونما تھا۔ سبھی تھکے ماندے پڑے ہانپ رہے تھے۔ وہ سونا چاہتے تھے مگر ڈر کی وجہ سے کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ آتی بھی کیسے — جب سر پہ موت کھڑی ہو تو بھلا نیند کیسے آ سکتی ہے۔

کسی طرح رات ختم ہوئی اور صبح ہوئی۔ سورج کا لال گولا اوپر کی طرف چڑھنے لگا لیکن آندھی نہیں آئی۔ پہرے دار واپس لوٹ آئے۔ ان کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی کیوں کہ بھاگ دوڑ کی وجہ سے پہلے ہی وہ تھک چکے تھے، اوپر سے انھیں رات بھر جاگ کر پہرہ بھی دینا پڑا۔ مگر ان سب سے زیادہ حالت خستہ تھی کمالو اور شیر کی۔

ہاں، جب پوری طرح دن نکل آیا تو شیر نے کمالو بندر کو بلا کر پوچھا — "کیوں میاں ...... تم تو کہہ رہے تھے کہ آندھی آنے والی ہے .... لیکن وہ آئی نہیں ....."

کمالو بولا — "حضور .... یہاں تو نہیں ..... لگتا ہے جنگل سے ہی لوٹ گئی ......"

کمالو کی بات شیر کو ٹھیک لگی۔ اس وقت وہ کمالو سے بڑا خوش تھا کیوں کہ اس کی وجہ سے سب کی جان بچ گئی ورنہ سب کے سب بے موت مارے جاتے۔ اس نے خوشی سے کہا —
"سارا جنگل اور یہاں کے رہنے والے تمہارے بڑے احسان مند ہیں کمالو ..... ورنہ ہم میں سے آج کوئی بھی زندہ نہیں بچتا... ... ہم تمھیں اس کا انعام دیں گے۔ جا کر سب سے کہو کہ وہ جنگل لوٹ چلیں۔"

اس وقت کمالو بندر کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ پھولا نہیں سما رہا تھا اور وہ اچھلتا کودتا اس طرف چل پڑا جدھر گھنا جنگل تھا۔

بقیہ صفحہ ۲

اجنبی آدمی دیکھ کر مسکراتا ہے وہ آدمی بھی گھر تک واپس آتا ہے۔ واحد دوڑ کر آدمی کو پکڑتا ہے۔ وہ آدمی وہ آدمی کہاں گیا جو ساتھ میں آیا تھا۔ آگے دوڑتا ہے۔ راستے میں ایک چھٹی پڑی ہوئی ملتی ہے۔ اٹھاتا ہے اور زور سے پڑھتا ہے۔

"یہ تمھارے ذہن کا ایکسیڈنٹ تھا۔ تم اپنی منزلِ مقصود میں کامیاب ہو گئے۔ اب خدا کے احکام کی پابندی کرو۔ زندگی کو بھی خوشگوار بناؤ اور آخرت میں بھی تم جنت کے حقدار بن جاؤ۔ اچھا خدا حافظ۔"

فارم IV حسب قاعدہ
بابت پیامِ تعلیم نئی دہلی ۲۵

(۱) مقامِ اشاعت: جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
(۲) وقفۂ اشاعت: ماہنامہ
(۳) پرنٹر کا نام: سید احمد ولی ہندستانی۔ پتا: جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
(۴) پبلشر کا نام: " " " " " "
(۵) اڈیٹر کا نام: " " " " " "
مالکان کے نام اور پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
چیرمین: پروفیسر محمد مجیب۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
۱۔ ڈائرکٹر: سید مجتبیٰ حسین زیدی " " "
۲۔ " معین الدین حارث پاٹن والا محل۔ کناٹ روڈ بمبئی ۲۷
۳۔ " نواب اقبال محمد خاں۔ کف پریڈ کولابہ بمبئی ۵
۴۔ " کرنل بشیر حسین زیدی جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
۵۔ " ضیاء الحسن فاروقی جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
۶۔ " مالک رام بوبچہ سی ۴/۵ ڈفینس کالونی نئی دہلی ۲۴
۷۔ " انور جمال قدوائی وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
کمپنی کے سرمایے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصے دار جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔ اسلامی جیم خانہ کنیڈی، سی فیس بمبئی۔
میں سید احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

۲۴ فروری ۸۳ء — سید احمد ولی

جاوید اقبال

کیسے لوگ

راجا رام موہن رائے

راجا رام موہن رائے اُن عظیم شخصیتوں میں سے تھے جو بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ وہ ایک عظیم انسان، قابل اور مصلح ہی نہیں، بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ موہن رائے جیسے لوگ ہمارے ملک کا وہ سرمایہ ہیں، جن پر ہم بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے ملک کی تعمیر میں جو رول ادا کیا، اس کی عظمت سے کسی طور پر انکار ممکن نہیں۔ بنگال کے ضلع ہگلی کے ایک چھوٹے سے گاؤں رادھا نگر میں ۲۲ مئی ۱۷۷۲ء کو رام کانت رائے کے گھر ایک بچے نے جنم لیا۔ ماں باپ نے بیٹے کا نام موہن رکھا۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ یہ معصوم ایک دن اُن کے اور اُن کے ملک کے نام کو روشن کردے گا۔

رام موہن بچپن ہی سے بڑے ذہین تھے۔ اس لیے اُنھوں نے جلد ہی عربی، فارسی اور بنگالی کی مکمل تعلیم حاصل کرلی۔ موہن رائے نو ۹ سال کی عمر میں فارسی اور بنگالی اچھی طرح پڑھ چکے تھے۔ اُنھوں نے پٹنہ میں عربی کی تعلیم حاصل کی۔ جہاں سب سے پہلے وہ فلسفۂ وحدانیت اور یونانی فلسفے سے روشناس ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں اُنھیں سنسکرت پڑھنے کے لیے کاشی بھیج دیا گیا۔ یہاں اُنھوں نے ہندو مذہب کا بہ غور مطالعہ کیا۔ چند سال بعد یہ نوجوان جب اپنے گھر پہنچا تو وہ ایک وسیع تجربہ اور بالغ نظر رکھتا تھا۔ اب موہن رائے کو چاروں طرف دکھائی دینے والے رسم و رواج عجیب سے لگے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ لوگوں نے مذہب کے نام پر عجیب و غریب رسم و رواج اور طور طریقے اپنا رکھے ہیں۔ ایسے طریقے اور رسوم جن کا مذہب سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ رام موہن کا دَم اس ماحول میں گھٹنے لگا۔ خاندان والے اُن کے جدید خیالات کے باعث اُن سے برہم ہوگئے۔ وہ ایک بار پھر حصولِ علم کی نیّت سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ بستی بستی سفر کرتے، علم اور تجربات حاصل کرتے ہوئے ہمالیہ پار کرکے وہ تبّت جا پہنچے۔ جہاں انھوں نے بُدھ مت اور اُس کے اصولوں کو سمجھا۔ تقریباً چار سال بعد پھر گھر واپس آئے۔

۱۸۰۳ء سے ۱۸۱۴ء تک وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کرتے رہے اور مختلف عہدوں سے ترقی کرتے کرتے دیوان یا سررشتہ دار کے عہدے تک پہنچ گئے۔

رام موہن کا کہنا تھا کہ خدا ایک ہے۔ دُنیا کا ہر مذہب اس سلسلے میں متفق ہے۔ ہندو مذہب بھی جس میں سیکڑوں دیوی دیوتا ہیں۔ "ایک خدا" "برہما" کا تصور رکھتا ہے۔ ہر جگہ خدا کی پرستش اور عبادت کے طریقے مختلف ہیں۔ کچھ طریقے صحیح ہیں اور کچھ صحیح نہیں ہیں۔ ہر انسان کو دیانت داری سے اس بات کی تحقیق کرنا چاہیے کہ سچ کیا ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ ایک خدا کی عبادت تمام دنیا کا مذہب ہونا چاہیے۔ وہ بُت پرستی کے کٹّر دشمن تھے اور ذات پات کا فرق اُن کی نگاہ میں انتہائی ذلیل بات تھی۔ وہ ہر مذہب کے مبلغ تھے۔ اُنھوں نے ۱۸۱۶ء میں ویدانت کا مختصر انگریزی ترجمہ شائع کیا جو کہ ہندوؤں کی ایک مشہور مذہبی کتاب ہے۔ وہ مذہب اسلام کی بُنیادی باتوں، عقائد اور نظریات کو سمجھنے کے بعد اس مذہب

۱۱۳ منی بازار اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی

کی عظمت کے دل سے معترف ہو گئے۔ عیسائیت کے مطالعے نے انھیں حضرت عیسیٰؑ کی ذات کا گرویدہ بنا دیا۔ اپنے انھیں خیالات کی تبلیغ کے لیے انھوں نے ۲۰ر اگست ۱۸۲۸ء کو ایک انجمن برہم سبھا کے نام سے قائم کی۔ یہی سبھا آگے چل کر برہمو سماج کے نام سے مشہور ہوئی۔

رام موہن رائے مغربی تعلیم کے بہت بڑے حامی تھے انھوں نے لوگوں کو تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانے کی کامیاب کوشش کی اور انھیں بتایا کہ اگر تعلیم نہ ہو تو انسان اور جانور میں کچھ فرق نہیں رہ جاتا ہے۔ انھوں نے مختلف اسکول قائم کیے جن کا زیادہ تر خرچ وہ خود برداشت کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ تعلیم کے میدان میں عورتوں کو بھی پیش پیش رہنا چاہیے۔

فرسودہ اور بے بنیاد رسم و رواج کی پروا نہ کرتے ہوئے انھوں نے انگلینڈ کا سفر کیا۔ اِس سے اُن کے دشمنوں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی۔ فرسودہ خیالات کا لبادہ اوڑھے بے وقوف لوگ اُن سے نفرت کرنے لگے اور کہنے لگے کہ "اُس نے مذہب کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی، یہ باغی ہے۔ اِسے ختم کردو۔" ان کو مارنے کی کئی مرتبہ کوشش کی گئی، مگر حق کی راہ پر چلنے والے کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔

ہندستان کو غلامی کی زنجیر میں جکڑا دیکھ کر انھیں بڑا دُکھ ہوتا تھا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ہندستان آزاد ہو جائے

رام موہن رائے کے کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ ستی کی بے ہودہ رسم کو بند کرانا بھی ہے۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۴ر دسمبر ۱۸۲۹ء کو ستی کی بے ہودہ رسم غیر قانونی قرار دی گئی۔ انھوں نے اِس سلسلے میں بہت سے کتابچے لکھے، اور لوگوں کے خیالات ہموار کیے۔ بھرپور کوشش کی اور آخر کار یہ منحوس رسم ختم ہوئی۔

موہن رائے کی قابلیت اور اہمیت کا اقرار کرتے ہوئے شاہ ابوالنصر معین الدین نے انھیں راجہ کا خطاب عطا کیا، اِس لیے موہن رائے راجا رام کے نام سے پہچانے جانے لگے۔

وہ ایک بے باک صحافی بھی تھے۔ اِس کا ثبوت ان کی ادارت میں نکلنے والے بنگالی زبان کے اخبار "بنگال گزٹ" "سماچار درپن"، سنباد وغیرہ اور فارسی کا روزنامہ "مراۃ الاخبار" ہیں۔

۲۷ر ستمبر ۱۸۳۳ء کو برسٹل میں ہندستان کے اس عظیم سپوت کا انتقال ہو گیا۔ جو دل سے چاہتا تھا ہندستانی انگریزی علوم سیکھیں، آزادی حاصل کریں۔ فرسودہ اور بے بنیاد توہمات و خیالات کے اندھیروں سے نکل کر حقیقت کی روشنی میں آئیں اور خود کو پہچانیں۔

بقیہ صفحہ ۲۸

وا اپنے گھر لے گیا جہاں اسے رحیم کی سچائی معلوم ہوئی کہ اُس کا باپ مر چکا ہے اور ماں بھی بیمار رہتی ہے۔

اب رحیم اور اُس کی ماں اُس رئیس کے یہاں رہنے لگے۔ کیوں کہ رئیس کی کوئی اولاد نہ تھی اور دولت بے شمار تھی۔ کئی برسوں بعد وہی رحیم پڑھ لکھ کر اس علاقے کے ایک بڑے تاجر سیٹھ رحیم کے نام سے مشہور ہوا۔

سلطان آزاد

سانچ کو آنچ نہیں

رحیم ابھی درجہ ششم کا طالب علم ہی تھا کہ ایک حادثے کے تحت اُس کے والد کی موت ہو گئی۔ اب اُس کے سامنے صرف اُس کی ماں تھی۔ وہ بھی اکثر بیمار رہتی تھی۔ اُسے پڑھنے لکھنے کے لیے کتابوں اور کاپیوں کی ضرورت پوری ہونی تو درکنار، کھانے پینے کے لیے بھی پیسے نہ تھے۔ وہ اپنی چھوٹی سی عمر میں مصیبت اور ماں کی بیماری سے گھبرا کر سوچنے لگا کہ میں کیا کروں؟ اُسے ایک ترکیب سوجھی: "ماں! میں تمھیں اچھا ہونے کے لیے اور کھانے کے لیے کام کروں گا۔" ماں نے کہا: "نہیں بیٹے! ابھی تو بہت چھوٹا ہے، تجھ سے کام نہیں ہو سکے گا۔" لیکن رحیم اپنی ضد پر قائم رہا۔ آخر ماں نے مجبور ہو کر کہا: "ٹھیک ہے، جاؤ، لیکن بیٹے! ایک بات کبھی نہ بھولنا چاہے کچھ ہو جائے تو بولنا ہمیشہ سچ۔"

رحیم کام کی تلاش میں گھومتے گھومتے ایک گوالے کے پاس جا پہنچا۔ جو گائے سے دودھ دوہ رہا تھا۔ رحیم کو اپنے پاس کھڑا دیکھ کر گوالے نے اس سے پوچھا، "کیا ہے؟" "مجھے کام چاہیے، میں کام کرنا چاہتا ہوں۔" رحیم نے اُسے جواب دیا۔ گوالے نے اُسے نوکر کی حیثیت سے رکھ لیا اور وہ روزانہ دُور دُور تک جا کر لوگوں کو دودھ پہنچانے لگا۔ ایک دن ایک گاہک نے اُس سے ڈانٹ کر پوچھا: "سچ سچ بتا، تیرا مالک دودھ میں پانی ملاتا ہے یا نہیں؟" اُس نے سچ سچ کا نام سن کر سچی بات بتا دی۔ کہ "ہاں! میرا مالک پانی دودھ میں ملاتا ہے۔" اِس بات کو سُن کر گوالے نے اُسے مار پیٹ کر نکال دیا۔ بے چارہ رحیم دوسری جگہ نوکری کی تلاش میں موٹر کے کارخانے میں جا پہنچا۔ وہاں اُس نے کارخانے کے مالک سے بھی نوکری کی بات کہی۔ کارخانے کے مالک نے اُسے نوکر رکھ لیا۔ ایک دن ایک آدمی کار بنانے کے لیے دے گیا۔ اور دوسرے دن جب آیا تو اُس نے پوچھا "گاڑی تیار ہو گئی؟" رحیم نے کہا۔ "ہاں حضور" وہ کمرے کے اندر جا کر مالک کو بلانا ہی چاہتا تھا کہ گاڑی والے نے کہا: "سنو!" اور وہ رُک گیا۔ "اِس گاڑی میں جو کچھ بدلنا تھا وہ بدلا گیا ہے یا نہیں؟" گاڑی والے نے رحیم سے پوچھا۔ رحیم نے سچ سچ بتا دیا کہ اِس گاڑی کا نیا پُرزہ نکال کر پرانا پُرزہ لگایا گیا ہے۔ گاڑی والے نے مالک کی خبر لی اور مالک نے رحیم کو کارخانے سے کان پکڑ کر نکال دیا۔

رحیم مایوس ہو کر جب شام کو گھر لوٹ رہا تھا تو اُس کی نگاہ اسکول کی طرف جا اُٹھی جہاں وہ کبھی پڑھتا تھا۔ اسکول سے نکل کر لڑکے ہنستے کھیلتے، کودتے اپنے اپنے گھر جا رہے تھے اُسے یہ منظر دیکھ کر اپنی دُرگت پر بڑا افسوس ہوا۔ لیکن کیا کرتا۔ وہ بھی اپنے گھر کی طرف چل پڑا اور گھر جا کر پلنگ پر اپنی ماں کے قریب بیٹھ گیا اور سر جھکا کر سوچنے لگا۔ ماں نے اسے دیکھ کر کہا: "کیا ہوا بیٹا! لگتا ہے کہ تو آج بھی پریشان ہو کر آیا ہے۔ میں کہتی تھی نہ کہ تجھ سے کام نہ ہو سکے گا، لیکن تو نے نہ مانا۔" رحیم رو پڑا اور روتے ہوئے کہنے لگا:

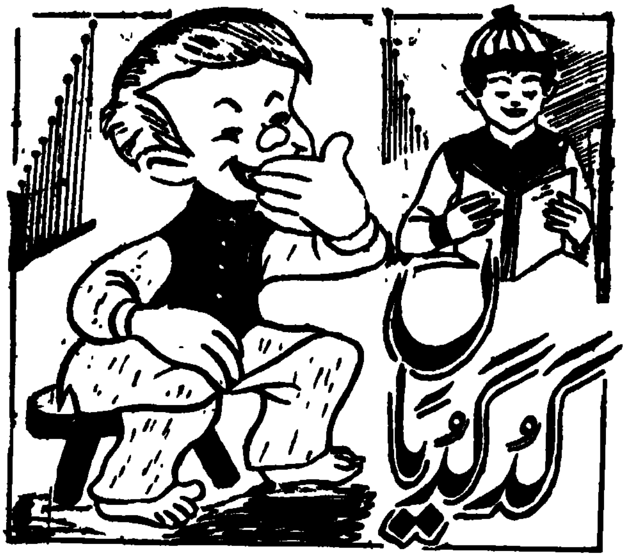
پتو مین گلزار باغ پٹنہ، ۸۰۰۰۰۷

"نہیں ماں! میں کام سے نہیں گھبرایا۔ میں تمھاری بات سے گھبرا گیا ہوں۔ تمھارا سچ کسی کو پسند نہیں۔ سچ بولنے پر لوگ مارنے پیٹتے ہیں۔" ماں نے کہا: "بیٹا تو اتنی سی بات سے گھبرا گیا۔ سانچ کو آنچ نہیں۔ تو دنیا کی پروا مت کر۔ بس سچ کو تو اپنائے رہ۔ ایک دن تو اسی سچ کے سہارے بڑا آدمی کہلائے گا۔"

اگلے دن رحیم پھر کام کی تلاش میں ایک ہوٹل میں جا پہنچا۔ وہاں اُسے کام مل گیا۔ وہ گاہکوں کے سامنے کھانے پینے کی چیزوں کو الماریوں سے نکال کر تشتریوں میں دیتا تھا۔ ایک دن ہوٹل میں بہت بھیڑ تھی۔ ایک آدمی آیا اور اُس نے رحیم کو ایک طرف کنارے بُلا کر اس سے کہا۔ سنو اس "کافی" میں اسے ملا دو، میں تمھیں دس روپے دوں گا۔" یہ کہہ کر اُس کے ہاتھ سے "کافی" لے کر خود اس میں وہ چیز ملا دی۔ رحیم سمجھ گیا کہ ضرور کوئی خراب چیز ہے جو اس گاہک کو پلانا چاہتا ہے۔ وہ گھبرایا ہوا اُس گاہک کے پاس گیا اور وہ "کافی" گاہک کے سامنے رکھنا ہی چاہتا تھا کہ اس کے کانپتے ہاتھوں سے کپ گر پڑا۔ گاہک نے غصے میں اُس کا کان پکڑ کر اٹھایا اور مارنا شروع کر دیا۔ "کم بخت! میرے سوٹ کو برباد کر ڈالا۔" یہ سُن کر ہوٹل کا مالک بھی دوڑ پڑا۔ گاہک کے کپڑے پر گری ہوئی "کافی" اور رحیم کو مار کھاتے دیکھ کر اُس نے بھی مارنے کے لیے تھپڑ اُٹھایا ہی تھا کہ رحیم نے روتے اور بلبلاتے ہوئے کہا۔ "وہ آدمی جو ہوٹل سے بھاگا جا رہا ہے اُس نے میرے ہاتھ سے "کافی" چھین کر اس میں نہ جانے کیا ملا دیا تھا اور کہا تھا کہ ان کو دے دو تو میں تم کو دس روپے دوں گا۔ اس لیے میں گھبرا سا گیا تھا کہ کہیں انھوں نے اسے پی لیا تو ہو سکتا ہے کہ مر بھی جائیں۔ اس لیے میں نے جان کر کپ گرا دیا۔ لیکن وہ نیچے گرنے کے بجائے ان کے کپڑے پر گر گیا۔" جب اس گری ہوئی کافی کو جانچا گیا تو واقعی اُس میں زہر تھا۔ وہ گاہک شہر کا بہت بڑا رئیس تھا۔ جس کے دشمنوں کی اُس کی دولت پر آنکھ لگی ہوئی تھی۔ وہ رئیس گاہک رحیم کی بات سن کر اپنی غلطی پر نادم ہوا۔ اور رحیم

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

پیام تعلیم کہاں کہاں ملتا ہے



● پٹھان گھڑی ساز سے: اس گھڑی کی مرمت کا کیا لوگے؟
گھڑی ساز: حضور جتنے میں آپ نے گھڑی خریدی ہے۔ اس سے آدھا دے دیجیے گا۔
پٹھان: میں نے یہ گھڑی ایک آدمی سے چار گھونسے دے کر خریدا ہے۔

مسرور حسن
لکھنیاں بیگو سرائے بہار

● ایک دیہاتی جس نے ریل نہ دیکھی تھی (ایک بابو سے)
کیوں بابو صاحب، ریل کس طرح چلتی ہے؟
بابو: آگ اور پانی سے۔
دیہاتی: گھروں میں بھی آگ اور پانی ہوتا ہے تو وہ کیوں نہیں چلتے؟

غفران الحق نور
محلہ شیخانہ خرد، بہار شریف ۸۰۳۱۰۱۔ نالندہ بہار

● ایک دیہاتی سڑک پر مولی کھاتا جا رہا تھا کہ اس کی ٹکر ایک انگریز سے ہوگئی۔ انگریز نے مڑ کر دیکھا اور کہا۔
آئی ایم سوری۔

دیہاتی بولا: ارے تو ساری کہتا ہے میں تجھے آدھی بھی دینے پر تیار نہیں ہوں۔

محمد ہارون حاجی عبدالرشید مانوی
کرانہ شاپ ضلع بہ کودہ

● منی: امی! آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟
امی: یہ تمھارے ابو کا خط ہے۔
منی: کیا ابو یہاں خط دینے آئے تھے؟
امی: نہیں تمھارے ابو نہیں آئے تھے بلکہ ڈاکیہ خط دینے آیا تھا۔
منی: تو کیا ڈاکیہ ابو کے ہاں گیا تھا؟

فرحی حیدر
بٹلہ ہاؤس۔ اوکھلا۔ نئی دہلی ۲۵

● ایک شخص کا گزر قبرستان سے ہوا اچانک اس کی نظر ایک قبر پر پڑی جس کے کتبے پر لکھا ہوا تھا۔ "ایمان دار وکیل" اس شخص نے دو تین مرتبہ پڑھا۔ پھر بڑبڑانے لگا۔
حیرت ہے کہ کس طرح ایک قبر میں دو دو آدمی دفن کر دیے گئے ہیں۔

فوزیہ افضال صدیقی
گنگیرو، مظفر نگر (یوپی)

●
آصم: ارے بھئی آصف تعلیم کو ہندی میں کیا کہتے ہیں۔
آصف: بھاگ
آصم: ارے بھئی بھگا کیوں رہے ہو۔ نہیں آتا تو ویسے ہی کہہ دو۔

سید شمیم انور نقوی نظر شخانہ دہلی

● ایک صاحب فلم دیکھ کر ہال سے باہر نکلے تو بڑبڑانے لگے "واہ کمال ہے! اتنی بارش ہوئی مگر سڑک پر کہیں پانی کا نام و نشان بھی نہیں ہے"

عابد۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵



جنوری کا ماہنامہ دیکھ کر خوشی ہوئی اس کا معیار برابر اونچا اُٹھ رہا ہے۔ "بالشتیے کے جوتے" اور طب کی روشنی میں بہت پسند آئے۔

واقعی بچوں کے لیے اپنی نوعیت کا واحد رسالہ ہے۔ خدا کرے یہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین
معلوماتی مضامین کا اضافہ کردیں مہربانی ہوگی۔

ثروت عثمانی

پتا: ۵ ۱۲۳ محل سرائے، حویلی حسام الدین، بلیماران دہلی ۶

دسمبر کا پیام تعلیم دیکھا۔ ماشاء اللہ سوکھے میوے کا کیا کہنا مبارک باد قبول کریں۔ تمام مضمون بے حد پسند آئے۔
میرا خیال ہے جس طرح دسمبر کے شمارے میں رسول پاک کی زندگی کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ ہر ماہ قائم رہے تو بہتر ہوگا۔

اقبال احمد نظامی

اقبال منزل، شیگاؤں (بلڈانہ)

دسمبر ۱۹۸۲ء کا "پیام تعلیم" باصرہ نواز ہوا۔ رسالہ ہر طرح سے بہت بہتر ہے۔ "بچوں کی کوششیں" کے عنوان سے اس میں جو کہانیاں شائع ہو رہی ہیں وہ قابل صد تحسین ہیں۔ اس سے خصوصاً ہمارے ننھے فنکاروں کو لکھنے کا شوق اور سلیقہ پیدا ہوگا۔

محمد احسن عالم

ڈسپنسری کھریال۔ پوسٹ آفس۔ دھوم نگر، وایا۔ سالماری،
ضلع کٹیہار (بہار)



فردوسیہ اختر — عمر ۱۱ سال
مشغلہ: پیام تعلیم، نور اور دینی کتب کا مطالعہ کرنا۔ نماز پڑھنا۔
پتا: معرفت عبدالظاہر۔ سرائے عاقل۔ الہ آباد (یوپی)

عبدالرحمن صدیقی — عمر ۱۷ سال
مشغلہ: رسائل پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔
پتا: ۱۷۔ رنگریزان۔ خورجہ۔ ضلع بلند شہر (یوپی)

محمد اسمٰعیل اعظمی — ۱۹ سال
مشغلہ: الرسالہ، پیام تعلیم اور دینی رسائل کا مطالعہ کرنا۔
پتا: جمال پورہ۔ مئوناتھ بھنجن اعظم گڑھ (یوپی)

ریشما نازلی — عمر ۱۵ سال
مشغلہ: اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔
پتا: معرفت خواجہ امان اللہ۔ نزد جامع مسجد سرائے روڈ گیا

محمد عین الحق — عمر ۱۸ سال
مشغلہ: اخبار پڑھنا۔ رسالوں کا مطالعہ کرنا۔
پتا: معرفت امام برادرس۔ اسٹیشن روڈ۔ بٹیانہ۔ کلٹی

حسین رضا — عمر ۱۹ سال
مشغلہ: کلچرل پروگرام میں حصہ، ادب سے دلچسپی۔
پتا: ۳۳، محمد علی ہاسٹل۔ مومن پورہ۔ ناگپور ۱۸



مُرتبہ: موثق الدین

ادھر ادھر سے

تہذیب ہائی اسکول مالیگاؤں

۲۶ ردسمبر ۸۲ء کو اینگلو اردو ہائی اسکول نندوربار میں منعقدہ "آل مہاراشٹر تقریری مقابلے" میں تہذیب ہائی اسکول مالیگاؤں کے دو ہونہار طلبہ پرویز اختر اور عبید اللہ اقبال احمد نے بالترتیب سینیر اور جونیر گروپ میں اول نمبر کی شیلڈ حاصل کی۔

بھونکنے والی ریت

ہونولولو سے ۵۰ میل کے فاصلے پر کوئی نامی جزیرے کے ساحل پر ایک انوکھی قسم کی ریت ہے۔ اس کے ساٹھ فٹ اونچے ٹیلے میں اس ریت کو اگر دونوں مٹھیوں میں رگڑا جائے تو اس میں سے کتّے کے بھونکنے کی سی آواز نکلتی ہے۔

ورق اُلٹنے کا آلہ

بیمار یا معزور حضرات کے لیے ایک ایسا آلہ تیار کیا گیا ہے، جو کتاب کے ورق خود بہ خود اُلٹ دے گا۔ بیمار جب ورق الٹنا چاہے گا تو آہستہ سے پھونک مارے گا۔ اس آلے میں ننھے ننھے بٹن اور دو چھوٹے برقی موٹر لگے ہوتے ہیں۔ جو پھونک مارنے سے ورق اُلٹنے والے حصے کو دائیں جانب گھما دیتے ہیں جب یہ حصہ اپنی جگہ آتا ہے تو کتاب کے ورق بائیں جانب اُلٹ دیتا ہے۔

راویر ہائی اسکول میں یوم اطفال

حکومت کے حکم نامے کے مطابق ۱۸ ردسمبر کو اینگلو اردو

معرفت: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ بمبئی ۳

ہائی اسکول راویر میں یوم اطفال منایا گیا۔ صدارت راویر تعلقہ کے نوجوان سوشل ورکر شیخ سلیم نے کی۔ مقررین میں عبدالقیوم سر و شفیع الدین نے نہرو جی کی زندگی پر روشنی ڈالی اور طلبہ کو اس دن کی اہمیت سمجھائی۔ صدر جلسہ نے بھی طلبہ کو بچوں کے چاچا سے متعلق دلچسپ باتیں بتائیں اور تعلیم پر دھیان دینے کو کہا۔ اسی روز اسکول میں طلبہ کے کبڈی، والی بال، کرکٹ کے مقابلے ہوئے اور انعامات دیے گئے۔

پلاسٹک کا مکان

کیلی فورنیا کی ایک تعمیراتی کمپنی میٹریل سسٹمس کارپوریشن نے اس فضلے سے جو پٹرول صاف کرنے کے بعد ریت اور ریشے کی شکل میں باقی رہ جاتا ہے، ایک پلاسٹک تیار کیا ہے۔ یہ پلاسٹک ان مکانوں میں استعمال کیا جاتا ہے جو ٹکڑے جوڑ کر بنائے جاتے ہیں۔ کمپنی کا دعوا ہے کہ یہ مکان مقررہ معیار سے مضبوط ہوگا اور زلزلے سے بھی محفوظ رہے گا۔

فاروق ہائی اسکول کا طالب علم اول

مولیدینہ ہائی اسکول پونہ میں سیرت النبی کے تقریری مقابلے ۱۸ اور ۱۹ ردسمبر ۸۲ء کو منعقد ہوئے۔ سینئر گروپ میں فاروق ستار عمر بھائی ہائی اسکول کے طالب علم ضیاء الرحمٰن عبید الرحمٰن صدیقی کی تقریر کو بے حد پسند کیا گیا اور پہلے انعام سے نوازا گیا۔ تقسیم انعامات کے موقع پر صدر جلسہ عالی جناب غلام احمد صاحب، پرنسپل بر ہانی کالج بمبئی نے اس تقریر سے متاثر ہو کر اپنے گلہائے عقیدت سے بچے کی ہمت افزائی کی ایک نئی روایت قائم کی۔

تقریری مقابلوں میں حصہ لینے والے طلبہ کی رہنمائی اسکول ہذا کے پرنسپل جناب ابراہیم خان صاحب، جناب حسن علی دھنسے صاحب اور مولانا اشتیاق احمد صاحب نے کی۔

(مظہر جمیل)

بچوں کی کوشش



چور

ممی بہت پریشان تھیں کیونکہ اُن کے پرس سے روزانہ پیسے غائب ہو جاتے تھے۔ ممی تکیے کے نیچے پرس رکھتیں تب بھی غائب ہو جاتے۔ باورچی خانے میں چاول کے ڈبے میں رکھتیں تب بھی غائب۔ ممی ہم تینوں پر شک کرتی تھیں اور ہم ڈیڈی پر۔ کبھی تو ممی ایک روپیا پرس میں رکھتیں تو دوسرے دن نوٹ غائب اور اٹھنی رکھی ہوئی ہوتی۔ کبھی ہم ممی کو بڑبڑاتے ہوئے سنتے کہ یا اللہ اس گھر میں آسیب تو نہیں ہے۔ کئی مرتبہ ہم تینوں بہن بھائی پٹ بھی چکے تھے لیکن ہم چور نہ تھے۔ البتہ چور سمجھے جاتے تھے۔ ہماری ممی بہت سخت مزاج تھیں۔ اُن کی ایک ہی ڈانٹ میں ہمیں بخار آجاتا۔ ڈیڈی تک اُن سے ڈرتے تھے۔ بات چل رہی تھی چوری کی۔ ممی نے حساب لگایا تو آٹھ آنے روز کے حساب سے ۱۵ روپے مہینا چوری ہو رہے تھے۔ ممی کبھی کبھی ڈیڈی سے ذکر کرتیں تو ڈیڈی کہتے بیگم تم نے تو مجھے بس میں کر رکھا ہے لیکن بچوں کو نہیں سنبھال سکتیں۔

ایک دن تو ممی تنگ آگئیں تو لکڑی لے کر ہم پر پل پڑیں اور ہم روتے ہوتے بولے آپ بھی چاہے جو قسم لے لو مگر ہم نے چوری نہیں کی ہے۔ ممی بھی ٹھنڈی ہوئیں جب دل کی بھڑاس نکل گئی ہم سوچتے کہ کمہار پر بس نہیں چلا تو گدھے کے کان اینٹھے ہیں ہم سب بہن بھائیوں میں سب سے بڑا میں تھا۔ میں نے ڈر ڈر کے ممی سے کہا کہ چور کو پکڑنے کی ایک ہی ترکیب ہے۔ کہ اگر آپ کے پاس کوئی کھوٹی اٹھنی ہو تو پرس میں رکھ دیجیے پھر دیکھیے چور کس طرح پکڑا جاتا ہے۔

میری بات ممی کی سمجھ میں آگئی۔ رات کو کھوٹی اٹھنی پرس میں رکھی۔ صبح دیکھا تو غائب۔ ڈیڈی دفتر جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھول دیا دیکھا تو سامنے بھولا پان سگریٹ بیچنے والا کھڑا تھا۔ بھولا بولا "ذرا اپنے ڈیڈی کو بلاؤ"، ڈیڈی دروازے کے پیچھے ڈیڈی کے پیچھے میں بھولا بولا: "شریمان رات کو آپ نے سگریٹ خریدی تھی تو اٹھنی کھوٹی دی"۔ ڈیڈی کا منہ فق ہو گیا۔ ممی نے جلدی سے بھولے کو اٹھنی دے کر رخصت کیا اور ڈیڈی کو خوب ڈانٹا، اس طرح ہم چوری کے الزام سے بچے اور اصلی چور پکڑا گیا۔

● محمد مصطفیٰ اعظمی

جونا بازار۔ اورنگ آباد

مصیبت میں مت گھبراؤ

ایک آدمی اپنے مکان کی چھت پر سو رہا تھا۔ رات میں ایک چور اس کے گھر میں جا گھسا اور اس سوتے ہوئے آدمی کو ڈنڈے سے مارنے لگا۔ آدمی نے چور سے پوچھا: "تم مجھے کیوں مار رہے ہو؟" چور نے کہا "اگر تم مجھ سے بچنا چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے نیچے کود جاؤ"۔ وہ آدمی بہت ہی ہوشیار تھا اور مصیبت میں بالکل نہیں گھبرایا۔ اس نے ہنس کر چور سے کہا: "اونچی جگہ سے زمین پر تو ہر ایک کود سکتا ہے۔ اس میں کیا خاص بات ہے۔ میں تو نیچے سے کود کر یہاں آسکتا ہوں"۔ یہ سن کر چور کو بڑا تعجب ہوا اور اس نے کہا:

"اگر ایسا ہے تو اپنا کمال دکھاؤ" تب وہ فوراً نیچے اتر آیا اور مکان کے سب دروازے بند کر دیے اور پولیس کو خبر کر کے چور کو پکڑوا دیا۔

● افروز انور
مسلم ہائی سکول پیسہ بہوہ پٹنہ

دو وقت کی روٹیاں

باپ بہت پریشان تھا۔ وہ کئی دن سے خاندان کے لیے روٹی نہ مہیا کر پایا تھا۔ ایک شام کو اس نے اپنے بڑے لڑکے سے کہا:

"کل میرے ساتھ چلنا، کل ہم سب روٹی کھائیں گے" خاندان میں سبھی کے چہرے کھل اٹھے۔ صبح سویرے باپ بیٹے چل پڑے کئی میل کا سفر طے کرنے کے بعد روٹی نہ ملی تو بیٹے نے باپ سے پوچھا: "ہم کہاں جا رہے ہیں؟ روٹی کب ملے گی۔؟" باپ نے جواب دیا: "سامنے گوروں کی بستی ہے وہیں تجھے فروخت کروں گا۔ تمہارے بدلے میں ہم سب کو روٹی ملے گی۔" بیٹا خاموش ہو گیا۔ دھیرے دھیرے اپنے باپ کے ساتھ چلتا رہا۔ جب وہ گوروں کی بستی میں پہنچے تو بیٹے نے ایک دم آگے بڑھ کر باپ کا سودا کر لیا اور اسے فروخت کر دیا۔ بدلے میں اسے ڈھیر ساری روٹیاں مل گئیں۔

جب وہ گھر لوٹا تو سب لوگ روٹیاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ سب نے خوب سیر ہو کر روٹیاں کھائیں۔ کھانے کے بعد اچانک سب کو خیال آیا اور انھوں نے اس سے پوچھا: "تیرے باپ کہاں ہیں؟" اس نے جواب دیا: "باپ کو فروخت کر کے ہی تو یہ روٹیاں ملی ہیں۔" گھر والے یہ سن کر بہت ناراض ہوئے اور اس کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ مقدمے کے بعد اسے سزا ملی سزا کے طور پر اس کو بھی ایک گورے کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ بدلے میں گھر کے لوگوں کو ایک وقت کی اور روٹیاں مل گئیں۔

● عمران آرزو
پرانا سیتارام پور، بردوان، بنگال

سچائی کا انجام

ایک لڑکا تھا جس کا نام احمد تھا۔ وہ بہت ہی ایماندار اور رحم دل تھا۔ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کا باپ اندھا تھا۔ احمد اپنے باپ کا اور اپنا کھانا خود پکاتا تھا۔ احمد روز روٹی کا ایک ٹکڑا کوے کو دے دیتا اور اس طرح کوا احمد کا دوست بن گیا۔

ایک دن اتفاق سے احمد کے پاس کوے کو روٹی کا ٹکڑا دینے کے لیے نہ بچا۔ احمد اس دن بہت مایوس ہوا کہ میرا دوست آئے گا اور خالی چلا جائے گا۔

حسب معمول کوا برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا اور کائیں کائیں کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد کوے نے سوچا شاید آج کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے اور وہ اڑ گیا۔ واپس آیا تو کوئی چیز اپنے ساتھ لایا اور احمد کے برآمدے میں گرا دی۔ یہ بادشاہ کی انگوٹھی تھی۔ اس انگوٹھی کو احمد نے اٹھایا اور اپنے باپ کو ساری بات بتا دی۔ اس کے باپ نے کہا یہاں کے کانسٹبل کو انگوٹھی دے دو وہ انگوٹھی یہاں کے راجا تک پہنچا دے گا۔

احمد انگوٹھی لے کر کانسٹبل کے پاس گیا اور بتا دیا کے یہ انگوٹھی کیسے ملی۔ اس پر بھی کانسٹبل نے یہ سمجھا کہ یہ چور ہے اس لیے اس کو راجا کے پاس لے جانے لگا۔ راستے میں کانسٹبل آرام کرنے لگا اور اس کو نیند آ گئی اتنے میں وہی کوا وہاں آ گیا اور احمد کے بندھے ہاتھ پر چونچ مارنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں رسی کھل گئی۔ احمد سیدھا راجا کے پاس گیا اور ساری بات بتا دی۔ راجا یہ بات سن کر بہت خوش ہوا۔ کچھ دیر کے بعد کانسٹبل بھی وہاں پہنچ گیا اور احمد کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ راجا نے احمد کی ایمانداری پر بہت سا انعام دیا اور سپاہی کو حکم دیا کہ اسے گھر تک چھوڑ آؤ۔

● ایس، ایس حق
نیو کریم گنج۔ گیا

غزوات میں دفاعی تدابیر

(یہ تقریر آل مہاراشٹرا سیرۃ النبی تقریری مقابلہ زیر اہتمام انجمن فروغ تعلیم بھیونڈی۔ منعقدہ ۹ جنوری ۱۹۸۳ء میں پیش کی گئی)

جناب صدر، معزز حاضرین اور میرے پیارے دوستو السلام علیکم۔ میں آپ لوگوں کے سامنے "غزوات میں آنحضورؐ کی دفاعی تدابیر" کے موضوع پر اپنے خیالات پیش کرنا چاہتی ہوں اس لیے سب سے پہلے لفظ "دفاع" کی تشریح پیش کر رہی ہوں۔

حضرات! دفاع یا DEFENCE کا لفظ آج کل جنگی تدابیر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس میں دفاعی اور اقدامی دونوں جنگیں بھی شامل ہیں۔ قرآنی قوانین جنگ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی جنگوں کی نوعیت بھی دفاعی اور اقدامی دونوں ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے حسب ضرورت دونوں طرح کی جنگیں فرض کی ہیں۔ اس لیے اس موضوع کے تحت میں اپنی تقریر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کردہ ان اصولوں کا ذکر کروں گی جن کی حیثیت اگرچہ دفاعی رہی ہے۔ لیکن اقدامی جنگوں میں بھی یہ اصول یکساں طور سے کارآمد ہیں اور آج تک اُن پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔

حضرات! تدابیرِ دفاع میں اولین اہمیت جنگی تیاریوں کی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سورہ انفال کی آیت ۶۰ کی رو سے تمام اسلامی حکومتوں پر فرض قرار دیا ہے۔ ارشاد باری ہے "اُن کے مقابلہ کے لیے جس قدر تمہارے امکان میں ہو سامانِ جنگ اور ہمیشہ تیار رہنے والے گھوڑے مہیا رکھو" اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے ہی بیعت عقبہ کے موقع پر اس امکان کو ملحوظ رکھا تھا اور غزوہ بدر کے موقع پر مہاجرین کے ساتھ انصار مدینہ اپنی مرضی اور خوشی سے شریک جنگ ہو گئے تھے۔

تدابیرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں دوسرا مقام ایک بہترین جاسوسی نظام اور حالات کے صحیح اندازہ کا ہے۔ جنگ بدر میں آپ کو نہ صرف قافلۂ ابوسفیان اور قافلۂ ابوجہل کی ہر نقل و حرکت کا پتا تھا۔ بلکہ جس تدبیر سے آپ نے گرفتار شدہ دشمن کی تعداد کا صحیح اندازہ لگایا وہ بھی قابلِ داد ہے۔ حضرات! غور فرمائیے کہ جب کسی طرح غنیم کے لشکر کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی تو آپ نے خوراک کے لیے ذبح ہونے والے اونٹوں سے جن کی تعداد ایک دن نو اور دوسرے دن دس ہوا کرتی تھی۔ اُن کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے درمیان متعین کی۔

دفاعِ رسول کی تیسری خصوصیت جو غزوہ بدر ہی میں ظاہر ہوئی یہ تھی کہ نہ صرف کفارِ مکہ بلکہ اسلامی لشکر تک کو آخر وقت تک اس کا علم نہ ہو سکا کہ آپ کا اصل ہدف ابوجہل کا لشکر ہے یا قافلہ ابوسفیان۔ اس سے معلوم ہوا کہ راز داری جنگ کی اہم ترین شرائط میں سے ہے۔

آپ کے دفاع کا چوتھا نکتہ میدان جنگ کی حکمت عملی ہے۔ جس کا مظاہرہ بھی میدان بدر میں آپ نے نہایت کامیابی سے کیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ پہلے پہنچ کر وہاں بلندی کی سخت زمین آپ نے اپنے لیے منتخب کی اور نشیب کی ریتیلی زمین پر کفار مکہ کو اترنے پر مجبور کر دیا۔ پھر آپ نے اپنے لشکر کے لیے جو جگہ منتخب کی وہاں آفتاب کے رُخ پر لشکرِ اسلام کی پشت ہوتی تھی جبکہ سورج کی تیز کرنوں کا انعکاس کفار کی آنکھوں کو خیرہ کرتا تھا۔ آپ نے پانی کے ذخائر پر بھی قبضہ کر لیا جو شب بارانی کی وجہ سے لبریز تھے۔ جبکہ کفار مکہ کو پانی کے بجائے کیچڑ نصیب ہوئی۔ سالارِ لشکر کی حیثیت سے آپ نے اپنے لیے عریش کا ٹیلہ منتخب کیا تاکہ حسبِ ضرورت ہدایت جاری کر سکیں۔

حضرات! دفاعی حکمت عملی کی پانچویں شرط جس کا تجربہ غزوۂ احد میں ہوا متوقع رخنوں کا سدباب ہے۔ آپ نے اسلامی لشکر کی پُشت پر کھلنے والے درّہ پر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو پچاس تیر اندازوں کے ساتھ متعین فرمایا اور تاکید کی کہ کسی بھی حالت میں اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ سب کو معلوم ہے کہ اس حکم عدولی کی وجہ سے اسلامی لشکر کو کتنی بڑی قیمت چکانی پڑی

حضرات ان چند اُصولوں کے علاوہ اور بھی بہت سی تدبیریں ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ جن قوموں نے ان پر عمل کیا فتح و نصرت نے ان کے قدم چومے اور جس کسی نے اس سے اعراض کیا شکست اس کا مقدر ثابت ہوئی۔

حضرات! علامہ اقبالؒ کا ایک شعر قدرے تصرف کے ساتھ پیش کر کے رخصت ہوتی ہوں۔

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول شمشیر و سناں آخر

● جویریہ خاتون
رفیع الدین فقیہہ میموریل ہائی اسکول، بھیونڈی (تھانہ)

نئی راہ

ممی کے مسلسل سمجھانے پر بھی جاوید جوا کھیلتا رہا۔ وہ جوئے کو اپنا پیشہ سمجھتا تھا۔ کبھی جیت کر آتا، کبھی ہار کر، جب ہار کر آتا تو اُس کا چہرہ دیکھنے کے قابل رہتا اور ممی جاوید کا چہرہ دیکھ کر کہتی۔ "میں، تمھیں بار بار سمجھا چکی ہوں کہ جوا نہ کسی کا ہوا ہے اور نہ کسی کا ہوگا۔ مگر تم ہو کہ مانتے ہی نہیں۔ اس ذلیل پیشے سے باز آؤ، ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔ کہیں نوکری نہیں ملتی۔۔؟ حلال کی کمائی کھانے کے لیے قلی کا پیشہ بھی جوئے سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔ اس جوئے سے تمھارے مستقبل کو ٹھیس پہنچے گی۔ ارے میرا کیا ہے؟ پڑوس کے برتن دھو کر گزارا ہو ہی جاتا ہے۔"

اور جاوید خاموش ان سب باتوں کو سنتا۔ مگر اُس کے اوپر ان سب باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔۔۔ ایک کان سے سُنتا اور دوسرے کان سے نکال دیتا۔

آج جاوید حسبِ معمول اڈے پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اُسے اڈے پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی اس لیے اُس نے ایک رکشا کیا۔ وہ آج بہت خوش تھا۔ وہ خیالات کی وادی میں کھوتا چلا گیا۔

"کہ آج دیوالی کی رات ہے۔ آج تو جم کر جوا کھیلوں گا۔ بڑے بڑے آسامی اڈے پہ پہنچیں گے اور جیت تو میری ہی ہوگی۔"

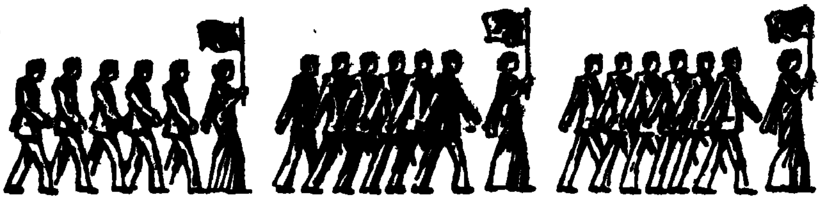
دیوالی کی رات بہت حسین تھی۔ سڑک کے دونوں جانب مکانات قمقموں سے سجے ہوئے تھے۔ پٹاخے کی شور سے پوری فضا میں گونج رہی تھی اور رکشا تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد رکشا کی رفتار دھیمی ہونے لگی۔ یہاں سڑک کی اونچائی کافی تھی۔ اکثر رکشا والے کو یہاں رکشا سے اُتر کر کھینچنا پڑتا۔ لیکن یہ عجیب رکشا والا تھا۔ اونچائی میں بھی سیٹ پر بیٹھا رکشا کھینچنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر جاوید جھنجھلا گیا، اُسے لگا کہ رکشا سے اُتر کر پیدل ہی چلا جائے لیکن اچانک وہ ٹھٹھک گیا۔ اُس کی نظریں رکشا والے کے پیروں پر مرکوز ہو کر رہ گئیں، جو ٹخنہ سے غائب تھا۔ یہ دیکھ کر اُس کا ضمیر اُسے لعنت ملامت کرنے لگا۔ "بھسم ہو جائے ایسی جوانی کہ تندرست رہ کر بھی محنت کی روٹی نہیں کما سکتا ایک رکشا والا ہے جو پیر سے مجبور رہنے کے باوجود محنت و مشقت کرتا ہے اور چین کی زندگی گزارتا ہے۔"

اب جاوید کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ وہ فوراً رکشا سے اُترا اور جتنے پیسے تھے اُسے فوراً پاکٹ سے نکالے اور رکشے والے کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے اسی نئی راہ پر چل پڑا۔

● نعمت اللہ نغز
ہواڈانگال، آسنسول ۴

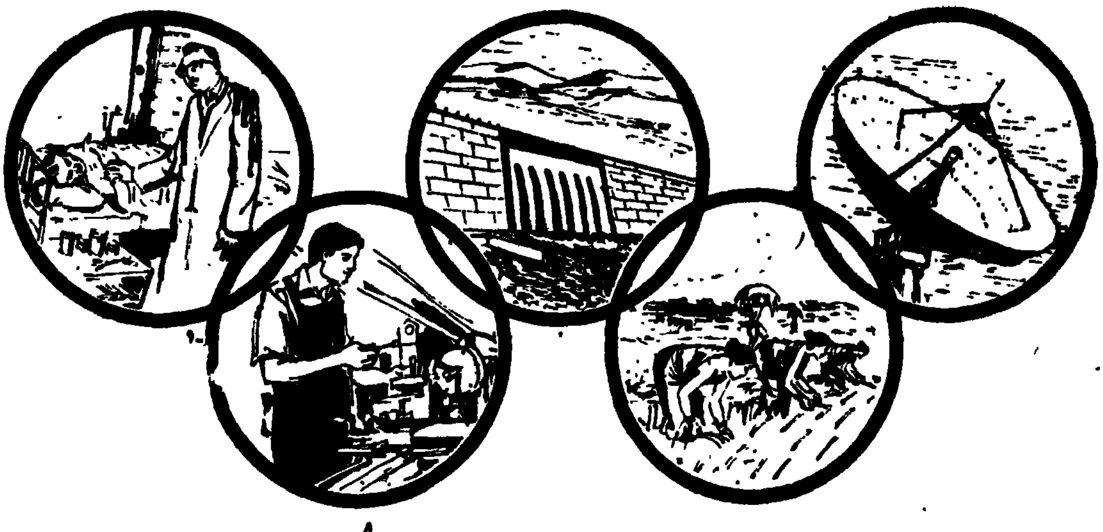
ہمارے دفتر میں رسالہ نہ ملنے کی شکایتیں آتی رہتی ہیں ہم پوری ذمہ داری سے پرچہ پوسٹ کرتے ہیں لیکن پھر بھی آپ کو رسالہ نہیں ملتا۔ ایسی صورتیں میں اسی مہینے کے پہلے ہفتے میں اطلاع دینا ضروری ہے ورنہ پرچہ دوبارہ بھیجنا ممکن نہ ہو سکے گا۔

(سرکولیشن منیجر)



سدا بڑھتے قدم

نویں ایشیائی کھیلوں کی میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں، ان کے لئے بھارت کو دنیا بھر سے تہنیت کے پیغام ملے ہیں۔
اسٹیڈیم ریکارڈ ٹائم میں تعمیر کئے گئے۔ ملک بھر اور دیگر ممالک کے لاکھوں ہی گھروں میں رنگین ٹیلی ویژن پر کھیل لوگوں کو دکھائے گئے۔ اس کے لئے کمپیوٹروں، الکٹرانک ایکسچینجوں، مائکروویو اور مصنوعی سیارے کے ساتھ رابطوں کے عظیم سلسلے کا کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔





تال میل کے ساتھ کی گئی سخت محنت کی یہ منہ بولتی مثال ہے
اگر ہم قومی تعمیر کے دیگر شعبوں میں بھی اسی لگن سے کام کریں تو اسی طرح کی کامیابیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

آیئے ہم سب مل جُل کر
اپنے وطن کو مضبوط بنائیں

davp 82/566



بچوں کی کتابیں

ریڈیو فیچر
(جگن ناتھ آزاد)

بچوں کی دل چسپی کے دو مزیدار ڈرامے۔ یہ دونوں ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی ہو چکے ہیں۔

قیمت: ۲/۲۵

گاندھی بابا کی کہانی
(بیگم قدسیہ زیدی)

اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز پیرایے میں لکھی گئی ہے۔

قیمت: ۴/۰۰

اُردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)

ہم سب اُردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن صحیح اُردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے، یہ اسی کتاب سے معلوم ہو سکے گا۔

قیمت: ۴/۰۰

جب اور اب
(آصف مجیب)

بچوں کی دلچسپی والی ۵۰، ۶۰ سال پہلے کی ایسی باتیں جو اب پرانی ہو چکی ہیں۔ قیمت: ۱/۷۵

پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)

دل چسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ۔ مزیدار کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے۔ آپ بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔

قیمت: ۲/۰۰

تین اناڑی
عصمت چغتائی

گگو، بلو اور ٹیٹو۔ تین نٹ کھٹ لڑکوں کی شرارتوں پر مبنی ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان میں لکھا گیا ہے۔ قیمت ۳/-

جن حسن عبدالرحمٰن
ترجمہ: قرۃ العین حیدر

الٰہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہو گئی، لیکن اب تو اُس جن کا قصہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے صراحی کی قید سے آزادی دلائی ہے۔

حصہ اول ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰

کہاوت اور کہانی
(سیفی پریمی)

روزمرہ بولی جانے والی کہاوتوں اور کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے کہاوتیں وجود میں آئیں۔

قیمت: ۲/۵۰

سرکس
تزئین کار: ڈین کیسپر

سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کتاب میں سرکس کی ڈھیر ساری تصویروں کے خاکے ملیں گے جن میں بچے شوق سے رنگ بھر سکتے ہیں۔ قیمت ۱/۵۰



دہلی ۶ — بمبئی ۳ — علی گڑھ ۱

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵-۱۱۰

Regd. No. D(SE)-043 March

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

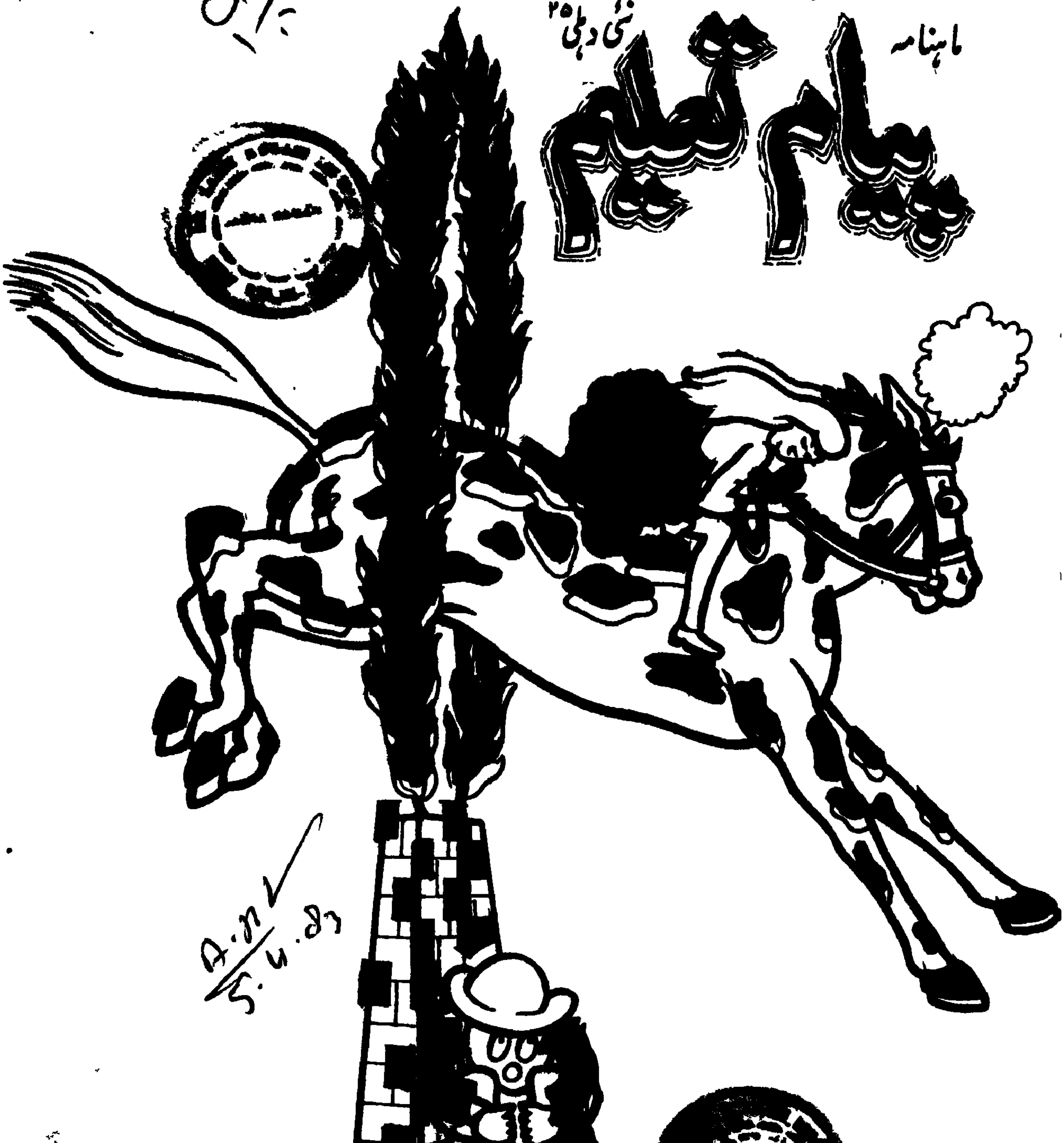
برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی ۲

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی ۲۵

اپریل





ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دلی

اپریل ۱۹۸۳ء | جلد:- ۲۰ | شمارہ:- ۴

اڈیٹر: ولی شاہجہاں پوری

قیمت فی پرچہ: ۲/=

سالانہ ۱۸ روپے

غیر ممالک سے ۸۵ روپے

بچوں سے باتیں

ہم نے بہت چاہا کہ اب پیامِ تعلیم کی قیمت میں کوئی اضافہ نہ کریں لیکن افسوس کہ ہماری خواہش پوری نہ ہوسکی اور اضافہ کرنے پر مجبور ہونا ہی پڑا۔ آپ دیکھیں گے کہ اضافے کے باوجود ہم خسارے ہی میں ہیں۔

کاغذ کی قیمت نے بجٹ آنے سے پہلے لمبی چھلانگ لگائی جسے ہم نے برداشت کرلیا لیکن محکمۂ ڈاک نے اور بھی ستم ڈھایا۔ اب تک پیامِ تعلیم کے ایک پرچے پر ہم کو صرف پانچ پیسے کا ڈاک ٹکٹ لگانا پڑتا تھا۔ اب یہ محصول فی پرچہ پچیس پیسے ہوگیا ہے۔ یعنی بارہ پرچوں پر ساٹھ پیسے کی جگہ دو روپے چالیس پیسے خرچ کرنے پڑیں گے جبکہ ہم نے اضافہ صرف دو روپے ہی کیا ہے اور ایک پرچے کی قیمت میں صرف تیس پیسے بڑھائے ہیں۔ اس طرح اب اس کا سالانہ چندہ اٹھارہ روپے اور ایک پرچے کی قیمت دو روپے ہوگئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اس اضافے کو بہ خوشی قبول کریں گے اور اس کی اشاعت بڑھانے میں ہماری مدد کریں گے

اس شمارے میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی ایک اور دلچسپ نظم اور اعجاز علی ارشد صاحب کا مضمون پڑھیے۔ یقیناً آپ کو پسند آئیں گے۔

نوگل بھارتی صاحب، متینہ سعادت صاحبہ کی نثریں اور ظفر صہبائی، حشمت کمال پاشا، نثار چنگیزی صاحبان کی منظومات بھی آپ شوق سے پڑھیے۔ ان کے علاوہ بھی نظمیں اور مضامین آپ کے پسند کی چیزیں ہیں۔

آج کل آپ امتحانات کے باعث بہت مصروف ہوں گے اور سال بھر کی محنت کے اچھے نتائج حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہوں گے۔ خدا کرے آپ کی محنت کے میٹھے پھل آپ کو ملیں۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برائٹ آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی

اک گلاس پانی میں



اک گلاس پانی میں
تین ننھے مینڈک تھے

یہ نہ پوچھیے صاحب
وہ کہاں سے آئے تھے
کیوں گلاس میں ان کو
گھر ملا تھا رہنے کو

واہ وا۔ گلاسوں سے
مینڈکوں کو کیا لینا
ہاں کنول کے تالابوں
حوض اور باغوں میں
جھیل اور چشموں میں
ننھے منّے مینڈک اور
ان کے باپ ماں ماموں
اور سارے گھر والے

ہم نے رہتے دیکھے ہیں
کیا پتا سمندر میں
یا کسی کنویں میں بھی
چھپ چھپا کے رہتے ہوں
کودتے اُچھلتے ہوں
ہاں مگر گلاسوں میں
کب کسی نے مینڈک کو
رہتے بستے دیکھا ہے
یہ سوال تو صاحب
ہم ضرور پوچھیں گے
اک گلاس پانی اور
تین تین — ادنہہ ہوں ہوں
اس میں کوئی گڑبڑ ہے

سُن تو لیجیے صاحب
صبر کیجیے صاحب

اس میں کچھ نہیں گڑبڑ
آپ کیوں کریں ہڑبڑ

ایک تھے میاں طٰسین
ایک ان کی خالہ بی
گھر میں باغ تھا ان کے
باغ میں کنول تالاب
صبح کو کنول سارے
کھلکھلا کے ہنستے تھے
دن میں دھوپ کے مارے
چپتے چاپ رہتے تھے
سردیوں کی راتوں میں
چاند کی کرن پی کر
سارے پھول سوتے تھے
گرمیوں کی شاموں میں
ٹھنڈی اوس کھا کھا کر
خوب مست ہوتے تھے

ایک دن کا قصّہ ہے
قصّہ پورا سچّا ہے
اور امی کا طٰسین
سب سے اچھا بچّہ ہے
باغ میں کئی مینڈک
گھومنے کو آنکلے
باغ، حوض کی ٹھنڈک
دیکھ کر کے سب مینڈک
بولے گھر یہ اچھّا ہے
تھوڑا تھوڑا پکّا ہے
تھوڑا تھوڑا کچّا ہے
ہم یہیں رہیں گے اب
حوض میں بہیں گے سب
گھاس پتی کھائیں گے
خوب موج اُڑائیں گے۔
چھپ چھپاک چھپ چھپ چھپ
چھپ چھپاک چھپ چھپ چھپ

[illegible] کاکانگر نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

انھیں لہریں پانی میں
موج کی روانی میں
مینڈکوں نے گھر ڈھونڈا
آئے حوض میں ہلچل
دل بھی لگ گیا سب کا
کوئی تخت پر بیٹھا
رہ گیا کوئی پیدل

شام کو ہوا ایسا
مینڈکوں کا ٹرّانا
بار بار چلّانا
دھوم دھام سے گانا
سُن کے خالہ بی بولیں
امتحاں ہے سر پر
پاس امتحاں کرکے
ڈاکٹر بنوں گی میں
لیکن اب پڑھوں کیسے
باغ میں جو مینڈک ہیں
اتنا شور کرتے ہیں
لکھتے ہیں نہ پڑھتے ہیں
روز روز بڑھتے ہیں
مجھ کو کام کرنا ہے

پڑھنے یہ نہیں دیتے
سونے یہ نہیں دیتے
کل میں چاقو لاؤں گی
خوب تیز پتلا سا
مینڈکوں کو ماروں گی
حوض سے نکالوں گی
کل کلاس میں مجھ کو
چیر پھاڑ کرنا ہے
بس انھیں کو کاٹوں گی
جاں سے سب کو ماروں گی

یہ تو تھا مگر طلسین
دور بیٹھے سنتے تھے
اپنے دل میں ڈرتے تھے
مینڈکوں کو خالہ بی
کاٹ پیٹ ڈالیں گی
بات یہ نہیں اچھی
ان کو میں بچاؤں گا
جیب میں چھپاؤں گا

چپکے سے میاں طلسین
اک گلاس چھوٹا سا
لے کے باغ میں آئے
جھک کے حوض میں لیے
چاہا پکڑیں مینڈک کو
پھر کہیں چھپالیں گے
خالہ بی کے چاقو سے
ان کا سر بچالیں گے

اور کچھ نہ ہاتھ آیا
تین بچے مینڈک کے
اس گلاس میں لیکن
کودتے ہوئے آئے
سمجھے یہ نیا گھر ہے
اب اسی میں رہنا ہے
کیا ہوا جو چھوٹا ہے
ہم میں کون موٹا ہے
سب ہی دُبلے پتلے ہیں
چھوٹے ہیں نہ لمبے ہیں
ہم مزے سے رہ لیں گے
گھر بہت ہی اچھا ہے
سر پہ چھت نہیں تو کیا
کھڑکیاں ہیں شیشے کی
خوب دھوپ آتی ہے
رات بھی اندھیرے میں
جھومتی ہے گاتی ہے

اب مگر میاں طلسین
تھک گئے تھے بے چارے
اک جماہی گہری سی
لی انھوں نے اس کے بعد
ہو کے گھاس پر لیٹے
سو گئے شرافت سے
گہری نیند خراٹا
خر خرر خرر خر خر

مینڈکوں کے بچے تین
اس گلاس میں اب تک
گھومتے ہیں پھرتے ہیں
ہم نے آج ہی دیکھا
پر کبھی تو کہتے ہیں
اک گلاس پانی میں
تین ننھے مینڈک ہیں



اعجاز علی ارشد

۱۹۰۰ - ۱۹۸۲

سدا بہار نغموں کا شاعر

یہ زیادہ دنوں کی بات نہیں، ابھی چند ماہ پہلے کی کہانی ہے اردو کے ایک مشہور شاعر سے اُس کے ایک دوست نے پوچھا۔ "آپ کی عمر؟" اور اُس نے فوراً جواب دیا۔ "اتنی ہی جتنی اس بیسویں صدی کی ہے۔ میں تو اس صدی کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں"۔ اگر آپ اِس شاعر کا نام نہیں جانتے تو میں اُس کی پہچان کے لیے کچھ اور نشانیاں بتاتا ہوں۔ بچوں کے مشہور رسالے "پھول" کا نام تو آپ نے سنا ہی ہوگا؟ یہ رسالہ اُسی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ چلیے اِس کو بھی چھوڑیے۔ آپ میں سے بہت سارے لوگوں نے جو گانوں کے شوقین ہیں اکثر اپنے ریڈیو سے یہ گیت بجتا ہوا سنا ہوگا

ع ابھی تو میں جوان ہوں ، ابھی تو میں جوان ہوں

میرا خیال ہے کہ پاکستان کے قومی ترانے سے بھی آپ ضرور واقف ہوں گے۔

ع پاک سرزمین شاد باد

اور آپ میں سے کچھ لوگ ایسے بھی نکل آئیں گے جنھوں نے "شاہنامہ اسلام" کا نام سُن رکھا ہوگا۔ ایک دو ایسے بھی ہوں گے جو اس کے بارے میں کچھ زیادہ ہی جانتے ہوں گے۔ اِن سدا بہار نغموں کا لکھنے والا کون ہے؟ وہی شخص جس نے اپنے دوست سے کہا تھا کہ میں اور موجودہ صدی ساتھ ساتھ محوِ سفر ہیں۔ اگر اب بھی آپ اُس کا نام نہیں جان پائے تو میں بتائے دیتا ہوں اُس کا نام ابوالاثر حفیظ جالندھری ہے۔

[illegible] پٹنہ ۸



(حفیظ جالندھری)

حفیظ جالندھری جو ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء کو متحدہ ہندوستان کے مشہور شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ تقریباً بیاسی سال تک موجودہ صدی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ آخرکار دسمبر ۱۹۸۲ء میں وہ دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ حفیظ نے ایک غریب گھرانے میں آنکھیں کھولی تھیں۔ اُن کے آبا و اجداد راجپوت تھے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ گھر کی خراب مالی حالت کے سبب ابتدا ہی میں والدین نے انھیں نوکری سے لگانا چاہا۔ یہ وہ وقت تھا کہ مقامی عدالت یا میونسپلٹی میں کوئی معمولی سے معمولی ملازمت حاصل کر لینے سے بھی خاندان میں ان کی عزت بہت بڑھ جاتی مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ اُن سے زیادہ بڑا اور اہم کام لینے والی تھی۔ انھوں نے سات برس کی عمر میں پہلا شعر کہا اور پھر اُسی راہ پر چل نکلے۔ بچپن سے ہی وہ اسکول کے روایتی طریقۂ تعلیم سے بیزار ہو گئے۔ حساب میں وہ سب سے زیادہ کمزور تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساتویں کلاس تک پہنچتے پہنچتے انھیں چار اسکول تبدیل کرنے پڑے اور آخرکار وہ پڑھائی کو خیرباد کہہ کر دہلی بھاگ آئے۔ جیسا کہ وہ خود بتایا کرتے تھے اردو زبان سیکھنے اور اُردو کا معیاری لب و لہجہ اختیار کرنے کا شوق ہی انھیں دہلی لے آیا تھا۔ اُس زمانے میں راشدالخیری اور حسن نظامی جیسے مصنف دہلی میں موجود تھے۔ حفیظ نے اُن کی کتابیں بھی پڑھیں اور اُن سے ملاقات بھی کی۔ ابتدا میں کبھی کبھی

ایسا بھی ہوا کہ حفیظ کو جاڑے کی سرد راتیں حضرت نظام الدین اولیاء کے کسی مقبرے میں گزارنی پڑیں مگر اُن کے شوق میں کمی نہ ہوئی اور آخر کار وہ پورے ملک میں ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔

حفیظ نے اردو میں پہلی بار گیت لکھے۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک نئی زبان اور ایک نیا لب و لہجہ عطا کیا اور صرف اکیس برس کی عمر میں وہ اپنے خوبصورت گیتوں کے سبب پورے ملک میں پہچانے جانے لگے۔ جب وہ لاہور پہنچے تو ہر طرف شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی فکری شاعری کا چرچا تھا۔ ملک میں خلافت تحریک شروع ہو چکی تھی اور مہاتما گاندھی نے ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ بلند کر دیا تھا۔ حفیظ نے اُن تمام حالات کا اثر قبول کیا۔ اقبال کے اثرات نے انھیں "شاہنامہ اسلام" لکھنے پر آمادہ کیا۔ یہ ایک طویل نظم ہے جس میں اسلام کا شاندار ماضی بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ انھیں "شاعرِ اسلام" کہا جانے لگا۔

حفیظ کو شاعری فطرت کی طرف سے ملی تھی۔ وہ ایک بہترین ترنم کے بھی مالک تھے۔ اس لیے لاہور کے مشاعروں میں انھوں نے اکثر اپنے گیتوں کا جادو جگایا۔ اُسی زمانے میں وہ اپنے وقت کے مشہور ادبی رسالے مخزن کے اڈیٹر بھی ہو گئے۔ ایک عرصے تک وہ بچوں کا مشہور رسالہ "پھول" بھی نکالتے رہے۔ بچوں کے لیے انھوں نے خوبصورت اور نصیحت آموز نظمیں لکھیں۔ اُن نظموں کی زبان سادہ اور انداز بیان سیدھا ہے۔ بچوں کے لیے یہ بے حد فخر اور مسرت کی بات ہے کہ شاہنامہ اسلام کے علاوہ حفیظ کے چار شعری مجموعے "نغمہ زار" "سوز و ساز" "تلخابہ شیریں" اور "چراغ سحر" کے عنوان سے چھپے ہیں اور بچوں کے لیے لکھی گئی اُن کی نظمیں بھی چار جلدوں میں شائع ہوئی ہیں۔ "پھول" "لاہور کا انتخاب" بھی کتابی شکل میں آچکا ہے۔

حفیظ صاحب زندگی بھر ہندو مسلم اتحاد کے حامی رہے وہ اسلام کے سچے پیرو تھے اس لیے تمام مذاہب کے ماننے والوں کا یکساں احترام کرتے تھے۔ اپنے وطن سے انھیں بے انتہا محبت تھی اور مغربی ممالک میں جا کر وہاں کی تہذیب اختیار کرنے والوں کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ مشہور ہے۔ ۱۹۳۲ء میں وہ انگلینڈ گئے اور اپنے ایک دوست سے جو تقریباً پندرہ برس سے وہیں جمے ہوئے تھے یہ دریافت کیا کہ وہ ہندوستان کب واپس جائیں گے۔ مغربی تہذیب کے نشے میں ڈوبے ہوئے دوست نے جب یہ جواب دیا کہ وہاں رکھا ہی کیا ہے، جو میں واپس جاؤں، تو حفیظ کو بہت برا لگا۔ انھوں نے نہ صرف اس دوست سے ملنا چھوڑ دیا بلکہ اپنے وطن کی تعریف میں ایک طویل نظم لکھی جس میں وطن کی عظمت کا دل کھول کر بیان کیا۔ آج ہمارے ملک میں زبان کے نام پر بہت سے جھگڑے ہو رہے ہیں۔ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء کے دوران بھی یہ معاملہ بہت نازک صورت اختیار کر چکا تھا مگر حفیظ نے دلوں کو جوڑنے کے لیے کیسی خوبصورت بات کہی تھی۔

حفیظ اپنی بولی محبت کی بولی
نہ اُردو، نہ ہندی، نہ ہندوستانی

آج حفیظ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن جب بھی ہم اُن کے اشعار پڑھیں گے اور ان کے گیت سنیں گے تو وہ ہمیں یاد آئیں گے۔ اُن کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور فیض احمد فیض جیسے شاعروں کے عہد میں پیدا ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی حیثیت اور انفرادیت منوالی۔ اس لیے اُن کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کے ارادوں میں مضبوطی، نیت میں خلوص اور دل میں کام کرنے کی لگن ہو تو وہ ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہوتا ہے۔

"قلمی دوستی" میں صرف ۱۲ سال کے بچوں کے نام شائع کیے جائیں گے اور بچوں کی کوششیں بھی صرف اُن بچوں کی کہانیاں شائع ہوں گی جو اسی عمر میں لکھیں گے۔



سعادت

اعتراف

شہر سے بہت دور ایک چھوٹا سا گانو تھا۔ اس چھوٹے سے گانو میں صرف غریب کسان اور مزدور رہتے تھے۔ دن بھر کڑی محنت کے بعد جو کچھ مزدوری ملتی، اسی پر اُن کی گزر بسر ہوتی۔ روکھا، سوکھا کھاتے، موٹا جھوٹا پہنتے اور میل ملاپ سے رہتے۔

اس گانو کے ایک غریب کسان کا اکلوتا بیٹا عزیز تھا۔ وہ بہت ہی سمجھ دار اور نیک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کو سارے گانو والے چاہتے تھے۔ عزیز گانو کے ایک چھوٹے سے اسکول میں پڑھتا تھا۔ ایک دن اس کے باپ نے اُس سے پوچھا: "بیٹا عزیز! تم پڑھ لکھ کر کیا کرو گے؟" عزیز نے جواب دیا: "بابا! میں پڑھ لکھ کر ایک بڑا آدمی بنوں گا اور دیش کی خدمت کروں گا۔"

کسان یہ سن کر بہت خوش ہوا اور ہنستے ہوئے پوچھا "تم کس طرح اپنے دیش کی خدمت کرو گے؟"

عزیز نے کہا: "بابا! میں ایک بڑا ڈاکٹر بنوں گا اور اپنے اُن غریب گانو والوں کا علاج کروں گا۔" کسان اس ننھے سے بچے کے ان اُونچے ارادوں سے بہت خوش ہوا اور اُسے دعائیں دیتا ہوا باہر چلا گیا۔

عزیز کا ایک ساتھی اکبر تھا جس کو عزیز کے برعکس پڑھائی سے کوئی لگاؤ نہ تھا، وہ عزیز سے خار کھاتا تھا، آئے دن عزیز کو اپنی شرارتوں کا نشانہ بنایا کرتا مگر عزیز کسی نہ کسی طرح ٹال جاتا کیونکہ اُسے اکبر سے کوئی دشمنی نہ تھی۔

اتوار کا دن تھا، اسکول میں چھٹی تھی، اکبر اور اس کے ساتھی اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے، گھومتے، گھومتے وہ آم کے ایک باغ کی طرف نکل پڑے، وہاں انھوں نے دیکھا کہ پیڑ پیلے، پیلے آموں سے لدے ہوئے ہیں۔ آموں کو دیکھ کر اُن کے منہ میں پانی بھر آیا لیکن مالی کے ڈر سے وہ اندر نہ جا پا رہے تھے، وہ اندر جانے کی کوئی ترکیب سوچ ہی رہے تھے کہ اسی لمحے عزیز وہاں سے گزرا، اکبر نے پکارا، "بھائی عزیز کہاں جا رہے ہو؟"

"ماسٹر جی کے یہاں!" عزیز نے کہا۔ "ذرا اِدھر تو آنا" اکبر بولا۔

عزیز اُس کے پاس پہنچا اور پوچھا: "کوئی کام ہے؟"

"ہاں!" اکبر بولا۔ "وہ کیا؟" عزیز نے دریافت کیا۔

"تم ذرا اس باغ میں جاؤ اور کچھ آم توڑ لاؤ۔" اکبر بولا۔

"نہ بابا! نہ، مجھ سے یہ کام نہ ہوگا۔ اگر مالی آجائے تو؟" عزیز نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "مالی نہیں آئے گا!" اکبر نے جھوٹ موٹ کہہ دیا: "ہم نے اُسے شہر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

اس پر عزیز کچھ سوچتے ہوئے راضی ہوگیا اور باغ میں جاکر آم کے پیڑ پر چڑھا اور آم توڑنے لگا۔ ابھی اُس نے کچھ ہی پھل توڑے تھے کہ مالی آدھمکا، اُسے دیکھتے ہی اکبر اور اُس کے ساتھی تو چمپت ہوگئے مگر بے چارہ عزیز جو پیڑ پر چڑھا ہوا تھا، اُتر نہ سکا اور مالی نے اُسے پکڑ لیا، عزیز نے ہر چند کہا کہ وہ اکبر اور اُس کے ساتھیوں

۱۱-۴-۱۱۳ چندو لال بیلا کالونی حیدر آباد ۵۰۰۲۶۵

کے کہنے پر آم توڑ رہا تھا لیکن مالی نے اس کی ایک نہ سُنی اور اُس کی خوب پٹائی کی۔ بے چارہ بھولا بھالا عزیز مار کھا کر روتا ہوا گھر چلا گیا مگر اُس نے نہ کسی سے اکبر کی شکایت کی نہ اس بات کا ذکر ہی کیا۔

اس واقعے کو کئی دن گزر چکے تھے، مارچ کی ایک دوپہر تھی، اکبر اسکول کا ناغہ کیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نیم کے ایک گھنے پیڑ کے نیچے گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا۔ امتحان کو ایک مہینا باقی رہ گیا تھا مگر اُسے اس کی کوئی فکر نہ تھی کھیلتے کھیلتے اس کو ایک نئی شرارت سوجھی، اُس نے سوچا کیوں نہ عزیز کی ساری کتابیں کچھ دن کے لیے مانگ لے اور بعد میں واپس نہ کرے، ایسا کرنے سے عزیز یقیناً فیل ہو جائے گا، اس طرح عزیز کو نہ صرف شرمندہ ہونا پڑے گا بلکہ سارے گانو میں اُس کی رسوائی بھی ہوگی۔

یہ سوچ کر اکبر نے اپنے ساتھی بھولو کو آواز دی "ارے او بھولو! اِدھر آؤ نا" بھولو، دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا، اکبر نے اُس سے پوچھا: "ایک کام کرو گے" بھولو نے پوچھا کیا کام ہے؟"

اکبر بولا: "تم عزیز کے ہاں جاکر اُس سے اس کی کتابیں مانگ لاؤ اور کہو کہ دو تین دن کے بعد لوٹا دو گے۔"

بھولو نے کہا: "لیکن اُسے تو امتحان کے لیے پڑھنا ہے، وہ کتابیں کیسے دے گا؟" اکبر بولا: "تم کہو تو وہ 'نا' نہیں کرے گا۔"

بھولو نے اُس کی بات مان لی اور سیدھا عزیز کے گھر پہنچا' وہاں کیا دیکھتا ہے کہ عزیز اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا پڑھ رہا ہے، عزیز نے بھولو کو دیکھ کر بہت ہی محبت اور اخلاق سے اندر آنے کے لیے کہا "ارے بھولو! آؤ آؤ، تم بھی ہمارے ساتھ مل کر پڑھو' پہلے کہو تو اِدھر کیسے آنا ہوا؟"

بھولو نے جواب دیا "یوں ہی آگیا تھا"

عزیز کے خلوص کو دیکھ کر بھولو کی ہمت نہ پڑی کہ وہ اُس کو دھوکا دے، وہ عزیز کی سکھائی ہوئی بات نہ کہہ سکا تھوڑی دیر بعد وہ لوٹ گیا۔ بھولو پر عزیز کے اخلاق کا بہت اثر پڑا۔

بھولو نے دوسرے ہی دن اکبر سے صاف صاف کہہ دیا' "میں عزیز کو دھوکا نہیں دوں گا" اُس سے اُس کی کتابیں نہیں مانگوں گا کیونکہ وہ بہت ہی شریف لڑکا ہے" اُس نے عزیز کے برتاو کا بھی ذکر کیا اور کہا: "اکبر! اب ہمیں ستانے کی ایسی باتوں میں نہیں پڑنا چاہیے، سوچو تو امتحان کے لیے ایک مہینا بھی باقی نہیں رہا اور ہم ہیں کہ کھیل کود میں وقت ضائع کر رہے ہیں، اگر ہم فیل ہو جائیں تو ساری بستی میں بدنام ہو جائیں گے تمھیں اگر کھیل کود اور شرارتوں ہی میں وقت گزارنا ہے تو گزارو، اب میں تمھاری باتوں میں کبھی نہ آؤں گا۔"

اکبر نے جب یہ سنا تو اُسے بہت غصہ آیا اور اُس نے بھولو کو پیٹنا شروع کر دیا اور کہا: "اگر تجھے مجھ سے دوستی نہیں کرنی ہے تو نہ کر، مجھے کوئی پروا نہیں۔"

بے چارہ بھولو روتا دھوتا اپنے گھر چلا گیا۔

بھولو کے ساتھ اکبر کا یہ سلوک رامو اور جگنو، کو ایک آنکھ نہ بھایا، دونوں نے غور کیا کہ انھوں نے کھیل کود اور شرارتوں میں وقت گنوا دیا، دھیرے دھیرے انھوں نے بھی اکبر کی دوستی چھوڑ دی۔

چھٹی کا دن تھا، اکبر ایک ٹیلے پر بیٹھا یوں ہی اپنا وقت گزار رہا تھا' اُس نے دیکھا کہ رامو اور جگنو کہیں جا رہے ہیں' وہ دوڑتا ہوا اُن کے نزدیک گیا اور کہنے لگا: "آج چھٹی کا دن ہے، کیوں نہ ہم کچھ کھیل لیں؟" انھوں نے کہا: "نہیں ہمیں نہیں کھیلنا ہے۔ ہم نے تمھارے ساتھ کھیل کود میں بہت سا وقت خراب کیا، اب ہمیں امتحان کی تیاری کرنا ہے، ہمارے بابوجی نے کہا ہے کہ اگر ہم فیل ہو جائیں تو وہ آگے ہمیں نہیں پڑھائیں گے" یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔

اکبر یہ سن کر پریشان اور اُداس ہو گیا [illegible] کی بھی دوستی کے چھوٹنے کا اُسے بہت دُکھ ہوا۔ [illegible]

گھر پہنچا اور چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔ ماں کے اصرار پر بھی اُس نے کچھ کھایا نہ پیا، اُس کے ماں باپ اُس کی ضد اور آئے دن کی نِت نئی شرارتوں سے سخت بیزار رہتے تھے لیکن وہ کچھ کر نہیں پاتے تھے۔ آج جب اکبر نے صبح سے کچھ بھی کھایا پیا نہیں تو ماں باپ کو بہت تشویش ہوئی۔ انھوں نے اکبر سے پوچھا: "کیوں اکبر! کیا بات ہے! تم نے صبح سے کچھ بھی کھایا نہیں، کہیں تمھاری طبیعت تو خراب نہیں۔ اِس کا اکبر نے کوئی جواب نہیں دیا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ پریشان ہو کر انھوں نے پوچھا: "اکبر! تم کیوں رو رہے ہو؟"

اکبر نے روتے ہوئے ساری بات بتادی اور بولا: "ابّا میں نے کھیل کود میں اپنا وقت ضائع کر دیا اور کچھ بھی پڑھائی نہیں کی، ابّا! میں فیل ہو جاؤں گا تو تمام ساتھی ہنسی اڑائیں گے۔"

اِس پر اکبر کے باپ نے سمجھایا: "بیٹے! اب رونے دھونے سے کوئی فائدہ نہیں، ابھی وقت ہے، تم چاہو تو محنت کر کے امتحان پاس کر سکتے ہو۔"

"وہ کیسے؟" اکبر نے بے چینی سے پوچھا۔

"تم عزیز کے ہاں جا کر اس سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگو، عزیز اچھا لڑکا ہے، وہ تمھاری ضرور مدد کرے گا۔" باپ نے اکبر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

یہ بات اکبر کے سمجھ میں آگئی۔ وہ اپنی غلطیوں پر پچھتاتا ہوا سیدھا عزیز کے گھر پہنچا۔ پتا چلا کہ عزیز گھر پر نہیں بلکہ ماسٹر جی کے یہاں پڑھنے گیا ہے۔ وہ دوڑا دوڑا ماسٹر جی کے گھر پہنچا، وہاں اُس نے عزیز کو ماسٹر جی کے سامنے ادب سے بیٹھے، پڑھتے ہوئے دیکھا، وہ فوراً عزیز کے نزدیک گیا اور ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے اپنے کیے کی معافی مانگی اور اُس سے پڑھائی میں مدد دینے کی خواہش کی۔

ماسٹر جی حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے! اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اکبر میں یکایک یہ تبدیلی کیسے آگئی؟ "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟"

عزیز اکبر کو اس طرح آنسو بہاتے ہوئے نہ دیکھ سکا اور اُسے جھٹ اپنے گلے لگا لیا اور کہا: "ارے اکبر! تم اتنا کیوں روتے ہو؟ میں تمھاری ساری غلطیوں کو معاف کیے دیتا ہوں، اب تم روز ہمارے ساتھ پڑھنے آؤ، خدا چاہے گا تو تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے، عزیز کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ لیکن اُن میں غم کے نہیں خوشی کے آنسو تھے۔ اکبر نے اُس کے گھر آنے کا وعدہ کر لیا اور آنسو پونچھتا ہوا اپنے گھر گیا اور دوسرے ہی دن سے پڑھنا شروع کر دیا۔

سچ ہے، انسان وہی ہے جو اپنی غلطی مان کر توبہ کر لے اور دوسروں کی غلطی کو معاف کر کے انھیں سیدھے راستے پر لائے۔



(بشکریہ نونہال کراچی)

امۃ الرحمن الحسنی

وہ شکاری



نہیں، بالکل نہیں۔ لیکن وہ ایسا جب کرتے ہیں جب شکاری بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اور تب بھی پچاس گز کے فاصلہ سے ٹانگوں کا نشانہ لے کر برائے نام ہی فائر کرتے ہیں۔

نہیں نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ کسی کو گولی مارنے کے جرم میں اسے خود کو جیل میں نہیں بھیج دیا جائے گا؟

اور شکاری کو چوری کے جرم میں جیل نہیں بھیج دیا جائے گا۔ ابو نے کہا۔ ہاں تو کا تم کو کیسا لگا؟

بہت مزیدار ہے۔

اور اگر تمھیں بھوک ہو تو کیوں نہ ہم سحری کھالیں ــ

مجھے تو بھوک لگ آئی ہے۔ میں نے کہا۔

ابو نے ڈبل روٹی نکالی۔ سینڈوچ بنانے کے لیے اس پر مکھن اور پنیر لگایا اور مجھے دے دیا۔ اچھا اب تم ان احمق تیتروں کے شکار کی کہانی سنو۔ سب سے پہلے اس کی مشق امیر لوگوں نے کی تھی۔ تیتر پالنا معمولی کام نہیں ہے۔ بہت زیادہ امیر لوگوں نے یہ کام اس طرح شروع کیا کہ وہ تیتر کے بہت چھوٹے بچے ہزاروں کی تعداد میں خریدتے تھے اور پھر ان کو کافی بڑا ہونے تک گھر میں ہی پالتے ہیں۔ جب وہ جنگل میں چھوڑنے کے لائق ہو جاتے ہیں تو ان کو درختوں پر رہنا سکھاتے ہیں۔ نوکر اور چوکیدار وہاں ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ دن میں دو بار انھیں بہترین غذا کھلاتے ہیں۔ جب وہ خوب موٹے ہو جاتے ہیں اور چربی کی وجہ سے مشکل سے اڑ پاتے ہیں تو ان کے لیے ہانکے والے بلائے جاتے ہیں اور تالیاں بجا بجا کر شور مچا کر ان نیم پالتو تیتروں کو شکار کے شوقین رئیس لوگوں کے سامنے ہنکا کر لانے کی کوشش میں جنگل میں اڑاتے ہیں اور جب وہ اڑ کر بندوقوں کے سامنے آجاتے ہیں تو پھر شکاری لوگ ان پر خوب دھواں دھوں کرتے ہیں۔ وہ زخمی ہو کر نیچے گرنے لگتے ہیں۔

میں تمھارے ایک سینڈوچ پر جیم لگا دوں؟

ابو لگا دیجیے۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔ لیکن ابو - - - -

میں رک گیا۔

کیا کہہ رہے تھے تم؟ انھوں نے پوچھا۔

ابو جب آپ تیتروں کا شکار کرنے جاتے ہیں تو ان کو کیسے پکڑتے ہیں۔ کیا آپ وہاں بندوق چھپا کر لے جاتے ہیں؟

بندوق: انھوں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ واقعی! اصلی شکاری یا چور تیتر کو بندوق سے کبھی نہیں مارتا۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جنگل میں ایک معمولی سی فائر کی آواز پر چوکیدار پیچھے لگ جائے گا

تو پھر آپ شکار کیسے کرتے ہیں؟

کیسے کرتے ہیں؟ ابو نے کہا۔ اور ان کی پلکیں جھک کر بہت ہی پراسرار ہو گئیں۔ بولے یہ باتیں راز ہیں۔

گہرے راز! لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب میرے ابا نے مجھ

مسکن۔ دودھ پور علی گڑھ

پر وہ سب راز ظاہر کیے ہیں تو میں بھی ان رازوں سے تم کو خبردار کردوں۔ کیوں کیا تم سننا پسند کروگے؟

ابو ضرور بتایئے۔ اور ابھی بتایئے۔ میں نے جوش میں کہا۔

باب ۵

ابو نے کہنا شروع کیا۔ میرے ابا نے تیتروں کے شکار کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کیے تھے۔ وہ نئے طریقے دریافت کرنے کے لیے ایسے تجربات کیا کرتے تھے جیسے کوئی سائنس داں کسی نئے فارمولے کا تجربہ کیا کرتا ہے۔

ابو نے سینڈوچ بناکر ایک پلیٹ میں رکھے اور مجھے دیدیے۔ وہ میں بڑے شوق سے کھانے لگا۔

اور انھوں نے صرف تجربے کرنے کے لیے گھر کے آنگن کے پچھلے حصے میں مرغیاں پال رکھی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مرغیوں کی عادتیں تیتروں جیسی ہی ہوتی ہیں۔ ویسی ہی ڈرپوک اور بیوقوف بھی۔ جو چیزیں تیتر کھاتے ہیں وہی مرغیاں بھی پسند کرتی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ مرغیاں زیادہ پالتو ہوتی ہیں۔

ابا جب تیتروں کی پوچنگ کا کوئی نیا طریقہ سوچتے تھے تو اپنی مرغیوں پر پہلے آزما کر دیکھتے تھے کہ وہ کامیاب ہوتا ہے کہ نہیں۔

سب سے اچھا طریقہ کون سا تھا؟ میں نے پوچھا۔

چند سیکنڈ ابو مجھے غور سے دیکھتے رہے پھر بولے وعدہ کرو کسی سے نہیں کہوگے۔

میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں پکا کہ کسی سے نہیں کہوں گا۔ میں نے جواب دیا

کہنے لگے: دانی جو کچھ میں تم کو بتانے والا ہوں، وہ بہت ہی ذہانت کی اور اہم ترین دریافت ہے اور اسی لیے ایک بڑا اور گہرا راز بھی۔ اور مجھ سے زیادہ قریب کھسک آئے۔ کمرے میں لیمپ کی پیلی مدھم روشنی میں ان کا چہرہ زیادہ پیلا نظر آرہا تھا۔ مگر آنکھوں میں اس وقت بھی ستارے بھرے ہوئے تھے۔ جھک کر سرگوشی میں کہا۔ تیتر کشمشوں پر جان دیتے ہیں۔

کیا یہی وہ بڑا راز ہے؟ میں نے کہا۔

ہاں! انھوں نے کہا، کہنے میں یہ بات بڑی نہیں لگتی۔ لیکن یقین مانو یہ بات بہت بڑی ہے۔

کشمش؟ میں نے کہا۔

ہاں! بالکل عام کشمش۔ وہ دیوانگی کی حد تک کشمش پسند کرتے ہیں۔ اگر ایک جھنڈ کے سامنے چند کشمشیں ڈال دو تو وہ ایک دوسرے سے لڑنے مرنے لگتے ہیں۔ اب سے چالیس سال پہلے میرے ابا نے یہ بات دریافت کی تھی۔ اس کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں جو میں تم کو بتانے والا ہوں۔ ابو نے تھوڑا وقفہ کیا اور ایسے دیکھنے لگے جیسے اطمینان کر رہے ہوں کہ دروازہ پر کھڑا کوئی سن تو نہیں رہا۔ بہت ہی ہلکی آواز کر کے کہا۔

پہلا قاعدہ گھوڑے کے بال کا پھندہ ہے۔

گھوڑے کے بال کا پھندہ؟ میں بڑبڑایا۔

ہاں! اور اس بے مثل قاعدہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مکمل طور پر خاموش ہوجاتے ہیں۔ گھوڑے کے بال کے پھندے کے بعد پھر وہاں کوئی چوں چپٹ پھڑپھڑاہٹ کچھ سنائی نہیں دیتی۔ ——— اور دانی یہ باتیں غور سے سننے کی ہیں اور یاد رکھنا کہ جب تم ان جنگلوں میں ہو جہاں بڑے بڑے درخت تمھارے سر پر اپنی شاخوں کا بھوتوں جیسا سایہ پھیلائے ہوں اور ایسا سناٹا ہو کہ تم ایک چوہے کی حرکت تک سن سکو تو ایسے میں کسی درخت یا جھاڑی کے پیچھے چوکیدار بھی بندوق لیے انتظار میں ایک بت کی طرح ساکت تیار کھڑا ہوگا۔

یہ بتایئے گھوڑے کے بال کے پھندے سے کیا ہوتا ہے؟ میں نے پوچھا۔

اس سے یہ ہوتا ہے کہ پہلے کشمشوں کو ایک ساتھ بھگوئے رکھو تاکہ وہ پھول کر نرم اور گدگدی موٹی ہوجائیں۔ پھر ایک سخت گھوڑے کا بال لے کر آدھ آدھ انچ کے ٹکڑے کاٹ لو۔

اور گھوڑے کے بال لیے کہاں سے جاتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

بہت آسان طریقہ ہے۔ کسی بھی گھوڑے کی دم میں سے کھینچا جا سکتا ہے۔ بس اس کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ اس کے بالکل پیچھے نہیں برابر کھڑے ہونا چاہیے تاکہ اس کی دولتی سے بچ سکو۔

پھر کیا ہوتا ہے؟

بھیگی ہوئی کشمشوں میں ان کٹے ہوئے بالوں کو پرو دو۔ ہاں بال کشمشوں کے دونوں طرف نکلے ضرور ہونے چاہییں۔ بس اب تم تیار ہو۔ شام ہو جائے تو کھسکتے ہوئے جنگل میں جاؤ یہ دیکھ لینا چاہیے کہ تیتر بسیرا لینے تو نہیں چلے گئے۔ پہلے سے پہنچ کر کشمشوں کو پھینک دو۔ تیتر آتے ہی کشمشیں نگلنے لگیں گے۔

اس کے بعد کیا ہوگا؟ میں نے سوال کیا۔

اس کے بعد وہ بات ہوگی جو ابا نے دریافت کی تھی۔ یعنی کشمش تیتر کے حلق میں پہنچتے ہی اٹک جائے گی۔ مگر اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بس وہ اس کے چبھنے لگے گی۔ ایسے ہی جیسے تمہارے گلے میں کوئی ریزہ پھنس جائے اور پھندہ لگ جائے۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے تم مانو یا نہ مانو۔ تیتر اپنے پیر وہیں جما دیتا ہے اور اپنی گردن کو نیچے اوپر کرتا رہتا ہے۔ اب تم یہ کرو گے کہ اپنے چھپنے کی جگہ سے نکل کر اسے دبوچ لوگے اور اٹھا کر چلتے بنو گے۔

ابو کیا سچ میں ایسا ہی ہوتا ہے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

ابو نے کہا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب تیتر کے گلے میں گھوڑے کے بال کا پھندا لگ جاتا ہے تو اس کا جو چاہے کر لو وہ قطعی نہیں ہل سکتا۔ یہ تو بہت سی اور ترکیبوں میں سے ایک ایسی ہے جسے بیان کیا جا سکتا ہے ابو تھوڑا رکے۔ اس وقت اپنے ابا کی شکاری ایجادوں کی یادوں سے ان کی آنکھیں فخر کی کیفیت میں جگمگا رہی تھیں۔ بات جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا۔ پہلا قاعدہ تو میں نے تم کو بتا دیا ہے۔

اور دوسرا کیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

اوہ! قاعدہ نمبر ۲! وہ بہت ہی حسین اور دلچسپ چیز ہے۔ وہ تو خالص ذہانت کا ایک چھماکہ ہے۔ مجھے اس کی ایجاد کا دن آج بھی یاد ہے۔ میں اس وقت بالکل تمہاری عمر کا تھا۔ ایک اتوار کی صبح کو ابا ایک مرغی ہاتھ میں لیے ہوئے باورچی خانہ میں آئے۔ ایک فاتحانہ مسکراہٹ سے ان کا چہرہ روشن تھا۔ وہ کہہ رہے تھے دیکھو میں اس طریقے میں کامیاب ہو گیا۔ اور مرغی کو باورچی خانہ کے صاف فرش پر رکھ دیا اور جوش میں کہنے لگے خدا کی قسم میں نے ایک بہترین طریقہ معلوم کر لیا ہے۔ اماں نے مڑ کر دیکھا اور کہا

کیسا بہترین طریقہ؟ اور پھر مرغی کو اپنے صاف فرش پر دیکھ کر کہا۔ ارے! اسے نکالو یہ میرا باورچی خانہ گندا کر دے گی۔

مرغی کے سر پر ایک قسم کی کاغذ کی ٹوپی مڑھی ہوئی تھی۔ آئس کریم کے کون کی طرح کی اور ابا بہت ہی فخریہ انداز میں اس کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہے تھے: اسے ہٹاؤ یا مارو جو چاہے کرو۔ وہ ایک انچ بھی اس جگہ سے نہیں ہلے گی۔ ادھر مرغی جی کھڑی تھی اور بس اپنے ایک پنجے سے کاغذ کی ٹوپی کو کھرچے جا رہی تھی۔ مگر ٹوپی کسی طرح اتر ہی نہیں رہی۔ عجیب حیرت ناک تماشا تھا۔ ابا کہہ رہے تھے کہ اگر کسی پرندے کی آنکھیں ڈھک جائیں تو وہ نہ تو اڑ سکتا ہے نہ بھاگ سکتا ہے۔ وہ اسے ڈھکیل رہے تھے اور جگہ سے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔

مگر مرغی پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ پھر اماں سے کہا۔ تم اسے لو اور میری نئی ایجاد کی خوشی میں اسے کاٹ کر ہماری دعوت کر دو۔ اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر بہت تیزی سے باورچی خانہ سے نکل آئے اور کئی میدان پار کر کے ہم ایک بہت بڑے جنگل میں پہنچ گئے۔ جو اس زمانہ نواب نصرت جنگ کی ملکیت تھا اور دو گھنٹے سے بھی کم میں پانچ موٹے خوبصورت تیتر لے کر ایسے آئے جیسے کسی دکان سے خرید کر لا رہے ہوں۔

ابو اپنی پرانی یادیں سنا کر سانس لینے کے لیے رکے۔ وہ اس وقت اپنی تیز چمکتی ہوئی آنکھوں سے اپنے لڑکپن کی حسین دنیا دیکھ رہے تھے۔

میں نے پوچھا۔ ابو تیتر کے سر پر کاغذ کی ٹوپی کیسے مڑھی جاتی ہے۔

واقعی! یہ بات خواب میں بھی نہیں سوچی جا سکتی تھی۔

بتائیے! میں نے کہا۔

اور ایک دفعہ پھر انھوں نے دروازہ کی طرف ایسے انداز سے دیکھا جیسے چوکیدار یا خود نواب نصرت جنگ کو وہاں دیکھنے کی انھیں توقع ہو۔

غور سے سنو! ابو نے کہا۔ ترکیب نمبر ۲ یہ ہے کہ سب سے پہلے زمین میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھود لو اور ایک کاغذ کا ٹکڑا لے کر گول پیچھے سے نوکیلا آئس کریم کے کون کی طرح موڑ لو اور اس گڑھے

میں جھاڑو دو اور اس کے اندر گوند مل دو۔ چند کشمشیں بھی اس میں ڈال دو۔ پھر اس کاغذ لگے گڈھے سے لے کر کچھ دور تک ایک لائن کشمشوں کی پھیلا دو۔ اب جب تیتر آئے گا تو لائن کی کشمشیں چنتا ہوا گڈھے تک آئے گا۔ مزید کشمشوں کی تلاش میں اپنا سر اندر ڈالے گا اور فوراً ہی کاغذ کی ٹوپی اس کی آنکھوں پر چپک جائے گی۔ اسے کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ یہ تھا ان کا وہ عجیب و غریب خیال ابا نے اس قاعدہ کا نام چپکنے والی ٹوپی رکھا تھا۔

تو کیا آپ نے آج شام یہی قاعدہ استعمال کیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

ابو نے سر ہلا دیا۔

آپ نے کتنے تیتر پکڑے ہیں؟

وہ کچھ شرمندہ سے ہو کر بولے: سچ تو یہ ہے کہ میں ایک بھی نہیں پکڑ سکا۔ میں جب وہاں پہنچا تو دیر ہو گئی تھی۔ تیتر بسیرا لینے جا چکے تھے۔ اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میری مشق بالکل چھوٹ گئی ہے۔

مزہ تو آپ کو بہت آیا ہوگا؟

بہت زیادہ! یہ کھیل ہی بہت عجیب اور دلچسپ ہے۔ مجھے اس میں اپنے پرانے دن یاد آجاتے ہیں۔ انھوں نے سونے کے کپڑے بدلے۔ روشنی بجھائی اور اوپر کے تختے پر اپنے بستر میں چلے گئے۔

میں نے ان کو ہلکے سے آواز دی۔ ابو!

ہاں دانی کیا بات ہے! انھوں نے جواب دیا۔

کیا آپ میرے سونے کے بعد اکثر وہاں جاتے ہیں۔ تاکہ مجھے خبر نہ ہو۔

نہیں! انھوں نے کہا۔ نو سال بعد گیا تھا۔ جب سے تمھاری ماں کا انتقال ہوا ہے تو تمھاری دیکھ بھال کی وجہ سے میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک تم اتنے بڑے نہیں ہو جاؤ گے کہ رات کو تم کو اکیلے چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ میں پوچنگ کے لیے نہیں جاؤں گا۔ لیکن آج شام میں نے اپنی قسم توڑ دی۔ مجھے جنگل جانے کی ایسی زبردست خواہش ہوئی کہ میں اسے روک نہیں سکا۔ اس کا اب مجھے بہت افسوس ہے۔

اگر آپ پھر جانا چاہیں تو چلے جایئے۔ میں بالکل برا نہیں مانوں گا۔ میں نے کہا۔

دانی کیا تم سچ کہہ رہے ہو! ابو نے پوچھا۔

ہاں ابو بالکل سچ! بس اتنی شرط ہے کہ جانے سے پہلے مجھے بتا ضرور دیا کیجیے۔ تب میں بالکل برا نہیں مانوں گا۔

تمھیں یقین ہے کہ تم برا نہیں مانوگے؟

بالکل یقین ہے۔ آپ بے فکر رہیے۔

شاباش! انھوں نے کہا۔ اور پھر جب تمھارا تیتر کھانے کو دل چاہے گا تو ہم دوپہر کے کھانے پر اس کا روسٹ بنا کر کھایا کریں گے۔ وہ روسٹ مرغ کے گوشت سے کہیں زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔

اور ابو کیا ایک دن مجھے بھی آپ اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ تم ابھی اس شکار کے لیے کچھ چھوٹے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ اس عمر میں وہاں کے اندھیرے میں شکار کرتے ہوئے تمھارے پیچھے کہیں سے کوئی چھرا آکر لگے۔

آپ کے ابا بھی تو آپ کو میری ہی عمر میں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

تھوڑی دیر تک وہ چپ رہے پھر بولے خیر پھر دیکھیں گے۔ تم سمجھ گئے نا؟

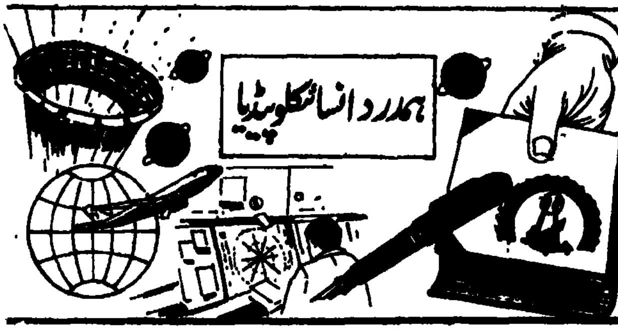
میں تم سے اس وقت تک وعدہ نہیں کر سکتا جب تک کہ مجھے پوری طرح مشق نہ ہو جائے۔

ٹھیک ہے میں نے کہا۔

اچھا دانی! شب بخیر! بس اب تم سو جاؤ۔

ابو! شب بخیر!

(باقی آئندہ)



س: سانپ کے کاٹنے کے بعد فوری علاج کیا کرنا چاہیے؟ سانپ یا دوسری اقسام کے زہر ہمارے لیے کیوں مضر ہیں اور یہ کس طرح نقصان پہنچاتے ہیں؟ از راہِ مہربانی تفصیل سے جواب دیں۔

محسن رجب علی

ج: اکثر و بیشتر زہر جب دورانِ خون میں شریک ہو جاتے ہیں تو اس میں شدید خرابی پیدا کرتے ہیں۔ اس کے مزاج و قوام کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ ان میں جماؤ پیدا کرتے ہیں اور اس کیفیت و تبدیلی سے قلب اور دوسرے اعضائے رئیسہ (دماغ و جگر) فوراً متاثر ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام تبدیلیاں شدید عوارض بلکہ موت کا سبب ہوتی ہیں۔ سانپ کے زہر کا بھی ایسا ہی اثر ہوتا ہے۔ اس زہر کے لیے اب تریاق ایجاد ہوا ہے۔ مریض کو فوراً قریبی ہسپتال جانا چاہیے۔

س: دنیا میں سانپ کی کتنی قسمیں ہیں اور کیا سانپ کے کاٹنے سے انسان کا رنگ کالا ہو جاتا ہے؟

(محمد فقیر فاضل محمد اقبال نوشاد)

ج: یہ بتانا تو مشکل ہے کہ دنیا میں کتنی قسم کے سانپ پائے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا انحصار بہت کچھ آب و ہوا اور جغرافیائی حالات پر ہے۔ ہر ملک میں اس کی مختلف قسمیں پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے کچھ سانپ زہریلے ہوتے ہیں اور کچھ نہیں۔

س: ستارے جھلملاتے کیوں نظر آتے ہیں؟

ج: ستارے اصل میں اپنی اپنی جگہ پر بہت بڑے بڑے سورج ہیں اور ہم سے بہت ہی زیادہ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ اُن کی روشنی لا محدود خلا میں اربوں کھربوں میل طے کرنے کے بعد ہم تک آتی ہے۔ لیکن زمین تک آنے سے پہلے اس روشنی کو ہوا کے اُس غلاف میں سے گزرنا پڑتا ہے جو ہماری زمین کے چاروں طرف لپٹا ہوا ہے چوں کہ اس غلاف کی کثافت مختلف فاصلوں پر مختلف ہے۔ یعنی ہوا کی وہ تہ جو زمین سے ملی رہتی ہے سب سے زیادہ کثیف ہے اور جیسے جیسے ہم اُوپر جاتے ہیں ہوا لطیف ہوتی چلی جاتی ہے اس لیے ستاروں کی روشنی سیدھی طرح نہیں آتی بلکہ کثافت کے فرق کی وجہ سے ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ جب ہم ستاروں پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ایک جگہ ٹھہرے رہنے کے بجائے جھلملاتے نظر آتے ہیں۔

س: فوٹو اسٹیٹ مشین کیا ہے اور کیسے کام کرتی ہے؟

(محمد اجمل علوی)

ج: فوٹو اسٹیٹ مشین میں ایک کاغذ کو اندر داخل کر لینے اور تیز روشنی پھینکنے کا انتظام ہوتا ہے۔ آپ جس کاغذ یا دستاویز کی تصویر لینا چاہتے ہیں اُسے مشین پر رکھتے ہیں اور نیچے کچھ فاصلے پر ایک سفید کاغذ رکھا جاتا ہے۔ تیز روشنی دستاویز میں ہوتی ہوئی اُس کاغذ پر پڑتی ہے جس پر ایک کیمیائی مادہ چڑھا ہوتا ہے جو روشنی کا اثر قبول کر لیتا ہے، بالکل اُسی طرح جیسے تصویر لینے کی فلم پر ایک کیمیائی تہ چڑھی ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کاغذ والا مسالہ بہت سستا ہوتا ہے۔ اس طرح دستاویز کی ایک سیدھی تصویر اُس کاغذ پر آجاتی ہے جسے ہم فوٹو کاپی کہتے ہیں۔ (بشکریہ نونہال کراچی)

اشفاق احمد

محنت کا پھل



بہت پرانی بات ہے، کسی گانو میں نصرت صاحب رہا کرتے تھے۔ ان کی گنتی دولت مند آدمیوں میں ہوتی تھی۔ نصرت صاحب بہت شریف، ہمدرد اور سخی تھے۔ ساتھ ساتھ انصاف پسند ہونے کی وجہ سے انھیں گانو کے لوگ بھی مانتے تھے۔ ان کے پاس کافی کھیتی تھی۔ وہ اپنی کھیتی میں خوب محنت کرتے اور اچھی فصل کاٹتے۔ ان کے دو لڑکے تھے، ایک کا نام اکبر اور دوسرے کا نام اصغر تھا۔ ان کے دونوں لڑکے گانو کے اسکول میں زیر تعلیم تھے۔

اس طرح نصرت صاحب کی زندگی خوشحال گزر رہی تھی۔ لیکن کبھی کبھی یہ دیکھ کر انھیں بڑا افسوس ہوتا تھا کہ اصغر ان کا چھوٹا لڑکا بہت سست اور کاہل ہے۔ اس کا دل پڑھائی میں بالکل نہیں لگتا اور نہ ہی کوئی کام دل چسپی سے کرتا ہے، ہمیشہ وہ اسکول سے غیر حاضر رہتا ہے۔ کبھی وہ دوپہر سے بھاگ کر کھیت کی طرف نکل جاتا ہے۔ انھوں نے بہت چاہا کہ اکبر کی طرح وہ بھی ہر کام دل چسپی سے انجام دے، سستی اور کاہل پن چھوڑ دے۔ اسے سنجیدگی اور سمجھداری سے سمجھایا، اس کے ہر غلط کام پر ٹوکا۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی اور پھر زندگی کے دن رات یوں ہی بیتتے رہے۔ اصغر دن بدن سست اور کاہل بنتا چلا گیا۔ ان کے ابا بھی بیمار رہنے لگے کافی دوڑ بھاگ کی۔ علاج کروایا۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر نصرت صاحب سمجھ گئے کہ اب وہ وقت قریب آپہنچا ہے جو سب کے لیے آتا ہے اور جس سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔

ایک دن انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو آواز دے کر اپنے قریب بلا کر بٹھایا۔ کہا: بیٹو! اب کہ

سروت گرنی - تاج آباد - ناگپور

میرے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس لیے میں تم دونوں کو وصیت کرتا ہوں کہ جس طرح میں نے اپنا سب کچھ کھیت کو سمجھا، جس طرح ماں کو پیار اپنے بچے سے ہوتا ہے بس اسی طرح مجھے بھی اپنے کھیت سے پیار تھا، لگاو تھا۔ میں اس کھیت میں محنت کرتا رہا۔ مجھے اس کا پھل بھی برابر ملتا رہا اور جو تم یہ سب کچھ دولت حویلی اور سامان دیکھ رہے ہو یہ سب میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اب میں کھیت، دولت تم دونوں میں تقسیم کر دیتا ہوں لیکن یاد رکھو میرے بچو! محنت کرنے سے کبھی منہ نہ موڑنا۔ اپنے کھیتوں کو ہمیشہ ہرا بھرا رکھنا۔" پھر نصرت صاحب نے اپنی جائداد دونوں میں تقسیم کر دی۔

دوسرے دن ان کی آواز رکنے لگی اور پھر ان کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ ماں کی بے لوث محبت تو اللہ نے پہلے ہی سے چھین لی تھی، اب باپ کا سایا بھی سر سے اٹھ گیا۔ اس وقت اصغر اور اکبر دونوں نویں جماعت میں تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد دونوں کے ذہنوں میں آندھیاں چلنے لگیں۔ سارے راستے انجان سے لگے۔ اب کہاں وہ خوشحالی کی زندگی اور عیش و آرام! ان کا سر چکرانے لگا۔ بڑا لڑکا اکبر بہت سمجھدار اور محنتی تھا۔ اس نے اپنے کھیت میں نوکروں کا سہارا لے کر محنت کرنا شروع کر دی۔ وہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ نوکروں کو ساتھ لے کر کھیت پہنچ جاتا۔ خوب محنت کرتا اور شام کو تھکے ماندے قدموں سے گھر لوٹتا۔

لیکن اصغر کا حال اس کے برعکس تھا۔ اس نے اپنی عادت ابھی بھی نہیں چھوڑی تھی۔ ملی ہوئی دولت آرام سے بیٹھ کر کھا رہا تھا۔ اب اس کے دوست بھی کافی ہو گئے تھے۔ دن بھر گھر میں دوستوں کا میلا رہتا۔ یہ دیکھ کر اکبر دل ہی دل میں کڑھتا اور اسے سمجھاتا۔ جب دولت ختم ہو گئی تو دوست دھیرے دھیرے دور ہوتے چلے گئے۔ پھر بھی اس کے سمجھ میں نہ آیا۔ کھیت اس نے نوکروں کے ذمہ کر دیا۔ نوکر موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنے گھر بھرنے لگے۔ آخر لاچار ہو کر اصغر نے کھیت بھی بیچ ڈالا۔ اور اس کا پیسا بھی جب چند روز میں ختم ہو گیا تو اس کی آنکھ کھلی۔ اب اس کے پاس کیا تھا۔ وہ دوسروں کے کھیتوں میں جانے لگا۔ لیکن چند دنوں کے بعد ہی لوگوں نے اسے اپنے کھیتوں میں کام دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ دلچسپی سے اور محنت سے کام نہیں کرتا تھا۔

ادھر بڑا بھائی اکبر اب بہت بڑا آدمی بن چکا تھا۔ لیکن اب بھی محنت برابر کیے جا رہا تھا۔ ہر وقت اس کا کھیت ہرا بھرا رہتا تھا۔ اس کے والد کی طرح اس کا بھی نام گاؤں میں عزت سے لیا جانے لگا۔

ایک رات اصغر فاقے کی وجہ سے تڑپ رہا تھا۔ اور اسی بے قراری میں صبح ہونے کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھا اور بوجھل قدموں سے لکڑیاں توڑنے کے لیے جنگل چلا گیا۔ اب وہ لکڑیاں توڑ لاتا اور اسے بازار میں بیچ کر اپنی گزر بسر کرتا۔ ایک دن شام کو لکڑیوں کا گٹھا سر پر رکھے اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ آج وہ دن بھر سے بھوکا تھا۔ اس لیے اسے بھوک کی شدت زیادہ پریشان کیے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور وہ لکڑیوں کا گٹھا لیے نیچے گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ اسی دوران اکبر اپنے کھیت سے نوکروں کو لے کر اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اس

نے راستے میں پڑے ہوئے آدمی کو دیکھا تو پہچان نہ پایا کہ یہ میرا بھا بھائی ہے۔ لیکن غور سے دیکھنے کے بعد اس نے پہچان لیا۔ قریب کے کھیت کے کنویں سے ایک پانی لایا اور ایک گھونٹ اس کے حلق میں ٹپکایا تھوڑی دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو وہ حیران رہ گیا کہ میرا بھائی یہاں کیسے پہنچ گیا۔

"تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟" اکبر نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "بھیا میری سمجھ میں اب سب کچھ آچکا ہے میں شرمندہ ہوں۔ ابا جان اور آپ نے مجھے بارہا کہا کہ سستی اور کاہلی کا نتیجہ بہت برا اور بھیانک ہوتا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور آپ نے محنت کی اس کا نتیجہ آپ کو ملا۔ آج آپ کے پاس دولت ہے گاؤں میں آپ کی عزت ہے اور میں ....

"اصغر یہ سب محنت کا پھل ہے۔ تم نے محنت نہیں کی نوکروں کے ذمّے اپنا سارا کام چھوڑ دیا اور اپنی ذمہ داری بھول بیٹھے۔ بس اسی وجہ سے آج تم اس مقام پر پہنچ گئے ہو۔"

اصغر نیچے سر کیے خاموشی سے سنتا رہا اور پھر آپ ہی آپ دونوں کی آنکھوں میں سے آنسو بہ نکلے اور وہ دونوں وہیں گلے مل کر رونے لگے!!!

"کھلونوں کی دکان"

بخشش صبا بی

بچّو! دیکھو میری شان
اتنے کھلونے ایک دکان
بوٹنگ، راکٹ، ہوڑہ میل
میں لائی البیلے کھیل
'امریکا' کی موٹر ہے
ایشیا" والا جوکر ہے

لٹّو ناچ دکھاتا ہے
سب کا جی بہلاتا ہے
مرغی دیتی ہے انڈا
ریچھ گھماتا ہے ڈنڈا
بندر وہسکی پیتا ہے
درزی کپڑے سیتا ہے
ملتے ہیں دولھا دلھن
بجتا ہے باجا جھن جھن
بطخیں، قیں قیں کرتی ہیں
تم سب کا دم بھرتی ہیں
لکڑی والا گھوڑا ہے
چڑے چڑی کا جوڑا ہے
ٹامی گن، چاقو، پستول،
تاج محل، اپنا انمول
کتنے اور کھلونے ہیں
رادھا، شیام، سلونے
بچّو! آؤ کھیلو کھیل
لیکن مت ہو جانا فیل
پڑھنا لکھنا پہلا کام
خالی کھیل کرے بدنام

مرسلہ: بارہویں ایڈیشنی مونٹینا پبلک اسکول بھوپال

کوئلا، تیل اور گیس

علی ناصر زیدی



جب سے دنیا میں صنعتی انقلاب آیا ہے، اُن ملکوں کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی ہے جن میں معدنیات کثرت سے موجود ہیں۔ دھاتیں اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں لیکن موجودہ تہذیب میں کوئلا، تیل اور گیس پیش پیش ہیں۔ ہر ملک اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنی حدود میں ان چیزوں کے ذخائر تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی جگہ جگہ کھدائی ہو رہی ہے اور کبھی کبھی تیل کے ذخائر مل جانے کی خوش خبری آتی رہتی ہے۔

سعودی عرب میں تیل موجود ہے، اس لیے اس ملک کو آج کی دنیا میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ تیل دولت ہی نہیں بلکہ طاقت کا دوسرا نام ہے اور کیوں نہ ہو، آج کی زندگی کی تمام تر رونقیں معدنیات اور زمین میں پوشیدہ ان خزانوں پر ہی تو منحصر ہیں۔ ہماری روزمرہ ضروریات بڑی حد تک ان ہی سے پوری ہوتی ہیں۔

تمام معدنیات اپنی جداگانہ صفات رکھتی ہیں۔ ایک کو دوسرے کا بدل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جہاں لوہا کام دے سکتا ہے وہاں کوئی اور دھات استعمال نہیں کی جا سکتی اور جہاں المونیم کی ضرورت ہے وہاں وزن زیادہ ہونے کی وجہ سے لوہا نہیں لگایا جا سکتا۔ ہوائی جہاز کا تصور کیجیے، اُس کی بناوٹ میں ایسی دھاتیں استعمال کی جاتی ہیں جو مضبوط بھی ہوں اور وزن میں ہلکی بھی۔ لوہا پانی میں ڈوب جاتا ہے، لیکن اگر لکڑی کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو تیرنے لگتا ہے۔ بحری جہاز میں دونوں لوہا اور لکڑی استعمال کیے جاتے ہیں۔

اتفاق کچھ ایسا ہے کہ دنیا کے تمام ملکوں کو معدنی خزانے برابر نہیں ملے ہیں جن ملکوں میں تیل نکلتا ہے وہاں عام طور سے غذائی اشیا یا دوسرے قدرتی خزانے وافر نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ملک تیل برآمد کرتے ہیں اور اپنی ضرورت کی غذائی اور دوسری اشیا دوسرے ملکوں سے منگاتے ہیں۔

تیل خود بہ خود اوپر نہیں آجاتا بلکہ اُسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ خدا کی قدرت ہے کہ جن ملکوں میں کبھی ریت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا اور چاروں طرف افلاس کے سائے نظر آتے تھے، وہاں تیل نکل آنے کے بعد چاروں طرف دولت ہی دولت نظر آنے لگی بلکہ اُن ملکوں کو سیاسی اہمیت بھی حاصل ہو گئی۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے بعض اسلامی ممالک تیل کی دولت سے مالا مال ہیں۔

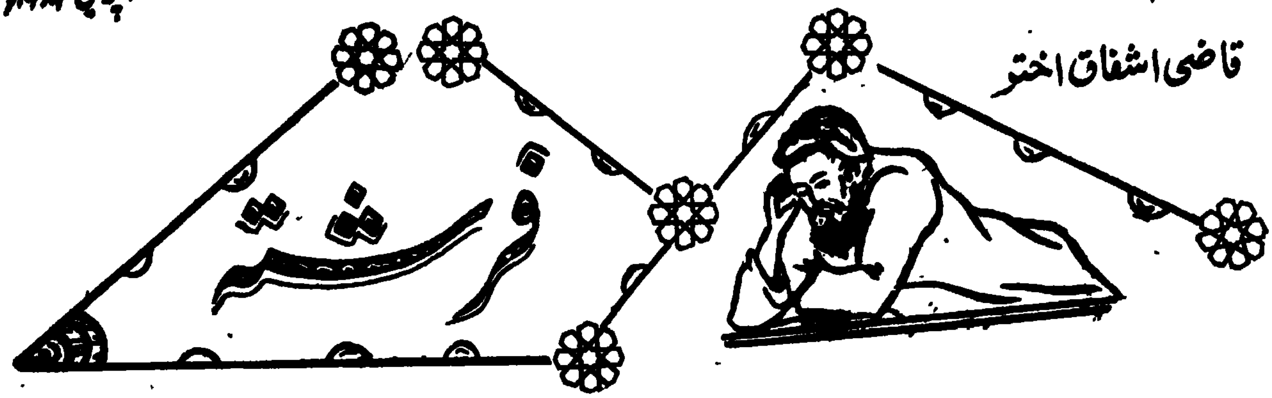
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئلہ، تیل اور گیس زمین کے اندر کیسے بنے؟ سائنس دانوں نے بہت سی تحقیقات کے بعد یہ معلوم کیا ہے کہ اب سے کروڑوں برس پہلے زمین

بشکریہ ماہنامہ نونہال کراچی

جنگل ہی جنگل چھائے ہوئے تھے۔ اُس وقت انسان یا کسی جان دار کا کہیں پتا نہیں تھا۔ بارش کی زیادتی کی وجہ سے زمین پر جا بجا دلدلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ انقلاب کی وجہ سے بڑے بڑے تناور درخت گر کر ان دلدلوں میں پھنس گئے، ان پر مٹی کی تہیں جم گئیں اور وہ اندر ہی اندر محفوظ ہو گئے۔ لاکھوں برس یوں ہی گزر گئے، زمین کے اندرونی دباو اور زبردست حرارت نے ان کی شکل ہی بدل دی۔ سخت دباو کی وجہ سے وہی درخت پتھر جیسے کوئلے میں تبدیل ہو گئے۔ اسی لیے ہم اسے پتھر کا کوئلا کہتے ہیں، وہ تہہ دار چٹانوں کے نیچے ملتا ہے۔

نباتات کی طرح بہت سے چھوٹے بڑے جان دار بھی زمین کی اندرونی تہوں میں دب کر رہ گئے، زبردست دباو کی وجہ سے وہ تیل میں تبدیل ہو گئے۔ نباتات اور حیوانات کا یہ ملا جلا ملغوبہ سیال سیاہ مادے کی شکل میں ملتا ہے جسے ہم کنووں میں سے نکال کر صاف کر کے استعمال کرتے ہیں، چونکہ یہ مادہ زمین میں بہت گہرائی پر ملتا ہے اس لیے اس تک پہنچنے کے لیے گہرے کنویں کی ضرورت پڑتی ہے۔ تیل خشکی پر ہی نہیں ملتا بلکہ اب سمندروں کی تہہ سے بھی نکالا جا رہا ہے۔

تیل کی طرح گیس بھی زبردست دباو کی وجہ سے زمین کے اندرونی اور گوشوں میں پھنس کر رہ گئی، اُسے بھی اندر سے نکال کر اور قابو میں رکھ کر استعمال کیا جاتا ہے



فرشتہ

قاضی اشفاق اختر

مجھے ایک ضروری کام سے بیتول جانا تھا۔ میں نے اپنی تیاری کی، ایک بیگ میں ضرورت کا کچھ سامان رکھا اور بس اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوگیا، کیونکہ ایک بج کر چالیس منٹ ہو چکے تھے اور بس دو بجے جاتی ہے جبکہ بس اسٹینڈ تک پہنچنے کے لیے دس منٹ درکار ہوتے ہیں۔ ابھی میں نے بس اسٹینڈ کا راستہ آدھا ہی طے کیا تھا کہ مجھے راستے میں ایک فقیر مل گیا۔ جس کے دونوں پیر کسی حادثہ کی نظر ہو چکے تھے اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے بمشکل گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ کر آواز لگائی "بابا۔ اللہ کے نام پر دس پانچ پیسے لنگڑے معذور کو دے دو، خدا تمھارا بھلا کرے، مصیبتوں کو ٹالے، صحیح سلامت رکھے اور کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا کہ چھٹے پیسے ہوں تو اُسے دیدوں، لیکن اِس وقت میرے پاس چھٹے پیسے نام کی کوئی چیز ہی نہ تھی اور چونکہ جیب میں ہاتھ ڈال چکا تھا اِس لیے اُسے کچھ دینا ہی تھا اور وہ بھی گھسٹنا چھوڑ کر رک گیا تھا اور اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا جن میں اُس نے کپڑے باندھ رکھے تھے اور اُنھیں زمین پر ٹیک کر آگے بڑھتا تھا۔ کپڑے بھی پھٹ چکے تھے اور اُس کی ہتھیلیوں سے خون رِس رہا تھا۔

میں نے پاکٹ سے ایک روپے کا نوٹ نکالا اور سامنے ایک دکان پر چلا گیا کہ چھٹے کرا کر فقیر کو دیدوں۔ دکاندار گاہکوں کو اُن کی مطلوبہ چیزیں دینے میں مصروف تھا۔ جب وہ اُن سے نمٹ چکا تو میری طرف متوجہ ہوا۔

میں نے اُس سے کہا: "مجھے ایک روپے کے چھٹے چاہیئے۔"

لیکن اُس نے انکار کر دیا اور کہا: "خود میرے پاس ہی چھٹے پیسے نہیں ہیں گاہکوں کو کہاں سے لاکر دوں گا۔" آخر مجبور ہوکر اُس کی دکان سے باہر آگیا۔ فقیر بدستور اپنی جگہ موجود مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ اب میں سوچنے لگا کہ کیا جائے، چھٹے ملنے سے رہے اور یہ ٹلنے سے رہا۔ ادھر وقت الگ پر لگائے اُڑا جارہا تھا اور مجھے کسی بھی قیمت پر بس پکڑنا تھی۔ آخر تھوڑے سوچ بچار کے بعد میں نے وہ ایک روپے کا نوٹ ہی فقیر کو دے دیا اور اپنا راستہ لیا۔

میرے آٹھ منٹ فقیر کے چکر میں ضائع ہو چلے تھے اب دو بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے اور مجھے بس اسٹینڈ کا آدھا راستہ طے کرنا تھا۔ میں تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا بس اسٹینڈ کی جانب بڑھنے لگا۔ بار بار گھڑی بھی دیکھتا جاتا تھا۔ اب میں بس اسٹینڈ کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا صرف پچیس تیس قدم کے فاصلے پر بس اسٹینڈ تھا اور مجھے بسیں بھی نظر آرہی تھیں۔ بیتول جانے والی بس بھی ان میں کھڑی ہوئی تھی۔

ابھی میں چار پانچ قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ غصّے کے مارے میرا برا حال ہوگیا، کیونکہ بیتول جانے والی بس، اسٹینڈ سے نکل رہی تھی۔ پھر بھی میں نے ایک آخری کوشش کی اور دوڑ پڑا۔ لیکن جو ہونا تھا وہی ہوا، میرے پہنچنے سے پہلے ہی بس نکل گئی اور میں دیکھتا رہ گیا۔

اب تو میرا غصّہ اپنے عروج پر تھا اور میں فقیر کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج کل کے زمانے میں تو نیکی کرنا بھی مصیبت مول لینا ہے۔ اس کے ساتھ

فرمان پورہ اچل پور

نیکی کی اُسے روپیا دیا اتنی دیر میں بس نکل گئی، اب یہاں دو گھنٹے تک جھک مارتے رہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ نیکی کرو تو اُس کا پھل ملتا ہے یہاں تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی مصیبت ہی ملتی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیرات کر کے ہم مصیبت خریدتے ہیں۔

غرض میں اسے دل ہی دل میں جتنا سنا سکتا تھا سناتا چلا گیا، کیونکہ اُس وقت بری طرح سے جھنجھلایا ہوا تھا۔ ویسے اگر میری جگہ آپ ہوتے تو آپ کی حالت بھی مجھ سے الگ نہ ہوتی۔ خیر اب تو صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے۔

دوسری بس کے جانے میں دو گھنٹے تھے اس لیے میں قریب کے ایک ہوٹل میں گیا اور چائے کا آرڈر دے کر اخبار دیکھنے لگا۔ چائے پینے کے بعد بھی میں بہت دیر تک اخبار دیکھتا رہا۔ کیونکہ ہوٹل سے باہر جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ باہر اچھی خاصی بارش ہو رہی تھی۔

جب اخبار دیکھ چکا تو پھر میں نے ہوٹل والے کو کافی لانے کے لیے کہا اور خود غزلیں سننے لگا۔ بارش ختم ہو چکی تھی اور موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ اتنے میں کافی آگئی اور اس کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے جگجیت کی غزلوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔

جب بیتول جانے والی بس آگئی تو میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور بِل ادا کر کے باہر آیا۔ بس میں گھس کر ایک سیٹ پر اپنا بیگ رکھ دیا اور ٹکٹ لینے کے لیے کنڈکٹر کے پاس چلا گیا۔ ٹکٹ لے کر میں اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ چونکہ بس کا ٹائم ہو چکا تھا اس لیے تھوڑی ہی دیر بعد بس چل پڑی۔ جب بس شہر سے باہر نکل آئی تو میں نے اپنے بیگ سے ایک میگزین نکالا اور اُس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

بس بڑی تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ "بہرم" کے بعد بس کوہ ست پڑا" میں داخل ہو گئی اور پھر ست پڑا کے پُرپیچ راستے شروع ہو گئے، اب مہاراشٹر کی سرحد ختم ہو گئی اور بس مدھیہ پردیش میں داخل ہو گئی۔ میں نے میگزین رکھ دیا اور باہر دیکھنے لگا۔ چاروں طرف ہرا بھرا میدان نظر آرہا تھا۔ بارش ختم ہو گئی تھی اور قوسِ قزح نکل آئی تھی، جو پہاڑیوں میں اتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی کہ میں وہ منظر بیان نہیں کر سکتا، کاش میں ایک مصوّر ہوتا تو اُس کی تصویر کشی ضرور کرتا۔

چھوٹے چھوٹے پہاڑی گانو آتے، بس چند لمحوں کے لیے رُکتی کچھ مسافر اترتے کچھ چڑھتے اور بس پھر اپنی منزل کی طرف چل پڑتی۔ کبھی وہ ہزاروں فٹ اوپر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جاتی تو وہ پیچ دار راستے یکے بعد دیگرے نظر آتے جس پر چل کر بس اوپر پہنچی ہے اور کبھی وہ نیچے اترنا شروع کرتی تو معلوم ہوتا کہ کسی کھائی میں جا رہی ہے۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا اور شام کے تاریک سائے پھیلتے گئے۔

بارش پھر شروع ہو چکی تھی۔ ڈرائیور نے بس کی رفتار کم کر دی اور دھیرے دھیرے اطمینان کے ساتھ بس چلانے لگا۔ کیونکہ اونچا نیچا اور خم دار پہاڑی راستہ تھا اگر ذرا سی بھی غلطی ہو جاتی تو بس سلپ ہو سکتی تھی۔

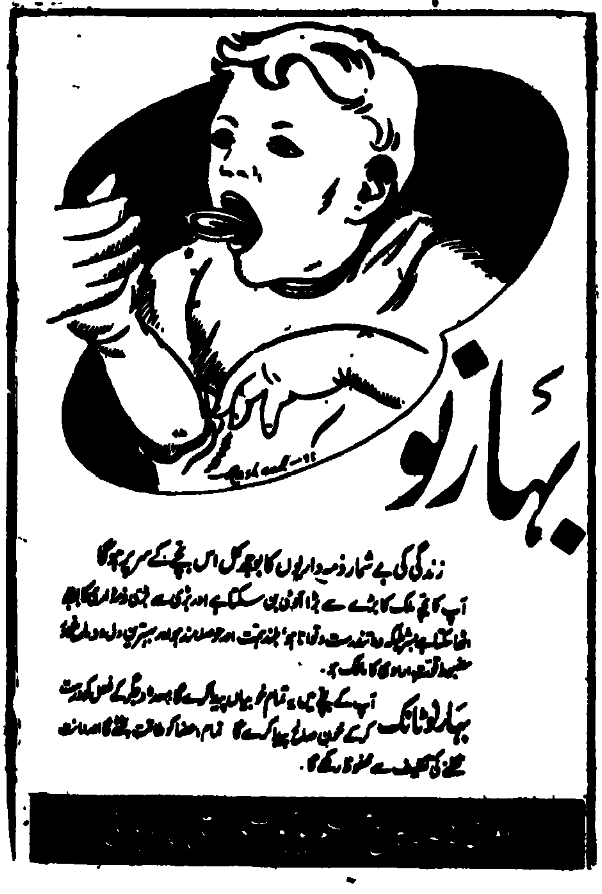
آخر خدا خدا کر کے "تاپتی" آیا۔ یہ ایک چھوٹا سا گانو ہے۔ یہاں ایک مندر ہے۔ چونکہ یہاں تاپتی ندی بہتی ہے اسی لیے اس گانو کا نام بھی تاپتی پڑ گیا۔ بس والے یہاں کے مندر میں جا کر ناریل ضرور پھوڑتے ہیں اور جب وہ تاپتی گھاٹ پار کر لیتے ہیں تو مسافروں میں بانٹ دیتے ہیں کیونکہ اس راستے میں تاپتی گھاٹ ہی سب سے خطرناک اور بڑا گھاٹ ہے جسے پار کرنے کے لیے بس کو ۲۵ منٹ درکار ہوتے ہیں۔

ہماری بس کا کنڈکٹر بھی اُترا، اُس نے بھی مندر میں جا کر پوجا پاٹ کیا اور ناریل پھوڑا اور پھر بس دھیرے دھیرے تاپتی گھاٹ میں آگے بڑھنے لگی۔ بس اب پوری چڑھائی مکمل کر چکی تھی اور اُسے اب نیچے ڈھلان میں اُترنا تھا کہ اچانک ڈرائیور نے بریک لگائے اور بس رُک گئی۔ سامنے دو بسیں اور تین ٹرک اور کھڑے ہوئے تھے اور بہت سے لوگوں کا ہجوم نظر آرہا تھا۔ ہماری بس کا ڈرائیور، کنڈکٹر اور بہت سے مسافر اُتر پڑے، میں بھی اُترا اور جا کر اُن لوگوں کی باتیں سننے لگا۔

ایک آدمی بتار ہا تھا کہ ہماری بس سے پہلے جو بس ۱۲ بجے پلر سے بیتول کے لیے روانہ ہوئی تھی، اُس کے بریک فیل ہوگئے اور وہ ایک ہزار فٹ گہری کھائی میں گر پڑی۔

یہ سن کر میرا سر چکرا گیا اور میں سوچنے لگا کہ اگر میں اس لنگڑے فقیر کو خیرات دینے کے چکر میں لیٹ نہ ہوتا اور اسی بس میں سفر کرتا تو میرا بھی حشر دوسرے مسافروں سے جدا نہ ہوتا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ایک ہزار فٹ نیچے گرنے کے بعد بس کا اور اس کے مسافروں کا کیا حشر ہوا ہوگا لیکن خدا نے اس فقیر کو میرے لیے فرشتہ بنا کر بھیجا تھا۔ فرشتہ ۔ رحمت کا فرشتہ۔

بار بار اُس فقیر کا سراپا میری نظروں میں گھومنے لگا، جسے میں نے جو دل میں آیا کہہ ڈالا تھا۔ لیکن اب وہ مجھے بہت عظیم نظر آر ہا تھا اور وہ کاغذ کا حقیر سا نوٹ مجھے میری زندگی کا پروانہ لگ رہا تھا۔



شمشت سجاد پاشا

ہمارا اسکول

(۱) روشن روشن پیارا پیارا
دور گگن پر جیسے تارا
مستقبل کا یہ گہوارا
علم کا ہے یہ اِک مینارا
ایسا ہے اسکول ہمارا

(۲) رنگ ہے اس کا اُجلا اُجلا
کھڑا ہو جیسے کوئی بنگلا
جب بھی یہاں کا گھنٹہ بولا
نیا ورق جیون کا کھولا
ایسا ہے اسکول ہمارا

(۳) پھول سے چہرے بڑے سجیلے
کپڑے اُجلے نیلے پیلے
چھٹی کے یہ کریں نہ حیلے
چست ذہن اور بول رسیلے
ایسا ہے اسکول ہمارا

(۴) بچے جب اسکول میں پہنچیں
اپنی جگہ تہذیب سے بیٹھیں
فر فر پچھلا پاٹھ سنائیں
نیا سبق اور املا سیکھیں
ایسا ہے اسکول ہمارا

(۵) چھوڑ دو سارا کھیل تماشا
من میں لے کر علم کی آشا
کر کے نیک تمنا ہم سب
آ کر چلیں اسکول کو پاشا
ایسا ہے اسکول ہمارا

۹ بنگالی بازار، [illegible] کلکتہ ۲۳

ڈوگل بھارتی

سخی کی تلاش

اکبر بادشاہ کا دربار بھرا تھا۔ اُس کے نورتن اس کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ اکبر کو درمیان ہی میں نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے اچانک بیربل کو آواز دی۔ اپنے گلے سے نورتنوں کا انمول ہار نکالا اور بولا "بیربل! راجدھانی میں جو سب سے سخی آدمی آدمی ہوگا، اسے یہ دے دو۔"

بیربل بولا "حضور! دیالو آدمی تلاش کرنے کے لیے مجھے تھوڑا سا وقت چاہیے۔ اِس کام کے لیے مجھے ایک ہفتہ کی مہلت دیجیے۔ آٹھویں روز میں وہ دیالو آدمی دربار میں حاضر کر دوں گا۔"

دربار برخاست ہوا۔ دوسرے دن سے بیربل دیالو آدمی کی تلاش میں نکلا۔ راستے سے گزرتے وقت اُسے انسانوں کے جھنڈ کے جھنڈ نظر آئے۔ اُن میں سے کسی کے ہاتھ میں کپڑے تو کسی کے ہاتھ میں اناج کی تھیلیاں تھیں۔ کسی کے ہاتھوں میں زیورات تو کسی کے نقد پیسے! جگہ جگہ معلومات حاصل کی تو پتا چلا کہ دربار کا ہر نورتن ہار کے لالچ میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اپنی سخاوت دکھا رہا تھا۔

بیربل راجدھانی میں چھ دن خوب گھوما مگر اس کو سخی آدمی نظر نہیں آیا جو ہار کے قابل ہو۔ ساتویں دن شام گھر جانے لگا تو راستہ میں ایک اندھا بھکاری دکھائی دیا۔ قریب ہی ایک لاری پر ایک آدمی گا رہا تھا۔ اُس کی آواز ایسی تھی ہی کہ بیربل بھی رک گیا۔ دھیرے دھیرے لوگوں کی بھیڑ بڑھنے لگی۔ گانے والے کے سامنے پیسوں کا ڈھیر جمع ہو گیا۔ گانا ختم ہوا، لوگوں کی بھیڑ چھٹنے لگی، بیربل نے دیکھا کہ گانے والے نے سامنے کے پیسے جمع کیے اور وہ اندھے کے پاس آیا۔ وہ سب پیسے اُس نے اندھے کو دیے۔ اپنے پاس کا یک تارا بھی اس نے اندھے کے حوالے کیا۔ "اللہ تمھارا بھلا کرے" بھکاری بدبدایا۔

گانے والا آدمی وہاں سے چلا گیا اور ملنے والے پیسوں میں سے ایک پیسا بھی اپنے پاس نہیں رکھا۔ بیربل اِس اندھے بھکاری کے پاس گیا اور اُس سے پوچھا "یہ گویا کون تھا؟"

اندھے نے کہا: "کون ہے خدا جانے! مجھے تو لگتا ہے کوئی کوئی فرشتہ ہے۔ اللہ اُس کا بھلا کرے!"

"آج ہی آیا ہے کیا یہ گویا؟" بیربل نے پوچھا۔ فقیر نے جواب دیا: "آتا ہے کبھی کبھی۔"

"بڑا مہربان ہے گویا تم پر!" بیربل نے تعجب سے پوچھا "بات کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔" اندھا بھکاری بولا۔ "یہ تو بتاؤ یہ فرشتہ تمھاری مدد کیوں کرتا ہے؟"

"بتاتا ہوں مہاراج! وجہ یہ ہے کہ میں بھی کبھی گویا تھا۔ یک تارا پر گاتا اور بیسیوں بچوں کا پیٹ بھرتا تھا۔ اس طرح میرے دن گزر رہے تھے۔ پھر میری بیوی مر گئی، بچے بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بڑھاپے میں مجھے کون سنبھالتا؟ اس لیے یہاں آیا۔ میرا یک تارا اِس فرشتہ نے دیکھا اور اُس نے مجھ سے کہا، تمھیں گانا آتا ہے کیا؟ میں نے کہا، آتا تھا۔ مگر اب اِس بڑھاپے میں گایا نہیں جاتا۔ باتوں باتوں میں اِس فرشتے نے میری حقیقت جان لی۔ اُس نے کہا کوئی فکر نہ کرو اور میرا یک تارا لے کر وہ گانے لگا۔ اس لیے کہتا ہوں خدا ہی نے اُسے بھیجا ہے مرے پاس۔ یہ دیکھو جھولی

ڈڈولی۔ رائے گڑھ (مہاراشٹر)

پیسوں سے کتنی بھری ہے۔ اس کی یہ مہربانی ہے۔"

دوسرے دن سویرا ہوا، دربار بھرا۔ بیربل ایک جانب جاکر خاموش بیٹھ گیا۔ اکبر بادشاہ دربار میں آیا۔ آتے ہی اُس نے بیربل کو آواز دی۔ بیربل ادب سے آگے بڑھا۔ اکبر نے پوچھا؟ بیربل تم نے سخی آدمی تو ڈھونڈ نکالا ہوگا۔ آج سات دن ختم ہو گئے۔"

"جی حضور! میں بھولا نہیں ہوں۔ سچا سخی ملا ہے اور آپ کے دربار میں حاضر ہے وہ۔" یہ کہہ کر بیربل اُٹھا۔ اس کے ہاتھ میں وہ رتن مالا تھی۔

کون ہے وہ دیالو آدمی، یہ دیکھنے کے لیے اکبر بے چین ہو گیا۔ سب نورتن اس اُمید میں تھے کہ ہار اُن کو ملے گا کیونکہ پچھلے سات دنوں میں ان سب نے دریا دلی کی خوب نمائش کی تھی۔ لیکن سب کو مایوسی ہوئی۔ کیونکہ بیربل سیدھا تان سین کے پاس پہنچا اور اُس کے گلے میں مالا ڈال دی۔

پھر بیربل نے اندھے بھکاری اور گویے کی کہانی بادشاہ کو سنائی۔ اس نے کہا "مہاراج وہ گویا — تان سین تھا۔ ایک بھکاری کی مدد کے لیے تان سین نے اپنا رتبہ تک نہیں دیکھا اور نہ جانے کب سے اس بھکاری کی مدد کررہا ہے۔

(مراٹھی سے ترجمہ)

سلطانہ واحدی

اچھی قسمت



مجید اور حمید اپنی ماں کے ساتھ ایک گانو میں رہتے تھے اُس گانو کے کنارے ایک دریا بہتا تھا۔

گرمیوں کا موسم تھا، اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں مجید اور حمید بے حد خوش تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب تمام چھٹیوں میں ہم کھیلیں گے، دریا میں خوب نہائیں گے کہ اُن کی ماں نے کہا یہ اچھا ہے کہ گرمی ہے اور ہم لوگوں کو کھیت اور گھر میں ڈھیروں کام ہے اب تم دونوں کو چاہیے کہ آدھا دن کام کرو اور آدھا دن کھیلو مجید اور حمید کو اپنی امّی کی یہ بات بہت ناگوار گزری کیونکہ اُن دونوں بچوں کو کام سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں تھی بس اُن کا تو دل چاہتا تھا کہ ہر وقت کھیلتے ہی رہیں۔ ایک دن اُن کی امّی نے کہا "ظہر تک احاطے کی تمام گھاس کاٹ کر ایک جگہ جمع کر دو"۔ مجید اور حمید احاطے میں گئے لیکن وہاں پہنچ کر بجائے کام کرنے کے کھیلنے میں مشغول ہو گئے۔ ظہر کے وقت اُن کی ماں احاطے میں آئیں تو دیکھا کہ اُن دونوں نے صبح سے اب تک کوئی کام نہیں کیا ہے صرف کھیلنے میں مصروف ہیں تو وہ بہت خفا ہوئیں اور بولیں: "تم نے صبح سے اب تک کیا کام کیا ہے؟ بہت اچھا... اب دوڑو اور اپنی خالہ کے گھر جا کر وہاں سے ہنسیا لے آؤ اور اگر پھر کھیلے اور جلدی نہ لوٹے تو میں تمھیں دوپہر کا کھانا نہیں دوں گی۔

حمید اور مجید کی خالہ کا گھر بہت ہی دور تھا۔ دوپہر کا وقت تھا، لُو کے جھکڑ چل رہے تھے ایسی سخت گرمی میں دونوں کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ خالہ کے گھر جائیں چار و ناچار اپنے گھر سے باہر آئے اور دریا کے کنارے چل پڑے۔ کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ حمید نے کہا: "ارے بھائی میں تو تھک گیا، جانتے ہو مجید مجھے بہت زور سے بھوک لگ رہی ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ درخت کے سایے میں ذرا بیٹھ کر سستا لوں"۔

مجید نے کہا: "نہیں، ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس سخت گرمی میں بھی خالہ کے گھر جانا چاہیے اور اگر ہم گھر جلدی نہ لوٹے تو امّی ہم کو کھانا نہیں دیں گی"۔

لیکن حمید دریا کے کنارے درخت کے سایے میں بیٹھ گیا اور اپنے پانو دریا میں ڈال دیے اور پھر گھاس پر لیٹ گیا ساتھ ہی مجید سے بولا "آؤ بھائی تھوڑا آرام کریں پھر خالہ کے گھر چلیں گے۔ مجید بھی آکر ہری بھری ٹھنڈی گھاس پر لیٹ گیا اور اپنے پانو دریا میں ڈال دیے۔ حمید بولا: "دیکھو مجید اگر ہماری قسمت اچھی ہوگی تو ہمارے لیے یہیں ایک بہترین کھانے کا دسترخوان حاضر ہو جائے گا اور پھر ہم دونوں کھائیں گے"۔

مجید نے کہا، امّی کہتی ہیں کہ "اچھی قسمت صرف اُن ہی لوگوں کی ہو سکتی ہے جو کاہلی نہ کریں بلکہ جو کام دیا جائے اُسے ٹھیک طرح سے انجام دیں"۔ حمید بولا "نہیں بھائی نہیں اچھی قسمت میں کام وام کا کوئی دخل نہیں۔ دیکھو نا..... اگر ہماری قسمت اچھی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ کام کریں"۔

ڈی-۲۳- اسٹاف کوارٹرز جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

چچا مُراد ایک بوڑھے آدمی تھے اور ان کا گانو مجید اور حمید کے گانو کے اوپری پہاڑی علاقے میں تھا وہ بہت ہی محنتی آدمی تھے ہر روز صبح سے شام تک اپنے کھیت پر کام کرتے تھے جب کبھی اُن کے کھیت میں کام نہیں ہوتا تو وہ دوپہر کا کھانا لے کر اپنی ناؤ میں سوار ہوتے اور مچھلی کا شکار کرنے کے لیے چل پڑتے۔

اُس روز صبح انھوں نے اپنا تمام کام جلدی جلدی کرلیا اور ظہر کے قریب اپنا کھانا ایک دسترخوان میں لپیٹ لیا مچھلی مارنے کا کانٹا اُٹھایا اور اپنی ناؤ میں سوار ہو کر مچھلی کا شکار کرنے کے لیے چل پڑے۔

چچا مراد اپنی ناؤ کو چلاتے ہوئے جب دریا کے بیچ پہنچے تو انھیں ڈھیروں مچھلیاں نظر آئیں تو وہ اپنی ناؤ کو دریا کے کنارے لے آئے اور ناؤ سے اترے تو دیکھا تین چار گائیں کھڑی چر رہی ہیں چچا مراد نے سوچا جب تک یہ گائے یہاں کھڑی رہیں گی تب تک میں ٹھیک طرح سے مچھلی نہیں مار سکوں گا لہٰذا وہ گائے ہنکانے کے لیے وہاں گئے دریا کے کنارے ہریالی کی وجہ سے گائے وہاں سے جانا نہیں چاہتی تھیں مجبوراً چچا مُراد نے انھیں ایک ایک کر کے بھگایا۔ جب وہ گائے ہنکا کر لوٹے تو دیکھا کہ وہاں سے ناؤ غائب، اچانک انھیں یاد آیا کہ جاتے وقت وہ ناؤ کو باہر گھسیٹنا بھول گئے تھے۔ شاید پانی کے بہاؤ کے ساتھ ناؤ بہہ گئی۔ بے چارے چچا مراد بہت ہی رنجیدہ خاطر ہوئے اور خود کو ہی لعنت ملامت کرنے لگے کہ اب ناؤ پتا نہیں کہاں بہہ کر گئی ہے اور نہ جانے کتنی دور تک تلاش کرنے کے لیے جانا پڑے گا۔

حمید اور مجید اُسی طرح دریا کے کنارے آرام کر رہے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک اُن کے پانو سے کوئی چیز ٹکرائی دونوں ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

اُن کے پانو سے ٹکرانے والی چیز چچا مراد کی ناؤ تھی ناؤ آہستہ آہستہ ڈگمگاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ تھوڑا اور آگے بڑھی اور اُن کے پانو سے لگ کر رک گئی۔

حمید نے ناؤ میں جھانکا تو اُس کی نظر میں دسترخوان پر پڑی وہ فوراً اٹھا اور ناؤ کو دریا سے باہر گھسیٹ لایا اور اُس میں سے دسترخوان نکالا اور جو کھول کر دیکھا تو اُس میں کھانا تھا۔ مارے خوشی کے چلا پڑا، مجید۔۔۔۔ دیکھو کتنا بڑھیا کھانا۔ میں نے تم سے کہا تھا نا۔۔۔ کہ اگر ہماری قسمت اچھی ہوگی تو ہمیں ایک عدد بڑھیا کھانے کا ہمراہ دسترخوان حاضر ہو جائے گا تاکہ میں اور تم کھا سکیں۔ دیکھا نا ہماری قسمت کتنی اچھی ہے آؤ بیٹھو کھانا کھائیں۔ مجید اور حمید بیٹھ کر چچا مراد کا کھانا کھانے لگے ابھی کھانا ختم بھی نہ کر پائے تھے کہ چچا مراد اپنی ناؤ تلاش کرتے کرتے اِدھر آ پہنچے انھوں نے دیکھا دو بچوں نے ان کی ناؤ کو باہر گھسیٹ رکھا ہے اور مزے سے کھانا کھا رہے ہیں۔

چچا مراد غصّہ سے چلا کر بولے: "بدتمیز بدبخت بچو تم کیوں میرا کھانا کھا رہے ہو؟" مجید نے کہا آپ کا کھانا؟ ہم نے کب آپ کا کھانا کھایا؟ وہ تو ہماری قسمت اچھی تھی کہ کھانا خود بخود ہمارے پاس آگیا۔ چچا مراد بپھر کر بولے: "اے کاہل اور پیٹو بچو تم میرا کھانا کھا رہے ہو اور اُس پر یہ بھی کہہ رہے ہو کہ ہماری قسمت اچھی تھی میں تم کو ابھی بتاتا ہوں کہ اچھی قسمت کیا چیز ہوتی ہے! اب میں یہاں بھوکے پیٹ ٹھہر کر مچھلی نہیں مار سکتا اور نا ہی اب مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ چپو چلا کر گھر جاؤں۔ چلو جلدی کرو ناؤ میں بیٹھو اور چپو چلا کر مجھے میرے گھر تک پہنچاؤ پھر وہاں سے پیدل اِس کڑی تپتی دھوپ میں گھر لوٹو۔ تب تم کو اپنی اچھی قسمت کا ٹھیک طرح سے اندازہ ہو جائے گا۔

حمید نے کہا "چچا مراد دیکھیے، ہمیں آپ کے گھر تک جانے اور پھر وہاں سے لوٹنے میں شام ہو جائے گی اور ہماری امّی ہم پر بہت خفا ہوں گی۔"

چچا مراد نے کہا گھبراتے کیوں ہو؟ راستے میں خود ہی تمھاری ماں کو تمھاری حرکتوں کی اطلاع دوں گا۔

مجید اور حمید چچا مراد کی ناؤ میں سوار ہو گئے اور کڑی تپتی دھوپ میں چپو چلا کر چچا مراد کو اُن کے گھر تک پہنچایا۔ وہاں سے مجبوراً دونوں کو پیدل گھر لوٹنا پڑا۔ جب دونوں گھر پہنچے تو شام ڈھل چکی تھی۔ اُن کی امّی تمام معاملے کی تہہ تک

پہنچ چکی تھیں۔ انھوں نے مجید اور حمید کو خوب اچھی طرح سے ڈانٹ پلائی اور رات کا کھانا نہیں دیا۔ دونوں بچے بھوکے، پیاسے اور تھکے ہوئے بستر پر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ تو حمید نے کہا مجید ہماری امّی بالکل ٹھیک کہتی ہیں کہ اچھی قسمت صرف ان لوگوں کی ہوسکتی ہے جو ہیری اور تمھاری طرح نہ تو کاہل ہوتے ہیں اور نہ لاپروا۔

اقوالِ زرّیں

عقل جیسی کوئی دولت نہیں۔ جہالت جیسی کوئی غریبی نہیں۔ (لقمان حکیم)

جھوٹ تمام گناہوں کی ماں اور سچ سبھی برائیوں کا علاج ہے۔ (سقراط)

علم کی مثال دریا کی سی ہے۔ اس میں سے کتنا ہی خرچ کروگے گھٹے گا ہی نہیں۔ (سلمان فارسیؓ)

اس دور میں ایمان دار وہی ہے جسے بے ایمان بننے کا موقع نہ ملا ہو۔ (مفکر)

اگر تم ایک مرد کو تعلیم دیتے ہو تو وہ ایک شخص کی تعلیم ہے۔ لیکن اگر تم ایک عورت کو تعلیم دیتے ہو وہ ایک کنبے کی تعلیم ہے۔ (مفکر)

(ریحانہ خاتون، قاسمی منزل، ضلع پورنیہ، بہار)

قاضی حسن رضا

جھولا کتنا اچھا ہے

جھولا کتنا اچھا ہے
اس کو اُڑنا آتا ہے
جب بھی جھولا جھولے ہے
بچّا رونا بھولے ہے
یہ جھولا تو ایسا ہے
اڑن کھٹولے جیسا ہے
جب یہ اونچا جاتا ہے
دل کچھ ڈر سا جاتا ہے
راکٹ ہے یہ بچّوں کا
قیمت میں لیکن سستا
دو رسّی میں بن جائے
پھر بھی سب کے من بھائے
پکنک پر جب جائیں بڑے
جھولا جھولیں کھڑے کھڑے
پھر دیکھو جھولوں کی اڑان
چھوتا ہے آکاش انسان

قاضی پور، کھنڈوا

منا النصر

شہزادہ اور تین دوست

ایک مرتبہ کسی ملک میں ایک شہزادہ اور اس کے تین دوست رہتے تھے۔ ایک دوست بہت لمبے پیر رکھتا تھا اور بہت تیز دوڑ سکتا تھا۔ دوسرا دوست تیز آنکھیں رکھتا تھا اور بہت دور تک دیکھ سکتا تھا۔ تیسرا دوست بہت موٹا تھا اور ایک وقت میں بہت سی چیزیں کھا پی سکتا تھا۔ لمبے پیر والے کا نام "لمبوترا"۔ "تیز آنکھ والے کا نام "تیز انکھا" اور موٹے آدمی کا نام "موٹو" تھا۔

اسی شہر میں ایک خوبصورت شہزادی رہتی تھی جس کے ساتھ بہت سے نوجوان شادی کی تمنا رکھتے تھے۔ لیکن شہزادی کا باپ جادوگر تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہزادی کی شادی ہو۔ جادوگر بادشاہ تین سوال رکھتا تھا ہر روز وہ شہزادی کو جادو سے چھپا دیتا تھا۔ وہ شہزادوں کے پاس جاتا اور شہزادی کو کھوج کر لانے کے لیے کہتا اگر شہزادی کو کھوج کر نہیں لاتے تو بادشاہ جادو کے زور سے شہزادوں کو پتھر میں تبدیل کر دیتا تھا۔

ہمارا شہزادہ اور اس کے دوست بھی بادشاہ کے پاس گئے۔ بادشاہ نے کہا " یہ امتحان کا پہلا حصہ ہے، میں شہزادی کو چھپائے دیتا ہوں اسے تلاش کرو اور سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے اسے لے کر میرے محل میں حاضر ہو جاؤ۔"

شہزادے نے اپنے دوستوں سے مدد کرنے کو کہا۔ تیز انکھا نے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا اور کہا۔ " میں دیکھ سکتا ہوں شہزادی کو۔ وہ ایک سو میل کی دوری پر ہے۔ میں دیکھ سکتا ہوں، شہزادی ایک پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھی ہے۔" اب شہزادے نے " لمبو" سے کہا " لاؤ اسے بادشاہ کے محل میں "۔ لمبو تیزی سے دوڑتا ہوا گیا اور شہزادی کو اپنے بازوؤں میں لیے ہوئے تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا واپس آیا۔ شام ہونے سے پہلے سب شہزادی کو لے کر بادشاہ کے پاس پہنچے۔ بادشاہ یہ دیکھ کر جھنجھلا گیا اور کہا:

" تم اس وقت کامیاب ہو گئے لیکن کل اس سے بھی سخت امتحان لوں گا۔"

دوسرے دن وہ شہزادے کے پاس گیا اور کہا " یہ امتحان کا دوسرا حصہ ہے میں شہزادی کو چھپائے دیتا ہوں اور رات ہونے سے پہلے اسے میرے پاس لاؤ۔"

ایک بار پھر تیز انکھا نے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ " میں دیکھ سکتا ہوں شہزادی کو کوئی دو سو میل دور۔ بادشاہ نے اسے بدل دیا ہے پتی میں۔ میں دیکھ سکتا ہوں پتی کو ڈال پر لٹکا ہوا۔ میں دیکھ سکتا ہوں پتی کو ہوا میں ہلتے ہوئے۔" اس لیے لمبا پیر والا دوڑتا ہوا چلا گیا اور رات ہونے سے پہلے شہزادی کو اپنے بازوؤں میں لیے ہوئے واپس آیا۔ بادشاہ کو یہ دیکھ کر پہلے سے زیادہ حیرت ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ اور کہا " کل اس سے بھی سخت امتحان تمھارے لیے تیار کروں گا۔"

تیسرے دن وہ شہزادے کے پاس گیا اور کہا " آج تم ضرور اس امتحان میں فیل ہو جاؤگے یہ سب سے سخت امتحان ہے۔ میں نے شہزادی کو چھپا دیا ہے۔ تیسری مرتبہ جاؤ اسے تلاش کرو اور رات ہونے سے پہلے میرے پاس لاؤ۔"

پھر تیز انکھا نے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا اور کہا " میں دیکھ سکتا ہوں شہزادی کو ایک جھیل کی تہہ میں۔ بادشاہ نے اسے بدل دیا ہے ایک مچھلی میں۔" چاروں دوست جھیل کے پاس پہنچے بار بار وہ لوگ غوطہ مار مار کر تھک گئے لیکن مچھلی کو پکڑنے میں ناکام رہے۔

" اب میری باری ہے" موٹو نے کہا اور اس نے پانی کو پینا شروع کیا۔ پیتا رہا اور پیتا رہا جب تک کہ جھیل پانی سے خالی نہ ہو گئی۔ تب شہزادے نے جلدی سے مچھلی کو پکڑا اور اسے ایک شہزادی کی شکل میں تبدیل کر لیا۔ وہ لوگ واپس آئے بادشاہ کے پاس۔ جب بادشاہ نے انھیں شہزادی کے ساتھ آتے دیکھا تو اسے بہت زیادہ غصہ آیا اور پھر وہ ایک کوے کی شکل میں تبدیل ہو کر اڑ گیا۔

اس کے بعد شہزادہ اور شہزادی اور شہزادے کے تینوں دوست ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔

معرفت اسٹار اسٹوڈیو۔ باٹن روڈ، آسنسول۔ ۷۱۳۳۰۱



مجاز منصور صدیقی
مشغلہ: کہانیاں پڑھنا، پُرانے، نایاب سکّے جمع کرنا۔
پتا: راحت ہومیو، سردار روڈ، ہزاری باغ۔ ۸۲۵۳۰۱ بہار

محمد اسلم ناگوری عمر ۱۲ سال
شوق: قلمی دوستی کرنا، نماز پڑھنا
پتا: محمد اسلم کرانا اسٹور۔ راجیندر مارگ مہدپور ضلع اجین

محمد انور عادل عثمانی عمر ۱۴ سال
مشغلہ و شوق: قلمی دوستی کرنا خط و کتابت کرنا وغیرہ۔
پتا: معرفت محمد منیرالدین محلہ پتیا نہ نزدیک اسٹیٹ بینک آف انڈیا۔ کلٹی۔ بردوان

نواب عتیق اطہر زاہدی عمر ۱۴½ سال
مشغلہ: والد اور والدہ کا دل نہ دکھانا بلی کی بولی بولنا۔
پتا: اطہر نیکیتن۔ گرجہ باڑہ۔ رانی گنج۔ بردوان (ویسٹ بنگال)

جمشید احمد اعظمی عمر: ۱۲ سال
مشغلہ: قلمی دوستی کرنا، فٹ بال کھیلنا، پیام تعلیم کا بڑے شوق سے مطالعہ کرنا۔
پتا: جمشید احمد کیرآف عبدالباقی کیرانہ مرچنٹ جمال پورہ مئوناتھ بھنجن،

محمد نسیم اختر،
مشغلہ: قلمی دوستی کرنا۔ فٹ بال کھیلنا۔ وقت پر اسکول جانا۔
پتا: نیچو گرام، کوارٹر نمبر 3 ۱۹A پوسٹ کلٹی۔ ضلع بردوان

محمد عالم عمر ۱۲ سال
مشغلہ و شوق: وقت پر اسکول جانا۔ سائنسی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔
پتا: شاہی محلہ نمبر ا پوسٹ کلٹی۔ ضلع بردوان۔



نوکر: صاحب! دُکان دار بل کے پیسے لینے آیا ہے۔
صاحب: تو تم نے کہا نہیں کہ صاحب باہر گئے ہیں۔
نوکر: صاحب کہا تو تھا مگر وہ مانتے ہی نہیں۔
صاحب: اچھا تو میں خود ہی جاکر کہے دیتا ہوں۔

آفتاب احمد
بمبئی

ایک شخص (دوسرے سے) اس کتّے سے نہ ڈریے۔ اندر تشریف لے آئیے۔ دوسرا شخص "یہ کاٹتا تو نہیں؟" پہلا یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کیونکہ میں نے اسے آج ہی خریدا ہے۔

رنگریز جمیل احمد محمد ابراہیم شولاپور

باپ نے لڑکے کی اسکول کی رپورٹ پڑھتے ہوئے کہا "حساب میں کمزور، انگریزی میں فیل، ہندی میں صفر، املا خراب، جملے غلط۔ آخر یہ سب کیا ہے؟"
لڑکا: ذرا آخری سطر بھی پڑھ لیجیے۔ لکھا ہے۔ صحت بہترین۔

محمد اقبال۔ مومن پورہ۔ محبوب نگر۔

ماسٹر صاحب: حمید سے، آج تمھیں اسکول آنے میں کیوں دیر ہوئی۔
حمید: سر، وہ احمد کی چوّنی کھو گئی تھی۔ ماسٹر صاحب (غصّے سے) تو تم کیا کر رہے تھے۔ حمید: سر، میں چوّنی پر پیر رکھے کھڑا تھا۔

باسط احمد خاں۔ ناندیڑ



مارچ ۱۹۸۳ء کا پیام تعلیم نظر نواز ہوا۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب پیام تعلیم کے لیے اپنی نظم موزنامہ بھیج کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بڑے ادیب صرف بڑوں کی حد تک محدود نہیں بلکہ بچوں کا بھی برابر خیال رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر حلیم کوثر چاندپوری نے یرقان سے متعلق اچھی معلومات فراہم کی ہیں۔ دوشکاری میں اب جان آرہی ہے۔ اس کے علاوہ، الف قدم، نادم سیتاپوری، اشفاق اختر، ڈاکٹر قنبر رضوی، سکندر ضمیر، آدم ناگپوری، اور بچوں کی کوششیں سبھی کامیاب ہیں۔

عبدالمجید آنیکل
ابن عبدالشکور، ریٹائرڈ میل اورسیر آنیکل ۵۶۲۱۰۶ ضلع بنگلور

✿

پیام تعلیم کا مارچ ۱۹۸۳ء کا شمارہ نظر سے گزرا۔ میں نے ایک ہی نشست میں پورا پڑھ ڈالا۔ احمد بھائی کی کارٹونی کہانی بہت پسند آئی۔ سکندر ضمیر اور اشفاق اختر کی نظمیں بھی اچھی لگیں۔ دوسرے مضامین بھی قابل تعریف ہیں۔
محمد اقبال حسین
پتیانہ۔ کلٹی (مغربی بنگال)

✿

اس بار سرورق بہت شان دار ہے۔ محترمہ بہن امۃ الرحمٰن محسنی صاحبہ کی مسلسل کہانی دوشکاری دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ معلوماتی بھی ہے۔
آجکل ایسا لگتا ہے کہ پیامیوں نے "ننھے فن کار" کے صفحہ میں دلچسپی لینا چھوڑ دی ہے۔ میرے خیال میں "ننھے فنکار" کا سلسلہ بند کر دیا جائے تو اچھا ہے۔

محمد نذیر آفاق
۵۲۰، مسلم پور، وانیم باڑی ۶۳۵۷۵۱

✿

مجھے خاص طور سے سردار احمد علیگ کے مضمون نے زیادہ متاثر کیا۔ اسمٰعیل میرٹھی سے متعلق پیامی بچوں کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ میں اپنی طرف سے سردار احمد صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

محمد اقبال حسین
محلہ پتیانہ۔ کلٹی (مغربی بنگال)

✿

ماہ جنوری اور فروری ۸۳ء کا پیام تعلیم ملا۔ سرورق پر جب ہماری نظر پڑی تو ہمارا دل خوشی سے پھولے نہ سما سکا۔ سرورق کی فوٹو نہایت ہی خوشنما تھی۔ بچوں کی کوششیں اس عنوان کے تحت لڑکوں کے اندر کہانی لکھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ انھیں بہت بہت شکریہ میری طرف سے۔ پیام تعلیم پڑھنے والے لڑکے اس کو پڑھ کر فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اچھی طرح مطالعہ اور دھیان لگا کر پڑھنے سے ان کی معلومات میں اضافہ ضرور ہو جائے گا۔

محمد اختر عادل عثمانی
ہائی اسکول ۱۳۳/۱۴ ضلع بردوان (ویسٹ بنگال)

✿

ماہ مارچ ۱۹۸۳ء کا پیام تعلیم بہت ہی خوب صورت ڈھنگ سے شائع ہوا۔ سرورق کی تصویر بہت ہی لاجواب ہے۔ "آدھی ملاقات" کا کالم ہمیشہ برقرار رکھیے۔ احمد کمال حشمی کی کارٹونی کہانی پڑھنے کا موقع ملا۔ کہانیاں اور نظمیں بہت پُر تکلف ہیں۔

طارق جلیل
ڈالی گنج۔ لکھنؤ



مرتبہ: موثق الدین

ادھر ادھر سے

انجمن خیر الاسلام بمبئی ۸ کی شاندار کامیابی

انجمن فروغ تعلیم بھیونڈی ضلع تھانہ کے زیر اہتمام آل مہاراشٹر "سیرت النبیؐ" تقریری مقابلہ ۹ رجنوری بروز اتوار بمقام "نارنی تالاب گراؤنڈ بھیونڈی" زیر صدارت مولانا ابوظفر حسان ندوی منعقد ہوا جس میں جونیر گروپ اور سینئر گروپ دونوں کے کل ۵۸ طلبہ و طالبات نے حصہ لیا۔

اس مقابلہ میں انجمن خیر الاسلام اُردو پرائمری اسکول بمبئی ۸ گروپ میں اول آیا اور اس نے انجمن فروغ تعلیم کی جونیئر ٹرافی جیت لی۔ اس کے علاوہ جماعت سوم کی طالبہ "رقیہ سلطانہ عظیم الرحمٰن نے امتیازی نمبر حاصل کرکے دوسرے انعام اور مرحوم غنی بنارسی میموریل ٹرافی برائے طالبات کی مستحق قرار پائیں۔

قصہ گوئی کا مقابلہ

۲۶ رفروری ۱۹۸۳ء کو شعیب ستار ہائی اسکول میں قصہ گوئی کا مقابلہ ہوا جس میں مولانا آزاد ہائی اسکول کی جماعت ششم اور ہفتم کی طالبات نے حصہ لیا۔ اس پروگرام میں مسز خیر النساء انصاری اور مس صدیقہ شکری کی رہنمائی میں مولانا آزاد ہائی اسکول کی طالبات صوفیہ صغیر احمد جماعت ششم نے سوم اور نور جہاں عبادت علی جماعت ہفتم نے اعزازی انعامات حاصل کیے ہم ان طالبات اور ان کے اساتذہ کو پُرخلوص مبارکباد پیش کرتے ہیں

معرفت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بمبئی ۳



اُردو پرائمری اسکول نمبر ۲۸، چونا بھٹی، مالیگاؤں کے طالب علم محمد آصف محمد شعبان نے ۱۹ رجنوری ۱۹۸۳ء کو انجمن فروغ تعلیم بھیونڈی کے زیر اہتمام ہونے والے سیرت النبیؐ تقریری مقابلے اور ۲۰ رفروری ۱۹۸۳ء کو جے اے ٹی ٹرسٹ ہائی اسکول مالیگاؤں کی جانب سے ہونے والے سیرت النبیؐ تقریری مقابلے میں بہترین تقریر کرکے پہلا انعام حاصل کیا۔

کالا دُودھ

امریکہ کی ریاست "اوہیو" کے باشندے رابرٹ کے پاس ایک ایسی بھینس موجود ہے جو دُودھ کی طرح سفید رنگت کی مالک ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بھینس کولتار کی طرح سیاہ دُودھ دیتی ہے، لیکن اس دُودھ کی لذت عام دُودھ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ (نونہال، کراچی)

عجیب قسم کا پنجرہ

جاپان میں ایک ایسا پنجرا ایجاد ہوا ہے کہ اگر اس میں بولیے کہ کاش اس میں کوئل ہو تو کوئل آجائے گی، اسی طرح اگر کچھ اور بولیے تو وہی چیز آجائے گی۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا پتا صاف اور خوشخط اور خریداری نمبر ضرور لکھیے۔

بچوں کی کوشش



مچھلیوں کی دعا

کسی گاؤں کے قریب ایک تالاب تھا۔ اس کے کنارے ایک فقیر کا ڈیرا تھا۔ یہ فقیر دن بھر گاؤں میں بھیک مانگ کر جھولی بھر روٹی کے ٹکڑے جمع کر کے رات کو پھر اسی تالاب کے کنارے آکر آرام کرتا تھا۔

ایک مرتبہ گاؤں کے اطراف علاقوں میں زوردار قحط پڑا۔ بارش کے موسم میں آسمان سے ایک بوند پانی بھی نہیں برسا۔ ندی، نالے سوکھ گئے۔ دھوپ اس درجہ تیز تھی جیسے سورج سوا نیزے پر آگیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود تالاب کا پانی ذرا بھی کم نہ ہوا۔ حالانکہ گاؤں والوں کے علاوہ جنگلی جانور، چرند پرند سب اسی تالاب کے پانی سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔

جانوروں کے ساتھ ساتھ انسان بھی قحط سے گھبرا گئے۔ گاؤں والے اناج کے دانے دانے کے لیے ترسنے لگے۔ بچے ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گئے۔ بوڑھے ادھ مرے ہو گئے اور جوانوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ لاکھ دعائیں مانگیں مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

ایک روز گاؤں والے دوڑتے ہوئے تالاب والے فقیر کے پاس آئے اور اپنی بپتا سنائی۔ فقیر تو گاؤں والوں کے لیے روزانہ دعائیں مانگا کرتا تھا مگر اس کی دعا بھی کارگر ثابت نہ ہوتی تھی۔ وہ خود بھی خدا کے سامنے مجبور تھا۔ کچھ سوچنے کے بعد فقیر تالاب کے نزدیک گیا اور آواز لگائی: "اے مچھلیو! باہر آؤ۔" بوڑھے فقیر کی آواز سنتے ہی ساری مچھلیاں کنارے پر آگئیں۔ فقیر نے گاؤں والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ بے بس اور مجبور جو ہمارے سامنے کھڑے ہیں وہ لوگ ہیں جو روزانہ بڑے پیار سے روٹی کے ٹکڑوں سے میری جھولی بھر دیتے ہیں۔ میں اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد سارے ٹکڑے تمہیں کھلا دیتا ہوں۔ میں نے اور میرے ساتھ ہی ساتھ تم نے بھی ان لوگوں کا نمک کھایا ہے۔ آج وہ خود روٹی کے ایک ٹکڑے کو محتاج ہیں۔ کیا ایسے بُرے وقت میں اپنے محسن کے لیے تم خدا سے دعا نہیں مانگو گی؟" بوڑھے کی باتیں سنتے ہی مچھلیوں کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ساری مچھلیوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دعا مانگی۔ قدرت بے زبانوں کے دل کی بات سمجھ گئی۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھا گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے رم جھم بارش نے گاؤں والوں کے سوکھے ہوئے چہروں کو شاداب کر دیا۔ وہ خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔ مچھلیاں بھی خوشی کے مارے تالاب میں اچھل کود کرنے لگیں۔

سہیل احمد انصاری
انجمن خیر الاسلام ہائی اسکول مدن پورہ بمبئی ۸

سچ کی راہ

سچ کہو اور سچے بن جاؤ
سب کو سچ کی راہ دکھاؤ

جھوٹ بولنا چھوڑ دو تم
جھوٹ سے منہ موڑ لو تم
سچ کی چادر اوڑھ لو تم
جھوٹ کو تو تم دُور بھگاؤ
سچ کہو اور سچے بن جاؤ
ہر دم سچی بات کرو تم
جھوٹ کو سچ سے مات کرو تم
جھوٹوں سے مت بات کرو تم
سب کو سچ کا سبق پڑھاؤ
سچ کہو اور سچے بن جاؤ

احمد کمال حشمی

بی۔ ایل ۲/۱ نیا بازار کانکی نارہ ۷۴۳۱۲۶

اونٹ اور شیر

کسی جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ گیدڑ، کوا، چیتا وغیرہ اس کے نوکر تھے۔ ایک بار ایک اونٹ جنگل میں بھٹک گیا اس نے دیکھا وہاں کچھ جانور دکھائی دے رہے ہیں چل کر دیکھیں شاید وہ میری مدد کریں اور وہ اس طرف چل دیا شیر نے کہا۔ وہ کون سا جانور آ رہا ہے؟ گیدڑ نے کہا مہاراج اونٹ آ رہا ہے۔ شیر نے کہا۔ ڈرو مت دوست جنگل میں کیسے آئے؟ اونٹ بولا۔ ہم گاؤں میں پتیاں کھا رہے تھے کھاتے کھاتے یہاں آ گئے اور بھٹک گئے کیا ہم کو آپ گاؤں پہنچا دیں گے۔ شیر نے کہا تم گاؤں نہیں جاؤ اور جنگل ہی میں ہری ہری پتیاں کھاؤ کچھ دن کے بعد جنگل میں ایک ہاتھی آیا اور اس نے شور مچانا شروع کر دیا جنگل کے سب جانوروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ شیر سے رہا نہ گیا وہ ہاتھی پر ٹوٹ پڑا۔ ہاتھی بھی کم نہیں تھا شیر کا پیٹ پھاڑ ڈالا لیکن کچھ ہی دیر میں شیر نے ہاتھی کو مار گرایا۔ اب گھایل شیر اک دم کمزور ہو گیا اور بھوکا مرنے لگا۔ گیدڑ نے کوے سے کہا کیوں نہ اس اونٹ کو مار کر اپنی بھوک مٹائیں کوا بولا: نہیں نہیں ایسا نہ کہو۔ گیدڑ مہاراج کے پاس گیا مہاراج بھوک سے ہم بھی بے حال ہیں اور آپ بھی۔ کیوں نہ اس اونٹ کو مار کر کھائیں شیر نے کہا۔ خبردار۔ آئندہ ایسی بات کہی تو زبان کھینچ لوں گا۔ کچھ دیر کے بعد کوا آیا مہاراج اگر یہ بدن آپ کے کام آ جائے تو میں قربان ہو جاؤں گا۔ گیدڑ نے کہا اس سے کیا ہوگا لیجیے مجھے مار ڈالیے۔ چیتا بولا انھیں نہیں مجھے مار ڈالیے۔ اونٹ بولا۔ نہیں ان سب سے کیا ہوگا مجھے مار ڈالیے۔ وہ سب اسی موقع کی تلاش میں تھے اور سب نے مل کر اونٹ کو مار ڈالا۔

اطہر شاہین
مظفر پور (بہار)

جادو کی تلوار

پُرانے زمانے کی بات ہے۔ کسی ملک میں ایک بادشاہ رہتا تھا۔ وہ بہت ظالم تھا۔ وہ رعایا کی دیکھ بھال نہیں کرتا تھا اور لوگوں پر زیادتی کرتا تھا اس لیے تمام لوگ اُس سے تنگ آ گئے۔ اُسے شکار کھیلنے کا شوق تھا۔ روز صبح کو ناشتے کے بعد وزیر اور چند سپاہیوں کے ساتھ شکار کے لیے جنگل کی طرف نکل جاتا اور شام کو واپس آتا۔

ایک روز جب وہ شکار کھیل کر واپس آ رہا تھا تو اُس کی نظر ایک بوڑھے پر پڑی۔ وہ بوڑھا اپنی طلسمی انگوٹھی سے کھانا مانگ رہا تھا تو سونے اور چاندی کے برتن میں قسم قسم کے کھانے آ گئے، بادشاہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور اُس کے دل میں اُسے حاصل کرنے کی خواہش ہوئی تو اُس نے اپنے سپاہیوں سے بوڑھے کو قتل کرا کر انگوٹھی حاصل کر لی۔ اُس بوڑھے کا ایک بیٹا تھا جب اس نے دیکھا کہ اس کا باپ مر گیا ہے تو اُسے بہت غصہ آیا۔ پیچھے پلٹ کر دیکھا تو ایک چمکتی ہوئی چیز نظر آئی اُس نے اُٹھا لیا وہ ایک تلوار تھی۔ اُس پر لکھا ہوا تھا شاہی تلوار۔ وہ سمجھ گیا یہ بادشاہ کا کام ہے وہ اداس بیٹھا تھا کہ اچانک ایک پری اُس کے پاس آئی اور پوچھا: کیوں اداس بیٹھے ہوئے ہو؟۔ اس ملک کے

بادشاہ نے میرے باپ کا قتل کرادیا لڑکا بولا۔ فکر مت کرو۔ تم یہ تلوار لے جاؤ اس پر حملہ کردو۔ اس تلوار میں جادو ہے جب اس کو حکم دو گے تو فوراً چلنے لگے گی۔ اس لڑکے نے پری کے کہنے کے مطابق بادشاہ کو قتل کردیا جس سے لوگوں کو ظالم بادشاہ سے نجات ملی اور انھوں نے اس لڑکے کو بادشاہ بنا دیا۔

ایس افتخار احمد
جمیل آباد۔ میل وشارم

مالک ہے تو ہمارا

تو ہے خدا ہمارا
ہم سب کا ہے سہارا

ہم سب ہیں تیرے بندے
مالک ہے تو ہمارا!

مولا تیرے علاوہ
کوئی نہیں ہمارا

جو کچھ ہمیں ملا ہے
تیرا کرم ہے سارا
خالد نے وقت مشکل
مولا تجھے پکارا

اسحاق احمد خالد
نرمل ۱۰۶ - ۵۰۴ (اے پی)

اچھی باتیں

۱۔ غصہ عقل کا دشمن ہے ۲۔ مطالعہ بہترین مشغلہ ہے۔ ۳۔ دوسروں کا انجام دیکھ کر سبق حاصل کرو۔ ۴۔ تکبّر اور غرور انسان کو ذلیل کردیتا ہے۔ ۵۔ اپنی عزت چاہتے ہو تو دوسروں کی عزت کرو۔ ۶۔ صحت کا خیال نہ رکھنا اپنے جسم کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔ ۷۔ جاہلوں کی صحبت سے پرہیز کرو۔ ۸۔ جواب دینے سے پہلے سوچو تاکہ بعد میں شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

آفتاب احمد حیدر آباد

بے وقوف کی چڑ

ایک بچہ کنویں پر بیٹھ کر مٹھائیاں کھا رہا تھا۔ اتفاقاً اندر جھانکا تو اس کو اپنا عکس نظر آیا وہ سمجھا کوئی لڑکا للچائی نظر سے دیکھ رہا ہے اس لیے اس نے کچھ مٹھائی اس کی طرف پھینک دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد پھر دیکھا تو پھر اسے اپنا عکس نظر آیا آخر غصے ہو کر اس نے ساری مٹھائی کنویں میں پھینک دی۔ لیکن عکس پھر بھی نظر آتا رہا۔ یہ دیکھ کر بچہ رونے لگا۔ اتفاق سے اس کا دادا بھی آپہنچا بچے نے دادا سے شکایت کی کہ ایک لڑکا میری تمام مٹھائیاں مانگ مانگ کھا گیا لیکن اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہا ہے دادا نے کنویں میں جھانکا تو اپنا عکس نظر آیا بگڑ کر کہنے لگا۔ اے بڈھے، تمھیں شرم نہیں آتی اتنی لمبی داڑھی رکھ کر بھی بچے کی تمام مٹھائیاں کھا گئے۔

محمد نواب عتیق اطہر زاہدی
رانی گنج۔ بردوان (ویسٹ بنگال)

سب سے عظیم ارتفاع

دنیا کا سب سے عظیم نام اللہ کا ہے۔
دنیا کی سب سے عظیم شخصیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔
دنیا کی سب سے عظیم کتاب قرآن مجید ہے۔
دنیا کی سب سے عظیم صحبت نیکی ہے۔
دنیا کی سب سے عظیم دولت علم ہے۔

رستم راہی
سری پور ۳، پوسٹ سری پور بازار ضلع بردوان

چالاک بڑھیا

چند سال پہلے اسی لبنان کی بات ہے کہ اچانک کسی ملک نے اس پر حملہ کر دیا۔ کافی دن تک لڑائی چلتی رہی۔ ادھر سے حملے ہو رہے تھے۔ ادھر سے بھی حملے ہو رہے تھے۔ لبنان کے بادشاہ نے حکم دیا کہ قلعہ کا ایک ایک

دروازہ بند کر دیا جائے۔

حکم ملتے ہی سب دروازہ بند ہو گئے۔ کئی سالوں تک لڑائی چلتی رہی قحط سالی پڑنے لگی۔ لوگ بھوک سے مرنے لگے۔ اناج وغیرہ بھی ختم ہو گیا۔ ایک بڑھیا جو ۹۰،۸۰ سال کی تھی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی:

"بادشاہ سلامت! میں ایک بات عرض کرنا چاہتی ہوں۔" بادشاہ نے کہا "ٹھیک ہے کہو۔"

بڑھیا اپنی بات کہنے لگی کہ ملک کے اندر سے ایک گائے لائی جائے جو اچھی قسم کی ہو اور اناج جمع کیا جائے۔ چنانچہ بادشاہ کا حکم ہوا۔ درباری گائے کی تلاش میں چل پڑے۔ ہر جگہ تلاش کیا گیا۔ مگر کہیں بھی گائے نہیں ملی۔ کیوں کہ جانور بھی بھوک کے مارے مر چکے تھے۔

کئی جگہ تلاش کرنے کے بعد ایک بہت ہی غریب کسان کے گھر اچھی حالت میں ایک گائے ملی۔ اس گائے کو بادشاہ کے سامنے حاضر کیا گیا۔ بادشاہ نے اسی بڑھیا کو بلوایا۔ بڑھیا آئی۔ گیہوں، جوار، چاول جمع کیا گیا۔ بہ مشکل ایک دو کلو اناج جمع ہوا اور اس گائے کو دیا گیا۔ جب گائے اناج کھا گئی تو بڑھیا نے قلعے کا دروازہ کھول کر اس گائے کو باہر کر دیا۔

جب باہر کے حملہ آوروں نے دیکھا کہ ایک اچھی موٹی تازی گائے اُدھر سے آ رہی ہے تو اس کو پکڑا اور ذبح کیا۔ جب دیکھا کہ گائے کے پیٹ کے اندر چاول گیہوں وغیرہ ہے تو انھوں نے اپنے ملک کو پیغام بھیجا۔

"بادشاہ سلامت۔ ابھی بھی اس ملک میں قحط نہیں پڑا ہے۔ اور لوگ جانوروں کو اناج کھلا کر پال رہے ہیں۔ آپ کا حکم کیا ہے؟" جب بادشاہ نے یہ پیغام پڑھا تو بڑا تعجب کرنے لگا کہ کئی سال لڑائی ہونے کے باوجود ابھی ان کے پاس غلّہ موجود ہے۔ چنانچہ لڑائی ختم کر دی جائے اور ان لوگوں کو آزاد کر دیا جائے۔

دوسرے دن لبنان کے بادشاہ کے پاس پیغام بھیجا گیا یہ لڑائی ختم ہو چکی ہے اور تم سب لوگ آزاد ہو۔ ملک کے تمام لوگ خوش ہو گئے اور اُس بڑھیا کی عقلمندی پر حیرت کرنے لگے۔

عبدالخالق ناگپوری

بیربل کی حاضر دماغی

اکبر بادشاہ کے دربار میں ایک مرتبہ ملک عرب کا رہنے والا گھوڑوں کا بیوپاری کچھ عمدہ قسم کے گھوڑوں کو لے کر آیا۔ بادشاہ کو عربی گھوڑے بہت پسند آئے۔ اُس کے پاس جتنے بھی گھوڑے تھے وہ سب کے سب بادشاہ اکبر نے خرید لیے اور مزید منگانے کا آرڈر بھی دے دیا۔ عرب اور ہندستان کے درمیان سفر بہت لمبا ہوتا تھا۔ اس کے لیے یہ سوچ کر اکبر نے اُسے ایک ہزار روپے پیشگی بھی دے دیے تاکہ گھوڑے آ سکیں لیکن اُس آدمی سے پتا لکھوانا بھول گئے۔ وہ سوداگر اپنے ملک کو چلا گیا۔

کچھ دنوں بعد بادشاہ بیربل سے بولے کہ یوں تو اپنے ملک میں بے وقوفوں کی تعداد بہت ہے لیکن پھر بھی ہم اُن بے وقوفوں کی فہرست دیکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا جلد سے جلد یہ فہرست تیار کر کے مجھے دے دو۔ دوسرے روز بے وقوفوں کی فہرست تیار ہو گئی۔ اس میں سب سے اُوپر بادشاہ کا نام تھا۔ بادشاہ نے نام دیکھ کر بیربل سے پوچھا: "بیربل تم نے میرا نام فہرست میں کیوں لکھا۔" تب بیربل نے عاجزی سے کہا کہ جہاں پناہ! عرب سے جو گھوڑوں کا سوداگر آیا تھا اُس کا نام و پتا لکھوائے بغیر آپ نے اُسے ایک ہزار روپے دے دیے اب غور کیجیے۔ اگر وہ سوداگر گھوڑے نہ لایا تو آپ اُس کا کیا کر سکتے ہیں۔ یہ ایک بڑی بے وقوفی نہیں ہے تو کیا ہے۔" بادشاہ نے اپنی غلطی پر افسوس کیا۔ مگر وہ بیربل سے ہار کیوں مانتے انھوں نے کہا "فرض کرو اگر وہ سوداگر گھوڑے لے کر آ گیا تو؟" بیربل نے جواب دیا تب آپ کی جگہ اُس کا نام لکھ دوں گا۔ بادشاہ اس جواب سے اور بھی شرمندہ ہوئے۔

محمد شمس الحسن
دواخانہ بندہ نواز، جونا بازار، اورنگ آباد










صبا وحید








بچّوں کی کتابیں

ریڈیو فیچر
(جگن ناتھ آزاد)
بچوں کی دلچسپی کے دو مزیدار ڈرامے۔
یہ دونوں ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی
ہو چکے ہیں۔
قیمت : ۲/۲۵

گاندھی باباکی کہانی
(بیگم قدسیہ زیدی)
اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی
کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز
پیرایے میں لکھی گئی ہے۔
قیمت : ۴/۰۰

اُردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)
ہم سب اُردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن
صحیح اُردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے،
یہ اسی کتاب سے معلوم ہو سکے گا۔
قیمت : ۱/۵۰

پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)
دلچسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ۔ مزیدار
کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت
بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے۔ آپ
بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔
قیمت : ۲/۰۰

جب اور اب
(آصف مجیب)
بچوں کی دلچسپی والی ۵۰۔۶۰ سال پہلے کی ایسی
باتیں جو اب پرانی ہو چکی ہیں۔ قیمت : ۱/۷۵

تین اناڑی
عصمت چغتائی
ککو، بلو اور ٹیٹو۔ تین نٹ کھٹ لڑکوں کی
شرارتوں پر مبنی ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان
میں لکھا گیا ہے۔ قیمت ۳/=

جن حسن عبدالرحمٰن
ترجمہ
قرۃ العین حیدر
الٰہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہوگئی لیکن اب تو
اس جن کا قصہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال
ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے صراحی کی
قید سے آزادی دلائی ہے۔
حصہ اول ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰

کہاوت اور کہانی
(شفیع پریمی)
روزمرہ بولی جانے والی کہاوتوں اور
کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے
کہاوتیں وجود میں آئیں۔
قیمت : ۴/۵۰

سرکس
تزئین کار : ڈین گیسپر
سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا
بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کتاب میں
سرکس کی ڈھیر ساری تصویروں کے خاکے
ملیں گے جن میں بچے شوق سے رنگ
بھر سکتے ہیں۔ قیمت ۱/۵۰

دہلی ۶ — بمبئی ۳ — علی گڑھ ۱

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵



Regd. No. D(SE)-043 April 1983

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

لبرٹی آرٹ پریس (پرو پرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲

بچوں کے لیے عبدالواحد سندھی جامعی کی کتابیں

پھر میں چگوں کیا خاک
نہایت آسان زبان میں
چھوٹے بچوں کے لیے
ایک کہانی
قیمت : ۱/۵۰

پان کھاکر، طبلہ بجاکر رام ناچا
ایک مزے دار کہانی
جو خاص طور سے چھوٹے بچوں کے
لیے لکھی گئی ہے
قیمت : ۱/۵۰

ایک دن تا کے سے
چھوٹے بچوں کے لیے
چھوٹے چھوٹے جملوں میں لکھی گئی
مزے دار کہانی
قیمت : ۱/۵۰

پکڑ دم کے ٹکو
ایک گدھے نے شیر کو بھگادیا۔
بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چھوٹے
بچوں کے لیے۔ قیمت ۱/۵۰

پانچ بونے
پانچ کام چور بونوں
کی کہانی چھوٹے بچوں کے
لیے۔ قیمت: ۱/۵۰

ہیتو چیتو
یہ کہانی بھی چھوٹے بچوں
کے لیے لکھی گئی ہے، انھیں
کی زبان میں۔ قیمت: ۱/۵۰

روٹی کس نے پکائی
چھوٹے بچوں کے لیے انھی
کی زبان میں ایک دلچسپ
کہانی۔ قیمت: ۲/۵۰

بی بیبڑکی اور کوا
چھوٹے بچوں کے لیے
آسان زبان میں لکھی
گئی ایک دلچسپ کہانی
قیمت: ۱/۵۰

چیونٹی رانی
کہانی کی کہانی اور معلومات
کی معلومات۔
قیمت ۱/۵۰

جادو کا گھر
چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان
میں لکھی گئی ایک مزے دار
کہانی۔ قیمت ۱/۵۰

بچوں کی کہانیاں
ایک کتاب اور
سب کہانیاں سچی سب
کی سب مزے دار
قیمت: ۱/۵۰

مدورانا پردیس چلے
مگر کیسے چلے؟ اور راستے میں کیا
کیا ہوا، یہ تو پڑھنے
سے ہی پتا چلے گا۔
قیمت :
۱/۵۰

لومڑی کا لالچ
[illegible]
قیمت: ۱/۵۰

[illegible]
[illegible]



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
دہلی
بمبئی
علی گڑھ

ماہنامہ
پیامِ تعلیم
نئی دلی

مئی ۱۹۸۳ء ——— جلد: ۲۰ ——— شمارہ: ۵

اڈیٹر: ولی شاہجہاں پوری

قیمت فی پرچہ: =/۲

سالانہ ۱۸ روپے

غیر ممالک سے ۸۵ روپے

بچوں سے باتیں

تعلیمی سال کے اِس آخری مہینے کے آخری ہفتوں میں آپ امتحانات سے فارغ ہو کر بے چینی سے نتیجوں کے انتظار کر رہے ہوں گے، اب کچھ دن بڑا ہی چین لگتا ہے۔ فرصت کے اوقات میں پیامِ تعلیم پڑھیے، اپنی رائے دیجیے، اپنے دوستوں کو پڑھائیے اور نئے خریدار بنانے کی کوشش کیجیے تاکہ ہم پرچے کو مزید ترقی دے سکیں۔

مشہور ایرانی مصنف صمد بہرنگی کی ایک کہانی آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس مرتبہ ناصرہ شرما صاحبہ نے ایک اور کہانی کا ترجمہ کیا ہے۔ یقیناً آپ اسے پسند کریں گے۔

ثروت عثمانی صاحب پہلی بار شریکِ بزم ہوئے ہیں، سردار احمد (علیگ) اور ڈاکٹر سنجیو رائے کے دلچسپ اور مفید مضامین بھی آپ کو ضرور پسند آئیں گے، باقی نظمیں اور مضامین بھی پڑھنے کے قابل ہیں۔

ہمارے پُرانے رفیق عبدالمجید آنیکل صاحب کی بلاعنوان کہانی کے جوابات براہِ راست ان کو ہی بھیجیے گا، ایک انعامی سلسلہ زبیر آفاق صاحب نے بھی شروع کیا ہے، یہ جولائی سے شروع ہوگا۔

سال گذشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی جامعہ مڈل اسکول کے طلبہ نے اپنے مدرسہ کی ایک دلچسپ سرگرمی کا حال اپنی زبان میں بیان کیا ہے۔ جون کا شمارہ بچوں کی حکومت نمبر طلبہ ہی نے ترتیب دیا ہے۔ اس مخصوص شمارے کی قیمت ساڑھے چار روپے ہوگی، مستقل خریداروں سے مزید قیمت نہیں لی جائے گی۔ جو اصحاب ۲۰ مئی تک خریداری قبول کریں گے انھیں بھی یہ رعایت حاصل ہوگی۔

طابع و ناشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

سطوت رسول

ننھے پنوں کا البم

(اپنی بیٹی عفت کے نام جو ۷ رمارچ ۱۹۸۳ء کو ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گئی)

اُس کی یادیں
اُس کی خوشبو
اُس کی وہ من موہنی صورت
پھولوں میں اک ہنستی لڑکی
اُس کے قصّے
اُس کے سارے ملبوسات
ڈبے میں اک رکھا البم
اُس کی تصویروں میں سارے گڈمڈ چہرے
کونے میں وہ رکھی کتابیں
لفظوں کی کاواک لکیریں
قلم دوات!



ہنستے کھیلتے سارے بچّے
گلی میں برپا، شورِ قیامت
چپکے چپکے چھپا کرنا
کتنی صدیوں سے سب بچّے
کھیلتے ہیں یوں آنکھ مچولی



پھیکی پھیکی، میٹھی میٹھی
ان کی بولی؟
چپ چپ گُم سُم
تنہا وہ لڑکی
"ہنستے کھیلتے دن اور راتیں
کتنی ساری یہ سوغاتیں
پیاری باتیں"
روتے پل کا، انوکھا قصّہ!؟
ٹوٹی پھوٹی چینی کی، اک ننھی گڑیا
چابی والے بندر، بھالو
ایک اچھلتے نٹ کا تماشا
فرش پہ بیٹھا کچھوا، مینڈک
ٹرٹر کرتی موٹر سائیکل
بگلے اپنے پنکھ پسارے
کوّوں کی یہ کائیں کائیں
یہ جنگل کی مند ہوائیں
سارے پنکھ پکھیرو،
اُڑتی ڈاریں
پھولوں پر شبنم کے قطرے

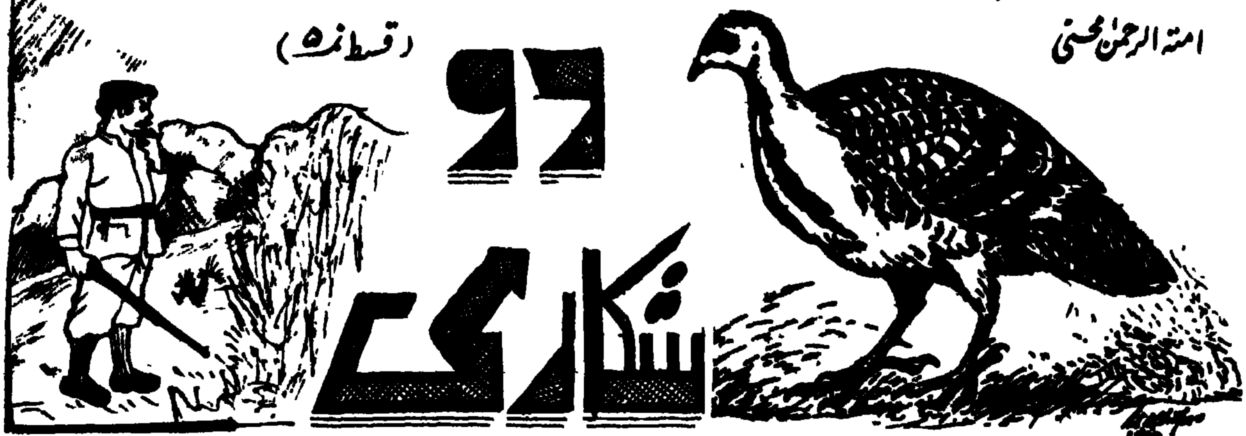


گڑیا گڈّی
پون ہنڈولے پر شہزادی
اڑتے جگنو
بھاگتی تتلی
گملوں میں پھولوں کے، بکسے گچھے
مسلی کلیاں
اُن گلیوں سے جا ملتی ہیں!
دور دیس کی گلیاں؟
وہ چہرہ سب دیکھ رہا ہے!
حیرت سے آنکھیں پھیلی ہیں
اُس کی سکھیاں
اُس کے بھائی بہنیں اور ماں
گلی کے لڑکوں کا اک غول
راجا، رانی
چور سپاہی
قصوں میں وہ کھوئے کھوئے
پھولوں میں ہنستے چہرے کو
حسرت سے سب دیکھ رہے ہیں
طاق میں رکھے کھلونے!؟

امتہ الرحمٰن محسنی

(قسط نمبر ۵)

وہ شکاری



باب ۶

اگلے جمعے کو رات کا کھانا کھانے کے بعد ابو نے کہا: ذاکی! میں کل رات کو پھر باہر جانا چاہتا ہوں۔ اگر تم ٹھیک رہے۔"

"آپ کا مطلب ہے پوچنگ کے لیے؟" "ہاں" ابو نے کہا۔

"کیا آپ پھر شہباز کے جنگل جائیں گے؟"

"ہاں۔ میں ہمیشہ وہیں جاتا ہوں۔ وہاں جانے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ تیتر وہیں ملتے ہیں۔ دوسری یہ کہ مجھے شہباز خاں پسند نہیں ہیں۔ ان کی چڑیوں کا شکار کرنے میں بڑا مزا آتا ہے۔"

اب میں یہاں رک کر شہباز خاں کا آپ سے تعارف کرا دوں۔

شہباز خاں بہت ہی دولت مند آدمی ہیں۔ ان کی دولت کا قیاس کرنا بھی مشکل ہے۔ ان کی کئی فیکٹریاں چلتی ہیں۔ جن میں سب سے بڑی شکر بنانے کی ہے۔ ان گنت کھیت اور باغات ہیں۔ میلوں دور تک پھیلے ہوئے جنگل اور چراگاہیں۔ ہمارے چاروں طرف ان ہی کی زمین ہے سوائے اس چھوٹے سے ٹکڑے کے جو ابو کی ملکیت ہے۔ وہ ٹکڑا شہباز خاں کی ریاست کے سمندر میں ایک ننھے سے جزیرے کی طرح ہے۔

وہ شکاری کتوں کو لے کر شکار کرتے ہیں اور امیروں نوابوں کو اپنے یہاں شکار کرنے کی دعوت دیا کرتے ہیں۔ شہباز خاں جب باہر جاتے ہیں تو زردوزی کے کام کی چمکدار ویسٹ کوٹ پہن کر اپنی لمبی سفید گاڑی کو چلاتے ہوئے ہمارے پٹرول پمپ کے سامنے سے گزرتے ہیں تو ہم کو بھی ان کے ڈبل روٹی جیسے پھولے ہوئے چہرہ کی جھلک اسٹیرنگ وھیل کے اوپر سے نظر آجایا کرتی ہے جو زیادہ شراب پینے کی وجہ سے تمتمایا رہتا تھا۔

وہ بہت ہی مغرور اور خود پرست تھے۔ وہ صرف اپنے ہی جیسے امیروں سے ملنے کے قائل تھے۔

ابو نے کہا: "شہباز خاں مجھے پہلے بھی پسند نہیں تھے۔ لیکن پچھلے سال جب وہ اپنی کار بھروانے یہاں آئے تھے اور تم سے جس بے ہودگی سے اس نے بات کی تھی اس کے بعد سے میں انھیں بہت ہی ناپسند کرنے لگا ہوں۔ ان کی وہ بات میں بھولا نہیں ہوں۔"

بھی بات تو یہ ہے کہ میں بھی نہیں بھولا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ شہباز صاحب نے ایک روز اپنی بڑی سفید گاڑی پمپ کے سامنے روک کر مجھے حکم دیا کہ "اسے بھر دو" "ٹھیک سے بھرنا!" اس وقت میں آٹھ سال کا تھا۔ وہ اپنی گاڑی سے باہر بھی نہیں آئے۔ بس پٹرول ٹینک کی چابیاں مجھے تھمادیں اور گرج کر کہا تھا "اپنے ان گندے غلیظ ہاتھوں سے میری گاڑی کو بچانا۔ سمجھ گیا تو؟"

میں ان کی بات بالکل نہیں سمجھا تھا۔ اسی لیے میں نے کہا تھا "جناب اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

انھوں نے اپنے برابر سے ایک چمڑے کا چابک اٹھایا اور پستول کی طرح مجھے دکھا کر بولے: "اگر تو نے میری سفید گاڑی پر اپنی گندی انگلیوں کا کوئی نشان ڈالا تو میں کار سے نیچے اگر اس سے تیری ایسی چمڑی ادھیڑوں گا کہ یاد رکھے گا۔"

ابھی شہباز نے بمشکل بات پوری کی تھی کہ ابو ورک شاپ

سے نکل کر ایک جست میں کھڑکی کے پاس تھے اور کھڑکی پر ہاتھ جما کر آگے کو جھک کر بولے: "مجھے پسند نہیں ہے کہ میرے بیٹے سے اس انداز سے بات کی جائے۔" ان کی آواز خطرناک اور بہت ہلکی ہو گئی تھی۔

شہباز خاں ان کی طرف دیکھے بغیر چپ چاپ بلا کسی حرکت کے ساکن بیٹھے رہے۔ ان کی ننھی ننھی سوروں جیسی آنکھیں اپنی سیدھ میں دیکھتی رہیں اور منہ پر ہونٹوں کے کونوں پر ہلکی سی خودسرانہ فخر کی مسکراہٹ پھیل رہی۔ ابو نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "اس کو اس بے ہودگی سے دھمکانے کی کوئی وجہ آپ کے پاس نہیں تھی۔ اس نے آپ کی کوئی خطا نہیں کی تھی۔" ادھر شہباز صاحب اس انداز سے بیٹھے ہوئے باہر کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے ابو وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ ابو نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا: "میرا مشورہ ہے کہ اگر آیندہ آپ کسی کو چمڑی یا کھال ادھیڑنے کی دھمکی دیں تو اپنا مقابل چنیے۔ مثال کے طور پر جیسے میں ہوں۔"

شہباز خاں اب بھی بلا ان کو دیکھے ساکت اسی طرح بیٹھے رہے۔ ابو نے کہا: "مہربانی کر کے آپ تشریف لے جائیے۔ ہمیں آپ کی گاڑی بھرنے کی قطعی خواہش نہیں ہے۔" انھوں نے میرے ہاتھ سے چابیاں لیں اور کھڑکی کے اندر اچھال دیں۔ اس کے فوراً بعد ان کی گاڑی خاک کے مرغولے اڑاتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

دوسرے دن مقامی محکمۂ صحت کا ایک انسپکٹر ہمارے یہاں آیا اور کہا کہ وہ ہمارے گھر کا معائنہ کرنے آیا ہے۔ ابو نے پوچھا کہ وہ ہمارے گھر کو کس لیے دیکھنا چاہتے ہیں؟

اس نے کہا: "میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ جگہ انسانوں کے رہنے کے قابل بھی ہے۔ ہمارے محکمہ کے قانون میں ٹوٹے پھوٹے گھروں میں رہنے کی اجازت نہیں ہے۔"

ابو نے اسے گھر کے اندر لے جا کر معائنہ کرایا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بے داغ اور صاف ستھرا آرام دہ تھا۔ آخر اس آدمی نے یہ بھی مان لیا کہ وہاں کوئی بات قابل اعتراض نہیں ہے۔

دو چار دن بعد ایک دوسرا انسپکٹر ہمارے زمین دوز پٹرول ٹینک سے پٹرول کا نمونہ لینے آ گیا۔

ابو نے مجھے بتایا کہ وہ یہ دیکھنے آیا تھا کہ ہم نے درجہ اول کے پٹرول میں درجہ دویم کا پٹرول تو نہیں ملا رکھا ہے۔ کیونکہ اس قسم کی دھوکہ بازی پٹرول پمپ والے عام طور پر کیا کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔

اب تو یہ سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ مقامی افسروں کے ٹیکے بغیر مشکل سے ایک ہفتہ گزرتا تھا کبھی وہ اس جگہ معائنہ کرنے آ رہے ہیں کبھی اس جگہ کا۔ ابو اس روز روز کی آمد دیکھ کر کھنچنے لگے تھے۔ اب اس میں ذرا بھی شک کی گنجایش نہیں رہی کہ اس سارے تماشے کے پیچھے شہباز خاں کے لمبے مضبوط بازو ہیں جو ہم کو ہماری زمین سے دھکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

آپ نے دیکھا! ان باتوں کی وجہ سے ابو کو شہباز خاں کے تیتروں کا شکار کرنے میں مزا آتا تھا۔

اس رات ہم نے کشمشیں بھیگنے کے لیے رکھ دیں۔ اگلا دن شکار کا تھا۔ ابو اپنے بستر سے اٹھے تو ان کو فوراً یاد آ گیا۔ کہ وہ آج کیا کرنے والے ہیں اور جب ہی سے ان کے اندر ایک جوش اور ولولہ بھر گیا تھا۔

وہ سنیچر کا دن تھا۔ میں اسکول سے جلدی ہی آ گیا تھا۔ ہمارا دن کا زیادہ حصہ ورک شاپ میں گزرا تھا۔ ہمیں پرکاش مہتہ صاحب کی آسٹن سیون کی صفائی اور مرمت کرنا تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی چالیس سال پرانی مشین تھی۔ عجیب جادو بھری چیز تھی۔ اتنی پرانی ہوتے ہوئے بھی وہ بہت ہلکی اور عمدہ چلتی تھی۔ ابو نے بتایا کہ یہ آسٹن ان کے زمانہ میں بے بی آسٹن کہلاتی تھی اور اس کا چھوٹا سا انجن اس زمانہ میں بھی سب انجنوں سے اچھا سمجھا جاتا تھا۔ مسٹر پرکاش کو اپنی اس پرانی گاڑی پر بڑا ناز تھا اور وہ اس کی مرمت کرانے بہت دور سے ہمیشہ یہیں لایا کرتے تھے۔ ابو نے کہا میں ٹھیک چھ بجے یہاں سے چل دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ جیسے ہی اندھیرا ہونے لگے میں جنگل میں موجود ہوں۔"

"ابو! اندھیرے سے پہلے کیوں؟" میں نے پوچھا۔

اس لیے کہ اس وقت جنگل کے اندر ہر چیز درختوں کے سایوں میں چھپ جاتی ہے۔ تم خود تو دیکھ بھال کر چل پھر سکتے ہو مگر اس وقت کوئی دوسرا تم کو آسانی سے نہیں دیکھ سکتا اور اگر کوئی خطرہ ہو تو بڑی سہولت سے سایوں تلے چھپا جا سکتا ہے۔ آپ پورا اندھیرا ہونے کا انتظار کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا۔ تب تو آپ

کو دیکھ لیے جانے کا خطرہ بھی نہیں رہے گا۔

اگر اندھیرا ہونے پر جاؤں گا تو کچھ بھی پکڑ نہیں پاؤں گا۔ کیونکہ اندھیرا ہوتے ہی تیتر بسیرا لینے درختوں پر چلے جاتے ہیں۔ وہ زمین پر بسیرا نہیں لیتے۔ آج کل ساڑھے سات بجے اندھیرا ہونے لگتا ہے۔ وہاں پہنچنے میں بھی کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ لگے گا۔ اس لیے ٹھیک چھ بجے مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ میں نے پوچھا: آج آپ کون سا طریقہ استعمال کریں گے۔ چپکنے والی ٹوپی یا گھوڑے کے بال کا پھندہ؟

"چپکنے والی ٹوپی": انھوں نے کہا۔ "اور آپ کب تک واپس ہوں گے؟"

"دس بجے تک زیادہ سے زیادہ ساڑھے دس تک": انھوں نے کہا اور "ہاں کیا یہ بات بالکل پکی ہے کہ تم برا نہیں مانو گے؟"

"بالکل پکی ہے": میں نے کہا۔ "لیکن ابو آپ کو تو کوئی خطرہ نہیں ہوگا؟"

"میری وجہ سے تم بالکل پریشان نہ ہو"۔ انھوں نے مجھے اپنے سے لپٹاتے ہوئے کہا۔

آپ نے کہا تھا نا کہ میرے ابا کے زمانہ میں گاؤں میں کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جسے کبھی نہ کبھی چوکیدار کی گولی نہ لگی ہو۔

"ہاں میں نے کہا تو تھا! لیکن ان دنوں جنگلوں میں اب سے بہت زیادہ چوکیدار درختوں کے پیچھے چھپے رہتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہے۔ شہباز خاں کے جنگل میں اب کتنے ہوں گے؟ وہاں زیادہ نہیں ہیں۔ چند چوکیدار رہتے ہیں۔"

جیسے جیسے دن ڈھل رہا تھا ابو کا جوش بھی بڑھ رہا تھا۔ ٹھیک پانچ بجے بے بی آسٹن کا کام ختم کر کے اس کا شیٹ لینے ہم اسے سڑک پر لے گئے۔ خوب گھما پھرا کر اسے ورک شاپ میں لا کر رکھ دی۔ ساڑھے پانچ بجے ہم نے کھانا کھایا۔ لیکن ابو سے کچھ کھایا نہیں گیا تھوڑا سا کھا کر اٹھ گئے۔ ٹھیک چھ بجے انھوں نے مجھے پیار کیا اور کہا: "دانی وعدہ کرو کہ میرے انتظار میں تم جاگتے نہیں رہو گے۔ آٹھ بجے تم بستر میں چلے جاؤ گے اور سو جاؤ گے۔ خدا حافظ!"

وہ سڑک پر جا رہے تھے اور میں گھر کے سامنے چبوترے پر کھڑا ان کو جاتا دیکھ رہا تھا۔ مجھے ان کے چلنے کا انداز بہت اچھا لگتا تھا۔ چلتے چلتے وہ مڑے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ جواب میں میں نے بھی ہاتھ ہلایا۔ پھر وہ سڑک کے ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ (باقی آئندہ)

الف قدم

گرمی

ٹل گیا جاڑا، آئی گرمی
نیا سندیسا لائی گرمی
تیز لگے گی سب کو دھوپ
موسم نے بدلا ہے روپ
تر تر تر تر بہے پسینا
ہو گیا مشکل لو اب جینا
جسم سے اتری ہے اب مخمل
اچھی لگتی ہے اب ململ
گرمی کا بجتا ہے ڈنکا
چلے گا گھر گھر میں پنکھا!
چلو گے جو تم ننگے پیر
نہیں ہے پھر پیروں کی خیر
لو چلتی ہے روز و شب
صبح سے ہوتا ہے مکتب

لوکوما زہر گروہ دھنیاؤ

صمد بہرنگی (ایران)

ترجمہ: ناصرہ شرما

نارنگی کا چھلکا

صمد بہرنگی فارسی ادب کے "چارلس ڈیکنس" کہلاتے ہیں۔ ان کی پیدائش ایران کے شمال میں ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ آپ نے بچوں کے لیے لکھا مگر اُن بچوں کے لیے جو غریب تھے۔ اسی لیے وہ اپنے ناشروں سے اصرار کرتے تھے کہ میری کتاب سستی اور سادہ چھاپیں تاکہ وہ زیادہ تر اس طبقہ کے ہاتھوں میں پہنچے جو اس کا مستحق ہے اور جس کے لیے میں لکھتا ہوں۔ اسی لیے صمد کی کتاب کی قیمت ۲ روپے اور ۲½ روپے سے کبھی آگے نہیں بڑھی۔ خود کندھے پر کتابوں کا پیکٹ رکھ کر گاؤں گاؤں جاتے تھے۔ ایران ادیب کی موجودہ کہانی بھی ایک گاؤں کے غریب بچے کی ہے۔ جس ایران میں پھلوں کا باغ ہو اور دنیا بھر میں اس ملک کے پھل مشہور ہوں وہاں کے غریب بچوں نے نارنگی کبھی دیکھی ہی نہیں تھی (مترجم)

ہاں شاید یہ میرا ہی گناہ تھا کہ میں جمعہ کی رات کو شہر میں ٹھہر گیا تھا یا پھر چائے کی دُکان والے کی بیوی کا گناہ تھا جو اس کے پیٹ میں درد اسی رات اٹھنا تھا۔ گناہ میرا تھا یا دکان والے کی بیوی کا۔ یہ ثابت کرنا آسان کام نہیں ہے کہ اتنی جلدی فیصلہ کرلیا جائے۔ میرے لیے یہی مناسب ہے کہ سارا قصہ تمھیں سناؤں، تاکہ تم مسئلے کو سمجھ کر درُست فیصلہ کر سکو کہ درحقیقت ہم میں سے مجرم کون ہے؟ ہوسکتا ہے ہم دونوں میں سے کسی کا جرم ثابت نہ ہوسکے۔

وہ جمعرات کی ایک دوپہر تھی۔ میں چائے کی دُکان کے سامنے شہتوت کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ ارادہ تھا کہ کھانا کھا کر بس اسٹاپ تک اور وہاں سے بس پکڑ کر شہر جاؤں گا۔ اسی خیال سے مدرسے کی چھٹی بھی وقت سے کچھ پہلے کر دی تھی۔ طاہر نے بھی غضب کی پھرتی دکھائی کہ پلک جھپکتے ہی بستہ گھر میں رکھ تانگہ لے کر آگیا۔ اب بڑے آرام سے کھڑا تالاب کے کنارے گھوڑے کو پانی پلا رہا تھا، اور خود پھُولی ہوئی جیب سے روٹی کے بڑے بڑے نوالے نکال کر منہ میں ٹھونس رہا تھا۔ میں نے کھانا ختم کرلیا تھا۔ دُکان والے نے میرے سامنے سے آب، گوشت کی قاب اور تپائی اُٹھائی، اور اپنے بیٹے سے میرے لیے چائے لانے اور حقہ تازہ کرنے کے لیے کہا۔ پھر میرے نزدیک آ بیٹھا اور التجا بھری آواز میں بولا: "ماسٹر صاحب ایک چھوٹی سی خواہش ہے"۔

"حکم دو نوروش میاں"۔ میں نے تپاک سے کہا۔ علی چائے لے آیا تھا۔ اب بھاگ کر حقہ لینے گیا تھا۔ دُکان والے نے بات آگے بڑھائی۔ "حضور! علی کی ماں کو نہ جانے کون سے درد نے جکڑ رکھا ہے کہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔ کل رات سے اب تک پیٹ کے درد سے پریشان ہے۔ جڑی بوٹی، دم کیا پانی، پھیکی دوا، جو جس نے کہا، اُسے پلایا مگر لگتا ہے یہ درد اس کی جان لے کر ہی جائے گا۔ منجوق کی دادی کا کہنا ہے کہ اگر نارنگی کا چھلکا مل جائے تو کام بن جائے گا۔ اس کے پانی کو اُبال کر پیتے ہی درد دُور ہوجائے گا۔ مگر چھلکا ملے کہاں سے؟ گاؤں میں تو کسی کے پاس ہے نہیں۔ خود میرے

۴۸۔ نیو کیمپس، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

پاس ایک ٹکڑا تھا، مگر نہ جانے کس کو دے دیا۔ اب کچھ یاد ہی نہیں آتا۔ ماسٹر صاحب آپ شہر جا رہے ہیں، تکلیف تو ہوگی۔ اگر تھوڑا وقت نکال کر ہمارے لیے نارنگی کا چھلکا لیتے آئیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔

اسی دوران صاحب علی حقہ تازہ کر کے لے آیا تھا، حقہ میرے سامنے رکھ کر پاس ہی کھڑا ہو گیا اور بڑے دھیان سے ہماری باتیں سننے لگا۔ جب میں نے کہا: "تمھارا حکم سر آنکھوں پر نوروش میاں،" تو صاحب علی کا چہرہ میرا جواب سُن کر کھل اُٹھا۔ جیسے کہ اس نے اپنی ماں کو صحت یاب دیکھ لیا ہو۔

سنیچر کی صبح کو میں شہر سے لوٹا اور بس سے اُترا تو میرے ہاتھ میں نارنگی کا تھیلا تھا۔ پرانے لوگوں کا ایسا خیال تھا کہ اگر نارنگی کے چھلکے کا اُبلا پانی مریض کو پلایا جائے تو درد فوراً جاتا رہتا ہے مگر کون سا درد؟

گاؤں بس اسٹاپ سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ اگر تیز قدموں سے چلا جائے تو پون گھنٹے میں گاؤں پہنچا جا سکتا ہے۔ مگر میں بڑے آرام سے ٹہلتا ہوا گاؤں گیا۔ پہلے مکان پر گیا اور وہاں سے کلاس کے لیے دو، تین ضروری کتابیں لیں اور نارنگی کا تھیلا لے کر کمرے سے باہر نکلا۔ دروازے پر مالک مکان سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے مجھے سلام کیا اور افسوس کے ساتھ کہا: "خدا سب پر رحم کرے ایک دن سب کو جانا ہے۔"

"آہ . . . . بیچارے صاحب علی کی ماں نہیں رہی صاحب علی اب تم کو اسکول کے لیے کون ناشتے دان میں کھانا دے گا۔"

ہاتھ میں پکڑا نارنگی کا تھیلا یکایک بھاری ہو گیا جیسے میرے ہاتھ میں نارنگی نہیں، بلکہ کوئی پتھر ہو اور اُسے سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو گیا۔ میں نے پوچھا: "کب؟"

مالک مکان بولا: "جمعرات کو تقریباً آدھی رات کے بعد۔ کل ہی تو دفنایا گیا ہے۔"

میں گھر میں واپس گیا۔ نارنگی کے تھیلے کو کتابوں کے پیچھے چھپا دیا۔ پھر وہاں سے نکال کر اپنے بستر کے نیچے اچھی طرح سے دبا دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جب صاحب علی یا اس کے والد میرے گھر آئیں تو ان کی نگاہ نارنگی پر پڑے۔

چائے کی دُکان ایک دو دن بند رہی۔ پھر سارا کام پہلے کی طرح ہونے لگا۔ لیکن بیس پچیس دن تک صاحب علی کی حالت ٹھیک نہ ہوئی۔ ہنسنا تو جیسے وہ بھول ہی گیا تھا۔ کھیلتا بھی نہیں تھا۔ ہمیشہ کسی سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ مجھ سے تو اُس نے ایک دم بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ جیسے عرصے سے ہم میں بول چال بند ہو یہاں تک کہ جب میں چائے کی دُکان پر جاتا، تو بھی بڑی مشکل سے میرے سلام کا جواب دیتا۔

چائے کی دُکان والا اپنے بیٹے کے اس برتاؤ سے بہت شرمندہ تھا اور شرمندگی مٹانے کے لیے صفائی پیش کرتا تھا: "ارے صاحب، نہ جانے اس کا مزاج کیسا ہو گیا ہے۔ صرف آپ کے ساتھ ہی نہیں، بلکہ سب کے ساتھ ہی اس کا رویہ اکھڑا۔ اکھڑا ہے۔" میں جواب دیتا: "جانتا ہوں۔ کم سن ہے۔ صبر کا مادہ کم ہے۔ چند ماہ بعد جب زخم بھر جائے گا، تو اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔"

صاحب علی کی ماں کی موت کے بعد اس کا باپ اپنی گرہستی گھر سے اٹھا کر اسی چھوٹی سی چائے کی دُکان میں لے آیا تھا۔ باپ۔ بیٹے دن رات اب وہیں رہتے تھے۔ کیونکہ اب ان کے لیے یہ جگہ گھر اور دُکان دونوں تھی۔ میں بھی کبھی۔ کبھی وہاں سے آدھی رات کے بعد لوٹتا تھا۔

کافی دن گزر گئے۔ مگر صاحب علی اپنی پہلی حالت پر نہیں لوٹا۔ دن بدن اس کا برتاؤ میرے ساتھ زیادہ بُرا ہونے لگا۔ پڑھائی کی طرف بھی وہ بہت کم دھیان دیتا اور سبق بھی کم یاد کرتا تھا۔ مگر ادھر چند دنوں سے اس کے مزاج میں تبدیلی ہو گئی تھی۔ اس کا برتاؤ اور اخلاق دوسروں کے ساتھ پہلے کی طرح ہو گیا تھا مگر میرے ساتھ اس کا برتاؤ وہی رہا۔

میں اس مسئلے پر جتنا زیادہ سوچتا، وہ اتنا ہی

سلجھنے کے بجائے اور پیچیدہ ہوجاتا اور میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتا تھا۔ آخر کیوں ماں کی موت کے بعد صاحب علی مجھ سے چڑنے لگا ہے؟ پھر سوچتا کہیں وہ اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار مجھے تو نہیں سمجھ رہا ہے؟ مگر ایسا سوچنا میں ایک بڑی بے وقوفی سمجھتا۔ کیونکہ صاحب علی کی ماں کی موت اپینڈکس کے درد سے واقع ہوئی تھی۔ جس وقت درد اٹھا تھا۔ اگر فوراً آپریشن ہوجاتا۔ تو شاید وہ نہ مرتی۔

ایک دن کلاس میں سبق پڑھاتے ہوئے لفظ "نارنگی" آیا۔ میں نے بچوں سے پوچھا: "تم میں سے کسی نے نارنگی دیکھی ہے؟ پورے کلاس میں خاموشی چھائی رہی لیکن منجوق دادی کے پوتے کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں پا رہا تھا میں نے کہا حیدر علی مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم کچھ کہنا چاہتے ہو کیوں؟ جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو کہو۔"

اب سب کی نظریں منجوق دادی کے پوتے سے ہٹ کر میری طرف مرکوز ہوگئیں۔ سوائے صاحب علی کے جو ٹکٹکی باندھے بلیک بورڈ کو تک رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ میری بات سن ہی نہ رہا ہو۔ جب سے نارنگی کا ذکر چلا تھا تب سے صاحب علی سیدھا اکڑ کر بیٹھا صرف بلیک بورڈ کو گھور رہا تھا۔ منجوق دادی کے پوتے نے کچھ ڈرتے اور سہمے ہوئے بڑی احتیاط سے کہا: "جناب میرے پاس نارنگی ہے۔" کلاس میں کسی کو بھی ایسی توقع نہ تھی کہ حیدر علی ایسی بات کہے گا۔ اس لیے سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ صاحب علی کی آنکھ میں بھی چمک سی پیدا ہوئی اور اس نے بھی نظریں گھما کر حیدر علی کو دیکھا۔ سبھی شاگردوں میں بے چینی پھیل گئی کہ وہ کسی بھی طرح جلد سے جلد نارنگی کی شکل و صورت دیکھ لیں۔ کلاس کے سب سے لمبے اور شیطان لڑکے علی نے کھڑے ہوکر کہا: "جناب یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اگر اس کے پاس نارنگی ہوتی تو دکھاتا نہ۔"

میں نے علی کو اس کی جگہ بٹھاتے ہوئے کہا: "اگر اس کا خود دل چاہے گا، تو وہ ضرور دکھائے گا۔"

سچ مچ منجوق دادی کے پوتے نے سائنس کی کتاب اپنے بستے سے نکال لی تھی اور جلدی جلدی صفحے پلٹ رہا تھا۔ جیسے کوئی چیز تلاش کر رہا ہو اور اسے وہ چیز مل نہیں رہی ہے۔ ساتھ ساتھ وہ بول بھی رہا تھا: "دیکھو میں ابھی دکھاتا ہوں۔ میں نے دل اور رگ والی تصویر کے بیچ میں رکھا تھا۔"

میں نے حیدر علی سے کتاب لے لی۔ اب سب کی نظریں میرے ہاتھوں پر جم گئیں۔ یہاں تک کہ صاحب علی کی بھی۔ سبھی بے چین تھے اور چاہتے تھے کہ جلد سے جلد دیکھ لیں کہ نارنگی کون سا تحفہ ہے؟

میں اس خیال سے بہت خوش تھا کہ صاحب علی کو دھیرے دھیرے اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ لیکن پھر بھی یہ گتھی میں سلجھا نہیں پایا تھا کہ آخر وہ کون سی وجہ ہے۔ کہ ایک دم سے صاحب علی میری طرف متوجہ ہوگیا۔ کیا صرف اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نارنگی کو دیکھنا چاہتا ہے؟

حیدر علی کی کتاب کا وہ صفحہ جس پر دل اور رگ کی تصویر تھی کھول دیا اور سب کو دکھایا۔ اس میں نارنگی نہیں تھی۔ لیکن نارنگی کے دو دھبے دونوں طرف کے صفحوں پر موجود تھے۔ سب سے پہلے صاحب علی اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ اور کتاب کو دیکھنے لگا اور پھر میرے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ نارنگی کی مہک کتاب کے درمیان سے اٹھ رہی تھی۔ ایک دم سے میرے ذہن میں ایک بات آئی جو میں ابھی تک بھولا ہوا تھا۔ صاحب علی کی ماں کے مرنے کے چند دن بعد میں نارنگی لے کر حیدر علی کی دادی کے پاس گیا تھا کہ وہ نارنگی اپنے پاس رکھ لے اور گاؤں میں پھر کسی کو ضرورت پڑے تو دوسروں کے کام آسکے۔ حیدر علی کی دادی سفید بالوں والی ایک بوڑھی عورت تھی۔ گاؤں کے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ہر قسم کے امراض کی دوا جانتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ دائی کا کام بھی کرتی ہے وہ اپنے پوتے کے ساتھ رہتی ہے۔ پوتے کے علاوہ دنیا میں اس کا کوئی اور نہیں ہے۔ اس لیے وہ اپنے پوتے سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ حیدر علی کا بھی یہی حال ہے دادی کو چھوڑ دنیا میں اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے،

اور وہ بھی اپنی دادی کو دل و جان سے پیار کرتا ہے۔ حیدر علی کو سب منجوق دادی کا پوتا کہہ کر بُلاتے ہیں۔ یہ نام لوگوں کی زبان پر اتنا چڑھ گیا ہے کہ اس کا اصلی نام حیدر علی بھلا سا دیا گیا ہے۔ جب مجھے یاد آیا کہ منجوق دادی کو میں نے نارنگی دی تھی تو سمجھ گیا کہ یہ دھبہ جو کتاب کے اندر نظر آرہا ہے وہ اسی نارنگی کے چھلکے کا ہے جو اس نے دادی سے مانگ کر کتاب کے بیچ میں رکھ لیا تھا۔ میں نے بھی اپنی طالب علمی کے زمانے میں نارنگی اور سنترے کا چھلکا کتابوں میں رکھا تھا۔ تاکہ کتاب میں خوشبو بس جائے۔ جب منجوق دادی کے پوتے نے دیکھا کہ صفحات کے بیچ میں نارنگی نہیں ہے تو اسے ایسا دھکا لگا۔ جیسے کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو۔ وہ رونے لگا اور روتے ہوئے بولا: "ماسٹر صاحب ان لوگوں نے میری نارنگی نکال لی ہے۔"

میں نے سب بچوں کے چہرے ایک کے بعد ایک غور سے دیکھے۔ کون حیدر علی کا نارنگی کا چھلکا اٹھا سکتا ہے؟ علی؟ طاہر؟ صاحب علی؟ آخر کون۔ . . . ؟

میں نے منجوق دادا ی کے پوتے کو چپ کرا دیا: "اب رو مت! دیکھو کوئی ترکیب نکالتے ہیں۔ کہیں تم نے کھو تو نہیں دیا؟" منجوق دادی کے پوتے نے کہا: "نہیں، ماسٹر صاحب، نہیں میں نے صبح خود دیکھا تھا۔ وہ ان ہی صفحوں کے بیچ میں تھا۔ میں تو کھانے کی چھٹی میں گھر بھی نہیں گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کیونکہ کل رات سے طاہر کی ماں کے پیٹ میں درد تھا۔ جب تک بچے کی پیدائش نہیں ہو جاتی، منجوق دادی کا وہاں سے ہٹنا غیر ممکن تھا۔ اس لیے مجبوراً اسے کھانے کی گھنٹی میں کلاس میں رُکنا پڑا۔ میں نے کہا: "بچو! جس کسی کو بھی حیدر علی کی نارنگی کا پتا ہو۔ وہ خود بتا دے۔ ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ کیونکہ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں: جھوٹ تو ہمیں اس سے بولنا چاہیے جو ہمارا دشمن ہو اور جس پر ہمیں اعتماد نہ ہو۔ لیکن دوست سے جھوٹ بولنے کا کیا مطلب؟"

صاحب علی کی دو آنکھیں اور دو کان تھے۔ لیکن وہ اتنے دھیان سے دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا اس نے دو کان اور دو آنکھیں اُدھار مانگ لی ہیں۔ میں نے دوبارہ کہا: "پتا نہیں چلا کہ وہ نارنگی کس نے اُٹھائی ہے؟" ایک لمحے تک کوئی بھی آواز نہیں آئی۔ پھر علی نے ہاتھ اٹھایا، اور کہا: "ماسٹر صاحب۔ میں نے نکالا تھا، لیکن اب میرے پاس نہیں ہے۔"

میں نے کہا: "آخر کیا کیا اس کا؟"

علی نے جواب دیا: "میں نے قمرمان کو دے دیا تھا کہ وہ اپنی کتاب میں خوشبو بسالے۔ اب کہہ رہا ہے میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے واپس کر دیا۔"

قمرمان اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور بولا: "ماسٹر صاحب میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرے پاس صرف آدھا ٹکڑا ہے۔"

میں نے پوچھا: "آدھا کیا ہوا؟"

قمرمان نے کہا: "میں نے آدھا طاہر کو دے دیا ہے۔"

قمرمان نے ایک چھوٹا سا نارنگی کا چھلکا اپنی حساب کی کتاب کے بیچ سے نکال کر میری میز پر رکھ دیا۔ چھلکے کا وہ ٹکڑا اسوکھے سیمنٹ کا لگ رہا تھا۔ سب کی نگاہیں طاہر کے چہرے سے ہٹ کر میری میز پر ٹک گئیں۔ سبھی کی خواہش تھی۔ کہ وہ چھلکے کا ٹکڑا اٹھائیں، دیکھیں اور اسے سونگھیں۔ میں نے حاضری کا رجسٹر اس ٹکڑے پر رکھ دیا اور چہرہ گھما کر طاہر کی طرف کیا۔ طاہر کھڑا ہونے پر مجبور ہو گیا اور کہا: "ماسٹر صاحب میرے پاس آدھے ٹکڑے کا آدھا ہے۔ باقی میں نے دلال اوغلی کو دے دیا ہے۔"

طاہر نے بھی ایک چھوٹا سا ٹکڑا نارنگی کے چھلکے کا پنی سائنس کی کتاب سے نکالا اور مجھے دے دیا۔ اس طرح نارنگی کا ایک چھلکا پانچ چھ بار ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا تھا اور آخری ٹکڑا جسے دیا گیا تھا وہ صرف چھنگلیا کے ایک پور کے برابر تھا۔ جیسے جیسے نارنگی کے ٹکڑے جمع ہو رہے تھے۔ منجوق دادی کے پوتے کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ لیکن صاحب علی بنا بولے، بنا ہنسے صرف نارنگی کے چھلکے کو

دیکھنے کی کوشش میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب سارے ٹکڑے جمع ہو گئے تو سب کو اکٹھا کر کے میں نے مٹھی میں پکڑا۔ اور سوچ رہا تھا۔ ان کا کیا کروں۔ میں چاہ رہا تھا۔ کہ بچوں سے کہوں کہ یہ خود نارنگی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے چھلکے کے ٹکڑے ہیں۔ جو سوکھ چکے ہیں۔ لیکن صاحب علی نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ ایک دم سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ اور غصہ سے بے قابو ہو کر میری مٹھی کے نیچے اپنا ہاتھ مارا۔ نتیجے کے طور پر چھلکے اوپر اچھلے اور ادھر اُدھر بکھر گئے۔ کچھ لڑکے ان کی طرف لپکے اور بینچ کے نیچے گھس کر اس کو اٹھانے لگے۔ لیکن میری آواز سُن کر وہ باہر آئے اور اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ ان کو لگا کہ مجھے غصہ آگیا ہے اور ہو سکتا ہے۔ میں کسی کو مار بیٹھوں۔ صاحب علی بھی اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور وہ اس طرح رو رہا تھا کہ سب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

رات کو میں چائے کی دُکان پر گیا اور کافی دیر ٹھہرا۔ جب سارے گاہک چلے گئے تو میں، صاحب علی اور اس کا باپ رہ گئے تھے۔ مجھے اطمینان تو ہو گیا تھا کہ گتھی کا سرا میرے ہاتھ آگیا ہے۔ ذرا سا دھیان دینے سے مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح میرے اور صاحب علی کے تعلقات کے درمیان نارنگی حائل ہے۔ لیکن کس طرح؟ اس بات کا مجھے پتا لگانا تھا۔

صاحب علی بینچ پر بیٹھا تھا اور کتاب پر جُھکا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پڑھنے اور ہوم ورک میں مشغول ہو۔ لیکن میں نے محسوس کیا۔ جیسے کہ وہ میرے بولنے کا منتظر ہو۔ جب چائے کی دُکان خالی ہو گئی۔ تو میں نے پوچھا: "کیسے ہو صاحب علی؟"

صاحب علی نے جواب نہیں دیا۔ چائے والے یعنی صاحب علی کے باپ نے کہا: "بیٹے ماسٹر صاحب تم سے مخاطب ہیں۔"

صاحب علی نے سر اوپر اُٹھایا اور دھیرے سے کہا: "میں ٹھیک ہوں۔"

میں نے کہا: "صاحب علی! تمھارا دل نہیں چاہ رہا ہے کہ میں اس بار شہر جاؤں تو تمھارے لیے نارنگی لے آؤں، کیوں؟"

میں نے صاحب علی سے صرف اس لیے بات کی تھی کہ وہ مجھ کو جواب دے اور بات کرے اس کے علاوہ اور کوئی مطلب نہ تھا۔ چائے والے نے پھر چاہا کہ وہ کچھ بولے۔ لیکن میں نے اس سے کہا کہ وہ ہمارے درمیان نہ بولے، تو بہتر ہے وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ صاحب علی نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس لیے میں نے دوبارہ پوچھا: "صاحب علی تمھیں نارنگی نہیں چاہیے۔"

صاحب علی غبارے کی طرح پھٹ پڑا اور بولا: "اگر آپ سچ کہہ رہے ہیں تو اس وقت کیوں نہیں لائے۔ جس وقت میری ماں مَری تھی؟ اگر آپ اس وقت نارنگی لائے ہوتے، تو میری ماں کبھی نہ مرتی، صاحب علی اپنے غم کو آنسوؤں سے دھو رہا تھا۔ نوروش میاں سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کیا کریں۔ اپنے بیٹے کو چُپ کرائیں۔ یا مجھ سے معافی مانگیں۔ یا ان آنسوؤں کو روکیں۔ جو خود ان کی آنکھوں میں بھی جمع ہو گئے تھے۔ اب میرے لیے لازم تھا کہ صاحب علی کو اس طرح دلاسا دوں اور تسلی دوں کہ نارنگی کا چھلکا اس کی ماں کی جان نہیں بچا سکتا تھا۔ لیکن یہ کام میرے لیے ایک مشکل کام تھا۔

سردار احمد علیگ

نظیر اکبر آبادی

بحیثیت بچوں کے شاعر



نظیر اکبر آبادی جنھیں اردو زبان کا پہلا عوامی شاعر بھی کہا جاتا ہے اپنی زندگی، اپنی شاعری، اپنی زندہ دِلی اور انسانیت دوستی کی خوبیوں اور بلندیوں کے لیے یاد کیے جاتے ہیں۔ بچوں کے لیے بھی ان کے ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے کلام میں بے شمار دل چسپیوں کے ساتھ تعلیم، تربیت اور افادیت کے لازوال نمونے اور مرقعے موجود ہیں۔ ان کے اسی پہلو کا ایک مختصر تعارف ان کی زندگی اور عہد کے پس منظر میں کرانا مقصود ہے۔

نظیر کی پیدائش دہلی میں ۱۷۳۵ء میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب محمد شاہ رنگیلے کا راج تھا۔ بدامنی، انتشار اور خطروں نے زندگی کو گھیر لیا تھا۔ نظیر چار برس کے تھے جب نادر شاہ نے ہندستان پر حملہ کیا اور محمد شاہ رنگیلے کی دہلی کا سہاگ لٹ گیا۔ دل و جگر کے زخم ابھی بھر بھی نہیں پائے تھے کہ احمد شاہ ابدالی نے تین حملے ۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۶ء کے دوران ایسے کیے کہ رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی اچھے اچھے کھاتے پیتے گھرانے نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے اور اپنے وطن عزیز کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ انھیں حالات میں نظیر ۲۲-۲۳ سال کی عمر میں اپنی والدہ اور نانی کے ہمراہ دہلی سے ہجرت کر کے آگرہ میں جابسے۔ اس طرح نظیر کا بچپن دہلی ہی میں گزرا جس کی یادیں بھی اُن کے کلام کا جزبن گئیں۔ "بچپن" پر اُن کی نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

یہ بالے پن کا یارو عالم عجب بنا ہے
یہ عمر وہ ہے اس میں جو ہے سو بادشا ہے
اور سچ اگر یہ پوچھو تو بادشاہ بھی کیا ہے
اب بھی نظیر میری سب کی یہی دعا ہے
جیتے رہیں سبھوں کے آس و مراد والے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

سیڑھی والا گھر۔ کٹرہ شہاب خاں۔ اٹاوہ

آگرہ میں باقی عمر بڑی سادگی، قناعت اور زندہ دلی کے ساتھ گزاری اور جو کچھ دیکھا سنا، جو کچھ سمجھا سوچا اور جو کچھ برتا اور جھیلا سب ایک ایسی نظر اور نظریے کے ساتھ اپنی شاعری میں بیان کیا کہ جس میں قلب کی وسعت، زندگی کی رنگارنگی، محبت اور بھائی چارگی، انسانیت اور دردمندی سب کچھ ہے جس کو آپ بڑے ہو کر پڑھیں گے۔

نظیر بڑے قلندرانہ مزاج کے انسان تھے۔ واجد علی شاہ نے بلایا لیکن نہیں گئے۔ پھر راجا بھرت پور نے اپنے یہاں رہنے کو کہا لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ معلم کی حیثیت سے آگرہ میں جمے رہے۔ راجا بلاس رائے نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے نظیر کی خدمات ضرور حاصل کیں۔ انھیں کے یہاں سترہ روپے ماہوار پر اپنی قناعت بھری زندگی گزار دی۔ بقول مولانا عبدالباری "مال و دولت سے ان کی بے نیازی اور فقیر منشی کا ثبوت اس حکایت سے بھی ملتا ہے کہ لکھنؤ کے نواب (غالباً واجد علی شاہ) نے ان کے کلام کا شہرہ سن کر بلا بھیجا اور قاصد کے ہاتھ تین ہزار روپے بھی بھیجے۔ روپیا نظیر نے گھر میں رکھا اور قاصد سے کہا کہ اپنے فیصلہ سے میں کل مطلع کروں گا۔ لیکن رات بھر روپے کی حفاظت کے خیال سے سو نہ سکے۔ صبح ہوتے ہی قاصد سے کہا کہ بھائی یہ روپیا تو بڑے بکھیڑے کی چیز ہے۔ چور کے ڈر کے مارے میری تو رات بھر ادھیڑ بن میں گزری کہ نیند حرام ہو گئی۔ سو مجھ کو ایسی چیز لینی منظور نہیں۔ آرام سے اپنا سوتا ہوں اور شکرِ خدا بجا لاتا ہوں۔ اپنی اتنی عمدہ عافیت کو میں اتنے روپے کے لیے بیچ نہیں سکتا۔"

نظیر صرف قول کے آدمی نہ تھے۔ وہ ایک عملی انسان تھے۔ اسی لیے ان کی شاعری اور زندگی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اوپر کی حکایت سے ان کا جو عمل سامنے آیا اسی کو انھوں نے اپنی ایک طویل نظم "صدائے درویش" میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

زر کی جو محبت تجھے پڑ جائے گی بابا
دکھ اس میں تری روح بہت پائے گی بابا
ہر کھانے کو ہر پینے کو ترسائے گی بابا
دولت جو ترے ہاں ہے نہ کام آئے گی بابا
پھر کیا تجھے اللہ سے ملوائے گی بابا؟

نظیر نے دنیا کی دھوپ چھاؤں اتنے قریب سے دیکھی تھی اور زندگی کے نور و نار میں سے خود اس طرح گزرے تھے کہ ان کو اللہ کی عظمت و قدرت، دنیا کی بے ثباتی اور انسان و معبود کے مضبوط رشتے کا یقین تو ہو ہی گیا تھا اِس پر صوفیوں اور بزرگوں کی صحبت اور تصوف کے مطالعہ نے ان کے قلب و نظر کی دنیا بدل دی تھی۔ وہ بچے، جوان، بوڑھے سب کو اپنی طرح خدا کو دیکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کی دعوت کس دل نشیں انداز سے دیتے ہیں ؎

تنہا نہ اسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان
ہر باغ میں ہر دشت میں ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں با رنگ میں نیرنگ میں پہچان
منزل میں مقامات میں فرسنگ میں پہچان
ہر عزم ارادے میں ہر آہنگ میں پہچان
ہر دھوم میں ہر صلح میں ہر جنگ میں پہچان
ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

نظیر علم و عرفان کی اس منزل کو پانے کے باوجود بڑے زندہ دل، ہنس مکھ اور انسان دوست تھے اور پابندی کے ساتھ ہندو مسلم تیوہاروں کی دلچسپیوں، میلے ٹھیلوں، کھیل تماشوں اور جلسے جلوسوں اور زندگی کے ہنگاموں میں شرکت کرتے رہے اسی لیے نظیر کو کسی نے "آئینہ بند" بھی کہا ہے جنھوں نے دنیا زمانے کے ہر ہر پہلو اور ہر ہر ادا کی جیتی جاگتی تصویریں خود ان کا لطف اٹھاتے ہوئے عوام کی زبان میں عوام کی خاطر اور عوام کے نگار خانے کے لیے پیش کی ہیں۔ آپ بھی اس نگار خانے کی کچھ جھلکیاں دیکھتے چلیے۔

آگرہ کی تیراکی والی نظم کا ایک بند ؎

جب پیرنے کی رُت میں دلدار پیرتے ہیں
عاشق بھی ساتھ ان کے غم خوار پیرتے ہیں
بھولے سیانے ناداں، ہشیار پیرتے ہیں
پیر و جوان و لڑکے عیار پیرتے ہیں
ادنیٰ غریب مفلس زردار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

ریچھ کے بچے کا حال سنیے —

کل راہ میں جاتے جو ملا ریچھ کا بچہ
لے آئے وہیں ہم بھی اٹھا ریچھ کا بچہ
سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچہ
جس وقت بڑھا ریچھ ہوا ریچھ کا بچہ
جب ہم بھی چلے ساتھ چلا ریچھ کا بچہ

بلبل کی لڑائی کا تماشا دکھانے نظیر اس طرح نکلتے ہیں —

جب لے چلے وہاں سے ہم بلبلوں کا لشکر
سب لوگ ہنس کے بولے اس دم دعائیں دیکر
سب میں میاں نظیر اب تم ہو بڑے قلندر
یہ کھیل آگرے میں اب ختم ہیں تمھیں پر
سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

ہندستان کا حسین و رنگین موسم "برسات" نظیر کے یہاں کیا سماں باندھ رہا ہے —

بولیں بئے بٹیریں قمری پکارے کو کو
پی پی کرے پپیہا بگلے پکاریں تو تو
کیا ہد ہدوں کی حق حق کیا فاختوں کی ہو ہو
سب رٹ رہے ہیں تجھ کو کیا پنکھ کیا پکھیرو
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کون بچہ ہو گا جو ہندستان میں پیدا ہوا ہو اور جاڑوں میں تل کے لڈو نہ کھائے ہوں۔ نظیر نے تل کے لڈو پر فرمایا ہے —

جاڑے میں پھر خدا نے کھلوائے تل کے لڈو
ہر ایک خوانچے میں دکھلائے تل کے لڈو
کوچے گلی میں ہر جا بکوائے تل کے لڈو
ہم کو بھی ہیں گے دل سے خوش آئے تل کے لڈو
جیتے رہے تو یارو پھر کھائے تل کے لڈو

گرمیوں میں "کورے برتن" میں ٹھنڈے پانی کی بات ہی کچھ اور ہے۔ نظیر بھی اسے اپنے جی کی تازگی بتاتے ہیں —

کورے برتن ہیں کیاری گلشن کی
جس سے کھلتی ہے ہر کلی تن کی
بوند پانی کی ان میں جب کھنکی
کیا وہ پیاری صدا ہے سن سن کی
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

روٹی چپاتی کی اہمیت پر نظیر یوں گویا ہوتے ہیں —

پیٹ میں روٹی نہ تھی جب تک دو عالم تھا سیاہ
جب پڑی روٹی تو پہنچی عرش کے اوپر نگاہ
کھل گئے پردے تھے جتنے ماہی سے بے تا بہ ماہ
کیا کرامت ہے فقط روٹی میں یارو واہ واہ
دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

"آدمی نامہ" نظیر کے شاہکاروں میں سے ہے۔ اس کے معنوں کی گہرائی میں آپ بڑے ہو کر پہنچ سکیں گے —

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز، یاں
اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر دنیا کی بے ثباتی اور موت کا بول بالا ہونے کی حقیقت تمثیل میں اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

گر تو ہے لکھی بنجارہ اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر، مصری، قند، گری، کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ، منقا، سونٹھ، مرچ، کیا کیسر، لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

جن نظموں سے کچھ اشعار آپ نے اس وقت پڑھے، یہ بڑی نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ نظیر اکبرآبادی نے ہندو مسلم تیوہاروں پر بھی بڑی دلکش نظمیں لکھی ہیں جو ان کے کلام کا مجموعہ "دیوانِ نظیر" میں موجود ہیں۔ اس مضمون کو پڑھ کر آپ کے اندر نظیر کے سلسلے میں دلچسپی مزید بڑھی ہوگی اس لیے آپ نظیر کی باقی نظموں کو بھی تلاش کیجیے اور زبانی یاد کیجیے۔

نظیر اکبرآبادی پر بڑھاپے میں فالج کا اثر ہوا اور اسی مرض میں مبتلا رہ کر وہ اپنی یادگار شاعری کی شکل میں چھوڑ کر ۱۲۴۶ھ میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ آگرہ میں جس جگہ نیم کے درختوں کے نیچے بورے بچھا کر وہ بچوں کو پڑھاتے اور دوستوں، شاگردوں سے ملاقاتوں کا اہتمام کرتے تھے، وہیں بعد وفات آخری آرام گاہ بھی پائی۔

ضروری تصحیح: "اپریل کے شمارے" میں "جھولا کتنا اچھا ہے" قاضی حسن رضا صاحب کے نام سے شائع ہوگئی تھی۔ دراصل اس نظم کے خالق عبدالمتین صاحب نیاز ہیں۔ اس فروگذاشت کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے۔ (اڈیٹر)

مسعودہ حیات

سیمیں کی سالگرہ

میری سیمیں میری پیاری
میری گڑیا۔ میری دُلاری
کیسے اُڑ کر واں تک پہنچیں
سالگرہ کے جشن کو دیکھیں
سالگرہ ایسے نہ مناؤ
رانی باجی کو تو بلاؤ
اُس دن ننھی حور بنوگی
کتنے دِلوں کا نور بنوگی
پاس پڑوس کے سارے بچّے
لائیں گے اچھے اچھے تحفے
میں ہی پہلی سال گرہ پر
خوابوں کا سنسار سجا کر
بھیج رہی ہوں دل کی دعائیں
ایسے جشن ہزاروں آئیں
عمر گزارو سرو سمن میں
جوت جگاؤ اپنے وطن میں
علم و ہنر کا گلشن مہکے
اپنے پرائے خوش ہوں تم سے

۹۹۳۔ بازار چتلی قبر دہلی ۶



سید محمود نقوی

گمشدہ بھائی

(روس کے شمالی علاقے کی ایک مشہور کہانی)

بہت پہلے کی بات ہے جب ٹنڈرا کے علاقے میں نہ تو اتنا شدید کہرا چھایا رہتا تھا اور نہ اتنی زیادہ ٹھنڈ پڑتی تھی، وہاں ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا جس کا نام کیبل کیہی تھا یعنی ایک ایسا شخص جس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ وہ دونوں میاں بیوی ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے اور دور دور تک کسی اور انسان کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ وہ دونوں جنگلی جانوروں اور مچھلیوں کا شکار کر کے اپنی گزر بسر کرتے۔ اکثر وہ دونوں اپنی تنہائی سے اکتا جاتے، دعا کرتے کہ خدا انھیں ایک بچے کی نعمت سے مالا مال کر دے یا بھولے بھٹکے کچھ اور لوگ وہاں آکر آباد ہو جائیں لیکن کافی انتظار کے بعد بھی جب ان کی خواہش پوری نہ ہوئی تو بیوی تنہائی سے عاجز آکر میاں سے تقاضا کرنے لگی: "آپ ہمت کر کے سفر پر نکلیے، کہیں تو کچھ اور آدمی بستے ہوں گے، ان سے مل کر کچھ لوگوں کو یہاں آنے پر آمادہ کیجیے یا پھر ہم لوگ وہیں چلے چلیں گے، آخر کب تک یہاں اکیلے پڑے رہیں۔"

اسی طرح بیس سال کی مدت گزر گئی۔ بیوی کے باربار کہنے پر میاں نے سفر کا ارادہ کیا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ سفر کس سمت میں کرے تاکہ کامیابی ہو اور پھر بغیر راستہ بھولے بھٹکے وہ اپنے گھر لوٹ بھی سکے۔ اس نے اپنے سامانِ سفر میں کچھ کبوتر بھی رکھ لیے اور اپنی بیوی سے کہا کہ ایک ایک مہینے کے وقفے سے وہ ایک کبوتر واپس بھیجتا رہے گا جو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ اس کا شوہر ابھی تک زندہ ہے اور اپنی مہم میں مشغول بھی۔ لیکن جب بھی ایک مہینے سے زائد مدت گزر جانے کے باوجود کوئی کبوتر واپس نہ پہنچے تو اس کا مطلب ہوگا کہ اس کا شوہر اب اس دنیا میں موجود نہیں۔ پھر اسے پورا حق حاصل ہوگا چاہے تہیں اسی پہاڑی پر رہے یا کہیں اور چلی جائے لیکن کہیں اور جانے کی صورت میں اس کا دھیان رکھنا ہوگا کہ اس سمت میں سفر نہ کرے جدھر اس کا شوہر جا رہا ہے بلکہ اس کی مخالف سمت میں سفر اختیار کرے تاکہ ان مصیبتوں اور بلاؤں سے محفوظ رہے جن میں اس کا شوہر گرفتار ہو۔

اس ہدایت کے ساتھ کیبل کیہی طلوع ہوتے ہوئے سورج کی سمت میں روانہ ہو گیا۔ گھنے جنگلوں اور پرشور دریاؤں کو عبور کرتے ہوئے وہ ہمت کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے تھا۔ چاند کے طلوع وغروب سے وہ دنوں اور مہینوں کا حساب رکھتا اور مہینا پورا ہوتے ہی وہ ایک کبوتر اپنے گھر کی طرف روانہ کر دیتا۔ اپنے سفر کے دوران اس نے کئی ایسے جانوروں کو دیکھا جو پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے، لیکن حیوانِ ناطق یعنی انسان جس کی اسے تلاش تھی وہ کہیں بھی نظر نہ آتا تھا۔ اسی طرح کئی مہینے کی مدت گزر گئی۔ وہ سفر کی دشواریوں سے عاجز ہو گیا تھا۔ اپنے پاس کا آخری کبوتر گھر کی طرف روانہ کرتے ہوئے اسے خیال آیا اس ساری مدت میں وہ ایک لفظ بھی کسی سے نہیں بولا تھا،

۱۔ نیو برج پوری۔ نئی دہلی ۵۱

گھر پر رو[illegible] ہی دیر رہی بیوی سے بات چیت تو ہوتی تھی۔ وہ ایک دریا کے کنارے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھا ان ہی تصورات میں غرق تھا۔ اپنا سفر جاری رکھنے کے لیے دریا پار کرنے کی ہمت بھی نہیں پڑ رہی تھی کہ اچانک کچھ آوازوں نے اُسے چونکا دیا، وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا، ایسا محسوس ہوا جیسے کہیں دور کچھ انسان بول رہے ہوں۔ ایک خوشی کی لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی اور تیز تیز قدموں سے وہ اسی طرف روانہ ہو گیا جدھر سے آوازیں آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ خاصی مسافت طے کرنے کے بعد اسے اونچے ٹیلے پر ایک خوبصورت مکان دکھائی دیا۔ مکان کے باہر شور مچاتے اور کھیلتے ہوئے کئی بچے تھے اور پاس ہی ایک بنچ پر ایک معمر شخص بیٹھا تھا جس کی خوش پوشاکی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے لیکن وہ کسی سوچ میں غرق معلوم ہو رہا تھا۔

مسرت اور شرم کے ملے ہوئے جذبات کے ساتھ کیل کیہی ذرا دیر ساکت کھڑا رہا۔ کیونکہ مدتوں بعد وہ اپنے کسی ہم جنس کے سامنے تھا۔ پھر وہ اس شخص کی طرف بڑھا جو یقیناً عمر میں اس سے کچھ بڑا دکھائی دے رہا تھا اور اس سے مخاطب ہوا: "جناب والا! میں مہینوں پہلے اپنے گھر سے اسی تلاش میں روانہ ہوا تھا کہ کچھ اور آدمیوں سے مل سکوں، خدا کا شکر ہے کہ میں اپنی مہم میں کامیاب ہو گیا۔ میں یہاں سے بہت دور اپنی بیوی کے ساتھ ایک پہاڑی پر رہتا ہوں، ہم لوگ اپنی تنہائی سے تنگ آ چکے ہیں، اسی لیے میری بیوی نے بڑے اصرار کے ساتھ مجھے اس سفر پر روانہ کیا تھا تاکہ کچھ اور انسانوں کا ساتھ حاصل ہو سکے۔ اب آپ اپنے بارے میں فرمائیں، آپ بھی کسی فکر میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔؟

ہاں مجھے بھی اپنے ایک بھائی کی تلاش ہے جو تقریباً تیس سال پہلے ہم سے بچھڑ گیا تھا اس وقت میں تیرہ چودہ برس کا تھا اور وہ صرف پانچ چھ برس کا لڑکا تھا۔ ہم لوگ ایک دن چپ چاپ اپنے والد کے پیچھے پیچھے جنگل میں پہنچ گئے، وہ شکار میں مصروف تھے۔ میں ایک گلہری اور ایک چڑیا کی لڑائی دیکھنے میں محو ہو گیا اور میرا چھوٹا بھائی رس بھریوں کے چکر میں نہ جانے کدھر نکل گیا۔ بہت تلاش کے بعد بھی اس کا پتا نہ چل سکا۔ میں اس کی گمشدگی کے لیے خود کو ذمہ دار سمجھتا ہوں کیونکہ میں ہی اسے اپنے ساتھ جنگل لے گیا تھا۔ میرے والدین کو بھی اس کی جدائی کا بہت رنج تھا لیکن نہ جانے کیوں میرے والد نے مرتے مرتے یہ کہا تھا کہ میرا چھوٹا بھائی ابھی زندہ ہے اور ایک نہ ایک دن ہم دونوں کی ملاقات ضرور ہو گی، چاہے پچاس برس بعد ہی سہی۔ اسی امید پر زندہ ہوں، خدا کرے میرے والد مرحوم کا خیال صحیح ثابت ہو اور میں اپنے بھائی کو وہ مال و اسباب سونپ سکوں جس کا میراث میں وہ حقدار ہے۔ یہ ہے میری دکھ بھری داستان۔ اب تم اپنے بارے میں بتاؤ، تمہارا نام کیا ہے، کہاں کے رہنے والے ہو اور تمہارا پیشہ کیا ہے؟

کیل کیہی میرا نام ہے اور تقریباً بیس برس سے میں اپنی بیوی کے ساتھ یہاں سے بہت دور پچھم کی طرف ایک پہاڑی پر رہتا ہوں، ہم لوگ جنگلی جانوروں اور اور مچھلیوں کا شکار کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ہم دونوں کسی تیسرے آدمی کی صورت دیکھنے کو برسوں سے ترس رہے تھے، اسی تلاش میں اپنی بیوی کو تنہا چھوڑ کر میں نے یہ سفر اختیار کیا تاکہ کچھ اور انسانوں سے ملاقات ہو سکے اور انھیں اپنے ساتھ رہنے کے لیے آمادہ کیا جا سکے یا پھر ہم لوگ ہی منتقل ہو جائیں اور اگر جلدی ہی میں اپنی بیوی کے پاس نہ پہنچا تو وہ میری طرف سے مایوس ہو کر خود بھی کسی دوسری سمت سفر پر روانہ ہو جائے گی۔

کیل کیہی کی سرگذشت سن کر اُس خوش پوشاک کو یہ خیال گزرا کہ کہیں وہی تو اس کا گمشدہ بھائی نہیں ہے اور اس طرح اس کے مرحوم والد کی پیشگوئی صحیح ثابت ہو جائے لیکن اس نے اپنے شبہ کا اظہار مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے بچھڑے ہوئے بھائی کے بائیں پیر پر ایک گہرے زخم کا نشان تھا جس کی تصدیق کے بعد ہی کچھ کہنا مناسب ہو گا۔ یہ ساری باتیں سوچتے ہوئے اس نے کیل کیہی سے

دو چار دن قیام کرنے پر اصرار کیا تاکہ اس کی تھکن بھی دور ہو سکے اور وہ خود بھی اپنے شبہ کو یقین میں بدل سکنے کا موقع پا جائے۔

رات کو کھانے سے فراغت کے بعد جب کیل کیھی اپنے بستر پر لیٹا تو جلدی ہی اس پر گہری نیند کا غلبہ ہو گیا۔ اس کا میزبان اسی انتظار میں تھا وہ دبے پانو کمرے میں داخل ہوا اور بائیں پیر سے کمبل ہٹایا تو اس پر وہی نشان موجود تھا۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، بے اختیار اس کے منہ سے آواز نکلی "میرا بھائی" اور وہ اس سے لپٹ گیا۔ وہ اپنے گھر والوں کو آواز دے رہا تھا "سب لوگ آؤ میرا بھائی مل گیا۔ میرے ابا جان نے بالکل صحیح کہا تھا۔"

کیل کیھی کی آنکھ کھلی تو وہ حیرت زدہ تھا کہ معاملہ کیا ہے جب اسے واقعات کی تفصیل معلوم ہوئی تو وہ اپنے کو انتہائی خوش قسمت شخص سمجھ رہا تھا کہ وہ نہ صرف انسانی آبادی میں پہنچ گیا بلکہ اپنے حقیقی بھائی کے پاس بھی۔ اس نے کئی بار اپنے بائیں پیر کے اس نشان پر نظر ڈالی جو اس کی شناخت کا سبب بنا تھا۔ وہ اپنی یادداشت کے سہارے ماضی کے واقعات میں کھویا ہوا تھا لیکن اس سے آگے وہ نہ بڑھ سکا کہ ایک بوڑھی عورت نے اسے پالا تھا جس نے بعد میں اپنی لڑکی کے ساتھ اس کی شادی کر دی تھی۔

کیل کیھی کچھ سوچتے ہوئے اپنے میزبان سے مخاطب ہوا "یقیناً یہ میری خوش قسمتی ہو گی کہ میں آپ کا چھوٹا بھائی بن کر رہوں لیکن اس بارے میں آخری فیصلہ کیے جانے سے پہلے میری بیوی کے خیالات بھی معلوم کر لیے جائیں تو اچھا ہے کیونکہ میرے ماضی کے متعلق اگر کسی کو کچھ معلومات ہیں تو اسی کو ہیں۔ اس لیے مجھے فوراً اپنے گھر جانے اور اپنی بیوی کو لانے کی اجازت دی جائے۔"

کیل کیھی کی اس تجویز کو اس کے میزبان نے منظور کرتے ہوئے اسے ایک تیز رفتار گھوڑا دیا تاکہ وہ جلد اپنی بیوی کو لے کر واپس آجائے۔ چنانچہ دوسرے دن صبح کیل کیھی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ساری مسافتیں طے کرتا ہوا وہ آخر اپنے گھر کے قریب پہنچ گیا۔ دور ہی سے پہاڑی کی چوٹی پر اُسے اپنا چھوٹا سا گھر نظر آیا تو خوشی اور خوف کے ملے جلے جذبات نے اُسے بے چین کر دیا۔ خوشی گھر پہنچنے کی تھی اُمید سے زیادہ اپنی مہم کی کامیابی کے ساتھ اور خوف اس بات کا کہ کہیں اس کی بیوی ایک مہینے سے زیادہ مدت گزر جانے اور کوئی کبوتر واپس نہ پہنچنے کے باعث مخالف سمت میں روانہ نہ ہو گئی ہو۔ لیکن اُس کا یہ اندیشہ زیادہ دیر برقرار نہ رہا کیونکہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں سن کر اس کی بیوی خود ہی گھر سے باہر نکل آئی۔ اپنے شوہر کو دیکھ کر خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیل کیھی نے اُسے اپنی سرگذشت سنائی اور دوسرے دن صبح ہی انسانوں کی آبادی کی طرف لوٹ چلنے کا پروگرام بنایا۔

چند روز ہی بعد کیل کیھی اپنی بیوی کے ساتھ پھر اُسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوا تھا۔ اس کے میزبان نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ جب سب لوگ ایک کمرے میں بیٹھے بات چیت میں مصروف تھے تو کیل کیھی نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کیا تمھاری ماں نے کبھی میرے بارے میں تمھیں کچھ بتایا تھا؟"

"وہ صرف یہی کہتی تھی کہ آپ انھیں جنگل میں ملے تھے اور اس وقت آپ کافی پریشان اور بھوکے تھے۔" اس کی بیوی نے جواب دیا۔ "وہ آپ کو اپنے ساتھ لے آئیں اور میرے ساتھ ہی آپ کی پرورش کی۔ آپ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے یہ کچھ آپ بھی صحیح طور سے نہیں بتا پاتے تھے۔ ہاں آپ کے پاس ایک تیر کمان ضرور تھا جو اب بھی محفوظ ہے۔"

"وہ تیر کمان کہاں ہے، لاؤ دیکھیں" میزبان بے ساختہ بول اُٹھا۔

کیل کیھی کی بیوی اپنے سامان سے وہ تیر کمان نکال کر لائی تو میزبان تقریباً چیخ پڑا۔ "ارے یہ تو وہی تیر کمان ہے جو اس وقت میرے بھائی کے ہاتھ میں تھا یہ ہمارے ابا جان کے ہاتھ کا بنایا ہوا ہے اور بالکل ایسا ہی

تیر کمان میرے پاس بھی ابا جان کی نشانی کے طور پر موجود ہے۔ مینسہان نے ایک بار پھر اپنے گم شدہ بھائی کو سینے سے لگا لیا تھا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا: "ابا جان کا خیال بالکل صحیح نکلا تیس سال بعد مجھے میرا بھائی مل گیا۔" سارے گھر والوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی اور کیل کیہی کی بیوی کہہ رہی تھی: "میری ماں کہا کرتی تھی کہ اس تیر کمان کو احتیاط سے رکھنا اور کبھی اپنے سے الگ نہ کرنا۔" اگر میں اس کا کہنا نہ مانتی تو آج مجھے پچھتانا پڑتا۔



بچوں کے لیے مزیدار اور دلچسپ کہانیاں

جوہرِ قابل	مسعود احمد برکاتی	۳/-
بھوتوں کا جہاز	ڈاکٹر شمیم حنفی	۶/-
خرگوش کی چال	آصفہ مجیب	۲/۵۰
ہار کی تلاش	ریاض احمد خاں	۷/۵۰
محمد شفیع الدین نیرّ	ڈاکٹر اطہر پرویز	۶/-
اس نے کیا کر نہ جانا	آصفہ مجیب	۱/۲۰
دُم کٹا سانپ	محمد قاسم صدیقی	۱/-
صحت کی الف بے	مسعود احمد برکاتی	۳/-
موم کا محل	پروفیسر محمد انس	۴/-
پہیلیاں	ڈاکٹر سیفی پریمی	-/۸۰
چھوٹا لڑکا	عبدالغفار مدھولی	۱/۵۰
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	کوثر بانو	۱/۵۰
شہزادہ اور ٹھگ		۲/-
لال مُرغی	عبدالواحد سندھی	۱/۵۰
چمپاوت کا آدم خور شیر	محمد معین	۱/۵۰
ایک کچوری تیل میں راجاجی	اسرار ندوی	۱/۵۰
چوری کی عادت	عبدالغفار مدھولی	۲/-
دادا نہرو	منور لکھنوی	۵/-
تابیل خاں	محمد حسین حسّان جامعی	۱/۵۰
میگھ نگر کا راجا	ریاض احمد خاں	۱/۲۵
سرکس	ڈین گپسیر	۱/۵۰
سُرخ جوتے	بیگم قدسیہ زیدی	۲/۵۰
پلک نہ مارو	یوسف ناظم	۲/-
چمن حسن عبدالرحمٰن	قراۃ العین حیدر	۵/-
تین اناڑی	عصمت چغتائی	۳/-
چنبیلی	محمد حسین حسّان	-/۸۰
امیر خسرو	سلمیٰ اجمیری	۵/۵۰



وکیل نجیب

جنگل میں منگل

منگل نے جلدی جلدی موٹھ سے پانی کھیتوں میں چاروں طرف پھیلا دیا۔ صبح کے سات بج چکے تھے۔ گھر آیا اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ تبھی اس کے والد آئے انھوں نے کہا:

"بیٹا آج ناگ پنچمی ہے اور ہر سال کی طرح اس سال بھی تمھیں ورنگل میں کشتی کے مقابلے میں شریک ہونا ہے"

منگل نے کھانا کھاتے جواب دیا:

"جی ابا جان۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اسی لیے میں نے صبح سویرے ہی کھیتوں کو پانی دے دیا ہے اور اب روانہ ہوا ہی چاہتا ہوں"

"ٹھیک ہے بیٹے۔ ہر سال تمھارے ساتھ تمھارے پچا جایا کرتے تھے لیکن آج وہ ٹریکٹر کی مرمت کے لیے شہر گئے ہوئے ہیں اس لیے اس بار تم کو اکیلے ہی جانا ہوگا۔ راستہ خطرناک ہے۔ جنگلی جانوروں کا ڈر رہتا ہے۔ ذرا ہوشیاری سے جانا"

"آپ میری فکر مت کیجیے ابا جان۔ مجھے ورنگل کا مختصر راستہ معلوم ہے"۔ اور دیکھو منگل کے والد نے کہا:

"وہاں جاکر گانو کے مکھیا دین دیال کو میرا سلام کہنا اور "بھرو کاکا" کو بھی سلام عرض کر دینا"

"جی ابا جان بہت اچھا"

اتنا کہہ کر اس کے والد چلے گئے۔

ورنگل نامی گانو میں ہر سال ناگ پنچمی کے موقع پر کشتیوں کا دنگل ہوا کرتا تھا۔ آس پاس کے تمام گانو کے نامی گرامی پہلوان اس میں شریک ہوتے تھے۔ جیتنے والے پہلوانوں کو انعامات دیے جاتے تھے۔

منگل مورشی گانو کا رہنے والا تھا۔ اس کا اصلی نام پیار محمد تھا لیکن لوگ اسے منگل کے نام سے ہی جانتے تھے کیونکہ وہ منگل کے دن پیدا ہوا تھا۔ اسی طرح اس کے والد کا نام پیر محمد تھا لیکن گانو کے سبھی لوگ انھیں پیرو پہلوان کے نام سے ہی یاد کرتے تھے۔ ان کا اپنا اکھاڑا تھا۔ گانو کے بہت نوجوانوں کو انھوں نے کشتی کے فن میں ماہر کر دیا تھا۔ ان کا بیٹا پیار محمد عرف منگل پہلوان بھی ایسے ہی نوجوانوں میں سے ایک تھا۔

منگل ایک ہونہار فرماں بردار تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ قصبہ کے اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے پرکھوں کی زمین سے اناج پیدا کر کے ملک کی غذائی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ گذشتہ دو سال سے ورنگل سے انعام جیت کر لا رہا تھا۔ اس بار اس کا مقابلہ گورداس پور کے مشہور پہلوان ڈوما سے ہونے والا تھا۔ بڑی کھار کی کشتی تھی اور ٹکر کا مقابلہ ہونے والا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد منگل نے اپنا سامان لیا اور ورنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگل کے مختصر راستے پر تیزی

نجیب منزل۔ متصل لال اردو اسکول، مومن پورہ۔ ناگپور - ۱۸

سے چلنے لگا۔ چاروں طرف درختوں کے گھنے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ درختوں پر مختلف قسم کے پرندے چہچہا رہے تھے۔ قدرت کے اس بہترین ماحول سے لطف اندوز ہوتا ہوا وہ جنگل کی طرف بڑھنے لگا۔ پگڈنڈی اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ آخر تقریباً ۱۲ بجے اس نے جنگل کی حدود کو پار کیا سامنے سانگل ندی دھیمی رفتار سے بہہ رہی تھی۔ پانی زیادہ نہیں تھا۔ اس نے ندی کو پار کیا دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اس میدان کی طرف چل پڑا جہاں مقابلہ ہونے والا تھا۔

میدان میں تماشائیوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ تقریباً سبھی پہلوان آ چکے تھے اور ڈنڈ بیٹھک لگانے میں مصروف تھے۔ ایک کونے میں اسے دین دیال جی نظر آئے منگل ان کی طرف گیا۔ انھیں آداب کیا اور اپنے والد کا سلام بھی عرض کیا۔

گانو کے مکھیا دین دیال نے اس کی پیٹھ تھپتھپا کر اسے شاباشی دی اور پوچھا؟

"تمھارے چاچا دکھائی نہیں دے رہے ہیں؟"

"وہ ایک ضروری کام سے شہر گئے ہوئے ہیں اس لیے اس دفعہ وہ نہیں آسکے۔"

وہیں ایک طرف بھرو کاکا بھی بیٹھے ہوئے تھے وہ ان کے دور کے رشتہ دار تھے منگل ان کے پاس گیا اور سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا اور دعائیں دیں۔

ملنے ملانے میں ایک بج گیا۔ تبھی دنگل میں چھوٹی کشتیوں کے پہلوانوں کو آوازیں دی جانے لگیں۔ منگل نے بھی تھوڑی بہت ورزش کی۔

ایک ایک کر کے تمام کشتیاں ختم ہوگئیں اور آخری کشتی کا اعلان کیا گیا۔

"بھائیو اب آپ کے سامنے اس سال کی سب سے مشہور جوڑی پیش کی جا رہی ہے منگل پہلوان بمقابلہ ڈوما پہلوان۔"

اس اعلان سے پورا میدان تالیوں کے شور سے گونجنے لگا۔

دونوں پہلوان دنگل میں آئے اور ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے۔ مجمع اس طرح ساکت ہوگیا گویا کسی جادوگر نے سب کو پتھر کا بنا دیا ہو۔

ریفری کی سیٹی کے ساتھ ہی کشتی کا آغاز ہوا۔ دونوں پہلوان طاقت اور داؤ پیچ میں سدھے ہوئے تھے۔ ہر لمحہ یوں محسوس ہوتا کہ اب فیصلہ ہوا اور اب ہوا۔ کبھی ڈوما پہلوان بھاری پڑتا تو کبھی منگل۔ دونوں پہلوان چیتے کی سی پھرتی اور شیر کی سی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آدھے گھنٹے تک لڑتے رہے۔ اکھاڑے کی لال مٹی اور پسینے کی وجہ سے جسم لہولہان دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں پہلوان آخری قوت لگا کر کشتی جیتنے کی کوشش میں لگے ہوئے تبھی منگل پہلوان نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور ایسی دھوبی پچھاڑ ماری کہ ڈوما پہلوان لاکھ کوشش کے باوجود اپنے آپ کو چت ہونے سے نہیں بچا سکا۔

پورا مجمع منگل پہلوان زندہ باد کے نعرے لگانے لگا۔ کچھ لوگ بڑھ کر آئے انھوں نے منگل کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا لیکن منگل نیچے اتر آیا اور گانو کے مکھیا دین دیال جی سے ہاتھ ملایا۔ بھرو کاکا سے ملا اور ڈوما کو جا کر گلے لگا لیا۔ پھر اپنا انعام لیا اور واپس چلنے کی تیاری کرنے لگا۔

سب سے ملتے ملاتے ۵ بج گئے۔ اسی وقت وہ اپنے گانو کی طرف روانا ہوگیا۔ راستے میں سانگل ندی پڑی وہاں جا کر اچھی طرح نہایا اور جنگل کی حدود میں داخل ہوگیا۔

شام ہو چلی تھی۔ درختوں کی شاخیں اور پتیاں سورج کی روشنی کو پوری طرح زمین تک آنے نہیں دے رہی تھی۔ درختوں پر پرندے بے تحاشا شور مچا رہے تھے۔ جیسے جیسے اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا ویسے ویسے منگل کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جنگل کے اس خطرناک راستے کو وہ جلد از جلد پار کر لینا چاہتا تھا۔

ابھی اس نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ ایک مقام پر اسے ایک عجیب آواز نے رکنے پر مجبور کر دیا۔ جہاں وہ

کھڑا تھا درختوں کے پیچھے ایک چٹانی سلسلہ تھا اُس طرف سے کسی کے رونے اور سسکنے کی آواز آرہی تھی۔ پہلے تو وہ ڈر گیا۔ خوف سے اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کسی بھوت پریت کا خیال کر کے وہ کانپنے لگا۔ لیکن پھر اس نے اپنی ساری ہمت جمع کی اور اس طرف بڑھا جدھر سے رونے کی آواز آرہی تھی۔ جھاڑیوں کو چیرتا ہوا چٹانوں کی پچھلی طرف گیا تو اس نے دیکھا کہ ایک دس گیارہ سال کا لڑکا بندھا ہوا پڑا ہے اور سسک سسک کر رو رہا ہے۔

منگل کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس ویرانے میں کون ظالم شخص ہے جو اس معصوم بچے کو باندھ کر چلا گیا ہے۔ آس پاس نظر دوڑائی تو اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ منگل دھیرے دھیرے چلتے ہوئے لڑکے کے پاس پہنچا تو لڑکا خوف سے سہم گیا اور چیخنے لگا۔

"مجھے مت مارو۔ مت مارو۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے گھر جانے دو۔"

منگل نے بچے کو غور سے دیکھا۔ اسکول کا یونیفارم پہنے ہوئے تھا۔ اس نے لڑکے کو دلاسا دیا اور کہا کہ تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟ کن لوگوں نے تمھیں یہاں قید کیا ہے؟

لڑکا چند لمحے اُسے حیران و پریشان نظروں سے دیکھتا رہا۔ منگل نے بڑھ کر اس کے ہاتھ پیر کھول دیے اور اپنے ساتھ لے کر باہر آیا۔ لڑکا بہت کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ شاید دو تین دنوں سے اسے برابر کھانے کو نہیں ملا تھا۔ پگڈنڈی پر پہنچ کر منگل نے پھر لڑکے سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟ یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ پرسوں جب میں اسکول سے گھر واپس آرہا تھا تو دو آدمیوں نے مجھے زبردستی اٹھا کر ایک کار میں بٹھا دیا اور مجھے ایک گاؤں میں لے کر گئے۔ وہاں سے انھوں نے میرے پتا جی کو فون کیا کہ تمھارا بچہ ہمارے پاس ہے۔ تم پچاس ہزار روپوں کا انتظام تین دن کے اندر کر لو اور ہم جہاں کہیں گے وہاں پہنچا دو تو تمھارا بچہ تم کو صحیح سلامت مل جائے گا ورنہ ہم اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔

دونوں آدمیوں نے ایک چھوٹے سے کمرے میں ۲ دن تک مجھے بند رکھا اور تیسرے دن انھیں کسی طرح معلوم ہوگیا کہ پولیس میری تلاش میں ہے تو وہ مجھے اس جنگل میں لے آئے اور یہاں لاکر باندھ دیا۔ وہ لوگ کل صبح مجھے یہاں سے لے کر کسی اور جگہ جانے والے ہیں۔"

اتنا کہہ کر لڑکا رونے لگا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

منگل نے لڑکے کی باتیں سنیں تو کانپ اٹھا۔ معصوم اور مالدار بچّوں کو اغوا کر کے ان کے والدین سے رقم حاصل کرنے کی خبریں وہ اخبار میں پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ لیکن وہ اس قدر ظلم کرتے ہیں اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ منگل نے لڑکے کو دلاسا دیا اور اس سے اس کا نام پوچھا۔

لڑکے نے کہا: "میرا نام سریش ہے۔ میرے پتا جی کی شہر میں کار اور ٹریکٹر کی دکان ہے۔"

منگل نے لڑکے کو کاندھے پر بٹھا لیا اور تیزی سے گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ جنگلی جانوروں کے چیخنے اور چلانے کی متواتر آوازیں دور سے آرہی تھیں۔ وہ جلد از جلد جنگل کو پار کر لینا چاہتا تھا۔ آخر تقریباً ۷ بجے شام میں وہ گھر پہنچ گیا۔ اس کے والد اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا اس کے والد نے پوچھا۔

"بیٹے کیا ہوا تمھاری کُشتی کا؟"

"کُشتی بڑی اچھی ہوئی ابا جان آپ کی دعا سے میں نے مقابلہ جیت لیا۔"

یہ سن کر اس کے والد خوش ہو گئے انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اسے دعائیں دیں پھر ان کی نظر سریش پر پڑی۔

"کیوں منگل؟ یہ لڑکا کون ہے؟" اس کے والد نے حیرت سے پوچھا۔

منگل نے لڑکے کے اغوا اور جنگل میں ملنے کی پوری داستان انھیں سنا دی۔ بیرو پہلوان نے کہا۔ "اس لڑکے کو تو ہم بچا سکتے ہیں لیکن ان ظالموں اور بچوں کا بیوپار

کرنے والوں کو بھی سزا دینا ضروری ہے۔"
منگل نے کہا "ٹھیک ہے ابا جان، میرا خیال ہے کہ آج رات پھر سریش کو گھر میں رکھتے ہیں۔ صبح پانچ بجے اسے لے جاکر پھر اسی جگہ باندھ دیں گے اور ہم چھپ کر بیٹھ جائیں گے۔ جیسے ہی وہ آئیں گے ہم انھیں گرفتار کر لیں گے اور پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ دونوں نے تجویز سے اتفاق کیا۔ سریش کا منہ ہاتھ دھلایا اور اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا اور کہا "بیٹے سریش، دیکھو ہم جیسا کہتے ہیں ویسا کرو۔ ہم تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ تمھیں تمھارے والدین کے پاس صحیح سلامت پہنچا دیں گے"۔
سریش پہلے تو ڈرتا رہا لیکن ان کے یقین دلانے پر وہ مان گیا۔ رات پھر وہ اطمینان سے سوتے رہے اور صبح چار بجے اٹھ کر سریش کو ساتھ میں لے کر جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔
جس جگہ سے سریش کو منگل نے آزاد کیا تھا پھر اسی طرح وہاں پر اس کو باندھ دیا اور دونوں چٹانوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔
دو گھنٹے کے اکتا دینے والے انتظار کے بعد دو آدمی آئے اور انھوں نے سریش کی رسیاں کھولنی شروع کیں۔
منگل اور پیرو پہلوان ان کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی انھوں نے سریش کی رسیاں کھولیں دونوں باپ بیٹے اُن بدمعاشوں پر ٹوٹ پڑے۔ گھونسوں اور لاتوں سے خوب پٹائی کی۔ زمین پر پٹخ پٹخ کر دونوں بدمعاشوں کو لہولہان کر دیا۔ جب دونوں ادھ مرے ہو گئے تو ان کو اسی رسّی سے باندھ کر کھینچتے ہوئے گاؤں کی طرف لے چلے۔
گاؤں میں جب اُن بدمعاشوں کو لایا گیا تو لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔ لوگ غصّے سے بے قابو ہو کر انھیں مارنا چاہتے تھے لیکن پیرو پہلوان نے کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔

سب مل کر انھیں تھانے لے گئے اور پورا حال کہہ سنایا۔ پولیس والوں نے دونوں بدمعاشوں کو حوالات میں بند کر دیا اور سریش کے والد کو اطلاع بھجوا دی کہ ان کا بیٹا مل گیا اور صحیح سلامت ہے۔ اسے آکر لے جائیں۔
جیسے ہی سریش کے والد کو اطلاع ملی وہ اپنی کار لے کر اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ ساتھ میں سریش کی ممی بھی تھیں۔
پولیس اسٹیشن پہنچ کر انھوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا تو دوڑ کر لپٹ گئے اور پیار کرنے لگے۔ خوشی سے ان کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ حولدار نے سریش کے ملنے کی پوری کہانی اس کے والد کو سنائی۔ سریش کے والد اور اس کی والدہ حولدار کے ساتھ منگل اور پیرو پہلوان سے ملنے کے لیے آئے۔ دونوں اپنے کھیت پر کام کر رہے تھے۔
سریش کے ماتا پتا نے ان دونوں باپ بیٹوں کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور انھیں ۲۵ ہزار روپے انعام کے طور پر دینے لگے۔ لیکن پیرو پہلوان نے وہ روپے لینے سے انکار کر دیا بلکہ ان سے ایک درخواست کی کہ ان پیسوں سے ایک ٹریکٹر خرید کر گرام پنچایت کو دے دیں تاکہ گاؤں کے غریب کسان وقت ضرورت اس کا استعمال کریں اور زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کر کے ملک کی غذائی حالت کو سدھار سکیں۔
یہ تجویز انھیں پسند آئی اور انھوں نے گرام پنچایت کو ٹریکٹر دینے کا وعدہ کیا۔ ایک بار پھر انھوں پیرو پہلوان اور منگل کا شکریہ ادا کیا۔ سریش نے ان کے پیر چھوئے اور خوشی خوشی اپنے شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہمارے دفتر میں رسالہ نہ ملنے کی شکایتیں آتی رہتی ہیں ہم پوری ذمہ داری سے پرچہ پوسٹ کرتے ہیں لیکن پھر بھی آپ کو رسالہ نہیں ملتا۔ ایسی صورتیں اسی مہینے کے پہلے ہفتے میں اطلاع دینا ضروری ہے۔ ورنہ پرچہ دوبارہ بھیجنا ممکن نہ ہو سکے گا۔
(سرکولیشن منیجر)

عبدالمجید آنیکل

بلا عنوان کہانی

یہ کہانی بغیر کسی عنوان کے شائع کی جا رہی ہے۔ پیامی اپنی پسند کا عنوان تجویز کر کے عبدالشکور ریٹائرڈ میل اور سیر آنیکل ۵۶۲۱۰۶ ضلع بنگلور کو بھیج دیں۔ سب سے اچھے عنوان پر ایک سال کے لیے پیام تعلیم جاری کرا دیا جائے گا۔

یوں تو ہر اسکول میں شریر بچوں کا ہونا کوئی نئی یا عجیب بات نہیں، ویسے ہمارے اسکول میں بھی کافی تعداد شریر بچوں کی تھی، اسکول کے بغل میں ایک گھر تھا، جس کے صحن میں طرح طرح کے درخت تھے۔ گھر کی مالکن ان درختوں کی دیکھ بھال جتنے جتن سے کرتی اُتنی ہی ہٹ دھرمی سے شریر بچے اُسے تنگ کرتے تھے۔ کبھی آم کے درختوں پر پتھر پھینکتے، کبھی پھولوں کے پودوں کو توڑ کر رکھ دیتے۔ جب اُن بچوں کا ظلم و ستم بڑھ جاتا تو بات ہیڈ ماسٹر تک پہنچ جاتی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ڈراتے دھمکاتے اور ایک دو کی پٹائی بھی ہو جاتی۔

بچوں نے دھیرے دھیرے یہ عادت ترک کر دی اور اس کے بدلے ایک اور نئی عادت کی بنیاد ڈالی۔ اُسی گھر میں مرغیوں کی کافی تعداد تھی۔ جب مرغیاں باہر آتیں تو اُن پر پتھر پھینکتے یا دور کہیں بھگا دیتے۔ مالکن ان سے کچھ کہتی تو جواب ملتا۔ "یہ مرغیاں اسکول کے صحن میں آکر ہماری اُٹھنے بیٹھنے کی جگہ گندی کر دیتی ہیں۔ اگر مرغیاں پالنا ہے تو چار دیواری کے اندر بند رکھو ورنہ ہم یہ غلاظت برداشت نہیں کر سکتے۔" دوبارہ بات ہیڈ ماسٹر تک آئی مگر بچوں نے دل بہلاوے کا یہ مشغلہ

آنیکل ضلع بنگلور

نہ چھوڑا۔

ایک دن کیا ہوا؟ اچانک تمام مرغیوں نے گھنٹہ دو گھنٹے کے اندر دم توڑ دیا۔ اچانک مرنے کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ وہی کہ زہر کھا کر مری ہوں۔ کیا مرغیوں نے بچوں سے تنگ آکر زہر کھا لیا؟ یا بچوں نے مرغیوں سے تنگ آکر زہر ڈال دیا ہاں!! مرغیوں سے تنگ آکر بچوں نے زہر ڈال دیا ہو تو یہ بات درست ہو سکتی ہے۔ چونکہ پہلے ہی سے مرغیوں کے دشمن اسکول کے شریر بچے ہی تو تھے۔

مالکن اساتذہ کو بُرا بھلا کہنے لگی۔ "بچوں کو اتنا بھی سر پر چڑھا لینے والے تم ہی ہو۔ میں ہر روز کہتی چلی آ رہی تھی کہ یہ بچے ایک نہ ایک دن تمام مرغیوں کو فنا کر کے ہی دم لیں گے۔ مگر تمہارے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اب عزت چاہتے ہو تو مرغیوں کی قیمت ادا کرو ورنہ میں پولیس کو رپورٹ کر دوں گی اور مقدمہ لڑوں گی۔" اساتذہ بچوں کا منہ دیکھنے لگے اور بچے اساتذہ کا ہر بچے کے زبان پر یہی الفاظ تھے۔ "یہ کام تو میں نے نہیں کیا یہ کام تو میں نے نہیں کیا!" اب یہاں اُن کی بات کا اعتبار کرنے والا کون تھا؟ جو بچے پہلے ہی سے شرارتوں میں مشہور ہو چکے ہوں ایسوں کی کون مانے گا؟

مالکن اپنی بات پر ڈٹی رہی۔ جھگڑا رُکنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ گھر کا مالک کہیں باہر گیا ہوا تھا، وہ بھی آگیا۔ واقعہ کی تفصیل سُننے کے بعد وہ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ یہ کام میری بھول سے ہوا ہے۔ کل رات چوہوں کا زہر نعمت خانہ میں رکھا تھا۔ سویرے اُسے کہیں چھپا کر رکھنا چاہیے تھا۔ لاپروائی سے صحن میں پھینک دیا۔ مجھے مرغیوں کا خیال نہ رہا۔"

مالک اور مالکن نے اسکول کے اساتذہ اور بچوں سے معافی مانگ لی اب اسکول کے بچوں کی جان میں جان آئی۔ عزت لُٹتے لُٹتے بچ گئی۔!! آیندہ سے توبہ کی کہ کبھی بھولے سے بھی کسی کو نہیں ستائیں گے۔

سچ ہے شرارتی بچے اگر سچ بھی بولیں تو بھروسا کرنا مشکل ہے!!

ثروت عثمانی

خلوص کا صلہ



یکایک بجلی چمکی۔ یہ بجلی اس کی یادوں کے دریچوں کو ایسے روشن کر گئی گویا کل ہی کی بات ہو۔ ماضی کا تلخ باب اس کے سامنے سے گزر گیا جس میں سخت تلخی کے باوجود ہلکی ہلکی مٹھاس ضرور تھی۔ اس نے سوچا یادِ ماضی بھی کتنی حسین اور دل فریب ہوتی ہے۔

رات کے دو بج چکے تھے لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کافی دیر تک وہ ہلکے گلابی رنگ کے بلب کو دیکھتا رہا لیکن اس کی نگاہیں کہیں اور تھیں اور دماغ ابھی تک گذشتہ سے پیوستہ تھا۔ آج اس کے پاس ایک کار اور ایک بنگلہ تھا وہ ایک مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں سوچتا تو اس کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے پاس کسی وقت اسکول میں نویں کلاس میں داخلہ کے لیے پیسے نہیں تھے اور پرنسپل صاحب اس سے کم از کم پانچ سو روپے چندے کے مانگ رہے تھے۔ جبکہ اس کے پاس پانچ پیسے بھی نہ تھے۔

رشید کے والد دو سال پہلے گزر چکے تھے۔ اس کی ماں محلہ والوں کے کپڑے سی کر اپنا، اس کا اور ایک چھوٹی بچی کا پیٹ پالتی تھی۔ جب اس کی ماں میلی چادر بچھا کر کھٹارا مشین سے کپڑے سیتی تو اس کی کھٹر کھٹر بار بار رشید کے مطالعہ میں رکاوٹ بنتی۔ اور وہ کبھی اپنی بوڑھی ماں کو اور کبھی اس پرانی مشین کو دیکھتا جس پر ان کی زندگی کا انحصار تھا۔ یہ دیکھ کر وہ یکایک قلم چھوڑ کر گھنٹوں ان خیالوں میں گم رہتا جن کی تکمیل کبھی نہ ہوتی دکھائی دیتی۔

اس کو پڑھائی کا بے حد شوق تھا لیکن مفلسی بار بار اس کی پڑھائی میں حائل ہوتی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ پڑھائی بند کر کے وہ کسی کارخانہ میں ملازم ہو جائے لیکن اسے اپنے والد کی نصیحت یاد آجاتی "بیٹا تعلیم بڑی چیز ہے اسے ہر قیمت پر حاصل کرو"۔ اس لیے وہ اسے ہر قیمت پر جاری رکھنا چاہتا تھا۔

ایک دن اس کی ماں کو بخار آگیا اور اس میں برابر اضافہ ہوتا گیا، اس سے رہا نہ گیا۔ وہ وہ چپکے سے گھر کے باہر نکل کھڑا ہوا۔ باہر نکل کر کافی دیر تک وہ سوچتا رہا کہ کیا کیا جائے۔ کبھی وہ سوچتا کہ سیٹھ مراری لال کے یہاں کافی پیسا ہوگا پھر اس کا ایک ہی نوکر ہے جو کبھی کبھی سودا لینے کے لیے باہر بھی چلا جاتا ہے۔ کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور اس کے گھر میں جا گھسے۔ پھر اس کو اچانک خیال آیا کہ اس کے یہاں ایک شکاری کتا بھی تو پلا ہوا ہے۔

پتا: معرفت جناب مخمور عثمانی صاحب، ایڈورٹائزنگ منیجر ہمدرد (د) 1235، محل کسرلے، بلیماران دہلی ۶

شکاری کتے کا خیال آتے ہی اُس کے بدن میں جھرجھری سی آگئی اور پھر اس کے قدم کسی موقع کی تلاش میں بس اسٹینڈ کی طرف اٹھ گئے۔ بس اسٹینڈ پر پہنچ کر اسے ایک آدمی سوٹ بوٹ میں ملبوس دکھائی دیا۔ اُس نے بس میں چڑھنے کی ان چاہی کوشش کی اور اپنا دایاں ہاتھ اس آدمی کی جیب کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ اُسے ہاتھوں میں ہتھکڑیوں کا خیال آگیا۔ اگر وہ پکڑا گیا تو تین سال کی قید ہو جائے گی اور اس کی ماں بے سہارا ہو جائے گی۔ ماں کا خیال آتے ہی اُس نے اپنے دل میں یہ طے کیا کہ وہ محنت کی کمائی ہی سے ماں کی مدد کرے گا چاہے اُسے کتنے ہی دُکھ جھیلنے پڑیں۔ اب اُس کے قدم تیزی سے اسٹیشن کی طرف اُٹھ گئے۔

اسٹیشن پر وہ کافی دیر تک کھڑا رہا لیکن کسی نے اُسے مزدوری کے لیے پکارا تک نہیں۔ وہ پریشان نظروں سے ایک بابو کو اپنا سامان خود اٹھاتے دیکھ رہا تھا۔ یکایک کسی کا ہاتھ اس کے شانہ پر پڑا۔ وہ چونک پڑا۔ تب ہی اُسے ایک نرم اور ہمدردی سے بھرپور آواز سنائی دی: "سامان اٹھاؤ گے؟" اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بھاری بھاری صندوق سر پر یوں رکھ لیے مانو وہ مہینوں سے بوجھ اٹھانے کا عادی ہو۔ مجبوری انسان سے کیا کچھ نہیں کراتی۔

بابو کا سامان ٹیکسی میں رکھ کر وہ واپس آتے ہوئے ان پیسوں کے متعلق سوچ رہا تھا جو بابو نے چند منٹ پہلے اُس کی ہتھیلی پر رکھے تھے۔ اُس نے پسینا پونچھتے ہوئے دل میں سوچا: "اب وہ شام تک دس روپے ضرور کما لے گا۔ اُس سے اپنی ماں کا علاج بھی کرائے گا۔" اس کے خیالوں کی دنیا کو ایک کار کے بریک کی آواز نے چور چور کر دیا۔ چونک کر پیچھے دیکھا کہ ایک کار کو پیچھے سے ایک ٹرک نے ٹکر ماری تھی وہ بھاگ کر جائے حادثہ پر پہنچا۔ ایسا دل خراش حادثہ اس نے زندگی بھر نہ دیکھا تھا۔ کار میں ڈرائیور کے علاوہ ایک بوڑھی عورت بھی تھی۔ ڈرائیور اپنی آخری سانسیں پوری کر رہا تھا جبکہ بوڑھی عورت شدید طور پر زخمی ہو گئی تھی اور مدد کے لیے چلّا رہی تھی۔ لوگ مجمع کی شکل میں کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے کوئی کہہ رہا تھا اس کا پتا تلاش کر کے اِسے اس کے گھر پہنچا دو، کوئی کہتا تھا پولیس کو فون کر دو، کوئی کہتا تھا اسے اسپتال پہنچا دو۔ غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ اُس کے پاس بھی پھٹکتا یا اُسے کوئی طبّی امداد پہنچاتا۔ رشید کو اپنی ماں یاد آگئی جسے وہ آج صبح بخار میں تپتا ہوا اللہ کے سہارے گھر پر چھوڑ کر آیا تھا۔ اُس کا دل ہمدردی اور رحم کے جذبے سے سرشار ہو اُٹھا۔ اُس نے اپنے قدم آگے بڑھائے تاکہ اُسے اسپتال پہنچا آئے لیکن اُس کو خیال آیا کہ پولیس اس کو پریشان کرے گی۔ ایک بار پھر ماں کا نقشا اُس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ اُس نے دل میں طے کیا کہ جو بھی ہو وہ اُس بوڑھی عورت کی جو بھی مدد ہو سکے گی ضرور کرے گا۔

چنانچہ وہ بوڑھی عورت کے قریب پہنچا اور اُسے کار سے نکالا۔ اُس کی آستینیں خون سے تر ہو گئیں۔ اُس نے اُسے بازوؤں میں سمیٹ کر ایک رکشا والے کو آواز دی۔ لیکن رکشا والے نے چلنے سے انکار کر دیا۔ رشید نے سوچا یہ دنیا بھی کتنی خود غرض اور مطلب پرست ہے۔ اگر یہی حادثہ اس کا ہوا ہوتا تو یہ بھی اسی طرح بے یار و مددگار چلّا رہا ہوتا۔ اُس نے جلد دوسرے رکشا والے کو آواز دی اُس نے بھی چند لمحے پس و پیش کیا پھر چلنے پر راضی ہو گیا۔ شاید اُسے صبح سے سواری نہیں مل پا رہی تھی۔ رشید نے بوڑھی عورت کو قریب کے اسپتال میں داخل کر دیا۔ اُس نے سوچا کہ اب اس کے گھر والوں کو اطلاع کرنی چاہیے۔ اُس نے بوڑھی عورت کے پرس کو کھولا تاکہ اُس میں سے اُس کا پتا حاصل کر سکے۔ پرس میں نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنے بہت سے روپے اُس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اُس کے دل میں طرح طرح

کے خیالات آنے شروع ہو گئے۔ اُس نے سوچا کہ وہ ان پیسوں کو لے کر بھاگ جائے گا۔ لیکن اُسے اپنے باپ کی نصیحتوں کی بازگشت سنائی دی: "بیٹا کسی بھی حال میں ہو کبھی حرام کا پیسا مت لینا ہمیشہ ایمان دار رہنا کیوں کہ اللہ تعالیٰ ایمان داروں کو پسند فرماتا ہے اور مصیبت کے وقت اُن کی مدد کرتا ہے۔" یہ سوچ کر اُس نے جلدی سے لاحول پڑھی اور تیزی کے ساتھ پرس میں پتا تلاش کرنے لگا۔ ایک چھوٹی سے ڈائری سے اُس نے پتا پڑھا۔ پتا کے ساتھ ہی فون نمبر لکھا ہوا تھا اُس نے قریب کے ہی پبلک کال سے فون کیا۔ دوسری طرف سے ایک مرد بول رہا تھا۔ بات چیت سے پتا چلا کہ وہ اُس مصیبت زدہ عورت کا بیٹا تھا۔ رشید نے اس کو حالات سے آگاہ کیا۔

تھوڑی دیر میں ہی ایک خوبصورت کار اسپتال کے باہر کھڑی تھی۔ اُس میں سے ایک آدمی باہر نکلا۔ وہ کافی پریشان نظر آرہا تھا رشید نے اُس سے پریشانی کا سبب دریافت کیا۔ وہ آدمی اُس بوڑھی عورت کا بیٹا تھا رشید اس کو ایمرجنسی وارڈ میں لے گیا جہاں اُس بوڑھی عورت کی حالت نازک چل رہی تھی۔

رشید کے بات چیت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک بڑا بزنس مین ہے جس کا نام رمیش تھا۔ اس کا کپڑوں کا ایکسپورٹ کا بہت بڑا کاروبار ہے اور لاکھوں روپے روز کماتا ہے۔ رمیش نے رشید کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ اُس نے رشید سے اُس کے اور گھر والوں کے بارے میں دریافت کیا رشید کی دُکھ بھری کہانی سن کر رمیش کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا اُس نے رشید سے اُس کے گھر کا پتا لیا، رشید کو ۵۰۰ روپے انعام کے طور پر دیے جسے رشید نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا: "یہ تو میرا فرض تھا جو میں نے پورا کیا۔" رمیش نے جب زیادہ اصرار کیا تو رشید نے روپے خوشی سے قبول کر لیے۔

رشید نے اپنی ماں کا علاج شہر کے اچھے ڈاکٹر سے کرایا جس کا سارا خرچ رمیش خود برداشت کرتا رہا۔ رشید روز رمیش کی ماں کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال جاتا۔

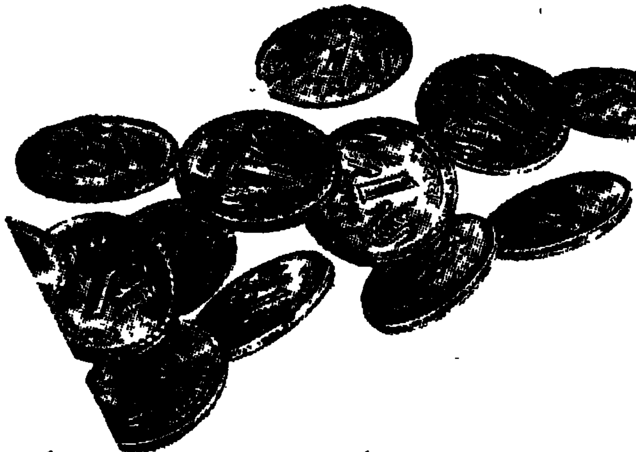
رمیش نے رشید کی مالی حالت اور بے روزگاری کے پیش نظر ضرورت نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی فیکٹری میں منیجر رکھ لیا۔ رشید، رمیش کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں اُس کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ رمیش نے اسے معقول تنخواہ کے علاوہ بنگلہ اور ایک کار بھی دی۔ رمیش کا کاروبار پہلے سے زیادہ چمک اٹھا یہ سب رشید کی محنت اور رمیش کی محبت اور اُس کی ماں کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔

آج جب بھی وہ اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں سوچتا تو اُسے یقین ہی نہیں آتا کہ یہ وہی رشید ہے جس کی زندگی اتنے نشیب و فراز میں گزری ہے۔

بجلی اب بھی چمک رہی تھی کھڑکی کے رنگ برنگے شیشوں سے چمکتی بجلی بے حد خوب صورت معلوم ہو رہی تھی، اُس کی زندگی بھی اس بجلی کی روشنی کی طرح رنگین ہو گئی تھی لیکن اس کی روشنی اسے دائمی محسوس ہوئی۔ محبت، سچائی اور ایمان داری کی روشنی۔ اس نے لائٹ بند کی اور خوابوں کی حسین دنیا میں پہنچ گیا۔

پیامی بچے ہوشیار رہیں

بمبئی کی مظفری بک کمپنی ۱۹۴- آئی، ایم، ایم مرچنٹ روڈ بمبئی ۳ سے کسی صاحب نے پیامی بچوں کو ٹھگنے کی اسکیم بنائی ہے۔ صرف دو روپے کے ڈاک ٹکٹ منگا کر فری کتابیں بھجوانے کے خطوط اکثر خریداروں کو لکھ رہے ہیں یہ بھی لکھتے ہیں کہ پیام تعلیم دہلی سے قرعہ اندازی کے ذریعے آپ کو چن لیا گیا ہے یہ سب ڈھوکا ہے۔ ہم اس سلسلے میں قانونی کارروائی کر رہے ہیں۔ پیامیوں سے درخواست ہے کہ ایسے تمام خطوط بلا تاخیر ہم کو بھجوا دیں۔ (اڈیٹر)



راہی بھارتی

کشش

ایک دیہاتی کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ ایک دن اُس نے کسی کتاب میں پڑھا کہ روپیا، روپوں کو کھینچتا ہے۔ یہ بات اس کے ذہن میں بہت گہری بیٹھ گئی۔ وہ سوچتا رہا اُس سے اچھا کیا طریقہ ہو سکتا ہے روپیا کمانے کا؟

لیکن اُس کی آزمائش دیہات میں ممکن نہ تھی کیونکہ کسی کے پاس اتنا روپیا نہیں تھا جو کھینچا جا سکے اور شہر بہت دور تھا۔ بغیر کچھ روپوں کے انتظام کے وہاں جانا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا وہ شہر جانے کے لیے روپیا جوڑتا رہا۔

جب اُس کے پاس کچھ روپے جمع ہو گئے۔ تو اُس نے شہر جانے کا قصد کیا اور جنتری میں ایک شبھ دن دیکھ کر روانہ ہو گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ سوچتا رہا کہ شہر جا کر کافی روپیا کھینچ لے گا اور مالدار ہو کر اپنے گاؤں لوٹے گا۔ تب اس کی عزت ہو گی۔ وہ ایک خوش حال زندگی گزارے گا۔ اسی طرح کے سپنے سجا سجا کر اس نے سفر طے کیا۔

شہر میں داخل ہوتے وقت اُس کے قدم خوشی سے ناچ رہے تھے۔ انجانی مسرتوں سے اُس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اپنی خوشیوں کو دبائے وہ سارے شہر میں گھوما اور نظروں نظروں میں اُس دکان کا انتخاب کرتا رہا جس میں روپوں کے ڈھیر لگے ہوں۔ ہر بازار کی ہر دکان کو وہ چور نگاہوں سے ٹٹولتا رہا۔ لیکن کہیں مطمئن نہ ہوا۔ چلتے چلتے وہ جوہری بازار پہنچ گیا۔ جہاں تقریباً ہر دکان پر اسے روپیا ہی روپیا نظر آیا۔

اُس بازار میں چکر لگانے کے بعد ایک دکان کو دیکھ کر اُس کی باچھیں کھِل گئیں۔ اُس نے دیکھا ایک موٹا آدمی ڈھیر سارے روپے اپنے سامنے رکھے حساب کتاب میں معروف ہے۔ دل ہی دل میں تہیہ کر کے وہ دکان کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور جب دکان دار اپنے پشت کی الماری کھولنے لگا تو اُس کی نظر بچا کر اُس نے ایک روپیا، روپوں کے ڈھیر میں اچھال دیا اور انتظار کرتا رہا کہ اُس کا روپیا، اُن روپوں کو کھینچ کر لائے گا۔ لیکن اُس کا روپیا اُن روپوں کو نہ کھینچ سکا یہ بات غلط ہوتی نظر آئی۔ مگر کتاب کی لکھی بات کو وہ غلط ماننے کو تیار نہ تھا۔ اُس نے سوچا ایسا تو نہیں کہ روپے زیادہ ہونے کے سبب اس کے تنہا روپے میں زیادہ طاقت نہ ہو۔ اِسی لیے مناسب یہی ہو گا کہ وہ اپنے سارے روپے اُس ڈھیر میں پھینک دے اس طرح کشش یقیناً بڑھ جائے گی اور سارے روپے آئیں گے۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنی پوٹلی کھولی اور موقع پا کر اپنے سارے کے سارے روپے، روپوں کے اُس ڈھیر میں پھینک دیے۔ اِس مرتبہ ایک جھنکار پیدا ہوئی اور کچھ روپے اُچھلے، جس کو دیکھ کر دیہاتی بہت خوش ہوا۔ اُس کو اپنی کوشش کامیاب ہوتی نظر آئی لیکن پھر خاموشی چھا گئی۔ ایک سکوت۔ اُس کے سارے روپے، اُس کی ساری پونجی روپوں کے اُس ڈھیر میں جا کر بالکل خاموش ہو گئی۔ وہ کچھ دیر انتظار کرتا رہا اور پھر بہت دیر ہو گئی۔

اب اُسے شک ہونے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ کتاب میں

(باقی صفحہ ۹ پر)

۱۷/ بیرن روڈ ، باندرہ ، بمبئی ۴۰۰۰۵۰

ڈاکٹر سنجیو رائے اگروال

ہڈی کا ٹوٹنا

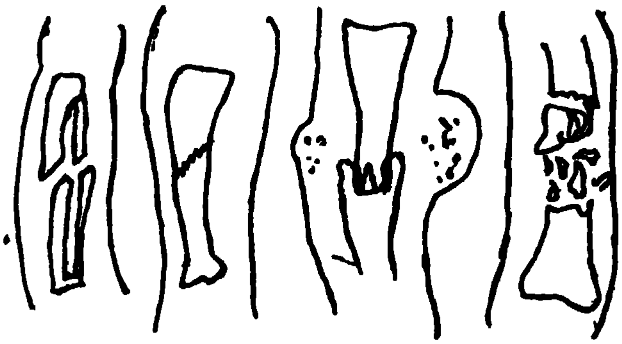
آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ کھیلنے میں چوٹ لگ جانے یا سڑک پر گر جانے سے ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔ آئیے آج ہم آپ کو اس کے بارے میں کچھ بتائیں۔

آدمی کے جسم میں دو سو تینتیس ہڈیاں ہوتی ہیں اور جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے ان کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ ہڈیاں، کلشیم (CALCIUM)، فاسفورس (PHOSPHORUS) اور کچھ دوسرے مادوں سے بنتی ہیں۔ زیادہ تر ہڈیاں دو طرح کی ہوتی ہیں

۱۔ سخت یا COMPECT BONE ۲۔ پولی یا TRABECULOR BONE

ہڈیاں مختلف سائز کی ہوتی ہیں جیسے سر کی ہڈی چپٹی اور گول۔ اور ہاتھ پیر کی ہڈیاں لمبی اور گول ہوتی ہیں۔ ان ہڈیوں کو دیکھ کر یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ آدمی کی ہڈیاں ہیں یا جانور کی۔ نیز ہڈیوں کے ماہرین ہڈی دیکھ کر یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ مرد کی ہے یا عورت کی اور اس کی عمر کیا ہے۔ کچھ لوگوں کی ہڈیاں کمزور ہوتی ہیں اور معمولی چوٹ سے بھی ٹوٹ جاتی ہیں ورنہ عام طور پر بہت سخت چوٹ لگنے سے ہی ٹوٹتی ہیں۔ مثلاً سڑک حادثے میں، پتنگ اڑاتے ہوئے چھت سے گرنے سے۔ اس لیے کہتے ہیں احتیاط سے کام کیجیے اور ہڈیاں سلامت رکھیے۔

ہڈیاں کلشیم (CALCIUM) کی کمی کی وجہ سے کمزور ہوتی ہیں اس لیے ایسی چیزیں استعمال کرنا چاہئیں جس میں CALCIUM کی مقدار زیادہ ہو۔ کلشیم دودھ میں زیادہ ہوتا ہے اسی لیے ہر بچے کو دن میں دو بار دودھ پینا چاہیے۔ دودھ کے علاوہ ہری پتی والی



تصویر ع ۱
(الگ الگ طریقے سے ہڈی کا ٹوٹنا)





(پیر کی ہڈی کا ٹوٹنا) (کلائی کی موچ)

سبزیوں، دال اور ناریل میں بھی CALCIUM ہوتا ہے۔ اور کبھی بہت احتیاط کے باوجود بھی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے جس سے ورم اور درد ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں مندرجہ ذیل باتوں پر عمل کرنا چاہیے۔

۱۔ چوٹ لگی ہوئی جگہ کو نہ چھیڑیں۔

۲۔ اگر چوٹ لگی جگہ سے خون بہنے لگا ہو تو اس کو Detol وغیرہ سے دھو کر اس پر ٹنکچر آیوڈین (TINCTURE IODINE) یا سیولان یا کوئی اور جراثیم کش دوا لگائیے۔

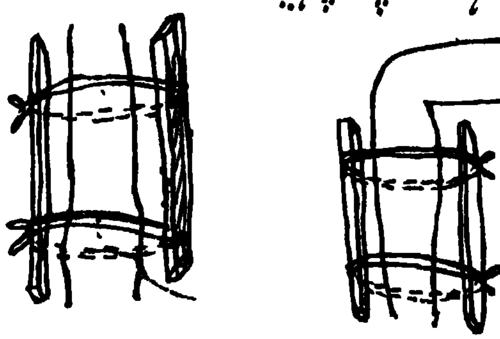
۳۔ چوٹ والی جگہ پر روئی رکھ کر پٹی باندھ دیجیے۔

۴۔ اگر خون نکلنا بند نہ ہو تو اس جگہ کو ۲-۳ منٹ تک

۲۵ ۔ دیش بندھو گپتا روڈ ۔ پہاڑ گنج ۔ نئی دلی ۲۵

دبائے رکھیے اس سے خون جم جاتا ہے اور نکلنا بند ہو جاتا ہے اور اگر پھر بھی بند نہ ہو تو فوراً کسی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔

۵۔ لکڑی کا سیدھا اور لمبا ٹکڑا لے کر ٹوٹی ہوئی ہڈی پر لگا کر دونوں سروں پر باندھ دیں جس سے ہڈی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گی۔ اگر ہڈی اپنی جگہ سے ہل جائے تو بے ہوش کر کے ہڈی کو ٹھیک جگہ پر لانا پڑتا ہے کبھی کبھی ہڈی کے ہلنے سے کوئی نس کٹ جاتی ہے اور دوران خون بند ہو جاتا ہے جس سے وہ حصہ بیکار ہو جاتا ہے اور آپریشن کرنا پڑتا ہے اس لیے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو ہلنے سے بچانا چاہیے۔



تصویر ۲
(ہاتھ اور پیر کی چوٹ میں پٹی باندھنے کا طریقہ)



تصویر ۳
(کندھے کی چوٹ میں پٹی باندھنے کا طریقہ)

۶۔ اگر چوٹ لگ جانے سے سوجن آجائے تو X-ray کرانا چاہیے اور فوراً ڈاکٹر سے صلاح لینی چاہیے۔ نیز ادھر ادھر کے مشوروں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ کیوں کہ ہڈی اگر غلط جڑ جائے تو زندگی بھر درد ہوتا ہے۔

۷۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے کے لیے پلاسٹر باندھا جاتا ہے، پلاسٹر چاک مٹی سے بنا ہوتا ہے اور تین ہفتے سے لے کر ۶ مہینے تک لگایا جاتا ہے۔ اس دوران میں ڈاکٹر کی ہدایات پر مکمل طور پر عمل کرنا چاہیے۔

۸۔ کبھی کبھی ایکسیڈنٹ میں ہڈیوں کے کئی ٹکڑے ہو جاتے ہیں تب آپریشن بھی کرنا پڑتا ہے۔

۹۔ پلاسٹر کھلنے کے بعد ڈاکٹر کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ورزش کرنا بہت ضروری ہے۔ صرف ہڈی کی جڑ جانے سے ہی سب کچھ نہیں ہو جاتا ہے۔

کب کس طرح کی ورزش کرنی چاہیے۔ یہ ہم بعد میں بتائیں گے اور اگر پیامی دوست مزید معلومات حاصل کرنا چاہیں تو خط و کتابت سے معلوم کر سکتے ہیں جس کا جواب ان کو خط سے یا اسی کالم میں ضرور دیا جائے گا۔

بقیہ صفحہ ۲۷

لکھی بات غلط ہو۔ مگر وہ پھر دل کو سمجھا لیتا۔ اسی وقت جوہری نے پلٹ کر اُس کو دکان میں جھانکتے ہوئے دیکھ لیا اور جھک کر پوچھا۔ "کیا بات ہے پردھان؟"

دیہاتی نے نہایت معصومیت سے ساری روداد کہہ سنائی۔

"ٹھیک۔! جوہری نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "کتاب میں سچ لکھا ہے۔ واقعی روپوں نے روپے کو کھینچ لیا۔ اب کیا چاہتے ہو۔ جاؤ، کوئی نیا دھندہ ڈھونڈو!

خط و کتابت کرتے وقت اپنا پتا صاف اور خریداری نمبر ضرور لکھیے اور جواب طلب امور کے لیے جوابی لفافہ یا کارڈ آنا ضروری ہے۔ (منیجر)



ایک پروفیسر صاحب میڈیکل کالج میں طلبہ کو لیکچر دے رہے تھے، انھوں نے ایک شاگرد سے سوال کیا "فرض کرو ایک مریض فلاں بیماری میں مبتلا ہے اور اس بیماری کے علاج کے لیے فلاں گولیاں ہیں، آپ اسے کتنی گولیاں دیں گے؟" شاگرد بولا "پانچ گولیاں!" پروفیسر صاحب نے کہا "بیٹھ جاؤ" کافی دیر بعد وہی شاگرد اٹھ کر بولا "ایکسکیوزمی سر! میرا جواب غلط تھا۔ میں صحیح جواب دینا چاہتا ہوں" پروفیسر صاحب نے جواب دیا "اب بہت دیر ہو چکی ہے، بیٹے تمھارا مریض تو دم توڑ چکا ہے۔"

● شگفتہ نسرین
۳۸۵، شاہ گنج، الہ آباد ۲

جعلی ڈاکٹر اپنے دوست سے: میری دوا دس منٹ میں اثر کرتی ہے۔

دوست: بالکل ٹھیک ہے اسی لیے تو کسی عقلمند نے تمھاری دُکان کے سامنے کفن کی دُکان کھولی ہے۔

● سید قمر العارفین رضوی مضطر
ہسپورہ۔ اورنگ آباد۔ بہار

ماں (اپنی بیٹی سے) بیٹی ٹب کا پانی گندا ہے اس میں ہاتھ نہ ڈالو۔

بیٹی: ماں صابن دے دو میں پانی کو دھو دوں

● اے، جے ہاشمی
کپڑا پٹی جھریا دھنباد (بہار)

ایک شخص اپنا ایک گدھا فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے کسی سے سُنا کہ اُس کے دوست کو گدھے کی ضرورت ہے۔ اُس شخص نے اپنے دوست کو خط لکھا... "پیارے دوست! اگر تمھیں ایک اچھے گدھے کی ضرورت ہو تو مجھے یاد کر لینا..."

● عرشیہ الماس
بلگام۔ کرناٹک

ڈاکٹر: بخار سے پہلے جب تمھیں سردی محسوس ہوئی تو کیا تمھارے دانت بج رہے تھے۔

مریض: (سادگی سے) نہیں جناب

ڈاکٹر: تعجب ہے۔

مریض: اس میں تعجب کی کیا بات ہے میں پہلے ہی اپنے دانت نکال کر الماری میں بند کر چکا تھا۔

● محمد انور عادل عثمانی
پتیانہ محلہ کلٹی (ضلع بردوان)

میزبان: کچھ مٹھائیاں اور کھا لیجیے صاحب!
مہمان: اب تو پیٹ بالکل بھر گیا جناب۔
میزبان: تو کچھ جیب میں رکھ لیجیے۔
مہمان: جیب تو پہلے سے بھری ہوئی ہے۔

● احمد کمال حشمی، نیا بازار، کانکی نارہ ۲۴ پرگنہ

مالک: دل لگا کر کام کرو۔ ورنہ نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

نوکر: اچھی بات ہے صاحب، صابن کے پیسے بچ جائیں گے۔

● سید محمد احسن۔ برنپور۔ بردوان



مرتبہ: موثق الدین

ادھر ادھر سے

قرأت کا بین الاقوامی مقابلہ ہندستانی قاری کی شرکت

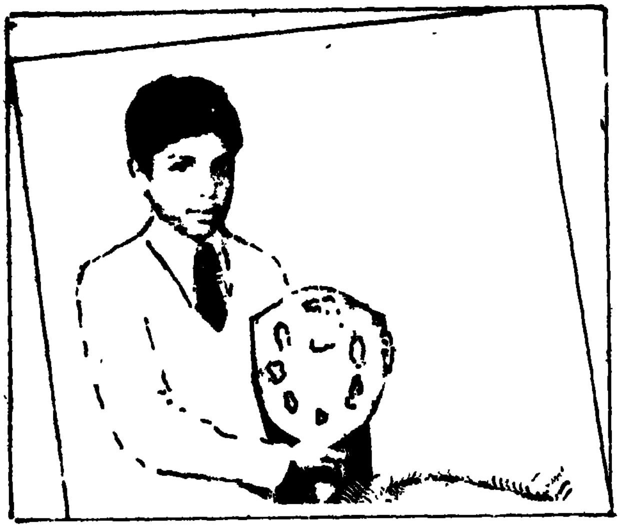


گذشتہ چار سالوں سے مکہ مکرمہ میں قرأت وحفظ قرآن کے بین الاقوامی مقابلے منعقد ہو رہے ہیں۔ سال حال پانچواں عالمی مقابلہ مکہ مکرمہ میں ۱۵ مارچ سے شروع ہوا اور جس کا افتتاحی خطبہ جلالۃ الملک فہد بن عبدالعزیز نے دیا۔ حیدرآباد کے مذہبی گھرانے کے نامور فرد ڈاکٹر محمد ضمیر الحق نثار کے دس سالہ فرزند محمد نذیر الحق نے شعبہ قرأت القرآن میں ہندستان کی نمائندگی کی۔

فتحپوری مسلم اسکول دہلی مرکزی وقف کونسل سے ایوارڈ

دلی ۲۰ مارچ۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ اس سال سینٹرل وقف کونسل وزارتِ قانون حکومت ہند نے فتحپوری مسلم سینئر سکنڈری اسکول کو دلی کا بہترین اسکول قرار دیتے ہوئے مبلغ ۲۵۰۰/- روپے کی رقم بطور ایوارڈ دی گئی۔ نیز اسکول کے سیاسیات کے استاد جناب انورالدین کو بہترین استاد قرار دیا گیا جس کے لیے موصوف کو مبلغ ۲۵۰/- روپے کی رقم کا انعام دیا گیا۔

معرفت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ بمبئی ۳



اُردو پرائمری اسکول نمبر ۲۸، چونا بھٹی، مالے گاؤں کے طالب علم احمد مجتبیٰ حاجی مختار حسین نے ۴ فروری ۱۹۸۳ء کو تہذیب ہائی اسکول مالے گاؤں کی جانب سے منعقدہ "سیرت النبیؐ" کے تقریری مقابلہ میں پہلا انعام حاصل کیا۔

مچھلی کھانے والا گدھا

پاکستان کے جنوبی علاقے میں ایک گدھے کو گھاس سے زیادہ مچھلیاں پسند ہیں۔ پاکستان کے اخباروں کے مطابق گدھے کا مالک اس کو گھاس کے بجائے مچھلی کھلانے لگا کیونکہ وہاں گھاس مچھلی سے زیادہ مہنگی ہے۔

قاتل مجسمہ

یونان میں ایک مجسمہ ایک راہ گیر پر گر پڑا اور راہ گیر موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ عدالت نے پتھر کے اس مجسمے پر باقاعدہ مقدمہ چلایا اور سزا کے طور پر اسے سمندر میں پھینکنے کا حکم دیا۔

ضخیم ترین اخبار: امریکہ کے ممتاز روزنامہ نیویارک ٹائمز کی اتوار، ۱۷ اگست ۱۹۶۰ء کی اشاعت ۴۷۸ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کا وزن تین سیر تھا۔ اب تک دنیا کا کوئی روزنامہ اتنا ضخیم نمبر شائع نہ کر سکا۔

بچوں کی کوشش



ایمان دار جیب کترا

میں نے ایک کہانی اس طرح سنی ہے کہ ایک آدمی صبح اندھیرے میں گھر سے نکلتا ہے تاکہ حمام جائے۔ راستے میں اُسے ایک دوست ملتا ہے۔ وہ اپنے دوست سے کہتا ہے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو میرے ساتھ حمام چلو۔

اس کا دوست جواب دیتا ہے کہ مجھے ایک ضروری کام ہے میں حمام کے باہر تک چل سکتا ہوں مگر اندر نہیں جاؤں گا۔

دونوں حمام کے نزدیک دوراہے پر پہنچتے ہیں جس کا ایک راستہ حمام کی طرف اور دوسرا دوسری طرف جاتا ہے اس کا دوست اس سے پہلے کہ اپنے دوست سے اجازت لے دوسرے راستہ پر چل دیتا ہے اتفاق سے اس دوست کے پیچھے سے ایک جیب کترا حمام کی طرف آتا ہے تاکہ حمام جائے اور اپنا کام شروع کرے۔ اس وقت بھی چاروں طرف ہلکا ہلکا اندھیرا تھا اس نے سمجھا یہ اس کا دوست ہے۔

اس کے پاس کچھ دینار تھے جو اس نے ایک کپڑے میں باندھ کر اسے دے دیے اور کہا کہ لو بھائی یہ امانت ہے جب میں حمام سے باہر آؤں اس وقت دے دینا۔ جیب کترا کپڑے میں بندھے دینار لے کر وہیں ٹھہر گیا۔

جب وہ آدمی حمام سے باہر آیا تو تھوڑی تھوڑی روشنی ہو گئی تھی اس نے کپڑے پہنے اور اپنے راستے پر چل دیا تو جیب کترے نے آواز دی کہ اے نوجوان پہلے اپنی امانت لو پھر کہیں جانا۔ مجھے بہت ضروری کام سے جانا تھا مگر میں تمھاری اس امانت کی وجہ سے رُک گیا۔

اس نوجوان نے جواب دیا امانت کیسی؟ اور تم کون ہو۔ جیب کترے نے کہا میں جیب کترا ہوں۔

نوجوان نے کہا اگر تم جیب کترے ہو تو یہ امانت لے کر بھاگ کیوں نہیں گئے۔

اس پر جیب کترا بولا کہ اس کو حاصل کرنے میں مجھے اپنے فن کا مظاہرہ تھوڑے ہی کرنا پڑا ہے جبکہ اس کو تو آپ نے بطور امانت کے میرے پاس رکھا تھا۔ اور امانت میں خیانت کرنا کون سی جواں مردی ہے۔

رخسانہ خاں
جوگا بائی۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

اپنی تعریف

سر پہ چپت پڑی تو کھجاتا چلا گیا
پچھلے سبق کو اور بھلاتا چلا گیا

ہر ماہ ہوم ورک دکھانے کے واسطے
یاروں کی کاپیوں کو چراتا چلا گیا

پاس اور فیل میں نہ کہیں فرق ہو جہاں
میں خود کو اس مقام پہ لاتا چلا گیا

جب ہونا پاس اپنا مقدر نہیں رہا
ناکامیوں کا جشن مناتا چلا گیا

ناغہ ہوا تو مار سے بچنے کے واسطے
اموات کا بہانہ بناتا چلا گیا

شاہد سید
محمدیہ ہائی اسکول، ۲، مسجد اسٹریٹ ممبئی ۳

نصیحت کا اثر

رمضان کا مہینا تھا۔ برف کی دُکان پر کافی بھیڑ تھی۔ ہر ایک اسی فکر میں تھا کہ اُسے پہلے ملے۔ یہاں تک کہ لڑائی جھگڑے کی نوبت آ گئی۔ ارشاد قریب ہی کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک صاحب گھبرائے ہوئے آئے اور بھیڑ کو چیر کر گھسنے لگے۔ پیسا نکالتے وقت ان کی جیب سے سَو روپے کا نوٹ نکل کر زمین پر گر گیا۔ اُنھیں نوٹ کے گرنے کی خبر نہ ہوئی۔ ارشاد کی نظر اس نوٹ پر پڑی کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ارشاد نے نوٹ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور سوچنے لگا کہ اب تو عیش ہی عیش ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس کی نظروں کے سامنے ماسٹر صاحب کی تصویر پھرنے لگی۔ جو بہت ہمدردی سے کہہ رہے تھے: میرے پیارے بچو! تم میں سے کچھ لڑکے آگے چل کر ملک کے رہنما ہوں گے۔ اچھے لڑکوں کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ اچھے اچھے کام کرنے چاہییں۔ ایمان داری سب سے بڑی دولت ہے۔ دوسروں کی چیزیں خواہ سونا، چاندی ہی کیوں نہ ہو اُسے مٹی سمجھنا چاہیے۔" یہ جملہ بار بار اس کی دماغ میں گردش کرنے لگا۔ اتنے میں وہ صاحب برف لے کر واپس لوٹے۔ ارشاد نے اپنی جیب سے نوٹ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔ وہ صاحب تعجب سے پوچھنے لگے۔ یہ روپیا مجھے کیوں دے رہے ہو۔ ارشاد نے کہا: "یہ نوٹ آپ کی جیب سے گر گیا تھا اور آپ کا ہی ہے۔" یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور اس کو انعام دیا۔

مجاز منصور صدیقی
راحت ہومیو مشن۔ سردار روڈ۔ ہزاری باغ۔۱

سچائی کا انعام

پُرانے زمانے کی بات ہے کسی شہر میں ایک غریب شخص رہا کرتا تھا اس کا نام سلیمان تھا وہ بہت نیک اور رحم دل تھا تمام دن اللہ کی عبادت کرتا اور اللہ کے بندوں کی خدمت کرتا اور روزانہ وہ صبح سویرے اٹھتا اور نماز پڑھ کر جنگل کو جاتا وہاں سے لکڑی لاکر وہ بازار میں فروخت کرتا پھر گھر کا سامان لاکر اپنی بیوی کو دیتا اس طرح ان کی گزر بسر ہوتی تھی۔ ایک دن سلیمان صبح سویرے مسجد سے نماز پڑھ کر آ رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک ہار پڑا نظر آیا۔ سلیمان نے ہار کو اٹھا لیا۔ ہار کو اپنی مٹھی میں دبائے وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا گھر پہنچ کر اس نے اپنی بیوی کو ہار دکھایا بیوی کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوئی اس نے کہا معلوم ہوتا ہے یہ ہار بادشاہ کا ہے کیونکہ یہ مجھے ہیروں کا معلوم ہوتا ہے سلیمان نے بھی کہا ہاں تمھارا خیال ٹھیک ہے کل میں بادشاہ کے محل میں جاؤں گا اتنے میں بیوی نے اس کی بات کاٹ کر کہا نہیں یہ ہار ہم بیچ کر اچھا سا محل بنائیں گے ہم امیر بن جائیں گے۔ سلیمان نے کہا نہیں نہیں میں کل ہی بادشاہ کے محل میں جاؤں گا سہ پہر کو جب سلیمان اور اس کی بیوی ہار کے بارے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو اچانک ایک ڈھنڈورچی نے کہا:۔ شہنشاہ کی لاڈلی بیٹی شہزادی مریم کا ہار گم ہو گیا ہے جس نے دیکھا ہو کل صبح بادشاہ کے دربار میں لاکر دے دے سلیمان کی بیوی نے کہا یہ سچ ہے کہ ہار بادشاہ کا ہے لیکن آپ کو ہار اٹھاتے وقت کسی نے نہیں دیکھا اس لیے یہ ہار آپ بازار جاکر فروخت کر دیجیے۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی لیکن سلیمان نے اس کی ایک نہ سنی۔ دوسرے دن وہ

صبح کو ہار لے کر بادشاہ کے محل میں پہنچ گیا جب وہ بادشاہ کے سامنے گیا تو وہاں کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گیا سلیمان بادشاہ کے پاس گیا اور جھک کر سلام کرنے کے بعد اس نے ہار بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بادشاہ ہار دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس کو اس ایمان داری کے بدلے ایک لاکھ روپے دیے اور اس کو اپنا خزانچی بنا لیا۔

عبدالغنی
جامعہ محمدیہ عربیہ کالج رائیدرگ

شانِ نبیؐ

جھکتی ہوئی نگاہ کا اسلوب دیکھنا
تعظیم آستانۂ محبوب دیکھنا

رحمت خدا کی ہے تو شفاعت رسولؐ کی
جنت کو اپنے نام سے منسوب دیکھنا

سرحد زمیں کی عرش سے معراج میں ملی
رنگِ وصالِ طالب و مطلوب دیکھنا

نازل ہوئی ہیں اُن کے کرم سے جو برکتیں
پیشانی حیات پہ مکتوب دیکھنا

بزمِ نبی میں آج کیا یاد آ گیا ہمیں
خم ہو گیا ہے کیوں سرِ مجبوب دیکھنا

فضل قدر آزاد درجہ ششم
پٹنہ مسلم ہائی اسکول

چالاک لومڑی

ایک شیر تھا وہ بہت بھوکا تھا اچانک اس نے ایک بکری کو دیکھا اس نے بکری کو اپنے پاس بلایا۔ بکری ڈرتے ڈرتے اس کے پاس آئی شیر نے اس سے کہا میرے جسم کو سونگھو کہیں بو تو نہیں آ رہی ہے۔ بکری نے شیر کا جسم سونگھا جی ہاں حضور آپ کے جسم سے بو آ رہی ہے۔ شیر نے اس کی بات سن کر کہا کہ تم کو معلوم نہیں جنگل کے بادشاہ سے کس طرح بات چیت کی جاتی ہے یہ کہہ کر شیر نے اُسے دبوچ لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک ریچھ کو دیکھا اس نے ریچھ کو اپنے پاس بلایا اور اس سے بھی وہی سوال کیا۔ ریچھ نے کہا جی ہاں آپ کے جسم سے بو آ رہی ہے۔ شیر نے اسے بھی اپنا نوالہ بنا لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سے ایک لومڑی کا گزر ہوا۔ شیر نے اس کو بھی آواز دی لومڑی نے شیر کا پورا راز جان لیا اور لومڑی اس کے پاس گئی، شیر نے اس سے بھی وہی سوال کیا۔ لومڑی نے جواب دیا جہاں پناہ کئی روز سے مجھے زکام ہو گیا اس لیے میں آپ کے سوال کا جواب دے نہیں سکتی لومڑی کا جواب سن کر شیر وہاں سے بھاگ گیا۔

محمد ہارون حاجی عبدالرشید
کرانہ شاپ مقام مانا ضلع اکولہ

چن مُن

یہ ہیں ننھے منے چن من — ہردم ہنستے گاتے چن من
روز سویرے ہیں اٹھ جاتے — پھر اسکول کو جاتے چن من
امی بیٹھی پوری پکائیں — خوب مزے سے کھاتے چن من
استادوں کی خدمت کرکے — علم کی دولت پاتے چن من
محنت سے پڑھتے لکھتے ہیں — فرسٹ ڈویژن لاتے چن من
کام میں اپنے لگ جاتے ہیں — جب اسکول سے آتے چن من
ماں اور باپ کی آنکھ کے تارے — ہردم ہیں کہلاتے چن من
میٹھی میٹھی باتیں کرکے — سب کے دل کو لبھاتے چن من
پیار محبت اور محنت کا — سب کو سبق سکھاتے چن من

ایم اقتدار خاں۔ عبدالغفار خاں
غیبی نگر، بھیونڈی (بھڑگانوی)

پلاٹی پس

پلاٹی پس، انڈے دے کر بچوں کو دودھ پلانے والا یہ جانور صرف آسٹریلیا اور تسمانیہ میں پایا جاتا ہے۔ اس کا منہ بطخ کے منہ کی طرح چوڑا، چپٹا، لانبا اور ساتھ ہی اس میں ایک تھیلی بھی لگی ہوتی ہے جس کے اندر یہ

اپنی زائد غذا جمع رکھتا ہے، تاکہ دوسرے وقت استعمال کر سکے۔

یہ خشکی اور تری دونوں حصّوں پر زندگی بسر کرتا ہے۔ اس جانور کے چھوٹے اور مضبوط پیر ہوتے ہیں۔ جن کے ناخن لانبے، تیز، نوکیلے اور چمک دار ہوتے ہیں جن کی مدد سے یہ اپنا غار نما گھر کھود کر بناتا ہے۔ اس کے ناخنوں کے درمیان ایک باریک چمڑے کی جھلی ہوتی ہے، جس سے یہ جھاڑو کا کام لیتا ہے اور ساتھ ہی پانی میں تیزی سے تیرنے کے لیے استعمال میں لاتا ہے۔ خشکی پر آنے یا دوسرے وقت اس کو ناخنوں کے درمیان سمیٹ کر بند کرلیتا ہے۔ اس کی دُم جو چوڑی اور چپٹی سی ہوتی ہے۔ تیرتے وقت کشتی کے پتوار کی طرح رُخ بدلنے میں کام آتی ہے۔

اس کے پچھلے پیروں میں ایک تیز کانٹا ہوتا ہے۔ جس کے اندر ایک تیز زہریلا مادّہ پایا جاتا ہے۔ خطرے کے وقت یہ اپنے جسم کو گیند کی طرح گول بنالیتا ہے اگر دشمن پھر بھی اس پر حملہ کر بیٹھے تو اپنی حفاظت کے لیے یہ اس پر زہر کی پچکاری دے مارتا ہے۔ یہ اپنا غار نما گھر پانی اور زمین کے درمیانی مقام پر بناتا ہے اور جب خشکی پر پایا جانے والا کوئی جانور اس کا تعاقب کرتا ہے تو یہ فوراً اپنی بنائی ہوئی غار کی راہ سے پانی کے اندر جاکر چھپ جاتا ہے۔ اور اگر پانی میں رہنے والا کوئی جانور اس کا پیچھا کرتا ہوا آتا ہے تو یہ فوراً غار کی راہ سے خشکی پر آکر خود کو روپوشں کرلیتا ہے، اس کی قیمتی اور چمک دار کھال کے لیے اس کا بہت شکار کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی نسل معدوم ہو رہی ہے۔ اس لیے اس کا شکار کرنا آسٹریلیا اور تسمانیہ میں ممنوع ہے۔ اس کو DUCK BILLED PLOTYPUS کہتے ہیں۔

نیلوفر شاہین
کیمبرج اسکول اینڈ نرسری آسنسول

نیکی کر دریا میں ڈال

بغداد میں خلیفہ متوکل اپنے ایک غلام فتح کو اپنے فرزندوں سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ خلیفہ کی نگرانی میں اس نے بہت سے کرتب اور ہنر سیکھے۔ مگر تیراکی کے فن سے بخوبی ماہر نہ تھا۔ ایک دن اس نے بغیر ملّاحوں کے دریا پر جاکر پانی میں چھلانگ لگائی۔ دریا کا پانی بڑا تیز بہ رہا تھا اور اسے بہا کر لے گیا۔ آخر ہاتھ پاؤں مار کر دریا کے کنارے ایک سوراخ میں جا گھسا۔ جب اس جانکاہ واقعہ کی خبر بادشاہ کے کانوں تک گئی تو وہ بہت فکر مند ہوا۔ اس نے تمام ملّاحوں کو اپنے سامنے بلا کر کہا کہ تم میں سے جو کوئی فتح کی لاشں تلاش کرکے لائے گا۔ میں اُسے کافی انعام دوں گا۔ ملّاحوں نے دریا میں غوطے مار مار کر اس کا گوشہ گوشہ چھان مارا مگر کوئی نشان نہ ملا آخر ساتویں روز خوش قسمتی سے ایک ملّاح نے اسے زندہ پالیا۔ اور کشتی میں سوار کرکے اسے خلیفہ کے پاس لے آیا۔ جب خلیفہ نے فتح کو دیکھا تو خوشی میں پھولا نہ سمایا۔ اور ملّاح کو پانچ ہزار دینار بطور انعام دیے۔ متوکل کو خیال ہوا کہ فتح کئی روز سے بھوکا ہوگا۔ جب اس نے اس کے لیے کھانا لانے کا حکم دیا تو فتح نے فوراً کہا: "میں بالکل سیر ہوں"۔ خلیفہ نے پوچھا "تو دریا کے پانی سے سیر ہے"؟ اس پر فتح نے جواب دیا کہ میں ان روٹیوں سے سیر ہوں جو ہر روز بیس چپاتیاں ایک طبق میں رکھی ہوئی میرے پاس تیرتی ہوئی آتی تھیں، میں کوشش کرکے ان میں سے دو تین کو پکڑ لیا کرتا تھا۔ جس پر محمد بن الحسن الاسکاف کا نام لکھا ہوتا تھا۔ متوکل نے ایسے آدمی کی تلاش کا حکم دیا۔ دوسرے روز وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ خلیفہ نے اس سے پوچھا کہ تم دریا میں کیوں روٹیاں ڈالتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے سنا تھا کہ نیکی کر دریا میں ڈال یہ کبھی نہ کبھی کسی دن ضرور پھل لائے گی۔ خلیفہ نے یہ سن کر اس کو پانچ گاؤں دے دیے۔

محمد نسیم اختر نیچو گرام کلٹی بردوان



ہم تمام رکاوٹوں کو پار کر سکتے ہیں....

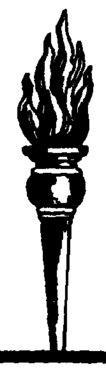
نویں ایشیائی کھیلوں کی میزبانی میں بھارت کو جو شاندار کامیابی ہوئی ہے، اس نے اس سے متعلق تاریک پہلو دیکھنے والوں کے تمام خدشے باطل کردیئے ہیں۔ اس کا راز کیا ہے؟

"واضح مقصد اور ڈسپلن کے احساس کے ساتھ سخت محنت۔"

یہ وہ یادگار اور غرض آگاہ نعرہ ہے جو وزیر اعظم اندرا گاندھی نے نیا 20 نکاتی پروگرام شروع کرنے وقت قوم کو دیا تھا۔

اس احساس کے ساتھ مِل جُل کر کام کرتے ہوئے ریکارڈ مدت میں عالی شان اسٹیڈیم تعمیر کئے اور باکمال صلاحیت کے ساتھ کھیلوں کا انتظام کیا۔

جو کچھ ہم نے ایشیاڈ کے لئے کر دکھایا
وہی کچھ پانچ سالہ منصوبے اور 20 نکاتی پروگرام کے لئے بھی کر سکتے ہیں۔



آیئے ہم سب مِل جُل کر اپنے وطن کو مضبوط بنائیں

davp 82/566

Regd. No. D(SE)-043 May, 1983.

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

بچوں کی مذہبی کتابیں

ہمارا دین (اول، دوم، سوم)	سید شہاب الدین دسنوی	(فی حصہ)	۶/۰۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول دوم)	عبدالواحد سندھی	(فی حصہ)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور امیرالبحر	" "		۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ (اول، دوم)	" "	(فی حصہ)	۴/۵۰
قرآن پاک کیا ہے؟	" "		۳/۰۰
اسلام کیسے شروع ہوا؟	" "		۴/۵۰
رسولؐ پاک	" "		۳/۵۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی		۳/۰۰
رسولؐ پاک کے اخلاق	" "		۳/۰۰
اللہ کے خلیل	" "		۲/۵۰
تحسین القرآن	تالیف: خدیجہ سید طاہر سیف الدین		۴/۵۰
منہاج القرآن	" "		۴/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری		۱/۵۰
عقائد اسلام	" "		۱/۵۰
چار یار	الیاس احمد مجیبی		۴/۵۰
آں حضرتؐ	" "		۱/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی		۲/۷۵
نبیوں کے قصے	" "		۲/۲۵
ہمارے رسولؐ	" "		۳/۰۰
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی		۲/۰۰
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی		۱/۵۰
سرکارِ دو عالم	محمد حسین حسان		۳/۰۰

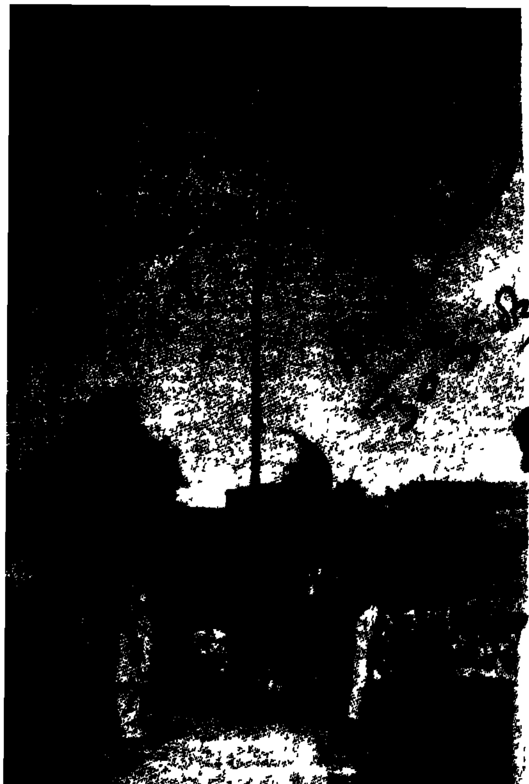
لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲

نامہ

یام تعلیم

نئی دہلی ۲۵

بچوں کی حکومت جامعہ مڈل اسکول













بچّوں کے لیے عبدالواحد سندھی جامعی کی کتابیں

پھر میں چُگوں کیا خاک
نہایت آسان زبان میں
چھوٹے بچّوں کے لیے
ایک کہانی
قیمت : ۱/۵۰

پان کھاکر، طبلہ بجاکر رام ناچا
ایک مزے دار کہانی
جو خاص طور سے چھوٹے بچّوں کے
لیے لکھی گئی ہے
قیمت : ۱/۵۰

تاک دِنا دِن تا کے سے
چھوٹے بچّوں کے لیے
چھوٹے چھوٹے جملوں میں لکھی گئی
مزے دار کہانی
قیمت : ۱/۵۰

پکڑ دُم کے ٹکو
ایک گدھے نے شیر کو بھگا دیا۔
بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چھوٹے
بچّوں کے لیے۔ قیمت ۱/۵۰

پانچ بونے
پانچ کام چور بونوں
کی کہانی چھوٹے بچّوں کے
لیے۔ قیمت: ۱/۵۰

ہتو چتو
یہ کہانی بھی چھوٹے بچّوں
کے لیے لکھی گئی ہے، انھیں
کی زبان میں۔ قیمت: ۱/۵۰

روٹی کس نے پکائی
چھوٹے بچّوں کے لیے انھی
کی زبان میں ایک دلچسپ
کہانی۔ قیمت: ۲/۵۰

بی بینڈکی اور کوّا
چھوٹے بچّوں کے لیے
آسان زبان میں لکھی
گئی ایک دلچسپ کہانی
قیمت: ۱/۵۰

چیونٹی رانی
کہانی کی کہانی اور معلومات
کی معلومات۔
قیمت ۱/۵۰

جادو کا گھر
چھوٹے بچّوں کے لیے آسان زبان
میں لکھی گئی ایک مزے دار
کہانی۔ قیمت ۱/۵۰

بچّوں کی کہانیاں
ایک کتاب اور
کہانیاں کتنی سب
کی سب مزے دار
قیمت: ۱/۵۰

مدو رانا پردیس چلے
مگر کیسے چلے؟ اور راستے میں کیا
کیا ہوا، یہ تو پڑھنے
سے ہی پتا چلے گا۔
قیمت :
۱/۵۰

لومڑی کا لالچ
[illegible]
قیمت ۱/۵۰

[illegible]
[illegible]

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
دہلی — بمبئی — علی گڑھ



ماہنامہ پیامِ تعلیم نئی دلی

بچّوں کی حکومت نمبر

جون ۱۹۸۳ء — جلد ۲۰ — شمارہ ۶

نگراں: جناب خالد سیف اللہ (پرنسپل)

اڈیٹوریل بورڈ

۱۔ راشد رفیق
۲۔ زبیر ارشاد
۳۔ شبینہ مجیب
۴۔ ارشاد حمید
۵۔ نشاط پروین
۶۔ خواجہ حبیب الرحمٰن

صلاح کار

محمد اخلاق قاسمی

مہمان اڈیٹر

شمامہ نورشید

سرورق: مظہر آصف، تبسم زیدی

قیمت: ۴/۵۰

سالانہ ۱۸ روپے

غیر ممالک سے ۸۵ روپے

پیامی ساتھیو!

آپ کا پیارا رسالہ "پیامِ تعلیم" بچوں کے رسالے کی اہمیت سے اپنا مقام بنا چکا ہے۔ پیام تعلیم اپنی ہر اشاعت میں بچوں کی حوصلہ افزائی اپنے مستقل کالم میں کرتا رہتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال بھی جامعہ مڈل اسکول کے تعلیمی میلے کے پروگراموں کو بہت ہی حسن و خوبی کے ساتھ چھاپا اور جامعہ کے بچوں کے تعلیمی تجربات کو ملک اور بیرونِ ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا دیا۔ اس کے لیے بچوں کی حکومت جناب ولی شاہجہانپوری اڈیٹر پیام تعلیم اور شاہد علی خاں صاحب جنرل منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی شکر گزار ہے۔

اس سال پھر شاہد علی خاں صاحب کی حوصلہ افزائی اور دل جوئی کی وجہ سے "بچوں کی حکومت نے "بچوں کی حکومت نمبر" نکالنے کا فیصلہ کیا ہے" تاکہ مزید تعلیمی تجربات کو اپنے ملک میں پھیلے ہوئے دوسرے تمام اسکولوں تک پہنچایا جا سکے۔

اس شمارے میں جیسا کہ آپ دیکھیں گے، ہم نے بچوں کی حکومت کے کاموں پر بھرپور روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

ساتھیو! زیرِ نظر شمارہ بچوں ہی نے ترتیب دیا ہے اور بچوں ہی نے اپنی حکومت اور اس کے کاموں پر روشنی ڈالی ہے۔ ہم اس کام کو اپنے لیے خاصا مشکل سمجھ رہے تھے مگر اپنے نگراں جناب خالد سیف اللہ کی قلندرانہ ہو کی وجہ سے یہ مشکل کام آسان ہو گیا۔ بچوں کی حکومت کے مشیر جناب محمد اخلاق قاسمی صاحب کے مشوروں سے ہمیں خاصی مدد ملی ہے۔ امید ہے کہ آپ سب ہماری کوششوں کو پسند فرمائیں گے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

محمد یوسف پاپا

تعارف بچّوں کی حکومت

تعارف لکھ رہا ہوں آج بچّوں کی حکومت کا
ملے گا ذکر ہر اک شعر میں بچّوں کی محنت کا
یہ بچّوں کی حکومت اور ذمّہ داریاں اس کی
کوئی دیکھے یہاں آ کر ذرا تیاریاں اس کی
حکومت کی ہیں ذمّہ داریاں ساری وزیروں پر
وزیروں کا بھروسا ساتھیوں اور دستگیروں پر
وزیرِ داخلہ کے نام نظم و ضبط ہے بھائی
جو خوراکی منسٹر ہے اسی بھائی کی بن آئی
وزیرِ کھیل ہر دم دیکھتا ہے کھیل بچّوں کا
نکل جاتا ہے میدانوں میں سارا تیل بچّوں کا
وزیرِ صحت کی ہر دم توجہ ہے صفائی پر
نظر کپڑوں پہ بھی ہے اور بچّوں کی دوائی پر
وزیرِ اطلاعات ہر گھڑی خبریں سناتا ہے
نہیں سنتا ہے جو خبریں اُسے آنکھیں دکھاتا ہے

یہ بچّوں کی حکومت بینک بچّوں کا چلاتی ہے
کبھی پیسے دباتی ہے کبھی پیسے دِلاتی ہے
حکومت کے ہی ذمّہ میوزیم ہے باغبانی ہے
کتب خانہ و چڑیا گھر سبھی کی پاسبانی ہے
اِسی کے دم سے بچّوں کی دُکاں میں کام ہوتا ہے
جو بیچے کا پیاں کاغذ اُسی کا نام ہوتا ہے
کھوجی! خونچہ بچّوں کا سب کو کیا کھِلاتا ہے
وہ چھولا چٹپٹا جو ناک سے پانی بہاتا ہے
یہ سارے سلسلے پروجکٹ ہیں اپنی حکومت کے
طریقے ہم نے اپنائے ہیں یہ بچّوں کی خدمت کے
سلیقے مشورے سے کام کرنا سیکھتے ہیں سب
عمل کے دَم سے اونچا نام کرنا سیکھتے ہیں سب
عمل کرتے رہو بچّو یہی پیغام ہے اپنا
یہی آغاز ہے اپنا یہی انجام ہے اپنا

پیغامات

عالی جناب انور جمال قدوائی صاحب
(وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ)

پیارے بچو!

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس سال آپ کی حکومت "بچوں کی حکومت نمبر" نکال رہی ہے۔ میں جب سے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہوں اُس وقت سے میں نے بچوں کی حکومت کے تمام چھوٹے اور بڑے پروگرام دیکھے ہیں جنھیں دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوتا رہا ہے۔

میں نے پچھلے چند برسوں میں ذاکر صاحب کے اصول کو اپناتے ہوئے بچوں کے دائرۂ کار وسیع تر کرنے کی کوشش کی اور بچوں کی حکومت کے ذریعے دوسرے پروگرام بھی کرائے گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ بچوں کی حکومت کے ذمے داروں نے امکان بھر ان کاموں کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کی ہے۔

میں بار بار کہتا رہا ہوں کہ جامعہ کی اعلا قدروں کے محافظ اور پاسبان ہمارے اسکول ہیں جو ان قدروں اور صالح روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اسکولوں کی حالت دیکھ کر مجھے جامعہ کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے اسکولوں کے بچے اپنی تعلیم اور تربیت کی طرف مزید دھیان دے کر گاندھی جی کے دیرینہ خواب کو پورا کریں گے۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ "جامعہ ایک ایسا ادارہ ہو جہاں اسلامی تہذیب کے ترجمان ہوں اور ساتھ ہی ایسے دیش بھگت مسلمان جو سماج سیوا کا کام کرتے وقت یہ نہ سوچیں کہ وہ شہروں میں کام کرتے ہیں یا گاؤں میں' ان کی خدمت سے ہندو فیض یاب ہوں یا مسلمان' ان کی خدمت کا کام خدا کی رحمت ہو جو سب کے لیے ہوتی ہے۔ ان کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوں۔ ان کا مذہب سب دلوں کو جوڑ دے۔ انھیں ایک دوسرے سے جدا نہ کرے۔ ایسا ہی مذہب اسلام جامعہ کے تہذیبی موقف کا سرچشمہ رہا ہے اور جامعہ کی اس تہذیب کا ایک نمونہ ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔"

میرے بچو! اگر آپ لوگ گاندھی جی کے ان اصولوں کو سچے دل سے اپنا کر اپنی تعلیم و تربیت کو بہتر کرنے کی کوشش کروگے تو ہم ملک و قوم کو ذاکر و اجمل' آزاد و نہرو پیدا کر کے دے سکیں گے جو اپنا' اپنے دیس اور اپنی جامعہ کا نام اونچا کر سکیں گے۔

بچوں کی حکومت اسی تہذیبی سرچشمہ کی مرہون منت خدا کرے آپ لوگ زیادہ سے زیادہ اس سرچشمے سے فیضیاب ہوں۔ اور اپنی حکومت کے ذریعے تربیت پا کر کل کے اچھے شہری بن سکیں۔

انور جمال قدوائی

پیغامِ مسرّت و تہنیت

میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ "پیامِ تعلیم" کا "بچّوں کی حکومت نمبر" شائع ہو رہا ہے۔ بچّوں کی حکومت ہمارے مدرسۂ ابتدائی کا ایک اہم بانشان ادارہ ہے جس کی نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلیمی تجربوں میں ایک خاص اور امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے، مدرسے کے تمام تجرباتی کاموں کا محور ہے۔ یہ ادارہ اور اس کی نگرانی میں، حکومت کے عہدیدار اور بچے شہریت اور اس کی ذمّے داریوں سے عہدہ برا ہونے کا پہلا سبق سیکھتے ہیں۔ بچّوں کی دکان، خوانچہ، بچّوں کا بینک، ڈائننگ ہال، کھیل کود، باغبانی، صحت و صفائی، غرض مدرسے کے سارے کام کا تعلق بچّوں کی حکومت سے ہوتا ہے اور انھیں کاموں کے ذریعے بچّوں میں خود اعتمادی اور مل جل کر کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

خوش نصیب ہیں وہ استاد جنھیں ایک ایسے مدرسے میں کام کرنے کا موقع ملے، جہاں بچّے بھی ان کے ساتھ تعلیمی و تربیتی کاموں میں شریک ہوں۔ بچّے جو ہمارا مستقبل ہیں اور جنھیں دیکھ کر ہم میں زندہ رہنے اور کچھ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ میں بچوں کی حکومت کے عہدیداروں اور مدرسے کے تمام بچّوں کو جنھوں نے ایسے حوصلہ مند ساتھیوں کو چنا ہے، مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ "پیامِ تعلیم" کا یہ خاص نمبر نکال کر صحافت کا پہلا سبق پڑھ رہے ہیں، میری دعا ہے کہ ان پر خدا کی رحمت کا سایہ رہے اور ان کے حوصلے بلند رہیں۔ آمین

(پروفیسر) ضیاء الحسن فاروقی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

✡

مجھے خوشی ہے کہ "پیامِ تعلیم" "بچّوں کی حکومت نمبر" شائع کر رہا ہے۔ میں نے مڈل اسکول کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس کی ایک ایک دھڑکن کو محسوس کیا ہے۔ یہاں بچّے ہی سب کچھ ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ہر ہر قدم پر اور ہر ہر موقع پر آگے رہتے ہیں۔

اس اسکول میں بہت سے مشاغل ہیں۔ سب مشاغل کی نسبت بچّوں سے ہے جیسے بچّوں کا بینک، بچّوں کا خوانچہ، بچّوں کی دکان وغیرہ۔ ان سب مشاغل کے روحِ رواں بچّے ہوتے ہیں۔ صدر کا الیکشن، مسند نشینی کا جلسہ،

ایک دن کا مدرسہ، یہ سب تقریبات بچوں کی عملی تربیت کا ذریعہ ہیں۔ اس عملی تربیت کے نتیجے میں یہاں کے بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ میل ملاپ کا جذبہ اُبھرتا ہے، خدمت کا احساس جنم لیتا ہے۔

مجھے توقع ہے یہ خصوصی نمبر دوسرے اداروں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

عبدالحق خاں
ڈائرکٹر تعلیم بالغاں، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

✡

شاہد علی خاں صاحب جنرل منیجر مکتبہ جامعہ قابلِ مبارک باد اور لائقِ ستایش ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے گذشتہ سال کی طرح امسال بھی "پیام تعلیم" کو اسکولوں کے خصوصی نمبر کے لیے وقف کیا ہے۔ مجھے امید ہے یہ نمبر جامعہ مڈل اسکول کی عملی اور تربیتی زندگی کا آیئنہ دار ہوگا۔

"بچوں کی حکومت" یہ الفاظ، یہ تصور صرف خواب نہیں، بلکہ جامعہ مڈل اسکول میں خواب کی تعبیر ہے۔ میں نے مڈل اسکول کے پچھلے دو تین سال میں خواب کی اس تعبیر کو دیکھا اور برتا ہے۔

اسکول کی زندگی ہو یا ہوسٹل کی مصروفیات، کلاس کا کمرہ ہو یا کھیل کا میدان، بچوں کی حکومت کے وزیر اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کو ذمّے داری، سلیقے، شوق اور لگن سے کرتے نظر آتے ہیں۔ بچّوں کی اِنھی خوبیوں کے سبب محترم شیخ الجامعہ صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اہم تقریبات کی ذمّے داری 'بچوں کی حکومت' کو سونپی۔ مجھے خوشی ہے کہ 'بچوں کی حکومت' کے ذمے دار شیخ الجامعہ صاحب کی توقعات پر پورے اُترے۔ بچوں کی اس کارکردگی کو ہمارے شیخ الجامعہ صاحب نے مختلف موقعوں پر سراہا — دراصل 'بچوں کی حکومت' بچوں کی شخصیت کی تشکیل، نشوونما اور ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے کا ایک عملی پروجیکٹ ہے۔ آج کے یہ ننھے اور معصوم بچّے کل کے امین ہوں گے۔ بچوں کی حکومت پروجیکٹ بچوں کو مستقبل کی باگ ڈور سنبھالنے، مستقبل کو بہتر سے بہتر بنانے کی عملی مشق ہے۔ سیکھنے کی یہ کوشش بچے کے حال کو مستقبل سے، نصاب کو زندگی سے، اور نظری کام کو عملی کام سے مربوط کرتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ "پیام تعلیم" کا یہ خصوصی نمبر نہ صرف جامعہ کے بچوں کے لیے بلکہ دوسرے تمام اداروں کے بچّوں کے لیے ایک روشن مینارہ ہوگا جس کی روشنی میں وہ اپنی زندگی کو بنا اور سنوار سکتے ہیں۔

خالد سیف اللہ
پرنسپل جامعہ ہائر سکنڈری اسکول، نئی دہلی ۲۵

تعارف
بچوں کی حکومت

جامعہ مڈل اسکول عملی اسکول ہے۔ اسی لیے اس میں "بچوں کی حکومت" قائم ہے، بچوں کی دکان ہے، بچوں کا خوانچہ ہے، بچوں کا کتب خانہ ہے، بچوں کا بینک ہے، باغبانی ہے، چڑیا گھر ہے اور میوزیم ہے۔ یہ ساری چیزیں مستقل پروجیکٹ کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہیں۔

بچوں کی حکومت سے ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ ہم اپنی حکومت کے ذریعے نہ صرف ایک دوسرے کے مشورے سے کاموں کو بہتر ڈھنگ سے کرنا سیکھتے ہیں بلکہ بڑوں کا ادب چھوٹوں کے ساتھ نرمی اور مہربانی کی عملی تعلیم بھی پاتے ہیں۔ اپنے اوپر بھروسا کرنا، ذمے داری کا احساس، مجلس کے آداب اور جلسوں کا انتظام کرنا سیکھتے ہیں۔

بہر حال بچوں کی حکومت کے کاموں سے ہم بہت سی صلاحیتوں کے مالک بن جاتے ہیں جو ہماری آیندہ زندگی میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

بچوں کی حکومت کے وزیر مدرسے کے بہت سے کاموں میں بڑی ذمے داری سے حصّہ لیتے ہیں۔ وزیر داخلہ نظم و ضبط یعنی ڈسپلن کا انتظام سنبھالتے ہیں۔ وزیر خوراک، ڈائننگ ہال، خوانچہ اور کینٹین سے متعلق ساری چیزوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ وزیر آرائش، اسکول کی سجاوٹ اور صفائی پر نظر رکھتے ہیں۔ وزیر کھیل، کھیل کے انتظامات میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ وزیر صحت و صفائی، بچوں کی جسمانی صفائی اور یونی فارم پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ وزیر اطلاعات دیواری اخبار نکالتے ہیں اور بچوں سے متعلق اطلاعات شائع کرتے ہیں۔ وزیر تعلیم، لائبریری میں آنے والے رسالوں اور کتابوں کی خبرگیری کرتے ہیں۔ بچوں کو لائبریری سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ ادبی جلسے کراتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی۔وی سے نشر ہونے والے بچوں کے پروگراموں کا بچوں کے دیکھنے اور سننے کا انتظام کرتے ہیں۔

یہ سارے وزیر، صدر اور وزیر اعظم کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔ بچوں کی حکومت کے مشیر جناب اخلاق قاسمی صاحب اور مدرسے کے تمام اساتذہ صاحبان ہم کو ضرورت پڑنے پر مفید مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں۔

پڑھائی کے ساتھ ساتھ یہ سارے کام کرتے رہنے سے ہمیں تحریر، تقریر، انتظام اور مسائل کو حل کرنے کا ڈھنگ آجاتا ہے۔ اس طرح مل جل کر کام کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے کام کی اہمیت معلوم ہو جاتی ہے اور بڑے سے بڑے کام کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔

ستمبر ۱۹۸۱ء میں بچوں کی حکومت کا اجلاس ہوا جس میں اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ اس سال یوم تاسیس کے موقع پر تعلیمی میلے کا اہتمام کیا جائے۔ اس فیصلے کی توثیق انجمن اساتذہ کی میٹنگ میں ہوئی جو ستمبر کے آخر میں منعقد ہوئی تھی۔ اکتوبر کے شروع میں مسلسل تعطیلات کی وجہ سے کاموں کی رفتار مدھم رہی، لیکن ۱۵ر اکتوبر کے بعد بچوں کی حکومت اور مدرسہ کے تمام شعبے اپنے اپنے کاموں کی طرف توجّہ دینے لگے۔

اس سال یوم تاسیس کے جلسے کا اہتمام بھی بچوں کی حکومت کے سپرد ہوا، لہٰذا ۱۲ر اکتوبر ۸۱ء کو ایک دعوت نامہ "بچوں کی حکومت" جامعہ مڈل اسکول کی وزیر اطلاعات کی طرف سے شائع ہوا، جس کے ساتھ تعلیمی میلے کا پروگرام بھی منسلک تھا۔

دعوت نامہ

بچوں کی حکومت جامعہ مڈل اسکول

نئی دہلی ۲۵

محترمی!

اس سال بچوں کی حکومت نے یوم تاسیس کے موقع پر

تعلیمی میلے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ میلا ۲۹؍اکتوبر ۸۳ء کو شروع ہوگا اور ۳۱؍اکتوبر تک جاری رہے گا۔ ۲۹؍اکتوبر کی شام چھ بجے بچوں کی حکومت کی رسم مسند نشینی کا جلسہ ہوگا جس کی صدارت شیخ الجامعہ صاحب فرمائیں گے۔

میلے اور مسند نشینی کے جلسے میں آپ کی شرکت ہمارے لیے باعث مسرّت ہوگی۔

نیاز مند

(وزیر اطلاعات)

جامعہ مڈل اسکول میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے زمانے سے ہی تمام کام بچوں کے ذریعے ہی کرائے جاتے رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج تک یہ اچھی روایت قائم ہے۔

ہمارے موجودہ شیخ الجامعہ صاحب نے پچھلے سالوں میں اس طرف مزید توجّہ فرمائی اور جامعہ کے جلسوں کا انتظام بھی بچوں کی حکومت کے سپرد فرمایا تاکہ بچّے اپنے اندر ذمّہ داری کا احساس شدت کے ساتھ محسوس کریں۔ اس احساس ذمّہ داری کی جھلکیاں بچوں کی حکومت کے کاموں میں قدم قدم پر نظر آئیں گی۔

تنویر اکرام

بچّوں کی حکومت کی
"تشکیل اور مقاصد"

۱۹۵۲ء تک جامعہ مڈل اسکول میں بچوں کی مجلس کے نام سے طلبہ کی ایک انجمن تھی، جس کا بڑا مقصد صرف یہ تھا کہ جلسے کرائے جائیں اور طلبہ میں تحریر و تقریر کے ذریعے اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ لیکن محترم آزاد رسول صاحب (سابق نگرانِ مدرسہ) کے نگران ہونے کے بعد طلبہ اور اساتذہ کے مشورے سے بچوں کی مجلس کو بچوں کی حکومت میں تبدیل کر دیا گیا۔

بچوں کی حکومت کے مقاصد:—

۱۔ طلبہ کو مدرسے کے انتظامی کاموں میں شریک کرنا۔
۲۔ طلبہ میں ذمّہ داری اور فرض کی ادائیگی کا احساس پیدا کرنا۔
۳۔ طلبہ کو مدرسے میں ڈسپلن قائم رکھنے کی عادت ڈالنا۔
۴۔ طلبہ میں مل جل کر رہنے کی عادت پیدا کرنا اور ایک اچھے شہری کی صفات پیدا کرنا۔

بچوں کی حکومت کا ایک باقاعدہ دستور ہے۔ دستور کی رو سے مدرسے کے تمام طلبہ اپنے میں سے ایک صدر چنتے ہیں۔ منتخب صدر، چیف جسٹس کو نامزد کرتا ہے۔ مختلف درجے، مختلف حلقوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مدرسے میں آٹھ درجے ہیں۔ سوائے اول، دوم کے جن کو صرف ووٹ دینے کا حق حاصل ہے، باقی درجوں کے نمایندوں کی تعداد مقرر ہے۔

ہشتم	۸
ہفتم	۶
ششم	۶
پنجم	۶
چہارم	۶
سوم	۴

نمایندے منتخب ہو کر آتے ہیں۔ ان ۳۶ نمایندوں سے پارلیمنٹ کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ نمایندے پارلیمنٹ کے ممبر کہلاتے ہیں۔ پھر یہ پارلیمنٹ کے ممبر اپنا ایک پارٹی لیڈر یا وزیر اعظم چنتے ہیں۔

جب وزیر اعظم کا انتخاب ہو جاتا ہے تو وہ پھر مختلف کام مختلف وزیروں کے سپرد کر دیتا ہے۔ بچوں کی حکومت کے کل دس عہدیدار ہیں، جن کے فرائض متعین ہیں۔

صدر کے فرائض:—

۱۔ مہمانوں کا استقبال کرنا۔
۲۔ علمی و ادبی جلسوں کی صدارت کرنا۔
۳۔ ایک دن کے مدرسے کے نگران کے فرائض انجام دینا۔

چیف جسٹس کو نامزد کرنا۔

چیف جسٹس کے فرائض:۔

۱۔ بچوں کی حکومت کے دستور کی پابندی کرانا۔
۲۔ ماتحت عدالتوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنا۔

وزیر اعظم کے فرائض:۔

۱۔ صدر کے مشورے سے وزیروں کا انتخاب کر کے کاموں کی تقسیم کرنا۔
۲۔ مہمانوں کو مدرسہ دکھانا۔
۳۔ کابینہ اور ممبران پارلیمنٹ کے درمیان اشتراک عمل پیدا کرنا۔
۴۔ مختلف تقریبات میں بچوں کی حکومت کی نمائندگی کرنا۔

وزیر مالیات کے فرائض:۔

۱۔ سال بھر کے لیے بچوں کی حکومت کے آمد و خرچ کا بجٹ تیار کرنا۔
۲۔ بچوں کے بینک کے آمد و خرچ کے حسابات رکھنا۔

وزیر آرائش کے فرائض:۔

۱۔ مدرسے اور بورڈنگ ہاؤس کی عام آرائش کا انتظام کرنا۔
۲۔ مختلف موقعوں پر تعلیمی نمائش لگوانے کا انتظام کرنا۔
۳۔ طلبہ میں مدرسے کی دیواروں اور عام آرائش کی چیزوں کو خراب نہ کرنے کا احساس پیدا کرنا۔
۴۔ روشنی کا انتظام کرنا۔

وزیر اطلاعات کے فرائض:۔

۱۔ قلمی رسالے نکالنا۔
۲۔ مصور اخبار نکالنا۔
۳۔ فلم دکھانے کا انتظام کرنا۔
۴۔ مدرسے کی مختلف تقریبات کی تصویریں کھنچوانا۔
۵۔ ریڈیو سنانے کا انتظام کرنا۔

وزیر تعلیم کے فرائض:۔

۱۔ علمی و ادبی جلسے منعقد کرنا۔
۲۔ کتب خانے کی دیکھ بھال اور انتظام کرنا۔
۳۔ بچوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا کرنا۔
۴۔ بچوں کے کتب خانے میں اخبارات اور رسائل کا انتظام کرنا۔
۵۔ مختلف لوگوں سے مختلف عنوانات پر تقریریں کرانا۔

وزیر صحت و صفائی کے فرائض:۔

۱۔ مدرسے اور بورڈنگ ہاؤس کی عام صفائی کی دیکھ بھال کرنا۔
۲۔ بیمار طلبہ کو بروقت طبی امداد پہنچانا۔
۳۔ بیماریوں کی روک تھام کے لیے انتظام کرنا۔
۴۔ مختلف ذرائع سے طلبہ میں صحت و صفائی کا ذوق پیدا کرنا۔

وزیر داخلہ کے فرائض:۔

۱۔ طلبہ میں نظم و ضبط قائم رکھنا۔
۲۔ روزانہ ترانے کا انتظام کرنا۔
۳ مدرسے اور بورڈنگ کے معمولات کی پابندی کرانا۔

وزیر خوراک کے فرائض:۔

۱۔ ڈائننگ ہال کے انتظام کی دیکھ بھال کرنا۔
۲۔ بچوں کے خوانچے اور بچوں کے کینٹین کا انتظام کرنا۔
۳۔ کھانے سے متعلق طلبہ کی شکایتوں کو دور کرنا۔
۴۔ مسند نشینی اور ایک دن کے مدرسے کے موقع پر مٹھائی کی تقسیم کا انتظام کرنا۔

وزیر کھیل کے فرائض:۔

۱۔ مختلف کھیلوں کا انتظام کرانا۔
۲۔ طلبہ کو ورزش اور کھیل کا پابند بنانا۔

۳۔ مختلف فرشی کھیلوں کا انتظام کرنا۔
۴۔ مختلف کھیلوں کا مقابلہ کرانا۔
۵۔ سالانہ اسپورٹس کا انتظام کرنا۔
۶۔ تفریحی پروگرام اور پکنک وغیرہ کا انتظام کرنا۔

اس طرح پورے سال بچوں کی حکومت کے ذمّے دار اپنے ساتھیوں کی مدد سے اسکول اور ہوسٹل کو خوب سے خوب تر بنانے میں لگے رہتے ہیں۔

مل جل کر کام کرنے کی بچوں کی اس لگن، کوشش اور محنت سے ان کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں اور ان میں وہ اچھائیاں اور خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس سے وہ آیندہ زندگی میں ایک اچھے طالب علم، اچھے شہری اور اچھے انسان بن سکتے ہیں۔

منظور الحق خاں

الیکشن کی رپورٹ

ہمارے مدرسے کا الیکشن بھی کیا عجیب چیز ہے کھیل کا کھیل اور کام کا کام ۔سیاست کی اچھی خاصی تعلیم اور لڑکوں کے اچھلنے کودنے کا انوکھا سامان۔ اگر کسی کے پاس وقت ہو، تو اس سارے پروگرام کو آ کر دیکھے اور سمجھے کہ سیاست بڑے ہی نہیں، چھوٹے بچے بھی جانتے ہیں اور بہت سے کاموں میں تو بڑوں سے بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ آج کی اس رپورٹ میں خاص طور پر میں آپ کو یہی سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ ہماری سیاست بڑے لوگوں کی سیاست سے کیوں اچھی ہے اور ہم اس کھیل میں کیا سیکھتے ہیں۔ گذشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی جولائی میں مدرسہ کھلا اور پرانے طلبہ نے نئے ساتھیوں کو الیکشن کی سرگرمیوں سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ ہر طرف چرچے ہونے لگے کہ دیکھیں اس سال صدر کون ہوتا ہے۔

ہمارے ایک ساتھی مرزا قمر بیگ نے تو پچھلے سال ہی صدارت کے الیکشن کے پروگرام بنانے شروع کر دیے تھے۔ "میں کھیل کے بڑے میدان میں لاؤڈ سپیکر لگواؤں گا۔ جس میں دن بھر گانے ہوتے رہیں گے۔ شامیانے لگواؤں گا۔ مٹھائی کھلاؤں گا" اور نہ جانے کیا کیا۔ مگر ہوا یہ کہ اس سال جب الیکشن کی باتیں شروع ہوئیں، تو ان کے ساتھیوں نے انھیں سمجھایا کہ محترم آپ کی شخصیت میں صدر بننے کی صلاحیت نہیں معلوم ہوتی۔ آپ کی چال ڈھال ہی کہتی ہے۔

اب دیکھیے لڑکوں کی نظر انتخاب مدرسے کے چند چنے ہوئے اُن طلبہ پر پڑی جو واقعی صدارت کی صلاحیت رکھتے تھے، جن میں اظہر آصف انصاری، تنویر اکرام، اعجاز حسین زیدی، ضیا حیدر، راشد رفیق اور منظور الحق شامل تھے۔

جدھر دیکھیے طلبہ کی زبان پر اُن ہی میں سے کسی نہ کسی کا نام سنائی دیتا۔ سب کو انتظار تھا کہ الیکشن کی کارروائی شروع کرنے کا اعلان ہو۔

بہر حال انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور ۲۶ر اگست کو اعلان کیا گیا کہ سوم تا ہشتم، ہر سیکشن سے دو دو نمایندے چن کر بھیج دیے جائیں۔ چنانچہ ۱۲ طلبہ کے نام آئے۔ انھوں نے سوچ سمجھ کر خاکسار کو الیکشن کمشنر مقرر کیا۔ جس کا دوسرے دن ترانے میں اعلان کر دیا گیا ـــــ اور اس کے فوراً بعد میں نے بھی اپنا کام شروع کر دیا۔

ایک دن کے بعد میں نے کہا کہ صدارت کے لیے نام پیش کیے جائیں۔ امیدوار کے نام باقاعدہ بچوں کی حکومت کے پیڈ پر تجویز، تائید اور استادِ درجہ کی تصدیق کے ساتھ میرے پاس آنا چاہییں۔ غرض، تین دن میں بیس ناموں کو مختلف لڑکوں نے پیش کیا۔ اس کے بعد میں نے نام واپس لینے کی تاریخ کا اعلان کیا۔ ۳۱ر اگست تک ۱۷ امیدواروں نے اپنے نام واپس لے لیے اور اب میدان میں الیکشن لڑنے کے لیے تین امیدوار ـــــ اظہر آصف انصاری،

تنویر اکرام اور مرزا قمر بیگ ـــــ رہ گئے۔

یہ صاحب اب الیکشن کا زور بندھا۔ ہر امیدوار کے ساتھیوں نے زوردار مضامین اور نظمیں تیار کرنی شروع کیں۔ پوسٹر بننے لگے۔ چادریں (بینر) تیار ہونے لگیں۔ بس اس تیاری میں بچوں کی صلاحیت کے مناظر دیکھنے کی چیز تھے۔ جہاں تک رائے دینے کا تعلق ہے، ہر بچہ آزاد تھا کہ وہ جس کو چاہے ووٹ دے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ جس کو ووٹ دینے کے قابل سمجھتا ہے، اس کے علاوہ باقی امیدواروں کی مخالفت کرے، جیسا کہ عموماً بڑے الیکشنوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ طلبہ الیکشن کے وقت تمام امیدواروں کا کام بھاگ دوڑ کر کر رہے تھے۔ وہ اگرچہ کامیاب نہ ہو سکے، مگر ان کے پوسٹر اور چادریں وغیرہ زیادہ تر بورڈنگ کے طلبہ ہی نے تیار کیں اور ان کو خود دیواروں پر لگایا تاکہ اپنے ساتھی یہ نہ محسوس کریں کہ میرا کوئی کام کرنے والا نہیں۔ ایک صاحب نے اس قدر میل جول کا مظاہرہ کیا، کہ ترانے میں تینوں امیدواروں کے انتخابی نشان والے بلّے لگا کر آئیں اور جب نعرے لگنے کا وقت آیا تو انھوں نے تینوں امیدواروں کے نعرے لگائے۔ بعد میں ان کو سمجھایا گیا کہ الیکشن میں یہ بات بھی مناسب نہیں ہے کہ تینوں امیدواروں کو خوش کرنے کے لیے آپ ایسی کوشش کریں، جو ایک قسم کا دھوکا معلوم ہوتا ہو۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ووٹ تو آپ کسی ایک کو ہی دیں گی پھر تینوں کے کھل کر نعرے لگانے کا کیا مطلب ہے۔ بہر حال ان کی سمجھ میں آگیا۔

اس کے علاوہ الیکشن کے پوسٹروں کے مضامین اور عنوانات گندے یا دوسرے کی مخالفت کرنے والے نہیں تھے، جیسے کہ ابھی چند ماہ پہلے لوک سبھا کے الیکشن میں پوسٹر لگائے گئے تھے۔ مثلاً: "نیا جال لایا پرانا شکاری"۔ "سڑے پھندے والے کانگریسیوں کی باسی کڑھی میں ابال"۔ "جن سنگھیوں کی بلی تھیلے سے باہر آگئی"۔ "تم نے فلاں فلاں کام کیے یا نہیں" غرض اس طرح کی ہزاروں باتیں دیکھنے میں آتی تھیں، مگر ہمارے تمام پوسٹر اس قسم کی باتوں سے پاک رہے۔ ان میں صرف اپنے امیدوار کی خوبیاں، اس پر دلچسپ لطیفے یا کارٹون ہوتے تھے۔ اس کے بعد امیدواروں نے اپنے اپنے انتخابی نشان مقرر کیے جس میں اظہر آصف انصاری کا نشان 'ترازو' تنویر اکرام کا 'سورج' اور مرزا قمر بیگ کا نشان 'موم بتی' طے ہوا۔

اب نعرے بھی زور شور سے لگنے لگے تھے۔ الیکشن کی تاریخ ۴ ستمبر مقرر کی گئی۔ استادوں نے طلبہ کو ووٹ ڈالنے کا طریقہ بتایا۔ امیدواروں نے اپنے اپنے منشور یا مینی فیسٹو تیار کیے۔ ان کے ساتھیوں نے نظمیں اور مضامین لکھے۔ شام کو صدر دروازے پر تینوں امیدواروں کے پوسٹر خوبصورتی سے لگا دیے گئے، پھر تینوں کی چادریں ایک رسّی میں باندھ کر سب سے اوپر لگا دی گئیں۔ آٹھ بجے صدر دروازے پر جلسہ شروع ہوا جس کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا اس کے بعد بچوں کی حکومت کی طرف سے ایک نظم سنائی گئی اور پھر ہر امیدوار کی طرف سے ایک ایک مضمون پڑھا گیا اور آخر میں تینوں امیدواروں نے اپنے اپنے مینی فیسٹو پڑھے کہ ہم صدر بن گئے تو کیا کیا کریں گے۔ اس طرح زوردار نعروں کے ساتھ ½ ۹ بجے جلسہ ختم ہوا۔ اس کے بعد جلوس نکالے گئے اور اسی دھوم دھام میں رات کے ½ ۱۰ بج گئے۔

دوسرے دن صبح ½ ۱۱ بجے مدرسہ ابتدائی کے کتب خانے میں پولنگ شروع ہوئی۔ مدرسے کے دو استاد صاحبان پولنگ افسر مقرر کیے گئے اور خاکسار نے الیکشن کمشنر، نے بیلٹ پیپر دینے کا کام انجام دیا۔

ووٹروں کو پریشانی نہ ہو، اس خیال سے ترتیب سے کلاس وائز ووٹ ڈلوائے گئے۔ اس موقع پر ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ اوّل جماعت کے ایک ووٹر کو جب بیلٹ پیپر دے کر پردے کے پیچھے بھیجا گیا تو ان کو وہاں سے واپس آنے میں کچھ دیر ہوئی۔ آپا جان نے جا کر دیکھا کہ آخر کیا کارستانی ہو رہی ہے تو دیکھا کہ ننھے منّے ووٹر صاحب بیلٹ پیپر ہاتھ میں لیے آنکھوں میں آنسو بھرے، پریشان کھڑے ہیں۔ آپا جان نے پوچھا: "بھئی کیوں کھڑے ہو ووٹ

کیوں نہیں ڈالتے؟" کہنے لگے "ہمیں یاد نہیں رہا کس کو ووٹ دینا ہے۔" ابا جان نے کہا کہ اب اس کا موقع تو ہے نہیں کہ باہر جا کر سوچ کر آئیں اس لیے جلدی سے کسی بکس میں، جس کا نشان آپ کو پسند ہو، ووٹ ڈال دیجیے۔ تب جا کر انھوں نے ووٹ ڈالا۔

۱/۲ ۱۱ بجے پولنگ ختم ہوئی اور ووٹ شمار کرنے کا کام شروع ہوا۔ ووٹ گننے کے وقت تینوں نمایندے، پولنگ افسر صاحب اور خاکسار، وہاں موجود تھے۔ ۱/۲ ۱ بجے جناب نگراں صاحب نے تمام طلبہ کو پولنگ اسٹیشن کے سامنے جمع کیا اور نتیجے کا اعلان کیا۔ کُل ۶۰۰ ووٹ ڈالے گئے، جس میں اظہر آصف انصاری نے ۳۱۲ ووٹ، تنویر اکرام نے ۱۲۲ اور مرزا قمر بیگ نے ۵۶ ووٹ حاصل کیے۔ اظہر آصف نے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے تھے، اس لیے وہ کامیاب قرار دیے گئے۔ اس اعلان کو سنتے ہی طلبہ خوشی میں جھوم اٹھے۔ اظہر آصف کا جلوس نکالا گیا۔

ہمارے اس الیکشن کی خوبی یہ تھی کہ ہارنے جیتنے کے بعد ہم پھر اسی طرح گھل مل گئے، جیسے پہلے تھے۔ ساتھیوں میں یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ کون ہارا، کون جیتا، جب کہ بڑے الیکشنوں میں ہارنے کی دشمنی بڑے رنگ لاتی ہے۔ ابھی کلکتہ میں ایک مشہور لیڈر کو اس کے الیکشن میں جیتنے کے دوسرے دن قتل کر دیا گیا۔ ہمارا الیکشن اگرچہ دیکھنے میں بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے، مگر اس کھیل ہی کھیل میں ہمیں وہ سب باتیں جو آگے آئیں گی، معلوم ہو جاتی ہیں۔ الیکشن کیا ہے؟ ووٹ کس طرح ڈالتے ہیں؟ ووٹ کی قیمت کیا ہے؟ وغیرہ ابتدائی اور بنیادی باتیں ہم عملی طور پر سمجھنے لگے ہیں۔

سید رضی باقر

جلسہ مسند نشینی

جامعہ مڈل اسکول میں تعلیم کا مقصد صرف یہی نہیں بلکہ بچے کچھ لکھ پڑھ لیں بلکہ اصل مقصد ان کی شخصیت کی نشوونما ہے۔ بچوں کی حکومت کے ذریعے ان میں اگر ایک طرف ذمے داری کا احساس، اپنے اوپر بھروسا کرنا اور اچھے شہری کی صفات پیدا کی جاتی ہیں تو دوسری طرف ان میں لیڈر شپ اور انتظامی صلاحیتیں بھی بیدار کی جاتی ہیں۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے بچوں کی حکومت کا الیکشن کرایا جاتا ہے۔ الیکشن کے بعد چنے ہوئے عہدے داروں کو حلف وفاداری دلایا جاتا ہے۔ اس حلف وفاداری کی رسم کو "مسند نشینی کا جلسہ" کہتے ہیں۔

مسند نشینی کے جلسے میں سابق صدر سالانہ رپورٹ پیش کرتا ہے اور نیا صدر اپنے ارادوں اور پروگراموں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اپنے ساتھیوں کو ترغیب دلاتا ہے کہ وہ اپنی ذمے داریوں کو نبھانے میں کوئی کمی نہ اٹھا رکھیں۔ لیجیے مسند نشینی کی ایک ہلکی سی جھلک ملاحظہ فرمائیے۔

صدر دروازے پر دو تختوں کو جوڑ کر ایک اسٹیج بنایا گیا ہے۔ اس کے اوپر تین خالی کرسیاں پڑی ہیں۔ اسٹیج سے نیچے آ کر دائرے کی شکل میں بڑے قاعدے کے ساتھ بہت سی کرسیاں رکھی ہیں۔ صدر دروازے سے نیچے اتر کر بچوں اور مہمانوں کا ہجوم بے چینی سے جلسہ شروع ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔ اتنے میں شیخ الجامعہ صاحب تشریف لے آئے بچوں کی نئی حکومت کے عہدیداران، کالی شیروانی، ٹوپی اور سفید پاجامے میں، لائن بنا کر ہنڈال کے باہر کھڑے تھے۔ شیخ الجامعہ صاحب کو دیکھتے ہی کابینہ نے ان کا پرتپاک استقبال کیا اور پھر سابق صدر اور وزیر اعظم کے ہمراہ وہ اسٹیج پر تشریف لے آئے۔ ان کے دائیں بائیں صدر اور وزیر اعظم بیٹھ گئے۔ سابق وزیر اعظم نے اٹھ کر جلسے کی کارروائی شروع ہونے کا اعلان کیا۔ فوراً ہی نئی کابینہ کا جلوس سامنے کی پٹریوں سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ یہ جلوس خراماں خراماں چلتا ہوا پنڈال میں داخل ہو رہا ہے

رقص مے تیز کرو ساز کی لے تیز کرو
سوئے مے خانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں

سب لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ بچوں کی حکومت کے صدر تقریر کرنے کے لیے تشریف لائیں۔ صدر محترم آئے اور اپنی سارے سال کی محنت کی پوٹلی سب کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ اس کے بعد حلف وفاداری کی رسم شروع ہوئی۔ سب سے پہلے چیف جسٹس نے صدر کو حلف دلایا۔ اس کے بعد صدر نے وزیر اعظم کو، اور وزیر اعظم نے ان الفاظ کے ساتھ اپنی کابینہ کو حلف دلایا۔

"میں سچے دل سے خدا کو حاضر و ناظر جان کر حلف لیتا ہوں کہ بچوں کی حکومت کی جو ذمے داری مجھ پر ڈالی گئی ہے، میں حکومت کا وزیر ہونے کی حیثیت سے وفاداری اور دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دوں گا اور اپنی تمام صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے بچوں کی حکومت کے آئین کے مطابق، ہر طالب علم کے ساتھ بغیر کسی رعایت یا لاگ لگاؤ کے ٹھیک ٹھیک برتاؤ کروں گا، اور قوم کی خدمت اور فلاح و بہبود کے لیے پوری تندہی سے کوشش کروں گا"

حلف وفاداری کی رسم کے بعد نئی کابینہ کو مبارکباد دینے کے لیے یہ نظم پڑھی گئی۔

مبارک ہو یہ رسم مسند نشینی — حکومت کی ہے باگ تم نے سنبھالی
نئی یہ وزارت بھی اپنی بنالی — اسے کامیابی سے گر جو چلائی
تو کہلائے گی یہ حکومت مثالی — مبارک ہو یہ رسم مسند نشینی
مبارک ہو یہ رسم مسند نشینی

حکومت کو تم اپنی بہتر بنانا — مقاصد کو اپنے نہ تم بھول جانا
ہر اک گام پر ان کو رہبر بنانا — سمجھ کر قدم اپنا آگے بڑھانا
مبارک ہو یہ رسم مسند نشینی
مبارک ہو یہ رسم مسند نشینی

منیر ان سے کہتا ہے سارا زمانہ — فرائض کو اپنے نہ تم بھول جانا
غرض یہ کہ کچھ ایسے جوہر دکھانا — جو وعدے کیے ہیں انھیں تم نبھانا
مبارک ہو یہ رسم مسند نشینی
مبارک ہو یہ رسم مسند نشینی

مبارکبادی نظم کے بعد نئی کابینہ کا تعارف مزاحیہ انداز میں کرایا گیا۔

آخر میں جناب شیخ الجامعہ صاحب نے ہمیں نصیحتیں کیں، اور ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اس کے بعد جلسے کا اختتام ہوگیا۔

جلسہ تو ختم ہوگیا مگر کیا آپ کے خیال میں یہ محض ایک ڈراما تھا کہ جس کو کر کے بھول گئے؟ نہیں، بلکہ ہماری ننھی منی سرکار کو اپنے کیے ہوئے وعدے ہمیشہ یاد رہتے ہیں اور یہ سال بھر ہماری فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ اس سے نہ صرف ہم میں خودداری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے بلکہ ذمے داری کا احساس اور اپنی اہمیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ قومی خدمت کا جذبہ ہمارے ذہنوں میں بیدار کر دیا جاتا ہے۔

ہمارے اندر تقریر کرنے کی صلاحیت اس حد تک پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم جہاں چاہیں، جس سے چاہیں اپنی بات بلاتکلف کہہ سکتے ہیں، اور نہ جانے کتنی انجانی خوبیاں اسی بچوں کی حکومت کی بدولت ہم میں رچ بس جاتی ہیں اور بچوں کے اندر خود اعتمادی کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ بچے دعوا کر سکتے ہیں۔

ہم بنائیں گے نیا جہاں
ہم سجائیں گے نیا چمن

محمد اکبر خاں

خطبۂ صدارت

(۱۹۸۱ء)

اس خطبہ کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس میں رخصت ہونے والے نگران مدرسہ جناب آزاد رسول صاحب کو الوداع اور آنے والے نگرانِ مدرسہ جناب خالد سیف اللہ صاحب کو خوش آمدید کہا گیا ہے۔

اراکین کابینہ، ممبران پارلیمنٹ اور عام اراکین!

اس وقت میں یہ اپنا خوش گوار فرض سمجھتا ہوں کہ آپ نے

مجھے اپنی حکومت کا صدر منتخب کر کے جو عزّت بخشی، اس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کر دوں۔ میرے ساتھی جانتے ہیں کہ میں پڑھنے لکھنے سے مطلب رکھتا ہوں۔ اس قسم کے کاموں سے دور بھاگتا ہوں۔ لیکن ساتھیوں نے کچھ ایسا مجبور کیا کہ انکار کرتے نہ بنا اور مقابلے کے لیے میدان میں نکلنا ہی پڑا۔ مجھے خوشی ہے کہ اکثر ساتھیوں نے مجھی کو ووٹ دیا اور کامیاب بنایا۔ میری حیرت کی اس وقت کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ الیکشن کا نتیجہ سنتے ہی وہ ساتھی بھی جو میرے خلاف نعرے لگا رہے تھے، مجھے کرسی پر بٹھائے ہوئے چاروں طرف گھماتے پھر رہے تھے اور زندہ باد کے نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی سچی جمہوریت ہے۔ بہرصورت میں آپ تمام حضرات کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ یہ آپ کی محبّت ہے جس نے مجھے فرش سے عرش پر پہنچا دیا۔ خدا کرے میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچاؤں اور آپ کی امیدوں کو پورا کر سکوں۔

عزیز ساتھیو! میں نے صدر منتخب ہونے کے بعد مدرسے کے ایک ساتھی یوسف سعید متعلم ہشتم کو حکومت کا چیف جسٹس بنایا۔ مختلف درجوں سے جو نمایندے منتخب ہو کر آئے ہیں، انھوں نے مظہر آصف متعلم ہشتم کو پارٹی لیڈر یعنی وزیر اعظم چنا۔ مظہر آصف جو کابینہ بنائی ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

کابینہ: اب میں کابینہ کے ارکان سے چند باتیں کہنا چاہوں گا۔ سب سے پہلے تو میں آپ کو آپ کے منتخب ہونے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ آپ پر حکومت کی بڑی ذمّے داری ڈالی گئی ہے، امید ہے کہ اپنے ساتھیوں پر بغیر دھونس جمائے ان کو سمجھا بجھا کر اپنا کام چلانے کی کوشش کریں گے اور بغیر کسی رو رعایت اور لاگ لگاو کے ہر طالب علم کے ساتھ ٹھیک برتاو کریں گے۔ یہ ذمّے داری صرف نام نہیں، کچھ کام بھی چاہتی ہے اور یہ اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک تمام وزرا مدرسے کو بہتر بنانے کا پکا ارادہ نہ کریں اور صرف ارادہ ہی نہیں، بلکہ خود کچھ کرنے کے لیے بھی تیار رہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ذاکر صاحب کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ لیجیے آپ بھی سن لیجیے:

ایک مرتبہ ہمارے اسکول کے بچوں کا ایک گروپ تعلیمی سیر کی غرض سے باہر گیا۔ رانچی میں ذاکر صاحب سے ایک گورنر کی حیثیت سے ملاقات ہوئی۔ بچوں کی حکومت کے کئی وزیر بھی تھے۔ سب سے تعارف کرایا گیا۔ جب وزیر صحت و صفائی کا نمبر آیا تو ذاکر صاحب نے ان سے دریافت کیا۔ آپ کا مدرسے میں کیا کام ہے۔ وزیر نے کہا میں مدرسے کی صفائی کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ اس پر ذاکر صاحب نے فوراً ان سے پوچھا کیا آپ کو جھاڑو دینی آتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی جھاڑو دی ہے۔ اس پر وزیر صاحب حیرت زدہ اُن کا منہ تکنے لگے شاید وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کیا وزیر کو بھی جھاڑو دینے کی ضرورت ہے۔ یا وزیر کو خود بھی جھاڑو دینی چاہیے۔ مگر ذاکر صاحب اپنے سوال کے ذریعے یہ سمجھا دینا چاہتے تھے کہ کسی کام کی نگرانی کرنے کے لیے یا کسی ذمّے داری کو سنبھالنے کے لیے خود اس شخص کو اس کام سے واقف ہونا ضروری ہے۔ یہی حال ہر کام کا ہے۔ اگر آپ اس بات کو سامنے رکھیں گے تو مجھے پوری امید ہے کہ بچوں کی حکومت کا کام بہت اچھا چلے گا۔ ساتھی بھی آپ سے خوش رہیں گے اور اساتذہ بھی۔

عزیز ساتھیو! مدرسے میں کچھ کام تو ایسے ہیں جن میں آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کو وزیروں پر چھوڑ دیجیے کہ وہ مدرسے اور جامعہ کے ذمے دار لوگوں سے مل کر انھیں پورا کرائیں اور آپ کے حقوق کی حفاظت کرائیں۔ لیکن کچھ کام ایسے ہیں جن کی حیثیت فرائض کی ہے، جو خود آپ کے کرنے کے ہیں۔ جیسے روزانہ مدرسے کے یونیفارم میں مدرسے آنا، صاف ستھرا رہنا، گھنٹوں سے غائب نہ ہونا، دیواروں پر نہ لکھنا، زبان سے بُرے الفاظ نہ نکالنا، گھر سے کام کر کے لانا، مدرسے کی چیزوں کو اپنی چیز سمجھ کر ان کی حفاظت کرنا اور توڑ پھوڑ سے بچانا۔ وزیر ان کاموں کے سلسلے میں آپ سے کہتے سنتے رہیں گے۔ امید ہے کہ آپ ان کے ساتھ پورا تعاون کریں گے۔ آپ کے تعاون کے بغیر صرف کیبنٹ کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر آپ اپنے فرائض کو اچھی طرح ادا کرتے رہیں تو وزرا کو آپ کے حقوق منوانے میں آسانی ہوگی۔ مدرسے کے کاموں کی نوعیت ایسی ہے کہ ایک طرف مدرسے کے وزرا اور تمام طلبہ اور دوسری طرف نہ صرف اساتذہ بلکہ بچوں کے

سودوست مل کر کوشش کریں تب ہی کچھ سدھار ہو سکتا ہے اور مدرسہ صاف ستھرا اور نمونے کا مدرسہ بن سکتا ہے۔ میں اس موقع پر مدرسے کے غیر مقیم طلبہ کے سرپرستوں سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال اور ان کے لیے مدرسے کا یونیفارم اور ضروری سامان فراہم کرنے میں ہماری مدد کریں تاکہ مدرسے کے تمام طلبہ یکساں ترقی کر سکیں اور مدرسے کے کاموں کو آگے بڑھا سکیں۔

ساتھیو! آپ جانتے ہیں ہمارا مدرسہ ایک اقامتی مدرسہ ہے۔ جس میں مدرسے کے انتظام سے متعلق کاموں میں اساتذہ کے علاوہ طلبہ سے بھی بچوں کی حکومت کے ذریعے مدد لی جاتی ہے۔ پہلے ہمارے مدرسے میں مقیم طلبہ کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ غیر مقیم طلبہ کی تعداد بڑھنی شروع ہو گئی۔ اب اس وقت مدرسے میں ۵۴۰ غیر مقیم طلبہ ہیں اور ۱۵۷ مقیم طلبہ۔ غیر مقیم طلبہ کی تعداد کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ مقیم اور غیر مقیم طلبہ میں امتیاز اور فرق کا احساس بھی بڑھتا گیا۔ یہ احساس ناخوش گوار حد تک بڑھ گیا ہے۔ الیکشن کے موقع پر اس کا مظاہرہ افسوس ناک حد تک ہونے لگا ہے۔ اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ اس احساس کو دل سے نکال دیجیے۔ مقیم ہوں یا غیر مقیم، سب اپنے آپ کو ایک ہی اسکول کا طالب علم سمجھیں اور آپس میں مل جل کر رہیں تاکہ کسی قسم کی بدمزگی نہ ہو۔

دوستو اور ساتھیو! میں چاہتا ہوں اس موقع پر ایک ضروری بات کی طرف اشارہ کروں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بڑے ساتھیوں کا نمونہ ہمارے سامنے رہتا ہے اور ہم ایک طرح سے اس کی نقل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ یہ بات کسی بھی صورت میں مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ ہم بغیر سوچے سمجھے اپنے بڑے ساتھیوں کی نقل کرنے لگیں۔ ہمارے بڑے ساتھی اگر کوئی ایسی بات کریں جو مناسب نہ ہو اور ہمیں خواہ مخواہ ساتھ دینے پر مجبور کریں تو ہم کو چاہیے کہ ہم صاف انکار کر دیں۔ خود سوچیں سمجھیں اور آپ کی حکومت کی کیبنٹ کا جو فیصلہ ہو، اس کا احترام کرتے ہوئے اس پر عمل کریں۔

معزز حاضرین!

میری بات نامکمل رہ جائے گی اگر میں اپنے حال کے ذکر کے ساتھ اپنے ماضی کا ذکر نہ کروں۔ اپنا دردِ دل نہ کہوں اور سابق نگرانِ مدرسہ جناب آزاد رسول صاحب کا ذکر نہ کروں جو حال ہی میں ہمارے مدرسے کی ۲۳ سال خدمت کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے ہیں۔ آپ کا دور سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ آپ ایک اچھے استاد بھی تھے اور اچھے استادوں کے شاگرد بھی۔ آپ کو ذاکر صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب، عابد حسین صاحب اور کیلاٹ صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل رہا ہے۔ آپ کے حسنِ انتظام، حسنِ عمل اور استقامتِ کردار کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مڈل اسکول کا گوشہ گوشہ، پتا پتا، بوٹا بوٹا' آپ نے زمانے کے پروجیکٹ، بچوں کی حکومت کی نئی تشکیل و تنظیم اور حسن تربیت کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ میں بچوں کی حکومت کے صدر کی حیثیت سے جگر کا یہ شعر ایک ہلکی سی تحریف کے ساتھ خدمتِ عالیہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں ؎

جان کر من جملۂ خاصانِ میخانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

لیکن اس دنیا میں صبح و شام، طلوع و غروب اور آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے آپ کے رخصت ہونے کے بعد ہماری انتظامیہ نے ہمیں ایک اچھا نگراں خالد سیف اللہ صاحب کے روپ میں دیا ہے۔ یوں سمجھیے کہ "آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا"۔ لہٰذا اس آفتابِ تازہ کا میں صدر کی حیثیت سے پُرجوش خیر مقدم کرتا ہوں۔

حضرات! میں اس خوشی کے موقع پر ایک نئی خوشی کا اعلان کرتا ہوں۔ ہر سال اول تا ہشتم کے کورس کی سیکڑوں کتابیں ردی کی نذر ہو جاتی ہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے بچوں کی حکومت کے زیر اہتمام بک بینک قائم کرنے کی تجویز رکھی ہے تاکہ یہ کتابیں ہمارے ان ساتھیوں کو مل سکیں جو اقتصادی اعتبار سے کمزور ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارے نگران صاحب نے میری اس تجویز پر لبیک کہا اور اپنے بھرپور تعاون

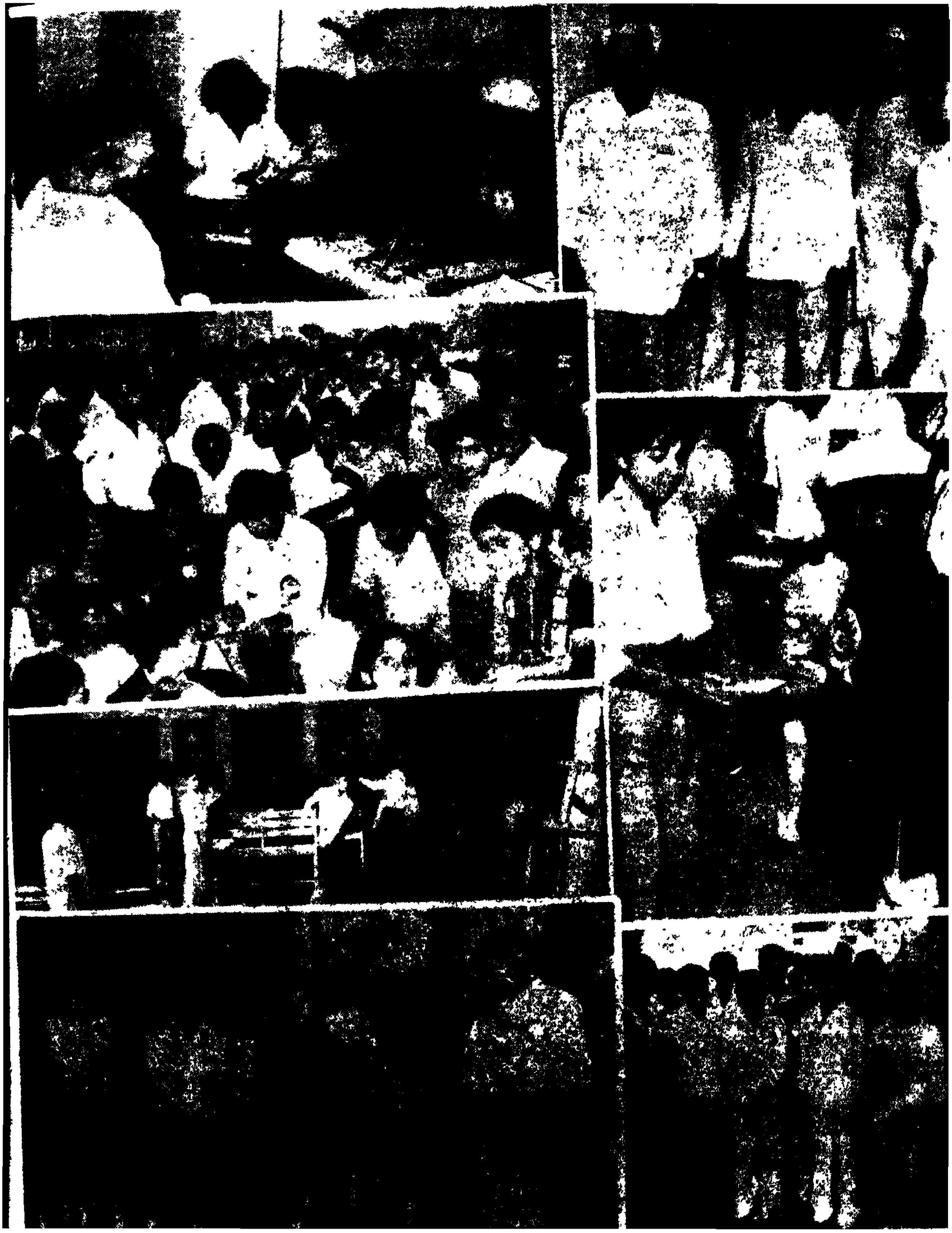
کا یقین دلایا۔

محترم شیخ الجامعہ صاحب! مسند نشینی کا یہ جلسہ بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا، لیکن اس جلسے کی صدارت حسب روایت شیخ الجامعہ صاحب فرماتے رہے ہیں اور آپ پچھلے دنوں غیر معمولی طور پر عدیم الفرصت رہے اس لیے یہ تاخیر ضروری تھی۔ بہر حال، مجھے مدرسے کی ضروریات کے سلسلے میں چند باتیں آپ کی خدمت میں پیش کرنی ہیں۔ ہمارے اسکول میں کامن روم نہیں ہے، جس کی وجہ سے طلبہ کو عام طور پر اور طالبات کو خاص طور پر بہت پریشانی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہفتہ واری ادبی جلسوں کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں۔ ہم ان جلسوں کو مسجد میں کرتے ہیں، جو کسی حد تک مناسب نہیں ہے۔ ایسے ہی ہمارے اسکول میں لیٹرین نہیں ہیں اور جو ہیں، وہ بہت خراب ہیں اور اس خرابی کو کچھ ہم ہی لوگ جانتے ہیں، جو انھیں استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے کیمپس میں باہر والوں کی مستقل آمد و رفت رہتی ہے۔ یوں سمجھیے کہ ہر وقت خوانچہ والوں کی آوازیں، سائیکل اور اسکوٹر کی دوڑیں ہوتی رہتی ہیں۔ حد تو یہ کہ صبح ترانے کے وقت بعض ہمت والے سائیکل سوار ہمارے ترانے کی قطاروں کے اندر سے بھی گزرنے کی کوشش کر لیتے ہیں، جس کی وجہ سے ہمارے اسکول کا ڈسپلن خراب ہو جاتا ہے۔ بورڈنگ ہاؤس پر نظر ڈال لیجیے تو ان کی حالت بھی غیر اطمینان بخش ہے۔ بورڈنگوں میں نہ حفاظت ہے، نہ طالب علموں کے لیے سامان رکھنے کی جگہ۔ جگہ تنگ ہے اور مردم بسیار۔ شب و روز کی محنت اور مسلسل کوشش کے باوجود بھی تربیتی کیفیت اطمینان بخش نہیں ہے۔ میری درخواست ہے کہ کسی وقت بلا اطلاع آنجناب مڈل اسکول ہوسٹل میں تشریف لائیں اور پھر دیکھیں کہ یہاں کے لوگ اپنے بس بھر اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں یا نہیں۔ لیکن دوسری طرف ہمارے مسائل ہیں۔ جو ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ ہم اپنے مسائل کو لیے در بدر پھرتے ہیں۔ غرض ہم ہیں اور تماشائے اہلِ کرم۔

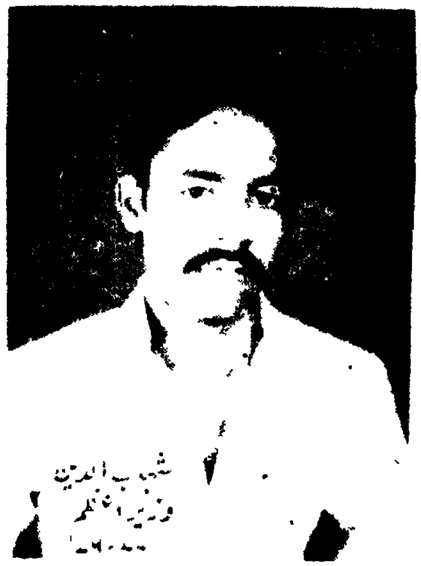
جناب عالی! میری داستان طویل ہو گئی ہے۔ چونکہ آپ جیسی شخصیت میری باتوں کو سن رہی ہے۔ اگرچہ میں نے نگرانِ مدرسہ سے بھی ان مسائل پر تبادلۂ خیال کیا تھا۔ ان کے ذریعے بھی یہ مسائل آپ تک پہنچے ہوں گے۔ نگران صاحب نے میری باتیں سن کر ان کے حل کا وعدہ کیا تھا، لیکن اب تک اس سلسلے میں ان کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ دوسری طرف ہم صبر بھی کرنا جانتے ہیں اور کرتے رہے ہیں۔ لیکن اپنے بڑوں تک مسائل کو رکھنا بھی ضروری ہے مجھے آپ کی ذمے داریوں کا احساس ہے جی تو چاہتا تھا کہ تفصیل سے آپ کی خدمت میں اپنے ادارے کے تمام مسائل رکھوں، لیکن ڈر لگتا ہے کہ کہیں صبر و تحمل کا وہ ذخیرہ جو آج آپ نے ہمارے لیے وقف کیا تھا، ختم نہ ہو گیا ہو۔ اس لیے اپنی بات ایک بار پھر شاعر کی زبان میں دہرا کر ختم کرتا ہوں۔

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیِ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے









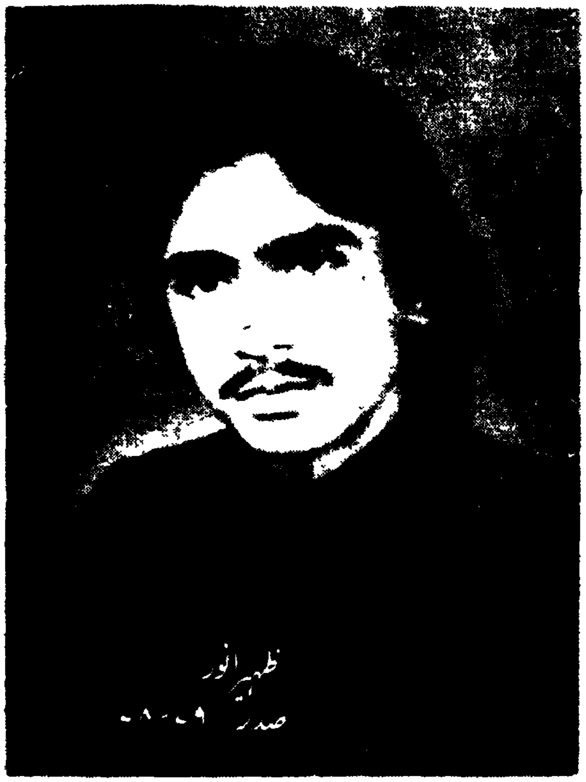


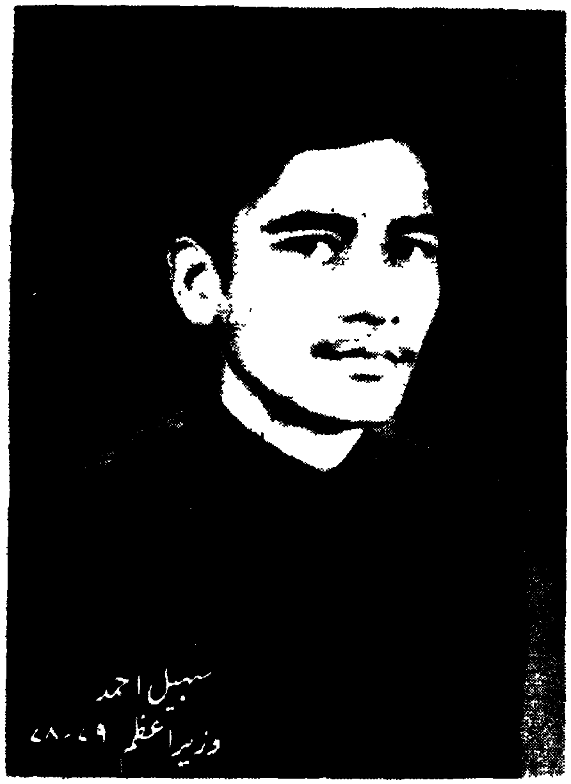


سابق عہدیداران۔ بچوں کی حکومت

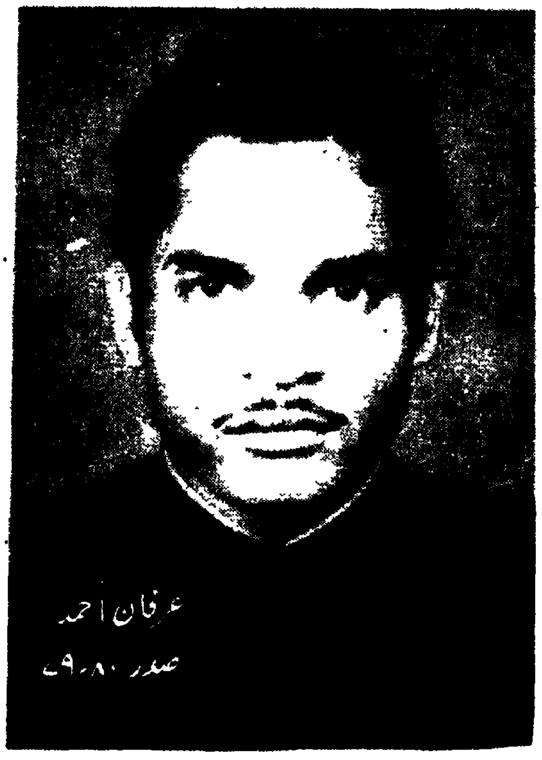




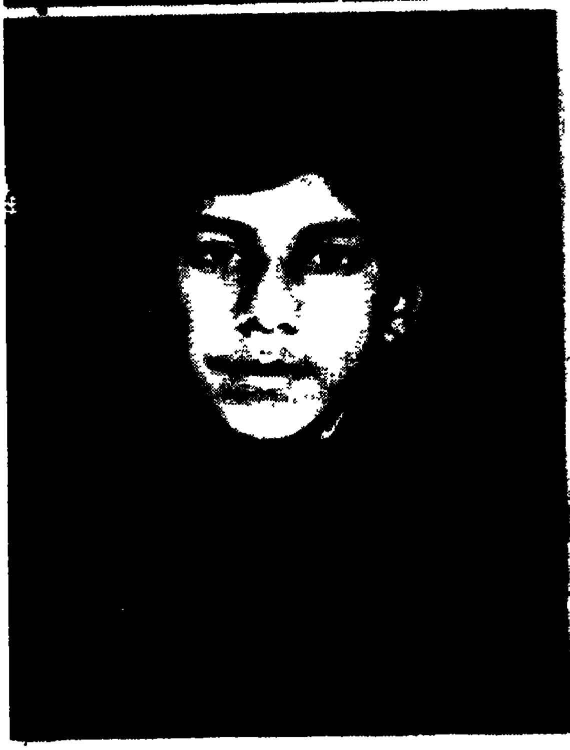

ظہیر انور
صدر ۷۹-۸۰ء


سہیل احمد
وزیراعظم ۷۹-۸۰ء


مظہر جمیل
وزیراعظم ۸۰-۸۱ء


عرفان احمد
صدر ۸۰-۸۱ء












عہدیداران حکومت



اس شمارے کے قلم کار





بورڈ کے پہلے امتحان میں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ





ریاض الدین

تعارف

صدر بچوں کی حکومت

" ارے اجھروا۔ ارے اجھروا!

ارے وہ جرمنی والے کلنوا بنوائے دیے ہوا کی نہیں"

"نہیں ابا جاجی وہ کلنوا کیسے تیار ہوتے رہے ابھی تو تم نے اونوا بھی نہیں منگوائے ہوئے ہو"

" وہ مسنوا کا لڑکوا ابھی آج بیمار ہوئے گوا۔ دو کاریگرا اور نہیں آتے رہے۔ جھبو کا باپ کل پیسے مانگت رہا ہم رے پاس تھے نہیں ہم کا دیتے، وہ آج نہیں آئے رہا"

" اوہو، ارے! اجھروے تو نے تو ہمرا بڑا ہی کردیا ایک تو، تو کارکھانے میں بالکل دیکھ بھال نہیں کرت ہے، اس لیے سارے آڈر کینسل ہوتے جار ہے ہیں۔ کاریگرا الگ پریشان کرت رہے۔ اور ہاں وہ جرمنی سے مرگی کے انڈے لایا تھا کہ یہاں بچے نکالیں گے، تو بھدوئی بھر میں ہمرا اپنا کاروبار ہوگا۔ بنت کسی کے منگوایں یہ ترکیب نہ آئی رہی ہوگی کہ انڈے جرمن مرگیوں کی نسل تیار کرکے باہر کی گورمنٹوں کو سپلائی کرے۔ مگر اجھروا تو نے تو بچے نکلنے سے پہلے ہی انڈوں کا املیٹوا بنائے کھا لیا۔ میرے سارے پروگرام کا بھٹا ہی بٹھا دیا۔

" ایک وہ تیرا بڑ کا بھیا دلی چلا گیا رہا، روج کھت پہ کھت کرت ہے۔ اب ہم تو جوڑی گرارے والی پتلونا سلوائے دو۔ ارے ہم کا کا دلوانی۔ جرا منشی جی سے کہو، اس کو کھت گیر دیں کہ سردی میں نئی اتلونا پتلونا کھریدنے کی جرورت نہیں ہے۔ آج کل کام کم ہوت ہے تو دہلی کے جما مجت سے چار ساڑھے چار روپے کا امریکن کوٹوا کھرید لے اور ڈھائی تین روپے کی کتب روڈ سے بوٹ کھرید لے۔ موجوا ابھی وہیں ملتا رہا ہے۔ انگریجوں کا سوٹر تو وہاں آواز لگا کے دو دو روپے میں ملت رہے۔ اور ایک جوڑا پتلونا، بوک سیٹ تو کے واسطے بھی بھیج دے گا۔

" منشی جی سے کہو بڑکے بھیا کو لکھ دیں، جرا کھرچہ درچہ کمتی کرے۔ اگلے سال میں کچھ کام اچھا ہوا رہا تو تو کو بھی بڑکے بھیا کے ساتھ دلی بھجوا دیں گے۔ ایک پلیٹ میں دونوں کھاتے لیا کرنا، ایک بستر پہ سو جانا۔ کچھ چوڑا ستو تو تیری اماں ساتھ کردیں گی۔ اس سے ناشتہ کرلیا کرنا۔ اسکولوا کی کلسوا الگ ہوگی، تو اس کی پھیس دے دیں گے۔ دلی میں رہنے کے بڑے پھائدے ہیں۔ وہاں جما مجت پہ بڑے سستے کپڑے ملت ہیں۔ آدمی پہن کے صاحب معلوم ہوئے رہے۔ کون جانت کہاں سے کھریدا۔ اگر تو کہہ دے کہ ہمرا ابان جان جرمنی سے لائے رہے تو کسی کو کیا پتا۔

" اچھا کھیر، اجھروا رے تو یہاں تو کارکھانے میں کام کرت نہیں ہے۔ کاریگر تیرے بس میں آت نہیں۔ بس تو اگلے سال بڑکے بھیا کے ساتھ دلی چلا جا"

لیجیے صاحب اگلے سال اجھروا ستو چوڑا اور کپڑے بستر کی گٹھری باندھ کے دلی آ گئے۔

یہاں آکر کچھ دنوں میں اجھروا سے اظہر آصف انصاری کہلانے لگے۔ جامعہ کی ہوا لگی کچھ دلی کی سڑکیں دیکھیں تو سیاست اور لیڈری کے خواب دیکھنے لگے۔

کالینوا کے کارکھانے کی زبان بھول گئے۔ بچوں کی حکومت کی صدارت کے میدان میں کود پڑے۔ قسمت نے ساتھ دیا آج آپ کے سامنے صدارت کی کرسی پر براجمان ہیں۔

منظور الحق

تعارف
چیف جسٹس

یہ ہریانہ کے رہنے والے ہیں، لیکن بچپن سے ہی غفار منزل میں آکر بس گئے ہیں۔ ہمارے اسکول کے پرانے طالب علم ہیں۔ اس مرتبہ آپ کو چیف جسٹس کا عہدہ صدر محترم نے عنایت فرمایا ہے۔ ہیں تو یہ چیف جسٹس، لیکن میری رائے یہ ہے کہ انھیں وزیر شکار بنایا جاتا، کیونکہ ان کی فطرت ایک بلّی جیسی ہے جو چھوٹے موٹے چوہوں اور پرندوں کو مار کر اپنے آپ کو شیر کی خالہ کہلاتی ہے۔ یہی حال ان کا بھی ہے۔ یہ اپنے آپ کو ٹارزن سے کچھ کم نہیں سمجھتے۔ جب یہ اپنے بھانجے کے ساتھ شکار پر نکلتے ہیں تو غفار منزل کے پرندے انھیں دیکھ کر چیخ پکار مچانے لگتے ہیں، مگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ میرے ڈر اور خوف کی وجہ سے چیخ چلّا رہے ہیں۔ لیکن ان کو یہ کیا معلوم کہ وہ انھیں دیکھ کر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں جاؤ میاں، اپنے عہدے کی حفاظت کرو۔ ابھی تمھیں ہم پر نشانہ لگانے کے لیے اور مشق کرنی پڑے گی۔ کیوں روز اس لوہے کی نال کو لے کر اپنا وقت برباد کرتے ہو۔ یہ کہہ کر پرندے انھیں خدا حافظ کہہ دیتے ہیں اور یہ میاں اپنی بندوق کو سنبھالتے ہی رہ جاتے۔ یہ ایسے بہادر شکاری ہیں۔

جب میں کبھی ان کے گھر گیا، تو یہ گھر نہیں ملے۔ بڑے لوگوں سے معلوم ہوا کہ یہ گھر کے پیچھے پہاڑیوں پر شکار کھیلنے کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں پہنچا تو دیکھا اپنے بھانجے کے ساتھ شکار کھیل رہے ہیں۔ میں نے دریافت کیا، کیا مارا ہے۔ تو بڑی اکڑ سے بولے ایک پدی ماری ہے اور ایک فاختہ۔ فاختہ چیل اُٹھا کر لے گئی۔ ایک بندوق ان کے کندھے پر رکھی تھی، دوسری بھانجے کے پاس تھی۔ جب کبھی میں ان کے ساتھ شکار پر گیا اور انھوں نے گولی چلائی اور اگر ان کا نشانہ ٹھیک نہ بیٹھا تو فرماتے کہ میں کیا کروں چڑیا کی قسمت میں کچھ اور دن جینا لکھا ہے۔

یہ کرکٹ بھی اچھا کھیلتے ہیں۔ لیگ بریک دیں گے تو آف بریک ہو جاتی ہے۔ اگر کسی سے کیچ چھوٹ جائے تو اس کی جان کھا جاتے ہیں۔ مگر جب کیچ ان کے پاس آتا ہے تو پیچھے ہٹ کر کہتے ہیں، تیار نہیں تھا۔ بیٹنگ کے وقت اگر کبھی چوکا پڑ گیا تو ایک روپے کی کھیلیں بانٹتے ہیں۔ یہ پڑھائی کے میدان میں بھی پیچھے نہیں ہیں۔ پڑھائی میں شکار سے بھی زیادہ دل لگاتے ہیں، اور نتیجے کے طور پر اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتے ہیں۔ انگلش بولنا بہت پسند کرتے ہیں، خواہ وہ آدھی اردو اور آدھی انگلش ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اپنے درجے کے اچھے طالب علموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ اس سال چیف جسٹس ہیں۔ ہم سب کی دعا ہے کہ یہ ایک اچھے اور کامیاب چیف جسٹس ثابت ہوں۔

زبیر ارشاد

تعارف
وزیر اعظم

لیجیے حاضر ہے ان کی کہانی، میری زبانی۔ بنی ہے جن کے ہاتھوں قسمت، میری نہیں بلکہ شمیروانی والوں کی۔ یہ مہاشے جنھیں ہم سب سے پہلے ان کے گھر والوں

نے تنویر اکرام نام دیا۔ بھولی بھالی شکل، ڈھیلے ڈھالے کپڑے مستوں کی طرح بے خبر، پڑھنے والوں میں سب سے مثل۔ گھومنے پھرنے کے رسیا، کھیلنے میں کھسیانے، فرخ آباد کے رہنے والے، شروع کی تعلیم علی گڑھ سے پانے والے، لیکن بدقسمتی کہیے یا خوش قسمتی، چار پانچ سال پہلے علی گڑھ چھوڑ کر جامعہ آن بسے۔ ان کی کہانی جامعہ سے ملتی جلتی ہے۔ جامعہ بھی علی گڑھ میں قائم ہوئی، اس کے بعد دلی منتقل ہوئی۔ خیر انھیں سیاست والوں کی طرح لائن بدلنے کا بچپن سے شوق رہا ہے۔ کودنا پھاندنا، بیچ میں درجے چھوڑنا ان کی عادت رہی ہے۔ لیکن اس چھوڑ چھاڑ میں اپنی تعلیم کی طرف، اپنی پوزیشن کی طرف توجہ کبھی نہیں چھوڑی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ، چاہے میڈیم کی تبدیلی کا حملہ ہو یا کسی کلاس کو پھاندنے کا، لیکن اوّل آنے کی جو رفتار انھوں نے شروع میں قائم کر لی تھی، وہ ابھی تک قائم ہے۔ اور دعوت نہ کرنے کا ریکارڈ انھوں نے شروع شروع میں قائم کر لیا تھا، وہ بھی ابھی تک برقرار ہے۔ جس کی انھیں بے حد خوشی ہے اور ان کے بڑے بھائی کو بہت افسوس رہتا ہے۔ انھوں نے کام سے جی چرانا نہیں سیکھا۔ باتیں بنا بنا کر کام کرنا سیکھا ہے۔ مسکرا کر اپنا کام نکالنے کو اپنایا ہے۔ کہتے ہیں کہ انھیں چوہے مارنے کا بہت شوق ہے۔ ہر دن اپنے گھر سے کوئی چوہا پکڑ کر یا اپنے گھر میں نہ ہو تو محلے پڑوس کے چوہے والوں کو اکٹھا کر کے یہ چوہا مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن چوہیا ان کے پنجے سے چھٹکارا پا جاتی ہے۔ اس طرح نورو شکر کی پہاڑیوں میں دوڑتے پھاندتے ہوئے روزانہ ان کی اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تندرستی ان کی ماشاء اللہ رنگت سبحان اللہ اور مسکراہٹ الحمد للہ۔ یعنی ہر وقت ہنسی خوشی اپنے ساتھیوں اور دوستوں میں مل جل کر رہتے ہیں۔ یہ جتنی توجہ تعلیم پر دیتے ہیں، کھیل میں بھی اتنی ہی دلچسپی لیتے ہیں لیکن چھوٹی کلاس کے بچوں سے کھیلنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو ہنسا ہنسا کر کھلاتے ہیں اور خود بیٹنگ کرتے ہیں اور جب کھیل ختم ہوتا ہے تو اپنی فطری مسکراہٹ کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے انھیں ان کے گھر روانہ کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسکول کے کھیلوں میں یہ ہمیشہ پیچھے سے اوّل آتے رہے ہیں۔ خیر کچھ بھی ہو، اپنی غیر معمولی محنت اور شرافت کی وجہ سے آج بچوں کی حکومت کے وزیر اعظم بن گئے۔ خدا کرے کہ یہ کامیاب وزیر اعظم ثابت ہوں۔

بہجت سلطان

تعارف

وزیر داخلہ

معلوم نہیں آپ نے کبھی سنبھل شریف کا نام سنا ہے یا نہیں۔ اگر نہ سنا ہو تو سن لیجیے۔ وہاں کے ۳۶ پورے اور ۵۲ سرائے مشہور ہیں۔ یعنی ہر محلہ کا نام یا تو پورہ پر ہوگا یا سرائے پر۔ جیسے پٹھان پورہ۔ دیپا سرائے۔ دوسری ایک بات یہ بھی مشہور ہے کہ "سنبھل کے مکان لوٹے، آدمی جھوٹے، بیر کھٹے"، پتا نہیں، اب بھی یہ سب باتیں وہاں پائی جاتی ہیں۔ یا نہیں۔ خیر یہی سنبھل، جو ایک شہر ہے یو پی میں انتخاب، نصرت بھی رہنے والے ہیں اسی ابھرنے دیار کے۔ ان کی عادت میں تھرکنا، اچھلنا، کودنا، آنکھیں مٹکانا ایسا ضروری ہو گیا ہے کہ معلوم نہیں رات میں چار پائی پر بھی کیسے رکتے ہیں۔ آپ کو انگلش بولنے کا بھی شوق ہے مگر اس کا انداز امریکی دیہاتیوں والا ہوتا ہے، جس کا سمجھنا ہم ہندستانیوں کے لیے بہت مشکل ہے شاید سنبھل میں ان کے پڑوسی سمجھ لیتے ہوں۔ کبھی کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ یہ انگریزی بول رہے ہوں اور قریب

سے کوئی گائے، بھینس گزر رہی ہو تو رک کر ان کی طرف غور سے دیکھنے لگتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنے کسی بوائے فرینڈ کی باتوں پر دھیان دے رہی ہو اور قریب آکر ان کے کان میں کہنا چاہتی ہو "کیا دودھ پی گئے؟"

کبھی کبھی یہ گھر سے آتے ہیں تو سوجی کا حلوہ بھی بنوا کر لاتے ہیں مگر وہ اسی طرح لایا اور رکھا جاتا ہے جیسے افیم یا ہیروئن۔ اگر اتفاق سے کسی ساتھی کی نظر پڑ جائے تو کہتے ہیں "ارے یار ذرا سا لایا تھا۔ گاڑی میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی، حلوہ کہاں رکھتا۔ اتنی بھیڑ تھی کہ میرا ہی حلوہ بنا جا رہا تھا۔ وہ تو کہو قسمت میں تم لوگوں سے ملاقات کرنی تھی تو یہاں تک پہنچ گیا۔ اب کے آؤں گا تو تم سب کے لیے دھڑی بھر حلوہ بنوا کر لاؤں گا۔"

ہاں ایک خصوصیت آپ کی یہ ہے کہ موصوف کو ہنسنے اور رونے، دونوں کا شوق ہے۔ ذرا ان کی مرضی کی بات ہو گئی تو ہنس لیے اور اگر ان کی مرضی کے خلاف ہو گئی تو رو دیے۔ روتے ہیں تو ایسی سسکیوں سے کہ لڑکیاں بھی تالی بجانے پر مجبور ہو جائیں۔

مسیح الزماں

تعارف وزیر مالیات

— عجیب و غریب سماجی جانور نجیب سلطان شیروانی کا تعارف کرانا بچوں کا کھیل نہیں۔

ان کے تعارف میں مشکل یہ آن پڑی کہ بسم اللہ کہاں سے کریں۔

تو چلیے ہم ان کے گاؤں سے بسم اللہ کرتے ہیں۔ تو جناب یہ ہمارا جانور کا بچاری ایک عام گاؤں کا رہنے والا ہے جس کا نام ہے کنادہ اور ضلع ہے ایٹہ۔ تیرہ برس پہلے یہ اس گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد ان کے گھر میں کوئی پیدا نہیں ہوا، اس لیے یہ اکلوتا ہوا۔ اچھا صاحب خاندان کو چھوڑیے۔ اس سے ہمیں کیا دلچسپی۔ یہ اگر مالدار ہیں تو ہمیں کیا۔ اب سے آٹھ سال پہلے انھیں ہمارے مدرسے میں لاکر ڈال دیا گیا۔ انھوں نے آتے ہی اپنی خاندانی خصوصیات کا سکہ جمانا شروع کر دیا، اور جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے، ویسے ویسے ان کی عادتیں، جنھیں یہ اپنے گھر سے دو مہینے کی چھٹیوں میں لے کر آئے تھے، تعلیم کی جگہ رنگ چوکھا دکھانے لگیں اور یہ چوتھی کلاس میں کیا آئے کہ مرغیوں، بلیوں، کبوتروں، بطخوں، کتوں، خرگوشوں، بکریوں، مور، گائے اور بھینس کی خوبیاں ان کی زبان کا چکر کاٹنے لگیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں کلاس میں آکر تعلیم کی جگہ مرغی خانے کی ریسرچ ہونے لگی۔ بٹیر بازی اور کبوتر بازی ان کی عادت ہو گئی۔ اور جب امتحان کے نتیجہ کارڈ میں مرغیوں کے انڈے ان کے گھر جانے لگے تو ان کی والدہ کو بڑی فکر ہوئی۔ سوچا کیا تھا نکلا کیا۔ اب بچے کی اصلاح کے بارے میں صلاح مشورے ہونے لگے۔ ان کی والدہ کنادے سے چل کر دلی آئیں اور یہاں کے ذمے داروں سے ملاقات کی۔ کہا کہ اس کے سدھار کا کوئی جتن کیا جائے، نہیں تو میرا بچہ برباد ہو جائے گا۔ مرغی خانے سے انھیں دل چسپی تھی، لہٰذا ان کے سدھار کے طریقے سوچے گئے اور اس دل چسپی کو دوسری طرف ڈال دیا گیا۔ ان کی اصلاح کی کہانی کو نیم کی ایک مثال دے کر سمجھاتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ایک صاحب گاؤں سے شہر آگئے۔ نوکری کی تلاش کی، لیکن انھیں نوکری نہیں ملی۔ کافی مدت گزرنے کے بعد ان کے پاس پیسے ختم ہونے لگے۔ فکر ہوئی کہ اب گزارا کس طرح ہوگا۔ ان کے پاس ۱۰۰ روپے بچے تھے۔ سوچا کہ ان سے کوئی دھندا چلاؤں۔ لہٰذا لال قلعے کے باہر لال چقندر، ٹماٹر اور لال مرچ رکھ کر بیچنے لگا۔ خیال تھا کہ ان سے جو چار پیسے کماؤں گا، گزر ہو جائے گی۔ ان ہی دنوں دلی میں کمیونسٹوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی، لہٰذا

انھیں ایک پولس افسر پکڑ کر لے گیا۔ الزام یہ لگا کہ یہ صرف لال سبزیاں فروخت کرتا ہے، جن سے حکومت کے خلاف سازش کی بو آتی ہے۔ سبزی والا بڑا پریشان۔ عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔

مجسٹریٹ پورا واقعہ سن کر مسکرایا۔ کہنے لگا، ہر لال چیز کمیونزم نہیں۔ اور اسے بری کر دیا۔ جس طرح ہر لال چیز کمیونزم نہیں ہوتی، اسی طرح ہر بچہ اپنے اندر کوئی نہ کوئی دل چسپی اور خوبی رکھتا ہے۔ اگر اسے صحیح راستے پر ڈال دیا جائے تو وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اسی دل چسپی کو دیکھتے ہوئے وزیر اعظم اور صدر نے نجیب کو بچوں کی حکومت کا وزیر مالیات بنا دیا۔ چونکہ یہ مرغی خانے کے انڈوں کا حساب کتاب بہت ٹھیک ٹھاک رکھتے تھے اور انھیں خوب استعمال کرتے تھے۔ لیکن بینک میں ان کی یہ ہیرا پھیری نہیں چلے گی۔ وہاں تو ایک رقم دس دس جگہ لکھی جاتی ہے۔ خیر ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے وزیر اعظم نے انھیں وزیر مالیات بنا کر انھیں اچھے راستے پر ڈال دیا ہے۔ خدا کرے کہ یہ کامیاب وزیر مالیات ثابت ہوں۔

شکریہ

ارشاد عالم انصاری
درجہ پنجم

تعارف وزیر خوراک

دلی ایسا شہر ہے جہاں پر ہر چیز مل سکتی ہے۔ آبِ حیات مل سکتا ہے، مسجد اور مندر مل سکتے ہیں، نیک اور شیطان مل سکتے ہیں، جھگڑے اور فساد، دوستی اور دشمنی، اپنے دیش کے لوگوں کے علاوہ دوسرے دیش کے اور لوگ ہی نہیں، وہاں کی بنی چیزیں بھی بہت آسانی سے آپ لے سکتے ہیں۔ لیکن ایسا ڈے جہاں دلی جیسے شہر کو بہت سی نعمتیں دیں، وہاں ہوٹلوں کی زیادتی نے ایک چیز کی کمی کر دی۔ آپ پوچھیں گے وہ کیا ہے۔ تو میں کہوں گا بیروں کی، نہیں، معاف کیجیے خان ساماؤں کی، پکانے والوں کی، مینو بنانے والوں کی۔ بچوں کی حکومت کے وزیر اعظم کو بڑی فکر ہوئی، اور ان کا فکر مند ہونا صحیح بھی تھا، کیوں کہ سب دلی والے فکر مند تھے، کہ انڈے نہیں ملیں گے۔ ڈبل روٹی نہیں ملے گی، مکھن نہیں ملے گا اور اگر ملے گا تو بہت اونچے داموں کے ساتھ ملے گا۔ انہیں یہ فکر تھی کہ اپنے مطبخ کے لیے مینو بنانے والا، مینو بنانے والا نہیں۔ سالن اچھا پکانے والا کیسے ملے گا۔ لیکن خدا رکھے وزیر اعظم کو، بڑے دور کی کوڑی لائے۔ اپنی نظریں گھمائیں، ہندستان کے نقشے پر نظر ڈالی اور ان کی نظر الہ آباد پر پڑ گئی۔ الہ آباد آپ جانتے ہی ہیں، مشہور ہے اپنے سنگم کی وجہ سے۔ الہ آبادی پیڑوں کی وجہ سے۔ نہیں، نہیں، امرود کی وجہ سے۔ دیکھا کہ مدرسے میں وہاں کے کوئی صاحب پڑھتے ہیں۔ ساتھیوں نے بتایا کہ اس کام کے لیے یہ بہت موزوں رہیں گے چوں کہ ان میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھی ماما میں۔ نہیں، نہیں، بڑی بی میں ہوتی ہیں۔ یہ کھانے کے معاملے میں اگر مفت میں مل جائے تو برا نہیں سمجھتے۔ ہماری بڑی بی کا کہنا یہ ہے کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے ہم نے کھانے پکانے کا کام سیکھا ہے۔ ہم تمھارے لیے مرغ مسلّم پکا سکتے ہیں، دال پکا سکتے ہیں۔ جو تم کہو، پکا سکتے ہیں۔ لیکن محنت ہماری، پیسا تمھارا۔ ایک دوسری وجہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہم اپنا پیسا خرچ کر کے کیوں کھائیں، جب اس سے خون ہی نہیں بنتا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تندرستی خراب ہے تو پیسا کھانے پر کیوں خرچ کریں۔ اس لیے ان میں کفایت شعاری حد درجہ پیدا ہو گئی ہے۔ دوستو! ایک بڑی بی جس طرح اپنے پوتے، پوتیوں، نواسے، نواسیوں کا خیال رکھتی ہیں، اسی طرح یہ بھی مطبخ کے تمام سامان اور کھانے کی چیزوں کا خیال رکھتے ہیں۔ خیال ہی نہیں، بلکہ ان کی حفاظت کو بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ دیکھا آپ نے کتنی خوبیوں والا وزیر خوراک اس مہنگائی کے زمانے میں بڑی تلاش کے بعد ڈھونڈ نکالا ہے۔ ان کی ایک خوبی کا ذکر کرنا تو بھول ہی گیا کہ یہ اپنے ہر کام الٹی طرف سے شروع کرتے

ہیں۔ یعنی بائیں ہاتھ سے لکھتے ہیں، لیکن کھاتے دائیں ہاتھ سے ہیں۔ کام ان کے ہاتھ میں آیا اور یہ اس کام کو دشمن کی طرح دبوچ لیتے ہیں۔ جو اپنا وار بھرپور کرتا ہے اور اس کا اندازہ پھر ان ہی کے ساتھی کر سکتے ہیں۔ گاتے ہیں تو اپنی ناک کے بائیں طرف سے گانے کی سر نکالتے ہیں۔ اور کیا گاتے ہیں، کس طرح گاتے ہیں، کتنی دھنوں میں گاتے ہیں، اس کا اندازہ تو آپا جان ہی کو ہوگا۔ البتہ کپڑوں کی سلائی دھلائی سب بہت اچھی طرح کرتے ہیں۔ ہمارے مدرسے میں چھوٹے چھوٹے ساتھی بھی ہیں۔ انھیں ان سب چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے، اس لیے ہمیں وزیر اعظم کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے اچھا وزیر خوراک توقیر عالم بنایا۔

اسجد مجید

تعارف وزیر صحت وصفائی

اسے صوبہ بہار کی خوش قسمتی کہیے یا آسام کی خیر سے میاں معین الدین وزیر بن گئے۔ مگر واہ رے! وزارت آئی بھی تو کیا، وزارت صحت وصفائی ذرا ملاحظہ فرمائیں۔ آپ کا بدن اور صحت کی وزارت۔

شاید اسی لیے اس سال جب سردی میں آپ اپنے وطن گئے تو والد صاحب کے کسی پرانے دوست نے صاحبزادے سے ملاقات کے بعد بڑے قیمتی مشورے دیے۔ کہنے لگے، بیٹا معین! تم دہلی میں پڑھتے ہو۔ جہاں ہمدم دواخانہ، ہندستانی دواخانہ، ہمدرد دواخانہ اور نہ جانے کتنے دواخانے ہیں۔ ان میں روزانہ کوئنٹلوں خمیرے، جوارشیں، شربت، ماشاءاللہ کے ڈرم تیار ہوتے ہیں اور ساری دنیا کو بھیجے جاتے ہیں۔ ان سب کے ہوتے ہوئے تمھاری صحت کا یہ حال! اگر روزانہ تم دواخانوں کی گلیوں سے ہی ایک بار گزر جایا کرتے تو آج پہچانے نہ جاتے مگر ہائے تم نے کچھ نہیں کیا۔ ارے کم از کم اردو بازار کی مچھلی، مرغی مارکیٹ میں شام کو جا کر گھنٹہ دو گھنٹہ ٹہل لیا کرتے، تو مرغوں کی طرح پھڑ پھڑاتے، مچھلیوں کی طرح اچھلتے کودتے، اٹھکیلیاں کرتے پھرتے۔ اب جو تم مرا ہوا جھینگا معلوم ہو رہے ہو، یہ نہ ہوتا تو تم نے باپ کی ساری کمائی پر پانی پھیر دیا اچھا خیر، اب دہلی جاؤ تو ہمدرد دواخانہ سے ایک آدھ کلو دماغین خرید لانا۔ کبھی کبھی گاؤزبان کا خمیرہ کھا لیا کرنا۔ صبح کے ناشتے میں مرغی کا انڈا اور دوپہر کے کھانے میں انڈے کی مرغی کبھی نہ چھوڑنا۔

بھائی معین نے یہ سارے مشورے غور سے سنے اور یہاں آکر دوستوں سے پتا پوچھا۔ بھائی، یہ دوائیں کہاں ملیں گی۔ گاؤزبان کے بجائے انھیں گائے زبان یاد رہ گیا تو کسی سمجھدار آدمی نے کہا: ارے معین! یہ دماغین تو خیر دماغ میں آرہی ہے۔ مل جائے گی مگر خمیرہ گائے زبان یہاں کہاں ملے گی۔ یہاں تو خمیرہ بھینس زبان، بکری زبان آسانی سے مل سکتا ہے۔ چلے جیں "بوفیلو میٹ شاپ" سے خرید لو۔ اور اگر میرا مشورہ ہو تو ان دواؤں کے چکر میں پڑنا بیکار ہے۔ یہ تو پرانے مریضوں کے علاج کے لیے ہوتی ہیں۔ تم تو خوب دبا کر گاجر کا حلوہ کھاؤ۔ سیب سنترے کی چٹنی بناؤ۔ صبح سویرے دریا کے کنارے ٹہلنے جاؤ۔ پھر دیکھو کیا صحت میں نکھار آئے گا۔ سنترے کا رنگ بھی شرمائے گا۔

اور اگر پھر بھی کسر باقی رہ جائے تو شہر سے جا کر دو دوائیں خرید لانا۔ ایک تو خمیرہ قلم توڑ اور دوسری معجون 'لوٹ پلٹ'، بس ان کے کھاتے ہی بدن میں اتنی طاقت آجائے گی کہ قلم، کتاب، کاغذ تم سے پناہ مانگنے لگیں گے۔ کمزوری لوٹ جائے گی، صحت پلٹ آئے

گی۔ جاپان کا جمناسٹک ہاجمی سیکو ناکی تمہارا شاگرد بن جائے گا۔ چین کا باڈی بلڈر چوں، چاں، چی تمہارے آگے پانی بھرے گا۔ پھر آپ بخوبی وزیر صحت کے فرائض انجام دے سکیں گے۔

شکریہ

فاطمہ امیر متعلمہ درجہ ہشتم

تعارف

وزیر آرائش

بتائیے یہ سانولی رنگت گھنگریالے بال، دو چوٹیاں اور تھوڑی سی چپٹی چپٹی۔ یہ کون ہیں؟ جی ہاں، یہ ہیں سیمی مشیر۔ ہماری پیاری سی بچوں کی حکومت کی وزیر آرائش۔ رہنے والی تو فیض آباد کی ہیں، لیکن جامعہ میں غفار منزل میں رہتی ہیں۔ پہلی کلاس سے ہی مڈل اسکول میں پڑھ رہی ہیں۔ اور اللہ کے شکر سے بنا ڈبکی لگائے آٹھویں تک آگئی ہیں۔ پڑھائی سے اچھی دلچسپی رکھتی ہیں۔ اسکول آنے کی بہت زیادہ شوقین ہیں۔ چاہے اسکول دیر سے ہی کیوں نہ پہنچیں، لیکن چھٹی کبھی نہیں کرتی ہیں اور اگر خدا نخواستہ کبھی طبیعت خراب ہوا اور اردو یا سائنس کے گھنٹے کا خیال آجائے، تو بس سمجھ لیجیے، قیامت ہی تو برپا کر دیتی ہیں، کیوں کہ ان دونوں مضامین سے انھیں ایک خاص طرح کا لگاؤ ہے۔ سائنس میں طرح طرح کے تجربے کرکے ان کا خون ضرور بڑھتا ہے چاہے تجربہ غلط سلط ہی کیوں نہ کرتی ہوں۔

پڑھائی کے علاوہ خالی وقت میں بھی ان کے بہت سے مشاغل رہتے تھے۔ جہاں ذرا سا بھی وقت ملا چٹر چٹر باتیں کرنا شروع کر دیں۔ جب بولنا شروع کریں گی تو رکنے کا نام نہیں لیں گی، اور اگر کوئی دوسرا بولنا چاہے تو خود اس سے زیادہ بلند آواز میں بولنا شروع کر دیتی ہیں۔ اس طرح آواز کے رعب میں آکر دوسرا چپ ہی رہتا ہے۔ اسی طرح خالی وقت میں اچھی خاصی لڑائی بھی کر لیتی ہیں۔ غصے میں منہ لال پیلا کر لیتی ہیں۔ ہونٹ تھوڑے سکڑ جاتے ہیں اور منہ میں تھوڑی سی ہوا بھر لیتی ہیں۔ پیشانی پر ان گنت بل ڈال کر، آستین اوپر چڑھا لیتی ہیں اور اگر خدا نخواستہ غلطی سے ان کے ہاتھ میں معمولی سی خراش آجائے تو شام تک درد محسوس کرتی رہتی ہیں۔

اب آپ ہی سوچیے، اگر اس عالم میں ہاتھ گھما کر ایک لگا دیں تو کیا ہوگا۔ (اب تو میری بھی خیریت نہیں ہے)

سنا ہے جب سے وزیر آرائش بنی ہیں، پیر زمین پر نہ پڑ کر آسمان پر جا رہے ہیں۔ شاید اپنے عہدے کا غرور ہے۔ نہیں بھئی انھیں غلط نہ سمجھیے گا۔ یہ غلط فہمی اپنے دل سے نکال دیجیے۔ یہ تو بہت سادہ اور کچھ شرمیلی طبیعت کی انسان ہیں۔ چاہے گھر ہو یا باہر، یہ اپنے بڑوں کی عزت کرتی ہیں اور اپنے ہم عمر اور چھوٹوں سے دوستانہ تعلقات رکھتی ہیں۔ صفائی پسند ہیں اور اسی لیے اپنی کلاس کو صاف ستھرا رکھنے کی ان کی پوری کوشش رہتی ہے۔

اپنی بات کی پکی ہیں۔ وعدہ خلافی ہرگز نہیں کرتی ہیں۔ اب آپ دیکھیے گا کہ انھوں نے ہمیں دعوت دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وزیر آرائش بننے کا خواب ان کا پورا ہوگیا، لیکن ان کا وعدہ اب تک پورا نہیں ہوا ہے۔ آرائش میں تو کہیں زیادہ وقت نہیں دے رہیں!

محمد وحید متعلم درجہ ہشتم

تعارف

وزیر کھیل

خواتین و حضرات !

میں اب ایک ایسے مہاشے کا تعارف کرانے کی زحمت کر رہا ہوں جنھیں اپنے تعارف سے دلچسپی ہے، نہ دوسروں کے تعارف سے۔ انھیں دلچسپی اگر ہے تو اپنے گانو سے۔ وہ گانو جو دہلی گڑھ روڈ پر واقع ہے۔ اس گانو کی زبان سے، اس کی بو باس سے، اس کے گوبر کے ابخرات سے۔ پچھلے دنوں ان کے والد صاحب کو جب بتایا گیا کہ بچوں کی حکومت کے وزیروں کے لیے شیروانی کا ہونا ضروری ہے، اور سراج بھی وزیر کھیل بنے ہیں، تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو چاہتے ہی ہیں کہ شیروانی پہنے، لیکن انھوں نے شیروانی بنوانے سے اس لیے انکار کر دیا کہ دہلی سے گانو جاتے ہوئے اور گانو کے اندر دھول بہت اڑتی ہے اور کالی شیروانی دھول بہت کھینچتی ہے اس لیے ابا جان کیوں پیسے خرچ کیے جائیں اور ہر تیسرے دن اس کی دھلائی پر بے جا خرچ ہو۔ ہم نے ان سے کہا تو کوٹ ہی سلوا لیتے۔ کہنے لگے، تم تو میرے گانو کا تعلق ختم کرا دینا چاہتے ہو۔ اگر میں کوٹ پہنوں گا تو میرے گانو والے کیا کہیں گے۔ اس لیے یہ چادر اوڑھنا پسند کرتے ہیں اور جب بھی دیکھیے برقع پوش عورتوں کی طرح چادر اوڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ انھیں ہمارے اسکول میں پڑھتے ہوئے چار سال ہو گئے۔ اب تک انھوں نے اپنے ساتھیوں کو یا ان کے ساتھیوں نے انھیں دوستی کے قابل نہیں سمجھا۔ خدا خدا کرکے اس سال نویں کلاس میں ان کے گانو کا ایک اور لڑکا آگیا۔ اب سراج صاحب ہر وقت، میرا مطلب ہے خالی وقت میں، ان کے ساتھ گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وزیر اعظم نے انھیں وزیر کھیل کیوں بنا دیا۔ کیا یہ بہت اچھے کھلاڑی ہیں؟ جب کہ ان سے بھی اچھے کھیلنے والے ساتھی موجود ہیں۔ ہاں ایک بات ضرور سننے کو ملی ہے کہ جب ساتھی ان کے پاس کھیل کا سامان لینے جاتے ہیں تو یہ سامان دینے سے پہلے چائے اور گلاب جامن کا ذکر ضرور کرتے ہیں اور چھوٹے ساتھی اس سے فائدہ اٹھا کر ان سے کہتے ہیں کہ سراج آج تم کھیل کے بعد چائے ہمارے ساتھ پی لیتے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ گلاب جامن کا حصہ وزیر اعظم کو بھی پہنچتا ہو! ہم نے اپنے ذہن پر زور دیا کہ آخر ایسی کون سی وجہ ہے جس کی وجہ سے انھیں وزیر کھیل بنا دیا۔ سوچتے سوچتے کئی دن گزر گئے۔ آخر ایک دن ہمارے ایک ساتھی نے کہا کہ میں وجہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر چیز کی نقل ہوتی ہے۔ آپ نے ٹیلی ویژن پر ہندستان اور پاکستان کا کرکٹ میچ دیکھا ہوگا۔ اس میں ایک جادوئی گیند باز عبدالقادر کو دیکھا ہوگا۔ ان کے گیند پھینکنے کا طور طریقہ بھی دیکھا ہوگا۔ وہ کیسے گیند پھینکتے ہیں۔ ہمارے وزیر کھیل بولنگ تو اس طرح نہیں کرتے، لیکن جب یہ اپنے بڑے سے بات کرتے ہیں تو آپ ان کو دیکھیے، ان کے چہرے کو دیکھیے۔ ان کے بھوں کے گوشوں کو دیکھیے، ان کے بولنے کے انداز کو دیکھیے، دور سے آپ سمجھ جائیں گے کہ یہ ایکٹنگ کر رہے ہیں پاکستان کے گیند باز عبدالقادر کی۔ بولنگ پھینکنے میں نہیں، صرف اپنے ہونٹوں سے، اپنی آنکھوں سے، اپنے ہلنے جلنے سے، اپنے پاجامے سے، اپنے ہاتھوں سے۔ خیر صاحب، جو وجہ بھی رہی ہو، وزیر کھیل بن گئے۔ لیکن چچا گلاب جامن کی طرح، جو گلاب جامن بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن کھاتے خوب تھے، انھیں کھیلوں سے دلچسپی ہو نہ ہو، یہاں کے ماحول سے دلچسپی ہو نہ ہو، یہاں کے ساتھیوں کو اپنا ساتھی سمجھیں یا نہ سمجھیں، شیروانی یا کوٹ کے لباس کو اپنائیں یا نہ اپنائیں، لیکن وزیر کھیل بننے کا سب سے زیادہ فائدہ انھیں ہی ہوا ہے۔ میری بات کا یقین نہ ہو تو ایک نظر ڈال لیجیے ان کے

چہرے پر، ان کے موٹے تازے جسم پر، واہ رے مطبخ کی دال، تونے کیسے ان کو اچھا خاصا صحت مند بنا دیا۔ اور اسی کے نتیجے میں سراج الدین صاحب کی ماشاءاللہ تحریر تو پہلے ہی سے اچھی تھی، اس سال پچھلے چند مہینوں میں تندرستی بھی اچھی ہو گئی۔ اسے کہتے ہیں اپنا اپنا مقدر۔ خدا کرے کہ یہ کامیاب وزیر کھیل ثابت ہوں۔

ممتاز زہرہ

تعارف

وزیر تعلیم

ماتھے پر شکن، آنکھوں میں تجسس، اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ۔ غصہ بھی کرتی ہیں تو مسکرا کے، لڑتی بھی ہیں تو مسکرا کے۔ ان سے بات کیجیے تو ہونٹ کھلتے ہیں۔ پہلے مسکراہٹ برآمد ہوتی ہے اور اس کے بعد منہ سے بات نکلتی ہے۔

مسکراہٹ سے تو ان کا ابدی رشتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوتے میں بھی اکثر معصوم بچوں کی طرح مسکراتی ہیں۔ مسکراہٹ دیانت اور صفائی پسندی، ان تمام صفات کو جب ملایا گیا تو مشیر زہرہ کی شکل سامنے آئی۔ صفائی پسند بے حد ہیں۔ ہاں ایک بات اور، جس قدر صفائی پسند ہیں، اسی قدر وہمی بھی۔ برتن دھو کر دوربین سے دیکھتی ہیں۔ گھر کا آنگن دھوتی ہیں تو دسمبر جنوری میں اس کو پنکھا چلا کر سکھاتی ہیں۔

کمروں کی صفائی کرتی ہیں تو کھڑکیوں کے پردے کھول کر دروازے بند کر دیتی ہیں۔ اور تمام لوگوں کو کمرے کے اندر جانے کی سخت ممانعت ہوتی ہے۔ خدا کے فضل سے مہمان نواز بھی بے حد ہیں۔ آپ ان کے گھر جائیے تو کہیں گی، کھانا تو آپ کھا کر آئے ہوں گے۔ چائے کی زیادتی نقصان دہ ہوتی ہے۔ بہرحال ایک گلاس پانی تو پی ہی لیجیے۔

انگلش پڑھنے اور بولنے کی بے حد شوقین ہیں ان کی بولی بھی انگلش بھی اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔ ایک بار کہہ رہی تھیں۔

سوشل اسٹڈیز سے بھی خاص لگاؤ ہے اور کافی معلومات رکھتی ہیں ایک بار فرما رہی تھیں: واسکوڈی گاما کا جہاز سب سے پہلے اوکھلا ہیڈ پر آکر رکا تھا۔ مرزا اسداللہ غالب آخری مغل شہنشاہ تھے۔ ہوم سائنس کا کام بھی بہت شوق سے کرتی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ دستانے کو موزا اور موزے کو دستانہ کہتی ہیں۔ ٹوکنے پر جواب ملتا ہے، تھوڑا سا ہی تو فرق ہے۔ ایک مرتبہ سوئٹر بننا شروع کیا، مگر افسوس جب پورا ہوا تو پتا نہیں کس وقت وہ سوئٹر سے مفلر بن چکا تھا۔ بیڈمنٹن اور باسکٹ بال کی بے حد شوقین ہیں، یہ الگ بات ہے کہ باسکٹ بال کھیلتے ہوئے ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ بال باسکٹ میں جانے کے بجائے کسی ساتھی کی کھوپڑی پر جائے تو اچھا ہے۔ اور اگر وہ اتفاق سے دیکھ لے تو فوراً اپنی سہیلی سے کہتی ہیں، اللہ! دیکھو اس کے لگ گئی نا۔ یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔

میٹھی چیز بہت شوق سے کھاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خواب میں بھی رس گلے دکھائی دیتے ہیں۔ بھوک بہت زیادہ لگتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کاپی کا کور بجائے کاپی کے آپ کے منہ میں نظر آتا ہے۔

اور اب ۔ ۔ ۔ اب تو خیر سے ہماری وزیر تعلیم ہو گئی ہیں۔ ان کا وعدہ ہے کہ اب کتابوں کی جگہ لائبریری میں ہم لوگوں کے لیے گڑ کے بتاشے رکھے جائیں گے۔ ربڑ کی جگہ چیونگم استعمال ہوں گے۔ باقاعدہ ایک زو بنوایا جائے گا تاکہ جب ہم پڑھتے پڑھتے تھک جائیں تو اپنے اپنے پنجروں میں جا کر آرام کر سکیں۔

خدا آپ کو ان نیک ارادوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہماری نیک خواہشیں آپ کے ساتھ ہیں۔

عالیہ خاتون

تعارف
وزیر اطلاعات ونشریات

محکمۂ اطلاعات سے تازہ ترین اطلاع ملی ہے کہ وزیر اطلاعات ونشریات مسٹر ایچ کے ایل بھگت نے اب سوانگ رچانا بھی شروع کر دیا ہے اور اس وقت وہ ایک کافوری گڑیا بنے بچوں کی حکومت کے شوکیس میں سجے بیٹھے ہیں۔ ارے ارے! ان کے تو تیور بدلنے لگے۔ اوہ معاف کیجیے گا۔ یہ تو ہماری بچوں کی چھوٹی سی حکومت کی چھوٹی سی وزیر اطلاعات ونشریات ہیں، جو غالباً ابھی بھی بیوٹی سیلون سے چلی آ رہی ہیں۔

میرے خیال میں میرا کام اس وقت سب سے مشکل ہے۔ ایک ایسے محکمے کے وزیر کا تعارف کرانا جن کا ستارہ ہمارے ملک میں آج کل گردش میں چل رہا ہے۔ دیکھیے ناوسنت ساٹھے صاحب وزیر اطلاعات بن کر ملک و T.V پر چھا گئے پچھلے کے وہاں سے ہٹائے جانے کے بعد سالوے صاحب کا نام سنائی دینے لگا۔ مگر سالوے صاحب بھی جس شان سے تشریف لائے تھے، اسی شان سے اپنی ذمہ داری مسٹر ایچ کے ایل بھگت پر ڈال کر رخصت ہو گئے۔ مگر شمامہ بہن آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آج ہمارے ملک پر جس خاتون کی عمل داری چل رہی ہے، اس نے بھی دنیائے سیاست میں پہلا قدم وزیر اطلاعات ونشریات کی حیثیت سے ہی رکھا تھا اور اب کروڑوں کی قسمت ان کے اشارے سے بدل سکتی ہے۔

دیکھا آپ نے، یہ معصوم سی آنکھوں والی، سینک سلائی سی لڑکی ہمارے بچوں کی چھوٹی سی حکومت کے صدر، وزیر اعظم اور دوسرے وزیروں کے لیے کتنا بڑا خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔

سہارنپور کے گنے کے کھیتوں سے آگی ہوئی ہماری وزیر اطلاعات شمامہ صاحبہ دیکھنے میں ایک کافوری گڑیا لگتی ہیں۔ کوڑی سی آنکھ، پکوڑی سی ناک ہتھوڑی سا جسم، پھر طرّہ یہ کہ خبردار جو مجھے بدصورت کہا۔ کل ہی اخباروں میں نام آجائے گا کہ فلاں پر وزیر اطلاعات نے ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔

اچھا بھئی ہمارا کیا اختیار، اب تو سارے مدرسے کی اطلاعات، خبروں اور افواہوں کی پرواز ان کی نظر کرم کی منتظر ہیں۔ یہ جو چاہیں اڑا دیں، جیسی چاہیں سنا دیں، مگر اخلاق کی حد میں رہ کر۔

ضیا حیدر
درجہ ہشتم

ایک دن کا مدرسہ

ایک دن کے مدرسے میں کوئی بڑا نہیں ہے۔ تمام بچے ہی بچے ہیں۔ دیکھیے وہ ایک ننھا سا لڑکا ہاتھ میں کرسی لیے آرہا ہے۔ بیچارے سے کرسی سنبھل بھی نہیں رہی ہے۔ "جانتے ہیں یہ کون ہے؟" "یہ ہیں، ایک دن کے مدرسے کے چپراسی"۔ ترانے میں استادوں کے بیٹھنے کے لیے کرسی لا رہے ہیں۔ ترانہ شروع ہونے والا ہے۔ ننھے ننھے بچے استاد کس شان سے کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ وہ دیکھیے چہارم "ب" کے ایک استاد آرہے ہیں۔ کیسے اکڑ اکڑ کر چل رہے ہیں۔ ترانہ شروع ہوا چھوٹے چھوٹے بچے تلاوت، حدیث اور ترانہ پڑھ رہے ہیں۔ ترانہ ایک بچہ پڑھتا ہے اور سب دہراتے ہیں اب ایک لڑکا مضمون پڑھ رہا ہے۔ ارے یہ تو ایک دن کے مدرسے پر ہے کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ اور اب ایک دن مدرسے کے نگران "صدر بچوں کی حکومت" استادوں اور کارکنان کو ہدایت دے رہے ہیں۔ ترانہ ختم ہوا۔ لو بچے لائن بنا کر اپنی اپنی کلاسوں میں جا رہے ہیں۔

وہ دیکھو کلاس اس میں ایک چھوٹے سے استاد پڑھا رہے ہیں کتنی دلچسپی اور خاموشی کے ساتھ سب بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔ اور ذرا کلاس کو تو دیکھو، کتنی خوبصورتی سے سجائی گئی ہے۔ کتنے خوبصورت چارٹ لگے ہیں، اور ان پر کتنے اچھے اچھے جملے لکھے ہیں۔ اب تفریح ہوگئی۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی بچے اپنی اپنی کلاسوں سے نکل بھاگے۔ کچھ جھولے کی طرف دوڑ لگا رہے ہیں، تو کچھ خوانچے کی طرف بھاگ رہے ہیں، کچھ بینک میں جا کھڑے ہوتے ہیں، کچھ پارک میں گپ شپ لڑاتے بیٹھ گئے۔ اب ذرا ادھر تو آئیے۔ دیکھیے یہ بچوں کا بینک ہے یہاں [illegible] کر رہے ہیں۔ دیکھیے وہ ایک ننھے سے صاحب آئے [illegible] روپے نکلوانے ہیں۔ انھوں نے روپے نکلوائے اور [illegible]

اب وقفہ ختم ہوگیا۔ پہلی گھنٹی کی آواز سنتے ہی بچے [illegible] کلاسوں کی طرف جانے لگے۔ مگر یہ دو تین آدمی کلاسوں [illegible] پاس کیسے گھوم رہے ہیں۔ اچھا یہ معائنہ کرنے والے ہیں۔ [illegible] اور بورڈنگوں کو دیکھیں گے اور نمبر دیں گے۔

لیجیے انھوں نے معائنہ کر لیا۔ اب یہ رپورٹ دینے دفتر جا رہے ہیں۔ دفتر میں نگرانِ مدرسہ اور نائب نگرانِ مدرسہ نے ان کا استقبال کیا، اور بات چیت کی۔ آج نگرانِ مدرسہ بہت مصروف ہیں۔ مہمانوں، استادوں اور کارکنان سے رابطہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ تمام کام اچھی طرح ہو رہا ہے۔

دیکھیے وہ ننھا چپراسی چھٹی کی گھنٹی بجانے جا رہا ہے۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی سب بچے کلاسوں سے نکل آئے، اور اجمل منزل کے پارک میں جمع ہوگئے۔ وہاں مٹھائی تقسیم ہوئی، اور پھر بچے مٹھائی لے کر بورڈنگوں کی طرف واپس چلے گئے۔ چلیے ساتھ ہی ساتھ ہم بھی ذرا بورڈنگوں کو دیکھ لیں۔

اوہو! یہ اقبال منزل ہے کچھ بچے کپڑے بدل رہے ہیں اتنے یہ بچے کپڑے بدلیں، آئیے ذرا ہم ان کی بورڈنگ دیکھ لیں۔

اس طرف دیکھیے بچوں نے اپنی پکنک میں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہی مٹی کی مدد سے یہاں بنا دیا یہاں تک کہ پہاڑوں پر برف بھی جما دی۔ ارے بھائی ذرا سنیے تو سہی۔ کھانے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ بچے ڈائننگ ہال کی طرف جا رہے ہیں آج سب بچے وزیر خوراک اور کابینہ کے دوسرے وزیروں کی نگرانی میں کھانا کھائیں گے۔ یہ وزیر بھی ان کے ساتھی ہی ہیں۔ سب بچوں نے کھانا کھایا، نماز پڑھی اور پھر آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ ارے ہاں۔ آج شام کو کلچرل پروگرام بھی تو ہیں۔ آئیے ہم بھی دیکھیں وہ سامنے اوپن ایر تھیٹر میں ڈرامہ شروع ہوگیا۔ کتنا مزا آرہا ہے۔ بھئی سچ مچ ان ڈراموں میں تو بچوں نے بڑوں کو بھی گھٹا دیا۔ کیسے غضب کے ایکٹر ہیں۔ لو جناب یہ تھا ایک دن کے مدرسے کا آنکھوں دیکھا حال۔ آپ نے [illegible]

ایک دن کے ... تو دیکھ لیا. آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیوں ہوتا ہے. سنیے یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہمارے اندر پڑھانے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے. ہم اسکول کو چلا سکیں اور ہمارے اندر ذمے داری کا احساس پیدا ہو. اسی دن ہمیں اپنی اہمیت محسوس ہوتی ہے. اور خوشی خوشی اپنا کام کرتے ہیں. ہم سب اس دن یہ ☆ کوشش کرتے ہیں کہ ہم اپنے استادوں سے بھی اچھا پڑھا سکیں. اس دن ہمیں اس بات کا بھی بخوبی احساس ہو جاتا ہے. کہ ہمارے استاد ہمیں کتنی محنت سے پڑھاتے ہیں اس دن صرف ہماری حکومت ہوتی ہے. اس ایک دن کی حکومت میں ہم بہت اچھی اچھی باتیں سیکھتے ہیں.

ڈاکٹر رشید الوحیدی

بچوں کی حکومت

آؤ بچو! ابتدائی کا سنو اک واقعہ
آؤ دیکھیں کس قدر دلچسپ ہے یہ تجربہ

یہ مڈل کے چھوٹے بچوں نے کیا کیسا کمال
ہے بظاہر کھیل، پر تعلیم بھی ہے بے مثال

ہے تمھارے ملک میں جیسے حکومت کا رواج
اپنے مدرسے میں ہے، ویسے ہی بچوں کا رواج

بچے ہی لیڈر ہیں خود ان کی سیاست ہے یہاں
چھوٹے پیمانے پر بچوں کی حکومت ہے یہاں

اس طرح باقاعدہ ہے اس حکومت کا نظام
جیسے دلی میں ہے، ایسا ہی ہے اس کا انتظام

صدر بھی ہے اس حکومت میں وزیر اعظم بھی ہے
کام کرنے کا ہے جذبہ کوشش پیہم بھی ہے

پھر وزیر اعظم کی کابینہ بھی بنتی ہے یہاں
اور کابینہ کے ممبر کی ہیں ذمہ داریاں

چیف جسٹس کا بھی ہوتا ہے یہاں پر انتخاب
اس حکومت کی ہے اک دستور کی اپنی کتاب

اطلاعات اور آرائش کا ہے کوئی وزیر
کوئی ہے تعلیم کا، خوراک کا کوئی وزیر

ہے وزیر صحت تو کوئی وزیر کھیل ہے
سب وزیروں میں محبت ہے خلوص و میل ہے

سب کے دل میں ایک جذبہ امن و صلح و شانتی
ایک ہی مقصد ہے، ہو اسکول کی نام آوری

سال میں اک بار ہوتا ہے الیکشن بھی یہاں
پوسٹر بھی ہر طرف لگتے ہیں ہر سو جھنڈیاں

دوسرے دن نو بجے سب ڈالتے ہیں آ کے ووٹ
کام سب ہوتے ہیں کوئی دشمنی ہے اور نہ کھوٹ

چند ہی گھنٹے میں نمٹی سب الیکشن کی بہار
اب دھڑکتے دل سے بچے کر رہے ہیں انتظار

ڈوبتی ہے کس کی کشتی، کسی کی نیا ہو گی پار
بس اسی اک فکر میں الجھا ہے ہر امیدوار

پھر ہوا جو کامیاب اس کا نکلتا ہے جلوس
دل میں ہوتی ہے خوشی، الفت، محبت اور خلوص

اب نئے لیڈر، نئے ممبر، حکومت ہے نئی
جو حکومت پچھلے سالوں میں بنی تھی وہ گئی[1]

چارج لینے کا بھی ہوگا ایک دن اب اہتمام
جلسۂ مسند نشینی کا کریں گے انتظام

اس میں مہمانوں کو دعوت نامے بھیجے جائیں گے
سرپرست استاد و شیخ الجامعہ سب آئیں گے

سب سے پہلے آ کے بیٹھیں گے بہت باقاعدہ
صدر صاحب، پھر وزیر اعظم و شیخ الجامعہ

دونوں جانب کرسیوں پر ہیں وزیران کرام
چیف جسٹس کا بھی ان سب میں ہے اک اونچا مقام

اک نئے دور حکومت کی ہیں یہ سرگرمیاں
چیف جسٹس عہد لیں گے اب وزیروں سے یہاں

الغرض ہر طرح خاموشی سے آیا انقلاب
اک حکومت ہو گئی رخصت نئی آئی جناب

نظم میں نے کر دیا ہے یوں تو سارا ماجرا
دیکھنے سے ہے تعلق تب ہی آئے گا مزا

---

[1] مٹ جانا، ختم ہو جانا

دعوت نامہ ایک دن کا مدرسہ

پروگرام

محترمی!

"بچوں کی حکومت"، جامعہ مڈل اسکول کے زیرِ اہتمام ۲۶ مارچ ۸۳ء کو "ایک دن کا مدرسہ" ہوگا۔ اس دن مدرسے کا سارا انتظام طلبہ کے ہی ہاتھوں میں ہوگا۔

امید ہے آپ اس موقع پر تشریف لا کر ہمیں شکریہ کا موقع دیں گے۔

شمامہ خورشید
(وزیرِ اطلاعات)

نگران مدرسہ: اظہر آصف انصاری
نائب نگران: تنویر اکرام

کلاس سپروائزرس

۱۔ امجد اشرف الزماں ۲۔ محمد مبشر انصاری ۳۔ کامل حسن ۴۔ قیام الدین۔

اساتذہ درجہ اول تا پنجم

۱۔ اول (الف) — سروری بانو، تبسم زیدی، شمیم فاطمہ
۲۔ اول (ب) — رابعہ امیر، سیمی مشیر
۳۔ دوم (الف) — نشاط پروین، شبینہ مجیب
۴۔ دوم (ب) — معین الحق، زبیر ارشاد
۵۔ سوم (الف) — مسیح الزماں، شبینہ الحسنین
۶۔ سوم (ب) — شرف الدین
۷۔ چہارم (الف) — محمد انعام خورشید، عاصم رشید خاں
۸۔ چہارم (ب) — بہجت سلطان، جاوید اختر صدیقی
۹۔ پنجم (الف) — منظور الحق، سید رضی باقر
۱۰۔ پنجم (ب) — محمد نوید۔ ساجد علی صدیقی، عاصم رشید

اساتذہ ششم، ہفتم

اردو: نجیب سلطان۔ سراج الدین
ہندی: محمد نصرت
انگریزی: تنویر اکرام۔ ارشاد حمید۔ اعجاز حسین زیدی
ریاضی: ضیا حیدر۔ عرفان العزیز۔
سائنس: اعجاز احمد
سماج کا علم: صوفیہ خاتون
ڈرائنگ: جاوید نثار
حرفہ: محمد اسماعیل
اسلامیات: واقف اللہ خاں

ناظم شعبہ جات

ناظم کتب خانہ — ریاض الدین۔ کمال پاشا، جاوید احمد خاں
" بینک — فہیم احمد۔ فخر عالم، سید یعقوب اختر
" دکان — ریاض الدین۔ آفتاب عالم
" کھیل — سراج الدین
" چڑیا خانہ — وسیم احمد
" میوزیم — سید معظم۔ محمد نقی، بشیر الدین
" خوانچہ — محمد وحید۔ سمیرہ حیدر
" فلاور شو — فاطمہ امیر۔ ممتاز زہرہ
" باغبانی — مرزا ظفر بیگ

آتالیق دار الاقامہ

۱۔ جوہر منزل — عابد حسین۔ طارق صدیقی
۲۔ اقبال منزل — توقیر عالم۔ شاہد حسین
۳۔ محمود منزل — حارث فرقان۔ محمد اکرام قریشی
۴۔ اجمل منزل — محمد ذکر اللہ۔ ذو الفقار
مالی: محمد ادریس، مختار علی انصاری

دفتر

کلرک: خواجہ حبیب الرحمن، احمد سراج صدیقی
چپراسی: یسین احمد لداخی، شرافت اللہ، ارشد الاسلام
بہشتی: فخر متین

مہترانی: رضوانہ اسد، شائستہ نصیر
ہوم سائنس: یاسمین بانو، شہناز پروین

استقبالیہ کمیٹی

۱۔ توقیر اکرام ۲۔ راشد رفیق ۳۔ یاسر طلال ۴۔ محمد عثمان
۵۔ احمد سراج ۶۔ اسجد مجید ۷۔ احسان اللہ خاں
۸۔ گوہر شمیم

اسپیشل کلاس برائے مخصوص طلبہ

اساتذہ: سائرہ بانو۔ تنویر
ریاضی — عظمیٰ نار
انگریزی — مشیر زہرہ
ہندی — ثمینہ بانو
سوشل ورکر — شابانہ شمیم

نظام الاوقات

بیداری	۵/۳۰ بجے
نماز فجر	۶ بجے
غسل و تیاری	۶/۱۵ تا ۷/۴۵ بجے
ناشتہ	۷/۱۵ تا ۷/۴۵ "
اسکول کا افتتاح	۸/۱۵ تا ۸/۴۵ "
تعلیم شروع	۸/۴۵ بجے
چھٹی	۱۲/۴۵ "
تقسیم شیرینی	۱ تا ۱/۳۰ بجے
نماز ظہر	۲/۱۵
نماز عصر	۵ بجے
نماز مغرب	غروب آفتاب
کھانا شب	بعد مغرب

مظہر آصف انصاری
سابق وزیر اعظم

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت

یادیں، کتنی میٹھی اور رسیلی ہوتی ہیں، اس کا اندازہ ہر شخص کو ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ دسمبر ۸۱ء کی بات ہے کہ ہمارے استاد اور مربی جناب آزاد رسول صاحب مدرسہ ابتدائی کی ۳۲ سال خدمت کرنے کے بعد مدرسے سے رخصت ہوئے۔ صدر بچوں کی حکومت محمد اکبر خاں نے مسند نشینی کے جلسے میں رخصت ہونے والے نگران کو الوداع اور نئے ہیڈ ماسٹر جناب خالد سیف اللہ صاحب کو خوش آمدید کہا۔ بچوں کی حکومت کی تنظیم اور تشکیل کے سلسلے میں آزاد صاحب کی خدمت ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ انھوں نے اپنے زمانۂ اقتدار تک ذاکر صاحب کی روایات کو قائم رکھا۔ کوئی بھی کام ہوتا بچوں ہی کو پیش پیش رکھتے اور ان کی صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کرتے۔ اس اچھی روایت کو مزید شاندار بنانے کے لیے نئے نگران جناب خالد سیف اللہ صاحب نے بچوں کی حکومت کے مشیر کے توسط سے ہمیں ایک پیغام دیا کہ جامعہ اور ہمارے ملک کی اہم شخصیات پر ترانے میں خاص طور پر اور ادبی جلسوں میں عام طور پر تقریریں کرانے کا اہتمام کیا جائے۔ اس سال میں بچوں کی حکومت میں وزیر اعظم تھا۔ لہٰذا مسند نشینی کے جلسے کے بعد، جو غالباً ۲ فروری کو ہوا تھا، ۸ فروری کو ذاکر صاحب کے یوم پیدائش کے موقع پر ترانے میں" مندرجہ ذیل خراج عقیدت ذاکر صاحب کو پیش کیا گیا۔

دوستو اور ساتھیو!

بچوں کی حکومت آج اپنے اسکول کا ترانہ اس شخص کی نذر کر رہی ہے جس نے اپنی پڑھائی کے زمانہ میں اپنے تن من اور دھن اور اپنی زندگی کو جامعہ کے لیے وقف کر دیا تھا اور جرمنی سے تار بھیجا تھا کہ میرے اور میرے دوستوں کے آنے تک جامعہ کو بند نہ کیا جائے۔ تعلیم ختم ہوئی، اپنے ملک ہندستان واپس ہوئے، جامعہ آئے۔ جامعہ آنے کے بعد ان کی غیر معمولی دلچسپی اور توجہ کی وجہ سے جامعہ نے ایک مدرسہ قائم کیا، جو اس وقت مدرسہ ابتدائی اور آج جامعہ مڈل اسکول کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جس میں تعلیم و تربیت، دونوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اچھی تعلیم دینے کے لیے اچھے استادوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا استادوں کی تربیت کے لیے استادوں کا مدرسہ کھولا گیا۔ جو آج کل ٹیچرس کالج کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اچھی کتابیں چھاپنے اور بیچنے کے لیے ایک شعبہ کھولا گیا جو آج کل مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مکتبے نے بڑوں اور بچوں کے لیے ایک رسالہ "پیام تعلیم" جاری کیا۔ جس نے گذشتہ سال ہمارے تعلیمی میلے کی سرگرمیاں ملک اور غیر ملک دونوں کے گوشے گوشے تک پہنچا دیں۔

بھائیو! آج کا ہمارا ترانہ اس مسیحا کی نذر ہے جس نے تعلیم و تربیت کی شمع سے بچوں کے دل و دماغ کو روشن کیا اور ایسی تعلیم کی تربیت دلائی جو آزادی کی منزل بڑھائے اور غلامی سے چھٹکارا دلائے۔ وہ ہندستان کے بچوں کو جواں ہمت، بلند حوصلہ اور پکے ارادے کا مالک بنانا چاہتے تھے اور اپنے اس ارادے میں کامیاب بھی ہوئے۔

آپ سمجھتے ہوں گے آج ۸ فروری ہے۔ یہ دن ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی پیدائش کا دن ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جامعہ ملیہ کی سوکھتی ہوئی بیل کی ایسے وقت میں آبیاری کی جب ملک کے بڑے بڑے رہنما ہمت ہار چکے تھے۔ وہ "ایک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی" کے مصداق کم و بیش ۲۲ سال تک جامعہ کی خدمت کرتے رہے اور مرتے دم تک جامعہ کی فکر اس کی ترقی کی فکر انھیں ستاتی رہی۔ مرحوم کی یاد تازہ کرنے کے لیے ہم نے آج یہ اہتمام کیا ہے۔ اس موقع پر میں آپ سب لوگوں کے سامنے ڈاکٹر صاحب کی ایک اچھی عادت کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب بھی ڈاکٹر صاحب کوئی نئی بات اچھا کام اور [illegible]

بچے تو نہ صرف ایک ننھے بچے کی طرح لپکتے، سیکھتے اور اس میں کھو جاتے بلکہ دوسروں کو بھی سکھانے کی کوشش کرتے۔ لہٰذا ہم بھی اس بات کی کوشش کریں کہ جب کوئی نئی بات، نئی چیز اور اچھا کام دیکھیں اور سنیں تو اسے سیکھنے، اپنانے اور عمل کرنے کی کوشش کریں۔

دوپہر بعد ۳ ½ بجے کانفرنس ہال میں جلسہ ہوا جس میں جامعہ اور بیرون جامعہ کے سرکردہ حضرات نے شرکت کی۔ مڈل اسکول کی طرف سے میں نے اس موقع پر جو مضمون پڑھا تھا اس کا خلاصہ پیش ہے۔

جناب صدر اور حاضرین جلسہ

آپ جانتے ہی ہیں کہ اس دنیا میں ولادت اور وفات دونوں کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اور جب تک یہ دنیا قائم ہے چلتا رہے گا۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کی پیدائش یا وفات دونوں ہی دنیا اور دنیا والوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور ایسے لوگ سورج کی طرح روشن اور چمکدار ہوتے ہیں۔ جو دنیا کے گوشہ گوشہ کو روشنی اور تابانی بخشتے ہیں۔ ان کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی معلومات بھی دنیا والوں کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت ذاکر صاحب کی ہے جن کا آج یوم پیدائش ہے اور انھیں ہم خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

معزز حاضرین! ذاکر حسین صاحب سے ہماری یادوں کا رشتہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا پرانا ہمارا مڈل اسکول۔ اسی لیے ان کی یادیں تازہ کرنے میں ہمیں اتنا ہی مٹھاس اور رس ملتا ہے جتنا مٹھاس اور رس ہمیں آج مڈل اسکول میں پڑھنے میں مل رہا ہے۔ ان کے پیش نظر بچوں کی عظمت تھی اسی لیے انھوں نے جامعہ کے اندر ہر موقع پر مدرسہ ابتدائی کے بچوں کو پیش پیش رکھا اور ان سے بڑے بڑے کام کرائے اور انھیں بڑی بڑی محفلوں میں سب سے اونچی جگہ دی۔ بڑے بڑے مہمانوں کی موجودگی میں چھوٹے چھوٹے بچوں نے جلسوں کی صدارت کی خصوصی مہمانوں کا استقبال کیا اور ہار پہناتے ہیں۔ جامعہ کا جشن سیمیں اور زریں ہوا اس موقع پر مہمانوں کا استقبال مدرسہ ابتدائی کے چھوٹے بچوں ہی نے کیا۔ ان کا اصول تھا کہ بچوں کی عزت کر کے انھیں عزت کرنا سکھایا جائے اور انھیں ذمہ داریاں سونپ کر ہمت والا بنایا جائے۔ اسی لیے مدرسہ ابتدائی کی بنیاد بھی ایک بچے سے رکھوائی۔

ذاکر حسین مرحوم نے اپنی زندگی کا آغاز ایک مخلص استاد کی حیثیت سے کیا اقتدار اور منصب کی ہوس سے بالا ہو کر وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعمیر و ترقی میں جٹ گئے۔ یہاں صرف محنت، قربانی اور مقصد سے لگن کی ضرورت تھی۔ اور ان باتوں سے وہ پوری طرح آراستہ و پیراستہ تھے۔ اسی لیے انھوں نے دشمنوں کی دشمنی اور دوستوں کے شبہوں کے باوجود اسے مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔

گاندھی جی کی بنیادی تعلیم کا تصور ایک ایسے آدمی کا متلاشی تھا جو اس تصور کی تشریح اور تنظیم بھی کر سکے۔ اور اسے عملی دنیا کی چیزیں بھی بنا سکے۔ یہ سارا کام ذاکر صاحب کی کوششوں سے انجام پایا۔ ذاکر صاحب میں توازن، قوت فیصلہ، انسانیت دوستی اور دانشمندی کے وہ اوصاف موجود تھے۔ جو انھیں ہر جگہ کامیابی دلاتے رہے۔

معزز سامعین!

آج ان کے یوم پیدائش کے موقع پر جامعہ کے سب سے چھوٹے ادارے مڈل اسکول کے بچوں نے ان کے مزار پر قرآن خوانی کی، اپنے ترانے کو ان کے لیے وقف کیا، اور اب آپ کے سامنے ان بچوں کا یہ نمائندہ مرحوم کی یادوں اور کاموں کا ذکر کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہا ہے۔ چونکہ بچے ان کے لیے باغ تھے، پھولوں کا ہجوم تھے۔ دشت اور صحرا تھے انھوں نے بچوں کے اندر وہ قوت پیدا کی جس سے

ان کی زندگی میں جودت اور حرکت پیدا ہو اور وہ اپنے آپ کو اور اپنی دنیا کو ہر پہلو سے دیکھ سکیں، دیکھ کر اپنا سکیں۔ اپنا تجربہ کر سکیں۔ اور ایسی تمام شرطوں کو ملحوظ کر دیں۔ جوان کی خود اعتمادی اور آزادی میں اضافہ ہوں۔

آیئے آج اس موقع پر عہد کریں کہ ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلیں گے اور ان کی انسانیت دوستی، قربانی اور حب الوطنی کو اپنائیں گے اسی وقت آن کی محبت کا حق ادا کر سکیں گے۔ خدا مرحوم کی مغفرت کرے آمین۔

اور اس طرح ان یادوں کا سلسلہ سمندر کی موجوں کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا میرے ذہن میں امڈا چلا آرہا ہے۔ خالد سیف اللہ صاحب کے تشریف لانے کے بعد مدرسے کے کلچرل پروگراموں میں پھیلاؤ آیا۔ مزید شیخ الجامعہ کی اسکولوں سے گہری دل دلچسپی کی وجہ سے بچوں کی حکومت کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اور جامعہ یونیورسٹی کی دوسری اہم تقریبات کا بھی انتظام بچوں کی حکومت کے سپرد ہونے لگا۔

پچھلے برسوں میں یوم تاسیس، یوم شہادت گاندھی جی، تعلیمی میلہ، یوم پیدائش ذاکر حسین اور قرأت وغیرہ جیسی اہم تقریبات کو بچوں کی حکومت کے ذمے کر کے طالب علموں کی شخصیت کو ابھارنے کی طرف مزید کوشش کی گئی۔

تبصرہ

کتب خانہ

جامعہ مڈل اسکول

جب سے مدرسہ ابتدائی کی بنیاد ڈالی گئی، تعلیم کا کام سال بہ سال ترقی ہی کرتا رہا۔ اسی دور میں اسکول کے چند افراد نے ایک "کتب خانہ" بھی قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی تاکہ طلبہ اپنے خالی اوقات میں کتب بینی سے فائدہ اٹھا سکیں۔

جناب عبدالغفار مدھولی صاحب نے لکھا ہے کہ "باغبانی سے بچوں نے سبزیاں فروخت کیں، پہلی دفعہ کوئی تیس روپے جمع ہوئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ ان روپوں سے کوئی یادگار قائم کی جائے، باغبانی سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے نئی کتابیں نہیں تھیں۔ طے ہوا کہ کتابیں منگوائی جائیں، ان کتابوں کا آنا تھا کہ بچوں کا "کتب خانہ" قائم ہوگیا۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں باقاعدہ "کتب خانہ" میں ایک استاد نے اعزازی طور پر اپنے خالی اوقات میں کام کرنا شروع کیا۔ کتابوں اور رسائل میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا۔ اس زمانے میں چودھری اکبر علی خان صاحب مرحوم نگران مدرسہ تھے اور "کتب خانہ" کے نگران جناب عبدالواحد سندھی صاحب مرحوم تھے۔ سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء تک مرحوم نے بڑی دلچسپی سے "کتب خانہ" کا کام انجام دیا۔ اس کے بعد مولانا سرور صاحب، ناظم دینیات، ناظم کتب خانہ بنائے گئے۔

سنہ ۱۹۴۶ء سے جناب رشید نعمانی صاحب نے کتب خانہ کی نظامت کے فرائض انجام دینا شروع کیے۔ اس وقت "کتب خانہ" میں کل ایک ہزار کتابیں مختلف مضامین کی موجود تھیں۔ موصوف نے سنہ ۱۹۵۶ء تک "کتب خانہ" کے کاموں کو سنبھالے رکھا۔ اس وقت جناب عتیق احمد صاحب نگران مدرسہ تھے۔ "کتب خانہ" کے لیے اسلامیات، سائنس، ترقی پسند ادب وغیرہ مضامین کی کتابوں کا خاص طور پر اضافہ کیا گیا۔ اس وقت کتابوں کی کل تعداد دو ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد آزاد رسول صاحب نگران مدرسہ مقرر ہوئے تو ان کے زمانے میں منیر الحسن صاحب مرحوم ناظم "کتب خانہ" مقرر کیے گئے۔ مرحوم اپنے فرائض کو خالی اوقات میں نہایت مستعدی سے انجام دیتے رہے۔ منیر صاحب مرحوم نے سنہ ۱۹۵۶ء تا ۳۰ ر اپریل سنہ ۱۹۶۸ء تک کتب خانہ میں کام کیا۔ اس وقت کتب خانہ میں تقریباً چار ہزار نو سو پچپن کتابیں مختلف مضامین کی موجود تھیں۔

یکم مئی سنہ ۱۹۶۸ء کو جناب محمد حبیب خاں صاحب کا لائبریرین کی حیثیت سے کتب خانہ جامعہ مڈل اسکول میں تقرر ہوا۔

آزاد رسول صاحب کے زمانے میں کتابوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ خاص طور پر اسلامیات اور اردو کی تقریباً سبھی اچھی اور مفید کتابیں اکٹھا ہوگئیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے کتب خانے میں، جامعہ یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ اور دیگر حضرات استفادے کے لیے آتے رہتے ہیں اور اس سال تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایک طالبہ بھی بچوں کے ادب پر تحقیقی کام کرنے کے لیے ہمارے کتب خانہ سے استفادہ کرنے کے لیے آئی ہوئی ہیں جن کی مدد ہمارے لائبریرین صاحب فرماتے ہیں خدا کرے کہ سارے لائبریرین صاحب خوش وخرم رہیں اور ان کی دلی مراد بر آئے۔

طارق صدیقی

بچوں کی دُکان

ایک تعارف

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بچوں کی تعلیم کے لیے عملی کاموں پر زیادہ زور دیتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ بچے خود اپنے

عمل کے ذریعے تعلیم حاصل کریں۔ عملی کاموں کے ذریعے مختلف مضامین میں معلومات فراہم کرسکیں۔ ان میں خرید وفروخت اور حساب فہمی کے ساتھ ساتھ سچائی اور نظم وضبط کی صلاحیت بھی پیدا ہو سکے۔ ان مقاصد کے تکمیل کے لیے انھوں نے جناب عبدالغفار صاحب مدھولی کو چنا جو کھیل اور عملی کاموں کے ذریعے تعلیم دینے کے ماہر تھے۔ انھوں نے جامعہ میں کئی دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ ۱۹۲۱ء میں، جبکہ جامعہ قرول باغ میں تھی، مدرسہ ابتدائی میں بچوں کی دکان کی ابتدا کی، لیکن کام کی زیادتی اور افادیت کے پیش نظر یکم مئی ۱۹۳۷ء کو بچوں کی دکان نے باقاعدہ ایک الگ شعبے کی حیثیت حاصل کرلی۔ اب طلبہ اور اساتذہ کی کتابیں، کاپیاں اور ضرورت کی اسٹیشنری خریدنے کے لیے بازار جانے کی دشواری ختم ہوگئی۔ بچوں کی دکان سے ہی سب کی ضرورت پوری ہونے لگی۔ سب بچوں کے پاس ایک ہی جیسا سامان رہنے لگا۔ جہاں کھانے پینے اور لباس وغیرہ میں یکسانیت تھی، وہاں اسٹیشنری وغیرہ کے سامان میں بھی یکسانیت آگئی۔ ۱۹۳۶ء میں جب جامعہ اوکھلا منتقل ہوئی تو کئی قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ شہر سے دوری، اوکھلا کا زیادہ تر غیر آباد اور مخدوش علاقہ، راستوں کی خراب حالت اور سواری کا معقول انتظام نہ ہونا وغیرہ۔ ان دشواریوں کے پیش نظر بچوں کی دکان پر مزید توجہ دی گئی اور محسوس کیا گیا کہ افادیت کے اعتبار سے دکان طلبہ کے لیے بہت ضروری ہے۔

بچوں کی دکان سے فائدے

بچوں کی دکان سے کچھ خاص خاص فائدے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ بچوں کو مناسب قیمت پر بغیر کسی دشواری کے اچھا سامان فراہم ہو جاتا ہے۔

۲۔ بچوں میں تجارت کے رجحان اور دلچسپی کے علاوہ ایمانداری اور دیانتداری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ کاروباری کاغذات، کیش بک، اسٹاک بک، کھاتہ، لیجر اور کیش میمو وغیرہ سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

۴۔ تجارتی خطوط، اعلانات اور اشتہارات لکھ سکنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

۵۔ دکان کے ذریعے بچوں کے پیسے اور وقت کی بچت ہوتی ہے۔

۶۔ دکان کے نفع سے بچوں کے مشترک پروگراموں میں مدد ملتی ہے۔

۷۔ کتب خانوں اور اسٹیشنری کے تھوک بیوپاریوں سے تعلقات کے علاوہ خرید وفروخت کا تجربہ ہو جاتا ہے۔

۸۔ ریلوے پارسل اور ڈاکخانے سے مال بھیجنے اور منگانے کے ضابطوں، ان کے محصول اور پارسل بنانے کے مختلف طریقوں سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

نجیب سلطان شیروانی

بچوں کا بینک

ہمارے اسکول میں ایک بچوں کا بینک ہے اس میں ہم اپنا روپیا جمع کرکے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ جب پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے، چیک بھر کر اتالیق صاحب کو دے دیتے ہیں۔ اتالیق صاحب چیک پر دستخط کرکے چیک نگران صاحب کو بھیج دیتے ہیں۔ نگران صاحب دستخط کرکے چیک بینک کے ناظم صاحب کو بھجوا دیتے ہیں۔

جب تفریح ہوتی ہے، ہم بچوں کے بینک جاتے ہیں۔ یہاں ہمارے چیک کو روپیا ملنے سے پہلے دو منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بینک میں ہمارے ساتھی وزیر مالیات کام کرتے ہیں۔ سب سے پہلے جن صاحب کے پاس چیک جاتا ہے، وہ اسے اچھی طرح دیکھتے بھالتے ہیں پھر کھاتے سے پاس بک میں بچی رقم کو ملاتے ہیں۔ اور یہ اطمینان کرکے کہ رقم موجود ہے چیک پر "CHECKED" کی مہر لگا کر اپنے دستخط کرتے ہیں اور پاس بک میں چیک رکھ کر اپنے دوسرے ساتھی کو دے دیتے ہیں۔ یہ صاحب چیک کو کیش بک پر چڑھانے کے بعد اس پر "Entered

کی مہر لگا کر اپنے دستخط کرتے ہیں اور چیک بک خزانچی کو دے دیتے ہیں۔ خزانچی چیک کی رقم ہمیں ادا کرتے ہیں اور چیک پر "Paid" کی مہر لگا کر رکھ لیتے ہیں۔

پیسے جمع کرنے کے لیے ہم روپیا جمع کرنے والی بینک کی سلپ کو بھر کر روپیا اور سلپ خزانچی صاحب کو دیتے ہیں۔ خزانچی صاحب سلپ کی رقم پاس بک میں درج کر کے پاس بک اپنے دوسرے ساتھی کو دیتے ہیں جو اس رقم کو ہمارے نام پر کیش بک میں درج کر دیتے ہیں۔ یہ سب کام تفریح میں ہوتا ہے۔ تفریح ختم ہوتے ہی بینک بند ہو جاتا ہے اور ہم سب کلاسوں میں چلے جاتے ہیں۔ آئیے اب آپ کو چیک اور بینک کی اصطلاحوں کے بارے میں کچھ بتا دیں۔ تو لیجیے سب سے پہلے حاضر ہے چیک کی قسمیں۔

چیک کی قسمیں

۱۔ آپ خود اپنے ہی نام ایک چیک کاٹ لیں اور بینک جا کر خود ہی روپے لے لیں۔ اسے کھلا یا Open چیک کہتے ہیں۔

۲۔ اگر چیک پر آپ کسی کا نام نہیں لکھتے تو جو شخص بھی اس چیک کو لے جائے گا، اسے ہی روپے مل جائیں گے۔ اس کو Bearer / چیک کہتے ہیں۔

۳۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ جسے روپیا ادا کیا جانا ہے، بینک اسے روپیا نقد نہ دے، بلکہ اس کے حساب میں ہی جمع ہو، تو آپ چیک پر اس کا نام لکھ کر چیک کے بائیں طرف اوپر کے کونے میں دو لائنیں کھینچ دیں اور لکھ دیں کہ صرف کھاتے میں (Payees A/C) ایسے چیک کو Cross چیک کہتے ہیں۔

۴۔ سفر میں حفاظت کے خیال سے بہت سارا روپیا اپنے ساتھ نہیں لے جایا جا سکتا۔ آپ اپنے بینک میں وہ رقم جمع کر دیں جو آپ ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ اس رقم کے عوض آپ کا بینک آپ کو چیک دے گا۔ آپ جہاں جا رہے ہیں، وہاں اس بینک کی کسی شاخ میں اس چیک پر دستخط کر کے روپے لے سکتے ہیں۔ کوئی دوسرا اس چیک کا روپیا نہیں وصول کر سکتا۔ ایسے چیک کو Travellor چیک کہا جاتا ہے۔

بینک سے متعلق چند اصطلاحیں

۱۔ Bank Note ۔ بینک کی طرف سے چلائے جانے والے کاغذی نوٹ کو بینک نوٹ کہتے ہیں۔ پہلے تو ہر بینک اپنے الگ نوٹ چلاتا تھا اور اگر نوٹ واپس کیا جاتا تھا تو اس کے بدلے میں وہ اصلی سکہ دے دیتا تھا۔ مگر اب صرف ریزرو بینک کو ہی نوٹ چلانے کی اجازت ہے

۲۔ Deposit یا جمع۔ بینک میں جو روپیا رکھوایا جاتا ہے، وہ جمع یا Deposit کہلاتا ہے۔

۳۔ withdrawl. روپیا نکلوانا۔ بینک میں جمع کی ہوئی رقم میں سے کچھ روپیا واپس لیا جاتا ہے تو اسے روپیا نکلوانا یا Withdrawl کہتے ہیں۔

۴۔ Account Deposit یا کھاتا۔ بینک میں روپیا جمع کرنے پر جمع کرنے والے کے نام کا ایک کھاتہ کھول دیا جاتا ہے، اسے انگریزی میں Account Deposit کہتے ہیں۔

۵۔ Account No. جب کسی کے نام پر کوئی کھاتہ کھولا جاتا ہے تو جمع کرنے والے کے نام کے ساتھ اس کا ایک نمبر بھی لکھا جاتا ہے تاکہ اس کی پہچان آسانی سے ہو سکے۔ اس کو اکاونٹ نمبر کہتے ہیں۔

۶۔ Locker ۔ روپے کے علاوہ بینک قیمتی چیزیں جیسے زیور، ہیرے جواہرات، ضروری کاغذات وغیرہ حفاظت کے لیے اپنے پاس جمع کر لیتے ہیں۔ اس کے لیے یہ بہت مضبوط تجوریوں جیسے ڈبے، ہر جمع کرنے والے کو دیتے ہیں، جن میں یہ اپنی چیزیں خود رکھتے ہیں اور خود ہی نکالتے ہیں۔ اس کی چابی بھی اس کو دے دی جاتی ہے۔ اس تجوری کو 'لاکر' کہتے ہیں۔ دیکھا آپ نے کتنی ساری باتیں ہم نے اپنے بینک کے ذریعے سیکھیں اور آج اپنے پیارے پیامِ تعلیم کے ذریعے آپ کو بھی ان کے بارے میں بتایا۔

توقیر عالم

بچوں کا خوانچہ

بچوں کی حکومت کے شعبہ جات میں خوراک کا شعبہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اور خوراک کے وزیر کو صبح و شام دو تین مرتبہ اپنی ذمہ داری کو نبھانا پڑتا ہے۔ کھانے سے متعلق تمام باتیں نوٹ کرنا اور انھیں ناظم مطبخ تک پہنچانا اگر کوئی شکایت ہو تو ناظم مطبخ کی مدد سے اسے دور کرنا وزیر خوراک کے اہم فرائض میں داخل ہے۔

اسی طرح ڈائننگ ہال میں کھانے کی میز پر ساتھیوں سے کھانے کے آداب کی پابندی کرانے مثلاً بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کھانا شروع کریں کھاتے وقت بات نہ کریں، چھوٹا لقمہ لیں، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مقررہ اشاروں سے مانگیں، سر پر ٹوپی پہن کر کھانا کھائیں، اپنے ساتھی مانیٹرس سے تہذیب و شرافت سے پیش آئیں، وغیرہ باتوں کی پابندی کرانا وزیر خوراک کے فرائض میں شامل ہے۔ چھوٹے بچوں کو ناشتہ شام کے چار بجے پابندی سے ملتا ہے، یا نہیں؟ اگر نہیں ملتا ہے تو کیا وجہ ہے؟ ان سب باتوں کی نگرانی کرنا بھی وزیر خوراک کے فرائض میں داخل ہے۔

ہر مہینے مینو کمیٹی کی میٹنگ میں شریک ہونا اور مینو کے بارے میں ساتھیوں کی رائے کو ملحوظ رکھتے ہوئے رائے مشورہ دینا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ کہنا یہ ہے کہ بچوں کی حکومت میں وزیر خوراک کو چاق چوبند اور مستعد رہنا چاہیے۔

"بچوں کا خوانچہ"

قوموں اور ملکوں کی ترقی کا دارومدار تجارت پر موقوف ہے، اور تجارت میں وہی لوگ اور قومیں کامیاب ہوتی ہیں جو تجارت کے اصولوں سے واقف ہیں۔ اسی لیے جامعہ مڈل اسکول کے ذمے داروں نے روز اول سے بچوں کا خوانچہ قائم کیا ہے تاکہ بچے ہنستے کھیلتے تجارت کی اصطلاحوں کی نظری اور عملی تعلیم حاصل کر سکیں۔

جامعہ مڈل اسکول میں بچوں کے خوانچے کا قیام ۱۹۳۶ء سے ہے۔ جو درمیان میں بعض وجوہات کی بنا پر کچھ مدت کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ لیکن نئے نگران جناب خالد سیف اللہ صاحب نے پھر سے شروع کرایا۔

"خوانچے کے اوقات"

ہمارا خوانچہ روزانہ تفریح میں لگتا ہے جس میں دو تین ساتھی اور ایک استاد تندہی سے کام کرتے ہیں۔ خوانچے میں اکثر و بیشتر چھولے، پھلوں میں سیب اور کیلے سنترے اور دوسری موسمی چیزیں فروخت کی جاتی ہے۔ سردیوں کے زمانے میں میرٹھ کی ریوڑیاں بطور خاص منگوائی جاتی ہیں خوانچے کے دوبارہ کھلنے کی وجہ سے ہمارے اکثر ساتھیوں نے بازاری چیزیں خریدنا بند کر دیا ہے۔ اور وہ خوانچے پر آکر تازہ پھل، چٹپٹے چھولے، اور بسکٹ اور ٹوفی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ تعلیمی میلے کے موقع پر بھی ہمارا خوانچہ لگتا ہے، اور اس میں سامان فروخت ہوتا ہے۔ روزانہ کی فروخت کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے۔ اور رقم کو بچوں کے بینک میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ اور بلوں کی ادائیگی چیک کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

مسند نشینی اور ایک دن کے مدرسہ کے موقع پر مٹھائی کا انتظام اور تقسیم کا بندوبست کرانا بھی وزیر خوراک کے فرائض میں شامل ہے۔ اور ایک دن کے مدرسہ پر ڈائننگ ہال کے انچارج کے فرائض بھی وزیر خوراک ہی انجام دیتا ہے۔ متعلقہ استاد اس روز تمام کام بچوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اور تمام نظم و ضبط اور نگہداشت وزیر خوراک کو کرنی پڑتی ہے اور اس طرح ہر وزیر کو اپنی ذمے داری نبھانے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔

نصرت وزیر داخلہ

ہمارا ترانہ

ہندستان ایک مذہبی ملک ہے ۔ یہاں ہر کام رام رحیم اور ایشور کے نام سے شروع ہوتا ہے ۔ یہاں کے اسکولوں میں سب سے پہلے ایک اسمبلی (اجتماع) ہوتا ہے ۔ بعض اسکولوں میں اللہ سے دعا اور بعض اسکولوں میں حمد سے اسکول کا آغاز ہوتا ہے ۔

ہمارے یہاں اسی کو ترانہ کہتے ہیں ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے سنگ بنیاد رکھتے ہوئے بہت ہی درد کے ساتھ فرمایا تھا :

"اے نونہالانِ وطن ! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندستان کے دو تاریخی مقاموں، دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا"۔

ہمارا ترانہ ان کے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی ایک ذہنی اور روحانی کاوش ہے ۔ ہمارے ترانے کے پانچ اہم حصّے ہیں (۱) تلاوت کلام پاک ، (۲) حدیث ، (۳) خبریں ، (۴) نظم ، (۵) اعلان ۔

ہر حصہ میں بچوں میں مختلف انداز سے اچھی عادتیں پیدا کرنے کی کوشش ہے ، تلاوت اور حدیث کے مضامین اچھے اخلاق بہترین اوصاف اللہ کے بندوں اور پڑوسیوں کے حقوق پر مبنی ہے ۔ بچے روزانہ ان مضامین کو سنتے ہیں ۔ یہ مضامین ان کے ذہنوں میں اس طرح رچ اور بس جاتے ہیں کہ ان کی زندگی اچھے اخلاق کا نمونہ بن جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اسکول کے بچے بڑوں کا احترام اور چھوٹوں سے پیار کرتے ہیں ۔ دوسروں کے کام آنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں ۔ شور ، شر اور ہنگامے سے بچتے ہیں ۔ اپنے وقت اور قوت کو اللہ کی امانت سمجھ کر اس کا صحیح استعمال کرتے ہیں بچوں میں بیمار کی مزاج پرسی ، اور تیمارداری والدین ، اور استادوں کا احترام ، بیواؤں اور یتیموں کی مدد اور اپنا کام خود کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ۔

تیسرا حصّہ خبریں ، ایک اچھے شہری کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کے حالات سے واقف رہے ۔ اسی کو دیکھتے ہوئے ہمارے ترانے میں خبروں کا بھی ایک پروگرام ہوتا ہے جس میں باری باری سے مختلف جماعتوں کے طلبہ اپنے دوسرے طلبہ ساتھیوں کو کچھ خاص خبروں سے واقف کراتے ہیں ۔ تاکہ یہ سب طلبہ اپنے ملک اور دنیا کے حالات سے واقف رہیں ۔

چوتھا حصّہ نظم ، ہمارے ترانے میں ایک پروگرام نظم کا بھی ہوتا ہے اس میں ہر جماعت کے خوش الحان طالب علم اپنے ساتھیوں کو نظم سناتے ہیں ۔ اس نظم کا مطلب طلبہ کو صرف ہنسانا ہی نہیں ، بلکہ اس کے ذریعہ ان کو کچھ سکھانا ہوتا ہے ۔ اس سے دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ جو اچھا گانے والے طلبہ ہیں ان کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ اور آگے بڑھیں ۔

اعلان ، سب سے آخر میں جب وزیر داخلہ نظم کے ختم ہو جانے پر لفظ اعلان کہہ کر ترانے کے آخری حصّے پر پہنچتا ہے تو بچے ادھر ادھر اور کلاسوں اور راستے میں پائی چیزوں کو اعلان کے لیے وزیر داخلہ کے پاس پہنچا دیتے ہیں ۔ وزیر داخلہ ان چیزوں کا اعلان کرتا ہے بچے کھوئی ہوئی اپنی چیزیں آ کر لے لیتے ہیں ، جن چیزوں کا کوئی وارث نہیں ہوتا ان کو جمع کر لیا جاتا ہے ۔

کھوئی چیزوں کے علاوہ نگران مدرسہ ضرورت کے مطابق اسکول کے تمام بچوں کو مختلف قسم کے ہدایات دیتے رہتے ہیں اور اس طرح یہ ترانہ ختم ہو جاتا ہے ۔

اس ترانے کے پانچوں حصّے بچے کے اندر اچھی باتیں

پیدا کرکے اچھا شہری اور اچھا انسان بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اچھی عادتیں پیدا کرنے کے علاوہ اس ترانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بچے حروف کی صحیح ادائیگی صحیح تلفظ کرنا سیکھیں، لب و لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ بولنا سیکھیں ایک مجمعے کے سامنے بلا جھجک اپنی بات پیش کرنے کی عادت ڈالیں، مجموعی طور پر ہمارا ترانہ ہمیں زندگی میں اچھی طرح رہنے اور اچھی طرح بولنے کے آداب سکھاتا ہے۔

کتابیں بہترین دوست

آپ ہمارا تعلیمی میلا دیکھنے کے لیے تشریف لائے بہت بہت شکریہ۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے تعلیمی میلے کے اندر مختلف صورتوں میں ہمارا اسکول دیکھ لیا ہوگا۔

اب آیئے ہم آپ کو اپنے عزیز دوستوں سے ملائیں۔ آپ سوچتے ہوں گے۔ کہ یہ اپنے دوستوں سے ملانے کا کون سا موقع ہے؟ مگر ہمارے دوست کوئی ببن میاں یا ذکر یا بھائی نہیں ہیں۔ بلکہ عمدہ عمدہ انگلش، ہندی اور اردو کے چٹ پٹے رسالے مزے دار کہانیاں اور سیکڑوں ادبی کتابیں ہیں۔ آیئے ہم آپ کو ان کے گھر لے چلیں۔

یہ دیکھیے، یہ ہے ان کا گھر کتنا خوبصورت ہے۔ ایک لمبی سی میز رکھی ہوئی ہے، اور اس کے چاروں طرف کرسیاں رکھی ہوئی ہیں مگر ایک بھی کرسی خالی نہیں ہے ہر ایک پر کوئی نہ کوئی کتابوں کا دوست بیٹھا ہوا ہے۔ اب آپ یہ پوچھیں گے کہ بھئی جب یہ بچوں کے دوستوں کا گھر ہے، تو یہاں صرف بچوں کو ہونا چاہیے مگر یہاں کالج اور ثانوی کے طلبہ بھی بیٹھے ہوتے ہیں۔ ارے جناب! یہ ہماری لائبریری ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں پہلی کلاس کے بچوں سے لے کر ایم۔ اے تک کے طلبہ موجود ہیں۔ کتابوں کے یہ دوست چاہے وہ کالج کے طلبہ ہوں یا ثانوی کے سب ہماری لائبریری سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اور ثانوی کے طلبہ کو آپ یہاں پر ہر وقت دیکھ سکتے ہیں۔

اس لائبریری میں تقریباً گیارہ ہزار کتابیں موجود ہیں جن میں جغرافیہ، سائنس، مذہبی ادب، لغت، قرآن کی تفاسیر اور احادیث کے علاوہ اردو ادب اور دوسرے بہت سے مضامین کی کتابیں موجود ہیں۔

لائبریری میں ماہوار آنے والے رسالوں اور کتابوں کی خبرگیری رکھنے کا کام ہمارے بچوں کی حکومت کے وزیر تعلیم کے ذمے ہوتا ہے۔ اور ان کتابوں کی حفاظت و انتظام ہمارے لائبریرین جناب محمد حبیب صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ محمد حبیب صاحب بھی بہت خوش مزاج اور زندہ دل آدمی ہیں۔ کتابوں کے دوستوں کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے کبھی ان سے کسی کتاب کی فرمائش کی ہو اور انھوں نے ہمیں فراہم نہ کی ہو۔

تو جناب یہ تھیں ہمارے دوست اور ان کا گھر۔

لائبریری اور ان کے رکھوالے جناب حبیب صاحب۔

خدا کتابوں کے رکھوالے حبیب صاحب کو ہمیشہ سلامت اور خوش و خرم رکھے۔

یومِ اساتذہ

مسیح الزماں متعلم درجہ ہشتم

بڑے لوگوں کا یومِ پیدائش منانے کا دستور عام ہے۔ جو بڑی شان وشوکت سے منائے جاتے ہیں اور اس موقع پر جلسے بھی کیے جاتے ہیں۔ آنحضور کے یوم ولادت پر چھٹی ہوتی ہے اور شری کرشن اور گوتم بدھ کی یوم پیدائش پر بھی۔ ملک کی آزادی کے بعد سے جنگ آزادی کے مشہور رہنما مہاتما گاندھی کا یوم پیدائش بھی منایا جانے لگا۔ لیکن پنڈت نہرو نے اپنا یوم پیدائش "یوم اطفال" کے نام سے منانا شروع کیا۔

اسی طرح ہم ۶/ دسمبر کا دن "استادوں کے دن" کے نام سے مناتے ہیں۔ اصل میں یہ رادھا کرشن کے یوم پیدائش کا دن ہے۔ جسے ہم "یوم اساتذہ" یا "استادوں کے دن" کے نام سے مناتے ہیں۔ یوم اساتذہ منانے کا مقصد یہ ہے کہ سال میں کم از کم ایک دن ہم ان خدمات کو یاد کر سکیں جو ملک کے استاد انجام دیتے ہیں۔ استادوں نے قوم کی جو خدمت کی اس کی شکر گزاری کے طور پر ان کے خدمات کو یاد کیا جائے اور ہم یہ نہ بھولیں کہ بچوں کی زندگی بنانے اور انھیں ملک کا گاندھی و نہرو بنانے میں ان کا کتنا ہاتھ ہے۔ یہ ملک کے بچوں کی اسی طرح دیکھ بھال اور نگہداشت کرتے ہیں۔ جس طرح ایک مالی اپنے باغ کے پودوں کی۔ استاد بھی بچوں کے ساتھ اسی شفقت و محبت کو سے پیش آتا ہے جس طرح والدین اپنے بچوں سے پیش آتے ہیں۔

آج کی یہ تقریب ہم ان استادوں کی یاد میں منا رہے ہیں۔ جنھوں نے جامعہ کے خیموں اور جھونپڑیوں میں فاقہ مستی کے ساتھ مسرت اور خوشی کی وہ زندگی بسر کی جو اس زمانے میں اونچی اونچی عمارتوں والوں کو خوشحالی کے باوجود میسر نہیں۔ ہمارا یہ آج کا یہ ترانہ ان لوگوں کے لیے وقف ہے۔ جن کے جلائے ہوئے مٹی کے ٹمٹماتے چراغوں کی روشنی نے سارے ملک کو اس قدر روشن کر دیا تھا کہ ان میں آج کل کے نیز سے تیز روشنی کرنے والے حسین قمقموں کے مقابلے میں بہت زیادہ بصیرت کی قوت دکھائی دیتی تھی۔ ہماری یہ محفل جو بچوں کی حکومت نے اس سال منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان مرحومین کی یاد تازہ کرانے کے لیے ہے۔ جن کی نحیف اور کمزور ہڈیوں کی بنیاد پر نام و نمو کے قلعے تعمیر کرنے والوں کو باد صبا ہمیشہ یہ پیغام پہنچاتی رہے گی۔ کہ بے بسی اور کسمپرسی کے دور میں بھی ملک وملت کی آبرو صرف خاموشی اور بے نفسی سے کام کرنے والے ہی حاصل کر سکتے اور قائم رکھ سکتے ہیں۔

دوستو! گزرے ہوئے استادوں میں بہت سے اساتذہ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کو مصائب میں ڈال کر جامعہ اور ملک وملت کی خدمت انجام دی۔ ان میں اگر ایک طرف شفیق صاحب ہیں تو دوسری طرف آزاد رسول صاحب سابق نگرانِ مدرسہ ہیں، اور اس قافلے میں شریک ہونے والے سید احمد علی آزاد، محمد حسین ابوبرکت علی فراق اور سید منیر الحسن ہیں۔ یہ وہی منیر صاحب ہیں جن کی نظم ہم ہر سال مسند نشینی کے جلسے پر سنتے ہیں۔ مبارک ہو یہ رسم مسند نشینی۔

آج یہ لوگ ہم میں موجود نہیں، لیکن بقول شاعر ؎

گو نہیں ساقی مگر ساقی کا جام آتشیں
رات دن گردش میں رندوں کی بھری محفل میں ہے

ان کے کارنامے، ان کے خیالات اور افکار ہمارے لیے روشنی کا کام کر رہے ہیں۔ خدا ان لوگوں کو اپنے جوار میں جگہ دے۔ اور ہمیں ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ایک اچھے استاد کی حیثیت سے ہم ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام لے سکتے ہیں جو کہ جامعہ اسکول کے سب سے پہلے نگراں تھے۔ وہ اپنے اسکول کے بچوں سے باپ کی حیثیت سے ملتے

اوران سے محبت وشفقت سے پیش آتے اور اقامت گاہوں کے بچوں کو بالکل محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ ماں باپ سے دور ہیں۔ ان کے چھوٹے موٹے کام بھی خود کرتے ان کی صلاحیتوں کو ابھارتے اور ننھے منے بچوں کو جوکہ ایک کلی کے مانند ہوتے ہیں انھیں ایک خوبصورت پھول میں تبدیل کر دیتے۔ وہ کہتے کہ "ماں تو جنم دیتی ہے لیکن استاد ہمیں دنیا کے نیک وبد کی تمیز سکھاتا ہے، ہماری عادتیں سنوارتا ہے، ہمیں لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے، اور ہمیں حوصلہ دیتا ہے کہ ہم بڑے ہوکر مصیبتوں کا مقابلہ کرسکیں۔ یا اس کی روشنی میں آگے بڑھیں"۔

انھیں ممتاز شخصیتوں میں سے ایک استاد ہمارے مدرسے کے سابق نگراں جناب عتیق صاحب مرحوم گزرے ہیں۔ عتیق صاحب کو روزمرہ کی سائنس سے بہت دلچسپی تھی۔ بچپن کے دیہات کی قدرتی فضا اور سائنس کی تعلیم کی وجہ سے جامعہ کے قدرتی ماحول نے ان کے لیے کام کی ایک دلچسپ فضا پیدا کردی تھی۔ بچوں کے ساتھ آس پاس کے علاقوں کا دورہ کرتے۔ جانوروں کیڑے مکوڑوں، پرندوں اور پودوں کا مشاہدہ ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ تھا۔ مدرسہ ابتدائی میں آپ نے آتے ہی چڑیا گھر بنوایا۔ بچوں کے لیے صحت و صفائی کے لیے پروجیکٹ چلائے۔ جامعہ میں پروجیکٹ میتھڈ اور کام کے ذریعے تعلیم کا سائنٹفک طریقہ چلایا۔ مرغی خانہ، باغبانی، خوانچہ اور بینک کے مستقل پروجیکٹس کے تعلیمی پہلو کو نمایاں کیا۔ چھوٹے بچوں کو شہریت کی تعلیم دینے پر غور کیا۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اس وقت ہمارے مدرسے کی اتنی شہرت تھی کہ اس سال داخلے کے لیے ایک ہزار درخواستیں آئیں اور صرف چالیس داخلے کئے گئے۔ جشن سیمیں کے موقع پر سائنس میوزیم سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ جامعہ نگر کے آس پاس کے کیڑے مکوڑے، پرندے ان کے انڈے اور مختلف قسم کے سانپ سب کو بوتلوں میں محفوظ کیا گیا۔ آپ جانتے ہیں یہ سب ہمارے عتیق صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ جبلی کا ہنگامہ ختم کرنے کے بعد عتیق صاحب نے فیصلہ کیا کہ مدرسے کا سارا کام بچوں کے سپرد کرکے استاد ایک دن پکنک منائیں۔

یکم دسمبر ۱۹۴۷ء کو ایک دن کا مدرسہ شروع ہوا جب ہی سے مسلسل ہو رہا ہے۔ ان کے لندن جانے کے بعد آزاد صاحب نگران مدرسہ بنائے گئے۔ انھوں نے بچوں کی حکومت کو نیا روپ دیا۔ آج بچوں کی حکومت کی جو شکل وصورت اتنی صاف ستھری نظر آتی ہے۔ یہ سب آزاد صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ بچوں کی حکومت ہمیشہ ان کو یاد رکھے گی اور ان کے بناتے ہوئے رہنما اصولوں پر چلتی رہے گی۔ دوستو یہ حضرات ہم میں نہیں لیکن ان کی یادیں ان کی باتیں ان کا عمل ہمارے لیے مشعل کا کام کرتا رہے گا۔

صوفیہ خاتون
درجہ ہشتم

تعلیمی میلہ

کیا جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک تعلیمی ادارہ ہے۔ اسے صرف ایک تعلیمی ادارہ کہہ دینا کافی نہیں۔ جامعہ ایک جوئے بے کراں ہے جس میں وقتاً فوقتاً انقلاب کی موجیں اٹھتی رہتی ہیں۔ یہ ایسا دلنواز ادارہ ہے جس میں میل محبت اور بھائی چارہ جیسی باتوں کا چلن ہے۔ یہاں بچوں کو صرف آنکھ اور منہ سے رٹا کر ٹیپ ریکارڈر بنا دیے جانے کو تعلیم نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تعلیم کا مقصد ہے طالب علم خود اپنی صلاحیتوں کو تلاش کرے اور انھیں اجاگر کرے۔ اسی مقصد کے پیش نظر بچوں کے ذریعہ یہاں کئی پروجیکٹ چلائے جاتے ہیں مثلاً بچوں کی حکومت، بچوں کا بینک، چڑیا گھر اور خوانچہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ جامعہ میں کچھ تعلیمی جشن بھی منائے جاتے ہیں۔

میلے کا سارا انتظام بچوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس طرح کے تعلیمی جشن اور پروجیکٹ طلبہ وطالبات کی بشاشت طبع کے علاوہ ان کی ذہنی اور جسمانی تربیت کر کے تعلیم کے اصل مقصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہاں پر گذشتہ سال کی طرح اس سال بھی تعلیمی میلا منایا گیا۔ دو دن کے اس میلے کے لیے پندرہ دن پہلے سے ہی تیاریاں شروع کردی گئیں۔ طلبہ اور طالبات، اساتذہ اور کارکنان اس قدر جوش وخروش سے تیاریوں میں لگے پڑے تھے کہ پتا ہی نہ چلتا تھا کہ کب رات ختم ہوتی اور دن شروع ہوگیا۔ جامعہ کا یوم تاسیس ۲۹ر اکتوبر کو منایا جاتا ہے۔ پرچم کشائی کی رسم شیخ الجامعہ جناب انور جمال صاحب کے ہاتھوں ادا کی گئی۔ اس کے بعد جامعہ کی تریسٹھویں سالگرہ کی خوشی میں مڈل اسکول کے طلبہ طالبات نے پی، ٹی کا خوبصورت پروگرام پیش کیا۔ پی ٹی کے پروگرام کے بعد بچوں کی حکومت جامعہ مڈل کے زیر اہتمام اوپن ایر تھیٹر میں جلسہ ہوا۔ جس کی صدارت بچوں کی حکومت کے صدر جناب اظہر آصف انصاری نے کی اور وزیر اعظم تنویر اکرام نے پروگرام کو چلایا۔

یوم تاسیس کے جلسے کے اختتام پر شیخ جامعہ صاحب نے تعلیمی نمائش کا افتتاح کیا۔ جس میں بچوں کے مستقل پروجیکٹ بڑے خوبصورت انداز سے پیش کیے گئے تھے۔ سائنس روم میں بھی کئی مختصر سائنسی پروجیکٹ پیش کیے گئے تھے۔ یہ پروجیکٹ نمایش میں کافی مقبول ہوتے۔ مہمانوں نے ننھے کارکنان کی خوش اخلاقی کی کافی تعریف کی۔

کہانی سنانے اور نظم خوانی کا مقابلہ ½۲ بجے سے تھا۔ ننھے منے بچوں نے تصاویر کی مدد سے تتلا تتلا کر کہانیاں سنائیں اور بڑے بچوں نے زبانی کہانیاں بھی سنائیں۔ اس کے بعد کئی اسکولوں کے درمیان نظم خوانی کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے کو سامعین نے بہت پسند کیا اور دل کھول کر داد دی۔

جامعہ کے تعلیمی میلے کے موقع پر نہرو ٹرافی کے مقابلے ہوتے آرہے ہیں۔ اس سال مڈل اسکول کے زیر نگرانی ان مقابلوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ان مقابلوں میں گروپ سانگ ایکشن سانگ اور موقع پر مصوری وغیرہ کے مقابلے۔ ۳۰ر اکتوبر کو مرکزی پنڈال میں ہوئے۔ جج صاحبان کے نتائج آنے پر پتا چلا کہ مجموعی طور پر جامعہ مڈل اسکول اس ٹرافی کا مستحق قرار دیا گیا۔ لیکن جامعہ کی روایت کے مطابق جامعہ اس ٹرافی سے مستثنیٰ کردی گئی۔

گذشتہ سال کی طرح اس سال کے تعلیمی میلے نے صرف بچوں میں ہی امنگ پیدا نہیں کی بلکہ استادوں اور جامعہ کے پرانے اور نئے فارغ التحصیل طلبہ میں بھی ولولہ پیدا کیا۔ ان لوگوں کی طرف سے تمثیلی مشاعرے کا اعلان ہوا۔ ۳۰ر اکتوبر کی خنک رات کو ایسے شعرا کی تمثیلیں پیش کی گئیں جو بقید حیات ہیں۔ اور ایسے شعرا کی بھی جو راہی ملک عدم ہو چکے۔

تمثیلی مشاعرے کے علاوہ کچھ بڑے اور کم بوڑھوں نے بیت بازی کی تیاریاں شروع کیں۔ ۳۱ر اکتوبر کی رات کو ابنائے قدیم وجدید کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ ہوا۔ یہ مقابلہ حرف "ط" کے وجہ سے بہت جلد ہی ابنائے جدید کے حق میں جانے لگا۔ یہ دلچسپ سلسلہ قائم رکھنے کے لیے صدر محترم نے ۲۰ منٹ کے لیے ابنائے جدید پر روک لگا دی کہ وہ حرف "ط" پر ٹوٹنے والا کوئی شعر نہیں دیں گے۔ یہ وقفہ ختم ہوتے ہی فوراً "ط" کے اشعار ابنائے جدید کی طرف سے شروع ہو گئے۔ کچھ حضرات نے فی البدیہہ شعر کہہ کر سلسلہ قائم رکھنے کی کوشش کی مگر جلد ہی ابنائے جدید یہ مقابلہ جیت گئے۔

سراج الدین

ہمارے کھیل

آج کے زمانے میں کھیلوں کی اہمیت کا اعتراف ہونے لگا ہے۔ اور ملک کے ہر اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں کھیلوں کو باقاعدہ اسکول کے ٹائم ٹیبل میں جگہ دی جانے لگی ہے۔

ہمارے اسکول میں بھی کھیل باقاعدہ ہوتے ہیں۔ اسکول کے اوقات میں ہی طلبہ کھیل کے میدان میں جاتے ہیں، اور کھیل کھیلتے ہیں۔ چوں کہ کھیلنے سے صحت بنتی ہے۔ جسم میں توانائی اور چستی آتی ہے۔ اسی لیے اسکول کھلنے سے پہلے اور اس کے بعد جس چیز کی سب سے زیادہ فکر رہتی ہے وہ ہے کھیل، اور اس فکر کا غلبہ ہمارے بعض ساتھیوں پر اتنا رہتا ہے کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ پڑھنے لکھنے کو بالائے طاق رکھ کر ہر وقت کھیلتے رہیں لیکن اسکول آنے کا مقصد نہ صرف کھیل ہے۔ اور نہ صرف پڑھائی لکھائی بلکہ اسکول کے نظام میں ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے، اس مقررہ وقت پر ہی اس کام کو انجام دینا پڑتا ہے۔ لہٰذا ہمارے یہاں شام کا وقت یا یوں کہہ لیجیے عصر کی نماز کے فوراً بعد کھیل کا وقت مقرر ہے۔ جس میں ہمارے چاروں ہوسٹل کے ساتھی لائن بنا کر صدر دروازے پر جمع ہوتے ہیں۔ اور کھیل کا سامان وزیر کھیل سے لیتے ہیں۔

اسکول کھلنے کے فوراً بعد بے قاعدہ کھیل شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی ساتھی وزایسٹ ہوئے تو باقاعدہ فٹ بال کی چھوٹی بڑی ٹیمیں بنا دی جاتی ہیں۔ اور باقاعدہ مشق شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جب ہاتھ پیر کھلے تو ہوسٹل کے ساتھیوں کے درمیان مقابلہ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔ اور بورڈنگ، بورڈنگ کے بیچ مقابلے ہوتے رہتے ہیں۔ ہماری فٹ بال کی ٹیم ہمیشہ اپنے شاندار کھیل کا مظاہرہ کرتی رہتی ہے ہم فٹ بال کے میچ اپنے برابر والوں سے زیادہ اپنے بڑوں سے کھیلتے ہیں۔ یونیورسٹی ٹورنامینٹ کے ہر آئیٹم میں ہم ہر سال باقاعدہ حصّہ لیتے ہیں۔

مہینہ دو مہینہ گزرنے کے بعد کرکٹ کی مشق بھی شروع ہو جاتی ہے۔ کرکٹ کے کھیل کو بہتر بنانے کے لیے بچوں کی حکومت کی کوششوں سے نگران مدرسہ نے ہمارے لیے پختہ پچ تیار کرا دی ہے، اور اسی پچ پر مسلسل ہم مشق کرتے رہتے ہیں کرکٹ کے ساتھ ساتھ ہاکی کی مشق بھی شروع کر دی جاتی ہے۔ گذشتہ سال سے ہمارے اسکول میں باسکٹ بال کا کھیل بھی شروع ہو گیا ہے جس کے لیے پول گراؤنڈ اور مولڈنگ اسٹینڈرڈ کی گیندیں منگوائی گئیں۔ اور یہی نہیں بلکہ ایک اعزازی باسکٹ بال کوچ جناب حفیظ الرحمان کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ جنھوں نے بڑی محنت اور لگن سے ہمارے ساتھیوں کو کھیلنا سکھایا —— جناب یہ تھا۔ ہمارے کھیلوں کا ایک سرسری جائزہ جو میں نے مختصر طور پر بیان کیا ہے اور ایک ہلکی سی جھلک سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ہمارے اسکول کے ذمہ داروں کی توجہ کھیل پر بھی بھرپور رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کھیل کے علاوہ خدا گواہ ہے۔ اسپورٹس کے میدان میں بھی ہم کسی سے پیچھے نہیں۔ اس لیے ہم ہر مقابلے کے لیے اپنے آپ کو ہر وقت تیار رکھتے ہیں اور کھیل کے میدان میں اتر پڑتے ہیں وہ چاہے N.S.S. کے مقابلے ہوں یا جامعہ ایین کے، ہمارے ساتھی ہر آئیٹم میں حصّہ لے کر دلی مراد کو پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سال بھی N.S.S. کے مقابلوں میں ہمارے دو ساتھی عرفان العزیز اور محمد وحید نے انعامات حاصل کر کے اسکول کی شان کو دوبالا کیا۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا پتا صاف اور خریداری نمبر ضرور لکھیے اور جواب طلب امور کے لیے جوابی لفافہ یا کارڈ آنا ضروری ہے۔
(منیجر)

یاسر جلال

یومِ پیدائش

پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی ذاکر صاحب کی یوم پیدائش کی تقریب منانے کے لیے جمع ہوئے ہیں، اس تقریب کا اہتمام اس سال بھی بچوں کے سپرد کیا گیا ہے۔ وہ بچے جن سے زندگی بھر پیار کرتے رہے ان کو سہارا دینے اور اونچا اٹھانے کی کوشش کرتے رہے آج وہی بچے اپنے مرحوم رہنما کو خراج عقیدت اور ایصالِ ثواب پہنچانے کے لیے آگے آگے ہیں۔

حضرات آپ لوگ جانتے ہیں کہ ذاکر صاحب کو بچے بہت اچھے لگتے تھے چاہے وہ اپنے ہوں یا کسی اور کے، بچوں کے سلسلے میں ان کا عمل آنحضور کی مشہور حدیث کے عین مطابق تھا جس میں آپ نے فرمایا: "جو اپنے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور اپنے بڑوں کی عزت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں"۔ بچے ذاکر صاحب کے لیے پیارے تھے چاہے وہ کسی کے ہوں۔ جیسے ایک مرتبہ اپنے مالی کے لڑکے کے لیے جو پانچ، چھ سال کا تھا ذاکر صاحب نے گرم سوٹ سلوایا اسے بلا کر بڑے پیار سے اسے پہنایا اور پھر اسے دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔

بچوں سے یہ دلچسپی ان کی تعلیم و تربیت کی طرف میلان، جو بچپن سے ہی ذاکر صاحب کی طبیعت میں بے پناہ تھا، عملی شکل میں اس کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مڈل اسکول کی شکل میں نظر آتا ہے، اس اسکول میں انھوں نے بچوں کے لیے وہ تمام دلچسپیاں اور کام فراہم کیے جن کا ایک نمونے کے اسکول میں ہونا ضروری ہے جیسے بچوں کا خوانچہ، بچوں کا بینک، مرغی خانہ، بچوں کی دکان وغیرہ، یہی وجہ تھی کہ وہ بچوں میں بہت جلد گھل مل کر بیٹھتے تھے۔ ان سے باتیں کرتے تھے، کھیل کے میدان میں آجاتے بچوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے۔ کبھی نماز میں بچوں کے ساتھ ہوتے، اور کبھی ڈائننگ ہال میں۔

ذاکر صاحب میں لاتعداد خصوصیتیں تھیں۔ لیکن ان کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ غلط لوگوں کو سدھارنے میں بہت ماہر تھے اس سلسلے میں ہم آپ کو ایک واقعہ سناتے ہیں۔ کھانے کے سلسلے میں ذاکر صاحب نے مدرسہ ابتدائی کے بچوں کو ایک مرتبہ ایسا سبق دیا تھا کہ آج تک ہم اس سبق کو فراموش نہیں کر سکے واقعہ یہ ہے کہ ہوسٹل کے بچوں کو ان کے زمانے میں بینگن کے بھرتے سے بہت چڑ تھی نہ معلوم پکوان کی خرابی تھی یا ایک جیسی طبیعت کے لڑکے جمع ہو گئے تھے۔ ان کو بینگن بالکل پسند نہیں آتے تھے۔

ایک دن جب بچے کھانے کے کمرے میں پہنچے تو انھیں بینگن کا بھرتا نظر آیا بس پھر کیا تھا ہل چل مچ گئی اور سارا بھرتا ہڈی دان میں ڈال دیا گیا۔ لڑکوں نے کچھ روٹی کے ٹکڑے بھی ڈال دیے اور کسی نے پانی بھی، اتفاق سے اس دن ذاکر صاحب آنکلے ڈائننگ ہال کا ادھر سے ادھر چکر لگایا۔ ایک میز چنی اور دری پر بیٹھ گیے۔ چاروں طرف دیکھا اور ہڈی دان کو اپنے سامنے رکھ کر کھانا شروع کیا۔ کسی لڑکے نے ہمت کر کے پوچھا، تو ذاکر صاحب نے جواب دیا: "آپ لوگوں کو نہیں معلوم کہ آپ کے ملک میں بلکہ آپ کے شہر میں یا شاید آپ کے آس پاس کے اسی بستی میں کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو اگر یہ بھی کھانے کو مل جائے، جو آپ نے پھینکا ہے تو وہ آج رات بھوکے نہ سوئیں گے۔ آپ نے اس کھانے کو پلیٹ میں ڈال کر اس میں پانی اور روٹی کے ٹکڑے ملا کر اس قابل بھی نہیں چھوڑا کہ کسی کو دیا جا سکے اور اس کے کام آسکے میں نے سوچا کہ اگر میں اسے کھا لوں تو کم سے کم میرا اپنا کھانا کسی اور بھوکے کو دیا جا سکتا ہے۔" پھر تھوڑی دیر تک وہ یہ بھی جاتے رہے کہ گیہوں جس کی روٹی وہ کھا رہے تھے۔ کس پریشانی سے

ملتا ہے۔ دیکھا آپ نے کتنا اچھا طریقہ تھا۔ بچوں کو سمجھانے اور تربیت دینے کا۔

ذاکر حسین صاحب کو گندگی سے سخت نفرت تھی وہ اپنے طالب علموں کو بھی صاف رہنے کی ہدایت کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ خود بھی صاف رہو اور اپنی کلاس کو بھی صاف رکھو۔ ایک دن کلاس میں آئے تو کچھ ناراض سے نظر آرہے تھے۔ آتے ہی شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ بچے دم سادھے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنی جیب سے کاغذ کے ٹکڑے نکالے اور آخر میں لڑکوں سے بولے: "یہ سب کوڑا مجھے گھر سے آتے ہوئے راستے میں ملا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوا۔ یہ علم کا مقدس مرکز ہے۔ اسے صاف رکھنا آپ کا پہلا فرض ہے۔"

اسی طرح ذاکر حسین صاحب نے مدرسہ ابتدائی کے بچوں سے کہا کہ اسکول آنے سے پہلے جوتے پالش کر لیا کریں۔ اگلے دن کئی طالب علموں کے جوتے گندے تھے۔ انھیں بہت برا لگا۔ اس کے دوسرے دن اسکول کے پھاٹک پر بیٹھ گئے آنے والے ہر لڑکے کا جوتا دیکھا جس کا جوتا صاف نہیں تھا اسے وہیں روک کر اس کا جوتا اتروالیا خود پالش کر کے اسے اندر بھیجا طالب علموں کے لیے یہ بہت بڑا سبق تھا اس دن کے بعد سے سبھی لڑکے جوتے پر پالش کر کے آنے لگے۔

ذاکر صاحب نے بچوں کے ادب کی طرف بھی توجہ کی ان کے لیے کہانیاں بھی لکھنا شروع کیں جب کہ بڑے اور مشہور ادیب اسے اپنی حیثیت سے کم تر سمجھتے تھے۔ کہانیوں کی زبان بالکل بچوں کی ہے اور موضوع بھی بچوں کی پسند کا، لیکن بات اتنی گہری کہہ جاتے تھے کہ بڑے بھی انھیں پڑھ کر سوچنے لگیں ان کی کہانیوں کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں نصیحت نہیں کی جاتی بلکہ اس کے بیان سے ہی مقصد پورا ہو جاتا ہے بس کہانی بیان کر دی اور بچے کو اس مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں سے وہ خود سب کچھ سمجھ سکتا ہے۔

پہلے ذاکر حسین اپنے دوستوں ساتھیوں اور جامعہ ملیہ کے بچوں کے تھے پھر جوں جوں ان کا درجہ بڑھتا گیا۔ بچوں کا یہ حلقہ بھی بڑھتا گیا، اور آخر میں جیسا خود انھوں نے کہا تھا کہ سارا بھارت میرا گھر ہے اور اس کے لوگ میرا کنبہ۔ اس ناتے سارے ہندستان کے بچے ان کے بچے تھے وہ ہر ایک کی عزت کرتے تھے اور بچے بھی ان سے اتنی ہی محبت کرتے تھے۔ متعدد مرتبہ یہ خوبصورت نظارہ دکھائی دیا کہ بیچ میں ذاکر صاحب کھڑے ہیں اور ان کے چاروں طرف بچے ہیں۔

دراصل وہ بچوں کو خدا کی امانت اور قوم کی پونجی سمجھتے تھے یتیم بچوں کو دیکھ کر ان کا دل بھر آتا تھا۔ اس لیے دریا گنج میں ان کی کوششوں سے ایک یتیم خانہ کھولا گیا جس کا نام "بچوں کا گھر" رکھا گیا۔ ذاکر حسین شروع ہی سے ہندستان کے بچوں کو آزادی کا سپاہی، وطن پر جان دینے والا، اچھا اور سچا انسان بنانے کا مقدس کام اپنے ذمے لیا تھا وہ بچوں کے دل میں آزادی کی لگن، پیدا کرتے۔ دیس کی خدمت کا جذبہ پھیلاتے اور یہ باتیں صرف زبانی یا کتابی نہیں تھیں بلکہ خود ذاکر حسین کی ذات ان بچوں کے لیے نمونہ تھی' نور کا ایک مینار تھی جو ہر طرف اپنی روشنی بکھیرتا تھا۔ انھوں نے ایک مرتبہ مدرسہ ابتدائی کے بچوں سے کیا خوب کہا تھا: "یہ درسگاہ تمھیں یہ بھی سکھانا چاہتی ہے کہ تم سچے اور اچھے ہوگے، دھن کے پکے ہوگے، بروں کے لیے لوہا ہوگے، اچھوں کے لیے موم ہوگے، غریبوں کا سہارا ہوگے، دیانت دار ہوگے، بے کسوں کا آسرا ہوگے، سوتوں کو جگاؤ گے، ڈوبتوں کو تیراؤ گے، غریب ہوگے تو بھی سیر چشم ہوگے، دوسروں کی دولت کو منہ پھیر کر نہ دیکھو گے، امیر ہوگے تو اپنی دولت کو خدا کی امانت سمجھو گے اور اس کو خدا کے بندوں پر خرچ کرو گے تم جہاں بھی ہوگے اپنے ساتھیوں کے لیے پڑوسیوں کے لیے رحمت ہوگے۔"

ذاکر صاحب کی یہی تعلیم تھی جو نہ صرف جامعہ کے بچوں کے لیے تھی بلکہ یہ ایسی تعلیم ہے جو ہمیشہ اور ہر زمانے میں رہے گی۔ اس کی روشنی میں ہر شخص اپنے دیس میں، دنیا میں حسن پیدا کر سکتا ہے وہ حسن جو خدا کا نور ہے، وہ حسن جو دنیا کو جنت بنا سکتا ہے خدا کرے کہ ہم بھی ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں، اور ہم اپنے آپ کو اپنے دیس کو زیادہ حسین اور بامقصد بنا سکیں۔

ریاض الدین انصاری
متعلم درجہ ہشتم

یوم تاسیس

جناب صدر خواتین حضرات!

جامعہ کو قائم ہوئے آج ۶۲ سال ہو گئے ہیں۔ جامعہ کی یہ ۶۲ سالہ کہانی بہت دلچسپ اور کافی طویل ہے۔ میں آپ کو اس کہانی کا صرف ابتدائی حصہ جو ۲۵ سالوں میں بکھرا ہوا ہے سنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

جب ہندستان انگریزوں کے ہاتھ میں آیا تو انھیں فکر ہوئی کہ ہم نے اپنا راج تو کسی نہ کسی طرح سے قائم کر لیا مگر اس کی جڑیں مضبوط نہیں ہیں اس لیے انھوں نے ہندستانیوں کی تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پورے دیش میں انگریزی تعلیم پھیلائی۔ ہندستان کے مسلمان پہلے تو انگریزی سے بھاگتے تھے مگر جب سرسید احمد خاں نے علی گڑھ کالج قائم کیا اور کہا کہ یہاں انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ دین کی تعلیم بھی دی جائے گی۔ اور اس کالج کو مسلمان ہی چلائیں گے۔ تو بہت سے مسلمانوں نے اپنے بچوں کو اس کالج میں بھیج دیا۔ نئی تعلیم سے مسلمانوں کو ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ کچھ لوگوں کو سرکاری نوکریاں مل گئیں اور کچھ لوگ وکیل بن کر پیٹ بھرنے لگے۔ مگر سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ نئی تعلیم سے مسلمان یہ بھی جان گئے کہ اگر تعلیم کا نظام انگریزوں کے ہی ہاتھ رہا تو آنے والے طلبہ اپنے دین کو اپنے بھیس کو اور اپنی بولی کو بھلا دیں گے۔ جب سرسید اللہ کو پیارے ہو گئے تو مسلمان رہنما یہ کوشش کرتے رہے کہ سرسید کا خواب پورا ہو اور علی گڑھ کالج آزاد یونیورسٹی بن جائے جس پر انگریزوں کا قبضہ نہ ہو مگر یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور مسلمانوں کی تعلیم انگریزوں کے ہاتھ میں ہی رہی۔ اس لیے مسلمانوں نے سوچا کہ ایک الگ ادارہ قائم کیا جائے جس میں ایسی تعلیم ہو جو مسلمانوں کے کام آسکے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی اور مسلمانوں کے اور بھی بہت سے رہنما اس بات پر راضی ہو گئے کہ ہاں ہم کو مسلمان بچوں کے لیے الگ ادارہ کھولنا چاہیے۔

ان رہنماؤں میں سے سب سے پہلے مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک آزاد یونیورسٹی کھولنے کی تجویز پیش کی۔ گاندھی جی نے بھی جامعہ کھولنے کی تائید کی، اور مولانا کی مدد بھی کی۔ علی گڑھ کالج کے نوجوانوں نے مولانا محمد علی کی اس تجویز کو مان لیا۔ اور ۱۹۲۰ء میں ۲۹ اکتوبر کو علی گڑھ کالج کے یہ نوجوان طلبہ اساتذہ کالج کی مسجد میں جمع ہوتے۔ پہلے مولانا محمد علی نے تقریر کی۔ جس میں بتایا کہ ہم جامعہ اس مقصد سے کھول رہے ہیں کہ یہاں سے بچے خدا پرست مسلمان اور وطن پرور ہندستانی پیدا ہوں۔

اس تقریر کے بعد بہت بڑے عالم اور بزرگ مولانا محمود الحسن کے مبارک ہاتھوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح ہوا۔ مسلمانوں میں اور پورے دیش میں اس کی دھوم مچ گئی۔

مولانا محمد علی نے علی گڑھ میں لال ڈگی کے مقام پر کچھ خیمے لگوائے اور یہیں جامعہ کالج کی کلاسیں ہونے لگیں۔ کچھ دن بعد کالج کے ساتھ ایک اسکول بھی کھول دیا گیا۔ مولانا محمد علی جامعہ کے پہلے شیخ الجامعہ بنائے گئے۔ اور حکیم اجمل خان پہلے امیر جامعہ۔

علی گڑھ میں چار سال رہنے کے بعد جامعہ ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ سے قرول باغ (دہلی) آگئی۔ اس وقت جامعہ کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی تھی اور قریب تھا کہ جامعہ بند ہو جائے۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پروفیسر محمد مجیب صاحب

اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب جرمنی سے اپنی تعلیم پوری کر کے لوٹے تو ان لوگوں کے آتے ہی جامعہ میں پھر سے جان پڑ گئی۔ ذاکر صاحب شیخ الجامعہ بنائے گئے۔ اور ذاکر صاحب نے اور جامعہ کے دوسرے استادوں نے ایک عہد نامے پر دستخط کیے۔ کہ وہ لوگ کم از کم بیس سال تک ۱۵۰ روپے ماہانہ تنخواہ پر جامعہ کی خدمت کرتے رہیں گے۔ حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری اور خواجہ عبدالحمید صاحبان نے بھی تن من دھن سے جامعہ کی مدد کی اسی زمانے میں جامعہ کے استادوں کو کئی مہینے سے تنخواہ نہیں ملی تھی حکیم اجمل خان رامپور گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے لوٹے اور ان کو معلوم ہوا کہ جامعہ کے استادوں کو تنخواہ نہیں ملی ہے تو اپنے منشی اخلاق حسین کو گھر میں سے یاقوت کی انگوٹھی لا کر دی۔ اور کہا کہ اس انگوٹھی کو بیچ کر جامعہ کے استادوں کو تنخواہ تقسیم کر دو۔ منشی اخلاق حسین نے واپس آکر بتایا کہ دہلی کا کوئی جوہری پانچ ہزار روپے سے زیادہ دام نہیں لگاتا۔ جب کہ انگوٹھی کی قیمت سات ہزار روپے ہے حکیم صاحب نے کہا کہ آگرہ جا کر وہاں کے جوہریوں کو دکھاؤ اسی دوران حکیم صاحب کو ایک ریاست سے علاج کے سلسلے میں ۷ ہزار روپے ملے تو آپ نے فوراً جامعہ کے استادوں کو تنخواہ بٹوا دی اسی طرح ڈاکٹر انصاری نے بھی اپنی زندگی جامعہ کے لیے قربان کر دی۔ ڈاکٹر انصاری کو یقین ہو گیا تھا کہ نئے ہندستان کے لیے نئے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ ایسے آدمیوں کو جو اپنی اچھی چیزوں پر بھروسا رکھیں۔ انھیں برتیں، انھیں ترقی دیں تاکہ دوسروں کی اچھی باتوں کو سمجھیں اور ان کی عزت کریں۔ خود مضبوط ہوں اور دوسروں کی مضبوطی سے ڈریں نہیں۔ مانگیں بھی نہیں دینے کو کچھ رکھتے ہوں۔ اور دینے کی کچھ ہمت بھی۔ مسلمانوں میں ایسے آدمی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے اپنی امیدیں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے باندھی تھیں۔ ہاں تو ان لوگوں کی مدد سے جامعہ کی حالت سدھر گئی۔ لڑکوں کی تعداد بڑھی، اور استادوں میں بھی نئے نئے لوگ آئے۔ اب جامعہ نے قرول باغ میں اپنی ایک عمارت بنوائی جس کا نام "تعلیمی مرکز" رکھا گیا۔ جامعہ کا کام پھیلا اور نئے نئے شعبے کھولے گئے۔

۱۹۳۶ء میں جامعہ قرول باغ سے اوکھلا کے قریب آگئی۔ جامعہ نگر کی نئی بستی میں سب سے پہلے مدرسہ ابتدائی کی موجودہ عمارت بنی۔ اس عمارت کی بنیاد جامعہ کے سب سے چھوٹے طالب علم سے رکھوائی گئی تھی۔ ابتدائی کے بعد مدرسہ ثانوی کی عمارت بنی۔ اور ۱۹۴۴ء تک پوری جامعہ جامعہ نگر میں آگئی۔ یہاں آکر جامعہ نے خوب ترقی کی۔ پڑھائی کا ڈھنگ بھی بدلا گیا۔ بڑی عمر کے لوگوں کی تعلیم کے لیے نیا ادارہ "تعلیم و ترقی" قائم ہوا۔

بورڈنگوں کی حالت ٹھیک کی گئی۔ طالب علموں کی تربیت کا یوں تو پہلے ہی سے خیال رکھا جاتا تھا، مگر اس زمانے میں تربیت پر خاص زور دیا جانے لگا۔ جامعہ نے استادوں کو نئی تعلیم کے طریقے سکھانے کے لیے ایک استادوں کا مدرسہ کھولا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو جامعہ کی زندگی کے پچیس سال پورے ہوتے تو جامعہ کی جبلی بڑی شان سے منائی گئی۔ دیش کے بہت سے رہنما اور تعلیم کا کام کرنے والے جامعہ میں جمع ہوتے ذاکر صاحب نے ملک والوں کو بتایا کہ جامعہ کیا کیا کر چکی ہے، اور کیا کرنا چاہتی ہے۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اگر عمر کے ان تھوڑے سے دنوں میں جو شاید ابھی حصے میں ہوں اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں آتا ہے۔ جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں۔ دیکھ کر سیکھ سکیں۔ برت کر اپنا سکیں۔ اور سنوار سکیں۔ جہاں ان کے بے شمار تعلیمی اور تمدنی مسئلوں پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے۔ جہاں شخصیت کی نشو و نما کا سامان ہو جہاں قوم کی نئی نسل دلکش اور زندگی کی ہم آہنگ فضائیں پرورش پائیں۔ اور رحمۃ للعالمین کے چمن کے نونہال بار آور سایہ دار درخت بنیں۔ یوں پھلیں پھولیں۔ کہ ان کے فیض سے سارا ماحول

مستفیض ہو۔ اور ہر طرف اپنی تحقیق اور اچھی زندگی کے موتی بکھیر سکیں کہ یہ دولت لٹانے سے ہی بڑھتی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ذاکر صاحب مرحوم کے دل سے نکلی ہوئی یہ باتیں کافی حد تک پوری ہوئیں۔ اور جامعہ نگر کی اس تعلیمی بستی نے جیسا کہ آپ جانتے ہیں دنیا سے علم و ادب میں ایک مقام پیدا کر لیا۔ لیکن جامعہ کی یہ خصوصیت اور جامعہ کی یہ شہرت اس وقت باقی رہ سکتی ہے جب ایثار و قربانی ان تھک محنت اور سعی و عمل کی شاندار روایات کو باقی رکھا جائے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں کی خدمات سے سبق حاصل کیا جائے۔ جنھوں نے جامعہ کو قائم رکھنے کی دھن میں اپنے آرام و راحت کا خیال نہیں کیا جن کے بیوی بچے اچھے کپڑے اور اچھی غذا کو ترستے رہے۔ لیکن وہ خود قوم کے بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت میں لگے رہے۔ اگر ہم ایسا کر سکیں تو کچھ عجب نہیں کہ جامعہ کے اس موجودہ خزاں رسیدہ چمن میں ایک بار پھر سے بہار آ جائے۔

ریحانہ اسد۔ متعلمہ درجہ ششم

یوم شہادت

گاندھی جی گھٹیا سے گھٹیا کام کو کرنے میں ذرا نہ شرماتے تھے۔ اونچ اور نیچ کے فرق کو بہت برا سمجھتے تھے۔ ان کو چمار، نوکر باورچی، درزی، نرس، جولاہا یا کسان بن کر کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ وہ اپنی آشرم کی زندگی میں یہ سب کام باہر سے آنے والے مہمانوں کے سامنے بھی برابر کرتے رہتے تھے۔ جس سے یہ پتا چلے کہ یہ سب پیشے عزت کے لائق ہیں۔ وہ ہر قسم کے ہاتھ کے کام کو اور اس کام کے کرنے والوں کو دیس کا معمار کہتے تھے۔ گاندھی جی نے اپنے عمل سے لوگوں کو اٹھایا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

(۲)

ایک مرتبہ کانگریس کے لیڈر گاندھی جی سے مشورہ کرنے سیواگرام آشرم گئے۔ جس وقت وہ لوگ وہاں پہنچے اس وقت گاندھی جی آشرم کے دو بیمار ساتھیوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ گاندھی جی نے ان سے کہا، اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ تم کو یہ سب کچھ خود ہی کرنا ہے۔ آج بھی گاؤں کے چار سو آدمیوں میں سے تین سو تم کو بیمار ہی ملیں گے۔

(۳)

ایک مجسٹریٹ نے جیل میں گاندھی جی سے پوچھا کہ آپ کیا کام کرتے ہیں؟ یعنی آپ کا پیشہ کیا ہے؟ گاندھی جی نے جواب دیا۔ میں ایک کسان اور جولاہا ہوں۔

(۴)

گاندھی جی کو دیس کے لیے جیل میں جاتے وقت کوئی پریشانی نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ کتائی کا سامان لے جا

اور اپنے پروگرام کے مطابق جیل میں بھی کتائی کر کے سوت تیار کرتے۔ اس طرح گاندھی جی جہاں رہتے وہیں ان کا آشرم بن جاتا۔

-:۵:-

افریقہ میں انھوں نے اپنا جو آشرم کھولا تھا اس میں وہ سب کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ وہاں پر وہ ایک پکے کسان بن گئے تھے۔ وہ روزانہ کھیتوں میں کئی گھنٹے ہل چلاتے انھیں جو کام اس آشرم میں ملتا وہ اسے اوروں سے پہلے پورا کر ڈالتے تھے۔

-:۶:-

آشرم میں گاندھی جی وہ سب کام کرتے تھے جس کو لوگ عام طور پر دوسروں سے کراتے تھے۔ وہ اپنے لیے اپنی بیوی بچوں کے لیے آٹا پیستے، کپڑے دھوتے، جھاڑو لگاتے، برتن دھوتے، پاخانہ اٹھاتے، وہ اس طرح کے کاموں سے بالکل شرماتے یا گھبراتے نہیں تھے۔ ان کے آشرم میں رہنے والوں کو یہ سب کام کرنے پڑتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک انگریز ان سے آشرم میں ملنے آیا۔ اس نے گاندھی جی سے کہا مجھے بھی کوئی کام بتایئے۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ مجھے گاندھی جی لکھنے پڑھنے کا کام دیں گے مگر اس کے بجائے گاندھی جی نے اسے ایک تھالی گیہوں پیسنے کے لیے کہا جس کو اس نے بڑی مشکل سے پورا کیا۔

-:۷:-

کیروداجیل میں گاندھی جی کے ساتھ سردار پٹیل بھی قید کیے گئے تھے۔ ان کی چپلیں ٹوٹ گئی تھیں۔ گاندھی جی نے ان سے کہا کہ میں تمھاری چپلیں بنا دوں گا ان کے لیے چمڑا منگالو۔ میں نے یہ کام افریقہ میں سیکھا ہے چپل بنانے کا یہ کام میں بہت اچھا کر سکتا ہوں اس پر سردار پٹیل نے کہا میں ان کو پہنوں گا نہیں بلکہ اپنے سر پر رکھے پھروں گا۔

-:۸:-

گاندھی جی کی پوتی منو بہن گاندھی لکھتی ہیں کہ میرے پاس پشمینے کی ایک گرم شال تھی جس کو باپو اوڑھا کرتے تھے۔ جب وہ جگہ جگہ سے پھٹ گئی تو میں نے اسے پھینکنا چاہا مگر باپو نے اس کو رات کے بارہ بجے تک بیٹھ کر سیا اور اس میں کئی پیوند لگا کر اسے ٹھیک کر لیا پھر ہر جگہ سفر میں وہی پیوند لگی شال استعمال کرتے رہے اور مجھے یہ کہہ کر برابر چھیڑتے رہے کہ دیکھو میں کیا اچھا درزی ہوں۔ بتا کیا میں اچھا نہیں سیتا؟ اس شال کو میں نے یادگار کے طور پر بڑی احتیاط سے رکھ چھوڑا ہے۔

-:۹:-

گاندھی جی اپنے ہاتھ سے پکا کر کھانے کو اہمیت دیتے تھے انھوں نے اپنے افریقہ اور ہندستان کے آشرموں میں کبھی کوئی باورچی نہ رکھا۔ وہ کہتے تھے، کھانا ذائقے کے لیے نہیں بلکہ تندرستی قائم رکھنے کے لیے کھایا جاتا ہے جب وہ انگلستان میں پڑھتے تھے۔ اس وقت سے ہی ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی۔ اور وہ ایک اچھے باورچی بن گئے تھے۔ گاندھی جی نے ایک مرتبہ بچوں کے نمونے کا ایک بورڈنگ اسکول میں دیکھا جس میں بچوں کا ایک ڈائننگ ہال بھی تھا۔ انھوں نے بچوں سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس ڈائننگ ہال میں جو کچھ کھائیں وہ اپنے ہاتھ سے پکا کر کھائیں۔

ہمیں چاہیے کہ ہم بھی گاندھی جی کی مثال کو اپنے سامنے رکھیں اور اپنی ضرورت کے چھوٹے موٹے کاموں کو خود کرنے کی عادت ڈالیں اور جو لوگ اس قسم کے کام پیشے کے طور پر کرتے ہیں۔ ان کو اپنے سے کم نہ سمجھیں بلکہ انھیں ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔

مرزا ظفر بیگ

الوداعی پارٹی

محترم شیخ الجامعہ صاحب، اساتذہ صاحبان اور ساتھیو!

یہ دنیا بڑی سنگ دل اور ظالم ہے، اس کا معمولی کرشمہ ہے کہ ایک گھر میں خوشی کے شادیانے بجواتی ہے اور دوسرے گھر میں ماتم کراتی ہے ایک جگہ ہزاروں مشعلیں روشن کراتی ہے اور دوسری جگہ ٹمٹماتے چراغ کو گُل کر کے ہی قرار لیتی ہے، ایک جگہ خوشی کے چہچہے ہیں تو دوسری جگہ رنج و غم کے ناقابل برداشت نالے لیکن ان سے بھی زیادہ جگر چاک کرنے والا یہ آج کا دن ہے کہ برسوں کے ساتھی ہم سے بچھڑ رہے ہیں اور ہم انھیں الوداع کہنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ کیا کیا جائے، وقت کے سامنے ہر چیز مجبور ہے، آسمان مجبور ہے، شمس و قمر مجبور ہیں۔

دوستو! ہمارے اسکول کی یہ شاندار روایت رہی ہے، کہ وہ ہر سال اپنے رُخصت ہونے کا جگر پاروں کی یعنی آٹھویں جماعت کے طلبہ کو بڑی شان اور اہتمام سے رخصت کیا کرتا ہے، اسی لیے آج ہم نے بھی یہ اہتمام کیا ہے جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہو رہا ہے۔

حسین شاہد

الوداعی مضمون

ساتویں جماعت کی طرف سے

اے میرے اسکول کے ساتھیو، بہنو اور بھائیو آج ہم ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے ہیں۔ یہ الوداع کہتے ہوئے ہم ساتویں کلاس کے لڑکے اور لڑکیاں بے حد غمگین بھی ہیں، بہت رنجیدہ بھی ہیں۔ بہت تکلیف بھی محسوس کر رہے ہیں لیکن اس غم میں رنج میں اور اس تکلیف میں ایک درجہ مسرت کی ہلکی سی لہر بھی شامل ہے۔ غم۔ رنج۔ تکلیف ظاہر ہے کہ آپ کے چھوٹنے کا بھلا ہم وہ سماں کس طرح آسانی سے بُھلا سکتے ہیں، جبکہ ہم اور آپ (یعنی آٹھویں کلاس کے طلبہ اور طالبات) اپنے اسکول کے لان میں، اپنے اسکول کی فیلڈ میں وقفے کے دوران ایک دوسرے سے ملتے، ساتھ کھیلتے، باتیں کرتے۔ کام کی باتیں بھی پڑھائی سے متعلق بھی اور بے کار باتیں بھی آپ کو یاد ہوگا کہ اُن بے کار باتوں میں کتنا مزا آتا تھا۔ تک بے تک ہانک رہے ہیں، طرح طرح کی حرکتیں ہاتھ پیر سے اور منہ بنا بنا کر کر رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ سب خوش ہیں سب شاد ہیں۔ ہاں ایک ہلکا سا احساسِ برتری اگلی کلاس میں ہونے سے آپ حضرات میں سے کچھ، وہ بھی کبھی کبھی محسوس کیا کرتے اور آپس میں دوستوں کے گلے کے طور پر کہہ لیتے۔ بات آئی گئی ہو جاتی اور ہاں آپ لوگوں میں سے کبھی کوئی کسی کا دوست روٹھ بھی جاتا مگر وہ روٹھنا بھی ایک اپنے گویا حق کے ساتھ ہوتا۔

اس روٹھنے میں کس قدر لطف ہوتا، اس منانے میں کس قدر لذت ہوتی کہ کاغذ پر بیان نہیں کی جا سکتی محض سمجھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ جس نے اس لذت کا مزا چکھا ہوگا وہی جانتا ہے۔ اب یہ واقعات جدائی کے احساس سے ایک داستان سی معلوم ہوتے ہیں، ایک دُور کی سی آواز لگتی ہے کیوں کیا آپ لوگوں کے دلوں میں بھی اسی طرح کے احساس، اسی قسم کے جذبات اور اسی طرح کی یادیں کروٹیں لے رہی ہیں؛ ہے نا یہ بات! آپ کے لبوں کی ہلکی سی مسکراہٹ اس بات کا پتا دے رہی ہے کہ ہم نے بھید کھول دیا ہے۔ دل نے دل کی بات جان لی ہے، پہچان لی ہے۔ اب تو اقرار کرلو۔ ایسا نا بھئی۔ اور ہاں وہ مسرت کی لہروالی بات رہ گئی۔ ہمیں جہاں رنج ہے آپ سے جدا ہونے کا وہاں آپ کی ترقی سے مسرت بھی ہے۔ آپ لوگ اگلی کلاس میں پہنچ جائیں گے۔ کون پہنچ جائیں گے؛ ہمارے دوست، ہمارے ساتھی۔ اس لیے آپ حضرات کی جدائی کا ہمیں رنج ضرور ہے مگر صدمہ نہیں۔ احساس ضرور ہے مگر قلق نہیں، ہم آپ کی خاطر یہ رنج بھی خوشی سے سہہ لیں گے۔ یہ تکلیف بھی گوارا کرلیں گے۔

طبیعت کو ہوگا قلق چند روز
بہلتے بہلتے بہل جائے گی

دل چاہتا ہے کہ اس گنگا جمنی رنج و مسرت کے درمیان ہم آپ کا آخری بار دیدار کریں اور ایک دوسرے سے کچھ عرصے بعد ملنے کی توقع لیے ہوئے رنج و خوشی کے ملے ہوئے جذبات کے ساتھ رخصت ہوں۔ خدا آپ کو زندگی بھر کامیابیاں دے اور تعلیم کی لگن عطا کرے۔ خدا آپ کا نگہبان ہو، مددگار ہو آپ کا معاون ہو۔

اُن کو رخصت کر کے تا حدِ نظر دیکھا کیے
اُس طرف دیکھا نہ جاتا تھا مگر دیکھا کیے

خدا حافظ

قیام الدین

الوداعی مضمون

(آٹھویں جماعت کی طرف سے)

محترم اساتذہ صاحبان اور ساتھیو!

اسکول کی روایت کے مطابق آج درجہ ہشتم کے طلبہ اور طالبات کو خدا حافظ کہنے کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ جدائی کے تصور سے ہی انسان کا دل کانپ جاتا ہے لیکن دکھانا اور کر کے دکھانا، ہمارے اسکول کی ایک امتیازی خصوصیت ہے، اس لیے آج بھی ہم روایت کے مطابق اس طرح وداع ہوں کہ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی غم کا اظہار کرے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہماری دلی خوشی کو ظاہر کرنے والی ہو۔

زمانہ ہمیشہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ آج ایسا زمانہ آپہنچا کہ ایک حالت پر رہنا سب سے بڑا خسارہ ہے۔ اسی لیے زندگی کی بہت سی عزیز چیزوں کو ضرورت کے مطابق چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اس لیے آج ہم پر بھی مسرت اور رنج کی ملی جلی کیفیات طاری ہیں۔ رنج اس بات کا ہے کہ آج ہم اپنے اس اسکول سے جدا ہو رہے ہیں۔ جہاں ہم میں سے اکثر ساتھیوں نے آٹھ سال گزارے۔ اسکول کا چپّہ چپّہ اور کونا کونا ہمارے بچپن کی شوخیوں اور شرارتوں سے نہ صرف واقف ہے بلکہ یہاں کا ذرّہ ذرّہ شاہد ہے۔ اس کے باوجود ترقی کی بڑھتی ہوئی منزل ہمیں پکار پکار کر اپنی طرف بلا رہی ہے اور ہم رنج والم کے پیکر بنے۔ والہانہ طور

پر اس کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔

محترم اساتذہ صاحبان!

تعلیم اور تربیت کے سلسلے میں ابتدائی منزل کو کافی اہمیت دی جاتی ہے۔ چونکہ مضبوط اور پایہ دار عمارت کا قیام کسی مضبوط بنیاد پر ہی ہوسکتا ہے۔ اکا دکا ایسی مثالیں ڈھونڈنے سے ملیں گی کہ کوئی طالب علم جس کی شروع کی تعلیم اچھی نہ ہو، آگے بڑھ کر وہ اچھا طالب علم ثابت ہوا ہو برخلاف اس کے وہ طالب علم اچھا ثابت ہوتا ہے اور کامیابی اس کے قدم چومتی ہے، جس نے اپنی ابتدائی تعلیم کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ لہذا ہم آپ کے دل سے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہماری تعلیم و تربیت کے سلسلے میں جو پُرخلوص کوششیں کی ہیں۔ ان کی یاد ہمارے دلوں میں صدا جگمگاتی رہے گی۔ ہمیں یاد ہے کہ آپ نے مدرسہ میں ہم کو گھر جیسی اپنائیت دی۔ سدا ہماری غلطیوں کو معاف کیا اور کبھی اتفاق سے اگر ہم سے اچھا کام ہو گیا تو اس کی بے حد تعریف کرکے ہماری ہمت افزائی کی۔ ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں ہمارے پاس ایسے الفاظ نہیں جن میں آپ کے احسانات کو بیان کر سکیں۔

عزیز ساتھیو! اس اسکول میں ہم اور آپ نے برسوں ساتھ ساتھ زندگی گزاری ہے۔ جماعت کا کمرہ ہو یا کھیل کا میدان، جلسہ جلوس کے مواقع ہوں یا بچوں کی حکومت کا کوئی پروگرام، ہر موقعے پر ہم نے بھائی چارہ قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مدرسہ کی چہار دیواری کے باہر بھی ایک خاندان کا نمونہ پیش کیا ہے۔ الیکشن کے موقع پر ایک دوسرے کے خلاف نعرے بھی لگائے۔ لیکن کامیاب ہونے والے ساتھی کو مبارک باد دی اور ہار بھی پہنائے اور ایک دوسرے کی غلطیوں کو سچے دل سے معاف کرنے میں پہل کی ہے۔

ساتھیو! جانے والوں سے کوئی ناراض نہیں ہوتا۔ ان کی غلطیوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے اس لیے آپ بھی ہمیں خوشی خوشی اجازت دیجیے اور ہمارے لیے دعا کیجیے کہ خدا ہمیں نئی دنیا میں خوش و خرم رکھے۔

عزیز دوستو! ہم جا رہے ہیں ہم نے اسکول اور اس کے معیار کو آگے بڑھانے کے لیے کچھ پروگرام بنائے تھے لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے کچھ کام ادھورے رہ گئے ہیں امید ہے آپ ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ ہماری اچھائیوں کو اپنائیں گے اور ہم بھی وعدہ کرتے ہیں کہ ہم جہاں بھی رہیں گے یہاں کی روایت کو کبھی فراموش نہیں کریں گے اور اپنے آپ کو اپنے قول و فعل سے جامعی ثابت کریں گے۔ آخر میں میں ایک بار پھر آپ سب حضرات کا شکرگزار ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ہم سب کو خدا ہمارے اچھے مقاصد میں کامیاب کرے۔ آمین

بہجت سلطان

الوداعی مضمون ۲

آٹھویں جماعت کی طرف سے

محترم نگراں صاحب، اساتذۂ کرام، عزیز ساتھیو!

ہم جس ادبی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں اس میں کلیوں کا مسکرانا، شبنم کا آنسو گرانا اور چاند تاروں کا آنکھ مچولی کھیلنا یہ سب وہ باتیں ہیں جو تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں کو پیغام بیداری دیتی رہتی ہیں۔

دوستو! جب کسی بادشاہ کا خادم تاج میں لگانے کے لیے ایک کھلا ہوا پھول باغ سے توڑنے کے لیے جاتا ہے تو پھول سمجھ لیتا ہے کہ آنے والا صیاد مجھے ہی شکار

کرنا چاہتا ہے اور افسوس اب میں اپنی ٹہنی سے جدا ہو جاؤں گا، میرا وطن مجھ سے چھوٹ جائے گا میرے ہم جولی مجھ سے چھوٹ جائیں گے۔ جس شاخ پر میں نے جنم لیا، جس ٹہنی پر میں نے کھلنا سیکھا اب وہ میری مسکراہٹیں نہ دیکھ سکے گی۔ اپنے بارے میں یہ سوچتے ہوئے پھول ان ننھی کلیوں پر نگاہ ڈالتا ہے جو دو ایک دن میں کھلنا چاہتی ہیں۔ کلیوں نے بھی محسوس کیا کہ ہم سب میں دراز عمر ساتھی آن کی آن میں جدا ہوا چاہتا ہے اور وہ بھی منہ بسورنے لگتی ہیں۔ پھول نے ان پر شفقت کی نگاہ ڈالی اور تسلی دیتے ہوئے بولا: اے ننھی کلیو! تم بڑی خوش قسمت ہو کہ تم نے میرا کھلتا ہوا رنگ روپ دیکھا، ابھرتی ہوئی جوانی دیکھی۔ نکھرتے ہوئے رنگ کی خوش نمائی سے لطف اندوز ہوئیں اور اب جدائی کی گھڑی بھی میرے سر پر کھڑی ہے دیکھ لو گی مگر یہ سمجھ لو کہ یہ اس حد تک افسوس ناک ہے۔ میں تم سے جدا ہو رہا ہوں۔ مگر تمھارے لیے یہ بات بھی خوشی کا باعث ہے کہ میں اب ترقی کر کے بادشاہ کے تاج پر پہنچوں گا یہ دن تمھارے لیے بھی کل کو آنا ہے کیونکہ میں تم سے جدا ہو رہا ہوں۔ مگر تمھارے لیے یہ بات بھی خوشی کا باعث ہے کہ میں اب ترقی کر کے بادشاہ کے تاج پر پہنچوں گا یہ دن تمھارے لیے بھی کل کو آنا ہے کیونکہ

عزت ملی اسے جو وطن سے نکل گیا
وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

اس دنیا میں جو بھی آیا اس کے لیے جدائی یقینی ہے۔ لیکن زندگی کی منزلوں کو اس طرح سے طے کرنا کہ زندگی میں ایک نکھار پیدا ہو اپنا وجود دوسروں کی دلکشی کا باعث بنے۔ خوشی مسرت کا سامان ہو اور اس کے بعد وہ جوہر پیدا کرو وجود دوسروں کے لیے مفید ہو۔ زندگی کا اختتام تو ضروری ہے لیکن یہ اختتام کامیابیوں اور خوشیوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔

اب آپ خود ہی سوچیے اگر میں اسی ٹہنی پر نکھرتا سنورتا، جوان ہوتا اور میری مہکتی پنکھڑیاں بڑھاپے کی نظر ہو جاتیں تو بتائیے اس وجود سے اچھا ہے کہ میں اپنے اس وطن کو چھوڑ کر دوسروں کے کام آؤں اس لیے تم کو خوش ہونا چاہیے کہ کل کو تم بھی میرے نقشِ قدم پر چلو گے۔

میرے عزیز ساتھیو! اس مثال کے کر کرنے کے بعد اب اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہاں رہ کر جس لائق ہوئے انھیں صلاحیتوں کے بل بوتے پر ہم آگے بڑھنے کی ہمت کر رہے ہیں۔ اسی چمن نے ہمیں سنورنے نکھرنے کا موقع دیا۔ ہم زندگی بھر اسے فراموش نہ کر سکیں گے۔

خدا کرے آپ لوگ ہماری اچھی عادتوں اور اور روایتوں کو قائم رکھیں اور خامیوں کو نظر انداز کریں۔ میں اپنے تمام اساتذہ کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ہمیں آگے بڑھنے کے قابل بنایا اور قدم قدم پر ہماری مدد کی۔ ایک بار پھر میں اپنی طرف سے اور تمام ساتھیوں کی طرف سے آپ سب کا مشکور ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اسکول کی اچھی روایات سے روشنی حاصل کرتے رہیں گے۔

محمد احمد دلکش

ستائش و دعا

آج کل کی زندگی میں خوش خبریوں کا فقدان ہے۔ لہٰذا جب کوئی خوش آیند خبر سننے کو ملتی ہے تو اس سے روح کو مسرت اور قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک خبر مجھے میرے دوست جناب اخلاق قاسمی صاحب نے سنائی کہ جامعہ مڈل اسکول کی تعلیمی، تہذیبی اور تربیتی سرگرمیوں کی کیفیت مکتبہ جامعہ کے رسالے "پیام تعلیم" میں شائع ہو رہی ہے۔ مکتبہ کے جنرل منیجر جناب شاہد صاحب ایک کاروباری ادارہ کے کامیاب منتظم ہی نہیں بلکہ ایک علم دوست اور صاحب لطف انسان بھی ہیں اور وہ نوجوان کے لیے مفید ادب شائع کرنے میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں جس کا ثبوت "پیام تعلیم" کے شماروں میں جا بجا ملتا ہے اس اہم کام میں پیام تعلیم کے مدیر جناب ولی شاہ جہاں پوری بھی ان کے شریک ہیں۔ اور یہ دونوں حضرات شکریے کے مستحق ہیں۔

پیام تعلیم کا موجودہ شمارہ جامعہ مڈل اسکول "بچوں کی حکومت" کے زیر اہتمام علمی و تہذیبی سرگرمیوں کے ذکر پر مشتمل ہے اور میرے خیال میں قابل تقلید علمی و تہذیبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ محترم اخلاق قاسمی صاحب تقریباً دس سال سے "بچوں کی حکومت" کے مشیر و نگران ہیں اور انھیں اس علمی اور تربیتی منصوبے کی تشکیل و تکمیل میں اپنے ہیڈ ماسٹر صاحبان اور رفقائے کار حضرات کا بھرپور تعاون حاصل رہا ہے اور یہ اشتراک کار اور ایک اچھے انسانی مقصد کے حصول کی کوشش ہی جامعہ مڈل اسکول کی شان امتیاز بنی رہی ہے جو اسے ایک لائق مثال اقامتی و تربیتی ادارہ بناتی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک قومی اہمیت کا تعلیمی ادارہ ہے جس کی بنیاد شیخ الاسلام مولانا محمود الحسنؒ اور مہاتما گاندھی نے ١٩٢٠ء میں اس لیے رکھی تھی کہ وہاں ایسے ہندستانی نوجوانوں کی تربیت ہو جو ذی علم ہونے کے ساتھ ساتھ نیک و مہذب محب وطن اور خدمت ملک و ملت کے جذبے سے سرشار ہوں۔ پھر اس ادارے کی خوش قسمتی کہ اسے مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے اساتذہ اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خاں صاحب جیسے سرپرست نصیب ہو گئے۔ اور آزادی ہند سے قبل کے فاقہ مستی کے دنوں میں یہاں کے کارکنوں اور اساتذہ نے بھائی چارہ کے ماحول میں مادی منفعت سے بے نیاز ہو کر ملک کے نوجوانوں کی اس خوبی سے تعلیم و تربیت کی کہ یورپ کے بعض ماہرین تعلیم نے جب دہلی آکر جامعہ کے مڈل اسکول کا، جو اس زمانہ میں مدرسۂ ابتدائی یعنی پرائمری اسکول کہلاتا تھا، معائنہ کیا تو انھوں نے اس اسکول کو دنیا کے بہترین اسکولوں میں سے ایک قرار دیا اور اس اسکول کا یہ امتیاز آج بھی قائم ہے۔ کیونکہ یہاں اچھے طریقے سے صرف کتابی تعلیم ہی نہیں دی جاتی بلکہ علمی منصوبوں کے ذریعے علم و زندگی کے مختلف شعبوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے خوش اسلوبی سے تعلیم و تربیت کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ جس کے متعلق اس رسالے میں شائع شدہ کیفیات سے اندازہ ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ شنیدہ کے بود مانندہ دیدہ، اس لیے بچوں کے والدین و سرپرست صاحبان، ماہرین تعلیم اور سماجی کارکنان کو جامعہ مڈل اسکول آکر اس تمام تعلیمی تہذیبی اور تربیتی کارگذاری کو بہ نفس نفیس دیکھنا چاہیے۔ تاکہ انھیں اندازہ ہو کہ واقعی اس ادارے میں طلبہ کی اخلاقی اور ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کی مناسب تربیت ہو رہی ہے جس سے وہ اپنی آیندہ زندگی میں معاشرے کے مفید رکن اور ملک کے اچھے شہری بن سکیں گے۔

تعلیم کا انداز و مقصد کیا ہو یہ ہر ذمہ دار معلم اور معاشرہ کے ذی شعور رکن کے لیے ایک مستقل سوال ہے جس کا جواب یہی ہے کہ تعلیم کو اخلاقی اور مادی دونوں اعتبار سے انسان

کے لیے مفید و دلچسپ ہونا چاہیے۔ اور اس اعتبار سے جامعہ مڈل اسکول کی تعلیمی و تربیتی سرگرمیاں باعث اطمینان ہیں بلکہ توقع یہ ہے کہ وہاں اساتذہ کو چونکہ زیادہ آزادیٔ فکر و عمل حاصل ہے اور ان میں تعاون کار اور اپنے فرائض منصبی سے شغف کی فراوانی ہے، اس لیے وہاں تمام رسمی تعلیم کے علاوہ جس کی ضرورت پر حکومت کا محکمۂ تعلیم زیادہ زور دیتا ہے، کچھ اور بھی ایسی تربیتی چیزیں ممکن ہو سکیں گی، جو ملک کے نونہالوں کو محض ذی روح ہونے کے منصب سے بلند کر کے درحقیقت اچھے انسان بنانے میں معاون ہوں گی۔

جامعہ مڈل اسکول میں "بچوں کی حکومت" نوعمر طلبہ کو حکومت کے معانی و مقاصد طریقۂ انتخاب اور حسنِ انتظام کے متعلق عملی تربیت فراہم کرتی ہے۔ انتخاب کے لیے نامزدگی کے بعد بچے مہذب انداز میں اپنے امیدواروں کے لیے ووٹ حاصل کرنے کی مہم بھی چلاتے ہیں، عمارت کے دیوار و در کو گندہ نہیں کرتے، تاہم دیدہ زیب و بامعنی پوسٹر آویزاں کر کے ایک طرح سے اسکول کی آرایش کرتے ہیں۔ دلچسپ اور پُر مغز تقریریں بھی کرتے، یہ انتخاب سے پہلے اور انتخاب کے بعد اسکول کی حدود میں جلوس بھی نکالتے ہیں، اور جلسے بھی کرتے ہیں، اور پھر مسند نشینی کا جو جلسہ ہوتا ہے اس میں کسی اچھے پارلیمنٹ کا جیتا جاگتا نقشا بھی حاضرین کے سامنے یہی کم عمر بچے پیش کرتے ہیں۔ صدر کا خطبہ اور جلسہ کی تزئین دعوت گوش و نظر بنتے ہیں اور پھر دورانِ سال جامعہ یونیورسٹی کے بڑے بڑے جلسوں مثلاً یوم تاسیسِ جامعہ کا انتظام انھی ننھے بچوں کے ہاتھوں ہونا ناظرین کے لیے صرف ایک خوشگوار حیرانی ہی کا باعث نہیں ہوتا بلکہ انھیں یہ امید بھی ہوتی ہے، کہ آنے والی دنیا کے لیے ذی علم و منتظم اور مہذب کارکنوں کی کمی جامعہ کے یہی نونہال پوری کریں گے۔ جامعہ مڈل اسکول کے دیگر اچھے تفریحی، تعلیمی، انتظام اور تربیتی پروگرام جو بچوں کے ہاتھوں ان کے اساتذہ کی سرپرستی و رہنمائی میں تکمیل کو پہنچتے ہیں، وہ ہے تعلیمی میلا کھلی ہوا کا مدرسہ اور ایک دن کا مدرسہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں اسکول کے روزمرہ کے انتظامات میں بھی ان نونہالان مدرسہ کے مشورے، خواہشات اور عملی تعاون شامل رہتے ہیں جس کے نتیجے میں جامعہ آنے والے کوئی بھی اجنبی مہمان جامعہ مڈل ایسکول کے ان ننھے خوش پوش و خوش گفتار و خوش کردار طلبہ سے پہلی ہی ملاقات میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، اور یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صحرائے تعلیم و حیات میں جامعہ مڈل اسکول ایک خوش منظر نخلستان ہے۔ اسکول میں آنے والے حضرات کو کلاسوں کی عام آرایش و صفائی در دیوار کی خوبصورت تصویروں طغروں اور تحریروں کو دیکھ کر طلبہ کی تخلیق کاری اور سلیقہ مندی کی داد دینی پڑتی ہے کیونکہ خوبصورت اقوال و اشعار اور نظر فریب مناظر کی ہر طرف افراط ہے اور یہی کہنا پڑتا ہے کہ ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اس اسکول کی لائبریری بھی قابلِ دید ہے جہاں علم و زبان کے ہر شعبہ میں اچھی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے اور بڑے بڑے رنگین چارٹ، دنیا کے ملکوں کے نقشے ان کی فولڈنگ آوٹ لائنز، فولڈنگ بلیک بورڈ اور دیگر ضروری تعلیمی سامان جو معلموں اور زیرِ تربیت اساتذہ کے لیے طلبہ کو پڑھانے میں نہایت معاون و مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اس کتب خانہ کا خاص اور قابل فخر سرمایہ ہیں اور جہاں اسکول کے بچے جو اس لائبریری کے انتظام میں معاون ہیں۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب جو اس کے سرپرست ہیں وہیں حبیب خاں صاحب لائبریرین بھی تعریف کے مستحق ہیں جنھیں اپنی لائبریری کے حسن تنظیم و حسن کاری کی ہر وقت فکر لگی رہتی ہے اور جن کی ہمہ وقت کوشش رہتی ہے کہ کتابوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو۔ کوئی شخص کسی بھی وقت حتیٰ کہ چھٹی کے دنوں میں بھی حبیب خاں صاحب کے پاس کوئی کتاب طلب کرنے چلا جائے تو وہ کبھی انکار نہیں کرتے اور اس طرح وہ اپنی مستعدی سے علم کی مشعل کو فروزاں رکھنے میں سب چھوٹے بڑوں سے معاونت کرتے ہیں۔

ذاکر صاحب کے زمانہ میں جامعہ کو ہندستان کے لوگ ایک ایک روپیا ماہانہ چندہ دیتے تھے اور وہ حضرات

"ہمدردانِ جامعہ" کہلاتے تھے اور ذاکر صاحب مرحوم نے ان کرم فرماؤں سے کہہ دیا تھا کہ آپ جب چاہیں جامعہ کے کاموں کی آزادی سے جانچ کر سکتے ہیں اور اگر اس کے کام سے مطمئن نہ ہوں تو ایک روپیا ماہانہ کا چندہ بند کر سکتے ہیں، اور یہ بات ذاکر صاحب نے جامعہ کے مدارس کی اچھی کارکردگی کے بل بوتے ہی پر کہی تھی، اور یہی بات آج بھی جامعہ مڈل اسکول میں ہونے والے ہر علمی، عملی و تربیتی پروگرام کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جو "بچوں کی حکومت" کے زیر اہتمام تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

جامعہ مڈل اسکول کے جملہ اساتذہ صاحبان اور کارکنان حضرات کو مبارکباد پیش کرنے کے بعد میں اپنے ان اشعار میں اس اسکول کے تمام طلبہ کو دعا دینا اور شاباش کہنا چاہتا ہوں ؎

وطن کے نونہالو فخر تم پر زندگی کو ہو
سبق تم مدرسہ میں خدمت انسانیت کا لو
زمانہ کے دکھوں کو دور ہمدردی سے تم کرنا
بنو عاقل، بنو ذی علم و خوش کردار تم بچو!
زمانہ میں کرن امید کی بن کر چمکنا تم
جہاں میں چاند سورج بن کے اے تارو چمکنا تم
تمھیں اس باغ ہستی کو بہاروں سے سجانا ہے
کبھی بھی خار کی صورت نہ آنکھوں میں کھٹکنا تم!
لگن سے علم سیکھو حکمت و اخلاق تم سیکھو
تمھاری دوستی پر اہل عالم کو بھروسا ہو
بہادر بن کے مظلوموں کے حق میں ڈھال بن جاؤ
پیام امن و صلح و دوستی سارے جہاں کو دو!
ہنر اور علم سے اب دامن خواہش کو تم بھر لو
جفاکش بن کے اپنے جسم کو مضبوط تم کر لو
بنو تم خادم انسانیت اس بزم ہستی میں
بزرگوں سے دعاؤں کے ہمیشہ لعل و گوہر لو
تمھارا راستہ سیدھا ہو نیکی اور جرأت کا
تمھارا کام ہو ہر ایک ایثار و شجاعت کا
زمانے کے لیے تم خیر کا پیغام ہو جاؤ
تمھاری زندگی میں حسن ہو تہذیب و الفت کا
زمانہ کی امیدوں کے ہو مرکز نونہالو تم
برائے خیر سرگرم عمل رہنا جوانو تم
فریب زندگی میں تم نہ آ جانا کبھی دیکھو
ہمیشہ مستعد رہنا وطن کے پاسبانو تم
حیات حال و مستقبل تمھاری نور افشاں ہو
خدا کے فضل سے لبریز امیدوں کا داماں ہو
تمھیں شاباشیاں دلکش کی جانب سے مبارک ہوں
تمھاری کامیابی، نیک نامی فخر انساں ہو

Regd No. D(SE)-043 **June, 1983.**

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

بچوں کی مذہبی کتابیں

ہمارا دین (اول، دوم، سوم)	سید شہاب الدین دسنوی	(فی حصہ)	۶/۰۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول دوم)	عبد الواحد سندھی	(فی حصہ)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور امیر البحر	" "		۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ (اول، دوم)	" "	(فی حصہ)	۴/۵۰
قرآن پاک کیا ہے؟	" "		۳/۰۰
اسلام کیسے شروع ہوا؟	" "		۴/۵۰
رسولؐ پاک	" "		۳/۵۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی		۳/۰۰
رسولؐ پاک کے اخلاق	" "		۳/۰۰
اللہ کے خلیل	" "		۲/۵۰
تحسین القرآن	تالیف: خدیجہ سید طاہر سیف الدین		۴/۵۰
منہاج القرآن	" "		۴/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری		۱/۵۰
عقائد اسلام	" "		۱/۵۰
چار یار	الیاس احمد مجیبی		۴/۵۰
آں حضرتؐ	" "		۱/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبد الحیٔ فاروقی		۲/۷۵
نبیوں کے قصے	" "		۲/۲۵
ہمارے رسولؐ	" "		۳/۰۰
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی		۳/۰۰
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی		۱/۵۰
سرکارِ دو عالم	محمد حسین حسان		۳/۰۰

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲


پیام تعلیم

ماہنامہ
پیامِ تعلیم
نئی دہلی ۲۵

جولائی ۱۹۸۳ء — جلد: ۲۰ — شمارہ ۷

اڈیٹر: — ولی شاہجہانپوری

قیمت: — ۲ روپے
سالانہ ۱۸ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

بچوں سے باتیں

سالانہ امتحانات کے نتیجے نکل آئے ہوں گے۔ کامیاب ہونے والے نئی جماعتوں میں داخلے لے رہے ہوں گے۔ ایسے تمام طلبہ کو ہماری مبارک باد۔

جو ناکام رہے ہوں۔ ان کے ساتھ بھی ہماری ہمدردیاں ہیں۔ انھیں بددل نہ ہونا چاہیے۔ جی چھوٹا کرنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ محنت سے پڑھائی جاری رکھنی چاہیے۔ کامیابی ان کے بھی قدم چومے گی۔ انشاءاللہ۔

اس مرتبہ عید الفطر مہینے کے وسط میں آرہی ہے۔ اس لیے ہماری طرف سے مبارک باد پہلے ہی قبول کیجیے۔

جون کا بچوں کی حکومت نمبر کافی پسند کیا گیا جس کے لیے جامعہ مڈل اسکول کے نگراں جناب خالد سیف اللہ صلاح کار جناب محمد اخلاق قاسمی اور طلبہ کو مبارک باد۔

جون میں ہم آپ سے باتیں نہ کر سکے تھے مگر پیام تعلیم کے ذریعے اچھی معلومات فراہم کی تھیں۔ یقین ہے کہ وہ شمارہ آپ کو ضرور پسند آیا ہوگا۔

وعدے کے مطابق ڈاکٹر قنبر احمد رضوی کا دلچسپ جغرافیائی مضمون "مقدس ایشیا" کی پہلی قسط اس شمارے میں پڑھیے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اسے ضرور پسند کریں گے۔ اس کے متعلق اپنی رائے ضرور دیجیے تاکہ قنبر صاحب سے ایشیا کے بعد دنیا کے دوسرے ممالک کی سیر کرانے کی درخواست کی جاسکے۔

اس شمارے میں ڈاکٹر مظفر حنفی، احمد وصی اور عطاء الرحمن طارق کی نظمیں اور ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کا معلوماتی مضمون اور سید محمود نقوی کی دلچسپ کہانی ضرور پڑھیے اور رائے سے مطلع کیجیے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔


مچھلی کا شکار
"آج مچھلی کا شکار کیا جائے۔"
"ہاں یہ جگہ مناسب رہے گی۔"
"اُف ابھی تک ایک بھی مچھلی نہیں پھنسی"
"معلوم ہوتا ہے کوئی مچھلی پھنسی ہے۔"
"ارے! یہ کیا ــــ!!"

مظفر حنفی

میں سوچتا ہوں

اکثر سوچا کرتا ہوں کیوں گھر گھر بیماری ہے
کیوں چوراہوں پر مجمع کیوں اتنی بیکاری ہے
کتنی گندی ہیں گلیاں جینا کتنا بھاری ہے

یہ قول بہت سچا ہے
چھوٹا کنبہ اچھا ہے

فصلیں اچھی بھی ہوں تو غلّہ کم پڑ جاتا ہے
کپڑا جو ملیں بُنتی ہیں تن ڈھانپ نہیں پاتا ہے
انساں اپنے پیروں کو چادر میں پھیلاتا ہے

یہ قول بہت سچا ہے
چھوٹا کنبہ اچھا ہے

بچّوں کی کم عمری میں کیوں شادی ہوجاتی ہے
منصوبے لاکھ بنائیں بربادی ہوجاتی ہے
دُگنی ہر پینتیس برس میں آبادی ہوجاتی ہے

یہ قول بہت سچا ہے
چھوٹا کنبہ اچھا ہے

بھوکے بچّوں سے ماں کو ہوتی ہے روز ندامت
اسکولوں میں ہنگامے ریلوں میں ایک قیامت
سچ ہے چھوٹا کنبہ ہی خوشحالی کی ہے علامت

یہ قول بہت سچا ہے
چھوٹا کنبہ اچھا ہے

شعبہ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دلی ۲۵



بے وقوف سابورو

(جاپانی لوک کہانی)

یہ پُرانے وقتوں کی بات ہے۔ جاپان میں کسی جگہ گانو میں ایک کسان رہتا تھا۔ اس کسان کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام سابورو تھا۔ بے چارے کسان اور اس کی بیوی اس امید پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کا بیٹا جلد بڑا ہو اور کام کاج میں اُن کا ہاتھ بٹائے، مگر سابورو انتہائی بے وقوف تھا۔ اس سے جو بھی کام کرنے کو کہا جاتا اسے الٹا کرتا تھا اور ہر وقت کوئی نہ کوئی بے وقوفی کی ایسی بات کرتا تھا جس سے نہ صرف گھر والے بلکہ ہر شخص اسے بے وقوف سمجھنے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے گانو میں لوگ اسے "بے وقوف سابورو" کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

سابورو کے ذہن کی حالت یہ تھی کہ وہ ایک وقت میں ایک ہی بات یا کام یاد رکھ سکتا تھا اور جب وہ اس کام کو کرنے کی کوشش کرتا تو حد درجہ بے وقوفی کا ثبوت دیتا۔ اس کے ماں باپ دونوں بے چارے اس کے بارے میں بہت پریشان تھے، لیکن اس کے ساتھ وہ یہ سوچ کر پُرامید بھی تھے کہ ان کا بیٹا بڑا ہو کر یقیناً اپنی حماقتیں چھوڑ دے گا۔ اسی خیال سے وہ ہر وقت اُسے سمجھاتے بجھاتے رہتے اور ہر طرح سے اس کا خیال رکھتے۔

ایک روز کا ذکر ہے۔ اس کے باپ نے اسے بڑے پیار سے اپنے پاس بلایا اور کہا:

"بیٹا سابورو! آج تم کھیت میں جاؤ اور کام کرو۔"

"ہاں، میں ابھی جاتا ہوں۔ بتائیے مجھے وہاں کیا کام کرنا ہے؟"

سابورو جلدی سے بول پڑا، اس پر اس کا باپ کہنے لگا:

"کھیت میں آلو کی فصل تیار ہو چکی ہے۔ تم جا کر کُسّی سے مٹی کھود کر آلو باہر نکال لو۔" اس کے ساتھ ہی باپ نے اسے تاکید کرتے ہوئے کہا:

"دیکھنا، جب تم آلو زمین سے نکال لو تو اُنھیں کھُلی جگہ پر احتیاط سے پھیلا دینا تاکہ وہ خشک ہو جائیں۔"

"میں سمجھ گیا ہوں۔ فکر نہ کریں جیسا کہ آپ نے کہا ہے میں ویسا ہی کروں گا۔"

سابورو نے کُسّی اپنے کندھے پر رکھی اور کھیت کی طرف چل دیا۔ کھیت میں جا کر اس نے زمین کھود کر آلو نکالنا شروع کر دیے۔ ابھی اس نے چند ہی آلو نکالے تھے کہ اچانک اس کی کُسّی زمین میں کسی سخت چیز سے ٹکرائی۔ اس نے اُس جگہ اور گہری کھُدائی کی تو وہاں ایک بڑا سا پُرانا برتن نظر آیا جسے اس نے باہر نکال لیا۔ جب اس نے جھک کر برتن میں جھانکا تو وہ سونے کے سِکّوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ ایک قیمتی خزانہ تھا جو گئے وقتوں میں کسی نے یہاں دبا دیا تھا۔

بقیہ ٹ بھاورا

"باپ نے کہا تھا کہ پہلے کھدائی کر کے چیزیں زمین سے باہر نکالنا اور پھر انھیں کھلی جگہ پر پھیلا دینا تاکہ وہ دھوپ میں خشک ہو جائیں۔"

سابورو نے سوچا اور اس کے بعد اس نے بڑی احتیاط سے سونے کے اُن سکّوں کو کھلی جگہ پر اِدھر اُدھر پھیلانا شروع کر دیا۔ اس طرح جب وہ تمام سکّے پھیلا چکا تو اپنی کسّی لیے واپس گھر آگیا۔ گھر آکر وہ بڑے فخر سے اپنے باپ سے کہنے لگا:

"ابّا جان میں نے آپ کے کہنے پر عمل کیا ہے۔"

"شاباش میرے بیٹے! اچھا بتاؤ تم نے کیا کیا ہے؟" اس کے باپ نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں سابورو نے بتایا:

"مجھے کھدائی کرتے وقت ایک بڑا سا برتن ملا تھا جو سونے کے سکّوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے برتن نکال کر اس میں بھرے ہوئے تمام سکّے سوکھنے کے لیے وہاں پھیلا دیے ہیں۔"

جونہی اس کے ماں اور باپ نے یہ بات سُنی وہ سر پیٹ کر رہ گئے اور دونوں بھاگے بھاگے کھیت میں گئے تاکہ سونے کے سکّے لائیں مگر اتنے میں وہاں سے کوئی تمام سکّے سمیٹ کر لے جا چکا تھا۔ وہاں صرف ایک پُرانا برتن پڑا تھا جسے وہ ساتھ لے آئے اور بیٹھ کر افسوس کرنے لگے۔



دوسرے روز سابورو کا باپ اس سے کہنے لگا:

"آج اگر تمھیں کوئی چیز ملے تو اسے بڑی احتیاط سے کپڑے میں لپیٹ لینا اور گھر لے آنا۔ دیکھنا ایسا کرنا بھولنا نہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں، آپ نے جیسے کہا ہے میں ویسا ہی کروں گا۔"

سابورو نے اپنے باپ کو جواب دیا اور کسّی کندھے پر رکھ کر کھیت کی جانب چل دیا۔ آج جب وہ کھیت میں جا کر کام کرنے لگا تو اسے وہاں ایک مری ہوئی بلی پڑی دکھائی دی۔

"باپ نے کہا تھا، جو چیز بھی ملے اسے بڑی احتیاط سے کپڑے میں لپیٹ کر گھر لے آنا!"

سابورو نے دل میں کہا اور بڑی احتیاط سے مُردہ بلّی کو کپڑے میں لپیٹ کر گھر لے آیا۔ گھر آکر وہ خوشی خوشی اپنے باپ سے کہنے لگا۔

"دیکھیے میں آپ کی ہدایت کے مطابق آج ملنے والی چیز کپڑے میں لپیٹ کر لے آیا ہوں!"

اِدھر جوں ہی ماں باپ نے ایک بدبودار مُردہ بلّی دیکھی تو وہ دونوں بیچارے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

اگلے روز جب سابورو پھر کھیت میں جانے لگا تو اس کے باپ نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا:

"اگر آج تمھیں کل کی طرح کوئی چیز ملے تو اسے گھر لانے کی بجائے دریا میں پھینک دینا۔"

"آپ فکر نہ کریں، میں ایسے ہی کروں گا۔"

یہ کہہ کر سابورو کسّی کندھے پر رکھ کر کھیت میں چلا گیا۔ آج جب وہ کھدائی کر رہا تھا تو اُسے زمین میں دبا ہوا درخت کا ایک تنا ملا۔ اس نے اسے بڑی مشکل سے زمین سے نکالا اور سوچا:

"باپ نے کہا تھا کہ آج کوئی چیز ملے تو اسے دریا میں بہا دینا۔"

چنانچہ وہ تنے کو گھسیٹتا دھکیلتا ہوا دریا پر لے گیا

اور اسے پانی میں بہا دیا۔ اتفاق سے اس وقت وہاں سے ان کا ایک پڑوسی گزر رہا تھا۔ اس نے دیکھا تو کہنے لگا :

"اس طرح کام کی چیز کو دریا میں نہیں بہانا چاہیے تھا۔ تمھیں چاہیے یہ تھا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے گھر لے جاتے !"

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا ہوں !"

سابورو نے کہا اور گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں اسے ایک چینی مٹی کی بنی ہوئی چائے دانی اور چائے کا پیالہ ملا تو وہ سوچنے لگا :

"کام کی چیز کو ٹکڑے کر کے گھر لے جانا چاہیے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے چائے دانی اور پیالے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کپڑے میں باندھ لیے اور گھر لے آیا۔ "ماں ! دیکھو ! میں کیا چیز لایا ہوں !"

اِدھر یوں ہی اس کی ماں نے دیکھا اور وہ سَر پیٹ کر بولی :

"اوہ میرے خدایا !۔ یہ چائے دانی اور پیالا تو وہ ہے جو تمھارا باپ دوپہر کو اپنے ساتھ لے گیا تھا تم نے دونوں توڑ دیے ہیں۔"

اس سے اگلے دن سابورو کا باپ اس سے کہنے لگا :

"آج تم گھر میں رہ کر گھر کی حفاظت کرو اور ہم دونوں کھیت میں کام کرنے جاتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر اس کا باپ اور ماں کھیت میں چلے گئے اور سابورو گھر میں اکیلا بیٹھا سوچ رہا تھا : "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جو کچھ لوگ مجھ سے کہتے ہیں میں وہی کچھ کرتا ہوں، لیکن پھر بھی سب لوگ مجھے بے وقوف کہتے ہیں ۔!!"

(اطہری)

کوشش

آؤ اک تصویر بنائیں
اس کو اپنے گھر میں سجائیں

پہلے کاغذ کو پھیلاؤ
پھر اس کو اک خواب دکھاؤ

خواب سنہری کرنوں والا
وادی وادی پھولوں والا

چاند میں جب خرگوش چھپا تھا
تب یہ چاند بہت اچھا تھا

اب اس کو مت دھیان میں لاؤ
مت اس کی تصویر بناؤ

رنگوں کو آپس میں ملانا
خود ہے اک تصویر بنانا

رنگوں کو پھیلاتے جاؤ
اپنے ہاتھ چلاتے جاؤ

اک دھنک سی بن جائے گی
اک تصویر ابھر آئے گی

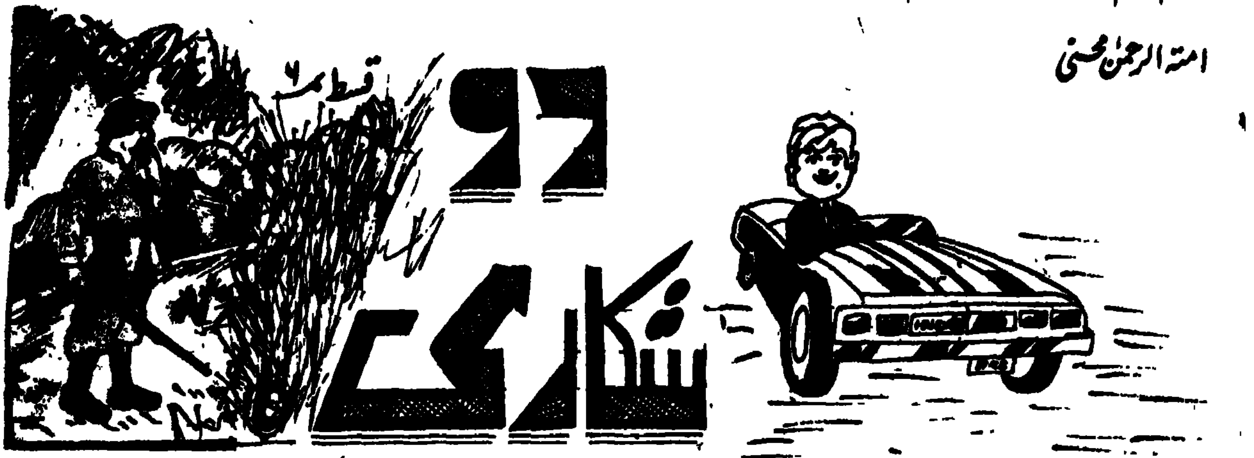
آؤ کوشش میں لگ جائیں
مل کر اک تصویر بنائیں

[illegible]

امۃ الرحمن محسنی

دو شکاری

قسط ۶



ابو کے جانے کے بعد میں کمرے میں چلا گیا اور ایک کرسی پر کھڑے ہو کر چھت میں لٹکے ہوئے لیمپ کو جلایا۔ مجھے کچھ ہوم ورک ملا تھا۔ اور اس کے کرنے کا یہ وقت بہت اچھا تھا۔ میں نے کتابیں لیں اور میز پر رکھ کر پڑھنے لگا۔ لیکن پڑھنے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ گھنٹے نے ساڑھے سات بجائے۔ جھٹ پٹا ہونے لگا تھا۔ اب وہ وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ جھاڑیوں میں گھس کر جنگل میں جانے کے لیے کھسک رہے ہوں گے۔ کم پتوں والی زمین پر کہ آواز کم سے کم پیدا ہو، رکے ہوں گے کہ کوئی آہٹ سن تو نہیں رہا ہے اور پھر ہوشیار، بچ کر چوکنے، محتاط چلنے لگے ہوں گے۔ کسی بڑے درخت کے پیچھے چوکیدار کو دیکھتے جا رہے ہوں گے۔ جو کہ شکاریوں کے انتظار میں بندوقیں لیے کھڑے ہوں گے اور آسانی سے نظر نہیں آ رہے ہوں گے۔

میں نے کتاب بند کر دی اور فیصلہ کیا کہ بے فائدہ کام کی کوشش کے بجائے سونا چاہیے۔ کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گیا۔ لیمپ جلا رہنے دیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو لیمپ کی روشنی میں دیکھا کہ گھنٹے میں دو بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اوپر والے تختے پر دیکھا۔ مگر کیا؟ وہ تو خالی تھا۔ ہیں وہ اب تک نہیں آئے؟ کیوں؟ انھوں نے تو وعدہ کیا تھا کہ ساڑھے دس بجے وہ آ جائیں گے اور کیا ہوا وعدہ وہ کبھی نہیں بھولتے پورا کرتے ہیں۔ اب تو تقریباً چار گھنٹے گزر گئے ہیں۔ اچانک ایک وحشتناک خیال میرے ذہن میں آیا کہ ان کو کوئی حادثہ تو پیش نہیں آگیا ہے؟

ارے نہیں ایسا نہیں! ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ میں نے خود کو سمجھایا۔ پچھلے ہفتے بھی تو میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اور پھر کیسا بے وقوف بنا تھا۔ لیکن پچھلے ہفتے کی بات اور تھی۔ تب انھوں نے مجھ سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ اس مرتبہ تو انھوں نے صاف لفظوں میں مجھ سے وعدہ کیا تھا اور اپنا وعدہ وہ ہمیشہ پورا کرتے ہیں۔

میں نے پھر گھنٹے کی طرف دیکھا۔ وہ یہاں سے ٹھیک چھ بجے روانہ ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو گئے ہوئے پورے آٹھ گھنٹے ہو گئے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنے میں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے صرف دو سکنڈ لگے۔ میں بہت پھرتی سے کپڑے بدل رہا تھا اور دماغ برے برے وہموں سے بھرا ہوا تھا۔ شاید وہ چوکیدار کی گولیوں سے اتنے زخمی ہو گئے ہیں کہ چل نہیں سکتے۔ ایسا تو نہیں کہ زیادہ خون نکلنے کی وجہ سے جنگل میں بے ہوش پڑے ہوں۔ جنگل تک پہنچنے میں مجھے کتنی دیر لگ جائے گی؟ ڈیڑھ گھنٹہ لگ ہی جائے گا۔ اگر میں بھاگتا ہوا گیا تو کچھ کم میں۔ جوتے کے فیتے باندھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ اور پیٹ میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔

ورک شاپ سے ٹارچ لینے کے لیے جلدی جلدی سیڑھیوں سے اترا۔ ٹارچ لی۔ ٹارچ اندھیرے میں کہیں جانے کے لیے بہت کارآمد ساتھی ہوتی ہے۔ میں پمپ کے پاس آ کر رک گیا۔ چاندنی تھی۔۔۔ ہر چیز ساکن تھی تارے خوب چمک رہے تھے۔ رات بالکل

اندھیری تھی۔ میرے داہنے ہاتھ کی سڑک گاؤں کو جاتی تھی۔ اسی پر جنگل کا راستہ بھی تھا۔

ساڑھے چھ میل دور! شکر ہے کہ میں راستہ جانتا ہوں۔ مجھے خوب تیز چلنا چاہیے۔ اسی وقت ایک عجیب دیوانہ پن کا خیال ذہن میں کوندا کہ کیوں نہ میں بے بی آسٹن میں جاؤں۔ یہ تو ایک اتفاقی موقع ہے۔ اور یہ شکر بھی ہے کہ میں کار چلا سکتا ہوں۔ جب کاریں مرمت کے لیے آتی ہیں تو ابو ہمیشہ ان کو چلانے کی مجھے اجازت دے دیا کرتے۔ مجھے ان کے چلانے میں بہت مزہ آتا ہے۔ اگر میں اس میں گیا تو بہت جلد پہنچ جاؤں گا۔

میں ورک شاپ گیا بجلی جلائی۔ کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اگنیشن چابی گھمائی اور کار اسٹارٹ کر کے کار کو بیک سے باہر نکال لایا۔ اتر کر ورک شاپ کی روشنی بجھائی تاکہ دیکھنے میں کوئی غیر معمولی بات نہ لگے۔ گھر کی روشنی کھلی رہنے دی اور کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ کس رفتار پر گاڑی چل رہی تھی یہ دیکھنے کے لیے میں نے اسپیڈ میٹر دیکھا۔ پندرہ میل فی گھنٹہ رفتار تھی۔ بہت خوب۔ میں نے حساب لگایا کہ چھ میل چوبیس منٹ میں طے ہو جائیں گے۔ میں اسی رفتار سے چلتا رہا۔ سڑک کی اونچائیوں نیچائیوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ شہباز کا جنگل سڑک پر نہیں تھا۔ اس تک پہنچنے کے لیے جھاڑیوں کے اندر جانا ہوتا تھا اور پھر ایک ناہموار کچی سڑک ملتی تھی جس کے آخر میں خاصے اونچے کئی ٹیلے تھے ان میں سے گزر کر جنگل میں پہنچتے تھے اور وہ جھاڑیوں والا موڑ جلدی ہی آنے والا تھا۔ کہ اچانک دور آسمان کے کنارے پر نیچے سے آتی ہوئی ایک پیلی روشنی مجھے نظر آئی۔ میں ڈر کر دھڑکتے ہوئے دل سے اسے دیکھنے لگا۔ جس بات کا مجھے خطرہ تھا وہ سامنے تھا روشنی تیزی سے تیز اور قریب سے قریب ہوتی جا رہی تھی اور سکنڈوں ہی میں میں نے دیکھا کہ ایک کار کی ہیڈ لیمپ کی تیز سفید روشنی جھپٹی چلی آ رہی ہے۔ حساب کے مطابق وہ موڑ جس پر سے مجھے گزر کر اندر جانا تھا قریب ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس سے پہلے کہ مصیبت سر پر آئے میں سڑک چھوڑنے اور موڑ پر مڑنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا میں نے اپنی گاڑی کی اسپیڈ اور بڑھا دی۔ مگر دوسری کار بھی اپنی پوری رفتار سے قریب آ رہی تھی۔ ایک دم میرے سامنے کی ساری سڑک روشنی میں نہا گئی اور گاڑی بالکل گولی کی طرح سنسناتی ہوئی میرے برابر سے نکل گئی۔ لیکن اس جھپاکے میں مجھے یہ نظر آ گیا تھا کہ وہ گاڑی پولیس کی تھی۔

اب مجھ میں یہ دیکھنے تک کی ہمت نہیں رہی تھی کہ گاڑی کتنی دور پر رکی ہے۔ اس میں بیٹھا ہوا آدمی مجھے دیکھنے آ رہا ہے یا نہیں۔ اس وقت تو بس ایک ہی خیال دماغ پر چھایا ہوا تھا وہ یہ کہ فوراً یہاں سے چل دوں بھاگ جاؤں۔ غائب ہو جاؤں۔ اور خدا جانے کہاں جاؤں؟۔ میں نے ایکسیلیٹر پر اپنی پوری طاقت سے پیر رکھا ہی تھا کہ مجھے بائیں ہاتھ کی جھاڑیوں والا موڑ باوجود گاڑی کی روشنی مدھم ہونے کے نظر آ گیا۔ اب بریک لگانے یا رفتار ہلکی کرنے کا بھی موقع نہیں تھا۔ میں نے گاڑی کو ایک دم موڑ دیا۔ وہ اچھلتی، اٹھتی، اترتی، ہچکولے کھاتی چلتی رہی آخر ایک ابھار پر چڑھی اور ایک جھٹکے سے نیچے آ کر رکی اور بالکل بند ہو گئی۔

میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سب روشنیاں بجھا دیں۔ نہ معلوم کس جذبے میں یہ کام میں نے کیا۔ شاید۔ شاید اس وجہ سے کہ مجھے چھپنے کی شدید خواہش تھی۔ اندھیری کار میں چپ چاپ بلا حرکت میں بیٹھا رہا۔ دونوں طرف کی جھاڑیاں اس قدر گھنی تھیں کہ ان میں سے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

کار جس جگہ رک کر بند ہوئی تھی وہ جھاڑیوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا پیدل کا راستہ تھا۔ اب میں پولیس کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سن رہا تھا اور چند سیکنڈ بعد وہ گھرگھراتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی اور پھر میں نے اپنے برابر کی جھاڑیوں کے اس طرف سے اس کے گزرنے کی آواز سنی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس والے نے مجھے مڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

لیکن اس کا بھی ڈر اور یقین تھا کہ وہ واپس آئے گا اس موڑ کو دیکھے گا اور گاڑی سے اتر کر اس طرف آئے گا۔ یہاں وہ مجھے پائے گا اور کہے گا کیوں میاں صاحبزادے! کیا پروگرام ہے؟ یہ کار کس کی ہے؟ اور کہاں جانے کا خیال ہے؟ کہاں رہتے ہو؟ تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟ اور پھر اپنی ساتھ وہ پولیس اسٹیشن لے جائے گا اور وہاں وہ مجھ سے پوری کہانی اگلوائے گا۔ اور میرے باپ کی تباہی کا سامان ہو جائے گا۔

میں بالکل چوہے کی طرح دبکا ہوا بیٹھا تھا اور کار کی واپسی کا

انتظار کر رہا تھا۔ کافی دیر بعد موٹر شور کرتی آئی اور دوسری طرف اگر رک گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ ایک راکٹ کی طرح جھاڑیوں سے نکل گئی۔ اس کے اس طرح دندناتے ہوئے آنے اور پھر تیزی سے چلے جانے سے اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس مین سخت حیرت میں تھا۔ شاید وہ سوچ رہا ہوگا کہ اس نے کوئی بھوت دیکھا تھا۔ ایک بھوت لڑکا جو ایک بھوت کار چلا رہا تھا۔

کچھ دیر میں اس کی دوبارہ آمد کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن جب وہ نہیں آیا تو میں نے روشنیاں جلا دیں اور اسٹارٹر کو جیسے ہی دبایا کار چل پڑی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جس طرح سخت جھٹکا کھا کر گری تھی اور بند ہو گئی تھی اس کی کوئی چیز ٹوٹی ہوگی یا پہیا پھٹا ہوگا۔ لیکن اس میں کوئی بھی خرابی نہیں آئی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ بیک کر کے اسے گھاس اور تنگ جگہ سے نکالا اور کچی سڑک پر لے آیا اور پھر کچی ناہموار سڑک پر دھیرے دھیرے چلانے لگا۔ آخرکار شہباز کے جنگل کے درخت اندھیرے میں لمبے لمبے بھوتوں کی طرح نظر آنے لگے۔ میں نے کار روک دی۔ اس کی روشنیاں بجھا دیں اور کار سے اتر کر مارچ لے کر کار کا دروازہ اچھی طرح بند کر کے جھاڑیوں کے بیچ کے پیدل والے راستے میں گھس گیا اور وہاں سے چلتا ہوا جنگل کے اندر پہنچ گیا۔ وہاں جا کر جب میں نے اوپر دیکھا تو درخت ایک دوسرے سے ایسے ملے ہوئے نظر آ رہے تھے جیسے کسی قید خانے کی چھت ہو۔ نہ وہاں سے آسمان نظر آ رہا تھا نہ سیاہ آسمان پر چمکتے ہوئے تارے۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا اور اس اندھیری دنیا میں جا کر آوازیں دینا شروع کر دیں۔ ابو! ابو! آپ کہاں ہیں؟

میری چھوٹی سی چلاتی ہوئی آواز پورے جنگل میں گونج اٹھی اور پھر دب گئی۔ میں جواب کا انتظار کرنے کے لیے خاموش ہو گیا اور سننے لگا۔ لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔

ہمارے دفتر میں رسالہ نہ ملنے کی شکایتیں آتی رہتی ہیں ہم پوری ذمہ داری سے پرچہ پوسٹ کرتے ہیں لیکن پھر بھی آپ کو رسالہ نہیں ملتا۔ ایسی صورتوں میں اسی مہینے کے پہلے ہفتے میں اطلاع دینا ضروری ہے۔ ورنہ پرچہ دوبارہ بھیجنا ممکن نہ ہو سکے گا۔

(سرکولیشن منیجر)

عطاء الرحمٰن طارق

کنجوس جی

بچّو! سنو، کہانی یہ کنجوس جی کی ہے
یعنی جھلک سماج کے کردار ہی کی ہے
اک روز وہ حضور کسی کام کے لیے
سر پر کلاہ کج کیے بازار چل دیے
لیکن خیالِ خام نے آخر غضب کیا
گھر میں وہ چھوڑ آئے تھے جلتا ہوا دیا
اتنا ملال تھا اُنھیں بے کار خرچ پر
اُلٹے ہی پاؤں آئے وہ بیچارے اپنے گھر
دروازے پر پہنچ کے ملازم کو دی صدا
نوکر پکار سُن کے جو دوڑا تو یہ کہا!!
"جُوتیں گھسیں گی بعد میں در کھول دیکھیو
جلتا دِیا ہے طاق میں، گُل اس کو کیجیو"
نوکر نے پھونک مار کے شعلہ بجھا دیا
کنجوس جی سے اُس نے مگر پوچھ ہی لیا
بازار سے پلٹ کے چلے آئے، یا خدا!
جوتے گھسیں گے یہ تو سمجھ میں نہ آسکا
سُننا تھا یہ کہ ہو گئے کنجوس جی خفا
غصے میں چیختے ہوئے نوکر سے یوں کہا
میرا غلام ہے تو نہ مجھ کو سبق پڑھا
یہ دیکھ میرا جوتا بغل میں دبا ہوا

۹۴ فاطمہ بائی بنگلہ کے کے روڈ بمبئی ۱۱

رنگوں کا بادشاہ

اعجاز علی ارشد

آج سے تقریباً ایک سو برس پہلے کی بات ہے ۲۵ اکتوبر ۱۸۸۱ء کو اسپین کے ایک چھوٹے سے موضع ملاگا میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ ویسے تو یہ بچہ بھی دوسرے بچوں کی طرح کھیلنے کودنے میں خوب دلچسپی لیتا تھا لیکن بچپن ہی سے اس میں یہ عادت بھی موجود تھی کہ وہ گھنٹوں خاموش بیٹھا ہوا فطرت کے خوبصورت مناظر کو دیکھتا رہتا۔ اس کے والد نہ صرف ایک اچھے مصور تھے بلکہ آرٹ ٹیچر بھی تھے۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا تو کھلونوں کے بجائے اپنے والد کے تصویر بنانے والے برش اور رنگوں سے کھیلنے لگا۔ دس برس کی عمر میں اس نے ایک سن رسیدہ جوڑے کی تصویر بنائی جسے سبھوں نے بے حد پسند کیا۔ اس کے والد نے مصوری سے اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے صرف تیرہ برس کی عمر میں اپنے رنگ اور برش اس کے حوالے کردیے اور اگلے ہی سال اس نے بارسلونا کے آرٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ مختلف تعلیمی مرحلوں سے گزرتے ہوئے صرف انیس سال کی عمر میں وہ اس قدر مشہور ہوگیا کہ ۱۹۰۰ء میں اس کی بنائی ہوئی ستر تصویروں کی ایک نمائش پیرس میں منعقد ہوئی۔ اس کے بعد وہ مصوری کی دنیا میں برابر ترقی کرتا رہا اور جلد ہی وہ دن بھی آگیا جب دنیا اس کی بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر ان کے حسن میں کھو گئی۔ اب رنگ اس کے غلام تھے۔ وہ جس رنگ کا جس طرح چاہتا مصرف لیتا اور مصوری کی دنیا میں اپنی فنکاری کا جادو جگاتا۔ امریکا اور روس دونوں کی حکومتوں نے اس کی فنکاری کا اعتراف کرتے ہوئے اسے انعامات و اعزازات سے نوازا۔

اس عظیم مصور کو اپنے وطن اسپین سے بڑی محبت تھی اور وہ کسی دوسرے ملک میں بسنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لیکن جب فرانکو نے نازی جرمنی کے مشہور ڈکٹیٹر ہٹلر کی مدد سے اسپین میں جمہوریت کا خاتمہ کردیا تو بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اسے بھی اسپین چھوڑ کر فرانس کی رہائش اختیار کرنی پڑی۔ پھر بھی اس نے اسپین کی شہریت نہیں ترک کی اور اپنے وطن لوٹ جانے کی خواہش ہمیشہ اس کے دل میں مچلتی رہی۔ اس عظیم فنکار کی زندگی میں برابر اتار چڑھاو آتے رہے۔ اس کے والد کی آمدنی بہت قلیل تھی پھر بھی اس نے دل لگا کر تعلیم حاصل کی۔ ایک ایسا بھی وقت آیا جب سردی کے موسم میں جسم کو گرم رکھنے کے لیے اسے اپنی ہی بنائی ہوئی تصویروں کو جلا کر آگ تاپنی پڑی۔ اس کی شہرت اور فن سے حسد کرنے والے بھی برابر اسے نقصان پہنچانے کی کوشش میں رہے۔ لیکن وہ ایک مضبوط ارادے کا مالک تھا۔ اس نے ہر مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور آخرکار کامیاب ہوا۔ زندگی گزارنے کا اس کا اپنا ایک انداز تھا۔ وہ گزرے ہوئے زمانے کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا تھا۔ جو زمانہ اس کے سامنے ہوتا وہی اس کے لیے سب سے اہم ہوتا تھا اور اسی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے وہ کوشاں رہتا تھا۔

تقریباً نوے برس کی زندگی میں اس فنکار نے لاتعداد تصویریں بنائیں اور مصوری کی دنیا میں نت نئے تجربات کیے

فلاور کالج - باغ بانو - پٹنہ - ۸

اس کی بنائی ہوئی سب سے مشہور تصویر "گورنیکا" ہے جو اس کی سب سے بڑی پینٹنگ بھی ہے۔ یہ ½ ۲۸ فٹ لمبی اور ½ ۱۱ فٹ چوڑی تصویر جو نیویارک کے عجائب گھر میں محفوظ تھی، پچھلے سال مصور کے مادرِ وطن اسپین کی راجدھانی میڈرڈ کے پرانے عجائب گھر میں لگادی گئی ہے۔ اس تصویر میں بیل گھوڑے اور عورتوں کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ بیل ظلم و جبر کی علامت ہے اور گھوڑا عوام کی چیختی چلاتی ہوئی عورتیں غم و الم کو ظاہر کرتی ہیں۔

مصوری کے علاوہ اس فنکار نے مجسمہ سازی، برتن سازی، نقاشی اور لیتھوگرافی وغیرہ کے ذریعہ بھی اپنے فن کا اظہار کیا۔ ۸ر اپریل ۱۹۷۳ء کو یہ عظیم فنکار، مصوری کی دنیا کا بے تاج بادشاہ، جس نے تقریباً ستّر برسوں تک نیلے اور گلابی، پیلے اور ہرے رنگوں پر حکومت کی تھی، دل کے دورے کا شکار ہو کر دنیا سے چل بسا۔

میں اس رنگوں کے بادشاہ کا نام بتانا تو بھول ہی گیا۔ اس کا نام پکاسو تھا — پیلو روئزی پکاسو، جس کی سوویں سال گرہ اکتوبر ۱۹۸۱ء میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔

مصباح الدین ذوقی

عید کی خوشیاں

کتنی نیاری کتنی پیاری
آئی عید کھلی پھلواری
عید کا پیارا پیارا دن ہے
اور دنوں سے نیارا دن ہے
نئی نئی پوشاک ہماری
رنگ برنگ پیاری پیاری
ارشد جب بن ٹھن کر نکلے
ننھے منّے تن کر نکلے
اپنے رب کو سجدہ کرنے
بچے بوڑھے مل کر نکلے
اللہ اکبر اللہ اکبر
ملنا سب سے خوش ہو ہو کر
گھر گھر سب سے ملنے جائیں
دودھ سویاں مل کر کھائیں
خوشی منائیں خوشی منائیں
گیت خوشی کے مل کر گائیں
عید مبارک عید مبارک
یاروں کو ہو عید مبارک

معرفت شمیم ہاشمی بکارو تھرمل

بدرجہاں

سچی توبہ

فضیل بن عیاض اپنے زمانے کے مشہور ڈاکو تھے۔ راتوں کو بچے روتے تو مائیں ان کو یہ کہہ کر ڈرایا کرتی تھیں: "چپ ہو جاؤ فضیل آجائے گا۔"

ایک بار فضیل جنگل میں چھپ کر ایک قافلے کا انتظار کر رہے تھے۔ کیوں کہ ان کے ایک ساتھی نے اطلاع دی تھی کہ شمال کی طرف سے ایک قافلہ آرہا ہے جس کے ساتھ بہت سا قیمتی سامان ہے۔ سورج غروب ہونے تک وہ قافلہ یہاں پہنچ جائے گا۔ سورج چھپنے ہی والا تھا کہ دور سے قافلے کی گھنٹیوں کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ سارے ساتھی تیار ہو گئے۔ قافلہ نزدیک آیا۔ قافلے والوں میں سے کوئی شخص قرآن پاک کی بلند آواز سے تلاوت کر رہا تھا۔ جن آیات کی تلاوت وہ شخص کر رہا تھا ان کا ترجمہ یہ تھا —— "اے لوگو کیا ابھی اللہ سے ڈرنے کا وقت نہیں آیا۔ یاد رکھو اللہ کی پکڑ بہت زبردست ہے۔" فضیل نے بھی یہ آیات سنیں۔ چونکہ عربی جانتے تھے اس لیے مطلب سمجھ گئے۔ تلوار پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ شرم سے پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ ساتھیوں سے بولے "خبردار قافلے پر کوئی حملہ نہ کرنا۔ بیشک اللہ کی پکڑ بہت زبردست ہے۔ تم سب گواہ رہنا میں آج تمام برے کاموں سے توبہ کرتا ہوں۔"

قافلہ بخیریت گزر گیا۔ فضیل اپنے گھر واپس آئے۔ رات بھر رو رو کر مالکِ حقیقی سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے رہے۔ صبح ہوئی تو فضیل نے جس جس کے یہاں چوری کی تھی باری باری ان کے گھر جا کر معافی مانگنے لگے۔ لوگ حیران ہو ہو کر انہیں دیکھتے اور آپس میں یہی کہتے بیشک اللہ جس کو چاہے ہدایت دے دیتا ہے۔ فضیل بن عیاض نے جن لوگوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ ان میں ایک یہودی بھی تھا۔ جب اس یہودی کے پاس معافی مانگنے پہنچے تو اس نے معاف کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے یہودی کی بہت خوشامد کی اور کہا جو معاوضہ چاہو مجھ سے لے لو مگر مجھے معاف کر دو۔ یہودی بولا کل آنا۔ یہ اگلے دن پھر یہودی کے گھر پہنچے اور پھر معافی کی درخواست کی۔ یہودی نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ادھر کونے میں سونے کی تھیلی رکھی ہوئی ہے، میرے پاس اٹھا لاؤ۔ فضیل نے وہ تھیلی لاکر یہودی کو دے دی۔ یہودی نے تھیلی کھول کر دیکھا واقعی اس میں سونا بھرا ہوا تھا۔ حالانکہ یہودی نے مٹی تھیلی میں بھر کر رکھی تھی۔ یہودی بولا۔ "میں نے توریت میں لکھا ہوا دیکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کی توبہ قبول کر لیتا ہے وہ اگر مٹی کو ہاتھ لگا دے تو مٹی سونا بن جاتی ہے۔ میں نے تمہارا امتحان لینے کے لیے مٹی بھر کر رکھی تھی۔ پہلے مجھے مسلمان کرو پھر معاف کروں گا۔" انھوں نے یہودی کو مسلمان کیا اور اس نے انھیں معاف کر دیا۔ دونوں نے اپنی بقیہ زندگی انتہائی تقوا اور پرہیزگاری کے ساتھ بسر کی۔

—— ✻ ——

۲۴۳ - ایس، ایس ہال - مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ڈاکٹر قنبر رضوی

مقدس ایشیا

رات کی سیاہی ختم ہو چکی تھی۔ میں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ تیزی سے بحرِ اوقیانوس کو پار کر کے ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے پیچھے پیچھے بیشمار ماہی گیروں کی کشتیاں بھی سمندر کی طرف سے خشکی کی طرف چلی آ رہی تھیں۔ کہیں سے اذان کی آواز آ رہی تھی تو کہیں سے ناقوس اور گھنٹے بجنے کی صدا۔ اتنے میں نورانی چہرے والے ایک بزرگ نے بڑھ کر مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا۔ میں نے ادب سے پوچھا:

میں: آپ کا اسم گرامی؟

بزرگ: ناچیز کو ایشیا کہتے ہیں۔

میں: مقدس ایشیا! آپ تو مجھے بہت لحیم شحیم دکھائی دیتے ہیں۔

ایشیا: جی ہاں، میری جسامت ۴۴ کروڑ مربع کلو میٹر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ساری دنیا کا ایک تہائی حصہ میرے ہی قدموں کے نیچے ہے۔

میں: مقدس ایشیا! آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی، آپ کے ساتھ آپ کی انگلی پکڑے ہوئے یہ بچہ کون ہے؟

ایشیا: یہ میرا سب سے زیادہ ترقی یافتہ، نئی تہذیب کا

شعبۂ جغرافیہ، اے۔ آر۔ کے کالج، شکوہ آباد یوپی



دل دادہ چھوٹا بچہ ہے۔

میں: مقدس ایشیا کے ننھے بچے! آپ کا نام کیا ہے؟

بچہ: لوگ مجھے جاپان کہتے ہیں۔ عظیم سیاح مارکوپولو نے میرا نام "چپنگو" بتایا۔ مگر کچھ لوگ مجھے ایشیا کا برطانیہ بھی کہتے ہیں۔

میں: پیارے جاپان! آپ تو کھلونے جیسے لگے ہیں۔

جاپان: جی ہاں۔ میرا سر "ہوکیڈو" ہے اور میرا دھڑ "ہانشو" میرے دونوں پیر "کیوشو" اور "شکوکو" ہیں جن پر میں قائم ہوں میری جسامت کل ۳½ لاکھ مربع کلو میٹر ہے۔

میں: ننھے بھیا! آپ کی قیام گاہ کہاں ہے؟

جاپان: میں مقدس ایشیا کے بائیں پہلو میں مشرق سے آنے والی سورج کی پہلی کرن کا استقبال کیا کرتا ہوں۔ روسی سائبیریا۔ شمالی و جنوبی کوریا منگولیا اور چین میرے قریبی عزیز ہیں۔ آیئے میں آپ کو اپنی قیام گاہ دکھاؤں۔

میں: چھوٹے جزیرے جاپان! آپ کی قیام گاہ کتنی گھنی آباد ہے؟

جاپان: جی ہاں یہ دنیا میں سب سے زیادہ گھنی آبادی والے ملکوں میں ہے یہاں ۳½ لاکھ مربع کلو میٹر



گیارہ کروڑ سے زیادہ لوگ رہتے ہیں۔ اوسطاً آبادی تین سو فی مربع کلومیٹر ہے۔

مقدس ایشیا کے ساتھ ساتھ میں آگے بڑھا۔ ہوانگ ہو ندی کے دہانے پر سرخ لباس میں ایک بزرگ نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ان کا قد و قامت منگولوں جیسا۔ ان کی آنکھیں ترچھی ترچھی ان کا رنگ زرد زرد، چہرے پر کنفیوشس کا تقدس



لباس میں گوتم کی پاکیزگی اور آواز میں کبلائی خان کا شاہانہ وقار تھا۔ میں نے بڑھ کر مصافحہ کیا۔

میں: اے بزرگ! کیا میں آپ کا تعارف حاصل کر سکتا ہوں؟

بزرگ: (باریک آواز میں) خاکسار کو لوگ چین کہتے ہیں۔ انگریزوں نے مجھے چائنا کہا۔ اور عربوں نے مجھے "الصین" کہہ کر پکارا۔ ۱۹۴۹ء کے سیاسی انقلاب کے بعد لوگ مجھے کمیونسٹ چین یا سرخ چین کہنے لگے۔

میں: بزرگ چین کیا آپ مقدس ایشیا کے خاندان میں سب سے بڑے ہیں؟

چین: ہاں۔ سائبیریا کے یورپی روس میں شامل ہو جانے کے بعد میں ہی اپنے باپ کا بڑا بیٹا ہوں۔ آبادی میں ساری دنیا میں میرا پہلا نمبر اور رقبے میں تیسرا نمبر ہے۔ میرا رقبہ براعظم یورپ کے لگ بھگ برابر یعنی ۹۵,۹۶,۹۷۱ مربع کلومیٹر ہے۔ میری سرحد پر منگولیا، سوویت روس، افغانستان، ہندستان، نیپال، برما، لاؤس اور کوریا آباد ہیں۔

میں: بزرگ چین! آپ تو بہت قدیم بھی ہیں؟

چین: جی ہاں، میرے قدیم ہونے کا ثبوت آپ کو دیوارِ چین، چھاپے خانے اور پتھر کا کوئلہ جیسی چیزوں سے ملے گا۔ ہماری تہذیب قدیم، ہمارے آثار قدیم ہماری صنعتیں قدیم۔ ہماری زراعت قدیم اور ہمارے تمدنی نقش و نگار بھی بہت قدیم ہیں۔ مجھے بودھ دھرم، اسلام اور کنفیوشس کے مذہب کی آماجگاہ کہا جاتا ہے۔

میں: دورِ جدید میں آپ کی کیا حیثیت ہے؟

چین: بھائی، اب ہم پرانے، قدامت پسند، سست اور افیونی نہیں رہے بلکہ جدید ترقی کے راستے پر چلنے والے ہیں۔

ملیں: بزرگ چین۔ آپ کی سرحدوں پر رہنے والے ایشیا کے بچے بھی آپ کی طرح قدیم ہیں۔

چین: ان میں بھارت ہی سب سے قدیم ہے ورنہ کچھ تو بہت نئے دیش ہیں جیسے مقدس ایشیا کے دو جڑواں بچے۔ ایک تو شمالی اور جنوبی کوریا اور دوسرے ویتنام اور لاؤس۔ یہ دونوں ممالک پشت سے پشت اور کندھے سے کندھا ملا کر چلتے ہیں۔



ملیں: وہ آپ کی پشت کی طرف سے کون جھانک رہا ہے۔

چین: وہ۔ وہ تو میرا چھوٹا بھائی منگولیا ہے

منگولیا



(باقی آئندہ)

قاضی حسن رضا

ہمارے ماں باپ

پیکرِ خلق و مروّت ہیں ہمارے ماں باپ
مہر و اخلاص کی دولت ہیں ہمارے ماں باپ

دولت علم ملی ان کی بدولت ہم کو
قابلِ عزّت و عظمت ہیں ہمارے ماں باپ

تربیت کی ہے بڑے ناز بڑے عزم کے ساتھ
مخزنِ علم و محبت ہیں ہمارے ماں باپ

ہر مصیبت سے یہ ٹکرائیں ہماری خاطر
باعث رحمت و برکت ہیں ہمارے ماں باپ

ہم کو تہذیب و تمدن سے سنوارا ہے رضا
پاسبان گل راحت ہیں ہمارے ماں باپ

قاضی پورہ کھنڈرا

انصاف کی ترازو

سید محمود نقوی



ایک زمانے کی بات ہے کہ برما میں لوگوں کے درمیان جھگڑے فساد بالکل نہیں ہوتے تھے، ہر ایک قانون اور انصاف کا پورا دھیان رکھتا۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا کہ دھوکا، فریب یا معاہدہ شکنی کو کوئی واردات ہو جائے۔ اگر اس طرح کا کوئی واقعہ ہوتا تو ججوں کو اس کا فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی اور فیصلہ بھی ایسا ہوتا کہ شک وشبہہ کی کوئی گنجائش بھی باقی نہ رہتی۔

دراصل اس صورت حالی کی وجہ ملکی قوانین پر سختی سے عمل درآمد یا ججوں کی غیر معمولی مہارت نہیں تھی بلکہ چکی کے دو پاٹ تھے جو انصاف کے ترازو کا کام دیتے تھے۔ جب بھی کسی عدالت میں کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو جج اور مصنف صاحبان جھگڑے میں شامل دونوں فریقوں یعنی مدعی اور مدعا علیہ کو اس انصاف کے ترازو کے پاس لاتے اور دونوں ہی پارٹیوں سے علاحدہ علاحدہ چکی کے پاٹوں کے درمیان میں ہاتھوں کو رکھ کر اپنا بیان دینے کو کہتے۔ اگر کوئی شخص جھوٹ اور غلط بیانی سے کام لیتا تو فوراً ہی اس کے ہاتھ چکی کے پاٹوں میں پس جاتے۔ اسی خوف کی وجہ سے لوگ فریب اور جھوٹ سے دور رہتے ہوئے امن وامان سے زندگی گزار رہے تھے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ایک دولت مند سوداگر کو اپنے کاروبار کے سلسلے میں طولانی سفر پر باہر جانا پڑا۔ اس نے سوچا کہ جو سونا میرے پاس ہے اسے ساتھ لے جانے کے بجائے اپنے کسی دوست

۲- کیو بیرج پوری - دہلی ۱۱

کے پاس رکھوا دیا جائے۔ چنانچہ وہ گھر جا کر پہنچا اور جو چار پونڈ سونا اس کے پاس تھا اسے اپنے ایک دوست کو حفاظت سے رکھنے کے لیے سونپ دیا جو اپنی ایمانداری کے لیے کافی مشہور بھی تھا۔

جب سوداگر کو گئے ہوئے کچھ دن گزر گئے تو اس شخص کی نیت خراب ہوئی، کیوں نہ یہ سارا سونا میں واپس ہی نہ کروں، سوداگر تو اور بہت سارا روپیا کما کر لائے گا ہی۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں، ضرورت پڑنے پر کام آئے گا۔ وقت بے وقت کے لیے کچھ تو ہونا ہی چاہیے۔ لیکن سوداگر سے کہا کیا جائے۔ وہ واپس آنے پر اپنی امانت مانگے گا ضرور اور لوٹاؤں گا نہیں تو ہو سکتا ہے وہ مقدمہ دائر کر دے اور جج چکی کے پاٹ میں ہاتھ رکھوا کر بیان لیں۔ پھر ہاتھ بھی زخمی ہوا اور سونا بھی واپس کرنا پڑے۔ اسی سوچ وچار میں کئی دن گزر گئے۔ پھر اسے ایک ترکیب سوجھی، اس نے اپنی چھڑی میں خول کیا اور سارا سونا پگھلا کر اس میں بھر لیا اور چھڑی کا منہ بند کر دیا۔

کچھ عرصے بعد سوداگر سفر سے لوٹ کر آیا تو اس نے اپنی امانت کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اس شخص نے اپنی سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق جواب دیا کہ سونا تو وہ پہلے ہی واپس دے چکا ہے۔

پہلے کب؟ سوداگر نے سوال کیا۔

جب پچھلی بار آپ آئے تھے، اس شخص نے جواب دیا۔

سفر سے لوٹنے کے بعد ہم لوگوں کی یہ پہلی ملاقات ہے، اس کے پہلے ہم لوگ ملے ہی کہاں ؟ سوداگر نے اور وضاحت کی۔

مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اتنی جلدی بھول جائیں گے تو وصول یابی کی رسید لکھوا لیتا۔ اس شخص نے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے کہا۔

بات کافی بڑھ جانے کے باوجود نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ سوداگر اپنے مطالبے پر قائم رہا اور وہ شخص بھی کہتا رہا کہ امانت پہلے ہی لوٹائی جا چکی ہے۔ آخر سوداگر نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ جج نے صحیح فیصلہ کے لیے دونوں آدمیوں کو انصاف کے ترازو کے پاس طلب کیا۔

سوداگر کی حیثیت مدعی کی تھی اس لیے پہلے اسے بیان دینا تھا۔ دونوں پاٹوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر اس نے کہا: "میں مدعی یہ صحیح دعوا کرتا ہوں کہ میں نے چار پونڈ سونا مدعا علیہ کے پاس بطور امانت رکھوایا تھا جو تقاضے کے باوجود مجھے واپس نہیں کیا گیا"۔

عدالت کے کمرے میں لوگوں کی بڑی تعداد اس معاملے کا فیصلہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے موجود تھی۔ جب سوداگر اپنا بیان دے رہا تھا تو سبھی حاضرین کی نظریں چکی کے پاٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ سوداگر کا بیان پورا ہو گیا لیکن چکی کے پاٹوں میں ذرا سی جنبش بھی نہ ہوئی۔ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سوداگر کا دعوا سچ ہونے پر اطمینان کا اظہار کیا۔

اب دوسرے شخص کی باری تھی۔ وہ اپنی عصا کا سہارا لیتا ہوا آگے بڑھا۔ انصاف کے ترازو کے قریب پہنچ کر اس نے سوداگر سے درخواست کی "تھوڑی دیر کو میری چھڑی پکڑ لیجیے تاکہ میں اپنے ہاتھ چکی کے پاٹوں کے درمیان رکھ کر بیان دے سکوں"۔ سوداگر نے بغیر تامل عصا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر اس شخص نے بہت ہی پتے تلے انداز میں اپنا بیان دیا: "میں مدعا علیہ یہ اقرار کرتا ہوں کہ سوداگر نے میرے پاس چار پونڈ سونا بطور امانت رکھوایا تھا لیکن وہ سارا سونا میں مدعی کے ہاتھ میں واپس دے چکا ہوں اور اب اسی کے پاس ہے"۔

پہلے کی طرح اب بھی پاٹوں میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ سارا مجمع حیرت زدہ تھا۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کے متضاد بیانات ہو گئے تھے لیکن چکی کے پاٹوں کو جنبش نہیں ہوئی تھی۔ جج بھی سوچ میں غرق تھا یہ معاملہ کیا ہے۔ مجمع میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ کوئی کہہ رہا تھا ان چکی کے پاٹوں کی زندگی شاید پوری ہو گئی۔ کب تک چلتے سیکڑوں برس تو ہو گئے۔ دوسرے نے رائے زنی کی اب بے ایمانوں کی موج ہو گئی، جو چاہے کرو، کوئی پوچھنے والا نہیں، تیسرے نے اظہار خیال کیا۔

جج نے غور و فکر کے بعد محسوس کیا کہ دونوں میں سے کسی ایک نے بیان دینے میں زیادہ چالاکی سے کام لیا ہے۔ اس نے مدعی اور مدعا علیہ دونوں سے اپنے بیانات پھر سے دینے کو کہا اور وہ خود پوری توجہ سے ساری کارروائی دیکھتا اور سنتا رہا۔ پہلے کی طرح مدعی اور مدعا علیہ دونوں کے بیانات ہو گئے اور چکی کے پاٹوں کو جنبش نہ ہوئی۔ لوگوں میں بے چینی بڑھ گئی۔ جج نے مدعا علیہ سے کہا اپنی عصا مجھے دے دو میں فیصلہ کل سناؤں گا۔

جج نے اپنے کمرے جا کر عصا کو توڑا تو اس کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اس چھڑی کے اندر سونا بھرا ہوا تھا جسے بیان دیتے وقت مدعا علیہ بڑی چالاکی سے سوداگر کے حوالے کر دیتا تھا۔

دوسرے دن عدالت میں پہلے سے زیادہ مجمع موجود تھا۔ لوگ اس اشتیاق میں تھے کہ جج کس طرح فیصلہ کرتا ہے۔ جج نے مدعا علیہ کو مجرم قرار دیتے ہوئے ٹوٹی ہوئی چھڑی کو بطور ثبوت پیش کیا۔ لوگوں میں اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بہت سے لوگ ایک زبان ہو کر کہہ رہے تھے "تبھی تو چکی کے پاٹوں میں کوئی جنبش نہیں ہو رہی تھی"۔

کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد سے چکی کے پاٹوں نے انسانی معاملات میں دلچسپی لینا اور انصاف کرنے میں تعاون دینا چھوڑ دیا۔ لوگ کیسا ہی جھوٹا اور غلط بیان اپنے ہاتھ چکی کے پاٹوں کے درمیان رکھ کر دے دیتے لیکن پاٹوں کو جنبش نہ ہوتی۔ تب ہی سے ججوں کو صحیح فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آنے لگی اور بد دیانت لوگوں کی ہمتیں بڑھتی چلی گئیں۔

قاضی اشفاق اختر

عید

دمشق میں عید کا چاند دیکھ کر ہر طرف خوشی کی لہر دوڑی ہوئی ہے چاروں طرف چہل پہل ہے ہر شخص عید کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ بچے مسرت کے مارے اچھلتے کودتے پھر رہے ہیں اور اپنے نئے کپڑے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ اس خوشی کے عالم میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا بچہ اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے اور اپنی ماں حضرت فاطمہ کے پاس رونے لگتا ہے۔

حضرت فاطمہ : (گھبرا کر) میرے بچے تجھ پر قربان! آج کیوں رو رہا ہے؟ دیکھ تو سب بچے کتنے خوش خوش پھر رہے ہیں۔

بچہ : (سسکیاں بھرتے ہوئے) اماں جان اسی لیے تو روتا ہوں۔ ہمارے خاندان کے سب بچے اچھے اچھے کپڑے پہن کر کل عیدگاہ جائیں گے۔ مجھے پرانے کپڑے پہن کر جاتے ہوئے شرم آئے گی۔

(بچے کو کپڑوں کے لیے روتا ہوا دیکھ کر حضرت فاطمہ کا دل بے قابو ہو جاتا ہے)

حضرت فاطمہ : (بچے کو سینے سے لگا کر تسلی دیتے ہوئے) رو مت میرے لال۔ تھوڑی دیر کے بعد امیرالمومنین آجائیں گے۔ میں ان سے کہہ کر تمہارے لیے بھی نئے کپڑے منگوا دوں گی۔ (یہ سن کر بچے کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھتا ہے)

بچہ : (مسکرا کر) میرے لیے ایک ایسی عبا ضرور منگوا دیجیے

فرمان پورہ اچل پور

جیسی جعفر کو اس کے ابا نے لا کر دی۔

حضرت فاطمہ : ہاں بیٹے ضرور منگوا دیں گے۔

(اتنے میں امیرالمومنین گھر میں داخل ہوتے ہیں)

حضرت فاطمہ : (امیرالمومنین سے) کل عید ہے بنو امیہ کے سب بچوں کے لیے نئے کپڑے بنے ہیں۔ مگر ہمارے بچوں کے لیے خلیفہ ہوتے ہوئے بھی پرانے کپڑے ہیں۔

امیرالمومنین : تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ سلطنت کا کام کرنے کے بدلے میں مجھے صرف دو درہم روزانہ ملتے ہیں۔ اس تھوڑی سی رقم میں کھانے پینے کا انتظام بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ رہا بیت المال تو وہ عام مسلمانوں کا پیسا ہے جس پر یتیموں اور بیواؤں کا حق ہے۔

حضرت فاطمہ :۔ مگر بچے تو رو رہے ہیں۔ ننھا کہتا ہے اسے عیدگاہ جاتے ہوئے شرم آئے گی۔

امیرالمومنین :۔ اچھا اگر تمہارے پاس کوئی زیور ہو تو اسے بیچ کر بچوں کی خوشی پوری کر دو۔

حضرت فاطمہ : میرے پاس تو کوئی زیور نہیں ہے۔ آپ نے خلیفہ ہوتے ہی میرے جہیز کا زیور یہ کہہ کر بیت المال میں داخل کر دیا کہ یہ بیت المال کے پیسوں سے بنا ہے۔ اس لیے اس پر بھی ہمارا کوئی حق نہیں۔

(امیرالمومنین تھوڑی دیر سر جھکا کر کچھ سوچتے رہے اور

پھر بیت المال کے مہتمم کے پاس بچے کے ساتھ گئے تاکہ اس سے پیسے لے کر بچے کو نئے کپڑے خرید دیں)

امیرالمومنین : (مہتمم سے) مجھے اگلے مہینے کا وظیفہ پیشگی دے دو۔

مہتمم : ۔ امیرالمومنین! غلام حکم کی تعمیل کے لیے حاضر ہے۔ لیکن آپ کو یہ کیسے یقین ہو گیا کہ آپ ایک مہینے تک اور زندہ رہیں گے۔ بغیر اس یقین کے آپ مسلمانوں کے پیسے کی ذمہ داری کیوں لیتے ہیں۔

امیرالمومنین :۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) خدا کی قسم تم نے مجھے اس گناہ سے بچا لیا۔ (بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) بیٹے! جو بچے دنیا میں صبر اور شکر کے ساتھ پرانے کپڑے پہن کر گزارا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت میں قیمتی کپڑے پہناتا ہے۔ پرانے کپڑے پہننے میں کوئی شرم نہیں۔

بچہ :۔ تو پھر شرم کس بات میں ہے۔

امیرالمومنین :۔ شرم تو اس میں ہے کہ آدمی خدا کی اطاعت اور مخلوق کی خدمت سے منہہ موڑے اور ظلم و زیادتی یا دھوکے سے روپیا حاصل کر کے اپنی خواہش پوری کرے۔

(بچے کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور دوسرے دن اس نے پرانے کپڑوں میں ہنسی خوشی عید منائی)

علم و ادب

شمس سلطان پوری

علم و ادب کو سیکھو بچو!
علم کی کیاری سینچو بچو!

جس کو ہے حاصل علم کی دولت
کیوں نہ ہو اس کی ہر جا عزت
علم سے ادنا بھی ہو اعلا
ذرّہ بھی ہو جائے پربت

علم و ادب کو سیکھو بچو!
علم کی کیاری سینچو بچو!

علم نہ ہو بے کار ہے جیون
علم ہے ہر انسان کا درپن
خلق ہے موتی علم صدف ہے
علم و ادب سے جگ ہے روشن

علم و ادب کو سیکھو بچو!
علم کی کیاری سینچو بچو!

علم کی ہے کیا شان نرالی
دور ہو اس سے خام خیالی
دیکھو سب اب باغ میں جا کر
پڑھتی ہیں چڑیاں ڈالی ڈالی

علم و ادب کو سیکھو بچو!
علم کی کیاری سینچو بچو!

معرفت نیاز احمد عطا نیوز ایجنسی سلطان پور

سیّد فتح علی انوری

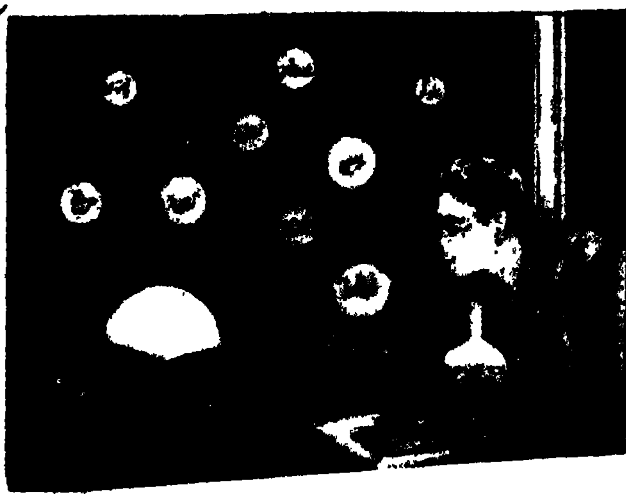
سورج کی آپ بیتی

میں سورج ہوں۔
دہکتا جگمگاتا سورج جو بلا ناغہ ہر صبح مشرق سے نکلتا ہے اور شام کو مغرب میں غروب[1] ہوجاتا ہے۔ دنیا میں زندگی کے آثار میرے ہی دم سے ہیں۔ میری ہی وجہ سے دن رات ظہور[2] میں آتے ہیں۔ میری ہی وجہ سے موسم بنتے ہیں اور میری ہی وجہ سے دُنیا میں وقت کا تعیّن[3] ہوتا ہے۔ میری ہی وجہ سے چاند کو چمک حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ جاہلیت[4] میں لوگ میری پُوجا کیا کرتے تھے۔ جب مجھے گہن لگتا تو میرے پجاری مایوس ہوکر دُعائیں مانگتے اور جب میں گہن سے چھوٹتا تو شادیانے بجاتے، مگر حقیقت یہ ہے کہ میرا خالق[5] اللہ تعالیٰ ہے۔ کائنات میں مجھ جیسے بے شمار سورج موجود ہیں اور ہم سب اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع[6] ہیں۔

میرا اپنا نظام ہے جسے نظامِ شمسی[7] کہتے ہیں۔ اس نظام میں نو بڑے سیارے[8] میرے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کئی سیاروں کے اپنے چھوٹے بڑے چاند بھی ہیں اور میرے اردگرد بے شمار دوسرے اجرامِ فلکی[9] بھی ہیں۔

میری تمازت[10] اس قدر شدید ہے کہ کروڑوں میل تک کوئی چیز میرے نزدیک آنے کی جرأت نہیں کرسکتی۔ میرے سیارے بھی مجھ سے کروڑوں میل دور اپنے مقررہ مداروں پر محوِ گردش[11] رہتے ہیں۔

مثلاً عطارد (MERCURY) مجھ سے تین کروڑ ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ زُہرہ (VENUS) مجھ سے چھے کروڑ ستر لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔ تمھاری زمین مجھ سے نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔ مریخ (MARS) مجھ سے ۱۴ کروڑ بیس لاکھ میل دور ہے۔ مشتری (JUPITER) مجھ سے اڑتالیس کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ زُحل (SATURN) اٹھاسی کروڑ ساٹھ لاکھ میل دور ہے۔ یورینس (URANUS) ایک ارب



---

(۱) ڈوبنا (۲) ظاہر ہونا (۳) مقرر کرنا (۴) جہالت کا زمانہ
(۵) پیدا کرنے والا (۶) ماتحت۔ تابع دار (۷) انتظام (سورج کا
اپنا کام کا ڈھانچا (۸) گردش کرنے والے ستارے (۹) آسمان کے چاند سورج ستارے
(۱۰) [illegible] (۱۱) حدت۔ گرمی (۱۲) چکر میں مشغول

اٹھتر کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ نیپتون (NEPTUNE) دو ارب اناسی کروڑ تیس لاکھ میل اور پلوٹو (PLUTO) تین ارب سرسٹھ کروڑ میل کے فاصلے پر ہے۔

ان سیاروں میں زمین کا ایک چاند ہے۔ مریخ کے دو چاند ہیں۔ مشتری کے بارہ چاند ہیں۔ زحل کے گرد چاندوں کی لڑی ہے اور نو چاند ہیں۔ یورینس کے پانچ اور نیپتون کے دو چاند ہیں۔

اب میری جسامت کا اندازہ لگائیے۔

میرا قطر ۸۶۵۰۰۰ میل ہے اور میرے خط استوا پر میری گردش کی رفتار ۴۰۰ر۴ میل فی گھنٹا ہے۔ زمین کی نسبت میری جسامت تین لاکھ تیس ہزار گنا زیادہ ہے۔ میری سطح پر درجۂ حرارت چھے ہزار ڈگری سینٹی گریڈ ہے میری حرارت ہائیڈروجن اور ہیلیم کے جوہر (ایٹم) کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہی طریقہ ہے جو ہائیڈروجن بم بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔

سائنس داں ہزاروں سال سے میرے راز دریافت کرنے کی کوشش میں ہیں مگر وہ بے چارے میری تمازت اور بے پناہ چمک سے مجبور ہیں، کیوں کہ مکمل گہن کی حالت میں بھی اگر کوئی شخص مجھے ننگی آنکھوں سے دیکھنے کی جسارت کر بیٹھتا ہے تو اُس کی بینائی ختم ہو جاتی ہے سائنس داں گہن کے دوران بڑی احتیاط سے میری سطح کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس طرح میرے متعلق یہ راز دریافت کر سکے ہیں کہ میری سطح پر دھبے ہر گیارہ سال کے بعد گھٹتے اور بڑھتے رہتے ہیں۔ اُنھوں نے گہن کے وقت میری گولائی کے کناروں سے دہکتی آگ کی لپٹیں بھی نکلتی دیکھی ہیں جو ہزاروں میل تک بلند ہوتی رہتی ہیں، میرے اندر ہر لمحہ دہکتی آگ اور جلتی گیسوں کا طوفان بپا رہتا ہے اور بڑے بڑے دھماکے ہوتے رہتے ہیں۔

---

(۱) جسامت مکعب فٹ کے حساب سے۔

تم شاید معلوم کرنا چاہو گے کہ مجھے گہن کیسے لگتا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ ایک کُرہ دوسرے کُرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُس پورے کُرے یا اُس کے کسی حصّے کو تھوڑی دیر کے لیے چھپا لیتا ہے۔ جب مجھے گہن لگتا ہے تو زمین کا چاند، زمین اور میں ایک سیدھی قطار میں آ جاتے ہیں۔ چاند کی تھالی (طباق) میری تھالی کو چھپانے لگتی ہے۔ تھوڑی دیر میں چاند کی تھالی نما شکل میرے سامنے سے پوری طرح گزر جاتی ہے۔ اس طرح چاند گہن کے وقت زمین میرے اور چاند کے درمیان آ جاتی ہے۔

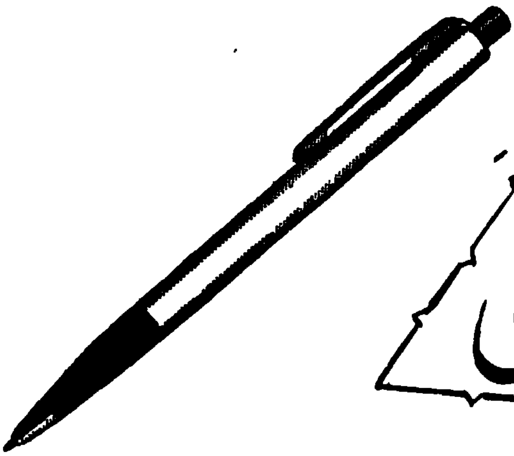
ہماری اس گردش کا کھیل بھی بڑا دل چسپ ہے۔ علم فلکیات کے ماہر لوگ ہماری رفتاروں کا حساب لگا کر گہن لگنے کا ٹھیک ٹھیک وقت پہلے سے ہی بتا سکتے ہیں۔

سائنس داں اور ماہرین علم فلکیات مجھ پر تحقیق کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں۔ علم بہت بڑی دولت ہے اور کچھ بعید نہیں کہ علم کی بڑھتی ہوئی دولت کی وجہ سے وہ لوگ مجھ سے متعلق اور بھی راز جاننے میں کامیاب ہو جائیں۔

---

(۱) آسمان سے متعلق خلا، چاند، سورج، ستاروں اور سیاروں کا علم (یعنی) نجوم، جیوتش وغیرہ (۲) آسمان سے متعلق چیزوں کے واقف کار

(بشکریہ نونہال کراچی)



ولایتی قلم کی چوری

محمد اعظم آمبوری

ناصر کو چوری کا پورا شک اجمل پر تھا۔ ناصر کے ابا نے اس کے لیے ولایت سے جو بہت ہی قیمتی بال پوائینٹ پین لا دیا تھا وہ اس کے اسکول کے بستے سے کل شام غائب ہو گیا تھا۔ کلاس کے سبھی لڑکوں کو معلوم تھا کہ ناصر کے پاس ان کے ابا کا ولایت سے لا کر تحفہ میں دیا ہوا ایک ایسا قلم ہے جس میں ایلکٹرانک گھڑی بھی لگی ہوئی ہے۔ ناصر نے جب اجمل پر شک کرنا شروع کیا تو اس کے دوستوں نے بھی اس کے ہاں میں ہاں ملا کر اس کے شک کو اور بھی مضبوط کر دیا۔

آج پہلا گھنٹہ شروع ہو چکا تھا۔ لیکن اجمل کی سیٹ خالی تھی۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ناصر نے اٹھ کر جب کلاس ٹیچر نظام الدین صاحب سے اجمل کے بارے میں شکایت کی تو انھیں یقین نہیں آیا۔ انھوں نے ناصر سے پوچھا "کیا وجہ ہے کہ تم اجمل پر شک کرتے ہو؟" اس سوال پر سبھی لڑکے ناصر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ناصر کیوں یہ الزام اجمل پر رکھنا چاہتا ہے۔

ناصر ایک بڑے لکھ پتی تاجر کا بیٹا تھا لیکن ناصر جتنا مالدار تھا اتنا ہی اجمل غریب تھا۔ اسکول میں بھی وہ پیوند لگے کپڑے پہن کر آتا تھا۔ اس کی ماں بیوہ تھی اور کپڑوں کی سلائی کر کے اپنا اور اجمل کا پیٹ پالتی تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ اجمل بھی اپنی ماں کی محنت کو رائیگاں جانے نہیں دیتا اور خود بڑی محنت سے پڑھتا ہے لیکن محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ اور لڑکوں کی طرح وہ بھی ذرا کھلنڈرا تھا۔

ایک دن کی بات ہے، اسکول کے گراؤنڈ میں فٹ بال کا کھیل ہو رہا تھا۔ کھیل کے دوران میں ایک بار اجمل نے دوڑ لگائی اور ناصر کے پاس سے گیند اچک کر لے بھاگا۔ یہ دیکھ کر ناصر بھی اس کے پیچھے گیند چھیننے دوڑا۔ لیکن لاکھ کوشش کے باوجود وہ گیند واپس نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا دیکھتے ہی دیکھتے اس بات پر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ہاتھا پائی بھی ہو گئی۔ لڑکوں میں ناصر کے زیادہ ہمدرد تھے اور اجمل کا کسی نے ساتھ دینا ضروری نہ سمجھا۔ یہ دیکھ کر بیچارے اجمل کا دل ٹوٹ گیا اس نے غصے میں آکر ناصر کو بہت برا بھلا کہا اور کھیل ادھورا چھوڑ کر گھر واپس چلا گیا۔ ناصر بھی اپنی بے عزتی برداشت نہ کر سکا اور ترکی بہ ترکی اسے خوب گالیاں دیں۔

اس واقعہ کے بعد ناصر اور اجمل میں دوبارہ دوستی نہیں ہو سکی اور دونوں ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ اجمل ناصر کو جب نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تو جواب میں ناصر بھی اسے بڑی حقارت سے دیکھ کر زمین پر تھوک دیتا۔ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے دھن میں پڑھائی میں بھی خوب محنت کر کے اچھے سے اچھا نمبر حاصل کر کے ایک دوسرے کو کم تر ثابت کرنے کی کوشش کرتے کلاس ٹیچر کے پوچھنے پر کہ وہ اجمل پر کیسے شک کرنے لگا ہے، ناصر نے کلاس ٹیچر کو یاد دلایا۔

پرسوں کل انٹرویل کے وقفے میں ہم سب باہر چلے گئے تھے تو اس وقت اجمل اکیلا کلاس کے اندر ہی رہ گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے پیٹ میں درد ہو گیا ہے۔ وہ پیٹ کے درد کا بہانا کر کے

۱۳۔ موڈ کولاڈ کریملہ گلم، امبور

آپ سے رخصت لے کر گھر چلا گیا۔" یہ سن کر کلاس ٹیچر کا چہرہ گمبھیر ہو گیا۔ انھوں نے اثبات میں اپنا سر ہلایا اور کچھ سوچ کر بولے: "کیا اجمل کے چلے جانے کے بعد تم نے فوراً اپنا بستہ کھول کر دیکھا تھا؟" ناصر نے جواب دیا: "جی نہیں سر! شام کو اسکول کی چھٹی ہو گئی تو میں نے جانے سے پہلے اپنا بستہ کھول کر اندر رکھی کتابوں اور بیاضوں کو ٹھیک ٹھاک کرنے لگا تو معلوم ہوا کہ میرا ولایتی پین غائب ہو گیا ہے۔" ٹیچر متفکر ہو گئے "لیکن تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اجمل نے ہی تمھارا پین اٹھا لیا ہے۔ ایک غریب لڑکے پر الزام لگانا ٹھیک نہیں ہے ناصر میاں!" یہ سن کر ناصر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر دبی دبی زبان میں بولا "سر وہ بڑا شرارتی ہے۔ ضرور اس نے یہ شرارت کی ہوگی۔ دوسرے لڑکوں سے پوچھ لیجیے کہ وہ مجھ سے کتنی نفرت کرتا ہے۔" اس پر کلاس میں "یس سر" بولنے کی اکا دکا آوازیں آئیں۔ ٹیچر نے ناصر کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا "اچھا تم بیٹھ جاؤ۔ اجمل ابھی لوٹا نہیں ہے اگر وہ آج نہیں آئے گا تو اس کی ماں کو اس بات کی رپورٹ بھیج کر تحقیقات کر لیں گے۔" اس کے بعد سب اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئے۔

کلاس ٹیچر سبق پڑھا رہے تھے لیکن ناصر اپنی سیٹ پر بیٹھا بے چین ہو رہا تھا۔ اس کی نظریں بار بار اجمل کی خالی سیٹ کی طرف اٹھ جاتی تھیں اور غصے میں اس کی مٹھیاں بھینچ جاتی تھیں۔ ابھی دوسرا گھنٹہ ختم نہیں ہوا تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر اجمل کلاس روم میں داخل ہوا۔ ٹیچر نے پڑھانا بند کر دیا اور اجمل کے اس طرح دیر سے آنے پر چڑھ گئے "کیا یہی وقت ہے آنے کا؟" سب لڑکے اسے شک اور تعجب سے گھور رہے تھے۔ اجمل نے سہم کر اپنی صفائی میں کہا "جی آج سرکاری دواخانے میں زیادہ ہجوم ہو گیا تھا۔ اس لیے ۔ ۔ ۔" لیکن ٹیچر بیچ میں بول پڑے "دواخانے گئے تھے یا کوئی اور بات ہوئی ہے؟ بتاؤ تم نے ناصر کا ولایتی قلم کہاں چھپا دیا ہے؟" ٹیچر کے اس طرح اچانک ڈانٹنے پر اجمل گھبرا گیا۔ اس نے صاف انکار کر دیا "جی نہیں سر! مجھے ناصر میاں کے قلم کا کچھ پتا نہیں ہے۔" یہ سن کر ناصر چیخ کر بولا "سر! یہ جھوٹ بولتا ہے۔ ضرور اسی نے میرا قلم غائب کر دیا ہے!!" اجمل یہ سن کر غصے میں بھر گیا۔ اس نے لال لال آنکھوں سے ناصر کی طرف دیکھا "زبان سنبھال ناصر میاں! ورنہ میں بہت برا آدمی ہوں!!" ٹیچر نے بیچ میں ڈانٹ دیا تو دونوں خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد ٹیچر نے اپنا رویہ بدل لیا اور نرمی سے اجمل کو سمجھانے لگے کہ ایسی شرارتیں نہیں کرنا چاہیے اور وہ ناصر میاں کو اس کا قلم واپس کر دے۔ لیکن اجمل ہر بار انکار کرتا رہا۔ ٹیچر کے پاس بھی اس کی چوری کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ان کے بار بار ڈانٹنے پر اجمل کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگا۔ آخر کار ٹیچر نے فیصلہ کیا کہ اس کی ماں کو بلا کر اس کے بارے میں پوچھا جائے گا اور اجمل کو کلاس میں بیٹھ جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ کلاس کے سبھی لڑکے اجمل کو شک اور نفرت سے دیکھنے لگے۔ اس کے ساتھ بول چال بھی بند کر دی۔ شام کو جب چھٹی ہو گئی تو اسکول کے باہر آ کر ناصر کے چند دوستوں نے چور کہہ کر اجمل کا منہ چڑانا چاہا۔ یہ دیکھ کر وہ تڑپ گیا اور غصہ سے ناصر پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں گتھم گتھا ہوئے ہی تھے کہ ناصر کے کار کا ڈرائیور دوڑا دوڑا آیا اور اجمل کو پکڑ کر دور ڈھکیل دیا اور ناصر اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا سیدھے اپنی کار میں جا بیٹھا۔ کار تیزی سے روانہ ہو گئی۔ اجمل اپنی جگہ پر دانت پیستا رہ گیا۔

اجمل کے بارے میں اس کی ماں کو جب شکایت پہنچی تو وہ دہائی دینے لگی اور یقین دلانے لگی کہ اس کا بیٹا غریب ضرور ہے لیکن چور نہیں ہو سکتا۔ آخر کار اس چوری کا کچھ پتا تو نہیں چلا البتہ اس واقعہ کا تناؤ کلاس کے اندر بہت دنوں تک موجود رہا۔ لڑکوں نے اجمل کے ساتھ ملنا جلنا بہت کم کر دیا تھا۔ ادھر ناصر ابھی تک پریشان تھا۔ وہ اچھا ہوا کہ ان کے ابا اپنے بیوپار کے سلسلے میں دوبارہ ملک سے باہر چلے گئے تھے اور چونکہ وہ اس واقعے سے ایک دن پہلے ہی چلے گئے تھے اس لیے انھیں ناصر کے نئے نئے قلم کے کھو جانے کا کچھ پتا ہی نہیں چلا ورنہ معلوم نہیں ناصر کو کیسی بڑی سزا ملتی۔

دن پر دن بیتتے چلے گئے۔ رفتہ رفتہ سب بھول گئے کہ کبھی کوئی واقعہ ہوا تھا۔ کوئی بیس پچیس دنوں بعد ناصر کے ابا بھی واپس آ گئے تھے۔ پتا نہیں ناصر نے ان سے کیا بہانا کر دیا تھا کہ دوبارہ اس کھوئے ہوئے قلم کا کچھ ذکر نہ چلا۔ رفتہ رفتہ ناصر اور اجمل کے درمیان جو کھینچا تانی تھی وہ بھی کم ہو گئی۔ ناصر

اندر پہلے سے کچھ بدل گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کمزور ہو گیا ہے یا اس پر اجمل کا پوری طور پر خوف چھا گیا ہے کیوں کہ اس کے اندر پہلی جیسی گرمی نہیں تھی۔ نہ اب وہ اجمل کو پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھتا تھا، نہ اب وہ اس کی طرف انگلی اٹھاتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ مل کر چھیڑنے کی بھی عادت کم ہو گئی تھی۔ بس وہ ٹھیک وقت پر کار میں بیٹھ کر اسکول آتا تھا اور چھٹی ہوتے ہی اسی طرح کار میں بیٹھ کر واپس چلا جاتا تھا۔ شاید پین کے کھو جانے کا ہی غم تھا کہ وہ آج کل بہت غمگین دکھائی دیتا تھا۔ اس کے مسکرانے اور خوش رہنے کی عادت بھی کم ہو گئی تھی۔

ایک دن لیبارٹری میں سائنس کا کوئی تجربہ چل رہا تھا۔ سائنس کے استاد عبدالحمید صاحب کسی کام سے ذرا باہر گئے تو لڑکوں میں چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ کسی لڑکے کے ساتھ شرارت کرتے کرتے اتفاق سے اجمل کا ہاتھ کانچ کے کسی مرتبان سے ٹکرایا اور مرتبان لڑھک کر اپنے ساتھ دو ایک اور برتنوں کو لے کر میز سے نیچے گرا اور چکنا چور ہو گیا۔ اس کے اندر پتا نہیں کیسی دوائیں تھیں کہ ایک دوسرے سے ملتے ہی اس میں سے بدبودار بھاپ جیسا سفید دھواں نکل کر کمرے میں پھیل گیا۔ سب لڑکے کھانسنے لگے۔ اتنے میں عبدالحمید صاحب اندر آئے اور کمرے کے اندر پھیلے ہوئے دھوئیں اور ٹوٹے مرتبانوں کو دیکھا تو لال پیلے ہو گئے غصے میں چیخ کر لڑکوں سے پوچھا "کس نے یہ شرارت کی ہے؟" اجمل کے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔ ڈر کے مارے اس کی زبان بند ہو گئی۔ دوسرے بھی لڑکے اپنا اپنا سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ کسی میں ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اجمل کا نام بتا دے۔ استاد اپنی بید کی چھڑی اٹھا لائے۔ وہ طبیعت کے بڑے سخت اور کٹر تھے۔ بار بار پوچھنے پر بھی لڑکے جب خاموش رہ گئے تو انھوں نے دھمکی دی "تم میں کوئی نام بتانا نہیں چاہتا ہے تو تم میں سے ہر ایک سزا پانے کے لیے تیار ہو جائے!" لڑکے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اجمل کی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اچانک ناصر آگے بڑھا اور ان کے سامنے جا کر ذرا ڈھٹائی سے بولا۔

"سر! یہ غلطی مجھ سے ہو گئی ہے۔ آپ مجھ سے اس کی قیمت لے لیجیے!"

اتنا سننا تھا کہ عبدالحمید صاحب آپے سے باہر ہو گئے "گستاخ! تمھیں اپنی دولت پر اتنا ناز ہے؟ اگر کسی کی جان چلی جاتی یا کوئی نقصان ہو جاتا تو کیا کرتے تم؟! ۔ ۔ ۔" یہ کہتے کہتے انھوں نے پوری شدت سے ناصر پر اپنا ہاتھ چلا دیا اور بے تحاشا بید کی چھڑی سے پیٹنے لگے۔ جب پیٹتے پیٹتے ہانپنے لگے تو غصے سے چھڑی ایک طرف پھینک کر پیر پٹختے ہوئے باہر چلے گئے۔

ناصر اپنا بدن پکڑ کر نیچے بیٹھ گیا تھا اس کی آنکھوں سے درد کے مارے آنسو بہہ رہے تھے۔ سارے لڑکے اس کے گرد جمع ہو گئے سب کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اجمل بھی تیزی سے نادم اور شرمسار اس کی طرف بڑھا۔ وہ بھی بے اختیار رونے لگا تھا۔ اس کی بند زبان کھل گئی وہ بول پڑا "یہ تم نے کیا کیا ناصر! مجھے معاف کر دو ناصر۔ ۔ ۔ یہ الزام تم نے کیوں اپنے سر لے لیا۔ ایسا کیوں کیا تم نے ناصر؟ ۔ ۔ ۔ ۔"

ناصر اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے بڑھ کر اجمل سے لپٹ گیا اور روتے روتے بولا "دوستو اجمل آج سے میرا بھائی ہے"۔ یہ سن کر سب کے منہ سے حیرت اور خوشی کی ملی جلی آوازیں نکلیں ناصر بول رہا تھا "یہ چور نہیں ہے یہ بُرا نہیں ہے۔ دوستو دراصل میں برا ہوں! میں نے اپنی دشمنی کی وجہ سے اس غریب پر شک کیا اس پر الزام لگایا۔ میں نے بڑی جلد بازی کی!! پھر اس نے سب کو اس ولایتی پین کے کھو جانے کی اصل کہانی سنائی "دوستو جب ہمارے ابا جان ولایت سے لوٹے تو میرا کھویا ہوا ولایتی پین مجھے واپس مل گیا۔ دراصل میرے ابا جان جس روز سفر کے لیے روانہ ہوئے تھے اس روز اسکول کی چھٹی تھی۔ میں ابھی بستر میں سویا ہوا تھا اور ابا جان اپنا قلم آفس میں بھول آئے تھے۔ انھوں نے جلدی میں امی جان سے میرا پین مانگ لیا جو انھوں نے میری بے خبری میں بستے میں سے نکال کر انھیں دے دیا اور مجھے بھی یہ بات بتانا بھول گئیں۔ دوسرے دن اسکول میں شام کو میں نے بستہ کھولا تو میرا پین غائب تھا اتفاق سے پیٹ میں درد ہو جانے کی وجہ سے اجمل صبح ہی رخصت پا کر چلا گیا تھا اور اسی لیے میرا سارا شک اس بیچارے پر گیا۔ قلم کے کھو جانے

کا قصہ میں نے ڈر کی وجہ سے گھر میں بھی کسی کو معلوم نہیں ہونے دیا تھا جب ابا لوٹے تو انھوں نے میرا قلم واپس کر دیا۔ اور میں قلم پاکر حیران رہ گیا۔ تب سے دل ہی دل میں پشیمان تھا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا تھا اور دل ہی دل میں اپنے گناہ کی سزا پانے کے لیے تڑپتا تھا۔ میں اپنی غلطی کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ اور دوستو آج کا دن میرے لیے خوشی کا دن ہے۔ آج میں نے اپنا بھائی پالیا ہے۔!" یہ کہنے کے بعد دونوں دوست گلے لگ کر خوب روتے رہے۔ اب یہ رونا خوشی کا رونا تھا۔ ناصر کے ابا کو بھی اس واقعے کا پتا چلا تو انھیں بہت افسوس ہوا اور انھوں نے اجمل کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔

اس طرح غریب اجمل کا اور اس کی بیوہ ماں کے غریبی کے دن بھی آسان ہو گئے۔

مولانا جلال الدین رومی

مولانا جلال الدین ایران کے مشہور و معروف شاعر گزرے ہیں آپ کا اصل نام محمد بن حسین تھا آپ کا وطن یوں تو بلخ ہے مگر آپ بچپن ہی میں روم میں جا بسے اس زمانے میں ایشیائے کوچک کو روم کہتے تھے۔

مولانا ۱۲۰۷ء میں پیدا ہوئے اور بڑی عمر پائی۔ ان کو بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے اتنا پڑھا لکھا کہ اپنے زمانے کے مشہور عالموں میں ان کا شمار ہو گیا۔ دور نزدیک ہر جگہ ان کے علم اور استادی کا چرچا ہونے لگا۔

کہتے ہیں کہ ایک بار ایک قلندر سا شخص ان کے مدرسے میں آیا۔ مولانا حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور پاس کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ آنے والے نے پوچھا "یہ کون سی کتابیں ہیں؟" مولانا نے کہا "یہ تم نہیں جانتے اسے قیل و قال کہتے ہیں"۔ اس نے وہ تمام کتابیں اٹھا کر پانی میں ڈال دیں۔ مولانا کو بہت افسوس ہوا کہا "اے درویش تم نے یہ کیا کیا۔ اس میں تو بعض ایسی کتابیں ہیں جو کہیں نہیں ملتیں"۔

درویش نے پانی میں ہاتھ ڈال کر سب کتابیں نکال لیں۔ جوں کی توں سوکھی نکلیں۔ مولانا کو بہت حیرت ہوئی پوچھا "کیا بات ہے؟" درویش نے کہا "یہ تم نہیں جانتے یہ ذوقِ وصال ہے"۔ اب تو مولانا درویش کے مرید ہو گئے۔ اور اس کے رنگ میں رنگ گئے۔

یہ درویش حضرت شمس تبریزی تھے یہ بہت بڑے بزرگ اور اللہ والے تھے۔ مولانا پر تبریزی کا ایسا رنگ چڑھا کہ انھوں نے پڑھانا لکھانا چھوڑ دیا اپنے پیر کے ساتھ جنگلوں میں، ویرانوں میں وقت بتانے لگے۔

مولانا کے شاگرد چھوٹے، رشتہ دار ٹوٹے، دوست احباب ختم ہو گئے اس کا سبب صرف تبریزی تھے۔ اس لیے وہ ان سب کی نظروں میں کھٹکنے لگے اور لوگوں نے سوچا کہ راستے کا یہ روڑا ہٹا دیا جائے۔

ایک دن مولانا اور ان کے پیر ذکر فکر میں لگے ہوئے تھے۔ کسی نے تبریزی کو پکارا۔ وہ باہر نکلے تو ان پر کچھ لوگوں نے حملہ کر دیا۔ اس وقت ایک ایسی دل ہلا دینے والی چیخ نکلی کہ سب بے ہوش ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ہوش آیا تو دیکھا کہ شمس تبریزی غائب ہیں اور لہو کی چند بوندیں وہاں پڑی ہوئی ہیں۔

مولانا رومی کا اس پر زبردست اثر پڑا۔

وہ اپنے پیر کی جدائی میں اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔ نہ کھانے پینے کی سُدھ نہ پہننے اوڑھنے کا دھیان۔ بس کسی خیال میں ڈوبے ہوئے کچھ دنوں بعد طبیعت میں کچھ سکون ہوا تو اپنے چہیتے دوست اور مرید حسام الدین کے کہنے سے ایک مثنوی لکھی جو فارسی کی بہترین کتابوں میں سے ہے۔ یہ کتاب مثنوی مولانا روم کے نام سے مشہور رہے اس کتاب میں اچھا انسان بننے کی تلقین ہے۔

مولانا سوکھے دماغ والے مذہبی لوگوں کی طرح نہ تھے۔ وہ بڑے مزے کی باتیں کرتے تھے۔ ہنسی ہنسی میں بڑی کام کی باتیں سمجھاتے تھے۔

پرانے زمانے میں ہندستانی مسلمانوں کو اسلامی ملکوں میں ہندو کہا جاتا تھا۔ مولانا نے چار ہندوؤں یعنی ہندوستانی مسلمانوں کا قصہ بڑے دل چسپ انداز میں لکھا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دوسرے کے عیب نکالنے میں انسان خود کیسی

کیسی حماقت کرتا ہے۔ کہانی سمجھنے کے لیے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ مسلمانوں میں نماز کے درمیان میں باتیں کرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ قصّہ یوں لکھتے ہیں۔

ایک مسجد میں چار ہندو آئے ایک دوسرے کا عیب نکالنے کی ان کی عادت تھی چاروں نماز کے لیے کھڑے ہوگئے اور نماز پڑھنے لگے اتنے میں موذن آیا تو ایک نے اس سے پوچھ لیا دوسرے نے جھٹ سے کہا اس نے بات کرلی اس کی نماز جاتی رہی تیسرے نے کہا: "چچا تم اس کو کہہ رہے ہو خود جو بات کرکے نماز توڑ دی" چوتھے نے کہا: "خدا کا شکر ہے سب بولے میں نہ بولا۔" دوسرے کا عیب ڈھونڈنے والوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔

ایک اور موقع پر لکھا کہ کسی بادشاہ نے سنا تھا کہ ہندستان میں ایک ایسا پیڑ ہوتا ہے کہ اس کی پتیاں کھانے سے آدمی نہیں مرتا ہے اور سدا کے لیے امر ہو جاتا ہے اس نے اپنا ایک آدمی ہندستان بھیجا اور بہت سا روپیہ خرچ کیا مگر کوئی ایسا پیڑ ہوتا تو ملتا۔ آخر میں مولانا نے بتایا ہے کہ لوگ بات کی جڑ تک نہیں پہنچتے۔ کہنے کے طریقے ہوتے ہیں یہاں اس درخت سے مراد علم تھا لوگ سچ مچ اسے پیڑ سمجھنے لگے۔ اسی طرح دنیا میں ایک دوسرے کو نہ سمجھنے سے جھگڑے کھڑے ہوتے ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ بات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ لفظوں اور اصطلاحوں کے پھیر میں نہ پڑ جائے۔

مولانا نے انسانوں کی خدمت اور دل کی پاکی پر بہت زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ محبت دنیا کی بہت بڑی دولت ہے۔

بدصورت بڑھیا

ایک تھا گانو۔ اس گانو میں کہیں سے ایک بدصورت بڑھیا آئی۔ اس کا چہرہ بالکل بھیانک تھا۔ اس کی آنکھیں لال لال اور ڈراؤنی تھیں۔ گانو کے لوگ اس سے ڈرنے لگے۔ بچے تو خوف کے مارے گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ گانو والوں نے اس کو گانو سے باہر نکال دیا۔ بے چاری غریب بڑھیا گانو سے دور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔

ایک دن، دو دن، تین دن گزر گئے۔ بڑھیا وہیں بیٹھی رہی۔ وہ تین دن سے بھوکی تھی لیکن کسی نے اس کو کھانا نہیں کھلایا اس کی طرف کسی نے مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔

اس گانو میں رفیق نام کا ایک لڑکا رہتا تھا۔ تیسرے دن وہ جانوروں کو چراتے چراتے وہاں آیا۔ اس نے بڑھیا کو دیکھا۔ بڑھیا پیڑ کے نیچے بھوک سے نڈھال ہو کر پڑی تھی۔ رفیق پہلے تو ڈر گیا لیکن اس کا کراہنا سن کر اس کو ترس آگیا۔ وہ بڑھیا کے قریب گیا۔ اس کے گردن کو اپنے ہاتھ کا سہارا دے کر اٹھایا اور بڑھیا سے سارا ماجرا پوچھنے لگا۔ بڑھیا نے اپنی بپتا سنائی۔ رفیق نے اپنی روٹیاں اس کے سامنے رکھ دیں۔ بڑھیا دیکھتے ہی دیکھتے ساری روٹیاں چٹ کر گئی۔ رفیق نے نزدیک کے جھرنے سے ٹھنڈا اشفاف پانی لا کر اسے پلایا۔ بڑھیا نے رفیق کو دعائیں دیں۔

اب رفیق روزانہ بڑھیا کے پاس جانے لگا اور اس کو اپنی روٹیوں میں سے آدھی روٹیاں دینے لگا۔ رفیق نے اس کے لیے ایک چھوٹی سی جھونپڑی بھی بنا دی اور جھونپڑی کے آس پاس پھولوں کے

انجمن خیر الاسلام اردو ہائی اسکول — بمبئی نمبر ۸ —



پودے بھی لگا دیے۔ بڑھیا خوشی خوشی رہنے لگی۔

گانو کے لوگوں کو یہ خبر معلوم ہوئی تو لوگوں نے رفیق کو گانو سے نکال دیا۔ رفیق کے ماں باپ نہیں تھے۔ رشتے دار بھی نہیں تھے۔ بے چارہ بڑھیا کی جھونپڑی میں رہنے لگا دونوں جنگلی پھل کھا کر رہنے لگے۔

تھوڑے دن بعد بڑھیا طویل علالت کے بعد انتقال کر گئی۔ رفیق نے بڑے اہتمام کے ساتھ ندی کے کنارے اس کو دفن کیا۔ ٹھیک اسی وقت قبر سے ایک پری باہر آئی اور کہنے لگی: "رفیق! تم سچ مچ بڑے رحم دل ہو تم نے ایک بدصورت عورت کی بھی خدمت کی ہے۔ یہ دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی ہوں۔ یہ انگوٹھی انعام سمجھ کر رکھ لو۔ یہ جادوئی انگوٹھی ہے۔ اس کو پہننے کے بعد کوئی بھی تم کو مار نہیں سکتا۔ تم فوج میں داخل ہو جاؤ۔ ابھی کچھ ہی دنوں کے بعد یہاں جنگ شروع ہونے والی ہے۔ اس جنگ میں تم اپنی بہادری کا خوب مظاہرہ کرنا۔ راجا خوش ہو کر تم کو اپنا وزیر اعظم بنا لے گا۔"

اتنا کہہ کر پری نے وہ انگوٹھی رفیق کے ہاتھ میں تھما دی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

پری کی پیش گوئی کے مطابق تھوڑے ہی دنوں میں رفیق وزیر اعظم بن گیا۔ راجا بھی رفیق سے بے حد محبت کرنے لگا۔ راجا کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ صرف ایک لڑکی تھی۔ راجا نے اپنی بیٹی کی شادی رفیق سے کر دی اور مرتے وقت رفیق کو اپنے تخت پر بٹھا دیا اور اس طرح رفیق راجا بن گیا۔

[illegible]



مرتبہ: موثق الدین

ادھر ادھر سے

احمد سیلر ہائی اسکول کی شاندار کامیابی

بھتری آر سوسائٹی، لائنس کلب اور ٹاٹا ڈیپارٹمنٹ کے زیر اہتمام ۱۹۶۸ء سے شروع کردہ اسکول ایجوکیشن پروگرام کے تحت امسال پانچویں مرتبہ احمد سیلر ہائی اسکول نے جذام اور جنون" مضمون نویسی کے مقابلے میں بمبئی کے تمام ہائی اسکولوں پر فوقیت حاصل کی اور اول انعام کا حق دار رہا۔

انجمن خیر الاسلام بوائز اسکول

انجمن خیر الاسلام اردو ہائی اسکول بوائز مدن پورہ بمبئی ۸ کا سالانہ تقسیم انعامات پروگرام اوپن ایر تھیٹر رانی باغ میں ہوا۔ جناب سید احمد ایم ایل اے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور اسکول کی تعلیمی ترقی پر اظہار مسرت کیا۔ آخر میں میونسپل محمد شریف قریشی صاحب کے ہاتھوں ایک سو پندرہ طلبہ کو ڈیڑھ ہزار روپے کے انعامات تقسیم کیے گئے۔

ہاشمیہ ہائی اسکول کو پہلا انعام

نور النساء مشتاق شیخ نیو کھانڈیا اسٹریٹ ہاشمیہ ہائی اسکول کا آر۔ ایس۔ پی، پٹرول

معرفت: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ بمبئی ۳

اپنی کارکردگی اور خدمات کے سبب بی زون میں بے حد مقبول ہے جو ذکریا مسجد اور مینارہ مسجد کے چوراہوں کے ٹرافک سگنل پر روزانہ شام کو لوگوں کی خدمت انجام دیتا ہے۔ گذشتہ سال ہاشمیہ آر۔ ایس پی کی شاندار خدمات کے صلے میں سٹی زن سوسائٹی بمبئی نے اول انعام کا مستحق قرار دیا۔ اور بانکر ہال میں ۱۶ر مارچ ۸۸ء کو ایک رنگا رنگ کلچرل پروگرام میں اسسٹنٹ کمشنر آف پولس (ٹرافک)، کے ہاتھوں، اسکول کو شاندار شیلڈ اور تمام کیڈٹس کو خوب صورت سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔

قاتل مجسمہ

یونان میں ایک مجسمہ ایک راہ گیر پر گر پڑا اور راہ گیر موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ عدالت نے پتھر کے اس مجسمے پر باقاعدہ مقدمہ چلایا اور سزا کے طور پر اسے سمندر میں پھینکنے کا حکم دیا۔

ضخیم ترین اخبار

امریکا کے ممتاز روزنامہ نیویارک ٹائمز کی اتوار ۱۷ر اگست ۱۹۶۰ء کی اشاعت ۸۷۶ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کا وزن تین سیر تھا۔ اب تک دنیا کا کوئی روزنامہ اتنا ضخیم نمبر شائع نہ کر سکا۔

روشنی دینے والے پودے

"ڈیٹم" ایسے سمندری پودے ہیں جو دن سے آدھی رات تک گلابی رنگ کے ہوتے ہیں، پھر وہ نیلے رنگ کے ہو جاتے ہیں اور اس رنگ سے روشنی نکلتی ہے جس سے ارد گرد کا علاقہ منور ہو جاتا ہے۔



اس بار مارچ کے پیام تعلیم نے ایک اور رنگ لیا ہے۔ جغرافیائی مضمون کافی معلوماتی مضمون ہے۔ اس کے علاوہ سکندر ضمیر صاحب کی نظم 'ہمت کا ترانا' اور الف قدم صاحب کی 'اچھی گڑیا' نے پیامیوں کو متاثر کیا۔ کہانیوں میں معین الدین الہ آبادی، سلطان آزاد و مچھلی کا بیاہ نادم سیتاپوری نے متاثر کیا۔ دوشکاری اب دلچسپ، ہوتا جارہا ہے۔ بچوں کی کوششیں بھی کامیاب ہیں خاص کر عمران صاحب، افروز انور واعظمی صاحب کی کہانیاں قابل غور ہیں۔ کچھ کہانیاں ایسی ہیں جو انگریزی و بنگلہ کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

مس شاہین
کلٹی مغربی بنگال

عراق دجلہ اور فرات کا عطیہ بے حد پسند آیا امید ہے معلوماتی مضمون کا سلسلہ برابر جاری رکھیں گے۔

فروری کے پیام تعلیم کو دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی اس ماہ اچھی اچھی کہانیاں اور مضمون پڑھنے کو ملا۔ کہانی میں 'مہمان' 'نیا سویرا'، نظم میں "جاڑا" اور سردار احمد علیگ صاحب کا مضمون مجھے بے پسند آیا امید ہے کہ مجھے آئندہ بھی اسی طرح کے مضامین پڑھنے کو ملیں گے۔ تمام قلمکاروں کو ہمارے جانب سے مبارک باد دے دیں۔ "بچوں کی کوشش" میں "شہید اشفاق اللہ" "دعا اور "دوستانہ" نظم مجھے بہت پسند آئی۔

قمر العارفین
ہسپورہ۔ اورنگ آباد

پیام تعلیم کا تازہ شمارہ ملا۔ اپنی سابقہ روایات کے عین مطابق نہایت دلچسپ اور مفید۔ مجھے کہنے دیجیے کہ اردو میں بچوں کے ادب کی اس تشویشناک کمی کے دور میں پیام تعلیم بچوں کا وہ واحد رہنما ہے جس نے نہ صرف بچوں کو ایک وقیع اور قابل فخر ادبی سرمایہ مہیا کیا ہے بلکہ انھیں ایک صحیح ذہنی سمت بھی عطا کی ہے جو یقیناً آپ جیسے تجربہ کار اور انتھک اہل قلم کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

ظفر گورکھپوری بمبئی۔

مارچ کا پیام تعلیم ملا۔ رنگین سرورق کو دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھا۔ راجا رام موہن رائے کی زندگی پر روشنی ڈالنے والا جناب جاوید اقبال صاحب کا معلوماتی مضمون بے حد پسند آیا۔ امید ہے کہ آپ ایسے ہی معلوماتی مضامین زیادہ سے زیادہ پڑھنے کا موقع عطا فرمائیں گے۔ تاکہ ہم جیسے طالب علموں کو فائدہ ہو۔ کہانیاں اور نظمیں بھی پسند آئیں۔

فیاض احمد بوڈے
پور، رنگم پیٹھ۔ گلبرگہ

اپریل کا پیام تعلیم نظر نواز ہوا۔ اس مرتبہ ٹائیٹل بہت پسند آیا۔ حفیظ جالندھری پر ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کا مضمون بہت پسند آیا۔ علی ناصر زیدی کا کوئلہ، تیل اور گیس بھی معلوماتی ہے لیکن بہت مختصر کہانیوں میں اشفاق اختر کی فرشتہ اور متینہ سعادت کی اعتراف پسند آئیں۔ اشفاق اختر کی کہانی تو حقیقت سے کافی قریب لگتی ہے ایسے واقعات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ نظمیں سب ہی اچھی ہیں خاص طور سے شمس الرحمٰن فاروقی کی ایک گلاس پانی میں دو شکاری میں بھی اب کافی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔

شارق پرویز
ناگپوری گیٹ امراوتی، مہاراشٹر

"قلمی دوستی" میں صرف ۱۲ سال کے بچوں کے نام شائع کیے جائیں گے۔

بچوں کی کوشش



سچا دوست

بہت دن پہلے کی بات ہے۔ کسی جنگل میں چیکو اور بیکو نام کے دو خرگوش رہتے تھے۔ دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی۔ وہ دونوں ہر وقت ساتھ رہتے اور ہر کام ساتھ ساتھ کرتے تھے۔

ایک دن دونوں جنگل میں گھوم رہے تھے کہ اچانک وہ شکاری کے بچھائے جال سے ٹکرا گئے۔ چیکو تو بچ گیا مگر بیکو جال میں پھنس گیا۔ وہ زور زور سے چلا کر چیکو سے کہنے لگا "چیکو میرے دوست میری جان بچالو نہیں تو شکاری مجھے پکڑ کر لے جائے گا اور پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ نہیں گھوم پائیں گے۔"

"تم فکر مت کرو چاہے کچھ بھی ہو میں تمہیں بچا کر ہی رہوں گا۔"

چیکو یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ راستے میں اسے ایک بندر بیٹھا نظر آیا، وہ اس کے پاس گیا اور بولا "بندر ماما، میرے دوست کی جان بچالو وہ شکاری کے جال میں پھنس گیا ہے۔ تمہارے دانت بہت تیز ہیں۔ تم اپنے دانتوں سے جال کو کاٹ دو۔ بندر نے کہا "میں جال کاٹوں گا اور ضرور کاٹوں گا۔ مگر مجھے بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔ پہلے مجھے پھل لا کر دو تب میں جال کاٹوں گا۔" یہ کہہ کر بندر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔

چیکو بنا کچھ کہے وہاں سے چلا گیا اور سیدھا ایک پیڑ کے پاس گیا اور اس سے بولا "پیڑ چاچا، پیڑ چاچا تم میرے دوست کی جان بچالو وہ شکاری کے جال میں پھنس گیا ہے۔ تم مجھے تھوڑے سے پھل دے دو۔ وہ پھل میں بندر ماما کو دوں گا پھل کھا کر بندر جال کو کاٹ دے گا اور میرا دوست آزاد ہو جائے گا۔" پیڑ نے زور سے کہا "میں تمہیں پھل دوں گا اور ضرور دوں گا۔ مگر تم میرے اوپر بیٹھی کالی بلی کو بھگا دو۔" چیکو بنا کچھ کہے وہاں سے چلا گیا اور سیدھا بلی کے پاس گیا اور اس سے بولا "بلی موسی، بلی موسی تم میرے دوست کی جان بچالو۔ وہ شکاری کے جال میں پھنس گیا ہے۔ تم پیڑ پر سے اُتر کر چلی جاؤ۔ تم چلی جاؤگی تو پیڑ مجھے پھل دے گا وہ پھل میں بندر ماما کو کھلا دوں گا۔ پھل کھا کر وہ جال کاٹے گا اور میرا دوست آزاد ہو جائے گا۔"

بلی آہستہ آہستہ بولی "میں اُس پیڑ پر سے چلی تو جاؤں۔ مگر مجھ میں بھاگنے کی ذرا سی بھی طاقت نہیں ہے۔ اگر تم مجھے تھوڑا گائے کا دودھ لا کر دے دو تو میں ابھی چلی جاؤں۔" یہ کہہ کر بلی پیڑ کی اوپر والی شاخ پر بیٹھ گئی۔ چیکو بنا کچھ کہے وہاں سے چلا گیا اور سیدھا گائے کے پاس پہنچا۔ اس نے گائے سے کہا "گائے خالہ گائے خالہ تم میرے دوست کی جان بچالو وہ شکاری کے جال میں پھنس گیا ہے۔ تم مجھے بس تھوڑا سا دودھ دے دو۔ وہ دودھ میں بلی کو دوں گا۔ دودھ پی کر بلی پیڑ سے بھاگ جائے گی۔ پھر پیڑ مجھے پھل دے گا وہ پھل بندر ماما کو کھلا دوں گا۔ پھل کھا کر وہ جال کاٹ دے گا اور میرا دوست آزاد ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گئی کہ تمہاری پریشانی کیا ہے۔ میں تم کو دودھ دوں گی اور ضرور دوں گی۔ مگر مجھے تھوڑی گھاس لا کر دو۔ جب میں گھاس کھاؤں گی۔ تبھی تو دودھ دوں گی۔"

چیکو بنا کچھ کہے وہاں سے چلا گیا۔ گھاس کی تلاش میں وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرا۔ کافی دور چلنے پر اُسے ہری ہری گھاس نظر آئی۔ بڑی محنت کے بعد اُس نے تھوڑی سی گھاس جمع کی۔ گھاس لے کر وہ گائے کی طرف چل پڑا۔ اُس کی ٹانگوں میں بری طرح

[illegible] سا تھا۔ لیکن وہ چپتا ہی گیا اور گھاس گدھے کے آگے رکھ دی۔ اتنی ساری گھاس دیکھ کر گدھے بہت خوش ہوئی۔ اس نے [illegible] جلدی ساری گھاس کھالی۔ گھاس کھا کر اس نے چیکو [illegible] بہت سا دودھ دیا۔

دودھ لے کر چیکو سیدھا بلّی موسی کے پاس گیا۔ جب بلّی نے اتنا سارا دودھ دیکھا تو بہت خوش ہوئی۔ وہ غٹ غٹ کر کے سارا دودھ پی گئی۔ دودھ پی کر اُس نے اپنی زبان کو چاروں طرف گھمایا اور پیڑ سے کود کر جنگل میں بھاگ گئی۔

جب پیڑ نے دیکھا کہ بلی اُس کے اوپر سے چلی گئی ہے تو اس نے چیکو سے کہا کہ "تمھیں جتنے پھل چاہیے توڑ لو۔" چیکو نے بہت سارے پھل توڑ لیے۔ پھل لے کر وہ سیدھا بندر ماما کے پاس پہنچا۔ جب بندر نے اتنے سارے پھل دیکھے تو وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ وہ غپ غپ کر کے سارے پھل کھا گیا۔ پھل کھا کر اُس نے چیکو سے کہا "بتاؤ کہاں ہے تمہارا دوست۔ مجھے اُس کے پاس لے چلو۔" چیکو بندر کو لے کر جال کے پاس گیا۔

بندر نے اپنے تیز دانتوں سے جال کو کاٹ دیا۔ جال کے کٹتے ہی میکو باہر آ گیا۔ تبھی وہاں شکاری آ گیا۔ جس نے جال بچھایا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ خرگوش بھاگ رہے ہیں تو وہ ان کے پیچھے بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک گڈھے میں گر گیا۔ بندر پیڑ پر چڑھ گیا اور دونوں دوست چیکو اور میکو ہنستے، کھیلتے، کودتے اپنے گھر چلے گئے۔

فرخ ریحان

عرفان منزل۔ بدر باغ۔ علی گڑھ

علم کی قیمت

ایک بوڑھی عورت تھی۔ اس کے دو بچّے تھے۔ ایک کا نام شفیع اور دوسرے کا نام رفیع تھا۔ شفیع، رفیع سے تین برس چھوٹا تھا۔ دونوں بھائیوں میں بڑی محبت تھی۔ دونوں اسکول میں پڑھتے تھے۔ شفیع آٹھویں درجے کا طالب علم تھا اور رفیع دسویں درجے کا۔ شفیع اپنے بڑے بھائی سے زیادہ ذہین تھا۔ اس لیے رفیع کو دسویں درجے کی کتابیں پڑھنے میں بھی مدد کیا کرتا تھا۔ بوڑھی عورت پڑھی لکھی تو تھی مگر غریب ہونے کے باوجود بھی اس نے اپنے دونوں لڑکوں کو اچھی تعلیم دینے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ لیکن رفیع پڑھنے کی طرف مائل نہیں تھا۔ وہ اپنے درجے کے دوسرے لڑکوں کی بہ نسبت کمزور بھی تھا۔ اتفاق سے وہ دسویں درجے میں ناکام ہو گیا۔ چونکہ اس کی ماں غریب تھی اور زمین کے چھوٹے سے خطّے کے علاوہ کوئی دوسرا سہارا بھی نہیں تھا۔ رفیع کی ناکامی پر بہت رنجیدہ ہوئی۔ اس نے رفیع سے کہا کہ اگر تم یونہی ناکام ہوتے رہے تو میری اتنی حیثیت نہیں کہ تمھیں پڑھاتی رہوں۔ تم دیکھتے ہی ہو کہ میرے پاس زمین کا چھوٹا سا خطّہ ہے اس سے گھر کا خرچ بھی چلاتی ہوں اور دونوں بھائیوں کو پڑھا بھی رہی ہوں۔ رفیع کو اپنی ماں کی باتیں بری لگیں۔ چند دن وہ ناراض رہا آخر میں اُس نے پڑھائی ترک کر دی۔ شفیع جو اپنے درجے میں ہمیشہ اوّل آیا کرتا تھا اپنے بڑے بھائی کی ایسی حرکت سے بہت رنجیدہ ہوا۔ اس نے رفیع کو بہت سمجھایا لیکن رفیع کا دل ٹوٹ چکا تھا اور اس نے دوبارہ پڑھائی کا ارادہ نہیں کیا۔ شفیع جو بہت ہی عقل مند اور باصلاحیت لڑکا تھا۔ اس واقعے کے بعد پڑھنے کی طرف اور زیادہ مائل ہو گیا۔ اس نے اب کھیل کود سب ترک کر دیا وہ ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایم اے میں اوّل آیا۔ غربت کی وجہ سے اس نے جلد ہی نوکری تلاش کی اور ایک اچھے کالج کا معلم ہو گیا۔ وہ کالج میں بڑی محنت سے پڑھاتا تھا۔ اس لیے کالج کے سارے لڑکے اس کی تعریف کرتے تھے۔ کالج کے معلم ہو جانے کے بعد بھی اس نے پڑھائی کو فراموش نہیں کیا۔ چند ہی برسوں میں اس نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر لی اور اپنی صلاحیت کی بنا پر اس کالج کا صدر بن گیا۔ اس کا بڑا بھائی رفیع جس نے نویں درجے تک ہی پڑھا تھا نوکری کی تلاش کر رہا تھا لیکن اسے نوکری نہیں مل رہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ مایوس ہو گیا۔ علم کی بدولت چھوٹا بھائی شفیع کالج کا صدر بنا اور اس کا بڑا بھائی رفیع جس نے علم حاصل نہیں کیا تھا نوکری کے لیے ترستا رہا۔

سید طارق متین
لکھنیا (بیگو سرائے)

چار نکھٹو شاعر

ایک دن چار نکھٹو شاعر ایک ایک مصرع لکھ کر بادشاہ کے

پاس گئے اور کہا کہ ان مصرعوں کی قیمت ہمیں دے دیجیے۔ بادشاہ نے کہا کہ مجھے مصرع لکھا دو اور کل آکر پیسے لے جانا۔ جس کمرے میں بادشاہ مصرع پڑھ رہے تھے اُسی کمرے میں چور سیندھ مار رہا تھا، بادشاہ نے جونہی پہلا مصرع پڑھا "کھودن تھے بھائی کھودن تھے" چور نے جب اس مصرع کو سنا تو خیال کیا کہ بادشاہ نے مجھے نقب زنی کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے اس لیے وہ خاموش بیٹھ گیا۔ کچھ وقفہ کے بعد بادشاہ دوسرا مصرع پڑھنے لگے "تیر بیر بیر بھائی بیٹھن تھے۔" دوسرا مصرع سن کر چور کو یہ خیال ہوا کہ بادشاہ نے بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا ہے اس لیے وہ سوراخ کے اندر گردن ڈال کر کمرے کے اندر دیکھنے لگا ادھر بادشاہ نے تیسرا مصرع پڑھنا شروع کیا۔ "لمبی گھیچ بل تاکن تھے" تیسرا مصرع سن کر چور نے خیال کیا کہ اب بھاگ جانے میں ہی بھلائی ہے۔ کیونکہ بادشاہ نے جھانکتے ہوئے بھی دیکھ لیا ہے ادھر چور بھاگنے کے لیے کھڑا ہی ہوا تھا کہ بادشاہ نے چوتھا اور آخری مصرع پڑھنا شروع کیا "بھیکم بھیا، بھیکم بھیا" بھیکم چونکہ چور کا اصلی نام تھا اس لیے وہ اپنی جان کی تلافی و معافی کے لیے بادشاہ سلامت کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ گھبرا کر بولے کون ہو تم؟ میں وہی بھیکم چور ہوں حضور! جسے آپ پکار رہے تھے، مجھے کچھ معلوم نہیں اپنے آنے کی تفصیل بیان کرو تو چور نے کہنا شروع کیا کہ جب میں نقب زنی کر رہا تھا تو آپ فرما رہے تھے "کھودن تھے بھائی کھودن تھے" اور جب میں بیٹھ گیا تو آپ کہہ رہے تھے کہ "تیر بیر بیر بھائی بیٹھن تھے۔" اور جب گردن ڈال کر آپ کے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا تو آپ فرما رہے تھے "لمبی گھیچ بل تاکن تھے" اور جب میں بھاگنے کے لیے تیار ہوا تو آپ نے زور زور سے کہنا شروع کیا "بھیکم بھیا بھیکم بھیا" چور کی تفصیل سن کر چور کو تھانے بھیج دیا اور خود سوچنے پر آمادہ ہو گئے کہ اگر یہ لوگ مجھے یہ شعر نہیں دے جاتے تو میں فقیر ہو جاتا اتنے میں صبح ہو گئی اور ان لوگوں کو دو دو اشرفی دے کر ان لوگوں کو گھر بھجوا دیا اور وہ لوگ اپنی زندگی بسر کرنے لگے۔

محمد سیماب برق [illegible] جہانگیر آبادی
رانی گنج، بردوان

جن اور کسان کا بیٹا

ایک تھا کسان اور اس کا ایک بیٹا تھا اس کا نام [illegible] تھا کسان دن بھر کھیت پر کام کرتا اور شام کو گھر آتا۔ ایک دن کسان سخت بیمار پڑا، سارا پیسا اُس کی بیماری میں خرچ ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کا کھیت بھی بک گیا لیکن کسان کی بیماری ٹھیک نہ ہوئی اور اس کا انتقال ہو گیا۔ اُس کے بعد لڑکا کام کی تلاش میں نکلا۔ وہ جب جنگل میں جا رہا تھا تو اس کا پیر ایک پتھر سے ٹکرایا۔ پتھر ہٹا کر اس نے دیکھا کہ ایک سوراخ ہے اس نے سوراخ پر ہاتھ لگایا تو ایک دم سے وہ بڑا ہو گیا اور اس میں سے آواز آئی ڈرو مت میں تم کو کچھ نہیں کہوں گا۔ اصل میں یہ ایک محل تھا وہ محل جن کا تھا، لڑکا اندر چلا گیا اور وہ دونوں آرام کی زندگی گزارنے لگے۔

نور الصباح
اسٹاف کوارٹر جامعہ نگر نئی دلی ۲۵

دو استاد

قاسم اور ہاشم دو دوست تھے۔ قاسم بہت باتونی تھا۔ وہ ہوشیار اور چالاک بھی تھا۔ دونوں دوستوں نے سوچا کہ چلو بادشاہ کے دربار میں جا کر کوئی گپ ہانکی جائے۔ دونوں دربار میں پہنچے بادشاہ نے پوچھا بولو تم لوگ کیا کہنا چاہتے ہو۔

قاسم نے کہا "حضور میں نے دیکھا کہ ایک پتھر کا ٹکڑا دریا میں بہا چلا جا رہا تھا۔" بادشاہ کو غصہ آگیا اس نے کہا "تم جھوٹے ہو پتھر پانی میں ڈوب جاتا ہے۔" قاسم نے کہا حضور ٹھیک فرماتے ہیں۔ مگر میں نے جو دیکھا ہے۔ وہ ہی کہہ رہا ہوں۔

دراصل بات یہ تھی کہ پتھر کا ایک ٹکڑا دریا کے کنارے پڑا تھا اور اُس پر مٹی پڑ کر جم گئی تھی اور کوئی چڑیا اس پر کدو کا بیج گرا گئی اور کدو اس میں لگ گئے اور سوکھ گئے۔ ادھر دریا میں پانی جو بھرا تو کدو کی وجہ سے پانی میں پتھر بھی ہلنے لگا اور جب دریا کا بہاؤ زیادہ ہوا تو پتھر کو اُٹھا لیا۔ کیونکہ پتھر کے چاروں طرف ہی کدو لگ گئے تھے۔ اس لیے پتھر دریا میں تیرتا چلا جا رہا تھا۔ بادشاہ نے اُن دونوں کو انعام دیا اور ان دونوں نے [illegible] کو آدھا آدھا بانٹ لیا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] ایک دریا میں پانی پی رہے تھے۔ [illegible] کی طرف بہہ رہا تھا۔ بھیڑیے کی نظر بھیڑ کے [illegible]۔ اسے دیکھ کر سوچنے لگا کہ اسے کسی نہ کسی طرح کھا جاؤں۔ [illegible] آہستہ بھیڑیے نے اُس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اس کے [illegible] دھمکانے لگا "اے بھیڑ کے بچے! تو پانی کیوں گدلا کر رہا [illegible] کیا اندھا ہے؟ تو مجھے نہیں دیکھتا کہ میں پانی پی رہا ہوں"۔ [illegible] یہ سُن کر پہلے تو بہت گھبرایا اور سہم گیا۔ مگر آخر دل کڑا [illegible] بولا۔ "جناب پانی تو آپ کی طرف سے بہہ رہا ہے۔ پھر میں [illegible] کیوں کر گدلا کر سکتا ہوں"۔ یہ سُن کر بھیڑیا کوئی اور بہانا تلاش [illegible] لگا۔ آخر تھوڑے سے سوچ بچار کے بعد اُس نے کہا "او [illegible] معاش! مجھے خوب یاد ہے کہ دو سال کا عرصہ ہوا تو نے مجھے ایک دفعہ ماں کی گالی دی تھی"۔ بھیڑ کے بچے نے جواب دیا "جناب دو سال تو میری عمر بھی نہیں"۔ اس پر بھیڑیا آپے سے باہر ہوگیا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور بولا "اگر تو نے گالی نہیں دی تو تیری ماں نے گالی دی ہوگی"۔ یہ کہہ کر اس کی طرف جھپٹا اور اُسے پھاڑ کر کھا گیا۔

محمد نسیم اختر
پنچو گرام۔ کلتی (بردوان)

میرا دوست

میرا دوست بہت ہی بہادر ہے۔ جس کا نام سلطان ہے۔ [illegible] اُس کو کالا کہتے ہیں۔ وہ بہت ہی کنجوس ہے۔ اُس کی عادت [illegible] اچھی ہے۔ وہ دسویں کلاس کا طالب علم ہے۔ وہ بڑوں کی بہت عزت کرتا ہے اور چھوٹے بچوں کو پیار کرتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کا [illegible] ہمدردی سے ساتھ دیتا ہے۔ وہ دھیان سے پڑھتا ہے۔ وہ نماز کا بڑا پابند ہے۔ وہ کبھی کسی کی بات دوسرے سے نہیں کرتا۔ وہ [illegible] رحم دل ہے۔ سلطان کی چار بہنیں اور ایک بھائی ہے [illegible] بھائی [illegible] میں تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اُس کے ابا جان [illegible] ہے۔ وہ بھی نہایت ہی سمجھدار انسان ہیں۔ سلطان [illegible] ہے۔ وہ میرے مشکل وقت میں کام آتا ہے۔ [illegible] صاف ستھرا رکھتا ہے۔ وہ اپنے ماسٹر صاحبان کی بہت عزت کرتا ہے۔ وہ کبھی بھی اسکول سے غیر حاضر نہیں ہوتا۔ وہ اسکول لگنے سے پانچ منٹ پہلے اسکول میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ وہ کلاس کے دوسرے دوستوں سے کبھی بھی لڑائی نہیں کرتا۔ وہ جماعت کے اندر خاموشی سے رہتا ہے۔ اُس کے بال چھلے دار ہیں۔ جو کہ دیکھنے میں بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کو حلوہ بڑا پسند ہے۔ ویسے تو وہ تمام چیزیں کھا لیتا ہے لیکن کسی چیز کو بُرا نہیں کہتا۔ اس طرح سلطان میرا بہت ہی گہرا دوست ہے۔

محمد اسلم
مالیر کوٹلہ، پن ۱۴۸۰۲۳

گوگلیموں مارکونی

گوگلیموں مارکونی اٹلی کے ایک شہر بونا میں ۲۵ اپریل ۱۸۷۴ء کو پیدا ہوا۔ گوگلیمو مارکونی ایک مشکل نام ہے اس لیے اسے زیادہ تر مارکونی کہتے ہیں۔ مارکونی کو لاسلکی کا باوا آدم بھی کہتے ہیں۔ اس کی تعلیم گھر میں ہی ہوئی تھی۔ آپ کو معلوم ہے لاسلکی کسے کہتے ہیں؟ بے تار کی کو لاسلکی کہتے ہیں۔ مارکونی سے پہلے کوئی سائنسداں لاسلکی کو کام میں نہ لا سکا۔

بچپن ہی سے مارکونی کو بجلی کی سائنس کا بڑا شوق تھا۔ ۲۱ سال کی عمر میں یہ بات اس کے ذہن میں جم گئی کہ تار کے بغیر بھی بجلی کی لہروں کے ذریعے بات دور دور تک جا سکتی ہے لہٰذا اس نے اپنے گھر پر بہت سے تجربے کیے اور نامکمل آلات کے ذریعے ایک میل کی آواز سننے لگا۔ اس بات کی خبر انگلینڈ کے محکمہ تار برقی کے سب سے بڑے انجینئر مسٹر ولیم کو ہوئی۔ انھوں نے خاص طور سے مارکونی کو بلا بھیجا۔

شروع میں مارکونی اس نتیجے پر پہنچا کہ جتنا اونچا کھمبا ہوگا اتنی ہی دور آواز جا سکے گی۔ لیکن اگر بہت زیادہ دور خبر بھیجنی ہو تو اتنے ہی اونچے کھمبے بھی بنانے ہوں گے۔ یہ بات ناممکن تھی۔ اس لیے اس نے پھر غور کرنا شروع کیا۔ اب اُس نے اپنی تجربہ گاہ سالیبری کے میدان میں قائم کی پھر آخرکار وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ یعنی یہ کہ ساری فضا ایتھر سے بھری ہوئی ہے اس نے سائنس کی طاقت سے لہروں کو دور تک [illegible]

پھیلانے اور کھینچنے میں بھی کامیابی حاصل کرلی۔ مارکونی نے پہلے ایک میل کی خبریں حاصل کی پھر دو پھر چار اور پھر نو میل کی بھی خبریں لے آیا وہ اپنی دھن میں برابر لگا رہا یہاں تک کہ چھ ہزار میل کی خبریں لے آیا۔

ایک واقعہ نے مارکونی کی شہرت میں اور اضافہ کیا ہوا یوں کہ ملکہ انگلینڈ کے بیٹے جارج پنجم جہاز میں سفر کر رہے تھے کہ جہاز ڈوبنے لگا۔ مارکونی نے لاسلکی کے ذریعے دوسرے جہاز کو خبر کی اور اس جہاز نے جارج پنجم کو بچالیا۔

اور اب تو فاصلے کی حد ہی نہیں۔ اس خدمت کے بدولت اُسے ۱۹۱۶ء میں علم طبیعیات کا نوبل پرائز ملا۔ مارکونی کا انتقال ۱۹۳۷ء میں ہوا۔ اور اس طرح دنیا فانی سے ایک اور عظیم سائنسداں اور موجد اٹھ گیا۔

محمد عامر
۱۳۔ مین بازار۔ راؤ کھلا۔ نئی دہلی

سکون

دن کی روشنی آہستہ آہستہ رات کے آغوش میں جارہی تھی۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف پرواز کر رہے تھے پرویز چھت پر بیٹھا ان پرندوں کو دیکھ رہا تھا جو بے فکر ہنسی خوشی اپنے اپنے آشیانے کی طرف لوٹ رہے تھے۔ پرویز سوچ میں ڈوب گیا کہ یہ پرندے بھی کتنے بے فکر اور آزاد ہیں جنھیں کسی چیز کی فکر نہیں ہوتی ہے۔ اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ دن بھر دانے دُنکے چگنے کے بعد شام کو اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ لیکن ایک ہم انسان ہیں جو کڑی محنت بھی کرتے ہیں آفس میں، افسر کی گھڑکی بھی سننی پڑتی ہے۔ پیسہ بھی ڈھیر سارا ملتا ہے۔ لیکن جب گھر لوٹتے ہیں تو وہاں بھی سکون نصیب نہیں ہوتا ہے۔ گھر پر آتے ہی فرمائش شروع شروع ہو جاتی ہے یہ نہیں ہے وہ نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ پرویز نے دیکھا پرندے کا ایک جوڑا سامنے والے درخت پر بیٹھ کر اپنی میٹھی آواز میں چہک رہا ہے۔ پرویز سوچنے لگا کاش میں بھی پرندہ ہوتا اور اپنی میٹھی آواز سے چہکتا اور سکون کی زندگی گزارتا کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور پرویز کے خیالات کا محل چور چور ہوگیا۔ سامنے والا پرندہ خون [illegible] آن گرا اور ایک صاحب نے اپنی چھڑی کا [illegible] پرویز کے دماغ میں ایک جھٹکا سا لگا اور وہ [illegible] ہوگیا کہ اس دنیا میں سکون کسی کو نصیب نہیں [illegible] پرندہ ہو، جانور ہو یا انسان ہو۔

سید ظفر [illegible]
پٹنہ مسلم ہائی اسکول [illegible]

ٹھگ نجومی

کسی گاؤں میں ایک نجومی آیا کرتا تھا اور وہ اپنے آپ کو [illegible] نجومی کہتا تھا اور لوگوں کو الٹی سیدھی باتیں بتا کر اپنا الو سیدھا کرتا تھا۔ ایک دن جب نجومی آیا تو اس کے ارد گرد لوگ جمع ہو [illegible] اور وہ سبھی کا باری باری سے ہاتھ دیکھتا اور الٹا سیدھا سمجھاتا [illegible] کہ اتنے میں ایک بیوہ عورت اس کے قریب آئی اور اس نے نجومی سے کہنا شروع کیا۔ آج سے لگ بھگ دو سال پہلے میرے شوہر مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں اور ان کا کوئی پتا نہیں وہ واپس [illegible] یا نہیں اور وہ کہاں ہیں آپ ہی بتائیے۔

نجومی نے اپنا منتر پڑھا اور پھر اُس عورت سے بولے کہ تمہارا شوہر یہاں سے لگ بھگ ایک ہزار میل کی [illegible] پر جا بسا ہے اور اس نے دوسری شادی بھی کرلی ہے اگر تم [illegible] پانچ کلو چاول تین کلو آٹا اور پچاس روپے دو تو ایسا منتر [illegible] کہ وہ چار دنوں کے اندر یہاں آجائے گا۔ تو اس عورت نے [illegible] شروع کیا کہ ہائے میرا شوہر تو کب کا مر چکا ہے یہ جھوٹا [illegible] ہے تو لوگوں نے اُسے مارنے کے لیے دوڑایا لیکن وہ [illegible] تھا اور پھر غلطی سے بھی اس نجومی نے اس گاؤں میں [illegible] اور گاؤں کے لوگوں نے بھی نجومی سے باتیں پوچھنا بند کر دیا۔

[illegible]

> بچوں کی کوششیں ہیں اب صرف [illegible]
> شائع ہوں گی جو اپنے نام کے ساتھ [illegible]
> لکھیں گے۔

//

گرمی آئی

آئی گرمی آئی گرمی
ہر سو دیکھو چھائی گرمی

سوکھی ڈالی سوکھے پتے
سوکھی دنیا لائی گرمی

لو میں بھی اور بادل میں بھی
کیا رنگت ہے لائی گرمی

بچے بوڑھے سب خوش دیکھو
ہر دل میں ہے سمائی گرمی

بھیا بولے دیکھو منا
کیسی ہے اترائی گرمی

کٹہل جامن، آم اور لیچی
پیڑوں پر لٹکائی گرمی

پنکھے کولر، ریفریجیٹر
لسّی، شربت لائی گرمی

ہوٹل میں بھی رنگت اس کی
جیسے ہو حلوائی گرمی

کیا بہتر ہے موسم اختر
کیا کیا تحفے لائی گرمی

جاوید اختر
انسان اسکول، کشنگنج، پورنیہ (بہار) ۸۵۵۱۰۷

قلمی دوستی

احمد عبدالصمد عمر ۱۲ سال
مشغلہ: پیام تعلیم پڑھنا۔ رسائل اور افسانوں کا مطالعہ کرنا۔
پتا: احمد عبدالصمد ولد محمد ابراہیم صاحب ٹیچر مکان نمبر ۵-۸-۵۰
مومن پورہ (کہنہ پالمور) محبوب نگر ۵۰۰۹۰۱

محمد شمشاد عالم عمر ۱۲ سال
مشغلہ وشوق: تلاوت قرآن کرنا۔ نماز پڑھنا۔ ماں باپ کی خدمت کرنا۔ بڑوں کا ادب کرنا۔
پتا: رحیم پورہ محلہ نمبر ۱ ڈاکخانہ کلٹی ضلع بردوان ۷۱۳۳۴۳

محمد نسیم اختر عمر ۱۷ سال
مشغلہ: وقت پر اسکول جانا۔ قلمی دوستی کرنا۔ فٹ بال کھیلنا۔
پتا: محمد نسیم اختر نیچو گرام۔ کوارٹر ۳ A ۱۹ پوسٹ کلٹی ضلع بردوان

اقبال احمد نظامی عمر: ۱۷ سال ۵ ماہ
نماز و قرآن شریف پڑھنا۔ اخبار بینی۔ بادشاہوں کے قصے سننا
پتا: اقبال احمد خاں وارڈ نمبر ۱۴ بیٹھ پورہ شیگاؤں ۴۴۴۲۰۳ بلڈانہ

میناز علی میاں کارائی
مشغلہ وشوق: کہانیاں پڑھنا۔ روزہ نماز کا شوق رکھنا۔
پتا: میناز علی میاں کارائی، شیر گاؤں، پالگھر (مہاراشٹر)

وجیہ الدین جمال عمر ۱۷ سال
مشغلہ: نماز پڑھنا۔ کہانیاں و افسانے لکھنا، پیام تعلیم پڑھنا۔
پتا معرفت ظہور عالم ہواڈانگہ۔ آسنسول ضلع بردوان

محمد انور عادل عثمانی عمر ۱۴ سال
مشغلہ وشوق: بیڈمنٹن کھیلنا۔ کورس کی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔
پتا: کندوا ہائی اسکول کلٹی ۷۱۳۳۴۳، ضلع بردوان (مغربی بنگال)



بچوں کی کتابیں

ریڈیو فیچر
(جگن ناتھ آزاد)

بچوں کی دلچسپی کے دو مزیدار ڈرامے۔ یہ دونوں ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی ہو چکے ہیں۔

قیمت: ۲/۲۵

اُردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)

ہم سب اُردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن صحیح اُردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے، یہ اسی کتاب سے معلوم ہو سکے گا۔

قیمت: ۲/۵۰

گاندھی باباکی کہانی
(بیگم قدسیہ زیدی)

اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز پیرایے میں لکھی گئی ہے۔

قیمت: ۴/۰۰

پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)

دلچسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ۔ مزیدار کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے۔ آپ بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔

قیمت: ۲/۰۰

جب اور اب
(آصف مجیب)

بچوں کی دلچسپی والی ۵۰، ۶۰ سال پہلے کی ایسی باتیں جو اب پرانی ہو چکی ہیں۔

قیمت: ۱/۷۵

تین اناڑی
عصمت چغتائی

گگو، ببلو اور ٹیٹو — تین نٹ کھٹ لڑکوں کی شرارتوں پر مبنی ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان میں لکھا گیا ہے۔

قیمت ۳/=

جن حسن عبدالرحمٰن
ترجمہ: قرۃ العین حیدر

الہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہوگئی، لیکن اب تو اس جن کا قصہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے صراحی کی قید سے آزادی دلائی ہے۔

حصہ اول ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰

کہاوت اور کہانی
(سیفی پریمی)

روزمرہ بولی جانے والی کہاوتوں اور کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے کہاوتیں وجود میں آئیں۔

قیمت: ۲/۵۰

سرکس
تزئین کار: ڈین گیسپر

سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کتاب میں سرکس کی ڈھیر ساری تصویروں کے خاکے ملیں گے جن میں بچے شوق سے رنگ بھر سکتے ہیں۔

قیمت ۱/۵۰



دہلی ۶ — بمبئی ۳ — علی گڑھ ۱

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

Regd. No. D(SE)-043 **July, 1983.**

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دہلی ۲

پیام تعلیم



ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دلّی ۲۵

اگست ۱۹۸۲ء　جلد ۷۰　شمارہ ۸

اڈیٹر : ــــ ولی شاہجہانپوری

قیمت : ــــ ۲ روپے
سالانہ ۱۸ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

بچوں سے باتیں

عید کی مبارک باد تو ہم پیش کر ہی چکے۔

اس مہینے کی پندرہ تاریخ کو چھتیسواں یوم آزادی منایا جا رہا ہے۔ یہ بھی ایک مبارک تقریب ہے۔ جو ہر سال منائی جاتی ہے

لیجیے اگست کا شمارہ حاضر ہے۔ پڑھیے اور اپنی رائے سے ہمیں بھی آگاہ کیجیے۔ ہم نے کئی بار اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ پیام تعلیم کے لیے مضامین بھی لکھیے۔ یہ خواہش اچھی طرح پوری نہیں ہوتی۔ جو چیزیں آتی بھی ہیں وہ ناقص ہوتی ہیں۔ جی کڑھتا ہے ایسی تحریریں دیکھ کر۔ خصوصی طور پر اتر پردیش کے بچے اُردو کے معاملے میں بہت کچے ثابت ہوتے ہیں۔

اس شمارے میں "دو شکاری" کی قسط پڑھیے، پاکستانی ادیبہ فہمیدہ عتیق صاحبہ اور سیدہ شان معراج صاحبہ پہلی مرتبہ ہماری بزم میں شریک ہو رہی ہیں ان کا دلچسپ مضمون اور نظم پڑھیے اور حظ اٹھائیے۔ ان کے علاوہ اُردو کے ممتاز ادیب مرزا ادیب کی کہانی "ایک بے غرض بڑھیا" کوثر چاند پوری صاحب کی کہانی "چودھویں کا چاند" سید محمود نقوی کا "سلطان کا انتخاب" اور سید فتح علی انوری کا معلوماتی مضمون "کیمرہ" بھی آپ کو یقیناً پسند آئیں گی۔

بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر مقدس ایشیائی قسط اس مرتبہ شامل نہ ہو سکی۔ اس کے لیے ہم ڈاکٹر قمر احمد رضوی اور قارئین سے معذرت خواں ہیں۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

سیدہ شان معراج

یومِ آزادی

یومِ آزادی نے یوں چھڑکا فضاؤں میں گلال
گلستاں سے بھینی بھینی خوشبوئیں آنے لگیں
تتلیاں اپنے پروں سے رنگ برساتی ہوئی
صحنِ گلشن کی روش پہ رقص فرمانے لگیں

قمریاں میٹھے سُروں کے ساز لے کر آ گئیں
بلبلیں مِل جُل کے آزادی کے گُن گانے لگیں
گل سے اپنی نسبتِ معصوم کی کھا کر قسم
اہلِ دل کو عشق کے اسرار سمجھانے لگیں

لیکن اس دن کے لیے اے ہم نشینو، دوستو!
کیسی کیسی بے بہا قربانیاں دینا پڑیں
خونِ دل دینا پڑا، خونِ جگر دینا پڑا
اپنے خوابوں کی حسیں پرچھائیاں دینا پڑیں

خیر اب ہم مطمئن یوں ہیں کہ اے صبحِ وطن
ہم نے کچھ کھو بھی دیا ہے اور کچھ پایا بھی ہے
کیسے کیسے عقل کو دے کر دلاسے روز و شب
روح کو تسکین دی ہے دل کو سمجھایا بھی ہے

اب یہی کوشش ہے دل سے اے عروسِ صبحِ نو
تیری پیشانی پہ اب کوئی شکن آنے نہ پائے
تو نے پہنی ہے جو آزادی کی مالا شوق سے
عمر بھر کوئی کلی بھی اس کی مرجھانے نہ پائے

اپنے گلہائے عقیدت پیش کرتی ہوں تجھے
مختصر یہ ہے محبت پیش کرتی ہوں تجھے

ترین تکلی شاہجہاں پور (یوپی)

ایک بے غرض بڑھیا

مرزا ادیب

ہر سال حضرت عثمان غنیؓ حج کے موقع پر لوگوں کو مدینے سے مکّے لے جاتے تھے اور راستے میں ہر شخص کی ضرورت کا پورا پورا خیال رکھتے تھے اور جب حج سے فارغ ہو جاتے تھے تو اسی طرح واپس اس قافلے کو لے آتے تھے۔ یہ فرض وہ پوری باقاعدگی کے ساتھ ادا کرتے تھے اور اس میں کبھی ناغہ نہیں ہوا تھا۔ مگر ایک سال وہ خلافت کے کاموں میں اس طرح مصروف تھے کہ مدینے سے باہر جانا اُن کے لیے ممکن نہیں تھا، اگر چلے جاتے تو بڑا حرج ہوتا۔ انھوں نے مدینے کی ایک معروف اور ممتاز شخصیت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بلایا اور کہا:

"مجھ پر بہت سی ذمّہ داریاں عائد ہیں۔ میں حج کے لیے جانے والے لوگوں کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ اب میرا فرض تم پورا کرو گے، دیکھنا کسی کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔"

امیرالمومنین حضرت عثمانؓ کا حکم سُن کر حضرت عبداللہ اس قافلے کے سردار بن کر روانہ ہو گئے جو حج کے لیے جا رہا تھا۔ نصف راستہ طے ہوا تو حضرت عبداللہ کو احساس ہوا کہ وہ مدینے سے جتنی خوراک لے کر چلے تھے وہ جلد ہی ختم ہو جائے گی اور لوگوں کو باقی سارا راستہ کچھ کھائے بغیر طے کرنا پڑے گا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جو وہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ امیرالمومنین نے اُن کی ذات پر اعتماد کیا تھا اور تاکید کی تھی کہ کسی کو بھی کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔

جب قافلے والوں نے دیکھا کہ ان کا سردار پریشان نظر آ رہا ہے تو انھوں نے قافلے کے ایک بزرگ سے کہا کہ سردار سے اُن کی پریشانی کی وجہ پوچھیں۔ وہ بزرگ حضرت عبداللہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر بولے "سردار! کیا وجہ ہے کہ آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟"

حضرت عبداللہؓ نے جواب دیا کہ مدینے سے نکلتے وقت ہمیں اپنی ساری ضروریات کا اندازہ لگا لینا چاہیے تھا۔ ایسا نہیں ہوا۔ ہمارے پاس خوراک ختم ہونے والی ہے۔ بھوکے رہ کر کیسے سفر کیا جا سکے گا؟"

بزرگ کہنے لگے "آپ صرف اس وجہ سے پریشان نہ ہوں۔ ہم بھوکے رہ سکتے ہیں۔ البتہ قافلے میں دو آدمی بیمار ہو گئے ہیں، اُن کے لیے کھانے پینے کا ضرور انتظام ہونا چاہیے۔"

حضرت عبداللہؓ نے قافلے کے دو افراد کو طلب کیا اور اُن سے کہا: "قریب کوئی بستی ہو گی۔ وہاں سے جتنی خوراک لا سکتے ہو لے آؤ۔ ہاں قیمت ادا کر کے لانا۔"

دونوں آدمی ایک طرف جانے لگے۔ جنگل میں کہاں گاؤں اور بستی؟ وہ چلتے گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے ایک جھونپڑی دیکھی۔ اُس جھونپڑی کے دروازے پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ ایک آدمی نے عورت کو مخاطب کر کے کہا "اماں! ہمارا قافلہ حج کے لیے جا رہا ہے دو آدمی بیمار ہیں کیا آپ ہمیں کھانے کو کچھ دے سکیں گی؟"

بڑھیا بولی: "میرے پاس صرف تین روٹیاں ہیں اور یہ میرے اور میرے دو لڑکوں کے لیے ہیں۔ ان میں سے میں تمھیں کیا دے سکتی ہوں؟"

دوسرے آدمی نے کہا: "اماں! ہم جو کچھ لے جائیں گے اُس کی قیمت دیں گے۔"

بڑھیا کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا: "کیا تم نے مجھے کوئی دُکان دار سمجھ رکھا ہے کہ میں روٹیاں بیچ دوں۔"

پہلے آدمی نے معافی مانگی اور کہا: "اماں! میرے ساتھی کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ ہمیں بیماروں کے لیے خوراک لے کر جانا ہے ورنہ وہ اور کم زور ہو جائیں گے۔ آپ یوں کریں کہ ہمیں فقط ایک روٹی دے دیں۔ دونوں آدمی آدھی کھا لیں گے۔"

بڑھیا پھر غصّے سے کہنے لگی: "کیا مجھے کمینہ سمجھ رکھا ہے کہ ایک روٹی دوں گی اور باقی دو روٹیاں اپنے پاس رکھوں گی۔ میرے بیٹے اور میں آج کچھ نہیں کھائیں گے۔ تینوں روٹیاں لے جاؤ!" دونوں نے ہر چند اصرار کیا کہ وہ کم از کم اپنے لیے ایک روٹی رکھ لے مگر بڑھیا نہ مانی۔ اس نے تینوں روٹیاں اُن کے حوالے کر دیں۔

قافلے کے آدمی جب روٹیاں لے کر اپنے سردار کے پاس گئے اور اُنھوں نے بتایا کہ ایک بڑھیا نے کیا قربانی کی ہے۔ تو حضرت عبداللہ نے فرمایا۔

"جاؤ اس نیک دل بڑھیا کو لے آؤ۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ آدمی لوٹ گئے۔ اور بڑھیا کو بتا دیا کہ اُن کا سردار اسے دیکھنا چاہتا ہے لیکن بڑھیا نے جانے سے انکار کر دیا۔

"مجھے تمھارے سردار سے کیا لینا ہے۔ اپنے گھر میں ہر طرح خوش ہوں۔"

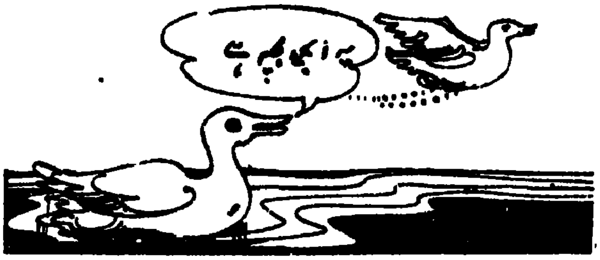
وہ آدمی جس قدر اصرار کرتے تھے بڑھیا اُسی قدر انکار کرتی جا رہی تھی۔ آخر مجبور ہو کر وہ واپس چلے گئے۔ جب حضرت عبداللہؓ کو معلوم ہوا کہ بڑھیا آنے پر تیار نہیں ہے تو اُنھوں نے کہا:

"اُس سے کہو کہ سردار قافلہ چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ سب کی حفاظت میرا فرض ہے۔ تم آجاؤ، یہ تمھاری بڑی مہربانی ہوگی۔"

بڑھیا آگئی۔ حضرت عبداللہؓ نے اُس کی بڑی عزّت کی۔ اُس کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔ اور جب وہ جانے لگی تو بہت سے تحفے اُسے پیش کیے۔ مگر اُس نے کوئی چیز قبول نہ کی۔

"میرے اللہ نے مجھے سب کچھ دیا ہے کسی چیز کی کمی نہیں کبھی ہوگی تو میں اُس سے مانگوں گی۔ وہی دینے والا ہے۔"

بڑھیا نے یہ فقرہ کہا اور وہاں سے چل پڑی۔





فہمیدہ عتیق



پرانے جوتے کی آپ بیتی

"اُف! ارشد میاں رحم کیجیے۔ اس بے دردی سے تو ٹھوکر نہ ماریے۔ میں آپ ہی کا پرانا جوتا تو ہوں مجھے کل آپ کے ابو جان نے ورانڈے میں کھڑے ہو کر اس زور سے سڑک پر پھینکا ہے کہ اب تک ہڈی ہڈی درد سے دکھ رہی ہے۔

"آہ! ارشد میاں وہ بھی کیا دن تھے جب میں صدر کی بڑی دکان کے شوکیس سے ہر پیارے پیارے گول مٹول بچے کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا کرتا تھا کہ یہ بچہ مجھے اگر گھر لے گیا تو یہ اپنے خوبصورت ریک میں مجھے ڈبے میں سجا کر رکھے گا اور میں اس کے تمام جوتوں کا سردار بن جاؤں گا۔ اور پھر یہ ننھا بچہ کسی پارٹی یا پارک میں جب مجھے پہن کر جائے گا تو سب بچے خوش ہو کر للچائی للچائی نظروں سے مجھے دیکھیں گے۔ اور یہ بچہ ہر طرح میری حفاظت کرے گا۔ کبھی اپنے ننھے منے رومال سے میرا منہہ صاف کرے گا۔ اور کبھی بغل میں دبائے پھرے گا جب آپ نے بھی سب بچوں کی طرح مجھ پر نظر ڈالی اور اپنے ابو جان سے مجھے باہر نکلوانے کے لیے کہا تو میں دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا کاش آپ کے ابو مجھے خرید لیں، کیونکہ مجھے توتلی زبان میں آپ کا میرے لیے فرمایش کرنا بہت بھلا لگا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد میں ڈبے میں بیٹھا آپ کے ننھے منے ہاتھوں میں خوشی خوشی جھولا جھول رہا تھا۔

"گھر پہنچ کر آپ نے ڈرائنگ روم میں سب کے منع کرنے کے باوجود مجھے کارنر کی میز پر سجا دیا اور خوش ہو ہو کر اپنے دوستوں کو دکھانا شروع کر دیا۔ ذرا ٹھہریے تو ارشد میاں، مجھے معلوم ہے آپ اس وقت اسکول جا رہے ہیں۔ چند منٹ میری بپتا بھی سن لیجیے۔ خیر، عید پر میں آپ کے دوستوں کے جوتوں میں سب سے خوبصورت تھا۔

"میرا سر فخر سے بلند تھا۔ اور آپ بھی اکڑ اکڑ کر چل رہے تھے۔ میرا ماتھا تو اسی روز ٹھنکا تھا جب آپ نے ایک روز بلی کو مارنے کے لیے مجھے ہی دے مارا۔ اور چند ماہ بعد تو آپ میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ میں اپنی بے عزتی پر پہروں آنسو بہایا کرتا تھا۔ مگر آہ! جب تقدیر بگڑتی ہے تو کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ مجھے آپ سے کیا گلہ۔ کل گھر کی صفائی کے دوران ابو جان نے مجھے بالکل غیر ضروری سمجھ کر یہاں دے مارا۔ تمام رات کی اوس میں بھیگنے اور صبح کی تیز دھوپ سے اکڑ کر میرا حلیہ بگڑ گیا ہے۔ اب اس دنیا میں صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہوں۔ کارپوریشن کی گاڑی آتی ہی ہوگی۔ اس کے جمعدار میرے حلق میں بڑا سا کانٹا ڈال کر مچھلی کی طرح اٹھا کر کوڑے کے ڈھیر میں مجھے بھی شامل کر دیں گے۔ پھر شہر سے دور تمام کوڑے کے ساتھ مجھے بھی جلا دیں گے۔ میں بری طرح درد سے چیخوں گا۔ چلاؤں گا، پھر وہاں ویرانے میں کوئی فریاد سننے والا تو کیا پانی پلانے والا بھی نہ ہوگا۔ اور یوں تڑپ تڑپ کر میری زندگی ختم ہو جائے گی۔ کاش میرے انجام کی خبر ان نئے شوکیس میں سجے سجائے جوتوں کو ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ ان سے باہر قدم نکالنے کا تصور بھی نہ کریں۔ معاف کیجیے ارشد میاں! میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا۔ آپ کو اسکول جانے کو دیر ہو رہی ہے۔ اچھا جائیے، خدا حافظ۔"

کوثر چاند پوری

چودھویں کا چاند



خورشید اکرم ایک بڑے شہر کے معمولی خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ انوار پاپا نے اپنے نام کی مناسبت سے اس کو خورشید اکرم کہنا شروع کر دیا۔ انوار، نور کی جمع ہے۔ خورشید، سورج کو کہتے ہیں۔ اس میں نور ہوتا ہے

گھر میں علم کا بالکل چرچا نہ تھا۔ بڑی بہن یاسمین اپنے ہی شوق سے پڑھنے لگی تھی۔ سب ہی اس پر انگلیاں اٹھایا کرتے تھے کوئی پوچھتا" پڑھ کر نوکری کرو گی" پروفیسر بنو گی کالج میں ؟ ڈاکٹر بنو گی ؛ اور کوئی کہتا دادی" الف" کے نام" بے" نہیں جانتی اور پوتی چلی ہے ماسٹر بننے "

خورشید سات سال کا ہوا تو اس نے یاسمین کے لکھنے پڑھنے پر ٹوکنے والوں کا منہ بند کر دیا۔ یاسمین پڑھے گی۔ نوکری بھی کرے گی۔ اور پروفیسر بھی بنے گی، تم کون ہوتے ہو انھیں نکو بنانے والے"

خورشید بڑا ذہین اور منہ پھٹ تھا۔ اس کے سامنے کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ یاسمین کے کمرے کا بلب بجھا دے یا اس کے پڑھتے شور و غل کرے ۔

خورشید بھی اسکول جانے لگا تھا۔ ایک دن انوار پاپا نے پوچھا۔ تم کیا بننا چاہتے ہو۔ پاپا میں انجینیر بنوں گا۔ اس نے بڑے یقین سے کہا۔ ننھے بچے کی بات پاپا کے دل میں بیٹھ گئی۔ انھوں نے اس کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دی اور اسی دن بینک میں اس کے نام کا حساب کھول دیا تم ضرور انجینیر بنو گے۔ خورشید" پاپا اکثر اس سے کہہ دیا کرتے تھے.

اوکھلا، نئی دہلی ۲۵

ممی جو اللہ والی مشہور تھیں، بیٹے پر جان چھڑکتی تھیں رات کو اپنے پاس سلاتیں، ساری ضدیں پوری کرتیں۔ پاپا کی مجال نہیں تھی کہ خورشید کو انگلی بھی لگا سکیں۔ ناشتہ اپنے سامنے ہی کراتیں، وہ سو کر نہ اٹھتا تو بیٹھی انتظار میں سوکھتی رہتیں۔ اسکول جانے سے پہلے ہی ناشتہ تیار کر دیتیں اور بس آنے سے پہلے ہی ٹفن بکس میں رکھ دیتیں۔ خورشید پڑھنے کا بہت شوقین تھا۔ خوشی خوشی اسکول جاتا، بستہ گلے میں ڈالے، ٹفن بکس ہاتھ میں لیے ہارن پر کان لگائے آنگن میں ٹہلتا رہتا۔ احمد پوچھتا" بھائی جان ٹہلتے کیوں ہو، آرام سے بیٹھ جاؤ۔ بس" آئے گی تو بھوپو بجائے گی۔ آرام اسکول جانے سے پہلے نہیں کیا کرتے، چھٹی کے بعد کرتے ہیں۔ میں اپنے ان کاہل ساتھیوں میں سے نہیں جو اسکول جانے میں ٹال مٹول کیا کرتے ہیں۔ وہ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتا رہتا اور دو منٹ پہلے ہی سڑک پر جا کھڑا ہوتا۔

خورشید بڑی لگن اور جان توڑ محنت سے پڑھتا رہا دسویں کلاس میں پہنچ کر اس نے اول نمبر آنے کے لیے سخت کوشش شروع کر دی۔ لیمپ میز پر رکھے کوئی گیارہ بجے تک سبق یاد کیا کرتا۔ اللہ والی بار بار پکار کر کہتیں سو جا میرے چاند"

"ممی اب تو پورا سبق یاد کر کے ہی لیٹوں گا" خورشید جواب دیتا، کل یاد کر لینا بیٹا "، نہیں ممی، پاپا کہتے ہیں۔ اچھے بچے آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتے "۔ انوار پاپا فائلوں پر نوٹ لکھتے رہتے۔ اور جی ہی جی میں خوش ہوتے اور سوچتے کہ میرا بیٹا ضرور انجینیر بنے گا۔ میں جان بیچ کر بھی اس کو پڑھاؤں گا۔ ادھر اللہ والی بستر پر کروٹیں بدلتی رہتیں، آنکھیں جلنے لگتیں لیکن خورشید پڑھائی میں لگا رہتا۔ راتیں، دن میں بدلتی رہیں اور دن، راتوں میں اور ایک دن آیا جب سارا گھر خوشی میں جھوم رہا تھا۔ یاسمین اور خورشید پاس ہو گئے تھے نا" اور خورشید تو دسویں میں اول آیا تھا۔

گیارھواں درجہ بہت مشکل تھا۔ حساب اور سائنس

نے لوہے کے چنوں کی صورت اختیار کرلی تھی۔ خورشید انھیں منہہ کے دانتوں سے نہیں، ذہانت اور پکے ارادے کے دانتوں سے چباتا رہا۔ اسے انجینیرنگ کالج میں داخلہ لینا تھا۔ رات کی پڑھائی میں خورشید نے ایک گھنٹہ اور بڑھا دیا۔ اب وہ بارہ بجے تک میز پر لیمپ رکھے کرسی پر بیٹھا پڑھتا رہتا۔ اس کے ساتھ اللہ والی بھی جاگتی رہتی بارہ کا گھنٹہ سنتے ہی ان کی پیار بھری آواز کمرے میں گونجتی "سوجا میرے چاند" "ممی ابھی چاند دھرتی ماتا کا پورا چکر نہیں لگا سکا۔ آج تو ایک بجے تک پڑھنا ہوگا۔ اللہ والی اونگھنے لگتیں انوار پاپا اپنے بیڈ روم کا بلب بجھا کر لیٹ جاتے چاند برابر پڑھنے میں لگا رہتا۔

خورشید صرف کتابوں کا کیڑا نہیں تھا بلکہ بڑا ہنس مکھ اور کھیل کود میں دلچسپی لینے والا لڑکا تھا۔ اور بس میں بیٹھ کر راستے بھر ایسے ایسے لطیفے چھوڑتا کہ سننے والوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے اسے بہت سی غزلیں یاد تھیں۔ گلا بھی بڑا رسیلا پایا تھا جب بھی کوئی غزل ترنم سے سناتا تو لوگ جھوم جھوم جاتے کلاس ٹیچر بھی اس سے بہت خوش تھے اور اس کے ساتھی بھی محنت کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔ اپنی محنت اور لگن کی وجہ سے خورشید نے اس امتحان میں بھی شاندار کامیابی حاصل کی اللہ والی پھولی نہ سما رہی تھی۔ خدا نظر بد سے بچائے، وہ پہلے ہی ڈھائی من کی تھی۔ خورشید کے پاس ہونے کی خوشی میں بالکل کپّا ہوگئی۔ یاسمین باجی نے نظر اتاری اور مٹھائی بانٹی اللہ والی نے محلہ کی غریب اور بوڑھی عورت سنّو بوا کے لیے نیا جوڑا نکال کر بھیجا۔ سنّو بوا نے ہاتھ اٹھا کر دعائیں دیں۔ "اللہ کرے تیرا بیٹا انجینیر بنے" "بنگلہ بنائے" "موٹر میں بیٹھے بندوق سے شکار کھیلے" دعائیں دیتے دیتے اس کا منہہ سوکھ گیا۔ اللہ والی کھڑکی میں بیٹھی زور زور سے آمین کہتی رہی اور سنّو بوا نے کہا خدا تو میری عمر بھی اللہ والی کے چاند کو دے دے" تو اللہ والی نے اس پر بھی وہی آمین کی صدا بلند کی۔

احمد، عرفان، یاسمین اور عمران کے ساتھ انوار پاپا بھی ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔

پاپا نے خورشید کو انجینیرنگ کالج میں داخل کر دیا انھیں بہت سا روپیہ دینا پڑا مگر جی میلا نہ ہوا۔ انجینیرنگ میں جا کر خورشید نے اپنی پڑھائی کی وہ دھاک بٹھائی کہ استاد بھی اس پر فخر کرنے لگے۔ کالج سے ڈگری لے کر خورشید ایک چھوٹے شہر میں جو دریا کے کنارے آباد تھا انجینیر ہو کر چلا گیا۔ اللہ والی اسے ایک منٹ کو بھی الگ کرنے پر تیار نہ تھی۔ وہ ساتھ گئی، پھر انوار پاپا نے بھی اپنا وہیں تبادلہ کرا لیا۔ پہلے سب لوگ کرائے کے مکان میں رہتے رہے، پانچ برس گزر جانے پر خورشید نے زمین خرید لی اور اس پر ایک عمدہ سے بنگلہ بنوایا۔ موٹر بھی خرید لی اور بندوق کا لائسنس بھی لے لیا تھا۔ ایک روز خورشید دریا سے مرغابی مار کر لایا۔ اللہ والی کی عید ہوگئی اس نے سوچا آج تو سنّو بوا کی ساری دعائیں قبول ہوگئیں۔ بڑی پہنچی ہوئی عورت تھی۔ مرغابی کو خورشید نے آپ ہی صاف کیا۔ اسے ڈر تھا کہ ممی خوشی میں کہیں پروں سمیت ہی نہ پکا لیں۔

خورشید اپنے چھوٹے بھائیوں کو خوب پڑھا رہا ہے۔ انھیں وقت کے ایک ایک پل کی قیمت بتاتا ہے چھوٹے بھائی بھی خورشید کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ یاسمین سچ مچ لیکچرار ہوگئی ہے۔ پاپا نے اس کی شادی کر دی ہے۔

اللہ والی کا بیٹا چودھویں رات کا چاند ہے۔ چاروں طرف روشنی بکھیر رہا ہے اور پاپا اس کی کرنیں سمیٹ کر سچ مچ "انوار" بنے جا رہے ہیں۔

سلطان کا انتخاب

سید محمود نقوی

سلطان ملکوس اب عمر کی ان حدوں میں داخل ہو گئے تھے جسے بڑھاپا کہا جاتا ہے۔ ضعیفی کے آثار ان کے چہرے سے ظاہر ہونے لگے تھے اور وہ خود بھی سمجھتے تھے کہ اب بہت زیادہ دنوں تک انھیں اس دنیا میں رہنا نہیں ہے۔

انھیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ ان کی اکلوتی بیٹی معصومی کی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی اور اس کے لیے معقول رشتے کی ضرورت تھی۔ شہزادی یقیناً ابھی نوجوان تھی اور اس کی خوبصورتی کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے برابر رشتے بھی آ رہے تھے لیکن کس رشتے کو پسند کیا جائے اور کسے ناپسند یہ مسئلہ طے نہیں ہو پا رہا تھا۔

آخر سلطان نے اپنی بیٹی کو مخاطب کر کے خود اس سے مشورہ کرنا چاہا۔ بیٹی! اب میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، میں چاہتا ہوں جلد تمھارے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔

کیا آپ نے رشتہ کا انتخاب کر لیا ہے؟ شہزادی نے نظریں جھکائے ہوئے سوال کیا۔

نہیں ابھی نہیں۔ سلطان نے جواب دیا۔

پھر کیسے ہوگا؟ شہزادی نے بھولے پن سے کہا۔

جتنے رشتے آئے ہیں ان میں سے ہی انتخاب کیا جائے گا جو سب سے اچھا ہو، جو اس ملک کا انتظام اچھی طرح چلا سکے۔

لیکن یہ انتخاب کس طرح ہوگا؟ معصومی نے مزید استفسار کیا۔

اس کے لیے میں نے طریقہ سوچ لیا ہے، سلطان نے اسے اطمینان دلایا۔ اور اسی دن ان تینوں شہزادوں کو بلانے کے لیے پیغام پر بھیج دیے جنھیں وہ اپنی لڑکی کے رشتے کے لیے مناسب سمجھتا تھا۔

جلد ہی وہ تینوں پہنچ گئے، شاہی خاندان کے تین خوبصورت نوجوان شہزادہ دولتمند، شہزادہ جرأت مند اور شہزادہ دلنواز۔ تینوں ہی خوش شکل اور قد آور تھے، تینوں ہی کی بول چال کا طریقہ بھی بہت دلکش تھا۔ شہزادی معصومی تینوں میں کس کو ترجیح دے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بادشاہ کی پسند کو اپنی پسند پر ترجیح دیتے ہوئے کہا، آپ میرے حق میں جو فیصلہ کریں گے وہ مجھے بخوشی قبول ہوگا۔

سلطان نے تینوں شہزادوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے مخاطب کیا۔ نوجوان شہزادو! میں نے تم لوگوں کو اس لیے زحمت دی ہے کہ میں اب اپنی بیٹی کی شادی کر دینا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے زندگی کے ہمسفر کا انتخاب کرنا ہے۔

تینوں ہی شہزادے مسکراہٹ کے ساتھ جھکے اور سلطان نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ ویسے تو تم تینوں ہی میں اس سرزمین کا سلطان بننے کی صلاحیتیں موجود نظر آ رہی ہیں لیکن ظاہر ہے میری بیٹی کی شادی کسی ایک شخص ہی کے ساتھ ہوگی، اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تم لوگ ایک مہینے سفر میں رہو اور اب کی چودھویں کا چاند سفر ہی میں دیکھو اور دوسرے مہینے چاند کی چودھویں تاریخ کو اپنی پسند کے مطابق شہزادی کے لیے ایک اچھے تحفے کے ساتھ یہاں واپس آ جاؤ۔ تمھارے لائے ہوئے تحفے ہی تمھاری

نیو برج پوری - دلی ۵۱

قسمت کا فیصلہ کریں گے ۔

تینوں ہی شہزادے شوق اور امید کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گئے ۔ چودھویں کا چاند روزانہ گھٹتے گھٹتے بالکل غائب ہو گیا ۔ دو دن کے وقفہ کے بعد نیا چاند نمودار ہوا اور ہر شام اس میں کچھ اضافہ دکھائی دیتا، یہاں تک کہ ایک شام وہ پورا روشن ہو گیا، ہر طرف چاندنی کی چمک دمک پھیل گئی ۔ بگل اور نقارے بجے جن سے تینوں شہزادوں کی آمد کا اعلان ہوا ۔ سلطان نے اپنے سجے ہوئے دربار میں ان تینوں کا خیر مقدم کیا ۔

آپ لوگ میری بیٹی کے لیے کیا بیش قیمت تحفے لائے ہیں، پہلے شہزادہ دولتمند آپ بتائیں سلطان مخاطب ہوا ۔

تعظیماً جھکتے ہوئے شہزادے نے ایک بڑا سا بنڈل کھولا جس میں سے قیمتی ہیرے جواہرات برآمد ہوئے جو شہزادے نے سلطان کے قدموں میں ڈھیر کر دیے

جناب والا! اس سے بڑے عقیق، زمرد اور یاقوت آسانی سے مل نہیں سکتے ۔ میں ان سے شہزادی کے خوبصورت سر کے لیے ایک جگمگاتا ہوا تاج، اس کی دلکش گردن کے لیے ایک بیش قیمت نیکلس، اس کے سڈول بازوؤں کے لیے حسین جوشن اور اس کی نرم و نازک انگلیوں کے لیے دیدہ زیب انگوٹھیاں تیار کرواؤں گا ۔ شہزادہ دولتمند نے ایک زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بات پوری کی اور احتراماً جھکا لیکن بالجواب سلطان خاموش رہا اور دوسرے شہزادے سے مخاطب ہوا

شہزادہ جرأت مند! آپ شہزادی کے لیے کیا تحفہ لائے ہیں؟

احترام کے ساتھ جھکتے ہوئے شہزادہ جرأت مند نے ایک لمبا سا بنڈل کھولا ۔ جس میں سے ایک بڑی سی لوہے کی سلاخ جیسی چیز نکلی جس کے آخر میں لکڑی کا دستہ لگا ہوا تھا ۔ شہزادہ اسے اپنے ہاتھ میں لے سلطان کی طرف بڑھا ۔ جناب والا! یہ ایک بندوق ہے یہ بہت طاقتور ہتھیار ہے جو بڑے ملکوں میں جنگ یا لڑائی میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ یہ بڑی تیزی سے اور صحیح نشانے کے ساتھ دشمن کو مار سکتا ہے ۔ آپ کی فوج کے پاس یہ جدید ہتھیار ہو تو کوئی بھی دشمن حملے کی ہمت نہیں کر سکتا بلکہ اس کے سہارے سے آپ دوسرے ملکوں کو جیت سکتے ہیں ۔ اس طرح آپ بہت طاقتور بادشاہ بن سکتے ہیں اور کوئی آپ کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا ۔

اس کی باتیں سن کر دوسرے شہزادوں پر ایک خوف سا طاری ہو گیا ۔ سلطان نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بہت سے موجود درباریوں اور سپاہیوں کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی ۔

پھر سلطان شہزادہ دلنواز سے مخاطب ہوا بیٹے آپ کے پاس کیا تحفہ ہے؟

شہزادہ ادب کے ساتھ آگے بڑھا اور شرمندگی بھرے لہجے میں اس نے کہا جناب والا! مجھے معاف فرمائیں میں شہزادی کے لیے کوئی تحفہ نہیں لایا ہوں۔

کیا تم شہزادی کے لیے کچھ بھی تحفہ نہیں لائے، کیا میں صحیح سن رہا ہوں؟

جی ہاں جناب ایسا ہی ہے ۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں بغیر تحفہ کے حاضر ہو گیا ہوں ۔ اور پھر بھی شہزادی سے شادی کا خواہش مند ہوں ۔ دراصل میں اتنا مصروف رہا کہ شہزادی کے لیے کوئی اچھا تحفہ تلاش نہیں کر سکا ۔

تم کس کام میں مصروف رہے کہ تحفہ خریدنے کی بھی فرصت نہیں ملی؟ سلطان نے وضاحت چاہی

جناب والا! جب میں یہاں سے روانہ ہوا تو راستے میں مجھے ایک غریب اجنبی ملا، زخموں سے جس کی حالت بہت خراب تھی ۔ میں نے اس کی مرہم پٹی

ور اس کی تیمار داری کرتا رہا، اور قابل ہوگیا کہ اپنی دیکھ بھال خود کر سکے ن کے پاس سے روانہ ہوگیا۔ تھوڑی ہی دور رہی ہوئی عورتوں اور بچوں کا ایک گروہ اپنے گھر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے ان کے گاؤں کو تباہ کر دیا۔ ان کے زیادہ تر مرد ڈاکوؤں سے مقابلے میں مار ڈالے گئے یا زخمی ہوگئے۔ ان کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا گیا اور ان کے گھروں پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ ان کے کچھ ہی مرد بچے تھے جو ڈاکوؤں سے بدلہ لینا چاہتے تھے لیکن ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ کیونکہ ان کو سہارا دینے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے ان کی ہمت بندھائی، انھیں ہتھیار خرید کر دیے اور پھر اچانک ایک دن حملہ کر کے ڈاکوؤں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ زیادہ تر ڈاکو مقابلے میں مارے گئے جو بچے وہ گاؤں چھوڑ کر بھاگ لیے۔ اس کے بعد بھی مجھے کئی دن وہاں ٹھہرنا پڑا کیونکہ زخمی لوگوں کی دیکھ بھال کرنی تھی، جو لوگ مارے گئے تھے ان کے دفن کفن کا انتظام کرنا تھا اور بیوہ عورتوں و یتیم بچوں کو پھر سے بسانا تھا اور خود میرے بھی ڈاکوؤں سے مقابلے میں کچھ چوٹیں آگئی تھیں۔ ان کا علاج بھی کرنا تھا۔ ان سب کاموں میں ایسا مشغول رہا کہ مجھے تحفہ خریدنے کا دھیان نہیں رہا۔ اور جب پورے ہوتے ہوئے چاند پر میری نظر پڑی تو خیال آیا کہ میں کس لیے سفر پر روانہ ہوا تھا۔ پھر اتنا وقت نہیں تھا کہ میں کوئی اچھا تحفہ تلاش کر پاتا اس لیے سیدھا آپ سے معافی مانگنے کے لیے حاضر ہوگیا۔

سلطان نے نظریں اٹھائیں جن میں آنسوؤں کی نمی اور چمک تھی۔ اور اشارے سے شہزادے کو قریب بلایا، اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اسی شہزادہ دلنواز کے ساتھ میری بیٹی کی شادی ہوگی، جو بظاہر کوئی تحفہ تو نہیں لایا لیکن جن کے ہاتھوں پر کچھ تازہ زخموں کے نشان ہیں جو مستحق انسانوں کی مدد کا فرض انجام دینے میں اسے بطور تحفہ وصول ہوئے ہیں اور جنھیں میں اپنی بیٹی کے لیے قبول کرتا ہوں۔



دہلی

ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی

دلی ہمارے ملک ہندستان کا دل، یہاں کی راجدھانی ہے لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ کتنی بار اجڑی اور پھر کتنی بار کہاں کہاں آباد ہوئی ہوئی کی خاص خاص تاریخی عمارتیں کون سی ہیں اور کس بادشاہ نے کب سے کب تک یہاں حکومت کی اس کتاب میں یہی سب باتیں بتائی گئی ہیں۔ بچوں کے لیے ایک انتہائی دلچسپ اور مفید معلوماتی کتاب۔

قیمت ۲/۵۰

امتہ الرحمٰن محسنی

دو شکاری

قسط نمبر



باب ۸

اس گھپ اندھیرے اور جنگل کے سناٹے میں آدھی رات کے وقت تنہا کھڑے ہوئے میں کیا محسوس کر رہا تھا یہ بیان کرنا میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ تنہائی کا احساس مجھے کچلے ڈال رہا تھا، موت کی سی خاموشی کے درمیان صرف میری ہی آواز تھی جس کی بازگشت میں سن رہا تھا۔ میں خاموش ہو کر کسی آواز کے سننے کا انتظار کرتا تھا۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا کہ میرے ساتھ پورا جنگل بھی کسی آواز کے سننے کا انتظار کر رہا ہے۔

میں نے ٹارچ روشن کی اس کی لمبی سفید روشنی میرے سامنے پھیل گئی۔ اس سے کم از کم میں دیکھ تو سکتا تھا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ چوکیدار مجھے دیکھ لے گا۔ مگر اس وقت مجھے چوکیدار کی پروا نہیں تھی۔ مجھے تو صرف ابو کی فکر تھی میں ان کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جنگل کے اندر پہنچ کر میں زور زور سے آوازیں دینے لگا۔ "ابو! ابو! آپ کہاں ہیں؟"

آوازیں دینے کے بعد میں سننے کے لیے رک جاتا تھا۔ مگر کوئی جواب سننے میں نہیں آرہا تھا۔ آوازیں دیتے رہنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میری آواز کپکپا رہی تھی اور کچھ احمقانہ باتیں میرے منہ سے نکل رہی تھیں۔ جیسے ابو بتایئے نا آپ کہاں ہیں؟ میں دانی ہوں مجھے جواب تو دیجیے! جب میں چپ ہو کر جواب سننے کی کوشش کر رہا تھا تو مجھے لگا میں نے کہیں سے آتی ہوئی ہلکی سی آواز سنی ہے۔ یا پھر میرا یہ وہم ہی ہو۔ میں دوبارہ سننے کے لیے بالکل ساکن ہو گیا۔ وہ آواز پھر آئی۔ اور میں اندازہ لگا کر آواز کی طرف بھاگا اور چلا کر کہا۔ "ابو آپ کہاں ہیں؟ میں دانی ہوں۔"

جب میں سننے کے لیے رکا تو آواز اتنی اونچی تھی کہ یہ الفاظ میری سمجھ میں آگئے تھے۔ "میں یہاں ہوں"۔ اور میں نے پہچان لیا کہ یہ ابو ہی کی آواز ہے۔ اس وقت میری خوشی کا یہ عالم تھا کہ میری ٹانگیں تک کانپ اٹھیں۔

"دانی تم کہاں ہو؟" ابو نے آواز دی۔

"ابو میں یہاں ہوں۔ میں آرہا ہوں!"۔

میں روشن ٹارچ کی شعاعوں کی رہنمائی میں آواز کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اب درخت دور دور تھے اور زمین پر ایک موٹا پتوں کا فرش بچھا ہوا تھا میں آسانی سے چل رہا تھا۔ اب میں آوازیں نہیں دے رہا تھا بس بڑھے چلا جا رہا تھا کہ اچانک آواز آئی "دانی رک جاؤ" ان کی یہ آواز میرے بالکل سامنے سے آئی تھی۔ دوبارہ پھر آواز آئی "دانی بس یہیں رک جاؤ"! میں رک گیا اور زمین پر ادھر ادھر روشنی ڈالنے لگا۔ مگر وہ نظر نہیں آئے۔ میں نے تھوڑی اونچی آواز میں پوچھا۔ "ابو آپ کہاں ہیں؟"

"میں نیچے ہوں! خوب اچھی طرح دیکھ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھو! دیکھو گر نہ پڑنا۔"

میں بہت احتیاط سے سرکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا مجھے اپنے سامنے ایک کھائی نظر آئی۔ اس کے منہ تک پہنچ کر اندر میں نے روشنی ڈالی اور ابو وہاں زمین پر نظر آگئے۔ انھوں نے اوپر دیکھ کر کہا۔ "شکر ہے میری جان تم آگئے۔"

"ابو آپ ٹھیک تو ہیں؟" میں نے خوشی میں چلا کر پوچھا۔

ابو نے کہا۔ "یہاں گرنے سے شاید میرا ٹخنہ ٹوٹ گیا ہے۔"

وہ کھائی چوکور کھدی ہوئی تھی۔ اور ہر طرف کی دیواریں چوڑی ہموار تھیں۔ لیکن اس کی گہرائی تقریباً بارہ فٹ تھی۔ اور دیواریں بالکل

مسکن۔ دودھ پور علی گڑھ

...کسی مشین سے کھودی گئی تھیں
...کے گھٹنے میں تکلیف بہت زیادہ ہے؟
...میں درد بہت زیادہ ہے۔ لیکن تم پریشان نہ ہو سب
...گا۔ بات یہ ہے کہ مجھے یہاں سے سورج نکلنے سے پہلے نکل
...چوکیدار جانتے ہیں کہ میں یہاں ہوں۔ جیسے ہی صبح کا اجالا ہوگا
...مجھے دیکھنے آجائیں گے۔" کیا یہ کھائی انھوں نے لوگوں کے پکڑنے
...لیے بنائی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں"! انھوں نے جواب دیا۔

کھائی کے اوپر میں نے روشنی ڈال کر دیکھا۔ چوکیداروں نے کھائی کے منہ کو پتلی لکڑیوں اور پتوں سے ڈھک رکھا تھا۔ جیسے ہی ابو کا قدم اس پر پڑا ہوگا۔ وہ ڈھانچہ پتوں اور ابو سمیت نیچے گر پڑا ہوگا۔ یہ بالکل ویسی ہی کھائی تھی جیسے افریقہ میں جنگلی جانوروں کے پکڑنے کے لیے بنائی جاتی ہے۔

میں نے ان سے پوچھا۔ "کیا چوکیداروں نے آپ کو پہچان لیا تھا؟"

"نہیں"! ابو نے کہا۔ "دو آدمی مجھے دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ مجھ پر روشنی ڈالی اور خوب اِدھر اُدھر روشنی ڈال کر دیکھتے رہے۔ مگر میں نے اپنا چہرہ اپنے بازوؤں میں چھپا لیا تھا وہ مجھے پہچان نہیں سکے۔ میں نے انھیں قیاس آرائی کرتے سنا! لوگوں کے نام بھی لے رہے تھے مگر میرا نام نہیں لیا تھا۔ ایک نے مجھے سنا کر کہا۔ ٹھیک ہے ہم صبح کو دیکھ لیں گے کہ یہ کون ہے۔ میں کچھ نہیں بولا۔ کیونکہ میں اپنی آواز ان کو سنانا نہیں چاہتا تھا۔ پھر بولے سوچ لینا جب صبح کو ہم نکالنے آئیں گے تو ہمارے ساتھ کون ہوگا۔ بتائیں! کون ہوگا۔ خود شہباز صاحب! وہ ہی تم کو خوش آمدید کہیں گے۔ دوسرے نے کہا مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا کہ جب تم ان کے سامنے ہوگے تو تمھارے ساتھ ان کا کیا سلوک ہوگا۔ یہ کہہ کر دونوں ہنسنے لگے اور چلے گئے۔ اف اوہ! میرا ٹخنہ"!

"ابو کیا چوکیدار یہاں سے چلے گئے ہیں"؟ "ہاں وہ رات کے لیے چلے گئے ہیں۔"

میں کھائی کے منہ پر جھکا ہوا اندر دیکھ رہا تھا میرا دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح اندر پہنچ کر ابو کو تسلی دوں اور یہ میری ایک احمقانہ خواہش تھی۔

ابو نے پوچھا کیا بجا ہے۔ ذرا روشنی نیچے کرو میں وقت دیکھ لوں"۔

انھوں نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا "تین بج کر دس منٹ! مجھے سورج نکلنے سے پہلے ہر حالت میں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"ابو" میں نے کہا۔ "ہاں دانی"! ابو نے پوچھا "تم یہاں کیسے آئے؟" "میں یہاں کار میں آیا ہوں۔ بے بی آسٹن میں"۔

"کیا کہا تم نے! بے بی آسٹن کو چلا کر یہاں لائے ہو؟"

"جی ہاں"۔

"یہ کیا حماقت تھی۔ یہ بالکل تمہاری جھک تھی"۔ انھوں نے گھبرا کر کہا۔

"مجھے اس کو چلانے میں اور یہاں لانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی" میں نے کہا۔

"سوچو تو اگر وہ چھوٹی سی چیز کسی شے سے ٹکرا جاتی تو تم تو ختم ہو گئے تھے"۔ "ابو وہ بہت عمدہ چلی تھی"۔

"اور اب وہ کہاں ہے"؟ "جنگل کے باہر ٹیلوں والی سڑک پر"۔ میں نے دیکھا کہ اس دوران تکلیف کی وجہ ان کا چہرہ سکڑ گیا تھا اور سفید پڑ گیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ ابو"۔

"میں ٹھیک ہوں" انھوں نے کہا۔ وہ اس گرم رات میں بھی تھرتھرا رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "اگر آپ کسی طرح باہر نکل آئیں تو میں آپ کو گاڑی تک لے جاؤں گا۔ آپ مجھ پر جھک کر ایک ٹانگ سے چل سکتے ہیں"۔

"سوال تو نکلنے کا ہے۔ یہاں سے سیڑھی بغیر نکلنا ممکن ہی نہیں ہے"۔ "ابو رسی سے کام چل جائے گا" میں نے پوچھا۔

"رسی! ہاں اس سے تو کام چل سکتا ہے"۔

"بے بی آسٹن میں دو رسیاں رکھی ہیں۔ پرکاش جی اپنی کار میں رسیاں ضرور رکھتے ہیں۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں"۔

میں ان کو چھوڑ کر رسیاں لینے بھاگ گیا۔ جنگل کے باہر کھڑی کار کی پچھلی سیٹ اٹھائی اور دونوں رسیاں نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لیں اور جھاڑیوں میں سے گزر کر جنگل میں آگیا۔ اور پھر آواز دی "ابو آپ کہاں ہیں"؟

"میں بالکل قریب ہوں"۔ انھوں نے جواب دیا۔ ان کی

آواز کی رہنمائی میں وہ جگہ پانے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ جگہ پر پہنچ کر میں نے کہا "ابو میں رسی لے آیا ہوں۔" "اب یہ کرو کہ اسے کسی پاس کے درخت سے باندھ دو۔" انھوں نے کہا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں ایک پاس کے درخت سے اسے باندھ دیا۔ دوسرے سرے کو ابو کے سامنے کھائی میں لٹکا دیا۔ اسے پکڑ کر وہ کھڑے ہوئے اور ہاتھوں کے ذریعہ خود کو اوپر دھکیلنے لگے جب وہ اوپر اٹھنے کی کوشش اچھل کر کرتے تو ان کا مڑا ہوا پیر دیوار سے ٹکراتا اور تکلیف کی وجہ سے ان کے منہ سے آہ نکل جاتی۔ میں نے پوچھا "ابو آپ چڑھ سکتے ہیں؟"

"ہاں! چڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم نے رسی کو خوب مضبوطی سے باندھ دیا نا؟"

"جی ہاں! آپ اطمینان سے چڑھتے رہیے۔" میں کھائی کے کنارے پر اوندھا لیٹ گیا اپنے ہاتھ اندر لٹکا لیے تاکہ جیسے ہی پہنچ تک آئیں میں ان کو باہر آنے میں سہارا دوں۔ میں نے جلی ہوئی ٹارچ کنارے پر رکھ دی تھی۔ وہ کہنے لگے میں صرف ہاتھوں سے چڑھ رہا ہوں۔ اور میں رسیوں پر ان کے ہاتھ کی گرفت دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ کنارے کے قریب آئے میں نے اپنا پورا زور لگا کر ان کا بازو اوپر کھینچنا شروع کر دیا۔ ادھر وہ اپنے سینے اور پیٹ کو کھسکا کر باہر آنے کی کوشش کر رہے تھے اور رسی کو بھی کبھی ایک ہاتھ سے کبھی دوسرے ہاتھ سے کھینچ رہے تھے۔ میں ان کا بازو گھسیٹ رہا تھا۔ آخر وہ بمشکل انتہائی تکلیف برداشت کرتے ہوئے کنارے پر چڑھ آئے۔ اور گھاس پر لیٹ کر ہانپنے اور سانس لینے لگے۔ میں نے کہا۔ "آپ باہر آگئے ہیں بس اب سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔"

"ہاں! بس میں تھوڑی دیر سانس لے لوں۔" انھوں نے کمزور آواز میں کہا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے کہا۔ "دانی مجھے اٹھنے میں سہارا دو۔ آئندہ کا کام تمھیں ہی کرنا ہوگا۔" وہ میرے سہارے سے اپنے پیر پر کھڑے ہو گئے۔ میں نے پوچھا "میں آپ کے کس طرف رہوں؟"

"میری داہنی طرف! تاکہ میرے پیر کے جھٹکوں سے بچے رہو۔"

سرک کر میں ان کی داہنی طرف آگیا اور ان کے ہاتھ اپنے کندھوں پر رکھ لیے۔ انھوں نے کہا ٹارچ کی روشنی سامنے ڈالو تاکہ معلوم ہو کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ اور پھر اپنے سیدھے پیر پر اُچک اُچک کر آگے بڑھنے لگے۔ میں ان کے سامنے چل رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ اپنی رفتار ان کی مرضی کے مطابق رکھوں میں نے کہا جب آپ تھک جائیں تو رکنے کے لیے کہہ دیجیے۔

"تم بس ابھی رک جاؤ!" میں نے خود کو نیچے جھکا کر ان کو زمین پر بیٹھنے میں سہارا دیا۔ مگر ٹخنہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے پیر بے سہارا تھا جیسے ہی وہ زمین پر لگا ابو درد سے اچھل پڑے ان کے چہرے سے پسینہ ٹپکنے لگا۔

میں نے کہا۔ "ابو اس میں بہت تکلیف ہے؟" "ہاں جب پیر زمین سے ٹکراتا ہے تو درد بڑھ جاتا ہے۔"

ستانے کے لیے وہ کئی منٹ بیٹھے رہے۔ اٹھے میرا سہارا لے کر اور پہلے ہی کی طرح چلنے لگے۔ اب ہم کو جھاڑیوں والے راستے سے گزرنا تھا۔ ان کا وزن مجھ پر کچھ زیادہ پڑا اور میرے گھٹنے مڑ گئے اور ہم دونوں ہی زمین پر گر پڑے۔

میں نے بڑے دکھے دل سے کہا۔ "ابو آپ کو پھر زور سے جھٹکا لگا ہے مجھے بڑی شرمندگی ہے۔"

"تم پریشان نہ ہو۔ بس ایک مرحلہ اور باقی رہ گیا ہے۔ کیا یہاں سے نکلنے میں تم مجھے سہارا دے سکتے ہو؟" میں ان لمحوں کو بیان نہیں کر سکتا جب ہم جھاڑیوں سے نکل رہے تھے بہت تکلیف دہ اور سخت لمحے تھے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح ہم نکل آئے اور جھاڑیوں کے نیچے بیٹھ کر ستانے لگے۔ کار ہم سے زیادہ سے زیادہ دس گز کے فاصلہ پر کھڑی تھی بس اب اس تک ہم کو پہنچنا تھا۔ ابو نے گھڑی دیکھ کر کہا "چار بجنے والے ہیں۔ سورج نکلنے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ یہاں سے نکل چلنے کے لیے ہمارے پاس کافی وقت ہے۔"

میں نے ان کو کار تک لانے اور اس میں چڑھنے کے لیے سہارا دیا۔ ان کی بائیں ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی اور وہ پورے وقت دائیں ٹانگ سے اسے سہارا دیتے رہے۔ اس کی وجہ سے انھیں بہت شدید اذیت پہنچ رہی تھی۔ میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا وہ میرے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ رسی وہیں چھٹی رہ گئی

...نے کہا "بھول جاؤ اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑیگا۔"

میں نے پوچھا کیا میں چلاؤں؟" کہا ہاں چلاؤ میں تمہاری مدد کروں گا۔ انھوں نے اپنا ہاتھ وھیل پر رکھ لیا میں نے کار اسٹارٹ کی اور ہیڈ لیمپ روشن کردیا اور گاڑی کو بیک کر کے کچی سڑک پر اس کا رخ کردیا۔ گاڑی ناہموار زمین پر چلتے ہوئے ہچکولے کھا رہی تھی۔ ابو نے کہا "ذاتی آہستہ چلو جب یہ ٹیلوں پر اچھلتی ہے تو درد تیز ہوجاتا ہے" جب ٹیلوں سے گزر کر ہم سڑک پر آگئے تو ابو نے خوش ہوکر کہا "تم نے گاڑی بہت قاعدے سے چلائی ہے بس اسی رفتار سے چلتے رہو۔" ابو کا ہاتھ وھیل پر رکھا ہوا تھا اب مجھے کسی چیز سے ٹکرانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ کسی چیز کا ہیڈ لیمپ چمکتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ ابو نے کہا "اسے اسی رفتار سے چلنے دو" وہ کار کو سڑک کے کنارے لے آئے۔ آنے والی چیز دودھ کی ایک بہت بڑی گاڑی تھی۔ وہ ہمارے برابر سے گزر گئی۔ اس کے علاوہ راستے بھر ہم خالی سڑک پر رہے۔ جب ہم اپنے پیٹرول پمپ پر آئے تو ابو نے کہا "مجھے ہاسپٹل جانا پڑیگا۔ وہ وہاں ہڈی کو جمانے کے لیے پلاسٹر لگائیں گے۔"

"آپ ہاسپٹل کب تک رہیں گے؟" "فکر نہ کرو میں شام سے پہلے ہی گھر آجاؤں گا۔"

"آپ پلاسٹر لگواکر چلنے لگیں گے؟" میں نے سوال کیا۔ "ہاں وہ ایڑی کے نیچے دھات کی کوئی چیز فٹ کردیں گے اس پر میں چل سکوں گا۔"

"کیا ہم کو ہاسپٹل ابھی چلنا چاہیے؟" "نہیں ابھی نہیں۔ صبح ہونے پر ڈاکٹر حسین کو فون کر کے بلاؤں گا۔ وہ ہی میرے ہاسپٹل لے جانے کا انتظام کردیں گے۔ اب تو میں ورک شاپ کے فرش پر لیٹ جاؤں گا۔"

"ان کو آپ بلا لیجیے نا۔" میں نے کہا۔

"نہیں! اس وقت صبح کے چار بجے مجھے کسی ڈاکٹر کو سوتے سے اٹھانا پسند نہیں ہے ہم انھیں سات بجے بلائیں گے۔"

"ابو آپ ان سے کیا کہیں گے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کے چوٹ کیسے لگی۔"

"میں ان سے سچی بات کہوں گا۔" ابو نے کہا۔ "ڈاکٹر حسین تو میرے پرانے دوست ہیں۔"

ہم نے ورک شاپ کے سامنے کار روک لی۔ ابو اندر جاکر سہارا لینے کے لیے ایک بنچ پر ٹک گئے اور بتانے لگے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پہلے میں نے فرش پر اخبار بچھائے اور پھر جاکر گھر میں سے دو کمبل اور تکیہ لے آیا۔ ایک کمبل کاغذوں پر بچھا دیا۔ تکیہ رکھ دیا اور پھر سہارا دے کر ان کو لٹا دیا اور دوسرے کمبل سے ان کو اچھی طرح ڈھک دیا۔ پھر انھوں نے کہا کہ فون کو بھی میرے پاس اس طرح رکھ دو کہ میرا ہاتھ اس تک پہنچ جائے۔ میں نے ایسے ہی کیا۔ اور پھر پوچھا "ابو آپ کے لیے چائے یا کافی بنالاؤں؟"

"نہیں ذاتی شکریہ! اس وقت مجھے کوئی چیز کھانی یا پینی نہیں چاہیے۔ کیونکہ ہسپتال میں جاتے کے فوراً بعد مجھے انتھیسیا دیا جائے گا اور اس سے پہلے کوئی چیز کھانا پینا نہیں چاہیے لیکن تمھیں ضرور کچھ کھانا پینا چاہیے جاؤ ناشتہ بنا کر کھاؤ اور پھر سو جاؤ۔"

"ابو میں ڈاکٹر کے آنے تک یہیں رہوں گا۔" میں نے کہا۔ "ذاتی تم بے حد تھک گئے ہو!"

"ابو میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا اور ایک کرسی ان کے قریب لے آیا اور اس پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی آنکھ لگ گئی ہو۔ میری آنکھیں بھی بند ہوئی جارہی تھیں اور پھر میں انھیں کھلا نہیں رکھ سکا۔ جب میری آنکھ کھلی تو ابو کو کہتے سنا "مجھے افسوس ہے کہ میں نے یہ مصیبت کھڑی کرکے آپ کو اس وقت تکلیف دی۔" میں شاید سو گیا تھا کیونکہ دوسری آواز ڈاکٹر حسین کی کہہ رہی تھی "میرے خدا! واجد! یہ سب تم نے کیا کر ڈالا ہے؟"

اور جب میں نے پوری طرح جاگ کر آنکھیں کھولیں تو ڈاکٹر حسین کو ابو پر جھکے ہوئے پایا جو ورک شاپ کے فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔

"قلمی دوستی" میں صرف ۱۲ سال کے بچوں کے نام شائع کیے جائیں گے۔

سید فتح علی انوری

کیمرہ

میں ایک چھوٹا سا کالا کلوٹا کیمرہ ہوں۔
مکمل تاریکی میری قسمت ہے۔ کیوں کہ بنانے والے نے مجھے اس طرح بنایا ہے کہ غلطی سے بھی روشنی کی کوئی کرن میرے مالک کی مرضی کے خلاف میری دنیا میں داخل نہ ہو سکے۔ گویا میں ایک کال کوٹھری ہوں اور الماری کے ایک تنگ و تاریک کونے میں پڑا ہوا دن رات کرنوں کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔

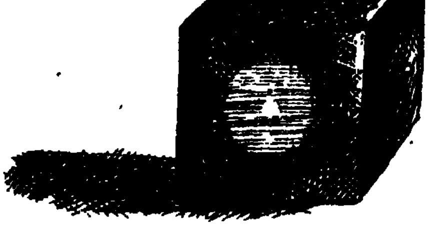
اس بھری دنیا میں میری رفیق و غم خوار صرف وہ فلم ہے جو مجھ میں ڈالی جاتی ہے۔ مگر یہ فلم بھی میرا ساتھ زیادہ دیر نہیں دیتی، کیوں کہ اس کی سیاہ بختی عارضی ہوتی ہے۔ جو کیمیائی عمل سے دھل کر جزوی طور پر صاف ہو جاتی ہے۔ جب یہ فلم میرے اندر ڈالی جاتی ہے تو مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ اب میری پلک جھپکائے جانے کا وقت آ گیا ہے۔ میں اس خوشی سے سرشار ہو جاتا ہوں اور اسی لیے مجھے فلم کا انتظار رہتا ہے سچ پوچھیے تو میری آنکھ ہی وہ سب کچھ ہے۔ جس کی بدولت میں تمام چھوٹے بڑے ڈبوں سے مختلف ہوں۔ میری فلم اور ہم آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے موٹر کار اور پٹرول۔ ٹارچ اور سیل، بلب اور بجلی،



گراموفون اور گراموفون ریکارڈ آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر ہماری کوئی حیثیت و حقیقت نہیں ہے۔ ہم دونوں وجود میں بھی ساتھ ہی ساتھ آئے تھے۔

کبھی ایسا ہوا تھا کہ کسی گرم ملک میں گرمیوں کے زمانے میں دوپہر کے وقت کوئی صاحب دھوپ کی تپش اور لو سے نجات حاصل کرنے کی جستجو میں اپنا کمرہ اچھی طرح بند کر کے سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ دھوپ کی سمت میں سڑک پر کھلنے والے دروازے میں ایک ننھا سا سوراخ تھا۔ جب باہر سے کوئی شخص ایک خاص فاصلے سے سوراخ کے سامنے سے گزرا تو تاریک کمرے کی سامنے والی دیوار پر اس کا واضح عکس نظر آیا۔ اگر کھڑکی کھلی ہوتی تو عکس اس قدر واضح نہ ہوتا۔

اگر آپ چاہیں تو آپ بھی گھر بیٹھے ایک آسان اور بڑا مزے دار تجربہ کر سکتے ہیں۔ گتے کا ایک چھوٹا سا ڈبا بنائیے جو تمام چھے طرفوں سے بند ہو، ایک طرف سوئی



سے باریک سا سوراخ کر لیجیے اور سوراخ کی مخالف سمت میں ایک چھوٹی سی کھڑکی کاٹ کر اس پر تیل لگا یا ہوا باریک سفید کاغذ لگا دیجیے۔ باریک سفید کاغذ پر ہلکا

حاصل [illegible] نے [illegible] کاغذ کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔ سوراخ کے ذریعے سے جو عکس ڈبے کے اندر اس کاغذ کے اندر کی طرف پڑے گا وہ آپ باہر سے بہ آسانی دیکھ سکیں گے۔ اب سوراخ والا حصہ دھوپ کی طرف کیجیے۔ جس چیز پر روشنی پڑ رہی ہوگی اس کا مکمل اور رنگین عکس آپ کو تیل لگائے ہوئے کاغذ پر بالکل صاف نظر آئے گا۔ سوراخ اور تیل لگے کاغذ کے درمیان جتنا فاصلہ کم ہوگا اتنا ہی عکس بڑا نظر آئے گا۔ جتنا فاصلہ زیادہ ہوگا اتنا ہی عکس چھوٹا نظر آئے گا۔ مگر فاصلہ اتنا کم بھی نہ ہو کہ سوراخ کی روشنی کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آئے۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ کرہ اور کیمرہ کتنے ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ اسی لیے سب سے پہلے ایجاد ہونے والے کیمرے کو (CAMERA OBSCURA) یعنی کال کوٹھری کہا جاتا تھا۔

حضرت انسان کی عقل بھی خوب ہے۔ انھیں کوئی اصول یا گر معلوم ہو جائے تو پھر وہ اسے لے اڑتے ہیں۔ اور ان کی عقل عجیب عجیب کرشمے دکھاتی ہے۔ انھوں نے بند ڈبے کے سوراخ سے حاصل کیے ہوئے عکس کو مستقل طور پر گرفتار کرنے کے لیے کسی شفاف جھلی پر کیمیائی اجزا کی ایسی پرت جمائی جو چیزوں کے روشن، تاریک اور نیم روشن عکسوں کو محفوظ کر لیتی ہے۔ پھر ایک کیمیائی محلول میں دھونے کے بعد جھلی کے اوپر روشنی اور تاریکی کے نقوش مستقل طور پر جم جاتے ہیں جنھیں کیمیائی پرت والے کاغذ پر چھاپا جا سکتا ہے۔ یہ فلم نہ صرف کالے، سفید اور نیم کالے رنگ جذب کر سکتی ہے۔ بلکہ رنگین عکس بھی اس پر آ جاتے ہیں۔ میری آنکھ پر بھی حضرت انسان نے بہت توجہ صرف کی ہے جو قریب سے بھی چیزوں کا مطالعہ کر سکتی ہے اور دور سے بھی۔ اس طرح میری وجہ سے فوٹو گرافی کا علم شروع ہوا۔

میری ہی وجہ سے سینما اور ٹیلی وژن وجود میں آئے۔ جو تصویریں آپ سینما کے پردوں پر اور ٹیلی وژن پر دیکھتے ہیں وہ مجھ جیسے کیمروں ہی سے کھینچی جاتی ہیں۔ مختلف کاموں میں استعمال کیے جانے والے کیمرے مختلف قسم کے ہوتے ہیں مگر ان سب کے کام کرنے کا بنیادی اصول ایک ہی ہوتا ہے۔

میری حساس آنکھ کے ذریعے سے خاطر خواہ تصویر حاصل کرنے کے لیے صحیح فاصلوں اور صحیح روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سینما اور ٹیلی وژن کے کیمروں کی آنکھیں دیر تک متواتر جھپک سکتی ہیں۔ میری آنکھ ایک تصویر کھینچنے کے لیے صرف ایک دفعہ جھپکتی ہے۔ میرا مالک مجھے استعمال کرتا جاتا ہے، اسے معلوم ہے کہ میری آنکھ کتنی روشنی میں کتنا کھلے رہنے سے کتنی دور سے کس چیز کو کتنی گہرائی سے دیکھ سکتی ہے۔ اگر روشنی کم ہوتی ہے تو وہ میری آنکھ کی جھپک قدرے طویل کر دیتا ہے اور جب روشنی تیز ہوتی ہے تو میری آنکھ آناً فاناً میں کسی چیز کی مکمل ترین تفصیل کو فلم پر ہمیشہ کے لیے قید کر لیتی ہے۔ یہی میری آنکھ کا کمال ہے۔ انسان کی آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز بھولی جا سکتی ہے۔ اور انسان کی آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز کی مکمل تفصیلات بھی یاد نہیں رہتیں۔ مگر میری آنکھ اگر صحیح روشنی میں اور صحیح فاصلے سے ایک مرتبہ جھپک جائے تو وہ سب کچھ مکمل تفصیل سے نوٹ کر لیتی ہے۔ اسی لیے تعلیم کے لیے، علوم و فنون کے لیے اور تفریح کے لیے اور سیر و سفر کے لیے اور تاریخی واقعات کو تصویری حقیقت دینے کے لیے ہزاروں لوگ مجھے ہر روز استعمال کرتے ہیں۔ آپ نے چاند کے اندرونی حالات اور مریخ کا قریبی عکس مجھ جیسے کیمرے ہی کی آنکھ کی مدد سے دیکھا ہوگا۔ آپ گھر بیٹھے اپنی کتابوں اور رسالوں میں اگر سائنسی ایجادات اور دور دراز ممالک کے عجائبات کی تفصیل آسانی سے دیکھ سکتے ہیں تو یہ میری وجہ سے ممکن ہو سکا ہے۔

میری اہمیت اور میری ضرورت کا اندازہ اس وقت کو یاد کرنے سے ہوگا جب میں وجود میں نہیں آیا تھا۔ لوگوں کی سب سے بڑی خواہش جب یہ ہوا کرتی تھی کہ کاش یادگار موقعوں، جگہوں اور شخصیتوں کی تصویریں محفوظ کی جا سکتیں تاکہ ان کی یادیں آنے والی نسلوں کے سامنے رہ سکیں۔ مصوروں نے ایک حد تک میری کمی ضرور پوری کی مگر اچھے سے اچھے مصور کو ایک مکمل تصویر بنانے میں بہت وقت درکار ہوتا تھا اور مصور کو اپنی آنکھوں کے ساتھ ساتھ اپنی یادداشت پر بھی بھروسا کرنا پڑتا تھا، کیوں کہ ہر ایک چیز کے لیے

(باقی صفحہ 18 پر)

رئیس صدیقی

معصوم آرزو





صبح کا وقت تھا بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ اس کا مزا لیتے ہوئے میں چادر اوڑھے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا کہ اچانک میرے دائیں کان نے کسی کی پتلی پتلی انگلیاں محسوس کیں۔ میں ہڑبڑاتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سامنے کیا دیکھتا ہوں کہ میرے چھوٹے بھائی میاں رضوان کھڑے ہوتے ہیں۔

"کیا بات ہے"؟ میں نے آنکھیں لال پیلی کرتے ہوئے سوال کیا۔

"بھیا آپ ایک گانا سنایا کرتے تھے۔ 'چندا ماما دور کے' اور آپ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ چاند میں رات کو بڑے بڑے بلب جلتے ہیں۔ اسی لیے چاند بہت خوبصورت دکھائی پڑتا ہے۔ وہاں شیشے کی پریاں رہتی ہیں جو ناچتی ہیں گاتی ہیں اور رات کو پریاں ستارے معلوم ہوتی ہیں کہا تھا نہ آپ نے"۔ اس نے اس کہانی کو سنا ڈالا جو کہ اکثر میں اس کو بہلانے کے لیے چاند کے متعلق سنایا کرتا تھا۔

"اور آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ خدا کی عبادت بھی کرتی ہیں۔ اگر وہ اللہ میاں کا حکم نہیں مانتی ہیں تو اللہ میاں اُن پریوں کو زمین پر پھینک دیتے ہیں جو یہاں تک آتے آتے سفید پتھر بن جاتی ہیں۔ انھیں پتھروں کا تاج محل بنا ہے"۔

"مگر بھیا، ابو جان تو بابر کسالوں کو بتا رہے ہیں کہ وہ لوگ وہ جو چاند پر گئے تھے، اُن لوگوں نے واپس آکر بتایا ہے کہ چاند پر صرف پتھر ہی پتھر ہیں وہاں نہ ہوا ہے اور نہ پانی وہاں کوئی زندہ چیز نہیں ہے۔ اور وہاں اندھیرا بھی بہت ہے۔ چاند کی کوئی اپنی روشنی نہیں ہے۔"

۲۴ گلی کبابیان، جامع مسجد، دہلی ۶

بڑی حیرت سے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

"بھیا آپ جھوٹ بولتے ہیں، وہ بھی اتنا جھوٹ! میرے ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ آپ اتنے دنوں تک گناہ کرتے رہے"... ایں ایں... ایں... ایں اور وہ آنکھیں ملتے ہوئے رونے کا بہانا کرکے بولا۔

"بھیا، مجھے ایک روپیا دیجیے، نہیں تو میں امی سے شکایت کردوں گا کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ پھر آپ خوب مار کھائیں گے اور میں نے اس کی دھونس کھانے کا بہانہ کرتے ہوئے ایک روپیا دے دیا تاکہ میاں کا بناوٹی رونا بند ہو جائے اور یہ تاثر بھی قائم ہو جائے کہ میں اپنے جھوٹ پر شرمندہ ہوں۔

خیر میاں رضوان اُچھلتے کودتے امی کے پاس گئے اور فرمایش کی کہ امی آج پوری کباب پکائیے۔ آج میرا بہت دل چاہ رہا ہے۔

اِدھر امی نے پوری کباب پکانے کی تیاری شروع کی کہ اُدھر میاں رضوان بغیر بتائے کہیں غائب ہو گئے۔

قریب ایک گھنٹہ کے بعد ایک بسکٹ کا بنڈل اور کچھ چاکلیٹ کے ساتھ آئے۔ سب لوگوں نے ناشتہ کیا۔ ناشتے کے بعد میاں رضوان بولے: "امی، آپ ناشتہ دان میں پوری کباب رکھ دیجیے"۔

امی نے سوچا کہ شاید میاں رضوان پوری کباب اپنے

دوستوں کے لیے لے جائیں گے۔ اس لیے انھوں نے پوری کھاب ناشتے دان میں رکھ دیے۔

میاں رضوان نے ناشتہ دان، بسکٹ کا بنڈل اور چاکلیٹ ایک پلاسٹک کی باسکیٹ میں رکھی۔ کپڑے بدلے جوتے پہنے کنگھی کی ایک ہاتھ میں باسکیٹ سنبھالی اور دوسرے ہاتھ سلام سلام کرکے یہ کہتے ہوئے چل پڑے۔ امّی ٹاٹا، بھائی جان ٹاٹا، گڑیا ٹاٹا۔ میں چاند پر جا رہا ہوں۔

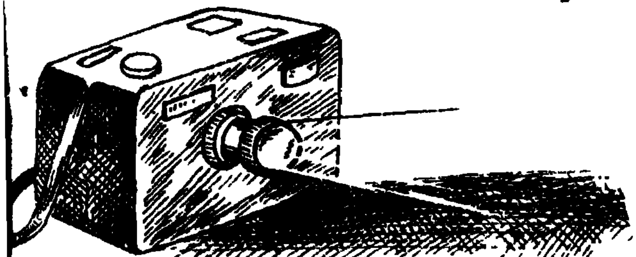
اس پر امّی نے حیرت اور معصومیت کے ملے جلے تاثرات ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

"خیریت تو ہے بیٹے! چاند پر کیا کرنے جا رہے ہو؟"

اس کے جواب میں رضوان نے بڑے پُر اعتماد لہجہ میں کہا۔

"یہ دیکھنے کہ کہیں بھائی جان کی طرح ابّو جان بھی تو چاند کے بارے میں جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔"

(بقیہ صفحہ ۱۶)



ممکن نہیں تھا کہ وہ دیر تک آرٹسٹ کے سامنے اُسی حالت میں رکھی رہے تاکہ وہ اُس کی مکمّل تفصیلات اپنی بنائی ہوئی تصویر میں پیش کر سکے۔ کسی جنگ یا کسی کشتی کی تصویر ہی دیکھیے۔ کسی مصوّر کو تصویر بنانے میں مدد دینے کے لیے لڑتے ہوئے سپاہی یا پہلوان کسی ایک ہی حالت میں دیر تک نہیں رہ سکتے۔ مگر میری آنکھ پلک جھپکتے سب کچھ دیکھ کر محفوظ کر لیتی ہے۔

ملک چین میں ایک مثل مشہور ہے کہ جو شخص اپنا منھ بند رکھتا ہے اُس کے الفاظ میں زبردست تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی بات میری آنکھ پر صادق آتی ہے۔ میری آنکھ بند رہتے رہتے اس قدر طاقت ور ہو گئی ہے کہ جب بھی پلک جھپکانے کے لیے کھلتی ہے تو اس کی تاثیر انسانی آنکھ سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ میری ہر جھپک ایک یادگار بن جاتی ہے۔

میری سیاہ پوشی روشنی کی ایک کرن کو پکڑ کر لوگوں کے لیے علم اور معلومات کی دولت فراہم کر دیتی ہے۔ یہی میری اصلیت ہے اور یہی میری زندگی۔ یہی میرا کمال ہے اور یہی میری ہستی کی وجہ۔ لوگ مجھے چاہت سے خریدتے ہیں۔ احتیاط سے استعمال کرتے ہیں اور یادگار موقعوں پر مجھے اپنے گلوں میں ڈالے پھرتے ہیں۔ اس ایک خیال کے سہارے میں زندہ رہتا ہوں اور اپنی سیاہ بختی کا غم نہیں کرتا کہ سیاہ بختی اور سیاہ پوشی دوسروں کے کام آتی ہے۔ اور دوسروں کے کام آنا اور علوم و فنون میں اضافہ کرنا ایک بڑی عبادت اور کارِ ثواب ہے۔

ین الدین عثمانی

حساس کی ضرب



جام نیر میں میرا تبادلہ ہوئے ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا لیکن ابھی تک شہر کی گلی کوچوں سے مجھے ٹھیک سے فیت نہ ہو سکی تھی۔ پھر مناسب مکان کرایے پر نہ ملنے سبب اب تک گھر کے تمام افراد پہلے مقام پر ہی تھے ں پہلے میں کام کر رہا تھا۔ اس لیے مجبوراً ہر اتوار کو اور ی کے دن ان کی خیریت معلوم کرنے کی غرض سے وہاں پڑتا تھا۔ آمدورفت مشکل تھی۔ بس کے علاوہ آنے جانے لیے دوسرا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ جام نیر ڈپو اپنی خاصیتوں سبب پورے مہاراشٹر میں مشہور ہے۔ ایک ماہ کے یں دو تین مرتبہ آنے جانے کے سبب مجھے بھی بہت ی باتوں سے واقفیت ہو گئی تھی۔

اس روز بھی میں بے چینی کے عالم میں بیٹھا اخبار کی لی معمولی خبروں کو بھی بڑے غور سے پڑھ رہا تھا اس کے د بھی بس کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اضطراب و بے چینی کے عالم ادھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ اچانک ایک ۱۸/۱۹ سال کا میرے قریب آکر رک گیا۔ لباس اور سامان سے معلوم ہا تھا کہ وہ جوتوں کی پالش کا کام کرتا ہوگا۔ وہ عجیب ب نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ جب میری نظریں اس ٹکرائیں تو ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں ک گئی۔ اس کے نہ پوچھنے کے باوجود بھی میں نے اخلاقاً کہہ دیا "مجھے جوتوں کی پالش نہیں کرانی ہے۔" لیکن میرے جواب کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ مسلسل مجھے گھورے جا رہا تھا۔ ۱۸ سالہ نوجوان کے ہاتھوں میں درسی کتابیں نہ پاکر پالش کا سامان دیکھ کر مجھے کوفت ضرور ہوئی۔ مگر میں کچھ نہ کر سکا پھر نہ معلوم کیا سوچ کر میں نے اپنے جوتے پیروں سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ برش سے جوتے صاف کرنے لگا۔ برش پھراتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی ظاہر ہو رہی تھی۔ میں نے ازراہ ہمدردی خیال کیا شاید اچھے گھر کا لڑکا ہوگا۔ مجبوراً یہ کام کرتے ہوئے شرما رہا ہوگا۔ میں نے اس کا نام پوچھا۔ مگر جواب دینے کے بجائے وہ رونے لگا۔ اسے روتا دیکھ کر آس پاس کے لوگ متوجہ ہو گئے۔ میں نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "بیٹے انسان کو کوئی بھی کام کرتے ہوئے شرمانا نہیں چاہیے۔ اور ایک روپے کا سکہ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ مگر پیسے لینے کے بجائے وہ آستین میں منہ چھپا کر پھر رونے لگا۔ پھر اچانک ایک درد بھری آواز اس کی زبان سے نکلی۔ "ماسٹر صاحب مجھے معاف کر دیجیے۔ میں فیروز ہوں۔ آپ کا شاگرد۔" روتے روتے وہ اپنا حال بتانے لگا۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اور ۱۰ سال قبل کے واقعات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ ان دنوں

(باقی صفحہ ۲۴)

۲۱- شاہو نگر- جلگاؤں ۴۲۵۰۰۱

ماجد بن واحد

بھگت سنگھ

ہر روح اور دل کی پکار رہتی ہے کہ "ہمیں زنجیروں میں نہ جکڑو، ہم پر پابندیاں نہ عائد کرو۔ ہم آزاد پیدا ہوئے اور آزاد رہ کر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔ غلامی کی بیڑیاں نہیں پہننا چاہتے۔ غلامی جہالت ہے، درندگی ہے، محتاجی ہے، جبر و نا انصافی ہے، بے کسی ہے، محرومی و مجبوری ہے۔ اور آزادی علم ہے، روشنی ہے، حُسن ہے، اپنائیت ہے اور زندگی کی ٹھوس حقیقت ہے۔"

شاید یہی پکار تھی جس نے ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لیے ذہنوں کو جگایا تھا۔ وہ جاگ کر جگانے لگے تھے کہ "اُٹھو! تمھارے دھرم کی قسم ہے، آؤ، آزادی اور دھرم کی حفاظت کے لیے ان ذلیل حاکموں پر ٹوٹ پڑو۔ بہادرو! یہی وقت ہے، تلوار سنبھالو، آزادی کی دیوی تمھارا انتظار کر رہی ہے۔ بڑھو، اور غلامی کی زنجیریں کاٹ دو۔"

عوام اپنے ملک کے لیے زندگی سے کھیلنے لگے۔ ۱۸۵۷ء میں پہلی جنگ آزادی کے انقلابی رہنما - بہادر شاہ، نانا صاحب تاتیا ٹوپے، کنور سنگھ اور جھا رانی لکشمی بائی ساتھیوں کے ہمراہ جہاد کرنے کو کود پڑے۔ دشمنوں سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ کئی جوان غلامی کی آگ بجھانے کے لیے مٹی میں ملنے لگے۔ دلوں میں جذبوں کے سمندر لے کر سردار بھگت سنگھ اور چندر شیکھر آزاد بھی ان کے کاموں کو آگے بڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ اور زبردست تحریک چلائی۔

مکان نمبر ۲۰۴، گنوری ٹلیا بھوپال

آزادی کی تحریک کو کچھ رہنماؤں نے گیتا اور قرآن کا سہارا لے کر اسے مذہبی تحریک بنانا چاہا۔ لیکن بھگت سنگھ نے اُسے عوامی اور انقلابی نظریہ دیا۔

بھگت سنگھ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام کشن سنگھ تھا۔ انھوں نے کالج تک تعلیم حاصل کی تھی وہ بہت ہی سادگی اور صفائی پسند تھے۔ ہمیشہ صاف کپڑے پہننا اور صاف رہنا پسند کرتے تھے۔

وہ بہت ذہین اور ہوشیار آدمی تھے۔ وہ مشکل کام کا حل اور اُس کے کرنے کا طریقہ جانتے تھے۔ اُن میں قیادت کرنے کی صلاحیت تھی۔

وہ جسمانی طاقت میں بھی کم نہ تھے۔ سبھی ساتھیوں میں چندر شیکھر آزاد پہلوان تھے۔ لیکن ایک مرتبہ شرط میں بھگت سنگھ نے آزاد کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر پٹک دیا تھا۔ انھیں عزت کی بہت فکر رہا کرتی تھی۔ وہ ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتے تھے، جس سے اُن کے یا اُن کے ساتھیوں کی بدنامی ہو۔ ایک مرتبہ اُن کا ایک ساتھی دوا سمجھ کر شراب کی بوتل لے آیا تو وہ آگ بگولا ہو گئے۔ بعد میں اُسے بلا کر سمجھایا "ہمیں خیال رکھنا چاہیے کہ ایسا کوئی کام نہ کریں جسے لوگ غلط کہہ سکیں۔"

ہر اُس شخص کو جس نے انگریز کے خلاف آواز اُٹھائی ہو، ساتھی سمجھتے تھے۔ مشہور کانگریسی نیتا لالہ لاجپت رائے کو ایک انگریز افسر نے اتنی لاٹھیاں ماریں کہ وہ چل بسے۔ یہ سارے ملک کی توہین تھی۔ بھگت سنگھ نے اس توہین کا بدلہ لیا۔ جیسے ہی انگریز چوکی سے باہر نکلا۔ پستول کی کئی گولیاں چلا کر اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ انھوں نے دلیری سے اسمبلی ہال میں جاکر بم پھینکا، تاکہ عوام جاگیں اور انگریز دہل جائیں۔ بم پھینک کر وہ ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہو گئے۔ اُن کی گرفتاری سے ہاہاکار مچ گئی۔ ملک کے ہر سپاہی کی زبان پر بھگت سنگھ کا نام تھا۔ اور "بھگت سنگھ زندہ باد" کے نعرے گونج رہے تھے۔

بھگت سنگھ پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں پھانسی کی سزا سنائی گئی۔

گاندھی جی نے سارے ملک کو ہوشیار کیا۔ لیکن بھگت سنگھ کے جذبے نے ملک کو حوصلہ دیا۔ گاندھی جی نے بہت کوشش کی کہ بھگت سنگھ کو پھانسی نہ ہو۔ ملک کو ان کی ضرورت ہے۔ مگر بھگت سنگھ نے انگریز حکومت سے کہا:

"آپ کی عدالت کے فیصلے کے مطابق ہم پر بادشاہ کے خلاف جنگ کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ اور اس طرح ہم جنگ کے شاہی قیدی ہیں۔ لہٰذا ہمیں پھانسی پر نہ لٹکایا جائے گولی ماردی جائے۔ آپ مہربانی فرما کر فوجی محکمہ کو حکم دیں کہ ہماری موت کی سزا کے لیے پلٹن کے کچھ نوجوان بلوائے جائیں"۔

فرنگی نے بھگت سنگھ کی بات قبول نہ کی۔ اُنھیں پھانسی کے تختے پر لے جایا گیا۔ اُن کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ وہ دھرتی ماتا کے لیے مرمٹنے پر فخر محسوس کر رہے تھے۔ پھانسی کا پھندا اُن کے گلے میں ڈالا گیا اور پھر اُن کا جسم ہوا میں جھول گیا۔

ملک میں غم کے بادل چھا گئے۔ مگر بھارتیوں نے پکّا ارادہ کر لیا کہ ہم ان فرنگیوں کو ملک سے باہر نکال کر ہی رہیں گے۔ بھگت سنگھ وہ بہادر انسان تھا جس نے اپنے دیش کی زندگی کے لیے موت کو ہنستے ہنستے گلے لگایا۔

راوی ندی کے کنارے پر بنا ہوا اُن کا مجسمہ اُن کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ آزاد ہند کی تاریخ میں بھگت سنگھ کی قربانی ایک اپنی الگ اہمیت رکھتی ہے۔

مرتبہ: التماس صابر مارہروی

ہندستان کے چند مسلم حکمراں اور ان کے سکے

حکمراں	سکہ	دھات
دلی کے ترک سلطان		
محمد بن سام (۱۲۰۶-۱۱۹۲)	دینار	سونا
	درہم	چاندی
	ٹنکہ	"
	دہلی وال	"
	جیتل	تانبا
التمش (۱۲۳۵-۱۲۱۰)	دینار	سونا
	درہم	چاندی
	ٹنکہ	"
	اشرفا	"
	دہلی وال	"
رضیہ سلطانہ (۱۲۴۰-۱۲۳۶)	الفداہ	"
ناصر الدین محمود (۱۲۶۶-۱۲۴۶)	ٹنکہ	"
غیاث الدین بلبن (۱۲۸۷-۱۲۶۶)	القداہ	"
خلجی سلطان		
علاء الدین محمد شاہ (۱۳۱۶-۱۲۹۶)	القداہ	"
	ٹنکہ	"
	جیتل	تانبا
	گنی	"
	فلس	"

حکمراں	سکہ	دھات
تغلق سلطان		
محمد بن تغلق (۱۳۵۱-۱۳۲۵)	دینار	سونا
	عدلی	چاندی
	ٹنکہ	"
	ٹنکہ	تانبا
	جیتل	"
	گنی	"
	درہم	پیتل
	ٹنکہ	"
لودھی سلطان		
بہلول لودھی (۱۴۸۹-۱۴۵۱)	بہلولی	تانبا
سوری سلطان		
شیر شاہ سوری (۱۵۴۵-۱۵۳۸)	مُہر	سونا
	روپیا	چاندی
	پیسا	تانبا
	دام	"
مغل شہنشاہ		
بابر (۱۵۳۰-۱۵۲۵)	بابری	چاندی
	شاہ رخی	"

پتا: مہاتما گاندھی میموریل بلڈنگ ۲۷ نیتاجی سبھاش چندر بوس روڈ بمبئی ۲

حکمراں	سکہ	دھات
اکبر (۱۶۰۵-۱۵۵۶)	شہنشاہ	سونا
	" (خرد)	"
	رہس	"
	آتما	"
	بے نشاط	"
	چار گوشہ	"
	چوگول	"
	الٰہی	"
	آفتابی	"
	لعل جلالی	"
	عدل گٹکا	"
	محرابی	"
	روپیا	چاندی
	جلالا	"
	چَرن	"
	دَرب	"
	پانڈو	"
	اشٹ	"
	دسا	"
	کالا	"
	سوکی	"
	دام	تانبا
	ادھیلا	"
	پاولا	"
	دمڑی	"
	فلوس	"
	ٹنکہ	"
	ٹنکی	"
جہانگیر (۱۶۲۸-۱۶۰۵)	نثار	سونا/چاندی

حکمراں	سکہ	دھات
	مُہر	سونا
	روپیا	چاندی
	نورافشاں	"
	خیرقبول	"
	روانی	تانبا
	رائج	"
	فلوس	"
اورنگ زیب (۱۷۰۷-۱۶۵۸)	درہم شرعی	چاندی
بنگال کے سلطان		
رکن الدین کیکاؤس (۱۳۰۰-۱۲۹۱)	الفدّاہ	"
جلال الدین محمود (۱۳۰۹)	الفدّاہ	"
شہاب الدین بوغرہ (۱۳۱۸)	الفدّاہ	"
غیاث الدین بہادر (۱۳۲۳-۱۳۱۰)	الفدّاہ	"
فخر الدین مبارک (۱۳۴۹-۱۳۳۸)	دینار	"
علاء الدین علی شاہ (۱۳۴۵-۱۳۴۱)	الفدّاہ	"
شمس الدین الیاس (۱۳۵۷-۱۳۴۲)	الفدّاہ	"
سکندر شاہ (۱۳۸۹-۱۳۵۷)	الفداہ	"
اعظم شاہ (۱۴۱۱-۱۳۸۹)	دینار	"
غیاث الدین محمود سوم (۱۵۳۸-۱۵۲۲)	شاہی بدر	"
گجرات کے سلطان		
محمود شاہ سوم (۱۵۵۳-۱۵۳۶)	محمودی	سونا
	ٹنکہ	چاندی
	ٹنکہ	تانبا
مظفر شاہ سوم (۱۵۸۴-۱۵۶۰)	جامی	"
	چنگیزی	"

حکمراں	سکہ	دھات
جونپور کے سلطان		
ابراہیم شاہ (۱۴۰۰-۱۴۴۰)	دینار	سونا
اودھ کے سلطان		
واجد علی شاہ (۱۸۴۷-۱۸۵۶)	اشرفی	"
	روپیا	چاندی
	فلوس	تانبا
عادل شاہی دور		
علی عادل شاہ (۱۶۶۷)	لرین	چاندی
میسور کے حکمراں		
حیدر علی (۱۷۶۶-۱۷۸۴)	پگوڈا	سونا
	فنوم	تانبا
ٹیپو سلطان (۱۷۸۴-۱۷۹۹)	احمدی (مہر)	سونا
	صدیقی	"
	فاروقی	"
	راحتی	"
	حیدری	چاندی
	امامی	"
	عابدی	"
	باقری	"
	جعفری	"
	کاظمی	"
	خضری	"
	عثمانی	تانبا
	مشتری	"
	زہرہ	"
	بہرام	تانبا
	اختر	"
	قطب	"

(بقیہ صفحہ ۱۹)

میں جماعت پنجم کو پڑھایا کرتا تھا ایک لڑکا کلاس میں ہمیشہ نظم کو خراب کرتا رہتا تھا۔ ہمیشہ کسی نہ کسی کو چھیڑتا رہتا نت نئی شرارت کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اساتذہ کی بھی نقلیں اتارتا رہتا تھا۔ ایک دن ہوم ورک نہ کر کے لانے کے سبب میں نے اسے خوب پیٹا۔ جس کے سبب اس نے مجھے الٹا جواب بھی دیا تھا اور گھر جاکر اپنے والد کے ذریعہ صدر مدرس صاحب کے پاس میری شکایت بھی کرائی۔ گاؤں کے زمیندار کا لڑکا ہونے کے سبب ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس پر سختی کرنے سے مجھے منع کر دیا۔ پھر کیا تھا چاروں راہیں اس کے لیے صاف ہوگئیں۔ جب جی میں آتا وہ مدرسہ آتا۔ بغیر اطلاع کے گھر پر رہ جاتا۔ اس طرح سے پڑھائی کی جانب سے رفتہ رفتہ اس کی دلچسپی ختم ہوگئی اور نتیجتاً وہ کلاس میں فیل ہوگیا۔ اور پھر آگے تعلیم نہ حاصل کر سکا۔ ایک سال بعد میرا بھی وہاں سے تبادلہ ہوگیا تھا۔

چند دنوں بعد خبر لگی کہ سیلاب کے سبب اس گاؤں کے لوگوں کا کافی جانی اور مالی نقصان ہوگیا پھر اچانک اس کی دھندلی سی تصویر میرے سامنے نکھر کر آگئی۔

"فیروز یہ کیا ہوگیا" بے ساختہ یہ الفاظ میری زبان سے نکل گئے۔

"ماسٹر صاحب، مجھے یہ بچپن کی لاپروائی اور والدین کے لاڈ و پیار کی سزا ملی ہے۔ میرے والدین تو سیلاب کی نذر ہوگئے ان کی جائداد بھی رشتہ داروں نے ہڑپ لی۔ اب میں دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ اگر میں کچھ لکھ پڑھ لیتا تو کم از کم کوئی ڈھنگ کا کام مجھے مل جاتا۔ آج آپ کو دیکھ کر مجھے اپنی لاپروائی کا بری طرح احساس ہو رہا ہے۔ مگر اب وقت نکل چکا ہے۔"

میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا: "فیروز گھبراؤ مت اب بھی اگر تمہارے دل میں علم حاصل کرنے کی تمنا ہے تو اس کا انتظام ہو سکتا ہے۔ سرکار نے تعلیم بالغان کا بھی انتظام کیا ہے۔"

(دادا جان کچھ دیر سوچتے ہیں)

دادا جان: اچھا تو پھر ایسا کرو اس کبوتر کو لے جا کر باغ کے دوسرے سرے کے پاس موجود آم کے درخت کے نیچے رکھ دو اور تم سب جا کر باغ کے دروازے کے پاس کھڑی ہو جاؤ جیسے ہی میں تین کہوں سب دوڑنا شروع کرو جو سب سے پہلے آم کے درخت کے پاس پہنچ کر کبوتر اُٹھائے گا اسی کو کبوتر ملے گا۔

"ہمیں آپ کا یہ فیصلہ منظور ہے" (سب ایک ساتھ کہتی ہیں اور جا کر باغ کے دروازے کے پاس کھڑے ہو جاتی ہیں۔ دادا جان کبوتر کو آم کے درخت کے نیچے رکھ دیتے ہیں اور گنتی شروع کرتے ہیں)

دادا جان: ایک ..... دو ......

(اسی وقت ایک بلی باغ کی دیوار پھلانگ کر اندر آتی ہے۔ اس کی نظر کبوتر کے بچے پر پڑتی ہے۔ شکار سامنے دیکھ کر بلی، کبوتر پر جھپٹتی ہے اور لے کر بھاگتی ہے)

حمیدہ: (چلاتے ہوئے) ارے بلی تو کبوتر لے اڑی۔

سلطانہ: ارے دیکھ کیا رہی ہو بھاگو بلی کے پیچھے۔

(سبھی بلی کے پیچھے بھاگتی ہیں مگر بلی ہاتھ نہیں آتی آخر تھک ہار کر سب دادا جان کے پاس آجاتی ہیں)

دادا جان: دیکھا بڑوں کی بات نہ ماننے کا نتیجہ ہے۔

سلطانہ: ہاں دادا جان ہم سے سچ مچ غلطی ہوئی!

نفیسہ: ہم سبھوں کو دادا جان کی بات مان لینی چاہیے تھی۔

حمیدہ: ہائے بے چارا کبوتر۔

دادا جان: خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو خدا کو منظور تھا وہ ہو چکا اب پچھتانے سے کیا فائدہ کیا تم نے وہ محاورہ نہیں سنا: "اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"

یاسمین: ہاں دادا جان۔ ہم سب سے غلطی ہو گئی اور ہماری ہی غلطی کی وجہ سے بے چارے کبوتر کی جان چلی گئی۔ ہائے بے چارا کبوتر ... کتنا پیارا تھا ....

دادا جان: اچھا اب تم سب کان پکڑ لو اور وعدہ کرو کہ آج کے بعد کبھی اس طرح لڑائی نہیں کرو گی۔ اور بڑوں کا کہنا مانو گی۔

(سبھی کان پکڑتی ہیں اور کہتی ہیں)

آج سے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہمیشہ بڑوں کا کہنا مانیں گے۔ اور کبھی لڑائی جھگڑا نہیں کریں گے۔

(اور اسی وقت پردہ تیزی سے گرتا ہے)

اقوالِ زرّیں

(۱) جو لوگ میانہ روی اختیار کرتے ہیں وہ کبھی کسی کے محتاج نہیں ہوتے

[سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم]

(۲) انسان کی سمجھ داری یہ ہے کہ وہ کفایت شعار ہو۔

[سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم]

(۳) عالم وہی ہے جس کا اپنے علم پر عمل ہو

[حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ]

(۴) جب خلقت کے پاس آؤ تو اپنی زبان کی نگہداشت کرو۔

[حضرت لقمان علیہ السلام]

(۵) نسلِ انسانی کو دنیا کے تمام جرائم مل کر بھی اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا تنہا شراب پہنچاتی ہے۔

[بیکن]

افتخار احمد سکندر ناسیکر۔ بھونڈی



ترتیب: موثق الدین

ادھر ادھر سے

یہ ہیں محمد عالم چنا۔ اس وقت دنیا کے سب سے لمبے انسان۔ ان کا قد آٹھ فٹ تین انچ یعنی ۲۴۷½ سینٹی میٹر ہے۔ ان سے قبل رابرٹ وڈلو نامی ایک شخص دنیا کا طویل ترین انسان ہوا ہے۔ اس کا قد آٹھ فٹ گیارہ انچ یعنی ۲۶۷½ سینٹی میٹر تھا لیکن عمر نہایت مختصر پائی یعنی صرف ۲۲ سال
Guinness Book of Records, 1983 ed. کے مطابق اس وقت محمد عالم چنا ہی دنیا کے سب سے لمبے انسان ہیں۔ ان کے بعد امریکہ میں ڈان کوکلر ہیں، جو ان سے صرف ایک انچ یا ۲½ سینٹی میٹر چھوٹے ہیں۔

اپنے قد کی وجہ سے جہاں ایک طرف وہ لوگوں کے لیے نمائش بنے ہوئے ہیں وہیں دوسری طرف ان کے لیے کچھ دشواریاں بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ بس میں سفر نہیں کر سکتے۔ ان کے اپنے پاس کوئی سواری نہیں، ٹیکسی میں البتہ اپنے آپ کو توڑ مروڑ کر پچھلی سیٹ پر جا لیتے ہیں۔ مگر دیہات میں ٹیکسی کہاں ؛

محمد عالم چنا سندھ کے سہوان شریف نامی مزار کے مجاور ہیں۔ اس پیشے سے جو آمدنی ہوتی ہے، وہ گزر بسر کے لیے ناکافی ہے۔ اور کہیں ملازمت تلاش کرنے کے لیے آنا جانا ان کے لیے ناممکن ہے۔ محمد عالم چنا کی محدود آمدنی کے پیش نظر پاکستان کے صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے ان کو یک مشت تین ہزار روپے کے عطیے کے علاوہ پانچ سو روپے ماہانہ وظیفہ بھی منظور کیا ہے۔ چنا کی عمر



۲۶ سال ہے۔ ابھی تک اُن کی شادی نہیں ہوئی جب کہ اس علاقے میں عام طور پر ۱۸ سال کی عمر میں شادیاں ہو جاتی ہیں۔ شاید ان کا طویل قد بھی اس کا سبب ہو۔

Coutsey: Weekend Review

بچوں کی کوششیں میں اب صرف اُن بچوں کی کہانیاں شائع ہوں گی جو اپنے نام کے ساتھ اپنی عمر بھی لکھیں گے۔

اڈیٹر

بچوں کی کوششیں



گپوں کا مقابلہ

ایک شہر میں ایک بادشاہ رہتا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی ۔ اس نے اپنی حکومت میں اعلان کروا دیا کہ جو مجھ سے گپ کرنے میں جیت جائے گا تو میں اپنی بیٹی کے ساتھ شادی کردوں گا اور آدھی جائداد دے دوں گا اس اعلان کو سن کر روزانہ کوئی نہ کوئی آتا تھا۔ اور بادشاہ سے شکست کھا جاتا تھا۔ اور اس کا سر قلم کر دیا جاتا تھا. اس طرح سیکڑوں لوگ مارے گئے۔ ایک دن ایک نوجوان دربار میں حاضر ہوا اور گپ کرنے کے انداز میں یوں کہنے لگا کہ حضور ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک جنگلی ہاتھی چنگھاڑتا ہوا میری طرف بے تحاشا دوڑا چلا آرہا ہے۔ جب ہاتھی قریب آیا تو میں لوٹے کے اندر چھپ گیا اور لوٹے کی ٹونٹی سے جب جھانک کر دیکھا تو نصف ہاتھی لوٹے کے اندر آچکا تھا۔ پھر میں نے ٹونٹی سے چھلانگ لگا کر دھان کے ایک لمبی ڈال پر سوار ہوگیا اور اس درخت کے سرے پر کھڑا ہو کر دیکھا تو ہاتھی بھی وہاں کے درخت پر چڑھ رہا تھا۔ میری قسمت نے یاوری کی کہ مجھے قریب ہی تاڑ کے پتوں سے لٹکا ہوا ایک مکڑا کا تار نظر آیا اور میں نے اسے پکڑ کر مکڑے سے کہا کہ مکڑے بھائی مجھے اوپر کھینچ لو۔ مکڑے نے میری بات مان لی اور مجھے اپنے قریب تاڑ کے سرے پر کھینچ لیا۔ جب میں اطمینان کے ساتھ تاڑ کے پتوں پر بیٹھ کر ہاتھی تاڑ کے درخت کے قریب میری طرف سونڈ اٹھائے چنگھاڑ رہا ہے۔ میں نے لوٹے سے پانی گرانا شروع کیا تو ہاتھی میرے لوٹے کے پانی کی دھار پکڑ کر تاڑ کے درخت پر چڑھنا شروع کر دیا ہاتھی آدھی دور پہنچا ہی تھا کہ لوٹے کا پانی ختم ہوگیا اور ہاتھی دھڑام سے زمین پر گر کر مر گیا اور دس دن کے بعد اس کا پیٹ پھٹ گیا تو اس کے پیٹ سے ایک بہت بڑا صندوق نکلا پھر اس صندوق سے ایک صندوق نکلا۔ الغرض روزانہ صندوق سے صندوق ہی نکلتا رہا آخر بادشاہ نے تنگ آکر کہا کر بھائی گپی اب کتنے صندوق نکالتے رہوگے لڑکے نے جواب دیا جب تک آپ اپنی شکست نہیں مان لیں گے ۔ اس طرح صندوق نکلتے ہی رہیں گے دس برس بعد بادشاہ نے اپنی شکست مان لی اور لڑکے نے کہا کہ صندوق کے اندر سے ایک نہایت چھوٹا ڈبہ نکلا جسے کھولنے کے بعد ایک چھٹی نکلی جس میں لکھا ہوا تھا کہ اس لڑکے سے جو زیادہ گپی ہوگا وہ اس بچہ کا غلام ہوگا۔

نواب عتیق اطہر زاہدی
رانی گنج ۔ بردوان (ویسٹ بنگال)

انتقام

آج اسکول میں کلاس مانیٹر کا چناؤ ہونے والا تھا سبھی لڑکے اس چناؤ میں مگن تھے ۔ جب ندیم نے اس کے لیے اپنا نام کلاس میں رکھا تو پھر کسی کی ہمت نہ ہوسکی کہ وہ اس جگہ کے لیے کھڑا ہوسکے ۔ لیکن اس کے مقابلے کے لیے ایک لڑکا اٹھا ۔ جس کا نام تنویر تھا

[illegible] میں ہر دل عزیز تھا۔ پڑھنے میں تیز تھا۔ اور شریف بھی ویسا ہی تھا۔ اس کے دوستوں نے اسے بہت روکا۔ لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی اور چناؤ کے لیے کھڑا ہوگیا۔ ندیم اور اس کے دوستوں نے اسے دھمکی بھی دی لیکن اس نے کسی کی نہ مانی۔ جب چناؤ کا نتیجہ نکلا تو سب کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ تنویر بہت زیادہ ووٹوں سے جیت گیا تھا۔ ندیم کو صرف اپنے چار پانچ دوستوں ہی کے ووٹ مل سکے تھے۔

چناؤ کی اس ہار کا بدلہ لینے کے لیے ہی ندیم اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کی گھات میں کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ یکایک وہ چونک پڑا۔ چاندنی رات میں اس نے دیکھا کہ تنویر اپنے دوستوں کے ساتھ سائیکل پر آرہا تھا۔ وہ تنویر ہی تھا ندیم اور اس کے دوست تیار ہوگئے۔ صرف دو آدمی اس کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اچانک دھڑام کی آواز کے ساتھ تنویر اور اس کے دوست نیچے گر پڑے اور وہ دو آدمی جو ابھی ابھی ندیم کے سامنے سے گزرے تھے۔ تنویر اور اس کے ساتھی کی سائیکل چھین کر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہلے تو ندیم اور اس کے دوستوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ندیم کے سب دوست معاملے کو سمجھ کر قہقہے لگانے لگے۔ وہ دونوں آدمی سائیکل چور تھے۔ ادھر تنویر چوروں کی لات کھا کر گرا۔ ادھر ندیم کے دوستوں کا قہقہہ بلند ہوا۔ لیکن اچانک ہی ان کے قہقہے رک گئے۔ ندیم تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے دوست بھی اس کے پیچھے بھاگے۔ چند ہی لمحوں میں ندیم کے دوستوں نے دیکھا کہ ندیم اپنی ہاکی سے دونوں چوروں کو بے ہوش کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے اور اب ندیم سہمے ہوئے تنویر کو گلے سے لگائے رو رہا تھا۔ لیکن یہ آنسو خوشی پیار، محبت اور دوستی کے آنسو تھے۔

افروز انور
پٹنہ مسلم ہائی اسکول، پیر بہورہ۔ پٹنہ ۶

نظم

اے میرے ساتھیو! اے میرے ساتھیو
بات میری ذرا غور سے تم سنو
دیس کی سرحدوں کے بنو پاسباں
اور غریبوں یتیموں کے بھی مہرباں
اپنے استاد کا کہنا مانو کرو
بات کہتے ہیں جو اس کو سمجھا کرو
امن اور شانتی کے پیمبر بنو
جو ہیں گمراہ اب ان کے رہبر بنو
اپنے دشمن سے بھی تم محبت کرو
بھول کر نہ کسی سے عداوت کرو
اپنے ماں باپ سے تم محبت کرو
فرض کہتا ہے یہ ان کی خدمت کرو
رشک دنیا کرے کام ایسا کرو
یوں زمانے میں تم نام پیدا کرو

شاہد تنویر
محمدیہ ہائی اسکول، ۱۴ مسجد اسٹریٹ بمبئی ۳

انوکھی تبدیلی

کسی ملک میں ایک بادشاہ رہتا تھا۔ جو بہت ظالم تھا مگر اس کا وزیر بالکل بادشاہ کے برعکس تھا نیک دل انصاف پسند اور رعایا کا خیر خواہ۔

ایک دن بادشاہ اور وزیر شکار کے لیے گئے۔ بادشاہ نے دیکھا کہ ایک درخت پر دو الو چونچ میں چونچ ملائے باتیں کر رہے تھے۔ وزیر چڑیوں کی بولی جانتا تھا۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا "جاؤ اور پتا لگاؤ کہ دونوں الو آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں" وزیر نے حکم کی تعمیل کی تھوڑی دیر بعد وزیر لوٹا اور بولا۔

"جہاں پناہ حضور سے ان کی باتیں نہیں عرض



محمد فاروق کھتری

شرارت

آئیے بچو! آج آپ کو خرگوش کے دو بچوں کی کہانی سناتے ہیں۔ یہ دو بچے تھے تو ذرا سے مگر اپنی شرارتوں اور شیطنت کی وجہ سے دور دور تک مشہور تھے۔ ان میں سے ایک کا نام تھا عرفی اور ایک کا گڈو۔ ان کے گھر کے آس پاس رہنے والے جانوروں کا تو ناک میں دم تھا۔ ان کے والدین بھی ان کی شکایتیں سن سن کر پریشان ہو گئے تھے۔ مگر یہ دونوں ننھے شیطان اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے تھے۔

ایک دفعہ وہ دونوں گھومتے گھومتے اپنے گھر سے دور نکل آئے۔ دفعتاً اُن کی نظر ایک بھالو پر پڑی جو جھاڑیوں میں پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر عرفی کو ہنسی آ گئی۔ اس نے گڈو کو بھالو کی طرف متوجہ کیا اور کہا۔ "کیوں نہ آج اسے شکار بنایا جائے؟"

گڈو گھبرا کر بولا۔ "اس کا ڈیل ڈول دیکھ رہے ہو۔ اس کا ایک تھپڑ ہی ہم دونوں کے لیے کافی ہو گا۔"

عرفی نے سینہ تان کر کہا۔ "ارے یہ کلوٹا بھاگنے میں ہمارا مقابلہ تھوڑے ہی کر سکے گا۔ اور پھر میرے ذہن میں ایک بالکل ہی نئی ترکیب آئی ہے۔ میں نے کچھوے دادا سے سنا تھا کہ انسان ایک ایسا شربت بناتا ہے جسے پینے سے ہوش و حواس اُڑ جاتے ہیں۔ شاید وہ شربت شراب کہلاتا ہے۔ ہم یہ شراب اس کلوٹے کو پلا دیں گے پھر دیکھیں گے کہ اس پر کیا اثر ہوتا ہے اور یہ کیا حرکتیں کرتا ہے۔"

گڈو بولا۔ "شراب انسان بناتا ہو گا۔ ہم نہیں۔ بھلا ہم کیسے بنا پائیں گے؟"

"چلو تو سہی۔ کچھوے دادا ہی سے پوچھتے ہیں۔" عرفی [illegible] تیار تھا۔

خیر صاحب دونوں کچھوے دادا کے پاس گئے۔ اُن کا نام تو تھا کچھوے دادا مگر شرارتوں میں یہ عرفی اور گڈو سے کم نہیں تھے۔ ان کی عمر تھی ۵۴ سال۔ بچو آپ تو جانتے ہی ہیں کچھوے کی عمر ہوتی ہے دو ڈھائی سو سال۔ لہٰذا ۵۴ سال کا یہ کچھوا تو بچہ ہی ہوا نا۔ مگر عمر کے لحاظ سے وہ عرفی اور گڈو کے پردادا کے زمانے میں پیدا ہوا ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ سب اسے کچھوے دادا کے نام سے پکارتے ہیں۔

خیر کچھوے دادا نے جب اُن دونوں سے اُن کا پلان سنا تو خوش ہو گئے اور بولے۔

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔ میں نے اپنے ابا کی زبانی سنا تھا کہ شراب، اناج اور پھلوں کے سڑ جانے پر بنائی جاتی ہے۔ ہمیں اناج کے لیے چوہے رام سے مدد لینی چاہیے۔"

تو اب ان تینوں نے چوہے رام کے گھر کی طرف کوچ کیا۔ یہ چوہے رام بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ ایک درخت کی کھوہ میں رہتے تھے۔ انھیں بھی یہ پلان پسند آیا۔ چوہے رام نے ایک دوسرے درخت کی کھوہ میں بہت سا اناج ڈالا اور پھر بہت سا پانی ڈال کر کھوہ کا منہ ایک پتھر سے بند کر دیا۔

چند دنوں کے بعد وہ پھر اسی درخت کے پاس آئے۔ پتھر ہٹانے پر ایک بہت ہی تیز قسم کی بو ان کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ کچھوے دادا خوش ہو کر بولے۔ "تو شراب تیار ہو گئی۔"

...بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا ...ب کون پلائے گا۔ گڈو بولا "کیوں نہ بھالو کو دعوت ...ئے اور اس دعوت میں یہ شراب اسے اک شربت ...ی جائے۔"

"چلو ایسا ہی کرتے ہیں۔" چوہے رام نے بھی تائید کی۔

تو صاحب بھالو میاں دعوت میں مدعو کیے گئے۔ دوپہر ...ے تین بجے تک انھوں نے اُسے باتوں میں لگائے رکھا جب بھالو کی بھوک بڑھنے لگی تو اُس نے کھانے کا تقاضا کیا عرفی بولا "کھانا پکنے میں تو ابھی دیر ہے۔ جب تک آپ شربت پی لیں۔ گرمی بھی بہت ہے۔ آپ کو پیاس بھی لگی ہوگی۔"

بھالو بے تابی سے بولا۔ "لاؤ وہی لاؤ۔ مگر کھانا پکانے میں جلدی کرو۔"

اب شربت کے نام پر اسے شراب سے بھرا جگ پیش کیا گیا۔ بھالو ساری شراب غٹاغٹ پی گیا۔ تھوڑی دیر تو وہ یوں ہی جھومتا رہا۔ پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ چھوٹے دادا نے آنکھ سے اشارہ کر دیا کہ اب بھاگ لو اُسے نشہ چڑھ گیا ہے۔ چوہے رام، عرفی اور گڈو تو نو دو گیارہ ہو گئے اور چھوٹے دادا پاس ہی کی ایک چٹان کے نیچے جا چھپے۔ بھالو جھومتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔ اتفاق سے وہ اسی محلے میں جا نکلا جہاں عرفی اور گڈو رہتے تھے۔ بھوک اور شراب نے بھالو کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ اس نے محلے کے سارے خرگوش کو مار ڈالا اور پھر اطمینان سے ایک جگہ بیٹھ کر ایک ایک کر کے سب کو کھانے لگا۔ عرفی اور گڈو اپنی آنکھوں سے یہ ماجرا دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ابا، امی اور چچا کو بھی بھالو کے ہاتھوں مرتے دیکھا۔ مگر وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ اُن ہی کی شرارت نے تو ان کے والدین کی جان لی تھی۔ ●

سید ابراہیم

فیصلہ

کردار:

١: شبانہ
٢: حمیدہ — آپس میں سہیلیاں
٣: سلطانہ
٤: یاسمین
٥: نفیسہ
٦: داداجان (ایک بوڑھا شخص)

پردہ اُٹھتا ہے

(اسٹیج پراس وقت ایک باغ کا منظر نظر آرہا ہے باغ میں کئی قسم کے درخت ہیں اور ایک طرف جھاڑیاں ہیں۔ ایک طرف باغ کا دروازہ نظر آرہا ہے۔ چند لڑکیاں آنکھ مچولی کھیلنے میں مگن نظر آرہی ہیں۔)

شبانہ: لو اب میری باری ہے میں اپنی آنکھیں بند کرتی ہوں آپ سب چھپ جایئے۔

سلطانہ: دیکھو ایمانداری سے آنکھیں بند کرنا ورنہ...ہاں

شبانہ: (بات کاٹتے ہوئے) اری جا..جا. آئی بڑی ایمانداری کی باتیں کرنے والی جب تیری باری تھی تب تو نے کہاں ایمانداری) سے آنکھیں بند کی تھیں۔

سلطانہ: کیا کہا.....میں نے آنکھیں کھلی رکھی تھیں؟

شبانہ: اور نہیں تو کیا. ایک آنکھ کھلی رکھ کر سب کو چھپتے ہوئے دیکھ لیا تھا اسی لیے تو جلدی سے ڈھونڈ نکالا.

سلطانہ: میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے اپنی دونوں آنکھیں اچھی طرح بند کی تھیں۔

شبانہ: اری جا. آئی بڑی قسم کھانے والی (منہ چڑھاتی ہے)
(سلطانہ، شبانہ کو مارنے کے لیے لپکتی ہے مگر شبانہ باغ میں دوڑ لگاتی ہے)

نفیسہ: (بیچ بچاؤ کرتے ہوئے) ارے..ارے.. آپ یہاں پر کھیلنے آئی ہیں یا لڑنے؛

حمیدہ: اُف او ہو... ان دونوں نے تو کھیل کا سارا مزہ کرکرا کر دیا.

یاسمین: ارے اب رُک بھی جاؤ نا. کیا سارا دن باغ میں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتی پھرو گی؛
(دوڑتے دوڑتے آخر سلطانہ، شبانہ کو پکڑ ہی لیتی ہے مگر باقی سب بیچ بچاؤ کر کے چھڑا لیتی ہیں)

نفیسہ: (دونوں کو سمجھاتے ہوئے) ارے لڑنا تو بہت بری بات ہے. چلو دونوں ہاتھ ملاؤ (دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتی ہیں اور پھر مسکراتے ہوئے ہاتھ ملاتی ہیں)

یاسمین: چلیے اب کھیل پھر سے شروع کیجیے.

سلطانہ: ہاں. چلیے کھیل شروع کیجیے (ذرا رک کر) کس کی باری تھی.

حمیدہ: اری واہ. اتنی جلدی بھول بھی گئی. روز صبح صبح بھینس کا تازہ تازہ دودھ پیتی ہو پھر بھی یادداشت اتنی کمزور ہے.

سلطانہ: (غصے میں) اگر میں دودھ پیتی ہوں تو تیرا کیا جاتا ہے.

یاسمین: ارے. اب پھر لڑنا مت شروع کر دینا۔

نفیسہ: چلو شبانہ آنکھیں بند کرو ہم سب چھپ جاتے ہیں.
(شبانہ آنکھیں بند کرتی ہے اور باقی سب اِدھر اُدھر درختوں کے پیچھے چھپنے کے لیے جگہ تلاش کرتی ہیں حمیدہ جھاڑیوں کی طرف بڑھتی ہے مگر پھر کایک چلاتی ہے)

حمیدہ: (چلاتے ہوئے) ارے ذرا اِدھر تو آؤ. یہ دیکھو کیا

...جھاڑیوں میں۔
...دوڑ کر جھاڑیوں کے قریب پہنچ جاتی ہیں۔
...ی سے) ارے واہ.. یہ تو کبوتر کا بچہ ہے۔
...گر یہ تو زخمی ہے۔ دیکھو خون بہہ رہا ہے۔
جاؤ جلدی سے دوا اور پانی لے کر آؤ۔
(نفیسہ دوڑ کر دوا لے کر آتی ہے اور پھر تھوڑی دیر بعد یاسمین پانی لے کر آتی ہے شبانہ دوا لے کر زخمی کبوتر کو لگاتی ہے اور پانی پلاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد کبوتر کی حالت کچھ سنبھل جاتی ہے)

حمیدہ: (کبوتر کو ہاتھ میں اُٹھاتے ہوئے) آہا... آہا! کتنا پیارا کبوتر ہے میں اِسے پالوں گی۔

یاسمین: (کبوتر کو حمیدہ کے ہاتھ سے لیتے ہوئے) اری واہ! اسے تو میں اپنے گھر لے جاؤں گی۔

حمیدہ: (کبوتر چھینتے ہوئے) اری واہ آئی بڑی اپنے گھر لے جانے والی یہ کبوتر میرا ہے۔ میں نے ہی اسے پہلے دیکھا تھا۔

شبانہ: (بیچ میں پڑتے ہوئے) کبوتر تم دونوں میں سے کسی کا نہیں ہے بلکہ اس پر میرا حق ہے کیونکہ میں نے اسے دوا لگائی ہے جبھی تو یہ اچھا ہوا ورنہ مرگیا ہوتا۔

حمیدہ: (غصے میں) نہیں کبوتر میرا ہے (اتنا کہہ کر کبوتر لے کر بھاگتی ہے مگر سلطانہ اسے پکڑ لیتی ہے)

سلطانہ: اری واہ! کہاں بھاگ رہی ہو۔ کبوتر تم تینوں میں سے کسی کا نہیں ہے۔ یہ میرے باغ میں ملا اس لیے میں اسے پالوں گی۔ کبوتر ہمارے باغ میں گرا ہے اس لیے یہ تم میں سے کسی کا بھی نہیں ہے۔

شبانہ: (کبوتر چھینتے ہوئے) اس کبوتر کو میں اپنے گھر لے جاؤں گی۔

نفیسہ: ارے سب ہٹو۔ اس کبوتر کو میں لے جاؤں گی۔

سلطانہ: (غصے میں) یہ کبوتر میرا ہے۔ میرے باغ میں گرا ہے اسے میں کسی کو نہ دوں گی۔

یاسمین: چلو تم سب جھگڑا مت کرو یہ کبوتر تم میں سے کسی کا نہیں ہے میں اسے لے جاؤں گی۔
(سبھی لڑنے لگتی ہیں اسی وقت دادا جان لاٹھی ٹیکتے ہوئے باغ میں داخل ہوتے ہیں)

داداجان: ارے تم سبھوں نے یہ کیسا شور مچا رکھا ہے ذرا بھی چین کی سانس نہیں لینے دیتی بس ہر وقت لڑائی کرتی رہتی ہو۔

سلطانہ: (جلدی سے) دیکھیے دادا جان یہ کبوتر ہمارے باغ میں گرا ہوا ملا اور یہ سب اس پر اپنا حق جتا رہی ہیں اب آپ ہی بتایئے یہ کبوتر میرا ہے یا نہیں۔

حمیدہ: مگر میں نے اسے پہلے دیکھا اس لیے یہ میرا ہے۔

نفیسہ: (غصے میں) میں اس کے لیے اپنے گھر سے دوا لے کر آئی جبھی تو یہ اچھا ہوا اس لیے کبوتر...

شبانہ: (جلدی سے بات کاٹ کر) اری واہ! دوا تو میں نے لگائی اس لیے تو یہ اچھا ہوا میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گی۔

یاسمین: (ہنستے ہوئے) آپ سب لڑتی رہیے میں کبوتر لے کر جاتی ہوں۔

داداجان: (مسکراتے ہوئے) ارے تم سب تو اچھی لڑکیاں ہو اور اچھے بچے بھی آپس میں لڑا نہیں کرتے تم سب ایسا کرو یہ کبوتر باری باری اپنے پاس رکھو۔

سلطانہ: یہ فیصلہ مجھے منظور نہیں کبوتر صرف اور صرف میرے پاس رہے گا۔

حمیدہ: نہیں کبوتر میرے پاس رہے گا۔

داداجان: (جلدی سے) ارے.. ارے.. اب لڑنا مت۔ تم سب اچھی لڑکیاں ہو اور اچھے بچے تو وہی کہلاتے ہیں جو آپس میں مل جل کر رہتے ہیں اور بڑوں کا کہا مانتے ہیں۔

نفیسہ: نہیں دادا جان۔ کوئی ایسا فیصلہ کیجیے کہ کبوتر کسی ایک کو ملے۔

[illegible] ورت صاحب کی

تو وزیر بولا: دونوں الوؤں میں سے ایک کے پاس ایک لڑکا ہے۔ اور ایک کے پاس ایک لڑکی۔ دونوں کے درمیان شادی کی بات چل رہی ہے۔ لڑکے والے الو نے کہا میں تب تک شادی کے لیے راضی نہیں ہو سکتا جب تک تم پانچ ویران گاؤں اپنی لڑکی کے جہیز میں نہ دوگے۔ لڑکی والے الو نے کہا: خدا تعالیٰ بادشاہ کی عمر دراز کرے وہ جب تک زندہ ہیں، ویران گاؤں کی کمی نہیں۔ میں پانچ گاؤں تو کیا پچاس گاؤں اپنی بیٹی کے جہیز میں دوں گا۔

یہ سن کر بادشاہ بڑا شرمندہ ہوا اور اس نے پھر سے ویران گاؤں کو آباد کیا۔ اس انوکھی تبدیلی کو دیکھ کر سبھی درباری خوش تھے۔

ریحان احمد

درگاپور۔ کٹیہار۔ بہار

کتنا اچھا ہوتا اگر چار چیزیں [illegible] نہ ہوتیں!

زندگی ہوتی موت نہ ہوتی۔ جنت ہوتی [illegible]

امیری ہوتی غریبی نہ ہوتی۔ صحت ہوتی [illegible]

خدا نے فرمایا اے موسیٰ....

اگر زندگی ہوتی موت نہ ہوتی، تو تمہیں [illegible] ملنے کا شرف کیسے حاصل ہوتا؟

اگر جنت ہوتی دوزخ نہ ہوتی، تو پھر تم [illegible] عذاب سے کیسے ڈرتے؟

اگر امیری ہوتی غریبی نہ ہوتی، تو تم ہمارا شکر ادا کرتے؟

اگر تندرستی ہوتی بیماری نہ ہوتی، تو تم ہم کو یاد کیسے کرتے؟

توحیدہ خاتون

ملت گرلس اسکول۔ پٹنہ

شیر کی دعوت

کہا شیر نے بلی خون پر
ہلو! شکاری ماما
بھیج رہا ہوں سالگرہ کا
تم کو دعوت نامہ
ممی، خالہ، منا، منگو
سب کو لے کر آنا
مگر شرط یہ یاد رہے
بندوق ساتھ مت لانا

قاضی شہاب ظہیر

سی۔ ایم۔ پی۔ ایف۔ آفس۔ آسنسول

حکایت

ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خداوند کریم سے دعا کی اے خدا.....

دوستی

ایک شام سنہا صاحب کے بچے آگ کے پاس بیٹھے تاپ رہے تھے۔ ان کی دادی بھی وہاں بیٹھی [illegible] تھیں۔ اسی درمیان میں ان کے بچوں نے کہا دادی کوئی اچھی سی کہانی سنائیے۔ دادی اماں نے پہلے تو [illegible] کیا لیکن بعد میں کہا کہ تم لوگوں کو ایک مہربان بلی کی [illegible] سناتی ہوں۔ ایک بھورا چوہا اور ایک سفید چوہا ایک ساتھ بل میں رہتے تھے ایک دن بلی نے سفید چوہے کو پکڑ لیا بھورے چوہے نے بلی سے روتے ہوئے کہا اے میری بہن تم بڑی مہربان ہو، میرے ساتھی کو چھوڑ دو اس کو نہ کھاؤ کیونکہ یہ میرا دوست ہے ہم لوگ ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ بلی نے جواب دیا کہ مجھے تھوڑا [illegible] لادو تاکہ میں اپنا پیٹ بھر لوں۔

تب بھورا چوہا دوڑا دوڑا گائے کے پاس گیا اور کہا اے گائے تم تھوڑا دودھ دو کہ میں اپنے ساتھی [illegible]

…ں نہیں تو بلی میرے دوست کی جان لے لے گی
…ے کہا میں دودھ تمہیں کیسے دوں۔ آج میں نے
…ہیں کھائی ہے میرے لیے تھوڑی گھاس لے آؤ
…ں گھاس کھالوں گی تو تمہیں دودھ دوں گی۔

چوہا دوڑا ہوا کسان کے پاس گیا اور کہا مہربانی کرکے تھوڑی گھاس دے دو۔ کسان نے کہا میں تم کو گھاس …ں شرط پر دوں گا کہ تم مجھے تھوڑی چینی لا دو آج میں نے گھاس نہیں کائی میرے چائے پینے کے لیے چینی نہیں ہے اب وہ دوڑا ہوا بنیے کے پاس گیا اور کہا دو مجھے تھوڑی چینی دو چینی میں کسان کو دوں گا کسان مجھے گھاس دے گا اور گھاس میں گائے کو دوں گا۔ گائے مجھے دودھ دے گی تو میں دودھ بلّی کو دوں گا تب بلی میرے دوست کی جان چھوڑے گی۔

دکان دار نے کہا میں تمہیں چینی ضرور دوں گا اگر تم میرے دکان سے چوہوں کو بھگا دو گے۔ یہ میرے چاول اور گیہوں بہت کھا جاتے ہیں کیا تم ان کو بھگا سکتے ہو چوہے نے کہا یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

دکان دار نے چینی دے دی اور چوہے نے تمام چوہوں کی میٹنگ کی اور کہا میں تم لوگوں کی ہمدردی میں آیا ہوں تم لوگ کتنے دُبلے پتلے ہو گئے ہو۔ تم لوگوں کو کھانے کو نہیں ملتا۔ ہمارے ساتھ آپ لوگ چلیے ہم گودام میں رہتے ہیں ہم سبھی لوگ ایک ساتھ رہیں گے اس پر چوہے تیار ہو گئے یوں چینی کسان کو مل گئی۔ کسان نے گھاس دے دی اور گھاس گائے کو دی۔ گائے نے دودھ دے دیا اور دودھ کو اس نے بلّی کو دے دیا دودھ پاتے ہی بلی نے اس کے ساتھی کو چھوڑ دیا۔ اور اور بھورے چوہے نے دوستی نبھائی۔

ایس۔ نظیر مہدی
علی نگری، چین پور، سیوان

گُنی رانی

میری بہنا گُنی رانی — سچ مچ تم ہو گھر کی رانی
ہم سب سے تم چھوٹی ہو — پر سب سے تم موٹی ہو
زبان تمہاری ٹوٹی پھوٹی — لگتی ہے پر کتنی میٹھی
کتنی بھلی ہے یہ مُسکان — لگتی ہے کلیوں کی جان
کرتی باتیں ٹھمک ٹھمک کر — چلتی ہو تم ٹھمک ٹھمک کر
ڈر ہے گڑیا گر نہ جائے — کہیں پر اس کو چوٹ نہ آئے
نانی کہتیں چڑیا ہو تم — ناناجی کی گڑیا ہو تم
ابو کہتے میری گُنی — امی کہتیں میری مُنی
ہم بھائی بہنوں کی جانی — سچ مچ تم ہو گُنی رانی

سید عبدالسبور
اردو یو پی اسکول بھدرک، اڑیسہ

انمول موتی

عیب تلاش کرنے والے شخص سے ....۔ اندھا اچھا
جو شخص خود کو نہ پہچانے اس سے ....۔ جانور اچھا
والدین کی خدمت نہ کرنے والے سے ....۔ مرنا اچھا
دوسرے کے کام نہ آنے والے سے ....۔ مریض اچھا
سود خور مالدار شخص سے . . . . . کنگال اچھا
خدا کا خوف نہ رکھنے والے سے ....۔ پتھر اچھا
دوسروں کی برائی سننے والے سے ..۔ بہرا اچھا
چغلی کھانے والے شخص سے ..۔ گونگا اچھا
بے عمل عالم سے ......، باعمل جاہل اچھا
سب سے بڑا بہادر بدلہ نہ لینے والا۔

افروز انور
مسلم ہائی اسکول، پیر بہورہ، پٹنہ۔۴

یتیم کے آنسو

ایک روز ایک ظالم بادشاہ ایک زرّیں تاج پہنے ہوئے ایک راستے سے گزرا اس کی رعایا خوف و ہراس سے فریاد کرنے لگی اور ہر طرف شکایتوں کا ایک دفتر کھل

گیا۔ ان ستم رسیدوں میں ایک یتیم لڑکا تھا اس نے پوچھا کہ بادشاہ کے تاج میں کیسی چمک ہے۔ لوگوں نے کہا ہمیں کیا معلوم کہ کیا ہے۔ لیکن ہاں اتنا ظاہر ہے کہ کوئی قیمتی شے ہے۔ اسی بیچ ایک بوڑھی عورت آگے بڑھی اور بولی کہ یہ میری آنکھوں کے آنسو اور تیرے دل کا خون ہے۔ وہ اپنے ظلم وستم سے یتیموں کا مال غصب کر لیتا ہے۔ غریب کسانوں کی پیداوار کا وافر حصہ اپنے خزانے میں داخل کر لیتا ہے اور مزدوروں کی گاڑھی کمائی پر ٹیکس لگا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ قتل وغارت گری کرکے دوسروں کی جائداد کو اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ اس طرح وہ بادشاہ جو اپنی رعایا کے حالات سدھارنے اور ان کی مفلسی دور کرنے کے بجائے، ظلم وجور سے الٹا ہی ان سے لگان و مالگزاری وصول کرکے اپنے عیش و عشرت پر خرچ کرتا ہے، وہ دراصل بادشاہ نہیں بلکہ خود دوسروں کا محتاج ہے۔ وہ ایک فقیر ہے۔ جو اپنی رعایا کی کمائی ہوئی روزی کے ٹکڑوں پر گزارا کرتا ہے، یتیموں کے آنسو کے قطروں پر نظر کرو تاکہ تم دیکھ سکو کہ موتی میں روشنی کہاں سے آتی ہے۔

محمد فردوس اطہر
محمد علی روڈ۔ رانی گنج۔ بردوان

کیا آپ جانتے ہیں

۱۔ دلی سے ماسکو	۴۳۶۰	کلو میٹر دور ہے۔
۲۔ دلی سے واشنگٹن	۱۲۰۴۰	کلو میٹر دور ہے۔
۳۔ دلی سے لندن	۶۷۱۰	کلو میٹر دور ہے۔
۴۔ دلی سے برلن	۵۸۰۰	کلو میٹر دور ہے۔
۵۔ دلی سے کراچی	۱۰۹۰	کلو میٹر دور ہے۔
۶۔ دلی سے ٹوکیو	۵۸۴۰	کلو میٹر دور ہے۔
۷۔ دلی سے کولمبو	۲۴۴۰	کلو میٹر دور ہے۔
۸۔ دلی سے جینیوا	۶۴۵۰	کلو میٹر دور ہے۔
۹۔ دلی سے سنگاپور	۴۱۴۰	کلو میٹر دور ہے۔
۱۰۔ دلی سے مکہ معظمہ	۳۸۹۶	کلو میٹر دور ہے

قاضی شہاب ظہیر
سی۔ ایم۔ پی۔ ایف۔ آفس۔ آسنسول

کیا آپ جانتے ہیں

۱۔ سب سے بڑا براعظم ایشیا ہے۔
۲۔ سب سے بڑا ملک (رقبہ کے لحاظ سے) روس ہے۔
۳۔ سب سے بڑا ملک (آبادی کے لحاظ سے) چین ہے۔
۴۔ سب سے بڑا شہر لندن ہے۔
۵۔ سب سے زیادہ آبادی والا شہر شنگھائی ہے۔
۶۔ سب سے بڑا جزیرہ برازیل ہے (۲۲۸۱۹۵۹ مربع میل)
۷۔ سب سے بڑا سمندر بحرالکاہل ہے۔
۸۔ سب سے بڑا عجائب گھر برٹش میوزیم (لندن میں) ہے۔
۹۔ سب سے بڑی جھیل (صاف پانی کی) لوپیریر جھیل ہے۔
۱۰۔ سب سے بڑا کتب خانہ لینن میموریل لائبریری (ماسکو) ہے
۱۱۔ سب سے اونچا شہر "لاما" ہے (۱۲۰۰۰ افٹ)۔

اسحاق احمد خالد
طالب علم (دہم)، سزمل

زندگی بے لطف ہو جائے
صحت اگر خراب ہو جائے



تندرستی انسان کی اوّلین ضرورت ہے۔ اس کو دھیان میں رکھتے ہوئے منصوبہ کاری کرنے وقت صحت کی خدمات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

- سن 2000ء تک سبھی کے لئے صحت کا منصوبہ تیار ہو چکا ہے۔
- ملک میں تقریباً ایک لاکھ 50 ہزار "صحت کارکن" پہلے ہی مقرر کئے جا چکے ہیں اور 55,000 سے بھی زائد ذیلی مراکز اور ابتدائی صحت مرکز کھول دیئے گئے ہیں۔
- بچے اور حاملہ عورتیں جلد امراض کے شکار ہوتے ہیں۔ ان کے لئے "بچوں کی مربوط نشو و نما کی خدمات" شروع کی گئی ہیں جن کے اچھے نتائج سامنے آرہے ہیں۔
- تنگ اور گندی بستیوں کے گھٹن اور سیلن آلود ماحول میں متعدد بیماریاں پنپنے لگتی ہیں۔ 1990ء تک ایسی بستیوں میں بسنے والے تین کروڑ لوگوں کو 20 نکاتی پروگرام کے تحت صاف ستھرا ماحول فراہم کرایا جائے گا۔

"صحت مند شہریوں سے ہی صحت مند سماج کی تعمیر ہوتی ہے۔"

تفصیلات کے لئے ذیل کا کوپن استعمال کیجئے:

ڈپٹی ڈائریکٹر ماس میلنگ یونٹ،
ڈائرکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژول پبلسٹی،
"بی" بلاک، کستوربا گاندھی مارگ،
نئی دہلی-110001
نئے 20 نکاتی پروگرام سے متعلق مجھے تفصیلی معلومات اردو/انگریزی میں بھیجنے کی نوازش کریں۔

نام ______________________

پتہ ______________________

______________ پن کوڈ نمبر ______________

نیا 20 نکاتی پروگرام

davp 83/107



بچّوں کی کتابیں

ریڈیو فیچر
(جگن ناتھ آزاد)

بچوں کی دل چسپی کے دو مزیدار ڈرامے۔ یہ دونوں ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی ہو چکے ہیں۔

قیمت: ۲/۲۵

گاندھی باباکی کہانی
(بیگم قدسیہ زیدی)

اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز پیرایے میں لکھی گئی ہے۔

قیمت: ۴/۰۰

اُردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)

ہم سب اُردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن صحیح اُردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے، یہ اسی کتاب سے معلوم ہو سکے گا۔

قیمت: ۴/۰۰

پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)

دل چسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ مزیدار کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے۔ آپ بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔

قیمت: ۲/۰۰

جب اور اب
(آصف مجیب)

بچوں کی دلچسپی والی ۵۰، ۶۰ سال پہلے کی ایسی باتیں جو اب پرانی ہو چکی ہیں۔

قیمت: ۱/۷۵

تین اناڑی
عصمت چغتائی

گڈو، بلو اور ٹیٹو — تین نٹ کھٹ لڑکوں کی شرارتوں پر مبنی ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان میں لکھا گیا ہے۔

قیمت ۳/=

جن حسن عبدالرحمٰن
ترجمہ: قرۃ العین حیدر

الہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہو گئی، لیکن اب تو اس جن کا قصہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے صراحی کی قید سے آزادی دلائی ہے۔

حصہ اول ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰

کہاوت اور کہانی
(سیفی پریمی)

روزمرہ بولی جانے والی کہاوتوں اور کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے کہاوتیں وجود میں آئیں۔

قیمت: ۲/۵۰

سرکس
تزئین کار: ڈین گیسپر

سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کتاب میں سرکس کی ڈھیر ساری تصویروں کے خاکے ملیں گے جن میں بچے شوق سے رنگ بھر سکتے ہیں۔ قیمت ۱/۵۰

دہلی ۶ — بمبئی ۳ — علی گڑھ ۱

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵



Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage

Regd No. D(SE)-043 August, 1983

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

پیامِ تعلیم

عیدِ مبارک



ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

ستمبر ۱۹۸۲ء — جلد ۲۰ — شمارہ ۹

ایڈیٹر: —— ولی شاہجہانپوری

قیمت: —— ۲ روپے
سالانہ ۱۸ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

بچوں سے باتیں

عید الفطر کی طرح عید الضحیٰ کی مبارک باد بھی کئی دن قبل دینی پڑ رہی ہے۔ قبول کر لیجیے۔

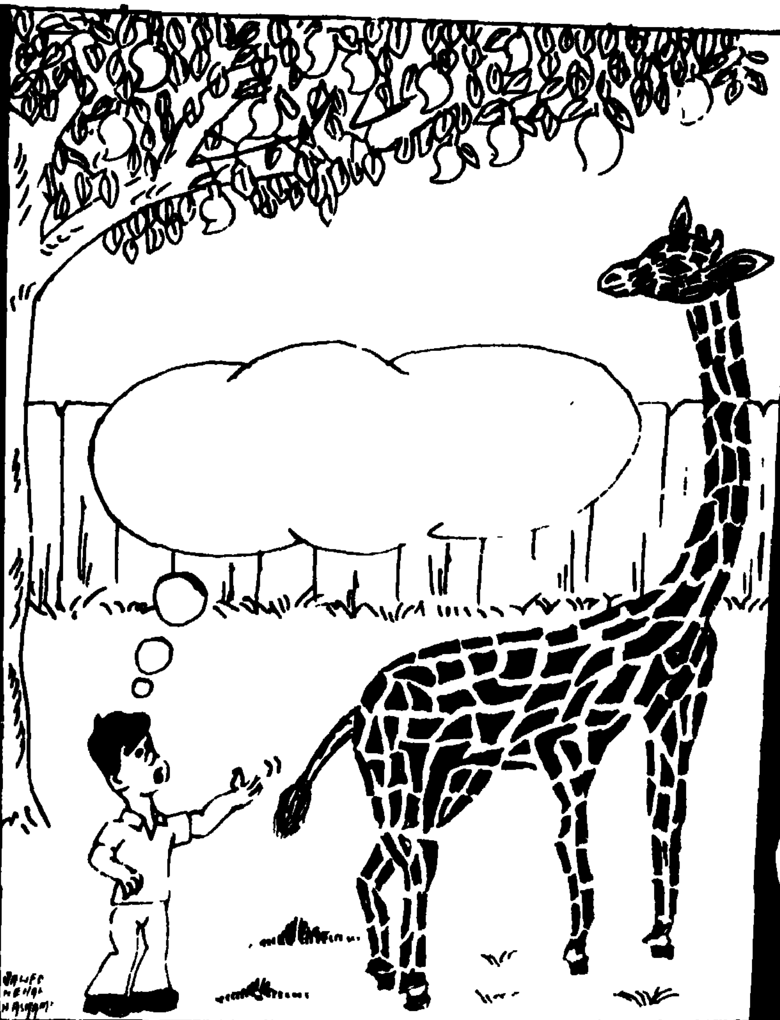
پچھلے مہینے "مقدس ایشیا" کی قسط نہ پا کر کئی پیامیوں نے شکایتی خط لکھے۔ لیجیے اس مرتبہ یہ کمی پوری کی جا رہی ہے، یقین ہے کہ یہ بھی پسند آئے گی "دو شکاری" کی اگلی قسط بھی دلچسپ ہے۔

اس شمارے میں مسعود احمد برکاتی صاحب کا تحفہ یقیناً دلچسپ تحفہ ہے۔ نجابت حسین صاحب کے "خوشی کے پیچھے"۔ بشیر احمد انصاری کا "دھنک کے رنگ" سننے اور دیکھنے کے لائق ہے۔ حج کے مبارک موقعے پر "حجرِ اسود" پر سکندر ضمیر صاحب کا مضمون وقت کی چیز ہے۔ آپ کی معلومات میں ایک اضافہ بھی۔ سید محمود نقوی صاحب برابر کرم فرماتے رہتے ہیں۔ آپ کو پیام تعلیم ہی سے نہیں مکتبہ جامعہ اور کتاب نما سے بھی دلچسپی ہے۔ اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ اس شمارے میں بھی "کتابی تعلیم" کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو عملی طور پر بھی جانکاری حاصل کرنا چاہیے۔

۳۱ر جولائی کو مکتبہ جامعہ کے ہمدرد و سرپرست جناب معین الدین حارث اور ۱۰ر اگست کو مولوی محمد حفیظ الدین کے انتقال کی خبروں سے مکتبہ جامعہ اور جامعہ ملیہ پر گہرے غم کے بادل چھا گئے —— حفیظ الدین صاحب کا پیام تعلیم سے گہرا ربط رہا ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ ادارہ پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

انعامی کارٹون



جی ہاں! یہ انعامی کارٹون ہے۔

بچہ کیا سوچ رہا ہے؟ اس کا جواب آپ کو دینا ہے۔ تھوڑی دیر سوچیے۔ اس کے بعد ایک پوسٹ کارڈ پر اپنا جواب لکھ کر نیچے دیئے گئے پتے پر بھیج دیجیے۔ سب سے دلچسپ انوکھا اور مزاحیہ جواب بھیجنے والے کو دس روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔
آپ کے جوابات ہمیں ۲۵ر ستمبر ۱۹۸۳ء تک مل جانی چاہئیں۔

"انعامی کارٹون"، ماہنامہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

سطوت رسول

ناموں کے بہروپ



ہانپتے کانپتے لالہ جی کا پیٹ ہے یا صندوق
ارے ہاں پیٹ ہے یا صندوق

بھاگ رہے ہیں، بھاگ رہے ہیں، مسٹر چوپی مل
جاگ رہا ہے، جاگ رہا ہے، دو آنکھوں میں چپل
فیئر ہوا ہے، فیئر ہوا ہے، چھوٹی ہے بندوق
ارے ہاں چھوٹی ہے بندوق



اک کالی موٹی سی عورت، چلتی پھرتی بوری
باتوں کا بے کار خزانہ، سر ہے ایک تجوری
کالو رام کو سب کہتے ہیں؟ کیوں مسٹر لمبوق؟
ارے ہاں کیوں مسٹر لمبوق

گھاسی بابا اتنے لمبے، جیسے ہوں اِک تاڑ
سب لوگوں میں ان کا قد ہے، اپنا جھنڈا گاڑ
بچّوں کو بھی رٹا ہوا ہے، نام بھی ہے لمبوق؟
ارے ہاں نام بھی ہے لمبوق

مسعود احمد برکاتی

تحفہ
ایک خوب صورت جذبہ

کیا آپ نے کبھی کسی کو تحفہ دیا ہے؟ کیا کسی نے آپ کو تحفہ دیا ہے؟ یہ سوالات غیر ضروری ہیں۔ ہر شخص نے زندگی میں کبھی نہ کبھی تحفہ دیا ہوگا اور اس کو بھی کبھی نہ کبھی تحفہ ملا بھی ہوگا۔ تحفے سے مراد کوئی بہت عمدہ اور اعلا چیز ہی نہیں ہے، ہر وہ چیز تحفہ ہے جو خلوص اور محبت سے کسی کو پیش کی جائے، چاہے وہ کتنی ہی معمولی چیز ہو۔ دیکھنے میں شاید کوئی چیز چھوٹی، حقیر یا معمولی ہو، لیکن وہ اگر تحفے میں دی گئی ہے تو وہ ہرگز حقیر نہیں ہو سکتی۔ تحفہ ہرگز حقیر نہیں ہو سکتا۔ کیوں؟ کبھی غور کیا ہے کہ کیوں؟ اس لیے کہ جس شخص نے آپ کو تحفہ دیا یہ اس کے خیال اور تعلق کی علامت ہے۔ یہ تحفہ دینے والے اور تحفہ لینے والے کے آپس کے لگاؤ اور یگانگی کی یادگار رہے۔ تحفے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو یاد رکھتے ہیں، سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ تحفہ دینے والے کی محبت تو خود تحفے سے ظاہر ہوتی ہے، لیکن تحفہ لینے والے کی محبت بھی اُس خوشی سے ظاہر ہوتی ہے جس خوشی سے وہ تحفہ قبول کرتا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ تحفے دیا کرو، اس سے محبت بڑھتی ہے۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اپنے ہمسائے کے لیے کسی تحفے کو حقیر نہ سمجھو چاہے وہ بکری کا ایک کھر ہی کیوں نہ ہو۔ آپؐ کا منشا یہ ہے کہ کسی معمولی چیز کو تحفے کے قابل نہ سمجھ کر رک نہیں جانا چاہیے۔ معمولی چیز کا تحفہ دینا، تحفہ نہ دینے سے اچھا ہے۔

معرفت نونہال۔ کراچی۔ پاکستان

دراصل تحفہ کسی چیز کا نام نہیں ہے، بلکہ تحفہ ایک انسانی عمل ہے۔ تحفہ اُس جذبے کا نام ہے جو ہم ایک دوسرے کے لیے رکھتے ہیں۔ جب ہم کسی کو تحفہ پیش کرتے ہیں تو اصل میں ہم اس سے اپنے خلوص کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

ایک غریب آدمی اپنے کسی مال دار عزیز یا دوست کو اس کی حیثیت کے لائق چیز نہیں دے سکتا، بلکہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق ہی چیز دے سکتا ہے۔ امیر آدمی کو چاہیے کہ وہ اس چیز کو نہیں دیکھے بلکہ تحفہ دینے والے کی محبت اور خیال کو سمجھے اور اسی طرح خوشی کا اظہار کرے جس طرح وہ کسی قیمتی سے قیمتی چیز کے ملنے پر کر سکتا ہے، لیکن امیر آدمی جب اپنے کسی غریب عزیز یا دوست کو تحفہ دے تو اس کی حیثیت کو نہ دیکھے بلکہ اپنی حیثیت کو دیکھے اور اچھی چیز دے تاکہ غریب عزیز یا دوست کو یہ خیال نہ ہو کہ ان کے دل میں ہماری قدر نہیں ہے۔ یا وہ ہمیں اسی قابل سمجھتے ہیں۔ امیر آدمی معمولی چیز دے گا تو تحفہ بھی معمولی ہی سمجھا جائے گا۔ کیوں کہ وہ اچھی اور قیمتی چیز خرید سکتا تھا اور اس نے نہیں خریدی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ محبت کی کمی ہے۔ غریب آدمی معمولی چیز بھی تحفے میں پیش کرے گا تو وہ اس بات کا ثبوت ہوگی کہ پیسے کم ہونے کے باوجود اس کی محبت نے مجبور کیا کہ وہ کچھ نہ کچھ چیز ضرور پیش کرے۔

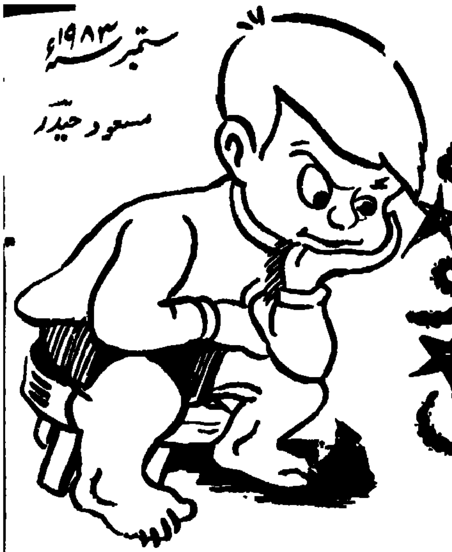
تحفہ دینے کے کئی موقعے ہوتے ہیں۔ سفر سے آنے کے بعد بھی تحفہ دیا جاتا ہے کہ جس شہر یا ملک گئے تھے وہاں سے کوئی چیز اپنے دوست، پڑوسی، عزیز، بیوی بچوں کے لیے لائے ہیں۔ گویا سفر میں بھی ان کو یاد رکھا۔ کسی تقریب مثلاً شادی، بیاہ، سال گرہ، امتحان میں نمایاں کامیابی کے موقعوں پر بھی تحفے دیے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب خوشی میں شرکت ہوتا ہے، اگر خوشی میں شرکت بھی خوشی خوشی ہونا چاہیے۔ اگر اس میں جبر شامل ہو جائے تو پھر

یہ نہ خوشی ہوتی اور نہ خوشی میں شرکت۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب کوئی عمل رسم بن جاتا ہے تو اس کے فائدے ختم یا کم ہو جاتے ہیں اور وہ ایک مصیبت بن جاتا ہے۔ تحفے کو بھی رسم بنا لیا جائے تو پھر یہ بھی خوشی کے بجائے پریشانی کا باعث بن جائے گا۔ تحفہ ایک ایسے پودے کا پھول ہے جو محبت کی زمین میں اگتا ہے اور خلوص کی فضا میں کھلتا پھولتا ہے۔ تحفے کا انتخاب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تحفہ دینے والے کے لطیف جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ پھولوں کا تحفہ بہت پسند کیا جاتا ہے۔ تحفہ خود ایک پھول ہے جس سے دوستی اور میلاپ کی خوشبو پھیلتی ہے۔

عام موقعوں کے علاوہ بھی بعض موقعے ہو سکتے ہیں مثلاً آپ نے کوئی کتاب پڑھی۔ آپ کو بہت پسند آئی۔ آپ کا دل چاہا کہ آپ کا دوست بھی یہ کتاب پڑھے۔ وہ دوست اسی شہر میں رہتا ہے تو وہ کتاب آپ نے اس کو پیش کر دی۔ دوسرے شہر میں رہتا ہے تو آپ نے کاغذ میں لپیٹی، بنڈل بنایا اور ٹکٹ لگا کر ڈاک خانے میں ڈال آئے۔ اس طرح آپ کے دوست کو تحفہ بھی پہنچا اور علم بھی پہنچا۔ کتاب سب سے خوب صورت تحفہ ہے۔

بتائیے تو جانیں

مسعود حیدر



(۱)

ایک پیر کی کالی دھوتی
جاڑے میں وہ بے حد سوتی
گرمی میں وہ سایہ دیتی
بارش میں وہ ہر دم روتی

(۲)

ایک ناری کے دو لڑکے
دونوں ایک ہی رنگ
ایک چلے ایک کھڑا رہے
پھر بھی دونوں سنگ

(۳)

رنگ برنگی ماں اور رنگ برنگے بچے
چلتی ہے ماں سراسر بولتے فرفر بچے

(۴)

ہری رکابی اجلا بھات
لے لو لوگوں ہاتھوں ہات

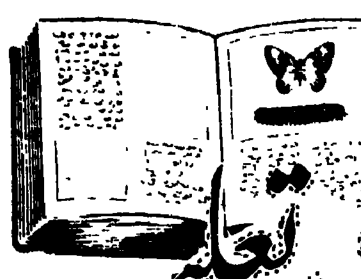
(۵)

میں ہوں لوگو کیڑا اصلی
مجھ میں ہڈی اور نہ پسلی

رحمانیہ انٹر کالج جہانگیری محلہ (آسنسول)

جواب کے لیے دیکھیے صہ ۲۵

سید محمود نقوی



کتابی تعلیم

پنڈت پرمانند کی شہرت کافی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ لوگوں نے انھیں "علامہ" یعنی سبھی علوم کے جاننے والے کا خطاب دے رکھا تھا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی زیادہ تھی۔ ان دنوں وجے نگر کی کرشن دیو کا زمانہ تھا۔ اس کے دربار میں کئی پنڈت تھے۔ وہ پڑھے لکھے لوگوں کی کافی عزت کرتا تھا۔ پنڈت پرمانند اپنے چار شاگردوں کو لے کر اس کے دربار میں حاضر ہوئے۔ ان چار شاگردوں میں سے ایک علم موسیقی یعنی گانے بجانے میں ماہر تھا۔ دوسرا علم نجوم یعنی ستاروں کی رفتار اور ان کے اثرات سے بخوبی واقف تھا۔ تیسرا شاگرد زبان و بیان پر پوری دسترس رکھتا تھا اور چوتھا فلسفہ کا رمز شناس تھا۔

راجا نے اپنے دربار میں موجود پنڈتوں سے کہا کہ ان چاروں شاگردوں سے ان کے شعبے سے متعلق سوالات کر کے ان کی مہارت کا جائزہ لیں تاکہ ان کی معلومات اور واقفیت کا اندازہ ہو سکے۔ چنانچہ چاروں ہی شاگردوں سے باری باری سوالات کیے گئے اور سبھی نے اطمینان بخش جواب دیے۔ راجا ان کے معقول جوابات سے بہت خوش ہوا اور اس نے اعلان کیا کہ چاروں کو شاہی خزانے سے انعامات اور وظیفے دیے جائیں گے۔

دربار میں تینالی رام لنگ بھی موجود تھا۔ وہ خاصا پڑھا لکھا شخص تھا۔ لیکن اس میں حسد کا مادہ بھی بہت تھا۔ کسی کو آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ راجا کو بھی اس پر کافی اعتماد تھا اس نے فوراً کھڑے ہو کر راجا کے اعلان پر اعتراض کیا۔ "جناب والا میرے خیال میں یہ کافی نہیں ہے کہ کسی پنڈت کو صرف کتابی علم حاصل ہو اسے دنیاوی باتوں کا بھی علم ہونا چاہیے۔ اس لیے ان لوگوں کا اس معاملے میں بھی امتحان لیا جانا چاہیے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو لیکن یہ لوگ کافی دور سے آئے ہیں، تھکے ماندے ہوں گے، ان کے ٹھہرنے کا انتظام کر دو، کچھ آرام کر لیں تو اس کا بھی امتحان ہو جائے گا" راجا نے کہا۔

ایک بڑے سے مکان میں پرمانند اور اس کے چاروں شاگردوں کے رہنے کا انتظام کر دیا گیا۔ چونکہ وہ لوگ اپنے گھر والوں کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اس لیے چاروں شاگردوں نے یہ ذمے داری آپس میں بانٹ لی۔ جو شاگرد سنگیت میں ماہر تھا اسے چاول پکانے کا کام دیا گیا، جیوتش میں ماہر شاگرد کے ذمے کھانا کھانے کے لیے پتے لانے کا کام سپرد ہوا۔ زبان و ادب کے عالم کو دہی لانے کا کام ملا اور فلسفی شاگرد کے حصے میں گھی کا انتظام کرنا طے پایا۔

سنگیت میں ماہر شاگرد نے چولھے پر چاول کی ہانڈی چڑھا دی۔ تھوڑی دیر میں چاول ابلنے لگے اور ایک عجیب قسم کا سنگیت پیدا ہونے لگا۔ شاگرد حیران ہو کر اسے سنتا رہا اور اسے جتنے راگ معلوم تھے۔ ان سبھی راگوں کو چاول پکنے کی آوازوں سے ملاتا رہا۔ لیکن کہیں بھی تال میل نہ بیٹھا۔ اس نے "تھوڑی راگ" گنگنا کر دیکھا پر وہ اس سے میل نہ کھاتا تھا۔ "موہنا راگ" گا کر دیکھا وہ بھی مختلف تھا۔ اسی طرح اس نے سارے راگ ملا ڈالے لیکن کوئی بھی کھد بد کی آواز

۱۔ نیو برج پوری دہلی

سے مل نہ پایا، اسے بڑی الجھن ہوئی وہ سوچنے لگا کہ یا تو وہ خود بے سرا ہو گیا ہے یا چاول پکنے سے پیدا ہونے والی آواز بے ہنگم ہے۔ چاولوں کے ساتھ اس کا خون کھولنے لگا اس نے لکڑی اٹھائی اور ہانڈی پر دے ماری۔ ہانڈی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور ادھ پکے چاول آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔ وہ بیٹھ کر "کلیانی راگ" گانے لگا۔

ادھر جیوتش کا ماہر شاگرد پتے توڑنے کے لیے بڑ کے درخت پر چڑھا اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ چھپکلی کی آواز سنائی دی، اس نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ چھپکلی کی آواز سنائی دینا برا شگون ہوتا ہے اس لیے وہ بغیر پتے توڑے ہی واپس چل دیا۔

فلسفی شاگرد ادھر ادھر گھومنے پھرنے کے بعد گھی لے آیا۔ گھی ایک دونے میں تھا وہ دونا ہاتھ میں لیے اپنی قیام گاہ کی طرف چلا جا رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا گھی دونے کی بنیاد ہے یا دونا گھی کی بنیاد، دونوں میں "عرض" کون ہے اور "جوہر" کون۔ وہ اس مسئلے پر غور و خوض کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ تھوڑی دیر میں اسے خیال آیا کہ چشم دید مشاہدہ سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ "عرض" اور "جوہر" کے پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے اس نے دونا الٹ کر دیکھا۔ فوراً ہی سارا گھی نیچے گر گیا اور اسے خالی ہاتھ واپس ہونا پڑا۔

چوتھے شاگرد جو زبان و بیان کے ماہر تھے دہی کی تلاش میں گلیوں میں پھرتے رہے۔ دیر ہو جانے کی وجہ سے دکانوں پر دہی ختم ہو چکا تھا۔ وہ مایوس ہو کر لوٹنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک دہی بیچنے والی کی آواز سنائی دی "دہوے لو دہو۔" شاگرد نے آواز پر توجہ دی اور غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ بیچنے والی دہی نہیں بلکہ کچھ اور چیز بیچ رہی ہے جس کا نام دہو ہے اور اگر یہ دہی کو دہو کہہ کر بیچ رہی ہے تب بھی اسے خریدنا نہیں چاہیے کیوں کہ جب نام کا تلفظ اتنا خراب ہے تو چیز کیسی ہوگی۔ اپنے طور پر

اس فیصلے کے بعد وہ خالی ہاتھ واپس آ گئے۔

چاروں شاگرد جب خالی ہاتھ اپنے گرو کے سامنے جمع ہوئے تو ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے کہ میرے ذمے تم لوگوں نے غلط کام سپرد کیا تھا۔ گرو نے انھیں سمجھایا، غلطی کسی کی نہیں ہے تم لوگوں نے کتابوں میں لکھی ہوئی باتوں کے مطابق ہی عمل کیا، اس طرح جھگڑا تو ختم ہو گیا لیکن ان سب کو مجبوراً برت رکھنا پڑا کیوں کہ کھانے کے لیے کچھ بھی تیار نہیں ہو سکا تھا۔

یہ سارا واقعہ تینالی رام لنگ کے مخبروں نے اس تک پہنچایا اور اس نے نمک مرچ لگا کر راجا کو سنایا۔ ساری باتیں سن کر راجا نے مسکراتے ہوئے کہا: "تم ٹھیک ہی کہتے ہو صرف کتابی تعلیم کافی نہیں، دنیاوی علم بھی ضروری ہونا چاہیے اور ہاں تمھیں تو معلوم ہوگا کتابوں ہی میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ایک من علم کے لیے دس من عقل ہونا بھی ضروری ہے۔

مضمون نگار۔ عزیز نسین

فارسی سے ترجمہ۔ نجابت حسین



خوشی کے پیچھے

چوں کہ میں جنگلوں میں زیادہ رہ چکا ہوں اس لیے سانپوں کا مشاہدہ بھی بہت کیا ہے۔ ایک بار کا اتفاق ہے کہ فصل کاٹنے کا زمانہ تھا۔ میں اپنے بیٹے کے ساتھ کٹنی میں مشغول تھا۔ ہمارا کھیت ایک ندی کے پاس تھا۔ کھیت کے بیچ میں ناشپاتی کا ایک درخت تھا۔ اس کی شاخوں پر "آسما" نام کے پرندے کا ایک گھونسلہ تھا اور اس میں چار چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ بچوں کی ماں ہم لوگوں کی طرف تیزی سے اُڑ کر آئی، شور کیا اور پھر اپنے گھونسلے کی طرف بھاگ گئی پھر تیزی سے ہم لوگوں کے پاس آئی پھر پھڑ پھڑا کر شور کیا اور گھونسلے کی طرف اڑ گئی۔ میں اپنے بیٹے کے ساتھ دوڑ کر درخت کے قریب گیا۔ درخت کے نیچے ایک سانپ پر نظر پڑی۔ اس سانپ کو وہاں کے لوگ "امجک" کہتے ہیں جو کالا ہوتا اور خطرناک ہوتا ہے۔ اسی لیے آسما اپنے گھونسلے بہت ہی نازک شاخوں پر بناتی ہیں تاکہ امجک ان تک پہنچ نہ سکے۔ یہ سانپ درخت پر چڑھ کر ان کے گھونسلے تک پہنچنا ہی چاہتا تھا کہ وہ شاخ بوجھ سے ٹوٹ کر سانپ اور گھونسلے کے ساتھ زمین پر آ رہی تھی۔ ہم لوگوں کے پہنچنے تک سانپ ایک بچے کو نگل چکا تھا اور دوسرے کو ہڑپنے کے لیے منہ کھول چکا تھا۔

امجک جیسے بڑے سانپ ہمارے علاقے میں نہیں ہوتے۔ پرندے اور مینڈک جیسے جانور اس سانپ کی خوراک بنتے ہیں۔ بستی کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ دودھ دینے والی بھیڑوں کے تھن بھی چوستا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ یہ بکری یا بھیڑ کی پچھلی ٹانگوں میں لپٹ جاتا ہے تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں۔ اور پھر ان کا دودھ پی لیتا ہے اور جس کا دودھ پی لیتا ہے اس کا تھن خشک ہو جاتا ہے اور پھر اس میں دودھ پیدا نہیں ہوتا۔

الغرض بچوں کی ماں ہمارے اردگرد کسی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی اور شور کر رہی تھی۔ ہم لوگوں نے سانپ کو مار ڈالا، گھونسلے کو شاخوں پر اچھی طرح پھنسا کر بقیہ بچوں کو اس میں رکھ دیا۔ آسما اڑ کر اپنے بچوں کے پاس چلی گئی۔

اس دن شام تک ہم لوگ کھیت پر کٹنی کرتے رہے اور وہ چڑیا بھی اڑ اڑ کر ہمارے پاس آتی اور خوشی سے چہچہاتی رہی۔

نورن گنج۔ سہسرام (بہار)

پڑھو اور ہنسو

ایک آدمی اپنے دوست کے گھر گیا یہ دیکھا کہ اس کا دوست باورچی خانے کے پیچھے بیٹھا بلی کی طرح میاؤں میاؤں کی آوازیں نکال رہا ہے اس نے پوچھا کہ کیوں بلی کی آوازیں نکال رہے ہو؟ اس کے دوست نے جواب دیا۔ جو کچھ کھانا باورچی خانہ میں چھوڑتا ہوں چوہے کھا جاتے ہیں۔ میں بلی کی طرح میاؤں میاؤں اس لیے کرتا ہوں کہ چوہے ڈریں۔ اس آدمی نے کہا۔ تم ایک بلی ہی کو گھر میں کیوں نہیں رکھ لیتے؟

اس کے دوست نے کہا۔ اس لیے کہ میں بلی سے ڈرتا ہوں۔

"میرا بھائی اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ ایک دن میں ایک بار داڑھی مونڈتا ہے۔"

"یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میرا بھائی ایک دن میں پچاس مرتبہ داڑھی مونڈتا ہے۔"

"کیا وہ دیوانہ ہے؟"

"نہیں حجام ہے۔"

فضل قدیر آزاد
محلہ پیر بہوڑ، پٹنہ

بشیر احمد انصاری

دھنک کے رنگ



بہت پرانی بات ہے۔ ایک پہاڑ تھا، بہت اونچا۔ ہمیشہ برف سے ڈھکا رہتا۔ اسے کوہ قاف کہتے تھے۔ کوہ قاف میں ننھی پریاں رہا کرتی تھیں۔ ان کے پَر بہت نازک اور رنگین تھے۔ کسی کے پر سبز تھے، کسی کے نیلے، کسی کے لال اور کسی کے پیلے۔

کوہ قاف کی ننھی پریاں ہمیشہ کھیلتی رہتیں۔ برف کے گولے بناتیں اور ہوا میں اچھالتیں۔ برف گرتی یا بارش ہوتی تو ننھی پریاں آسمان میں اڑتیں اور بھیگ جاتیں۔ ان کے پَروں کا رنگ آسمان میں بکھر جاتا اور دھنک کی سات رنگوں والی کمان بن جاتی۔

پریوں کو یہ دھنک بڑی پیاری لگتی۔ دھنک دیکھ کر سبز پری کہتی: ”آہا! وہ دیکھو رنگین کمان۔ اس میں ہم سب کے رنگ ہیں۔ یہ رنگوں کا میل کتنا حسین ہے۔ کتنا خوبصورت! ہم ہمیشہ ساتھ اڑیں گے۔ یہ کمان اسی طرح خوبصورت نظر آئے گی۔“

لال پری ذرا شوخ اور چنچل تھی۔ وہ کہتی: ”میں تو بہت تیز اڑتی ہوں۔ جی چاہتا ہے اڑتے اڑتے دور نکل جاؤں اور سورج کے پاس پہنچ جاؤں۔“

زرد پری کہتی: ”نا بہن! نانی امّاں کہتی ہیں کہ ہلکی دھوپ میں اڑا کرو۔ زیادہ اوپر جاؤ گی تو تیز دھوپ سے نازک پَر جل جائیں گے۔“ سبز پری کہتی: ”ہاں پَر جل گئے تو کیسے اڑیں گے۔ پھر یہ کمان بھی نہیں بنے گی۔“

نیلم پری کہتی: ”ہاں بھئی۔ دھوپ میں بھی اڑنا چاہیے لیکن اتنے اوپر نہیں کہ پَر جل جائیں۔“

لال پری کہتی: ”کوئی کچھ بھی کہے۔ میں تو سورج کے پاس ضرور جاؤں گی۔“

ایک دن خوب بارش ہوئی۔ سب پریاں آسمان کی سیر کو نکلیں۔ وہ کبھی بادلوں سے کھیلتیں، کبھی اوپر اڑ جاتیں۔ لال پری بھی ان کے ساتھ تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ان سے الگ ہو گئی اور تیزی سے اڑتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

شام ہو گئی لیکن لال پری واپس نہ آئی۔ دوسری پریاں اداس ہو گئیں اور کوہ قاف لوٹ آئیں۔ اس دن آسمان پر رنگین کمان بھی دکھائی نہ دی۔

جب نانی امّاں نے سنا کہ لال پری کہیں چلی گئی تو وہ بہت ناراض ہوئیں۔ کہنے لگیں: ”تم نے اسے کیوں جانے دیا۔ میری نازک بچی نہ جانے کس حال میں ہو گی۔ اب میں تمھیں بھی اڑنے نہ دوں گی۔ اڑنے کی کوشش کی تو پَر کتر ڈالوں گی۔“

بے چاری ننھی پریاں ڈر گئیں۔ انھوں نے اڑنا چھوڑ دیا۔ بس اِدھر اُدھر پھرتی رہتیں۔ برف کے کھیل میں بھی ان کا جی نہ لگتا۔ بارش ہوتی لیکن دھنک کہیں

(جھیم گیورہ۔ یونے کیمپ دہارا شتر)

دکھائی نہ دیتی۔

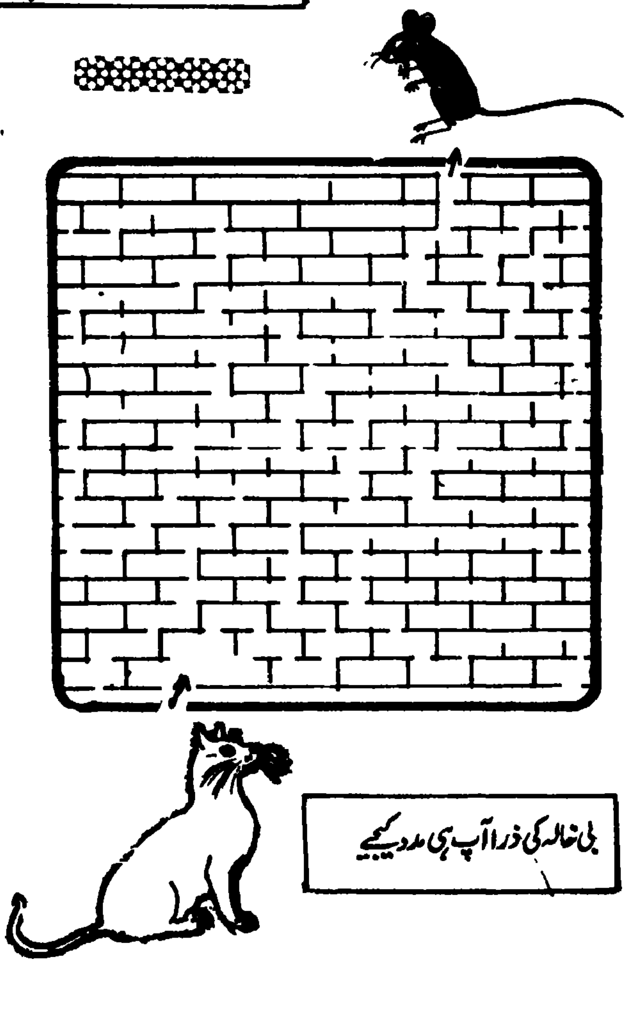
ایک دن اچانک لال پری آ گئی۔ اس کے پَر گرمی سے جل گئے تھے۔ وہ کہیں دُور میدان میں گر پڑی تھی۔ وہاں سے پیدل آتے آتے کئی دن لگ گئے۔ وہ سب سے گلے مل کر خوب روئی۔ نانی اماں نے پہلے تو اسے خوب ڈانٹا پھر اس کے جلے ہوئے پَروں پر دوا لگائی۔ ایک سال بعد اس کے نئے پَر نکل آئے۔

کچھ دنوں بعد بارش ہوئی تو پریوں نے نانی اماں سے کہا: "کیا اب ہم اُڑنے جائیں؟" نانی اماں نے ہنس کر کہا: "جاؤ۔ لیکن سورج سے دُور رہنا۔ نہیں تو تمھارے پَر جل جائیں گے۔"

ننھی پریاں خوش ہو کر اُڑنے لگیں۔ وہ بہت دیر تک اُڑتی رہیں۔ بہت عرصے کے بعد اُس دن آسمان پر دو رنگین کمانیں دکھائی دیں، سورج سے بہت دور۔ آج بھی جدھر سورج ہوتا ہے۔ اُدھر دھنک دکھائی نہیں دیتی۔



بہ شکریہ نونہال۔ کراچی



بی خالہ کی ذرا آپ ہی مدد کیجیے

پہیلیاں

کسی زمانے میں جب آسمان سبز تھا اور زمین سخت تھی، کوہ پامیر کے درّوں میں ایک بادشاہ رہا کرتا تھا۔ یہ جگہ چین، ہندستان اور افغانستان کی سرحدوں کے قریب تھی۔ یہ بادشاہ بڑا عقل مند، بہادر اور دولت مند تھا۔ ہر شخص اس کو چاہتا تھا۔ اس کی رحم دلی، عدل و انصاف، اور ایمان داری کی وجہ سے لوگ سب اس کی عزت کرتے تھے۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اس بادشاہ نے ایک عجیب و غریب اعلان کروایا۔ چنانچہ ڈھنڈورچی ساری سلطنت میں اس کی منادی کرنے لگے۔ اعلان یہ تھا:

"میرے پاس جو آئے وہ نہ تو کپڑے پہنے ہوا ورنہ ننگا ہو، نہ پیدل ہو اور نہ گھوڑے پر سوار، مجھ سے جب بات کرے تو اندر ہو نہ باہر۔ اگر ایسا شخص آ جائے گا تو ملک بچ جائے گا ورنہ تباہ ہو جائے گا۔"

بادشاہ کا یہ اعلان سن کر ہر شخص حیران رہ گیا۔ بہر حال بہت دنوں تک کچھ نہیں ہوا۔ پھر ایک دن ایک غریب لکڑہارے کی لڑکی نے اپنے باپ سے کہا:

"بابا، مجھے بادشاہ کے پاس جانا چاہیے۔ میں جانتی ہوں کہ ہم لوگ کس طرح تباہی سے بچ سکتے ہیں، اور اس طرح سے ہماری غربت بھی دور ہو جائے گی۔"

لکڑہارا یہ سن کر پریشان ہو گیا اور اس نے لڑکی کو روکنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ نہ مانی، لہٰذا مجبور ہو کر اس نے لڑکی کو اجازت دے دی۔

لڑکی جب بادشاہ کے محل کے پاس پہنچ گئی تو وہ پھاٹک کے پاس لیٹ گئی اور چلّائی، "بادشاہ سلامت! باہر آئیے، کیوں کہ میں آپ کی سلطنت کو بچانے کے لیے موجود ہوں۔" یہ شور و غل سن کر بادشاہ نے درباریوں سے پوچھا، "یہ کیسا شور و غل ہو رہا ہے؟" درباریوں نے کہا، "جہاں پناہ! ایک دیہاتی لڑکی آئی ہے اور آپ سے ملنے کے لیے چلّا رہی ہے۔ کہتی ہے کہ وہ آپ کی سلطنت کو تباہی سے بچا لے گی۔"



بادشاہ پھاٹک پر پہنچا تو اس نے لڑکی کو دہلیز پہ لیٹے دیکھا۔ لڑکی بولی، "میں نہ اندر ہوں نہ باہر۔ لہٰذا میں نے ایک شرط پوری کر دی۔"

بادشاہ بولا، "مگر ایک شرط یہ بھی تو ہے کہ نہ کپڑے پہنے ہوا ورنہ ننگا ہو؟" لیکن یہ کہنے کے بعد بادشاہ نے دیکھا کہ لڑکی ایک جالی سے اپنا جسم ڈھانکے ہوئے ہے۔ اس طرح وہ کپڑے بھی نہیں پہنے ہے اور نہ ننگی ہے۔

پھر لڑکی بولی، "میں نہ پیدل آئی ہوں اور نہ سوار ہو کر آئی ہوں۔ ایک پہاڑی بکرا مجھے گھسیٹتا ہوا لایا ہے۔" بادشاہ نے لڑکی سے کہا کہ محل میں داخل ہو جائے۔ پھر جب پورا دربار لگ گیا تو بادشاہ بولا، "اے چالاک لڑکی تجھ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایک خطرناک بھوت کے قبضے

میں آگیا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ سارا ملک تباہ کر ڈالے گا، مگر سوتے میں اس کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ جو شخص ایسی باتیں کر سکے گا جن کا میں نے اعلان کیا ہے تو وہ سلطنت کو بچا سکے گا۔"

لڑکی بولی، "میں مدد کو تیار ہوں۔ بتائیے مجھے اب کیا کرنا ہے؟"

بادشاہ نے کہا، "تم کو ان پہیلیوں کا جواب دینا ہے بھوت بار بار ان کے بارے میں بڑبڑاتا رہا ہے۔ پہلی پہیلی یہ ہے کہ آسمان پر کتنے تارے ہیں؟"

لڑکی بولی، "یہ تو آسان ہے۔ آسمان پر اتنے تارے ہیں جتنے بھوت کے سر پر بال ہیں۔ اس کی تصدیق یوں ہو سکتی ہے کہ آپ ایک ایک تارہ گنتے جائیں اور اس کے سر سے ایک ایک بال کھینچا جاتا رہے۔"

بادشاہ بولا، "بہت خوب، میں اس سے یہی کہہ دوں گا، مگر اب دوسرا سوال سنو۔ یہاں سے زمین کے آخری کنارے تک کتنا فاصلہ ہے؟"

لڑکی فوراً بولی، "اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ زمین کے آخری کنارے سے یہاں تک کا ہے!"

بادشاہ بولا، "بہت خوب! میں اس سے یہی کہہ دوں گا، لیکن اب آخری سوال سنو، آسمان کتنا اونچا ہے؟"

لڑکی بولی، "اس سوال میں کوئی مشکل نہیں۔ آسمان اتنا ہی اونچا ہے جتنا اونچا اچھل کر بھوت اپنے آپ کو دولتی مار سکتا ہے۔ اگر اسے یقین نہیں آتا تو آزما کر دیکھ لے!"

بادشاہ نے کہا: "بہت خوب، میں اس سے یہی کہہ دوں گا۔"

چند گھنٹوں کے بعد بھوت سیر و شکار کر کے واپس آیا اور بڑی ہیبت ناک آواز میں بادشاہ سے کہا، "او بے وقوف بادشاہ! کیا تو نے پہیلیوں کا جواب معلوم کر لیا؟"

بادشاہ نے بھوت کو وہی جواب سنا دیے جو لڑکی نے دیے تھے۔ بھوت غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ بولا، "یہ جوابات صحیح ہیں، مگر تم کو ابھی ایک اور آزمائش سے گزرنا پڑے گا۔ اس کا تعلق ہے میرے مار ڈالنے سے۔ مجھے صرف وہی مار سکتا ہے جو نہ آدمی ہو نہ جانور۔ مجھے صرف وہی مار سکتا ہے جو نہ تو دن میں مارے اور نہ رات کو۔ مجھ کو صرف وہ مار سکتا ہے جو مجھے ایسا تحفہ دے جو کہ تحفہ نہ ہو۔ مجھے نہ تو دھات سے مارے نہ رسّی سے، نہ زہر سے، نہ پتھر سے، نہ آگ سے مارے اور نہ پانی سے۔ مجھے



وہی مار سکتا ہے جو روزے سے کبھی نہ ہوا اور کھاتا کبھی نہ ہو۔"

یہ کہہ کر بھوت ایک بڑے سے درخت پر چڑھ گیا اور سو گیا۔ وہ سوتے میں بڑے زور زور سے بڑبڑاتا رہا۔

بادشاہ نے بھوت کی بات لکڑہارے کی لڑکی کو بتا دی۔ وہ بولی، "یہ تو بالکل آسان ہے، میں فوراً کام شروع کر دوں گی۔" پھر جس وقت جھٹ پٹا ہوا، یعنی نہ دن تھا اور نہ رات۔ لڑکی اس درخت کے نیچے پہنچ گئی جہاں بھوت سو رہا تھا اور چلائی، "او بھوت! بھاگ جا، کیوں کہ تیرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ میں ایک عورت ہوں، نہ آدمی ہوں اور نہ جانور۔ اس وقت نہ تو دن ہے اور نہ رات اور یہ ہے میرا تحفہ جو کہ تحفہ نہیں ہے!"

یہ کہہ کر اس نے ایک چڑیا پیش کی۔ بھوت جوں ہی اس کو لینے کے لیے بڑھا چڑیا اڑ گئی۔ بھوت سمجھ گیا کہ یہ

تحفہ واقعی تحفہ نہ تھا۔ وہ چلایا، "اگر تم یا تو کچھ کھا رہی ہوگی یا روزے سے ہوگی؟"

لڑکی بولی، "میں ان دونوں باتوں میں سے کچھ بھی نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو ایک درخت کی چھال چبا رہی ہوں۔"

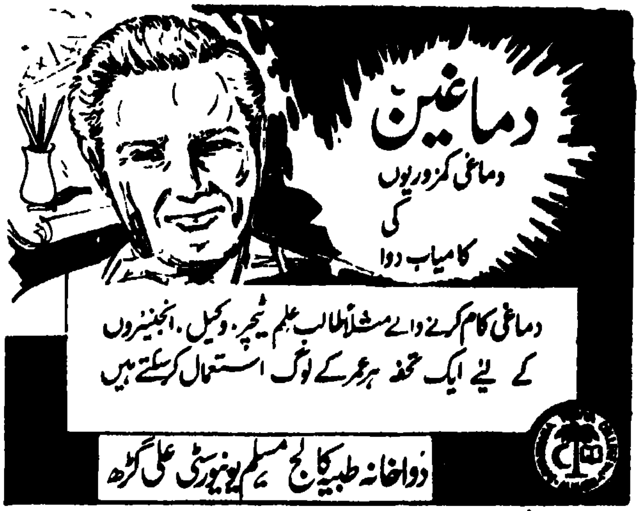
یہ سن کر بھوت کو اتنا غصہ آیا کہ وہ درخت سے گر پڑا۔ اسے نہ تو تلوار سے مارا گیا اور نہ نیزے سے، وہ نہ تو رسی سے مرا، نہ تیر سے اور نہ زہر سے۔ وہ تو خود اپنے غصے کی بدولت اتنی زور سے گرا کہ مر گیا۔

بھوت کے گرنے سے زمین لرزنے لگی۔ جب کچھ دیر کے بعد سکون ہوا تو بادشاہ بولا، "اے لڑکی، ایک آخری بات مجھے بتا۔ وہ یہ کہ اس وقت میں کیا سوچ رہا ہوں؟"

لڑکی بولی، "آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں اتنی عقل مند اور دل کش ہوں کہ آپ مجھ سے شادی کریں گے۔"

لڑکی نے صحیح جواب دیا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے اس لڑکی سے شادی کر لی اور دونوں عرصۂ دراز تک ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے رہے۔

(بہ شکریہ نونہال کراچی)



بچوں کے لیے مزیدار اور دل چسپ کہانیاں

جوہر قابل	مسعود احمد برکاتی	۳/-
بھوتوں کا جہاز	ڈاکٹر شمیم حنفی	۶/-
خرگوش کی چال	آصفہ مجیب	۲/۵۰
ہار کی تلاش	ریاض احمد خاں	۴/۵۰
محمد شفیع الدین نیر	ڈاکٹر اطہر پرویز	۶/-
اس نے کیا کرنہ جانا	آصفہ مجیب	۱/۲۰
دُم کٹا سانپ	محمد قاسم صدیقی	۱/-
صحت کی الف بے	مسعود احمد برکاتی	۳/-
موم کا محل	پروفیسر محمد انس	۴/-
پہیلیاں	ڈاکٹر سیفی پریمی	-/۸۰
چھوٹا لڑکا	عبدالغفار مدھولی	۱/۵۰
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	کوثر بانو	۱/۵۰
شہزادہ اور ٹھگ		۲/-
لال مُرغی	عبدالواحد سندھی	۱/۵۰
چپاوت کا آدم خور شیر	محمد معین	۱/۵۰
ایک کچوری تیل میں راجا جی	اسرار ندوی	۱/۵۰
چوری کی عادت	عبدالغفار مدھولی	۲/-
دادا نہرو	منور لکھنوی	۵/-
تانبیل خاں	محمد حسین حسّان جامعی	۱/۵۰
میگھ نگر کا راجا	ریاض احمد خاں	۱/۲۵
سرکس	ڈین گپسیر	۱/۵۰
سُرخ جوتے	بیگم قدسیہ زیدی	۲/۵۰
پلک نہ مارو	یوسف ناظم	۲/-
جن حسن عبدالرحمٰن	قراۃ العین حیدر	۵/-
تین اناڑی	عصمت چغتائی	۳/-
چنبیلی	محمد حسین حسّان	-/۸۰
امیر خسرو	سلمیٰ اجمیری	۵/۵۰

امۃ الرحمن محسنی

دو شکاری (قسط ۷)



ابو نے مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر حسین پینتالیس سال سے ہمارے ضلع میں کام کررہے ہیں۔ اب وہ ستر برس کے ہیں۔ عرصہ ہوا ریٹائر ہوچکے ہوتے۔ مگر کام چھوڑنے کی نہ تو ان کی خواہش ہے نہ ضلع کے لوگ چاہتے ہیں کہ وہ کام چھوڑ دیں۔ وہ چھوٹے سے قد کی مناسبت سے چھوٹے ہاتھوں پیروں، بھورے جھریوں دار مسکراتے چہرے والے انسان ہیں۔ ان کو دیکھ کر نہ معلوم کیوں ایک ایسے بالشتیے کا تصور ہوتا ہے جس کے سر پر سفید بالوں کا جھا، آنکھوں پر اسٹیل فریم کا چشمہ چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ پھیلی ہوئی، تیز تیز باتیں کرتا ہوا، نہ اس سے کوئی ڈرتا ہو بلکہ لوگ اس سے محبت کرتے ہوں اور خاص طور پر بچوں پر وہ بہت مہربان ہو۔ ابو سے وہ سوال کررہے تھے۔ کون سا پیر ہے۔ بایاں۔ ابو نے بتایا۔

ڈاکٹر حسین دو زانو ہو کر فرش پر ان کے پاس بیٹھ گئے۔ اپنے بیگ سے ایک لمبی بڑی قینچی نکالی اور ابو کی پتلون کا بایاں پائینچہ گھٹنے تک کاٹ دیا۔ صرف کپڑے ہٹا کر بلا چھوئے اس کا معائنہ غور سے کیا۔ میں نے بھی دیکھا۔ ان کا پیر پیچھے کو مڑا ہوا تھا۔ اور ٹخنے کے نیچے کا حصہ بہت سوج گیا تھا۔ وہ فکر مند ہو کر بولے کافی بڑا چکر ہے۔ بلا ہاسپٹل جائے کام نہیں بنے گا۔

پھر ابو سے اجازت لے کر انھوں نے ہاسپٹل فون کیا اور ایمبولینس جلد لانے کی تاکید کی اور کسی دوسرے سے ایکسرے اور آپریشن کی تیاری کے لیے کہا۔ پھر ابو سے پوچھا۔ کیا درد کے لیے میں تمھیں کچھ دوں؟۔

مگر ابو نے انکار کردیا۔ کہا ہاسپٹل جانے تک میں کچھ نہیں لوں گا۔

وہ بولے۔ اگر تم ضروری نہیں سمجھتے تو ٹھیک ہے۔ لیکن واجد یہ سب ہوا کیسے؟ کیا تم اپنے گھر کی سیڑھیوں پر سے گر پڑے تھے؟۔ نہیں سیڑھیوں پر سے نہیں۔ ابو نے کہا۔ بات دراصل یہ ہے ابو نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔ میں شہباز کے جنگل میں گھوم رہا تھا۔ اور رک کر ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگے جواب تک ان کے پاس دو زانو بیٹھے تھے۔

اچھا اچھا ہاں! ڈاکٹر نے ان کی بات سمجھتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔ آج کل وہاں کیا حال ہے؟ کیا اب بھی بہت تیتر ہیں وہاں؟ وہاں ڈھیروں ہیں۔۔۔ ابو نے کہا۔

یہ کھیل بھی کتنا دلچسپ اور تفریح کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نے لمبی سانس لے کر کہا۔ بعض دفعہ بے اختیار دل میں تمنا ہوتی ہے کہ کاش میری عمر کم ہوتی اور میں ایک مرتبہ پھر وہاں جاتا۔ مجھے اپنی طرف تاکتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ دانی کیا تم نے نہیں سنا کہ میں بھی اپنی جوانی میں وہاں پوچنگ کے لیے جایا کرتا تھا؟

میں نے کہا۔ جو اس وقت حیرت زدہ ان کی باتیں سن رہا تھا۔ نہیں مجھے تو معلوم نہیں ہے۔

ڈاکٹر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا جس رات کو سرجری میں میری ڈیوٹی نہیں ہوتی تھی۔ میں سویرے ہی سے پچھلے دروازے سے نکل کر میدان میں اور پھر وہاں سے اپنی کسی خاص جگہ پر

مسکن دودھ پور، علی گڑھ

پہنچ جاتا تھا ۔ کبھی تیتروں کے لیے جنگل میں ۔ کبھی ٹراوٹ کے لیے تالاب پر ۔ ان دنوں تالابوں میں ٹراوٹ بہت ہوتے تھے ۔ وہ ابو کے برابر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے اور پھر ابو سے کہا ہاں بس ایسے ہی آرام سے بلا حرکت کیے لیٹے رہو۔

ابو نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں کچھ وقفے کے بعد آنکھیں کھول کر پوچھا تیتروں کے لیے آپ کون سا طریقہ استعمال کرتے ہیں؟ جن اور کشمش والا ۔ ڈاکٹر نے جواب دیا ۔ میں کشمشوں کو ایک ہفتے تک شراب میں بھگوئے رکھتا تھا اور پھر جنگل میں پھیلا دیتا تھا ۔ مگر یہ طریقہ تو کامیاب نہیں ہوتا ۔ ابو نے کہا ۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو ۔ ڈاکٹر نے کہا ۔ مگر اس کھیل میں مزا بہت آتا ہے بڑی تفریح ہوتی ہے ۔

ابو نے کہا ۔ اگر ایک تیتر پندرہ سولہ جن میں بھیگی ہوئی کشمشیں نگل جائے تب کہیں اس کو اتنا نشہ ہوتا ہے کہ وہ پکڑا جائے ۔ میرے ابا نے مرغیوں پر اس کا تجربہ کیا تھا ۔

مجھے تمھاری بات کا یقین ہے ۔ ڈاکٹر نے کہا ۔ کیونکہ اس طریقے سے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا ۔

اور پھر ابو سے سوال کیا ۔ یہ ہوا کیسے ؟ کیا کسی خرگوش کے بل میں تمھارا پیر پڑ گیا تھا ۔

وہ خرگوش کے بل سے بہت بڑا اور گہرا بل تھا ۔ ابو نے کہا ۔

میں سمجھا نہیں اس سے کیا مطلب ہے تمھارا ؟ ۔

ابو نے ڈاکٹر صاحب کو پوری کہانی سنا دی کہ وہ کیسے اس گہری کھائی میں گرے تھے ۔

ڈاکٹر حسین جو اب ورک شاپ کے باہر کھڑے ایمبولینس کو دیکھنے کے لیے سامنے سڑک کو دیکھ رہے تھے ۔ مڑے اور ابو سے تعجب کے ساتھ کہنے لگے ۔ کیا بتاؤں مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ کھائی اتنی گہری ہوگی ۔

آپ یقین کیجیے ! دانی سے پوچھ لیجیے اس میں بالکل مبالغہ نہیں ۔ ابو نے کہا ۔

میں نے بھی ان کو یقین دلانے کے لیے کہا ۔ جی ہاں وہ بہت گہری کھائی تھی ۔ کوئیں کی طرح گہری اور خوفناک !

ڈاکٹر حسین غصے سے پیر پٹکتے ہوئے اندر آگئے اور کہنے لگے کہ خدا کی قسم شہباز کی یہ انتہائی کمینہ پن اور مکاری کی حرکت ہے کہ شیروں کے پکڑنے کا جال اپنے جنگل میں آدمیوں کے لیے بنایا ہے ۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی وحشیانہ بات کبھی نہیں سنی تھی ۔ ابو نے کہا ۔ بے شک یہ اس شخص کی سنگدلی اور بے رحمی کی بات ہے

واجد میں کہتا ہوں کہ اس سے بھی زیادہ ، خباثت اور درندہ پن کا کام ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم جیسے شریف لوگ ٹانگ ، بازو ، بلکہ گردن توڑنے کا خطرہ مول لیے بغیر رات کو اس کھیل کے لیے جا ہی نہیں سکتے ! ۔

ابو نے گردن ہلائی اور کہا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ۔

اور واجد ! سچ پوچھو تو میں نے شہباز کو کبھی کوئی بہتری یا فائدہ پہنچانے والا کام کرتے نہیں دیکھا نہ سنا ۔ اسے ہمیشہ ایسے ہی ذلیل اور پاجی پن کے کام کرتے دیکھا اور سنا گیا ہے ۔ اسی لیے وہ مجھے کبھی پسند نہیں آیا ۔ لو وہ ایمبولینس بھی آگئی ۔ ڈاکٹر نے کہا ۔ ایمبولینس ورک شاپ کے سامنے آکر رک گئی ۔ دو وردی پوش اس میں سے اتر آئے ۔ ڈاکٹر نے ان سے ٹانگ کے نیچے لگانے کا تختہ منگوایا ۔ اور پھر خود ہلکے سے اسے ٹانگ کے نیچے سرکا کر اس پر فیتے کس دیے ۔ ایمبولینس کے آدمیوں نے ایک اسٹریچر ابو کے برابر لگا دیا ابو خود ہی اس پر لیٹ گئے ۔

میں اب تک کرسی ہی پر بیٹھا تھا ۔ ڈاکٹر نے میرے پاس آکر اور شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔ دانی ! میرا خیال ہے کہ تم میرے ساتھ گھر چلو اپنے ابو کے ہاسپٹل سے لوٹنے تک وہیں رہنا ۔

میں نے کسی قدر گھبرا کر پوچھا ۔ کیوں کیا وہ آج گھر نہیں آئیں گے ؟ ۔

ابو نے فوراً کہا ۔ میں آج شام تک گھر واپس آجاؤں گا ۔ ڈاکٹر نے کہا ہو سکتا ہے رات کو تمھیں رکنا پڑے ۔

نہیں میں شام کو ضرور آجاؤں گا ۔ ڈاکٹر صاحب دانی کو اپنے یہاں لے جانے کی آپ کی پیش کش کے لیے بہت ممنون ہوں ۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا یہاں رہنا بہتر ہوگا ۔ کیونکہ دن کا زیادہ حصہ تو اس کا سونے ہی میں گزر جائے گا ۔ کیوں پیارے تم پریشان تو نہیں ہو گے ؟ ۔

میرا خیال بھی یہی ہے کہ میں سوتا رہوں گا مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

تو بس تم پمپ وغیرہ بند کر کے سیدھے سونے چلے جانا۔

جی ہاں! ابو۔ آپ تو جلدی ہی آجائیں گے نا؟

اور اس کے بعد ان کو ایمبولینس میں لیجایا گیا اور گاڑی کے دروازے بند کر دیے گئے۔ میں ڈاکٹر حسین کے پاس ورک شاپ سے باہر کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا کہ بڑی سفید گاڑی پیٹرول پمپ سے چل کر سڑک پر مڑ گئی تھی۔

تم تو بالکل ٹھیک ہو نا؟ ڈاکٹر نے پوچھا۔ جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ شکریہ! میں نے جواب میں کہا۔

تو بس اب تم جا کر لیٹو اور آرام سے سوؤ۔ جی ہاں۔ میں نے کہا

اگر تمھیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف فون پر بتلا دینا۔ میں نے پھر کہا۔ جی ہاں۔

اس کے بعد وہ نیک دل مہربان ڈاکٹر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اسی سمت روانہ ہو گئے جس طرف ایمبولینس گئی تھی۔

(جاری)

ڈاکٹر قنبر رضوی

قسط نمبر۲

(سلسلے کے لیے جولائی کا شمارہ دیکھیے)



مقدس ایشیا

کے اس پار چلیں۔

مقدس ایشیا کے پیچھے پیچھے میں نے دیوار چین پار کی اور سنگ لنگ کی پہاڑیوں کے اس پار کیون لن کے کوہستانی سلسلے تک پہنچ گیا۔

میں نے مقدس ایشیا سے پوچھا۔

میں: مقدس ایشیا! ہم لوگ تو اب بہت اونچائی پر آ گئے۔

ایشیا: ہاں یہ تبت کا پٹھار ہے۔ اسے "بام دنیا" کہتے ہیں۔ یہ اب چین کے پاس رہتا ہے۔ یہاں بودھ دھرم کے آثار آج بھی 'لاما' اور 'پگوڈا' کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔

میں: مقدس ایشیا! وہ برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی چوٹیاں کہاں ہیں؟

ایشیا: یہ دنیا کا سب سے اونچا کوہستانی سلسلہ ہمالیہ ہے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی کو لوگ 'ایورسٹ' کہتے ہیں۔ تبت سے جنوب کی طرف اس پہاڑی سلسلے کو پار کر کے ہم نیپال، بھوٹان ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش و برما سے ملاقات کر سکتے ہیں۔

میں: مقدس ایشیا! تو آئیے ان برفانی سلسلوں

شعبہ جغرافیہ۔ اے۔ کے کالج شکوہ آباد۔ یوپی

ہم دونوں بام دنیا سے اونچی نیچی برفیلی سیڑھیوں کے ذریعے چڑھتے اترتے آگے بڑھے۔ مقدس ایشیا نے بتایا۔ ہم لوگ تین آبی راستوں سے ہو کر نیچے میدانی علاقوں میں پہنچ سکتے ہیں۔ پورب میں چین کی سرحد کے قریب ہند میں برہمپتر سے داخل ہو کر ہم بنگلہ دیش سے مل سکتے ہیں۔ پچھم میں سندھ کے ذریعے کشمیر میں ہوتے ہوئے ہم سرزمین پاک تک پہنچ سکتے ہیں لیکن جنوب میں گنگا ہم کو برِ ہند سے ملا دیتی ہے۔

دوپہر کے قریب چمکتی دھوپ میں ہم سطح سمندر سے ۸۸۴۸ میٹر کی اونچائی پر تھے۔ چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ مقدس ایشیا نے فخر سے سر اونچا کیا۔ ایک انگڑائی لے کر کہا۔ یہ میرے سر کا تاج یعنی میرے ہمالہ کی سب سے اونچی کلاہ ہے اسی کا نام 'ایورسٹ' یا 'چومولنگ ما' ہے۔ آؤ نیچے چلیں پہاڑیوں کا راجا نیپال ہمارا انتظار کر رہا ہے۔

ہم نیچے آئے۔ پہاڑیوں کے بیچ کسی نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا اور مقدس ایشیا کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

میں: پہاڑیوں کے راجا۔ ہمالہ کے بیٹے نیپال آپ ہی ہیں؟

نیپال: جی ہاں میں ہی گورکھوں کا نیپال ہوں۔ مجھے بلند ہمالہ نے پالا ہے۔ میں ندیوں کے ساتھ کھیلتا۔ جنگلوں کے گیت سنتا اور جھرنوں کے سائے میں سوتا ہوں۔

میں: آپ کی زندگی تو بڑی مست اور شان دار ہے۔

نیپال: جی ہاں میں تو قدرتی مناظر سے ہی لطف اندوز ہوتا رہتا ہوں۔

میں: آپ کے پڑوسی کیسے ہیں؟

نیپال: میرے پڑوسی ہیں "بھارت ماتا" میرے جوان دو بھائی پاکستان اور بنگلہ دیش۔ ایک ننھا منا بھیا بھوٹان اور میرے بڑے بھائی چین۔ یہ سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔

میں نے مقدس ایشیا کا ہاتھ پکڑا اور کہا آئیے چلیے پہلے بھارت ماتا سے ملاقات کریں۔



سامنے کیسری ساری باندھے اپنے سفید بالوں والی مانگ میں سیندور بھرے ہوئے ماتھے پر بندیا لگائے ہاتھوں میں چوڑیاں کھنکتی ہوئی۔ گنگا اور جمنا کی انگلیاں پکڑے ہوئے بوڑھی بھارت ماں کیلاش سے آتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے ادب سے سر جھکا لیا۔ مادرِ ہند نے مجھے دعائیں دیں۔ مقدس ایشیا نے تعارف کراتے ہوئے کہا یہ میری سب سے بڑی بیٹی ہے۔

میں: ماں! کیا آپ کا نام ہند ہے۔

بھارت: ہاں بٹیا کوئی مجھے ہند کہتا ہے کوئی ہندستان۔ یونانیوں نے مجھے انڈیز کہا تو انگریزوں نے میرا نام انڈیا رکھا۔ میرے بچے مجھے بھارت ماتا کہتے ہیں۔

میں: مادر ہند آپ کتنی متبرک لگتی ہیں۔

بھارت: بیٹے! میں اپنے باپ مقدس ایشیا کی سب سے بڑی بیٹی ہوں۔ اسی لیے میرے باپ نے اپنا برفانی تاج میرے ہی سر پر رکھا۔ میرا وطن بہت قدیم ہے اتنا جتنا عرب، آسٹریلیا، افریقہ اور برازیل۔ یہ میری سب سے چھوٹی لڑکیاں گنگا اور جمنا ہیں جن کی پاکیزگی کی سب لوگ قسم کھاتے ہیں۔ میں واحد ملک ہوں جس کے نام پر ایک بحرِ اعظم کا نام بحرِ ہند رکھا گیا۔

میں: مقدس ایشیا کی متبرک بیٹی آپ کتنی عظیم اور وسیع ہیں!

بھارت: ہاں کشمیر سے راس کماری تک۔ اروناچل سے پنجاب تک میرے ہی بچے کھیل کود رہے ہیں۔ دنیا میں آبادی میں چین کے بعد میرا ہی نمبر ہے۔ میرا رقبہ بھی ۳۲،۷۴،۰۰۰ مربع کلومیٹر ہے جو دنیا کا ۱/۴۰ ہے۔

میں: مادرِ ہند آپ کتنی نڈر اور کتنی محبت کرنے والی ہیں!

بھارت: جب تک میرے دائیں بائیں میرے دونو جوان بھائی پاکستان اور بنگلہ دیش میرے ساتھ ہیں مجھے کسی کا کوئی ڈر نہیں۔ یہ مجھ سے الگ سہی پھر بھی یہ دونوں میرے اپنے بھائی ہیں مجھے ان سے بڑی محبت ہے

(باقی آئندہ)





مصنف: اے۔ایس۔آشر

مترجم۔ محمد یوسف کھتری

جو ڈرے سو مرے

پُرانے زمانے کی بات ہے۔ بلکہ یوں کہنا درست ہوگا آج سے کئی سو سال پہلے کی بات ہے ایک سوداگر تھا۔ مال و زر سے خوشحال۔ اس کا کاروبار نہایت ہی وسیع اور شان دار اور اعلیٰ پیمانے کا تھا۔ سماج میں اس کی عزت بھی زیادہ تھی۔

خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے قحط کے آثار شروع ہونے لگے۔ برسات بھی نہیں ہوئی۔ لوگ پانی اور اناج کو ترس گئے۔ سوداگر نے جن لوگوں کو مال ادھار دیا تھا ان سے رقم بھی وصول نہیں ہو پائی۔ کاروبار ٹھپ ہوگیا اور وہ خود روپے پیسوں سے مجبور۔ کاروبار بند کرنے کا وقت آگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سوداگر مفلس ہوگیا۔ اپنی اس غریبی کی وجہ سے اسے اپنے گاؤں میں رہنے سے شرمندگی محسوس ہونے لگی اس نے طے کر لیا کہ اب گاؤں چھوڑ کر کہیں اور جا بسے گا۔ بس وہ اپنے خاندان کو لے کر دوسرے گاؤں جانے کے لیے چل پڑا۔

چلتے چلتے وہ ایک گھنے جنگل میں پہنچا۔ اس جنگل میں دن کے وقت بھی سورج کی کرنیں اور روشنی نہیں آتی تھی۔ ایسے گھنے جنگل میں رات کے وقت کا ذکر ہی کیا؟ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اندھیرے کے سوا کچھ نظر ہی نہ آتا اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ رات ہوگئی۔ آخر انھوں نے طے کیا کہ اب رات کاٹنے کے لیے اس جنگل میں ہی بسیرا کرنا پڑے گا۔ اس گھنے اور خوفناک جنگل کے بارے میں مختلف افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ اس جنگل میں بھوتوں کا بسیرا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس پر چڑیلوں اور شیطانوں کا قبضہ ہے۔ کوئی اس جنگل سے زندہ اور سلامت واپس نہیں آسکتا۔

سوداگر نے اپنے خاندان کے ساتھ ایک اچھی جگہ کا انتخاب کر کے اپنا ڈیرا ڈال دیا۔ اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اپنے کھانے کا انتظام کرنے لگے۔ کھانے کے دوران وہ سب باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک بھوت کے آثار نمودار ہوئے۔ اور عجیب سی آوازیں آنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک خوفناک بھوت سب کو نظر آیا ــــ سوداگر ایک زمانہ شناس اور دور اندیش آدمی تھا۔ اس نے ایک زمانہ دیکھا تھا چنانچہ اس نے سب سے کہا:

"ایک کہاوت ہے کہ "جو ڈرے سو مرے"! اس لیے تم میں سے کوئی گھبرائے نہیں۔ بلکہ ہمت سے کام لے: ہمتِ مرداں مددِ خدا! ہم اس بھوت کو پکڑ کر اس کی بلی شنکر بھگوان پر چڑھا دیں گے جس سے شنکر بھگوان خوش ہو جائیں گے اور ہم لوگوں کی تکالیف و مصیبت کے دن ختم اور دور ہو جائیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے بیٹے سے کہا: "جلدی سے رسّی لے آؤ"

بیٹے نے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور جلد ہی رسی لے آیا۔
پھر سوداگر نے کہا: "تم سب مل کر بھوت کو پکڑ لو، ہم اسے باندھ لیں گے۔"

اس بھوت نے سوداگر کی بات سن لی۔ اس نے دیکھا کہ

معرفت۔ محب بک ڈپو۔ بمبئی ۳

سب اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر بھوت ڈر گیا ـــــ اور رو رو کر عاجزی سے کہنے لگا۔

"دیکھو تم مجھے چھوڑ دو تو میں اس کے بدلے تم کو سونے کی اشرفیوں کی پانچ ہانڈیاں دوں گا۔" سوداگر نے کہا: "اس کا کیا ثبوت ہے؟"

بھوت نے نہایت ہی عاجزی سے کہا: "میں فوراً ہی تمہارے لیے اشرفیوں سے لبریز ہانڈیاں لے آتا ہوں۔"

اتنا کہنے کے بعد بھوت نے زمین کھودنا شروع کر دی۔ اور اس میں سے اس نے سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی پانچ ہانڈیاں نکال کر سوداگر کے حوالے کر دیں۔ اور۔ غائب ہو گیا۔

اشرفیاں ملنے سے سوداگر اور اس کے خاندان کے افراد کی باچھیں کھل گئیں۔ اور وہ خوشی سے جھوم اٹھے اب ان کی مصیبت اور تکالیف ختم ہو گئیں اور غریبی بھی جاتی رہی ـــ اب اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے قریب ہی کے دوسرے شہر کا رخ کیا وہاں سے کچھ سامان اور رقم لے کر واپس اپنے گاؤں آگیا اور گاؤں میں دوبارہ تجارت شروع کر دی ـــ اپنے رہنے کے لیے ایک عالیشان اور خوبصورت بنگلہ بنوایا۔ سب ہنسی خوشی، سکھی زندگی گزارنے لگے۔

سوداگر کی یہ شان و شوکت دیکھ کر اس کے پڑوسی اور گاؤں کے دوسرے لوگ حسد سے جلنے لگے ـــ انھوں نے اسے مذاق کا نشانہ بنایا۔ کہنے لگے کہ سوداگر اتنی جلدی امیر کیسے بن گیا؟ ـــ یہ دولت کہاں سے ہاتھ لگ گئی؟؟ ـــ کہیں چوری ڈاکا تو نہیں مارا؟؟؟ ـــ وغیرہ وغیرہ ـــ اس طرح کے فقرے وہ سوداگر پر کستے تھے۔

اسی گاؤں میں ایک حاسد اور لالچی تاجر بھی رہتا تھا وہ اس سوداگر کا حریف بھی تھا۔ اس نے سوداگر کی شان و شوکت اور دولت مند ہو جانے کی داستان سنی تو اس کے حسد کی آگ بھڑک اٹھی ـــ وہ بھی سوداگر کی طرح دولت مند ہو جانا چاہتا تھا۔ حسد اور لالچ نے اس کی عقل بھی ختم کر دی ـــ اور آنکھوں میں اندھیرا۔ اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اسے تو صرف دولت مند بن جانے کی فکر تھی ـــ اس نے دولت مند بن جانے کی ٹھان تمام ـــ اور ـــ سوداگر کی نقل کرتے ہوتے اس لالچی تاجر نے اپنی تمام جائیداد فروخت کر دی اور اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ اسی گھنے جنگل کی راہ لی

چلتے چلتے وہ اسی جگہ پہنچے جہاں سوداگر نے بسیرا کیا تھا۔ کھانے سے فراغت پا کر سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے ـــ ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بھوت کے آثار نظر آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک خوفناک آواز کے ساتھ بھوت سامنے آگیا ـــ لالچی تاجر نے فوراً اپنے بیٹے سے کہا: "رسی لے آؤ تاکہ ہم اس بھوت کو باندھ لیں۔" لیکن اس خوفناک اور ڈراؤنے بھوت کو دیکھ کر بیٹا گھبرا گیا تو خاندان کے دیگر افراد بھی ڈر گئے اور بھوت سے نجات پانے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے

لالچی تاجر کا بیٹا تو اس خوفناک اور ڈراؤنے بھوت کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

بھوت نے جب یہ منظر دیکھا کہ یہ لوگ اسے پکڑنے اور باندھنے کی شیخی بگھارتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ اس سے ڈرتے بھی ہیں + اسے خوشی ہوئی ـــ وہ مزید خوف ناک آوازیں نکال نکال کر انھیں ڈرانے لگا ـــ ان خوف ناک آوازوں سے گھبرا کر دہشت سے لالچی تاجر کے خاندان کے افراد اپنی جانیں گنوا بیٹھے ـــ بھوت کی بھیانک آواز سن کر اور اپنے خاندان کے افراد کی لاشیں دیکھ کر لالچی تاجر اپنی جان بچا کر بھاگنے لگا ـــ لیکن بھوت نے نہایت پھرتی سے اُسے پکڑ لیا ـــ اور ـــ اپنا نوالا بنا لیا۔

اس طرح یہ لوگ اس خوفناک بھوت سے ڈر گئے اور اس کا شکار بن گئے۔

اسی لیے تو کہتے ہیں کہ "جو ڈرے سو مرے۔"

(گجراتی سے آزاد ترجمہ)

سکندر ضمیر

حجرِ اسود

خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت جب دیواریں اونچی ہوگئیں تو کعبتہ اللہ کے معمار حضرت ابراہیمؑ ایک اونچے پتھر پر کھڑے ہو کر دیواریں چننے لگے۔ اِس پتھّر کو اب مقامِ ابراہیم کہتے ہیں۔ جب خانۂ کعبہ کی تعمیر مکمّل ہوگئی تو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ سے کہا: "جاؤ، ایک ایسا پتھّر لاؤ جسے بہ طور نشان استعمال کیا جائے اور وہیں سے طواف شروع ہو اور وہیں ختم ہو۔"

حضرت اسماعیلؑ گئے اور ایک ایسا پتھّر تلاش کرنے لگے۔ جب آپ واپس آئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اِس جگہ ایک عجیب پتھّر نصب ہو چکا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بتایا کہ یہ پتھّر حضرت جبریل علیہ السّلام لائے ہیں۔ اِسے "حجرِ اسود" کہتے ہیں۔

حجرِ اسود کے بارے میں کئی روایات ہیں۔ ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ہے کہ جب آدم علیہ السّلام جنت سے زمین پر اُترے تو یہ پتھّر اُن کے ساتھ تھا۔ یہ جنت کے یاقوتوں میں سے ایک یاقوت ہے اگر خدا نے اُس کی روشنی نہ بجھا دی ہوتی تو کوئی اُس کی طرف دیکھ نہ سکتا تھا۔ سب سے پہلے روئے زمین پر کعبتہ اللہ کی جو عمارت بنائی اُس میں یہ پتھّر نصب تھا۔ طوفانِ نوح کے وقت کعبہ شریف کی عمارت جب منہدم ہوگئی تو جبریل علیہ السلام نے حکمِ الٰہی سے حجرِ اسود کو کسی خاص جگہ پر محفوظ کر دیا۔ پھر جب حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے حکم سے کعبتہ اللہ کی تعمیر کی تو حضرت جبریلؑ نے یہ پتھّر لا کر آپ کو دیا اور آپ نے اُسے خانۂ کعبہ سے باہر ایک گوشے میں نصب کر دیا، جہاں وہ آج تک ہے۔

مختلف زمانوں میں خانۂ کعبہ حوادث سے دوچار ہوا۔ اُن سے حجرِ اسود بھی متاثر ہوتا رہا۔ جن جن لوگوں نے خانۂ کعبہ پر حملے کیے اُن کے نام اور سنین یہاں درج ہیں۔

ایک زمانے میں قبیلۂ جرہم اور قبیلۂ خزاعہ کے درمیان جنگ ہوئی اور قبیلۂ جرہم کو مکہ مکرمہ سے نکالا گیا۔ اُس وقت اُس قبیلے کے ایک شخص عمرو بن الحارث نے حجرِ اسود کو چاہِ زمزم میں چھپا دیا۔ قبیلۂ خزاعہ کی ایک عورت نے اُسے ایسا کرتے دیکھ لیا تھا۔ پھر قبیلۂ خزاعہ کے لوگوں نے حجرِ اسود کو چاہِ زمزم سے نکال کر اسے اس کی جگہ نصب کیا۔ پھر قریش نے کعبہ کی تعمیر کی تو حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اُس جگہ نصب کیا۔ اُس وقت وہ بالکل صحیح و سالم تھا۔ پھر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانے میں حرم شریف میں آگ لگنے کا خوف ناک حادثہ ہوا۔ تو عمارت کے ساتھ حجرِ اسود کو بھی کافی نقصان پہنچا۔ اِس کے چند ٹکڑے ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے کعبہ کی نئی تعمیر کرائی تو حجرِ اسود کو چاندی کے ایک خول میں جڑ کر اُس کی جگہ نصب کر دیا۔ حجرِ اسود کو پہلا بڑا حادثہ ۶۴ھ میں پیش آیا۔ پھر ۲۱۲ھ میں کفار نے مکہ مکرّمہ پر حملہ کیا۔ ابوطاہر قرمتی نے کعبہ کا غلاف پھاڑ دیا۔ اور حجرِ اسود کو کعبہ شریف

راماین ہاؤس آزاد مارکیٹ۔ بھوپال

سے نکال کر بائیس سال تک اپنے پاس رکھا۔ بائیس سال بعد سر قرمطی نے اُسے پھر خانۂ کعبہ میں اپنی جگہ نصب کر دیا۔ ۴۱۳ھ میں ایک رومی نے ایک دوپہر میں کدال جیسی کسی چیز سے حجر اسود پر حملہ کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ ضرب لگائے، ایک طواف کرتے ہوئے شخص نے اُسے قتل کر دیا۔

چوتھا حادثہ ۱۴۱ھ میں ایک مصری کے ہاتھوں پیش آیا۔ اُس نے تین ضربیں لگائیں جس سے حجر اسود کے چند ذرّے الگ ہو کر گر گئے۔ جنھیں بعد میں وہیں جوڑ دیا گیا۔

پھر ۹۹۰ھ میں ایک عجمی نے حجر اسود کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑا تو اُس کا انجام بھی قتل ہوا۔

آج بھی حجاج حجر اسود ہی سے طواف شروع کرتے ہیں اور اُسی پر ختم کرتے ہیں۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حجر اسود جب آدم علیہ السّلام کے ساتھ جنت سے آیا تو اُس کا رنگ سفید تھا۔ بعد میں سیاہ کار انسانوں کے ہاتھوں سے آلودہ ہو کر سیاہ ہو گیا۔ اب اس کا رنگ سیاہ سُرخی مائل ہے۔ بیضوی شکل کا ہے۔ عرض ۲ بالشت ہے۔ زمین سے چھ بالشت کی بلندی پر چاندی کے پانچ انچ چوڑے اور تین انچ کے حلقے میں جڑ کر کعبہ شریف کی دیوار میں نصب کر دیا گیا ہے۔ چاندی کا حلقہ دیوار سے کچھ اونچا نظر آتا ہے۔ اور حجر اسود میں دبا ہوا ہے۔ جس سے اُس کی شکل ایک پیالے کی سی ہو گئی ہے۔ ایک حدیث نبوی کے بموجب حجر اسود خدا کا سیدھا ہاتھ ہے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حضرت سرکار دو عالم کی بوسہ گاہ رہا ہے۔

عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کو لوگوں کے سینے سے اُٹھا لیں گے۔ حجر اسود کو بھی قیامت سے پہلے اُٹھا لیں گے۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا پتا صاف اور خریداری نمبر ضرور لکھیے اور جواب طلب امور کے لیے جوابی لفافہ یا کارڈ آنا ضروری ہے۔ (منیجر)

کوثر بھگوت پوری

گلہری

جب پیڑ سے اتر کر آتی ہے یہ گلہری
بچّوں کے دل کو کتنا بھاتی ہے یہ گلہری

کھیتوں میں جب کہ دانے پاتی ہے یہ گلہری
کیسے پھدک پھدک کر کھاتی ہے یہ گلہری

پنجے میں اپنے لے کر گیہوں کی بالیوں کو
اونچے درخت پر بھی جاتی ہے یہ گلہری

من سب کا موہ لیتی ہے اپنے بھولپن سے
ایک بھی نہ گیت منہ سے گاتی ہے یہ گلہری

کس طرح کھلکھلا کر ہنستے ہیں رعنا راجو
امرود توڑ کر جب لاتی ہے یہ گلہری

کوثر بھگوت پوری، بھگوت پور، ضلع سمستی پور (بہار)



غریب کی عید

ڈاکٹر عارفہ عرفی

عید اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں اور تمام رونقوں کے ساتھ آئی۔ روزے ووزے تو خیر اب کے کیا ہوئے، گرمی اتنی شدید تھی کہ ہم بچوں کو بہت اصرار کے ساتھ روزوں سے روکا گیا اور ہم بہت افسردہ دلی سے یہ کہنا بہت سعادتمندی سے مان بھی گئے۔ بہر حال ابھی ہم لوگوں کو صرف کپڑوں اور سوئیوں اور عیدی کی خوشی رہتی ہے۔ روزہ رکھ کر عید کی خوشی اماں ابا ہی کے لیے ہے۔ ہاں تو صبح صبح ہم سب بھائی بہن نہا دھو کر عید گاہ جانے کے لیے ٹہلنے لگے۔ آخرکار ابا نے للکارا: "ارے بھائی نماز میں جگہ نہ ملے گی تو پریشان ہونا پڑے گا۔ چلو جلدی چلو" بڑوں سے پہلے ہم لوگ کار میں بیٹھ گئے۔ خوشی خوشی عید گاہ گئے۔ دل لگا کر نماز دوگانہ ادا کی۔

ادھر ابا عید ملنے لگے مبارک سلامت ہونے لگی اور ہم میلے میں شریک ہو گئے۔ بہت سے ساز و سامان مٹھائی کھلونے لیے۔ ہر چیز پر تبصرہ کرتے ہم لوگ گھر آئے ــ اپنے اپنے کھلونے لے کر مقابلہ آرائی ہولی، سوئیاں کھائی گئیں اور کھیل میں لگ گئے۔

میں نے دیکھا کہ وہ تپتی دھوپ میں بالکل سرخ ہو رہا تھا، پسینا ایڑیوں تک بہہ رہا تھا اور کام میں مصروف تھا۔ ہمارے گھر میں کچھ مکان کی مرمت کے سلسلے میں ملبہ پڑا تھا اس کو ہٹانے کے لیے ابا نے مزدور بلوائے تھے انھیں میں ایک مزدور آیا تھا۔ جس کو آج کے دن بھی اپنے کمانے کی دھن تھی۔ مجھ کو ترس آیا میں نے تحکمانہ انداز سے پوچھا: "کیوں بھئی کتنا کام باقی ہے؟" وہ بہت نرمی سے بولا: "بھیا شام تک سب نبٹا دوں گا۔" میں نرم پڑ گیا۔ میں نے کہا "ذرا دم لے لو پانی پی لو" تو کہنے لگا: "لے آؤ بھیا۔" میرے دل میں اس کے لیے خواہ مخواہ رحم کا دریا موجیں مارنے لگا، میں اس کے لیے فرج سے نکال کر بوتل لے گیا وہ ایک ہی سانس میں پانی پی گیا۔ پھر میں نے سوئیاں بھی دیں۔ اس نے وہ بھی کھا لیں اور برآمدے میں بیٹھ کر سستانے لگا۔ اس کو ذرا سکون ہوا تو وہیں فرش پر لیٹ گیا۔ میں نے پوچھا: "تمھارا نام کیا ہے؟" وہ بہت لاپروائی سے بولا: "محمد یاور" میرے اوپر بجلی گر پڑی۔ محمد یاور عید کے دن مجبوراً مزدوری کر رہا ہے۔ میرے

عرفی کلینک ۔ فتح گنج ۔ فیض آباد

رگ وپے میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ یا خدا! آج تو سب ہم سب تیرے مہمان ہیں، آج کا دن سال کا سب سے زیادہ خوشی کا دن ہے اور یا در مزدوری کرے۔ پھر میں نے کہا: "تم کہاں رہتے ہو؟" وہ اسی شان بے نیازی سے بولا: "دیہات میں۔" وہ بہت مختصر جواب دے رہا تھا مگر ہر جواب دل کی گہرائی میں اُترتا جا رہا تھا۔ میری آنکھیں شدّت جذبات سے بھر گئیں۔

میں تھکے تھکے قدموں سے گھر میں آیا اماں سے بتایا تو وہ بھی بہت متعجب اور رنجیدہ ہوئیں۔ کہنے لگیں "ہاں بیٹے، اتنی ہی غربت مجبور کرتی ہے تبھی کوئی ارمانوں کا خون کرتا ہے۔" پھر انھوں نے ابا سے بتایا تو ابا بھی حیرت میں پڑ گئے۔ اس کو پیسے دینے کے بعد ابا نے کہا "تم ابھی گھر جاؤ اور بچوں کے ساتھ عید کرو۔" اماں نے سوئیاں بھی ایک برتن میں ساتھ کر دیں کہ جب اتنا ہی غریب ہے تو اس کے یہاں سوئیاں ہی کیوں پکی ہوں گی۔ وہ تو بہت اصرار کے بعد سب لے کر چلا گیا مگر میرے لیے ایک سوچ ایک فکر چھوڑ گیا میرا ننھا سا ذہن جتنا سوچتا اُتنا ہی اُلجھتا، اچانک عید مجھ کو سونی سونی لگنے لگی۔ کاش کہ کوئی مجھ کو میرے سوالوں کا جواب دیتا کہ سارے انسان ساری قوم کیوں نہیں ایک سی ہو جاتی، اسلامی اخوت، انسانیت اور بھائی چارہ کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم خوشیاں منائیں اور ہمارے چند بھائی اپنی تمام خوشیوں اور آرزوؤں کا عین عید کے دن گلا گھونٹیں۔ کاش کہ ہماری آنکھوں پر سے تمام پردے اُٹھ جاتے اور ہم ایک ہو جاتے۔

جوابات ط ۱- ۱- چھتری ۲- چکّی ۳- قلم ۴- چنبیلی کا پھول ۵- کیچوا

آدھی ملاقات اور بچوں کی کوششیں لکھنے والے پیامی قلم کار، اپنے خط اور مضامین صاف، خوش خط اور لائن چھوڑ کر لکھیں
ادارہ



مرتبہ: موثق الدین

ادھر ادھر سے

۱۵۹ ہونہار طلبہ کو تمغے

بھوپال۔ ۱۰ اگست وزیر اعلیٰ مسٹر ارجن سنگھ نے ایک شاندار جلسے میں مدھیہ پردیش، بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کے ذریعہ منعقدہ ہونہار طلبہ کے اعزازی جلسے میں ۱۵۹ طلبہ کو تمغے پیش کیے۔ یہ تمغے بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کے ذریعے ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۲ء تک کے امتحانات میں مسلسل کامیابی حاصل کرنے والے ہونہار طلبہ و طالبات کو دیے گئے جلسے کی صدارت وزیر تعلیمات (اسکول)، مسٹر بنسی لال دھرت نہرے نے کی۔

کامٹی نگر پریشد اردو گرلس اسکول

کامٹی نگر پریشد اردو گرلس پرائمری اسکول کامٹی کی تین طالبات نازمین خانم، عابدہ نسرین اور شاہینہ پروین رشیدی تینوں سکشن میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرکے اول آئیں۔ نازمین خانم نے تین سو میں سے ۲۸۲ نمبر حاصل کیے۔ عابدہ نسرین نے ۲۷۵ نمبر حاصل کیے۔ شاہینہ پروین نے ۲۵۴ نمبر حاصل کیے۔

قیمتی گھوڑا

لندن: دوبئی کے حکمراں شیخ راشد المکتوم نے نیلام میں ایک سال عمر کا ریس کا خوب صورت گھوڑا ایک کروڑ دو لاکھ ڈالر (دس کروڑ بیس لاکھ روپے) میں خریدا ہے۔ دوبئی کے حکمراں کا برطانیہ میں ریس کے گھوڑوں کا ایک فارم ہے۔

بال جیسے پتّے

آسٹریلیا میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جس کے پتّے انسانی بال جیسے مشابہ ہوتے ہیں۔ اسے وہاں "ہیر ٹری" کہتے ہیں۔

معرفت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ بمبئی ۳

اشفاق احمد



احسان کا بدلہ

شاہد غصے میں آکر گھر سے نکل گیا۔ گھر کے سامنے سڑک کے پاس پہنچا تو موٹر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بغیر سوچے سمجھے موٹر میں بیٹھ گیا۔ موٹر خالی تھی کیونکہ وہ ابھی شہر میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ آج بازار کا دن بھی تھا۔ تھوڑی دیر بعد موٹر شہر میں داخل ہوئی۔ اور مسافروں سے پُر ہو گئی۔ شاہد کے بازو میں ایک بوڑھی عورت آکر بیٹھ گئی۔ شاہد پہلے ہی سے غصے میں تھا۔ وہ پہلو بدل کر بیٹھ گیا اور خاموش کھڑکی سے باہر مخالف سمت دوڑے جانے والے درخت اور مختلف چیزوں کو دیکھنے لگا۔ موٹر تیز رفتاری سے دوڑی جا رہی تھی۔ اتنے میں اچانک بازو میں بیٹھی بوڑی عورت نے اس کی خاموشی کا سکوت توڑا "بابا پیپل گاؤں کا کیا ٹکٹ ہے"۔ شاہد "ساڑھے تین روپے" کہہ کر خاموش ہو گیا۔ "منے تم کہاں جا رہے ہو؟" یہ بوڑھی عورت کا دوسرا سوال تھا۔ اس سوال کا جواب دینا شاہد کے لیے بھی مشکل تھا۔ وہ خود سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ کہ اسے کہاں جانا ہے؟ اس نے بوڑھی عورت سے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا کہ "بوڑھی ماں مجھے خود نہیں معلوم! بس میرا دل ہے اور میں ہوں"۔ یہ سُننا تھا کہ بوڑھی عورت تعجب خیز نظروں سے اس کا منہ تکنے لگی۔ "منا تو ناراض کیوں ہے کون سی مشکل تجھ پر ٹوٹ پڑی ہے منا تو میرے بیٹے کی طرح ہے۔ میں تجھ سے پوچھ کر ہی رہوں گی۔" شاہد نے سوچا کہ اب یہ بوڑھی ماں باز نہیں آئے گی۔ اس لیے اس نے اپنی آپ بیتی سنانا شروع کی:

"بوڑھی ماں میں اسراپور کا رہنے والا ہوں۔ میرے ماں باپ دونوں مزدوری کرتے ہیں۔ میں پانچویں جماعت میں پڑھتا ہوں لیکن میرا دل پڑھنے لکھنے میں نہیں لگتا اور میرے ماں باپ مجھے جبرًا پڑھانا چاہتے ہیں، اکثر میری ماں مجھے مارتی ہے۔ برا بھلا کہتی ہے اور کہتی ہے جا کہیں دفع ہو جا، اس لیے میں گھر سے جا رہا ہوں"۔

یہ سن کر شاہد سمجھا کہ بوڑھی عورت خاموش بیٹھ جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ وہ شاہد پر غصہ ہو گئی۔ اور کہنے لگی: "بیٹے صرف اتنی سی بات پر تم گھر سے بھاگ نکلے ہو کیا تم نے وہ دن بھلا دیے؟ سوچو تمھاری ماں نے تمھیں کتنے لاڈ و پیار سے پالا ہوگا۔ اس کی عمر کی بیشتر گھڑیاں صرف تمھارے لیے ضائع ہوئی ہوں گی۔ خود پیوند لگے کپڑے پہنے ہوں گے۔ اور دن رات مزدوری کر کے تمھاری ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ تمھارے باپ نے تمھیں غریبی کا احساس تک نہ ہونے دیا ہوگا اور دونوں ان پڑھ رہنے کے باوجود تمھیں اعلا تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔ ان کا ایک بہت بڑا خواب ہے کہ میرا بیٹا ایک انسانِ کامل بن جائے سب لوگ اس کی عزّت کریں۔ بڑی اور اچھی سی نوکری لگ جائے۔ اور پھر وہ ہماری خدمت کرے اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے وہ تمھیں پڑھا رہے ہیں۔ اچھا اور نیک راستہ دکھا رہے ہیں بُری صحبتیں اور خراب عادتیں چھوڑنے کے لیے تمھیں قدم قدم پہ نصیحتیں کرتے ہوں گے اور اگر نہ مانے تو ڈانٹ پھٹکار مار اور غصے میں برا بھلا بھی کہہ دیتے ہوں گے۔ تو کیا تم ان کی باتوں

سوت گرنی کوارٹر تاج آباد ناگپور نمبر ۹

مار کا برا مان جاؤ گے؟ اور گھر سے نکل جاؤ گے۔ اور پھر ان کے وہ خواب کا کیا ہوگا ان احسانات ۔۔۔!

اُن کے احسانوں کا بدلہ یہی ہے نا؟ بیٹا تم ان کی خدمت کرتے کرتے اپنی زندگی ختم کر دو گے لیکن ان کے احسانوں کا بدلہ نہ چکا سکو گے۔

"جاؤ اور اپنی ماں اور باپ کے گلے لگ جاؤ۔ ان سے معافی مانگو وہ تمہاری راہ تکتے ہوں گے۔"

اب شاہد پر کچھ عجیب سی کیفیت طاری تھی اس کا غصے سے تمتماتا ہوا چہرہ پسینے میں شرابور تھا۔ اس کی لال لال آنکھوں میں آنسو تھے۔

"بوڑھی ماں اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے تم نے مجھے نیک راستہ دکھا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔" "نہیں بیٹے یہ احسان نہیں یہ تو میرا فرض تھا جو میں نے ادا کیا۔"

"اب مجھے جانے دیجیے ماں باپ کے پاس۔" شاہد اٹھا اور انجان اسٹیشن پر اتر کر اپنے گھر کی طرف، اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھ گیا۔



پیام تعلیم کا "بچوں کی حکومت نمبر" بے حد پسند آیا۔ خاص طور سے اس نمبر میں حکومت میں نئی کابینہ کے اراکین کا تعارف، اور جامعہ اسکول کے بچوں کی اعلیٰ ذہنی اور قلمی استعداد پڑھ کر جتنی خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ خدا ان سب نونہالوں کو علم کی لازوال دولت اور ذہن و فکر کی بلندیاں عطا فرمائے۔ میرے طرف سے فرداً فرداً سب بچوں کو دعائیں اور پیار پہنچائیے۔ حقیقتاً یہ نمبر دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ خدا کرے آپ کی ادارت بچوں کے اس ماہنامے کو تابندہ رکھے۔ اتنا اچھا نمبر نکالنے پر آپ کو مبارکباد عرض ہو۔

عتیق احمد

کراچی (پاکستان)

جون ۱۹۸۲ء شمارہ "بچوں کی حکومت" نمبر دیکھا طبیعت خوش ہوگئی۔ خاص طور پر جامعہ مڈل اسکول کے تعلیمی میلے کے پروگرام کو حسین بنایا گیا ہے اور ذاکر حسین صاحب کی بچوں سے محبت کی یاد و اخلاق سے سجایا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ جریدہ بہت ہی مفید اور کارآمد ہے۔

شرافت اللہ خاں

مکری کھوہ مرزاپور۔

جولائی کا "پیام تعلیم" نظر نواز ہوا۔ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ "پیام تعلیم" کی سبھی کہانیاں پسند آئیں ... خصوصاً اعجاز علی ارشد کا لکھا ہوا مضمون "رنگوں کا بادشاہ" اور سید محمود نقوی صاحب کی لکھی ہوئی کہانی "انصاف کا ترازو"۔

قاضی شہاب ظہیر

آسنسول

بچوں کی کوششیں



نماز کی برکت

کسی گانو میں ایک شخص رہتا تھا اس کے تین لڑکے تھے۔ احمد۔ محمود اور عباد۔ احمد اور محمود بہت ہی با اخلاق تھے۔ اس گانو کے سبھی لوگ ان کو جانتے اور محبت وشفقت کی نظروں سے دیکھا کرتے۔ دونوں بھائی نماز پابندی سے پڑھتے تھے۔ اس لیے دوسرے نیک کام بجا لانے میں بھی کوئی کسر نہیں رکھتے تھے۔ لیکن محمود ان دونوں بھائیوں سے بالکل الگ تھا۔ وہ بڑا ہی ناشائستہ اور بد اخلاق تھا معمولی معمولی باتوں پر لڑنا جھگڑنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ وہ ہر وقت والدین سے بھی لڑنے جھگڑنے کے لیے تیار رہتا۔ چوں کہ وہ بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس لیے اپنے سے کم عمر بھائیوں کو خوب پیٹا کرتا تھا۔ اس کے والدین اس کی ایسی حرکتوں سے پریشان تھا۔ تنگ آکر ایک دن اس کی ماں نے اسے بہت سمجھایا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس طرح سمجھانے کے باوجود اس کی حرکتیں کم نہ ہوئیں تو اس کے والد نے اسے بہت ڈانٹا۔ ڈانٹنے کا اثر اس پر کیا پڑتا۔ بلکہ اس دن سے وہ اور زیادہ بدتمیز ہوگیا۔ اب اس نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا۔ اب وہ باہر بھی روزانہ لڑتا جھگڑتا اور شکایتوں کا انبار اپنے گھر میں لاتا۔ اپنی ان حرکتوں سے وہ اپنے خاندان کی عزت خاک میں ملائے ہوئے تھا۔ اس کے رشتے داروں میں سے ایک نے رائے دی کہ اسے کسی سخت معلم کے پاس بھیج دیا جائے۔ آخر اس کے والد نے اسے گانو کے سب سے سخت معلم کے پاس بھیج دیا۔ چند دن وہ وہاں رہا۔ لیکن اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔ آخر تنگ آکر انھوں نے اسے اس کے والدین کے پاس پہنچا دیا۔ پھر اس کے والد کو کیا خیال آیا کہ انھوں نے اسے پاس کے مدرسے میں بٹھا دیا۔ وہ روزانہ مدرسے جاتا لیکن وہاں بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔ مدرسے کے سبھی لڑکے اس سے نالاں رہتے تھے۔ جب مدرسے کے ہیڈ مولوی نے سنا تو بہت خفا ہوئے اور اسے مدرسے سے نکال دیا۔ اسی گانو میں ایک شخص رہتا تھا جو نماز کا بہت پابند تھا۔ اس نے محمود کے والد کو رائے دی کہ اسے وہ نماز پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ شروع شروع تو اس نے اس نصیحت کا کوئی اثر نہیں لیا۔ لیکن ایک دن وہ خود ہی مسجد میں پہنچ گیا اور آہستہ آہستہ پکا نمازی ہوگیا۔ آخر نماز نے اپنا رنگ دکھایا اور دیکھتے دیکھتے اس کی ساری بری حرکتیں دور ہوگئیں۔ نماز نے محمود کو سب کا پسندیدہ لڑکا بنا دیا تھا۔

سید طارق متین
(لکھنیاں۔ دبکیہ سرائے)

بے وقوف کی تلاش

ایک شہر میں ایک دولت مند آدمی رہتا تھا۔ اس کے دربار میں ہر ایک چیز موجود تھی۔ لیکن وہ کبھی خدا کی عبادت نہیں کرتا تھا۔ اس نے اپنے دربار میں بے وقوفوں کا ایک محکمہ کھولا جس کا افسر ایک بے وقوف کو ہی بنایا۔ یہ افسر اپنے محکمے کے لیے احمقوں کی تلاش کرتا مگر ایک بھی احمق اسے نہیں ملتا تھا۔ اسی طرح سال بھر گزر گیا۔ ایک دفعہ وہ دولت مند بیمار ہو گیا۔ اس نے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے علاج کرایا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ایک دن اس نے اپنے درباریوں کو بلا کر کہا: "آخری وقت آگیا۔ اب ہم خدا کے گھر جا رہے ہیں۔" لیکن بے وقوف کی سمجھ میں ایک بات بھی نہ آئی۔ اس نے اپنے مالک سے کہا "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" دولت مند نے کہا "میں خدا کے گھر جا رہا ہوں۔" ہر انسان دنیا میں اکیلا آیا ہے اور اکیلا ہی جائے گا۔ وہاں کوئی کبھی دوسرے کی مدد کرنے والا نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی اپنا مال و دولت لے کر جاتا ہے۔ بے وقوف نے کہا ارے آپ کیا کہہ رہے ہیں بھلا کوئی مال و دولت کے بغیر جا کر کیا کرے گا۔ آپ اگر مال و دولت لے کر نہیں جائیں گے تو وہاں کیسے رہیں گے۔ اب تو ہمیشہ کے لیے ہی وہاں رہنا ہوگا۔ آپ نے تو اس دنیا میں بہت کچھ کیا۔ لیکن اس دنیا میں ساتھ لے جانے کے لیے ضروری مال کبھی نہیں جمع کیا۔ نہ معلوم کیسے۔ اس بے وقوف کے منہ سے سچی بات نکل گئی تھی۔!

محمد نسیم اختر
پنچو گرام۔ کلٹی (بردوان)

آزمائش

کسی محلے میں دو دوست رہتے تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ ایک کا نام ناصر اور دوسرے کا نام صمد تھا۔ ناصر، صمد سے بڑا تھا۔ دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے اور ایک ہی درجے میں تھے۔ دونوں دوست ایک ساتھ اسکول جاتے۔ اسکول سے چھٹی ہوتی تو ایک ہی ساتھ دونوں سیدھے اپنے گھر چلے آتے تھے۔ جب کبھی ناصر اسکول نہیں جاتا تو صمد کا دل ناصر سے ملنے کے لیے بے چین ہو جاتا۔ کبھی یہ سوچتا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوگی۔ اس طرح صمد کے دل میں طرح طرح کی باتیں اٹھتیں۔

ایک دن صمد نے اپنے دل میں سوچا کہ ناصر کو آزمایا جائے کہ وہ اچھا دوست ہے یا برا ——— یہ سوچ کر صمد نے کہا کہ ہم لوگوں کو کہیں گھومنے جانا چاہیے۔ دونوں میں یہ بات طے پائی کہ ایک دوسرے کے برے وقت میں ساتھ دیں گے۔

اتوار کا دن تھا۔ موسم بہت ہی خوش گوار تھا۔ صمد نے ناصر سے کہا آج اتوار ہے اسکول میں چھٹی ہے ہم لوگوں کو جنگل میں گھومنے جانا چاہیے۔ دونوں دوست جنگل کی طرف چل دیے۔ جیسے ہی دونوں دوست جنگل کے اندر داخل ہوئے، دونوں کی نظر یکایک ایک بھالو پر پڑی۔ دونوں کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ ناصر کو درخت پر چڑھنا آتا تھا لیکن صمد کو نہیں۔ ناصر فوراً درخت پر چڑھ گیا۔ صمد نے درخت پر چڑھنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ آخرکار وہ زمین پر سانس روک کر لیٹ گیا جیسے وہ مرا ہوا ہے۔ بھالو نے صمد کے پورے جسم کو سونگھ کر محسوس کیا کہ وہ مرا ہوا ہے۔ پھر وہ جنگل کی طرف چل دیا۔ بھالو چلا گیا تو ناصر فوراً درخت سے اترا اور صمد سے کہنے لگا کہ بھالو نے آپ کے کان میں کیا کہا ہے۔

صمد نے کہا کہ بھالو کہہ رہا تھا کہ یہ تمہارا دوست ٹھیک نہیں ہے کیوں کہ یہ تمہارے برے وقت میں ساتھ نہیں دیتا۔ دونوں دوست اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

اختر عادل عثمانی محلہ تیتیا بنہ۔ پوسٹ آفس کلٹی ۷۱۳۳۴۳
ضلع بردوان (ویسٹ بنگال)

گناہوں کا نہ کرنا بھی گناہ ہے

پولیس انسپکٹر:- یہ موٹی موٹی مرغیاں کس کی ہیں؟
مرغی والا:- میری ہیں، جناب!
انسپکٹر:- ان مرغیوں کو تم کیا کھلاتے ہو؟
مرغی والا:- حضور انھیں میں اخروٹ، بادام، چلغوزہ، اور پستہ کھلاتا ہوں۔
انسپکٹر:- (بگڑتے ہوئے) ہمارے دیس میں انسانوں کو سوکھی روٹی میسر نہیں اور تم ہو کہ مرغیوں کو قیمتی میوے کھلاتے ہو۔ تمھاری یہ حرکت سراسر خلاف قانون ہے، اس لیے تم اگر جیل کی چکیاں چلانے سے بچنا چاہتے ہو تو نکالو ایک ہزار نقد سکہ رائج الوقت۔ ورنہ جیل میں بھر دوں گا۔
(مرغی والا ڈرتے ہوئے انسپکٹر صاحب کو سَو سَو کے دس نوٹ دے کر اپنی جان بچا لیتا ہے۔
(چند مہینوں کے بعد اس راستے سے ڈی۔ایس۔پی صاحب کی گاڑی گزری اور ڈی۔ایس۔پی صاحب کی نظر بھی مرغیوں پر گئی اور انھوں نے اپنی جیپ روک کر مرغی والے کو بلایا اور سوالوں کی بوچھار شروع کر دی)۔
ڈی۔ایس۔پی:- کیا تم ہی ان موٹی مرغیوں کے مالک ہو؟
مرغی والا:- جی ہاں حضور!
ڈی۔ایس۔پی:- تم ان مرغیوں کو کیا کھلاتے ہو کہ یہ اتنی موٹی ہوگئی ہیں؟
مرغی والا:- (چونکہ اچھی خوراک کھلانے کے صلے میں ہزار روپیا انسپکٹر صاحب کو بھر چکا تھا۔ اس لیے ڈرتے ہوئے کہا) حضور میں انھیں کچھ بھی نہیں کھلاتا ہوں۔ یہ مرغیاں گھوڑے کی لید اور مویشیوں کے گوبر وغیرہ کھا کر دن بھر پڑی رہتی ہیں۔
ڈی۔ایس۔پی:- (ناراض ہوتے ہوئے بولے) تم بہت ہی گندے آدمی معلوم ہوتے ہو اور تمھاری اس گندگی سے اس گاؤں میں مہلک بیماریوں کے پھیلنے کا بہت زیادہ امکان ہے۔ اس لیے تمھیں اس جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔ کم از کم سات برس جیل میں رہنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ چلو! جلدی کرو! جیپ میں سوار ہو جاؤ!
مرغی والا:- میں بہت غریب ہوں مجھے اس مرتبہ معاف کر دیا جائے میں وعدہ کرتا ہوں کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔
ڈی۔ایس۔پی: اتنی بڑی غلطی کو معاف کرنا میرے بس میں نہیں ہے یہ کام عدالت ہی کر سکتی ہے۔
مرغی والا:- اتنی بڑی غلطی کو معاف کرنا! میرا گھر تباہ و برباد ہو جائے گا۔ مجھ پر رحم کیا جائے...
ڈی۔ایس۔پی:- دیکھو جی مرغی والے! میں بھی انسان ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کا گھر میرے ہاتھوں خراب ہو۔ لہٰذا تم کو ایک رائے دیتا ہوں اگر تم اس پر عمل کرو تو شاید تمھیں نجات مل جائے۔
مرغی والا:- حکم کیجیے سرکار! میں آپ کا حکم حرف بہ حرف بجا لاؤں گا۔
ڈی۔ایس۔پی:- تمھاری ان گندگیوں کی جڑ یعنی مرغیاں، انھیں تم میری جیپ میں بھر دو اور ان گندگیوں کے لے جانے میں جو پٹرول کا خرچ ہے اس کی قیمت نقدی کی شکل میں مبلغ دو ہزار روپے میرے ڈرائیور کو دے دو۔
مرغی والا:- حضور میں نے تمام مرغیوں کو آپ کی جیپ میں بھر دیا ہے اور تیل کا خرچ بھی ڈرائیور صاحب کو دے دیا ہے۔ مگر میری

ایک درخواست ہے حضور!

ڈی۔ایس۔پی:۔ ہاں بولو، کیا کہنا چاہتے ہو۔

مرغی والا:۔ حضور آپ پولیس والے بڑے شریف ہوتے ہیں۔ یہ دوسرا موقع ہے کہ آپ نے مجھے جیل سے نجات دلائی۔ مگر یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر میرا قصور کیا تھا۔

ڈی۔ایس۔پی:۔ بڑے بھولے ہو تم مرغی والے! تم نے یہ شعر نہیں سنا

گناہوں کا نہ کرنا ہی گناہِ عظیم ہے
بدعقلی کا نام ہی تو عقلِ سلیم ہے

نواب عتیق اطہر زاہدی درجہ دہم
رانی گنج اردو ہائی اسکول بردوان
دولیسٹ بنگال

حضرت صالحؑ

اب سے ہزاروں برس قبل ایک قوم آباد تھی جو ثمود کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ ایک خدا کو بھول کر یہ قوم دنیا کے عیش و آرام میں پڑ گئی تھی۔

اُسی زمانہ میں حضرت صالحؑ پیدا ہوئے۔ بڑے ہی نیک تھے۔ کبھی بچپن میں بھی انھوں نے جھوٹ نہیں بولا۔ ہر وقت خدا کی عبادت میں مصروف رہتے۔ جوان ہوئے تو خدائے تعالیٰ نے انھیں اپنا پیغمبر بنا لیا اور فرمایا کہ "لوگوں کو نصیحت کرو۔"

خداوند عالم کا حکم پاتے ہی حضرت صالحؑ نے لوگوں کو سچی راہ دکھانے کی کوشش کی اور فرمایا "اے لوگو! ایک خدا سے ڈرو۔ اسی نے یہ ساری دنیا بنائی ہے۔ اسی کی عبادت کرو۔ یہ سب لڑائی جھگڑے چھوڑ دو جو تم بات بات پر کرتے ہو۔" کچھ لوگوں نے آپ کا کہنا مان لیا مگر باقی لوگ منکر ہی رہے۔

چنانچہ ایک دن پھر حضرت صالحؑ نے فرمایا۔ "اے لوگو! ایک خدا سے ڈرو۔ اسی کی عبادت کرو۔ ان ہرے بھرے باغات، ان عالی شان مکانات اور اس مال و دولت کے تم ہمیشہ مالک نہیں رہوگے۔ موت کسی کو نہیں بخشتی، چاہے وہ امیر ہو یا غریب۔ جب موت آئے گی تو یہ ہرے بھرے باغ یہ عالی شان مکان اور یہ مال و دولت تمھارے کچھ کام نہیں آئے گا اور تم اکیلے ہی رہ جاؤگے۔ یہ دنیا تو وقتی ہے آخر ایک روز یہ بھی فنا ہو جائے گی اور اس کے بعد تم کو ساری زندگی اسی خدا کے پاس گزارنا ہے کہ جس سے تم بھاگتے ہو اور جس کو تم مانتے نہیں۔ اگر تم اس کی عبادت نہیں کروگے تو خدا تم سب کو دوزخ میں ڈال دے گا اور تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں جلتے رہوگے جتنی دنیا کی تکلیفیں ہیں، سب تم کو دی جائیں گی۔ ہاں، اگر تم اس کی عبادت کروگے، اچھے کام کروگے، لڑوگے نہیں، دوسروں کو دکھ نہیں پہنچاؤگے اور کوئی برا کام نہیں کروگے تو خدا تم کو اس کی جزا دے گا اور جنت میں بھیج دے گا۔ وہاں پر تم کو زیادہ سے زیادہ آرام ملے گا۔ جو چاہوگے ملے گا۔ لہٰذا تم میری بات مانو اور بری بات اور برے لوگوں سے بچتے رہو۔"

حضرت صالحؑ کے اتنا سمجھانے کے بعد چند اور لوگ ایمان لے آئے مگر باقی سب کہنے لگے۔ "اے صالحؑ! کیا تم پاگل ہوگئے ہو یا تم پر کسی نے جادو کرا دیا ہے جو ایسی الٹی سیدھی باتیں کرتے ہو۔ اگر تم واقعی پیغمبر ہو تو ہم کو اپنی کوئی نشانی دکھاؤ۔" حضرت صالحؑ نے پوچھا کہ تم کیا دیکھنا چاہتے ہو؟ لوگوں نے سوچ کر کہا کہ "تم پہاڑ میں سے ایک ایسی اونٹنی نکالو جس کے پیٹ میں بچہ ہو"۔ یہ سن کر حضرت صالحؑ نے فرمایا کہ اگر میں خدا کے حکم سے پہاڑ کے دامن سے ایک اونٹنی نکال دوں تو کیا تم ایمان لے آؤگے؟ لوگوں نے جواب دیا "ہاں ہم ایمان لے آئیں گے۔"

حضرت صالحؑ نے خدا سے دعا کی اور تھوڑی دیر بعد پہاڑ میں سے ایک اونٹنی نکلی۔ نکلتے ہی اس نے ایک بچہ دیا۔ یہ اونٹنی کافی تندرست اور بہت ہی ڈیل ڈول کی تھی۔ بچے نے پیدا ہوتے ہی چرنا شروع کر دیا۔ اونٹنی کھانے پہ آتی تو کھیت کے کھیت کھا جاتی اور پینے پہ آتی تو کنویں

کے کنوئیں خالی کر دیتی۔ حضرت صالحؑ کا اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے اور آپس میں کہنے لگے کہ "صالحؑ کا خدا تو واقعی بڑی قدرت والا ہے، جو ناممکن کو ممکن اور ناپید کو پیدا کر دیتا ہے۔" چنانچہ کچھ اور لوگ بھی ایمان لے آئے اور باقی ایمان سے پھرے رہے۔

حضرت صالحؑ نے فرمایا "خیر اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا یہ اونٹنی جو تمہارے سامنے ہے خداوند عالم کی ایک نشانی ہے اس اونٹنی کو آزاد کر دو۔ جہاں چاہے گھومے پھرے اور جو چاہے چرے۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ اگر اس کے ساتھ تم کوئی بُرا سلوک کرو گے تو تم کو خدائے تعالیٰ کا عذاب گھیر لے گا۔"

جیسا کہ دنیا کا دستور ہے کہ اپنے دشمن کی ہر چیز بری لگتی ہے، چاہے وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ لوگ خدا کی بھیجی ہوئی اس چیز سے نفرت کرنے لگے، جب کہ وہ لوگوں کو اتنا فائدہ پہنچاتی تھی کہ روز شام کو قبیلے کے قبیلے اس اونٹنی کا دودھ اپنے برتنوں میں بھر کر لے جایا کرتے تھے اس کے باوجود مخالف اس ادھیڑ بن میں لگ گئے کہ حضرت صالحؑ کی اس اونٹنی کو قتل کر دیں۔

ایک رات جب سب سو رہے تھے تو چند لوگوں نے مل کر اس اونٹنی کو ختم کر دیا۔ اس کا بچّا چیختا ہوا اسی پہاڑ میں جا چھپا جہاں سے وہ اونٹنی آئی تھی۔ صبح ہوئی اور حضرت صالحؑ کو معلوم ہوا تو افسوس کرنے لگے اور کہنے لگے کہ "تم بہت ڈرایا کرتے تھے کہ اگر تم اس اونٹنی کے ساتھ کوئی بُرا سلوک کرو گے تو تم کو خدا کا عذاب گھیر لے گا۔ اب ذرا وہ عذاب لا کر تو دکھاؤ۔" حضرت صالحؑ نے فرمایا "انتظار کرو خداوند عالم کا عذاب ضرور آئے گا۔ چنانچہ ایک روز رات کو جب سب مست سو رہے تھے، ایک زبردست زلزلہ آیا اور ذرا سی دیر میں تمام عالی شان مکانات کھنڈروں میں تبدیل ہو گئے اور خدا کے سب منکر ہلاک ہو گئے اور اپنی نافرمانی کی سزا پائی۔ بس چند لوگ جو ایمان لے آئے تھے وہ اور حضرت صالحؑ باقی بچے۔

جو لوگ خدا کا حکم نہیں مانتے اور اس کے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں، وہ ایسے ہی عذاب کے مستحق ہوتے ہیں۔ حضورِ انور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو ارشاد ہے کہ "جس علاقے پر کبھی خدا کا عذاب نازل ہوا ہو تو اس علاقے پر پل بھر کے لیے بھی نہ ٹھہرو ورنہ تم بھی اس عذاب میں شامل ہو جاؤ گے۔"

اب خدائے تعالیٰ سے ہماری یہی دعا ہے کہ "خدا تعالیٰ اُن بُرے لوگوں سے بچائے جو دوسرے لوگوں کو سیدھی راہ سے ہٹاتے ہیں اور ہم کو سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔" (آمین)

حسّان غضنفر صدیقی
کلاس ۷ بدر باغ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

چالاک کیکڑا

بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک تالاب میں بہت سی مچھلیاں اور کیکڑے رہا کرتے تھے۔ اسی تالاب میں ایک بگلا روزانہ آ کر مچھلیاں اور کیکڑے پکڑ پکڑ کر کھایا کرتا تھا۔ تنگ آ کر مچھلیوں نے تالاب کے کنارے آنا چھوڑ دیا اور کیکڑے بھی اپنے بل سے باہر نہ نکلے۔ اب بگلے میاں مچھلیاں کھاتے تو کس طرح بگلے کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے تالاب کے کنارے بیٹھ کر زور زور سے رونا شروع کیا "اوں اوں اوں اوں اوں" کی آواز سن کر ساری مچھلیاں اور کیکڑے باہر آ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ بگلے میاں رو رہے ہیں۔ سبھی نے کہا، کیا ہوا، کیا ہوا ماموں جان۔ ماموں رو رو کر کہنے لگے "اوں اوں اوں" میں نے سنا ہے تالاب کا پانی سوکھ جائے گا اور سبھی مچھلیاں اور کیکڑے مر جائیں گے۔ سبھی مل کر رونے لگے۔ "اوں اوں اوں، چی چی چی، کٹ کٹ کٹ" مچھلیاں بولیں، اب ہم کہاں جائیں گے چی چی چی۔ کیکڑے بولے۔ اب ہم بھی کہاں جائیں گے، کٹ کٹ کٹ" کچھ ہی دور پر ایک ندی ہے، ہم لوگ وہاں چلے جائیں گے۔ کیکڑے بولے، پہلے ہم لوگ

جائیں گے۔ مچھلیاں بولیں پہلے ہم لوگ جائیں گے۔ ماموں نے کہا کوئی بات نہیں ہے ہم سب کو ایک ایک کرکے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر لے جائیں گے۔ سبھی خوش ہوگئے۔ سبھی مچھلیاں اور کیکڑے ایک ایک کرکے دوسری ندی میں جانے لگے۔ ایک مرتبہ ایک چالاک کیکڑے کی باری آئی۔ بگلا اسے بھی اپنی پیٹھ پر بٹھا کر دوسری ندی میں لے جانے لگا۔ کچھ دور چلنے پر کیکڑا بولا، ماموں! ندی کہاں ہے۔ بگلے نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "ہا ہا ہا میں تو روز اسی طرح مچھلیاں اور کیکڑے لاتا ہوں اور کھا جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر بگلا ایک پتھر پر اترنے لگا۔ کیکڑے نے فوراً بگلے کی گردن پکڑ لی اور زور سے دبا دیا۔ بگلا زور زور سے چلانے لگا۔ اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ میری گردن چھوڑ دو۔ بگلا چلاتا رہا مگر کیکڑے نے بگلے کی گردن نہیں چھوڑی۔ یہاں تک کہ بگلے کی جان نکل گئی۔ اب کیکڑے میاں وہاں سے خوشی خوشی پھر اسی تالاب کی طرف آنے لگے۔ مچھلیاں اور کیکڑے تالاب کے کنارے بگلے کا انتظار کر رہے تھے۔ مچھلیوں نے جب چالاک کیکڑے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو سبھی زور زور سے چلائے، انکل، ماموں کہاں گئے۔ کیکڑے نے نزدیک آکر کہا، ماموں بہت ہی چالاک تھے۔ وہ ہم سب کو لے جایا کرتے اور راستے ہی میں کھا جایا کرتے تھے۔ وہ مجھے بھی کھانے والے تھے کہ میں نے ان کی گردن پکڑ لی اور مار ڈالا۔ مچھلیاں بولیں، آپ بہت اچھے ہیں انکل! آپ نے ہم لوگوں کی جان بچائی۔ سبھی مچھلیاں اور کیکڑے اچھلتے کودتے تالاب میں چلے گئے اور پھر کسی بگلے نے ادھر کا رخ نہ کیا۔

صداقت حسین (ریپٹر)
رحمت نگر برن پور

اینٹونیو اور کالا ناگ

یہ ایک بہت پرانی کہانی ہے۔ کسی زمانے میں قدیم یونان (گریس) میں اطالیہ نامی ایک گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں ایک بادشاہ رہا کرتا تھا جس کا نام اینٹونیو تھا۔ وہ بہت رحم دل اور بہادر تھا۔ اس کے دور میں رعایا بہت خوش حال تھی۔ یہ بادشاہ ہر ایک کے ساتھ انصاف کرتا تھا۔ اس کی نظر میں تمام رعایا برابر تھی۔ اس گاؤں سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور بادشاہ کی حکومت تھی جو اپنے پڑوسی بادشاہ اینٹونیو سے دشمنی رکھتا تھا۔ آخر ایک دن دونوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ اینٹونیو جیت گیا۔ لیکن اینٹونیو کی فوج بہت ماری جا چکی تھی۔ اس کے ساتھ صرف گیارہ سپاہی بچے تھے۔ اینٹونیو اپنے ساتھیوں کو لے کر لمبے سفر پر نکل پڑا۔ رات ہو چکی تو بادشاہ نے کہا اب ہم گھوڑوں کے بجائے جہاز سے سفر کریں گے۔ بادشاہ نے گھوڑوں کو وہیں چھوڑ دیا اور جہاز میں سوار ہوگئے۔ آندھی اور طوفان زوروں سے چل رہا تھا جس سے جہاز کا آگے بڑھنا مشکل تھا۔ طوفان کے زور نے جہاز کا رخ ہی بدل دیا اور وہ ایک اجنبی گاؤں میں پہنچ گئے۔ وہاں بادشاہ اور اس کے سپاہیوں کو بھوک لگی تو سپاہی غذا کی تلاش میں نکلے۔ اس گاؤں میں جنگلی انسان رہا کرتے تھے۔ وہ بڑے خطرناک، ظالم اور وحشی تھے۔ ان کے جسم پر کالے لمبے بال ہوتے تھے، گوریلے کی طرح۔ ان کی شکل بھی کافی بھیانک تھی۔ ہر ایک کے چہرے پر صرف ایک آنکھ تھی۔ دوسرے گاؤں کے لوگ ان سے بہت ڈرتے تھے۔ گاؤں کے لوگ ان کو "کالا ناگ" (بلیک کوبرا) کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ سب غاروں میں رہا کرتے تھے۔ بادشاہ اور فوجی ایک غار میں چلے گئے۔ وہاں جانوروں کا گوشت اور کچا دودھ رکھا تھا۔ وہ خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے لیکن اسی غار میں ایک 'بلیک کوبرا' رہا کرتا تھا۔ وہ لوگ ابھی کھانا کھا رہے تھے کہ پیروں کی آواز آئی۔ بادشاہ نے کہا کہ سب خاموش ہو جاؤ اور کہیں چھپ جاؤ لیکن اتنے میں بلیک کوبرا اندر داخل ہوا تو وہ اتنے بہت سے آدمی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ان سے پوچھنے لگا کہ تم لوگ کون ہو؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ میں ایک بادشاہ ہوں ہم سب ایک جنگ جیت کر آ رہے تھے، تو ہمارا جہاز طوفان میں گھر کر یہاں آگیا۔ ہمیں بھوک لگی

تو ہم تمھارے غار میں چلے آئے۔ اب تم ہمیں ایک رات رہنے کی اجازت دے دو، ہم صبح ہوتے ہی چلے آئیں گے۔

بادشاہ کی بات سن کر کالا ناگ ہنسنے لگا۔ اور بولا نہیں، میں اب تم سب کو کہیں نہیں جانے دوں گا، بلکہ ایک ایک کر کے سب کو کھا جاؤں گا اور اس نے واقعی اسی وقت دو سپاہی پکڑ کر کھا لیے۔ اب تو بادشاہ اور باقی سپاہی ڈر گئے! بلیک کوبرا سپاہیوں کو کھا کر بولا کہ میں اب ایک کو کل صبح ناشتہ میں کھاؤں گا اسی طرح تم سب کو کھا جاؤں گا۔ پھر وہ غار سے باہر چلا گیا اور غار کو ایک بہت بڑے پتھر سے ڈھک دیا۔ بادشاہ اور سپاہیوں نے بہت کوشش کی مگر پتھر اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ مگر بادشاہ نے ہمت نہیں ہاری اور سپاہیوں سے کہا کہ میں کوئی ترکیب نکالتا ہوں یہاں سے نکلنے کی۔ بادشاہ نے سپاہیوں کو کچھ سمجھایا۔ وہ سب بلیک کوبرا کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ شام کو بلیک کوبرا آیا تو بادشاہ نے اس کو باتوں میں لگایا اور اس کے سپاہیوں نے جلدی سے لوہے کی ایک سلاخ جو پہلے ہی گرم کر لی گئی تھی۔ بادشاہ کا اشارہ پاتے ہی اس بلیک کوبرا کی اکلوتی آنکھ سے لگا دی۔ بلیک کوبرا وہیں تڑپ کر ختم ہو گیا۔ بادشاہ فوراً غار سے نکلا اور اپنے باقی سپاہیوں کو ساتھ لے کر اپنے گانو واپس پہنچ گیا۔

محمد سلیم۔ جی پٹیل
بی کے کالج چکوڑی۔ تحصیل۔ چکوڑی۔ ضلع بیلگام

جمیل اور بہادر

برسوں پرانی بات ہے۔ خرم شاہ جمشید گڑھ کا بادشاہ تھا۔ وہ بہت نیک دل تھا۔ ہر وقت اپنے ملک کے لوگوں کی فکر میں لگا رہتا۔ اس کا ایک وزیر جس کا نام سلطان ٹھاکر تھا، بہت خراب شخص تھا۔ وہ ہر وقت یہی سوچا کرتا کہ کسی طرح بادشاہ کو ہٹا کر خود بادشاہ بن جائے۔

جمشید گڑھ کے ایک گانو میں جمیل نام کا ایک لکڑہارا بھی رہتا تھا۔ وہ بہت طاقت ور تھا۔ روزانہ جمیل صبح کو جنگل چلا جاتا اور جتنی بھی لکڑیاں ملتیں انھیں شہر میں بیچ کر گھر کا خرچ چلاتا۔

ایک دن جمیل جنگل میں لکڑیاں کاٹنے گیا۔ بڑے زور کی گرمی پڑ رہی تھی۔ مگر وہ لکڑی کاٹنے میں مگن تھا۔ اچانک اس نے ہاتھی کے چنگھاڑنے کی آواز سنی۔ آواز ہاتھی کے بچے کی لگ رہی تھی جیسے وہ بھوک اور پیاس سے چلّا رہا ہو۔ جمیل اس کی آواز کے سہارے اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا ہاتھی کا بچہ جھاڑیوں میں پڑا ہوا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے ہیں۔ جمیل نے جھاڑیاں ہٹا کر اسے باہر نکال لیا۔ باہر آ کر وہ چلنے کی کوشش کرنے لگا مگر تھوڑی ہی دور چل کر وہ وہیں گر گیا۔ ہاتھی کا بچہ زور زور سے چنگھاڑ رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ میں بھوکا ہوں۔ جمیل اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اس نے بہت سارے پتے اور کھانا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا، اس بچے کے آگے رکھ دیا۔ بچہ جلدی جلدی سب کھانا کھا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد جمیل نے اسے پاس کی ندی سے پانی لا کر پلایا۔

ہاتھی کے بچے کی دیکھ بھال میں شام ہو گئی۔ جمیل نے اس کے چاروں طرف کانٹے دار لکڑیوں کی باڑھ بنا دی تاکہ اسے رات میں جنگلی جانور پریشان نہ کریں۔ وہ اسے باڑے میں چھوڑ کر گھر واپس آ گیا۔ دوسرے دن جمیل اس کے لیے بہت ساری روٹیاں لے کر گیا اور اسے کھلا دیں۔ ہاتھی کے بچے نے روٹیاں جی بھر کر کھائیں اور پانی پیا ——— کئی دن اسی طرح ہاتھی کے بچے کی دیکھ بھال میں گزر گئے۔ ہاتھی کا بچہ اب جمیل سے ہل گیا تھا اور وہ اسے "بہادر" کہہ کر بلاتا تھا۔ ایک دن جمیل نے سوچا کہ بہادر اب ٹھیک ہو گیا ہے اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے باڑے کو ہٹا کر اسے باہر نکال لیا۔ باڑے کے باہر آتے ہی وہ خوشی میں سونڈ اٹھا کر بہت زور سے چنگھاڑا اور خوشی خوشی جنگل میں داخل ہو گیا۔

کئی سال گزر گئے مگر بہادر کا کچھ پتا نہ چلا۔ جمیل بھی اسے بھول گیا تھا۔ بادشاہ کا وزیر ٹھاکر جو بادشاہ بننا چاہتا تھا، اسے جو موقع ملا تو اس نے بادشاہ کو قید خانے میں ڈال دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ پورے ملک میں ہنگامہ مچ گیا۔ چاروں طرف لڑائیاں ہونے لگیں، سب لوگ اپنے بادشاہ کے قید ہو جانے سے بڑے پریشان تھے۔ کچھ لوگوں نے سلطان ٹھاکر کو ہٹانے کی کوشش کی، مگر سلطان نے ان کو پھانسی پر چڑھا دیا۔

جمیل کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اسے بڑا غصّہ آیا۔ اس نے گاؤں کے کچھ لوگوں کو ساتھ لیا اور سلطان سے بدلہ لینے چل دیا۔ جب سلطان کو یہ خبر ملی تو اس نے جمیل اور اس کے سب ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ سلطان ٹھاکر نے سارے ملک میں اعلان کرا دیا کہ "کل ان سب کا کھلے میدان میں ہاتھی سے سر کچلوا یا جائے گا۔"

اگلے دن جمشید گڑھ کا ہر آدمی کھلے میدان میں موجود تھا۔ صحیح وقت پر سلطان وہاں پہنچا اور اس نے مہاوت سے کہا کہ سب سے پہلے ان کے سردار کا سر کچلوایا جائے۔ حکم پاتے ہی مہاوت ہاتھی پر سوار ہو گیا۔ جمیل کو الٹا لٹا دیا گیا۔ جس ہاتھی پر مہاوت سوار تھا، وہ اتنا خون خوار تھا کہ لگ رہا تھا کہ وہ پلک جھپکتے ہی جمیل کا کچومر نکال دے گا۔

مہاوت کا اشارہ پاتے ہی ہاتھی چنگھاڑتا ہوا جمیل کی طرف دوڑ پڑا۔ چاروں طرف دھول اڑ رہی تھی لیکن جمیل کے پاس پہنچتے ہی ہاتھی اچانک رک گیا۔ مہاوت نے اُسے بہت انکش مارے مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اُس ہاتھی کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ سب لوگ حیران پریشان یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اچانک جمیل نے اُٹھ کر اس ہاتھی کو "بہادر" کہہ کر پکارا۔ یہ سنتے ہی ہاتھی اپنے پچھلے دو پیروں پر کھڑا ہو گیا جس سے اوپر بیٹھا ہوا مہاوت نیچے آ پڑا۔ جمیل بہادر کو پہچان گیا تھا۔ اب وہ اس کے اوپر سوار ہو گیا۔ اور سیدھا سلطان کی طرف بڑھا۔ سلطان یہ دیکھ کر وہاں سے بھاگنے لگا۔ مگر بہادر نے اُسے سونڈ میں پکڑ کر زمین پر دے مارا۔ نیچے گرتے ہی سلطان کا کام تمام ہو گیا۔ چاروں طرف "جمیل زندہ باد" کی آوازیں آنے لگیں۔

جمیل نے اپنے پرانے بادشاہ کو قید خانے سے آزاد کرا لیا اور انھیں پھر سے تخت پر بٹھا دیا۔ خرّم شاہ نے جمیل کی اس بہادری پر اسے اپنا نیا وزیر بنا لیا۔ جمیل کے پاس اب بہت دولت تھی۔ مگر وہ پھر بھی بہادر کے ساتھ جنگل میں گھومنے ضرور جاتا تھا۔

فرخ ریحان
عرفان منزل بدر باغ۔ علی گڑھ

زبان

بہت ہی زمانے کی بات ہے۔ کسی ملک میں ایک بادشاہ رہتا تھا۔ اس نے اپنے وزیر سے فرمایا کہ اے وزیر مجھے اس طرح کا کھانا پیش کرو کہ بہت ہی لذیز اور عمدہ قسم کا ہو۔ وزیر نے کہا عالی جناب میں لاتا ہوں اس نے بہت ہی اعلا قسم کا کھانا پیش کیا اس کھانے میں زبان تھی وہ زبان جس سے ہم لوگ مزا چکھتے ہیں بادشاہ نے جب کھانے کے لیے تشتری اٹھایا تو دیکھا کہ اس میں زبان ہے۔ تو بادشاہ نے وزیر سے پوچھا یہی سب سے عمدہ کھانا ہے وزیر نے کہا جی حضور! کچھ ہی دنوں کے بعد پھر بادشاہ نے وزیر سے فرمایا کہ اے وزیر اب میرے لیے اس طرح کا غذا پیش کر جو سب سے بری ہو مذہب کہ سب سے خراب ہو۔ وزیر نے پھر وہی زبان پیش کی تو بادشاہ نے پوچھا کہ یہ کیا مذاق ہے کہ میں نے جب تم سے اچھا کھانا لانے کو کہا تو زبان پیش کیا اور جب برا کھانا مانگا تو پھر تو نے وہی زبان پیش کیا تو وزیر نے کہا کہ حضور زبان ہی سے اچھے برے کی تمیز ہوتی ہے۔

خورشید عالم (رامپور)


ہم اپنی ضروریات کے لیے کافی اناج پیدا کر لیتے ہیں۔
بید سمجھتے ہوتے کہ بھارت آبادی کے لحاظ سے دنیا میں دوسرا
سب سے بڑا ملک ہے جسے اناج کی درآمد پر بھاری خرچ کرنا
پڑتا تھا۔ یہ کوئی چھوٹی کامیابی نہیں۔
ہمارا شمار دُنیا کے صف اوّل کے صنعتی ممالک
میں ہوتا ہے۔ ہم ریڈیو سے لے کر کمپیوٹر تک اور
سُوئی سے لے کر انتہائی پیچیدہ مشینری اور آلات تک
تیار کرتے ہیں۔
ہمارے یہاں دُنیا کے کسی بھی ملک کے مقابلے
میں (رُوس اور امریکہ کو چھوڑ کر) زیادہ تربیت یافتہ
سائنسدان اور ٹیکنیشین موجود ہیں۔ بہت سے
ملکوں میں ہماری امداد سے مشترکہ صنعتی ادارے قائم
کئے جا رہے ہیں۔
ہمیں اپنی
کامیابیوں پر
ناز کرنا چاہیے
ان کامیابیوں سے ہمیں پنجسالہ منصوبے اور
بیس نکاتی پروگرام میں شامل کاموں کو سرانجام
دینے کی صلاحیت اور مہارت حاصل ہوتی ہے۔
ہم پُراُمید مستقبل کی طرف
رواں ہیں
davp 83/150

Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage
Regd No. D(SE)-043 **September 1983**

P A Y A M - I - T A L E E M

NEW DELHI-110025

پیام تعلیم

اکتوبر



ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

اکتوبر ۱۹۸۲ء / جلد ۲۰ / شمارہ ۱۰

اڈیٹر — ولی شاہجہانپوری

قیمت : ۲ روپے // سالانہ : ۱۸ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

بچوں سے باتیں

ستمبر کا مہینا مکتبہ جامعہ کے کاروباری سال کا آخری مہینہ ہوتا ہے۔ اس میں سارے عملے کی مصروفیتیں غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہیں۔ اس کا اثر پیامِ تعلیم کی تیاری پر بھی پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شمارہ آپ کو دیر سے مل رہا ہے۔

زیرِ نظر شمارہ اگرچہ عجلت میں ترتیب دیا گیا ہے پھر بھی آپ کی دلچسپی کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔ یوسف ناظم صاحب آپ کی ضیافت کے لیے ایک موٹی تازی مرغی لائے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اس کی بقدرِ ذوق پذیرائی کریں گے۔ مقدّس ایشیا اور دو شکاری کی قسطیں حسبِ معمول مفید اور دلچسپ ہیں۔ مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی صاحب کی کہانی "ننھا کانت" خاصی دلچسپ ہے۔ ڈاکٹر لطافت علی خاں کا مضمون "پیاز" عطاء الزماں طارق کے "نمک" کے ساتھ استعمال کیجیے۔ آپ کی صحت کے لیے یقیناً مفید ہوگا۔ فہمیدہ عتیق صاحبہ گڑیا بنانے کا آسان طریقہ لے کر شریکِ بزم ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ آپ کو یہ پرچہ بھی پسند آئے گا۔

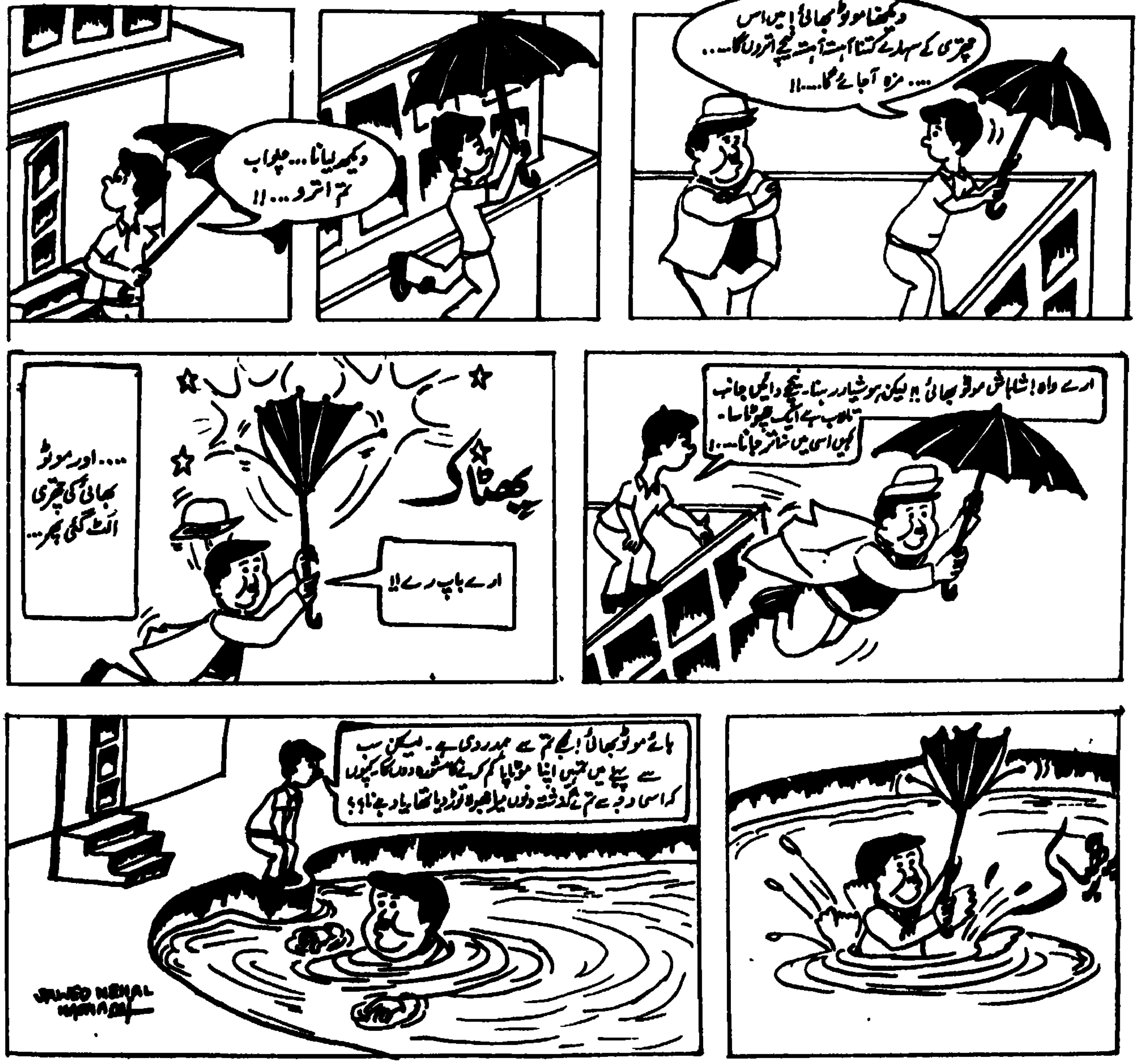
آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ بیشتر پیامی بھائی بہنوں کے اصرار پر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اگلے ماہ سے پیامی ادبی معمے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔

پرنٹر پبلشر سیّد احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شایع کیا۔

موٹو چھوٹو



کہانی : احمد کمال حشمی
تصاویر : جاوید نہال حشمی



انور شعور

ہپ ہپ ہُرّے



ہپ ہپ ہُرّے ہپ ہپ ہُرّے

یہ بھی عجب آفت کی گھڑی ہے
شائستہ کو مار پڑی ہے
ہٹ کر ایسے دُور کھڑی ہے
جیسے خوب پڑے ہوں جُوتے

ہپ ہپ ہُرّے

دیکھو تو منّے کی ادائیں
ہات لگاؤ تو چڑ جائیں
بات کرو تو شور مچائیں
ہائے یہ حضرت اتنے کھُرّے

ہپ ہپ ہُرّے



وہ پنجرے میں گھبراتی تھی
اُڑنے کو پر پھیلاتی تھی
بل کھا کھا کر رہ جاتی تھی
آخر چڑیا اُڑ گئی پھُرّے

ہپ ہپ ہُرّے

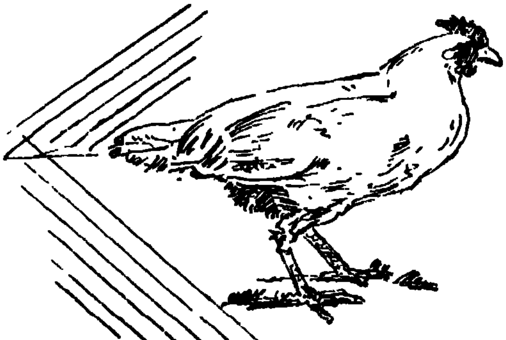
دادا جان کا ایک پوتا ہے
گھوڑے بیچ کے جو سوتا ہے
جو منہ پھاڑ کے یوں روتا ہے
جیسے ہو آواز میں شُرّے

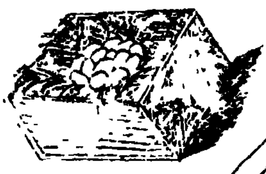
ہپ ہپ ہُرّے ہپ ہپ ہُرّے

(ہمدرد نونہال)

یوسف ناظم

گھر کی مُرغی دال برابر





مرغی ہمیں بہت پسند ہے، تمہیں بھی پسند ہو گی۔ لیکن ہمیں ذرا زیادہ پسند ہے، چاہے وہ زندہ ہو یا بے جان۔ بے جان سے مطلب یہ کہ دسترخوان پر ہو۔ مرغی کی بہار تو دسترخوان ہی پر دیکھنی چاہیے۔ پک پکا کر بھی مرغی ہی دکھائی دیتی ہے۔ اس میں بس ایک ہی خرابی ہوتی ہے وہ یہ کہ اس کی صرف دو ٹانگیں ہوتی ہیں۔ اگر قدرت اسے دو کی جگہ چار ٹانگیں دے دیتی تو دنیا کا کوئی کام تو نہیں رک جاتا تھا نہ قدرت کے خزانے میں کوئی کمی واقع ہو سکتی تھی دو ٹانگوں کی بات ہی کیا تھی۔ دسترخوان پر تو مزا آتا ہی لیکن خود مرغی بھی ان ٹانگوں سے کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل کرتی ہی۔ مرغی کے لیے چار ٹانگوں کی سفارش ہم اس لیے بھی کر رہے ہیں کہ بے چاری کتنا کام کرتی ہے۔ جب دیکھو مصروف جب دیکھو کسی نہ کسی کام میں جٹی ہوئی ہے۔ دن رات گھر یلو کام کرتی رہتی ہے۔ روزانہ مقررہ وقت پر انڈا دیتی ہے انڈا دینے کا وقت اس نے خود مقرر کیا ہے۔ صبح ناشتے کے وقت وہ انڈا نہیں دیتی۔ سمجھدار ہے۔ صبح دے گی تو اسے آپ کب ڈھونڈیں گے اور کب اس کا آملیٹ بنائیں گے۔ اس لیے اس نے دن کا وقت ڈھونڈا ہے۔ ٹھیک بھی ہے۔ سب لوگ دن میں کام کرتے ہیں یہ بھی اپنا کام دن میں کرتی ہے۔ انڈا وہ چھپ کر دیتی ہے۔ ہو گی کوئی وجہ۔ اور وہ کسی کو بتاتی بھی نہیں کہ اس نے انڈا کس کونے میں دیا ہے۔ ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ انڈا کھانا ہے تو ڈھونڈو اب مرغی کسی کی گود میں بیٹھ کر تو یہ کام کرنے سے رہی۔ کچھ ہو جائے انڈا تو وہ چھپ کر ہی دے گی۔ مرغی جب انڈے دینا بند کر دیتی ہے تو وہ انڈوں سے بچے پیدا کرتی ہے اور مرغی یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ یہ سارے انڈے اس کے اپنے نہیں ہیں لیکن یہ اس کی صاف دلی ہے کہ وہ سب انڈوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے۔ اسے سب انڈوں سے ایک سی محبت ہوتی ہے۔ کاش انسان مرغی سے کچھ سیکھتا۔ وہ ان غیر مرغیوں کے انڈوں کو بڑی محبت سے سیتی ہے۔ اور یہ اس کی محنت اور پیار کا نتیجہ ہوتا ہے کہ چند ہی دنوں میں گھر کے آنگن میں کوئی ڈیڑھ درجن چوزے چوں چوں کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ چوزے الگ الگ رنگ کے ہوتے ہیں کوئی بھورا کوئی سفید، کوئی چتکبرا، کوئی کالا، کوئی کاسنی۔ انہیں الگ الگ رنگ کا ہونا ہی چاہیے۔ نکلے بھی تو یہ الگ الگ مرغیوں کے انڈوں سے ہیں... مرغی ان سب چوزوں کی حفاظت کرتی ہے۔ کیا مجال کوئی بچہ کوئی بلی ان کے نزدیک آ جائے۔ گھر میں رونق الگ رہتی ہے۔

مرغی تو بلی پر جھپٹنے کی بھی کوشش کرتی ہے اور جب دیکھتی ہے کہ خطرہ بہت قریب آ گیا ہے تو اپنا الارم بجانا شروع کر دیتی ہے۔ اور اتنا شور کرتی ہے جیسے مرغی نہ ہو فائر بریگیڈ

ا۔ الہلال ۔ ۱۳ باندرہ ریکلیمیشن بمبئی ۵۰

ہو۔ بچے بڑے سب بھاگ کر مرغی کی خیریت دریافت کرنے آجاتے ہیں۔ بلی دبے پاؤں فرار ہو جاتی ہے۔ بلی مرغی کی دشمن ہوتی ہے۔ جب دشمن کے چار پاؤں ہیں تو مرغی کے بھی اتنے ہی پاؤں ہونے چاہیے تھے۔ یہ پاؤں میدان جنگ میں اس کے زور دستر خوان پر ہمارے کام آتے۔

معلوم نہیں مرغی کی ٹانگ ہر کسی کو کیوں پسند آتی ہے۔ مشکل تو اس وقت آتی ہے جب مہمانوں کے لیے مرغی پکی ہو۔ مرغی پکڑنے میں ہم اس کے پیچھے آدھا گھنٹہ بھاگیں ہم مرغی چھیلنے میں مدد کریں ہم اور جب مرغی پک کر دستر خوان پر آئے تو اتی اس کی ایک ٹانگ اپنی سہیلی کی پلیٹ میں ڈال دیں اور دوسری سہیلی کی بیٹی کے پلیٹ میں۔ یہ بھی کوئی انصاف ہوا۔؟ دل تو ضرور دکھتا ہے لیکن کوئی بات نہیں۔ مرغی کی صرف ٹانگیں تھوڑی ہی ہوتی ہیں اور بھی تو چیزیں ہوتی ہیں اور ان سب کا مزا ایک سا ہوتا ہے۔ بلکہ ہم تو کہتے ہیں یہ دوسری چیزیں ہی کھانی چاہیے۔ کسی کو پتا ہی نہیں چلتا کیا کیا کھایا ہے جب کہ مرغی کی ٹانگ بعد میں بھی چغلی کھاتی رہتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ کس نے کھائی ہے۔

مرغی کا جوش بھی نکلتا ہے۔ اسے سوپ کہتے ہیں مرغی کے سوپ میں تو طاقت ہی طاقت ہوتی ہے۔ یہ عرق پی کر کمزور تندرست ہو جاتے ہیں۔ جوش کے لیے جو مرغیاں استعمال کی جاتی ہیں وہ مرغیاں نہیں ہوتیں چوزے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں ان کے عرق میں زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ یہ بھی اچھی چیز ہے لیکن سال میں بس ایک یا دو مرتبہ پینا چاہیے۔ یہ بھی بہت ہو گیا۔ ہم سوچتے ہیں اگر مرغی کی چار ٹانگیں ہوتیں تو جوش بھی مقدار سے زیادہ نکلتا اور جگہ جگہ اس کی بھی دوکانیں لگی ہوتیں۔ یہ بھی اسی طرح بکتا جیسے گنے کا رس بکتا ہے۔

مرغی اپنا رزق خود پیدا کر لیتی ہے۔ بس اسے دن میں آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ کبھی کھانا مانگنے آپ کے سامنے نہیں آئے گی۔ ہاں کھانے کی کوئی چیز نظر آجائے تو کیا مجال جو چھوڑ دے۔ ظاہر ہے کیوں چھوڑے گی۔ کیا ہم مرغی کو چھوڑ دیتے ہیں۔

مرغی کی بس ایک ہی مشکل ہے۔ اسے اپنا ایک گھر چاہیے چاہے وہ جھانپ ہو یا دربہ۔ وہ رہے گی الگ۔ ایک بڑے ٹوکرے میں دو تین مرغیاں آسانی سے زندگی گزار لیتی ہیں ٹوکرا الٹا ہونا چاہیے اور اس پر ایک بڑا سا پتھر بھی رکھا ہونا چاہیے۔ بلی تو مرغی کی بو سونگھ لیتی ہے۔ مرغی کو جتنا بلی سے بچاؤ گے مرغی اتنی ہی تمہارے کام آئے گی۔

ہم یہ بھی سوچتے ہیں کہ یہ شکاری بڑی بڑی بندوقیں لے کر رات رات بھر جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں کہ کوئی ہرن ہاتھ آجائے، کوئی خرگوش ہی مل جائے۔ ارے میاں آرام سے گھر بیٹھو اور شکار کا ہی شوق ہے تو مرغی کا شکار کرو۔ گھر کی مرغی ہوتی ہی بیچاری دال برابر ہے ہاں اس کی چار ٹانگیں ہوتیں تو بات اور تھی۔

مسعود احمد برکاتی

روشنی کا مینار

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور ہدایات کے بہت سے گوشے ہیں، بہت سے پہلو ہیں۔ آپؐ کی سیرت پاک ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ آپؐ کی ساری زندگی اور اس کا ہر ہر لمحہ ہمارے لیے اور تمام انسانوں کے لیے روشنی کا سرچشمہ ہے۔ اُن انسانوں کے لیے بھی جو گزر چکے ہیں، ان کے لیے بھی جو اب موجود ہیں اور ان انسانوں کے لیے بھی جو آئندہ دنیا میں آئیں گے، حضورؐ کی پاک زندگی نور کا ایک مینارہ ہے۔

آپؐ کی سیرت پاک مکمل اور کامل ہے۔ بہترین نمونہ ہے۔ اس نمونے پر جو شخص جس حد تک عمل کرتا ہے، اسی حد تک وہ فائدے اُٹھاتا ہے، فلاح پاتا ہے حضورؐ ہمیں ایک معیار اور مثال عطا کر گئے ہیں، ہمارا کام اس پر عمل کرنا ہے۔ عمل کر کے ہی اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ جس طرح حکیم جو نسخہ آپ کو لکھ کر دیتا ہے اس کے مطابق دوا پینے سے ہی فائدہ ہوتا ہے، محض نسخہ لکھوا لینے یا نسخے کو رٹنے سے یا بہت خوبصورت لکھوا کر اور سجا کر رکھ دینے سے بیماری کبھی دُور نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح حضورؐ نے جو نسخۂ شفا ہمیں عطا کیا ہے اُس پر عمل کر کے ہی ہم اپنی بیماریاں اور پریشانیاں دور کر سکتے ہیں۔ محض اس کو دُہراتے رہنے یا اس پر کتابیں پڑھنے سے یا تقریریں سننے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اور کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری پریشانیاں دُور نہیں ہو رہی ہیں۔ ہم طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا ہیں۔ دنیا میں نئے نئے فساد برپا ہو رہے ہیں۔ لڑائی جھگڑا عام ہے۔ بے ایمانی، دھوکا، فریب بھی عام ہے، امن نہیں ہے، سکون نہیں ہے، کوئی خوش نہیں ہے اور یہ اسی طرح رہے گا، ہرگز ہرگز اس میں فرق نہیں آئے گا۔ اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی، یہ پریشانیاں خوشیوں سے کبھی نہیں بدل سکتیں، اس لیے کہ ہم سرکارؐ کے بتائے ہوئے راستے پر نہیں چل رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ حضورؐ نے جھوٹ کو بُرا کہا ہے، لیکن ہم خوب بولتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وعدہ خلافی کو حضورؐ نے منع کیا ہے، لیکن ہم وعدہ خلافی کرتے ہیں۔ اسی طرح جن جن چیزوں کو حضورؐ نے منع فرمایا ہے ان کو ہم نہیں چھوڑتے اور جن جن کاموں کی حضورؐ نے ہدایت کی ہے وہ نہیں کرتے تو ایسی صورت میں حالات کیسے بدلیں گے، اصلاح کیسے ہوگی۔ خیر اصلاح نہ ہو۔ حالات نہ بدلیں۔ ہم نقصان اُٹھاتے رہیں، تباہی کی طرف جاتے رہیں۔ ایک دوسرے کو تکلیف پہنچاتے رہیں۔ آپس میں لڑتے رہیں۔ دھوکا دیتے رہیں۔ دھوکا کھاتے رہیں۔ پریشان رہیں بد حال رہیں۔ کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر کوئی اپنے آپ کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو اس کو کون روک سکتا ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ پھر حضورؐ کا اسم مبارک اپنی زبان پر کیوں لائیں! حضورؐ کی تعلیمات کیوں دُہرائیں! اسلام کے دعوے کیوں کریں! سیرت نبویؐ کے جلسے کیوں منعقد کریں! میلاد کیوں پڑھیں! یہ سب کس لیے؟ کیا دنیا کو دھوکا دینے کے لیے؟ یا اپنے کو دھوکا دینے کے لیے؟ دنیا تو دھوکا نہیں کھاتے گی۔ ہم خود اپنے ہی کو دھوکا دے رہے ہیں، دوسروں کی نظروں میں بھی ذلیل ہو رہے ہیں اور رسول عربیؐ کے نام لیوا بن کر آپ کے نام نامی کو بھی بٹّا لگا رہے ہیں۔

آپ لوگ ابھی کم عمر ہیں۔ اس لیے شاید آپ کی سمجھ میں یہ بات آجائے ورنہ اخلاقی گراوٹ نے ہم بڑوں کے دماغ تو اس قابل نہیں چھوڑے کہ ہم یہ سیدھی سادی بات سمجھ سکیں۔

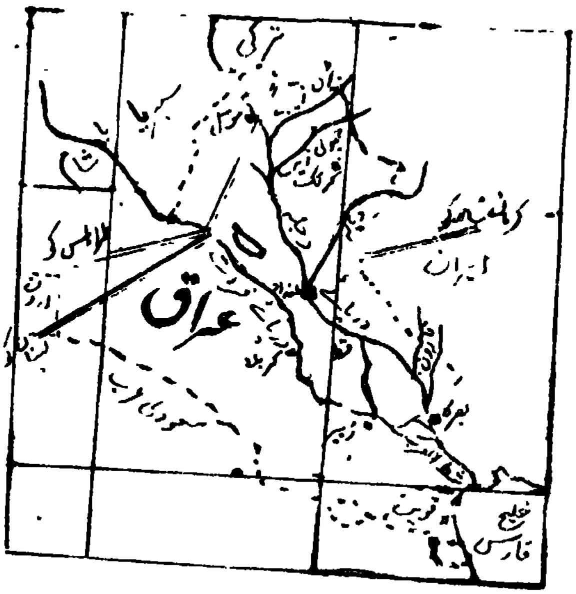
آپ اگر ابھی سے سوچیں گے، سمجھیں گے اور سچائی پر چلنے کا ارادہ کریں گے تو کل جب آپ تعلیم پوری کر کے زندگی کے میدان میں قدم رکھیں گے، تو اچھے اچھے کام کر سکیں گے اور جو برائیاں پھیل چکی ہیں ان کو ختم کر سکیں گے۔

جن قوموں نے اچھے اصولوں پر عمل کیا، وہ ترقی کر رہی ہیں۔ خوش ہیں، خوشحال ہیں۔ ہمارے پاس حضورؐ کے عطا کیے ہوئے جو اصول ہیں۔ ہم ان پر عمل کریں تو ہم فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

(ہمدرد نونہال)

ڈاکٹر قنبر رضوی قسط (۳)

مقدس ایشیا



مقدس ایشیا نے کہا آؤ چلو ان دونوں نوجوانوں سے ملاقات کرائیں۔ کشمیر کی خوبصورت وادی کو پار کرکے ہم سندھ کی گھاٹی میں پہنچے۔ ہمیں دور سے ایک نوجوان فوجی لباس میں دکھائی دیا جس کے سر پر چاند تارا بھی چمکتا دکھائی دے رہا تھا اور جس کی زبان پر نعرۂ تکبیر بھی تھا۔ مقدس ایشیا نے کہا لو اس نوجوان سے ملاقات کرو۔

میں: مقدس ایشیا کے جوان بیٹے۔ آپ ہی کو لوگ پاکستان کہتے ہیں۔

پاکستان: جناب عالی!
میں ہی قدیم
سندھ گھاٹی کی
تہذیب کا وارث
پانچ ندیوں کا
پروردہ، سرحد کا
محافظ پاکستان ہوں۔



میں: آپ کی زندگی تو بڑی سپاہیانہ سی لگتی ہے۔

پاکستان: جناب سرحدی جدوجہد نے مجھے سپاہی بننے پر مجبور کردیا ورنہ میں سرزمین پاک پر اسلامی جمہوریت کا علمبردار ہی رہتا۔

میں: آپ جسامت اور توانائی میں بھی کم نہیں لگتے ہیں۔

پاکستان: نہیں جناب۔ میرا رقبہ ۱۹۷۱ء کے بعد صرف ۸۰۱۴۰۵ مربع کلو میٹر رہ گیا۔ باقی میرے بھائی بنگلہ دیش کو مل گیا۔ میری آبادی بھی صرف سات کروڑ رہ گئی ہاں قدرت توانائی بڑھانے میں مددگار ہے ویسے میری توانائی تو میرے ہمسائے ممالک کی وجہ سے ہے۔

میں نے مقدس ایشیا سے کہا چلیے اب بنگلہ دیش سے بھی مل لیا جائے جب ہم وادی گنگا کو پار کرکے برہمپتر کی گھاٹی میں داخل ہوئے تو سادے لباس میں مگر سپاہیانہ انداز سے کسی نے ہمارا خیر مقدم کیا۔

میں: کیا آپ ہی ہند پاک کے چھوٹے بھائی بنگلہ دیش ہیں؟

بنگلہ دیش: جی ہاں میں ہی ہند و پاک کا چھوٹا بھائی ہوں۔ میری جسامت صرف ۱،۴۱،۱۲۳ مربع کلومیٹر ہے مگر آبادی ۷ ½ کروڑ ہے اور اس لحاظ سے دنیا کا آٹھواں بڑا ملک ہوں۔ فی کلو میٹر یہاں ۵۳۷ لوگ بستے ہیں۔

وائس پرنسپل، اے، کے ڈگری کالج۔ شکوہ آباد

آتنی گھنی آبادی اور اتنے غریب کسانوں کو دیکھ کر
میرا دل گھبرانے لگا۔ میں نے کہا مقدس
ایشیا بھارت اور بنگلہ دیش
کے پورب میں کیا ہے ۔



مقدس ایشیا
نے کہا
پورب تو
برما اور
ملائشیا
ہیں۔ ہم نے
پہاڑیوں کو
پار کرکے
گھنے مانسون
سدابہار
جنگلوں کو پار کیا۔ اراودی ندی کی گھاٹی میں ایک
بدھ سادھوں کے لباس میں مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا
میں : کیا آپ جنگلوں کے راجا۔ بودھ پگوڈا کے دیش
برما ہیں۔



برما : جی ہاں مجھے ہی
برما کہتے ہیں۔
انگریزوں نے مجھے
۱۹۳۷ء میں بھارت سے
الگ کرکے اپنے
قبضے میں رکھا
مگر میں ۱۹۴۸ء
میں ان کی گرفت
سے آزاد ہوگیا۔
: آپ کتنے لمبے لگتے ہیں۔
: ہاں میری لمبائی شمال
سے جنوب کی طرف
تقریباً دو ہزار کلومیٹر ہے
جو چین سے
ملائشیا تک ہے مگر میری حسامت صرف ۶،۷۸،۰۰۰
مربع کلومیٹر ہے۔
میں نے مقدس ایشیا سے پوچھا یہ ملائشیا کون ہے
مقدس ایشیا نے مسکرا کر کہا میرے دو بچے ایسے ہیں جنہوں
نے اپنا نام میرے نام پر رکھا ہے ایک ملائشیا
اور دوسرے انڈونیشیا۔ یہ دونوں یہاں سے جنوب
میں ہیں۔ ان کا نام ہی بتا دیتا ہے کہ میرا ان سے کیا
رشتہ ہے۔ کیا آپ ان سے ملیں گے۔ میں نے کہا۔
ضرور۔ آئیے چلیں۔



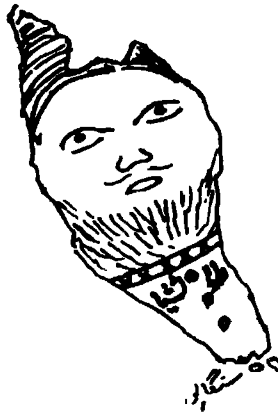
ایشیا: مگر آئیے چلتے چلتے اپنے سب
سے چھوٹے بچے ننھے کمپوچیا کی
خیریت معلوم کرتے چلیں۔
میں: وہ کہاں ہے ؟
ایشیا: یہاں سے پورب کی طرف آزاد ملک تھائی لینڈ
کے اس پار میرے جڑواں بچوں لاؤس اور
ویت نام کے پاس رہتا ہے۔
میں: مقدس ایشیا! آپ نے تھائی لینڈ کو آزاد ملک کیوں
کہا ؟



ایشیا: اس ملک کا نام ۱۹۳۶ء تک
سیام تھا۔ مگر اس کو
تھائی لینڈ کہنے لگے
کیونکہ جنوب مشرق
میں یہی ایک ملک
ہے جو کبھی کسی کے قبضے
نہ رہا اور ہمیشہ آزاد زندگی
گذارتا رہا۔ تھائی لینڈ کے
معنی ہیں آزاد لوگوں کا ملک
میکانگ ندی اس کو برما سے
الگ کرتی ہے اور ۲½ ہزار کلومیٹر
سے زیادہ لمبا سمندری ساحل اس کو اور حصوں
سے علیحدہ کرتا ہے۔ یہ چاول کا ملک بھی کہلاتا ہے

کمپوچیا اور تھائی لینڈ کے جنوب میں ہم ربر کے جنگلوں میں داخل ہوئے تو مقدس ایشیا نے کہا۔ آیئے آپ کو خط استوائی ناریل اور ربر کی باغانی کاشت کرنے والے رتن کی عالمگیر پیداوار کے مالک سے ملائیں اس کا نام تو ملایا تھا مگر اس نے سنگاپور اور سراوک کو ملا کر اپنا نام ملائشیا رکھ لیا۔ اب سنگاپور علیحدہ ہو گیا ہے پھر بھی اس نے مجھ سے اپنی نام کی نسبت ختم نہیں کی۔

میں : (ملائشیا سے ہاتھ ملاتے ہوئے) میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے اتنا اچھا نام رکھا آپ معدنیات اور زراعت دونوں میں آگے ہیں۔



ملائشیا: یہ سب مقدس ایشیا کی دعاؤں کا نتیجہ ہے ورنہ ہماری بساط ہی کیا ہے آیئے آپ کو مشرق کے دروازے سنگاپور تک پہنچا دوں۔

سورج کی شعاعیں ہمارے سروں پر زاویہ قائمہ بنا رہی تھیں مگر ساحل کی ٹھنڈی ہواؤں نے اسے خوشگوار بنا دیا تھا۔ ہم مشرق کے دوار ہے یعنی سنگاپور پہنچ گئے بین الاقوامی جہاز بندرگاہ کی طرف چلے آرہے تھے۔ ساحل پر ناریل اور ربر کے درخت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے مقدس ایشیا سے پوچھا۔

میں : کیا ناریل اور ربر پیدا کرنے والے یہی ممالک ہیں؟

ایشیا : نہیں تو۔ ملائشیا میں ربر سب سے پہلے ۱۸۷۶ء میں شری لنکا سے آیا۔

میں : شری لنکا کی قیام گاہ تو میں نے نہیں دیکھی۔؟

ایشیا: بھارت کے جنوب میں آبنائے پاک میں واقع پل آدم کے جزیروں سے صرف ۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر شری لنکا بحر ہند میں واقع ہے۔ آؤ دکھائیں۔



ہم دونوں ایک بڑے جہاز کے مستول پر چڑھ گئے۔ بحر ہند موجیں مار رہا تھا اس کی موجوں میں ایک ناریل سا تیرتا نظر آیا مقدس ایشیا نے کہا۔ یہ ناریل جیسا دیش سری لنکا ہے اس کو یورپ کا موتی بھی کہتے ہیں یہاں بودھ دھرم ۳۰۰ قبل مسیح میں پہنچ گیا تھا۔ جنوبی شری لنکا میں موتی نکالے جاتے ہیں۔ بھارت اور لنکا تہذیب اور تاریخ میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔

میں : مقدس ایشیا۔ سنگاپور سے جنوب اور مشرق میں یہ بحر ہند میں اور کون تیرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔

ایشیا: یہ میرے نام سے نسبت رکھنے والا ایک اور میرا بیٹا ہے جسے انڈونیشیا کہتے ہیں۔

میں : یہ ایک نہیں یہ تو کئی ایک دکھائی دے رہے ہیں

ایشیا: ہاں یہ تمہارے قریب سماٹرا تیر رہا ہے اور آگے چھوٹا جاوا ہے۔ جاوا کے شمال میں اور سراوک کے جنوب میں بورنیو ہے۔ اس کے پورب میں سلاویز تیر رہے ہیں۔ اور سلاویز کے جنوب میں جاوا کے مشرق میں تیموری ہے ان میں جاوا بہت چھوٹا ہے مگر بہت گھنا بسا ہوا ہے۔ یہاں عربوں نے بہت پہلے تجارتی مرکز بنا رکھے تھے اور آج بھی مسلم کافی تعداد میں آباد ہیں۔

میں مقدس ایشیا! وہ دور بحر اوقیانوس کی طرف گیا کوئی غوطہ خور گہرے سمندر میں غوطے لگا

رہا ہے۔



ایشیا :- نہیں یہ گھرے سمندر میں میرے فلپائن۔ جزائر ہیں۔



میں :- مقدس ایشیا ان جزائر تک عرب جہاز راں کیسے آگئے ؟

ایشیا : وہ مغرب سے مسالوں کی تلاش میں تاجروں کی حیثیت سے آئے چلو تمھیں اب مغرب ہی کی طرف لے چلیں۔

میں مقدس ایشیا کے قدم بہ قدم چلتا رہا۔ برما، بنگلہ دیش اور سرزمین ہند و پاک کے مغرب میں درۂ خیبر پار کرکے ہم آگے بڑھے تو ایک سپاہی نے ہم کو ٹوکا۔

میں :- مقدس ایشیا یہ سپاہی کون ہے ؟

ایشیا :- یہ سرحدوں کا رکھوالا روس و پاکستان کے درمیان محافظ پٹھان دیش افغانستان ہے۔ آپ بزرانہ مائیں سرحدوں کے محافظ کابل کے پٹھان یا افغان کا فرض ہے کہ وہ ہر ایک کو ٹوک دے چاہے اپنا ہو یا پرایا۔

میں :- بہادر افغان۔ آپ کی فرض شناسی پر مبارکباد میں آپ کا دوست اور مقدس ایشیا کا مہمان ہوں۔



افغانستان :- خوش آمدید! خان بابا آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہے ؟



میں :- خان بابا! آپ جیسے بلند و بالا اور عظیم فرزندوں پر مقدس ایشیا کو فخر ہونا چاہیے۔

افغانستان :- نہیں نہیں خان بابا! ۶½ لاکھ مربع کلومیٹر رقبہ میں اپنے دو کروڑ بھائیوں کے ساتھ اونچی نیچی وادیوں میں سوکھے میووں پھلوں اور معمولی کھیتی پر گزر کرنے والا ہے۔ اس کی طرف چاروں طرف سے لوگ بندوقیں اٹھائے رہتے ہیں خان بابا کمزور ہے۔

مقدس ایشیا نے پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ بیٹے۔ ایشیا اور خدا تمہارے ساتھ ہے۔ تم فکر نہ کرو اور میرا ہاتھ پکڑ کر ہندوکش کی پہاڑیوں کو پار کرکے ایلبرز کی پہاڑیوں پر چڑھنا شروع کیا۔ خراسان کی ایک مسجد سے دستار باندھے ایک بزرگ عالم دین باہر نکلے مقدس ایشیا سے مصافحہ کیا۔ مقدس ایشیا نے مجھ سے کہا لیجیے ملیے یہ اسلامی جمہوریہ ایران ہے۔ میں نے سلام کرتے مصافحہ کیا۔ انھوں نے خوش آمدید کہا۔

میں :- مرحبا! اے بزرگ دین! اس پر آشوب زمانے میں آپ اسلامی قدروں کو اجاگر کرنے پر کمربستہ ہیں۔

ایران :- اے برادر ملوکیت کی گرفت سے عوام کو صرف اسلامی جمہوریت ہی آزاد کرا سکتی ہے۔

میں :- آپ تو بہت وسیع و عریض ہیں۔ ؟



ایران :۔ جی ہاں کوہ لیرزا اور کوہ زیگر اس کے درمیان دشت لوط اور دست کبیر کے ساتھ ساتھ خراسان اور سیستان کے علاقے تقریباً ۱۶½ لاکھ مربع کلومیٹر کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، مگر آبادی صرف ۳½ کروڑ ہے۔

مقدس ایشیا نے بتایا کہ سنہ ۱۹۲۵ سے پہلے اسے فارس کہتے تھے اور اس سے متصل خلیج کو آج بھی لوگ خلیج فارس کہتے ہیں۔ عرب لوگ اس ملک کو عجم مانتے ہیں۔ سنہ ۱۹۷۷ء میں عوام نے ملوکیت کو ختم کرکے جمہوریت کو رواج دیا۔ معدنی تیل کی پیداوار کے نقطہ نظر سے دنیا کا تیسرا بڑا ملک مانا گیا۔ ابادان میں تیل صاف کرنے کا عظیم کارخانہ ہے ایرانی قالین اور غالیچے دنیا میں اعلیٰ ترین سمجھے جاتے ہیں۔ چلیے اب آپ کو عراق سے ملائیں۔ سرحد پر توپیں گولہ باری کر رہی تھیں اس لیے ہم لوگ خلیج فارس میں ہوکر بصرہ پہنچے۔ شط العرب کے دہانے پر کسی نے فوجی انداز میں ہمارا استقبال کیا۔ اور ہنس کر کہا آپ کو ایران سے یہاں آنے میں زحمت ہوئی ہوگی۔

میں :۔ کیا آپ ہی قدیم بابل اور اسیریائی تہذیب کے وارث عراق ہیں۔

عراق :۔ جی ہاں انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں ہم کو میسوپوٹامیہ کہا۔ سنہ ۱۹۵۸ سے ہمیں الجمہوریہ عراق کہا جاتا ہے ہمارا وطن دجلہ اور فرات کی زمین اور ہمارے شہر متبرک زیارت گاہ اور مقبروں کے حامل ہیں۔ بغداد۔ کاظمین۔ سامرہ۔ نجف اور کربلا کے آستانوں پر ساری دنیا کے عقیدت مند مسلمان اپنا سر خم کیے نظر آتے ہیں مگر جسامت میں صرف ۴۳۸۵۵۶ مربع کلومیٹر میرا رقبہ ہے اور آبادی دو کروڑ سے بھی کم ہے۔



ہماری تہذیب قدیم

میں :۔ مگر آپ دور جدید میں کیسے نظر آرہے ہیں۔

عراق :۔ اس دور میں ہمارا موصل۔ کرکک۔ خان کوئین۔ دورہ۔ قائرہ۔ رومیلہ ترقی کی شاہراہ پر سنگ میل ہے۔ پٹرولیم کی پیداوار نے ہم کو دنیا میں پیش پیش کر دیا۔ اب ہم اپنے پڑوسی ایران۔ ترکی شام واردن کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

مقدس ایشیا نے کہا چلو شمال میں ہم اس واحد ملک سے ملیں جس نے ہمارا سکہ یورپ پر بھی جما دیا۔ یہ ٹرکی یا ترکی ہے جہاں مشرقی اور مغربی دونوں تہذیبوں کا سنگم ہے اس کا قسطنطنیہ مشرق اور مغرب کا چوراہا ہے کردستان کی پہاڑیوں کے اس پار کوہ قاف سے پریوں کا حسن اور خلیج باسفورس سے سپاہیانہ عزم لیے آتا ترک کے انداز میں ہمارا استقبال کسی نے کیا۔

میں :۔ بہادر مجاہد۔ تم صرف اپنے نہیں بلکہ پورے ایشیا کے محافظ ہو۔ تم کو لوگ ایشیا کی دہلیز بھی تو کہتے ہیں۔

ٹرکی :۔ جی ہاں مجھے لوگ ترکوں کا دیش۔ ایشیا کا دروازہ



اور ترکستان بھی کہتے ہیں۔ میں نے یونانیوں کا مقابلہ کیا اور پہلی جنگ عظیم میں یورپ کے بہت سے ممالک سے ٹکر لی۔ اور آج بھی ساحل بحر روم پر اپنے باپ مقدس ایشیا کی دعاؤں سے زندہ ہوں (باقی آئندہ)

بلیّوں کا راجا

محمود نقوی

کافی پہلے کی بات ہے، انگلستان کے ایک گرجا گھر میں ایک بوڑھا شخص رہتا تھا جو عبادت کے اوقات میں گرجا گھر کی گھنٹیاں بجاتا اور جب کسی شخص کا انتقال ہو جاتا تو اس کے لیے قبر تیار کرتا۔ گرجا گھر کے قریب ہی ایک چھوٹے سے مکان میں وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ان کے یہاں ایک بلاّ پلا ہوا تھا۔ بالکل سیاہ کوئلے کی طرح بس اس کے سینے پر ایک سفید نشان ضرور تھا۔ یہ لوگ اسے ٹام یا اولڈ ٹام کہہ کر پکارتے تھے۔

جاڑے کی ایک شام تھی اور موسم کافی شدید۔ اس مرد کو قبر کھودتے ہوئے تقریباً سارا دن گزر چکا تھا۔ اُدھر اس کی بیوی اور اولڈ ٹام اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ وہ بھی آجائے تو چائے پی کر تازہ دم ہوں لیکن خلاف امید ایسا نہ ہوا اور چاروں طرف رات کا اندھیرا پھیل گیا کچھ دیر بعد وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا اور تیز لہجے میں بولتا ہوا کمرے میں داخل ہوا "یہ ٹام ٹلڈرم کون ہے؟" اس کے لہجے میں ایسا کھردراپن تھا کہ اس کی بیوی اور بلا دونوں ہی سپاٹ نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوگئے "آخر بات کیا ہے؟" اس کی بیوی نے سوال کیا۔

"میں نے ابھی ایسی عجیب و غریب باتیں دیکھی اور سنی ہیں کہ تمھیں ان پر یقین نہیں آئے گا" مرد نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"جلدی سے بیٹھ جاؤ اور بتاؤ نا، میں چائے تیار کرتی ہوں" اس کی بیوی نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔

"سنو" مرد نے اپنی بیوی کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ان کے درمیان میں اولڈ ٹام پہلے ہی سے موجود تھا "میں اس بوڑھے شخص کے لیے قبر کھودنے میں مصروف تھا جسے کل صبح دفن کیا جانا ہے۔ قبر لگ بھگ تیاری ہو گئی تھی اندھیرا ہو رہا تھا میں نے سوچا ذرا سا کام باقی ہے۔ اسے بھی پورا کر ہی لوں۔ جب میں نے قبر کے اندر سے مٹی کا آخری پھاؤڑا باہر نکالا تو میاؤں کی آواز سنائی دی۔"

"میاؤں" اولڈ ٹام نے اس طرح کہا جیسے بات سمجھ کر کچھ جواب دیا ہو۔ "ہاں بالکل اسی طرح" بوڑھے آدمی نے سر ہلاتے ہوئے کہا "میں نے نظریں اٹھائیں تو جانتی ہو کیا دیکھا۔؟"

"مجھے کیا معلوم، آپ بتائیے نا" بیوی نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"میں نے دیکھا نو کالی بلیاں چلی آرہی ہیں ہر ایک کے سینے پر اولڈ ٹام کی طرح ایک چھوٹا سا سفید دھبا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر اور تعجب ہوا کہ وہ بلیاں اپنے کاندھوں پر ایک چھوٹا سا تابوت اٹھائے تھیں جس پر مخمل جیسا کالا کپڑا اڈھکا ہوا تھا۔ اور بیچ میں ایک چھوٹا سا سنہرا تاج رکھا تھا۔ وہ بلیاں بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھیں اور ہر تیسرے قدم پر وہ ایک آواز ہو کر کہتیں "میاؤں"

"میاؤں" اولڈ ٹام نے پھر آواز لگائی!

"ہاں بالکل اسی طرح" مرد نے کہا "وہ میری ہی طرف بڑھتی آرہی تھیں۔ اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے بالکل قریب سے ہو کر گزریں گی۔ جب وہ قریب پہنچ گئیں تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے آٹھ تابوت اٹھائے ہوئے ہیں اور نویں جو ان سب میں بڑی تھی تابوت کے آگے آگے چل رہی تھی" یہ کہتے ہوئے وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہوا "بیگم! ذرا اولڈ ٹام کو تو دیکھو جیسے وہ ہر بات سن

نمبر ۱ نیو برجپوری - دلی ۵۱

اور سمجھ رہا ہو؛

" اولڈ ٹام برا نہ ماننا تمہاری بات تھوڑی ہو رہی ہے" بیوی نے بلے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر اپنے شوہر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی" آگے بتایئے نا۔"

" ہاں میں بتا رہا تھا کہ وہ بلیاں تابوت اٹھائے ہوئے آگے بڑھتی چلی آرہی تھیں اور ہر تیسرے قدم پر ایک آواز ہو کر کہتیں رمیاؤں،"

رمیاؤں، پھر اولڈ ٹام نے آواز میں آواز ملائی۔

" ہاں بالکل اسی طرح" اس شخص نے کہا، "اور جب وہ بلیاں اس قبر کے نزدیک سے گزر رہی تھیں جس میں میں کھڑا ہوا تھا تو وہ سب ٹھہر گئیں اور میری طرف دیکھنے لگیں، بیگم! دیکھو اولڈ ٹام بھی بالکل اسی طرح مجھے گھور رہا ہے۔"

"آپ تو خواہ مخواہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، اولڈ ٹام برا نہیں مانے گا، آپ آگے چلیے۔"

" اچھا ہاں، وہ ساری بلیاں میرے قریب پہنچ کر رک گئیں اور جو بلی تابوت کے آگے آگے چل رہی تھی وہ اور آگے بڑھی اور بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے کہنے لگی، ٹام ٹلڈرم سے کہہ دینا کہ ٹم ٹلڈرم مرگیا ہے، لیکن بیگم ٹام ٹلڈرم کون ہے میں اسے کیسے بتاؤں کہ ٹم ٹلڈرم کا انتقال ہو گیا ہے؟"

" ذرا اولڈ ٹام کی طرف تو دیکھیے" اس کی بیوی گھبراہٹ کے ساتھ بولی انھوں نے دیکھا کہ اولڈ ٹام کی پیٹھ کے بال کھڑے ہو گیے ہیں اور اس کا قد بڑا ہوتا جا رہا ہے اور اس کی بڑی بڑی ہری آنکھیں کچھ اور چمکدار ہو گئی ہیں۔ ابھی دونوں میاں بیوی حیرت زدہ اسے دیکھ ہی رہے تھے کہ ان کے کانوں میں آواز آئی "اگر ٹم ٹلڈرم مرگیا ہے تو میں بلیوں کا راجا ہوں" اس آواز کے خاتمہ کے ساتھ ہی اولڈ ٹام ایک جست میں چمنی سے باہر چلا گیا اور کمرے میں ایک خوف زدہ نسوانی چیخ گونج گئی۔

کہتے ہیں کہ ان دونوں میاں بیوی کو وہ بلا پھر کبھی دکھائی نہیں دیا۔

بقیہ صفحہ ۱۸ کا

خالص ایک تولہ اور کپور دو ماشہ ملا کر آنکھ میں سوتے وقت لگانے سے موتیا بند کا اثر رک جاتا ہے۔ پیاز کا رس ایک تولہ آب تازہ دو تولہ کے ہمراہ جوش دیں، جب پانی آدھا باقی رہ جائے تو چھان کر ٹھنڈا کر کے دو بار دن میں پلانے سے جلن ٹھیک ہو جاتی ہے۔ پیاز کا رس دو تولہ، آب تازہ دو تولہ روغن سرسوں دو تولہ میں ملا کر آدھے گھنٹے کے وقفہ سے تین بار پلانے سے سانپ کا زہر اتر جاتا ہے۔ بیہوش آدمی کی ناک پر پیاز کو چھیل کر رکھنے سے بیہوشی دور ہو جاتی ہے۔ تخم پیاز کا سفوف دو گرام شہد میں ملا کر ضعف اعصاب و باہ میں کھلانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ تخم پیاز کو سرکہ میں پیسکر مالش کرنے سے داد ٹھیک ہو جاتا ہے۔ یونانی ادویہ میں پیاز کو مختلف مرکبات میں شامل کیا جاتا ہے۔ مثلاً شکنجبین عنصلی وغیرہ

امتہ الرحمٰن محسنی



دو شکاری

(قسط ۸)

جیسے ہی ڈاکٹر صاحب گئے، میں آفس میں گیا۔ اور وہ سائن جس پر "معاف کیجیے آج بند ہے" لکھا ہوا تھا لا کر پمپ پر لٹکا دیا۔ اور پھر سیدھا جا کر اپنے تخت پر لیٹ گیا۔ میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ کپڑے بدلنے تک کی ہمت نہیں تھی۔ بستر پر گرتے ہی سو گیا جب میں اپنے بستر میں گیا تو آٹھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔

شام کے چھ بجے دس گھنٹے گزرنے کے بعد ایمبولینس کے آدمیوں نے مجھے جگایا جو کہ ابو کو واپس گھر لائے تھے اور انھیں بستر پر لٹا رہے تھے۔ "ابو آپ آگئے!" میں نے ان کو دیکھ کر خوشی میں چلا کر کہا۔

"ہاں دانی! میں نے کہا تھا نا کہ میں شام کو آجاؤں گا۔۔"

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"کچھ غنودگی سی ہے،" انھوں نے کہا۔ اور فوراً ہی غافل ہو گئے۔

جیسے ہی ایمبولینس گئی ڈاکٹر حسین اپنے مریض کو دیکھنے آگئے۔ ابو کو سوتا دیکھ کر بولے "یہ کل صبح تک سوتے رہیں گے۔ صبح کو اٹھنے پر بالکل ٹھیک محسوس کریں گے۔" ڈاکٹر جانے لگے تو میں بھی ان کو کار تک پہنچانے گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ ابو گھر آگئے ہیں۔

ڈاکٹر کار کا دروازہ کھول کر مجھ سے پوچھنے لگے۔ "دانی! تم کو کچھ کھائے پیے ہوئے کتنا وقت ہو گیا ہے؟" اوہ۔۔۔ اچھا میں نے تو۔۔۔" اب اچانک مجھے یاد آیا کہ میں نے کل شام ابو ہی کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ مجھے کوئی چیز کھائے ہوئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر نے اپنی کار میں سے کاغذوں میں لپٹی ہوئی کوئی بڑی سی چیز نکالی اور میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا "میری بیوی نے یہ تم کو بھیجا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم کو اس میں کی چیزیں پسند آئیں گی۔ وہ کھانا پکانے میں بہت ماہر سمجھی جاتی ہے۔"

اور اپنی کار میں بیٹھ کر فوراً ہی اسے اسٹارٹ کر دیا۔

میں اس بڑی سی چیز کو سنبھالے کھڑا تھا اور ڈاکٹر کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ جب ان کی کار نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا گھر میں چلا گیا اور پیکٹ کو میز پر رکھ دیا۔ مگر کھولا نہیں۔

ابو اپنے بستر پر لیٹے تھے اور گہری نیند میں تھے۔ وہ ہاسپٹل کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ میں نے ان کا کمبل ہٹا کر دیکھا کہ کیا کیا گیا ہے۔ ان کے پیر سے لے کر گھٹنوں تک سفید پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ پیر کی ایڑی کھلی ہوئی تھی اور اس کے نیچے ایک عجیب سی دھات کی چیز لگی ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ چلنے میں زور ایڑی پر نہ پڑے۔ میں نے ان کو پھر اچھی طرح ڈھک دیا۔ اور میز کے پاس جا کر ڈاکٹر کے لائے ہوئے پیکٹ کو کھولنے لگا۔ اس میں بہت ہی عمدہ سینکے ہوئے کباب، ڈبل روٹی کے سلائس، انڈوں کا خاگینہ اور کئی طرح کی سبزیوں کا سلاد تھا۔ میں نے دو سلائس لے کر اس میں کباب اور سلاد رکھ کر سینڈوچ بنا کر کھایا، بہت ہی مزیدار تھا۔ پھر ایک دوسرا سینڈوچ خاگینے کا بنا کر کھایا۔ ڈاکٹر اور ان کی بیگم کی اس مہربانی اور اتنے مزیدار کھانا بھیجنے کے لیے دل ہی دل میں شکریہ ادا کرتا رہا۔

دوسری صبح کو میرا اسکول کا دن تھا۔ ابو چھ بجے سے ہی جاگ گئے تھے اور خوش ہو کر کہہ رہے تھے۔ اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ اپنی ٹانگ کو آزمانے کے لیے چل کر دیکھ رہے اور خوش ہو کر بتلا رہے تھے کہ بس برائے نام دکھن رہ گئی ہے۔

مسکن۔ دودھ پور، علی گڑھ

جوش میں آکر کہا "میں تم کو پہنچانے اسکول بھی جا سکتا ہوں"۔ "نہیں بالکل نہیں" میں نے کہا۔

"دانی! میں اب تک ہمیشہ تمہارے ساتھ گیا ہوں۔"

"نہیں ابو! دیکھیے نا دو میل جانے اور دو میل آنے میں لگتے ہیں۔ آپ بالکل نہیں جائیں گے۔" اس دن میں اکیلا ہی اسکول گیا۔ لیکن دوسرے دن ان کا اصرار اتنا زیادہ تھا کہ میں ان کو روک نہیں سکا۔ انھیں چلنے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہو رہی تھی سوائے اس کے کہ تھوڑے لنگ کے ساتھ چلتے تھے اور پیر کے نیچے والی چیز چلنے میں کھٹ کھٹ ہوتی رہتی تھی۔

پٹرول پمپ، ورک شاپ اور گھر کی زندگی تقریباً معمول پر آگئی تھی۔ تقریباً میں نے اس لیے کہا ہے کہ سب باتیں پہلے جیسی نہیں تھیں۔ دراصل تبدیلی ابو میں تھی۔ اگرچہ بہت نمایاں نہیں تھی۔ لیکن محسوس ہوتا تھا کہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جو ان کو پریشان کیے رکھتی ہے۔ ہر وقت وہ کسی سوچ میں رہنے تھے اور لگتا تھا کہ وہ کچھ منصوبے بنا رہے ہیں۔ ہم دونوں کے درمیان بھی زیادہ تر خاموشی ہی رہتی تھی یہاں تک کہ رات کے کھانے کے وقت بھی زیادہ بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ وہ اکثر پٹرول پمپ کے سامنے چپ چاپ کسی فکر میں کھڑے سڑک اور شہباز کے جنگل کی طرف تاکتے رہتے تھے۔ ان کو اس کیفیت میں دیکھ کر کئی بار میرا دل چاہا کہ پوچھوں کیا بات ہے؟ اگر میں نے ان سے پوچھا ہوتا تو وہ فوراً بتا دیتے۔ مگر میں نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ جلدی یا دیر سے خود ہی بتائیں گے۔ اور مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

ہاسپٹل سے ان کی واپسی کے دس روز بعد ہم دونوں کھانا کھا کر اپنے گھر کے چبوترے پر بیٹھے تھے اور سورج کو غروب ہوتے دیکھ رہے تھے۔ میرے سونے کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔

اچانک انھوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "دانی تمھیں معلوم ہے کہ آج کل میں پاگل بنا کیوں پھرتا ہوں۔ صبح کو میں خوش خوش اٹھتا ہوں۔ مجھ پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ پھر نو بجتے ہیں اور وہ سفید بڑی گاڑی آتی ہے اور پٹرول پمپ کے سامنے سے زن سے گزر جاتی ہے۔ وھیل کے پیچھے شہباز خاں کا پھولا۔ ابھرا چہرہ دیکھتا ہوں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دیکھنے پر مجبور ہوتا ہوں اور وہ بھی گزرتے ہوئے ہمیشہ میری طرف مڑ کر دیکھتا ہے۔ اس کی وہ نظریں اور چہرے پر پھیلی ہوئی تذلیل، تحقیر اور مضحکہ خیز جو کیفیت ہوتی ہے۔ اگرچہ میں صرف ایک لمحے کے لیے اس کے چہرہ کی جھلک دیکھتا ہوں۔ مگر وہ ہی ایک لمحہ مجھے پورے دن پاگل بنائے رکھتا ہے۔ پورے دن میں اس کے چہرے کی کیفیات کے تصور میں دیوانہ بنا رہتا ہوں۔"

"آپ کی اس کیفیت کے لیے آپ کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔" میں نے ہلکے سے کہا۔

اس کے بعد پھر ہم دونوں چپ ہو گئے۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ آگے وہ کیا کہتے ہیں۔ آخر انھوں نے کہا۔

"ایک دل چسپ بات سنو! تیتروں کے شکار کی تقریب سنیچر سے شروع ہو رہی ہے۔ اس کا تمھیں پتا ہے؟ یہ تقریب ہمیشہ پہلی اکتوبر کو شروع ہوتی ہے۔ اس دفعہ اکتوبر کی پہلی سنیچر کو پڑ رہی ہے۔ شہباز اس دن کو جشن کے طور پر مناتا ہے۔ بہت بڑی شکار پارٹی دے کر بہت دھوم دھام سے مناتا ہے۔"

میں سوچ رہا تھا کہ ابو کے دیوانہ ہونے اور اس بڑی پارٹی کا کیا تعلق ہے۔ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ تعلق ضرور کوئی ہوگا تب ہی ابو اس کی بات کر رہے ہیں پھر بولے۔

"دانی! شہباز کی یہ شکار پارٹی بہت مشہور ہے۔" میں نے پوچھا "کیا اس میں بہت لوگ آتے ہیں؟"

"بہت! سیکڑوں لوگ، دور دور سے راجے مہاراجے، نواب، جاگیردار، تاجر اور دوسرے امیر لوگ۔ اپنے خاندانوں نوکروں، بندوقوں، کتوں کے ساتھ آتے ہیں۔ سارا دن ہانکے کی آوازوں سے جنگل گونجتا رہتا ہے۔ اگرچہ وہ سب ہی شہباز کو پسند نہیں کرتے۔ اس کی حرکتوں سے واقف ہوتے ہوئے اس سے نفرت بھی کرتے ہیں۔" "تو ابو! وہ وہاں آتے کیوں ہیں" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ اس کے یہاں جیسے تیتر اور شکارگاہ ملک بھر میں کہیں نہیں ہے۔ شہباز اپنی شہرت قائم رکھنے کے لیے

جنگل اور تیتروں کی خریداری، پرورش پر دل کھول کر ہزاروں روپیا خرچ کرتا ہے۔" "نہیں ابو ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "میں تم سے قسم کھا کر کہتا ہوں۔ شہباز اتنا خرچ کر کے اس کا پورا فائدہ حاصل کر لیتا ہے۔ بڑے لوگوں سے دوستی کر کے ان سے کام نکالتا ہے۔ اس دن وہ سب کی نظروں میں بے حد اہم ہو جاتا ہے۔ سب مہمان اس سے خاص تعلق کا اظہار کرتے ہیں۔ جاتے وقت گلے مل کر اور ہاتھ ملا کر اس سے رخصت لیتے ہیں۔ اسے اپنی چھوٹی سی دنیا بے حد شاندار اور اہم محسوس ہونے لگتی ہے۔"

"خیر یہ سب تو ہے اب میں اور کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ابو کہیے۔" میں نے کہا۔

"میں یہ چاہ رہا ہوں کہ میں کوئی نئی تدبیر معلوم کرنے کے لیے بے تاب ہوں۔ دانی یہ بہت ہی راز کی بات ہے۔" پھر خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ جب کہ میلوں بھی کوئی انسان دیکھا نہیں جا سکتا تھا اور یہ بات انھیں خود بھی معلوم تھی۔ وہ میرے اور قریب کھسک کر سرگوشی میں بولے۔ "میرا دل چاہتا ہے کہ ایسی کوئی ترکیب مجھے مل جائے کہ ایک ساتھ بہت سے تیتروں کی پوچنگ ہو سکے اور شکار کے دن جنگل میں کوئی تیتر ہی باقی نہ رہے۔" "ابو! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے زور سے کہا۔

"شش شش!" انھوں نے کہا۔ "سنو میں چاہتا ہوں کہ ایک ہی دفعہ میں شہباز جنگل کے پورے دو سو پرندے گرا لوں تاکہ سہباز کو اس دن ایسی ناکامی ہو کہ پوچنگ کی تاریخ میں ایک مثال بن جائے۔"

"دو سو! ناممکن!" میں نے حیرت سے کہا۔

"دانی ذرا سوچو تو اگر یہ ممکن ہو جائے تو یہ فتح کیسی عظیم اور شاندار ہوگی۔ سب راجے، مہاراجے، نواب، جاگیردار مشہور لوگ مع ساز و سامان کے گاڑیوں میں لدے آ رہے ہیں شہباز خاں صاحب اکڑے اکڑائے مور کی طرح سجے پھولے ان کا استقبال کر رہے ہیں۔ ادھر جنگل کے اندر ہنکاروں کی ایک فوج بھاگی پھر رہی ہے۔ طرح طرح کی آواز نکال کر نیچے بیٹھے تیتروں کو ہنکانے اور منتظر بندوقوں کی طرف اڑانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر ہیں یہ کیا! وہاں تو ایک بھی تیتر کہیں نظر نہیں آتا۔ شہباز صاحب کا چہرہ مارے غصے کے لال ہوتا ہے پھر اودا اور آخر میں دھنواں دھنواں ہو جاتا ہے۔ کیوں ہوگا نہ یہ ایک بہت ہی دلچسپ، عجیب، انوکھا واقعہ! کاش اگر ہم اس کا کوئی طریقہ دریافت کر سکیں۔"

بات ختم کر کے ان کے دل میں ایسا جوش پیدا ہوا کہ وہ بیٹھے سے کھڑے ہو گئے اور میرے سامنے ٹہلنے لگے اور تیز تیز آواز سے کہتے رہے "اُف اگر ایسا کوئی طریقہ معلوم ہو جائے تو کیسی شاندار بات ہو۔ کیسی کامیابی ہو۔ ساری کوفت دور ہو جائے۔" "بے شک آپ کی یہ تمنا ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ لیکن کیسے؟"

"لیکن کیسے؟" ابو نے میری بات دہرائی۔ "ساری بات اور سوال تو یہی ہے کہ کیسے؟"

"ابو ایسا نہ سوچیے۔ اس خیال کو دل سے نکال دیجیے۔ دو پرندے وہاں سے پکڑنا آسان نہیں۔ کہاں دو سو!"

"کیسے نہ سوچوں؟ یہ باتیں میں بھی جانتا ہوں اور یہ سب مشکلیں چوکیداروں کی وجہ سے ہیں۔"

"وہاں کتنے چوکیدار رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"صرف تین ہیں۔ مگر وہ ہر وقت گھومتے اور نگرانی کرتے رہتے ہیں۔"

"کیا وہ رات کو بھی وہاں رہتے ہیں؟"

"نہیں جب تیتر درختوں پر بسیرا لینے چلے جاتے ہیں۔ ان کو درختوں پر محفوظ دیکھ کر وہ بھی اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ مگر بسیرا لینے تیتروں کو پکڑنے کا طریقہ ابھی تک کوئی دریافت نہیں کر سکا۔ یہاں تک کہ میرے ابا بھی جو پوچنگ کے نئے طریقے دریافت کرنے میں ماہر تھے۔

دانی! بس اب تمہارا سونے کا وقت ہو گیا ہے۔ اندر جاؤ۔ اور سونے کی تیاری کرو۔ پانچ منٹ میں تمہیں کہانی سنانے میں ابھی آتا ہوں۔" (جاری)

ڈاکٹر لطافت علی خاں

پیاز استعمال کرنے کے فائدے

پیاز ایک مشہور گول جڑ والی سبزی ہے۔ یہ عام طور پر مسالے کا جز ہوتی ہے۔ اس کو غذا کے علاوہ دوا کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندستان میں ہر ریاست میں اس کی کاشت کی جاتی ہے اس کی سب سے زیادہ کاشت آندھرا پردیش اور بہار میں ہوتی ہے۔ رنگ کے اعتبار سے سفید، سرخ و سنہری اس کی قسمیں ہیں۔ اس کے تخم سیاہ چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور یہی تخم دوا مستعمل ہیں۔ یونانی اطباء اس کی تاثیر گرم و خشک بتاتے ہیں۔ پیاز کے زیادہ استعمال سے متلی، قے اور دست ہونے لگتے ہیں۔ یہ معدے اور آنتوں کی غشاء مخاطی میں خراش پیدا کرتی ہے اور کبھی کبھی بدہضمی بھی پیدا کرتی ہے نیز گرم مزاج والوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ سرکہ، نمک یا شہد سے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اگر اس کو مناسب مقدار میں استعمال کیا جائے تو کھانا لذیذ ہو جاتا ہے اور جلد ہضم ہوتا ہے۔

پیاز کے استعمال سے پیشاب زیادہ آتا ہے یہ کھانسی، دمہ اور استسقاء میں فائدہ کرتی ہے۔ اس کو پیٹ کے کیڑے مارنے میں استعمال کرتے ہیں نیز وجع المفاصل اور جذام میں بھی اس کا استعمال کرایا جاتا ہے۔ اس کو بیرونی طور پر جلدی داغ دھبوں پر لگانے سے دھبے ختم ہو جاتے ہیں۔ پیاز کے رس کو کان کے درد میں ڈالنے سے فائدہ ہوتا ہے۔

پیاز کا رس ایک تولہ، نوشادر ایک تولہ کے ساتھ کھرل کرکے مچھر اور بچھو کے کاٹے میں لگانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ پیاز کا رس، شہد اور گھی ہر روز استعمال کرنے سے باہ کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس کو ہلکا گرم کرکے ورموں پر باندھنا ورم کو تحلیل کرتا، پکاتا اور پھاڑ کر ورم کو باہر نکالتا ہے۔ پیاز کا رس اور شہد ملا کر آنکھ میں لگانے سے نگاہ کی کمزوری، جالا اور دھند وغیرہ میں مفید ہے۔ اگر کان میں پھنسی ہو، تو پیاز کو بھون کر اس کا پانی کان میں ڈالنے سے آرام ملتا ہے وبائی امراض مثلاً ہیضہ و طاعون کے زمانے میں اس کو سرکہ میں ملا کر کھانا اور اپنے پاس رکھنا امراض وبائیہ سے محفوظ رکھتا ہے۔ جیٹھ کے دنوں میں پیاز کا رس، کالی مرچ اور پودینہ ملا کر پلانا بہت مفید ہے۔ برسات اور گرمیوں کے موسم میں اس کو ہری مرچ اور کاغذی لیموں کے ہمراہ چٹنی کی صورت میں کھانے کے ساتھ استعمال کراتے ہیں۔ پیاز کا رس ایک تولہ، شہد

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

تعلیم منزل۔ میرس روڈ۔ علی گڑھ

فہمیدہ عتیق



آؤ بنائیں گڑیا

گئے ہیں دفتر ابّو اپنے   دیکھ رہی ہیں امّی سپنے
اچّو، بجّو بھی ہیں غائب   آؤ بیٹھیں مالا چننے
گئے ہیں پکچر دیکھنے بھیّا
آؤ بنائیں ہم تم گڑیا

امّی کا لیں سوئی دھاگا   اور اڑائیں تھوڑا کپڑا
پھر کپڑے میں روئی بھر کر   گول مٹول بنائیں مکھڑا
بے بی، آصف، راشد، سیما
آؤ بنائیں مل کر گڑیا

تسّو تم دو ہاتھ بناؤ   گلّو تم بس چٹیا لگاؤ
منّی تم بے کار کھڑی ہو   جلدی سے دو پانو بناؤ
ریشم کی اک چوٹی لائیں
بڑھ جائے تو اس کو کاٹیں

راشد اپنا قلم تو لاؤ   آنکھیں دو گڑیا کی بناؤ
ناک بنائیں چپٹی اس کی   کالے بٹن کی آنکھ بناؤ
کپڑے کترن کے پہناؤ
پھر گڑیا کو خوب سجاؤ

لال ڈوپٹہ سر پہ اڑھا کے   پیلا اک کرتا پہناؤ
پہنا دو ساٹن کا پجامہ   جوتا موزہ بھی تو لاؤ
بن ٹھن کر تیار ہے گڑیا
گڑیا ہے آفت کی پڑیا

۱۹۵ آر بلاک ۵ دستگیر کالونی کراچی

راجندر سنگھ بیدی

ننھا کانت

کانت بھولا بھالا رحم دل لڑکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ اُسے کہانیاں سننے کا بے حد شوق تھا۔ جب وہ اپنی خالہ سے کہانی سُن کر اپنے نرم گدُ گدُے بستر پر لیٹتا تو اُسے طرح طرح کے خواب دکھائی دیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، کانت فرش پر لیٹا ہوا تھا کہ ایک بُڑھیا روتی پیٹتی آئی اور کانت سے کہنے لگی، "بیٹا! بہت دور کا سفر کر کے آرہی ہوں کانٹے چُبھ جانے سے میرے پانو میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام۔ بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ اس



جینے سے تو مرنا بہتر ہے۔ بیٹا! اگر کچھ کھانے کو ہے تو اس بد نصیب بڑھیا کو دے۔"

کانت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دوڑ کر نان بائی کی دُکان پر پہنچا اور روٹیاں خرید لایا۔ جب بڑھیا پیٹ بھر کر کھا چکی تو ڈاکٹر کو بُلوا کر اس کے پانو کی مرہم پٹی کروائی۔ اپنا نرم بستر سونے کے لیے اُسے دیا۔ بڑھیا چارپائی پر لیٹتے ہی خراٹے لینے لگی۔ صبح کو اٹھی تو دیکھا کہ ننھا کانت فرش پر سو رہا ہے۔ سردی سے ٹھٹھرا جاتا ہے۔ ساری رات اسی حالت میں گزار دی ہے۔ بہت افسوس کیا۔ کانت کو جگا کر اس کی پیشانی چومی اور کہا، "بیٹا! تو نے میرے لیے اتنی تکلیف اٹھائی ہے۔ میں بھی اس کا بدلا دیے بغیر نہ رہوں گی۔" اس کے بعد محبت بھرے لہجے میں کہا، "کانت! مانگ کیا مانگتا ہے؟"

کانت نے تھوڑی دیر سوچ بچار کے بعد کہا، "بڑی بی! مجھے پرستان کی سیر کا شوق ہے۔"

بڑھیا نے ہنس کر کہا، "اوہ! یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔ کل صبح سویرے ندی کنارے آجانا، میں تمھیں پرستان کی سیر کرا لاؤں گی۔"

کانت بہت خوش ہوا کہ آخر مدت کی تمنا بر آئی، بڑی مشکل سے دن کاٹا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو ننھا کانت دوڑا دوڑا ندی کنارے گیا۔

ندی کے بیچوں بیچ کنول کا ایک پھول کھلا ہوا دیکھ کے اس نے چلا چلا کر کہنا شروع کیا "اچھی اماں! جلدی آؤ، پرستان کی سیر کراؤ۔"

آن کی آن میں پھول کنارے کی طرف آنا شروع ہو گیا۔ جب پھول کنارے آ لگا تو اس میں سے وہی بڑھیا نکلی۔ کانت اُسے دیکھ کر ڈرا پھر بڑھیا نے جو اصل میں پری تھی، اُسے گود میں لے کر پیار کیا اور کہا "دیکھو، مشرق کی طرف وہ سُرخی سی کیسی ہے؟" کانت نے اُدھر دیکھا۔ پری نے جھٹ پانی میں دھکا دے دیا، اور آپ غائب ہو گئی۔ ندی میں گرتے ہی کانت کو ایک بہت بڑا مگر مچھ نگل گیا اور نگلنے کے بعد ندی کی تہ میں جا پہنچا۔ یہاں ہر طرف ریت بچھی تھی، پر پانی نام کو بھی نہ تھا۔ مگر مچھ نے کانت کو صحیح سلامت باہر اُگل دیا۔ کانت کو ہوش آیا تو اس نے اپنے سامنے اسی بڑھیا کو کھڑے پایا۔ وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔

دونوں چلتے چلتے ایک باغ میں پہنچے۔ وہاں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ خالص دودھ کی نہریں جاری تھیں۔ ایک طرف سونے کا ایک تالاب تھا جس میں ایک فوارہ چھوٹ رہا تھا، فوارے میں سے بجائے پانی کے امرت نکلتا تھا۔ درختوں پر پرندے طرح طرح کی راگنیاں گا رہے تھے۔ کانت نے ایک طرف اشارہ کر کے بڑھیا سے کہا کہ بڑی بی وہ سامنے شعلہ سا کیسا ہے؟ پری مسکرائی اور کہنے لگی، "بیٹا! شعلہ نہیں ہے۔ بلکہ پرستان کا سونے کا محل ہے جس میں ہیرے موتی جڑے ہیں۔ جب سورج کی کرنیں اس پر پڑتی ہیں تو دور سے وہ شعلہ سا معلوم ہوتا ہے۔"

آخر چلتے چلتے دونوں محل میں پہنچ گئے۔ محل کے اندر بھی طرح طرح کے پھول کھلے تھے گلاب موتیا، گیندا، نیلوفر اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ محل کے کمروں میں پردے لٹک رہے تھے۔ پری نے پھولوں کے گرد چھڑی گھما کر کہا، "پھولوں کی پریوں! نکل آؤ۔" اس کا یہ کہنا تھا کہ سب کلیاں چٹکیں اور ان میں سے طرح طرح کی خوبصورت پریاں رنگا رنگ پوشاکیں پہنے نکل آئیں۔ کانت ہکا بکا رہ گیا اور جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑھیا کی جگہ ایک جوان پری کو کھڑے پایا۔ یہ دیکھ کر وہ سہم گیا، مگر اس پری نے بڑی ملائم آواز میں کہا، "کانت ڈرنے کی بات نہیں، میں وہی بڑھیا ہوں جس کو تو نے کھانا کھلایا تھا، تمام پریاں میری رعایا ہیں اور میں ان کی ملکہ ہوں۔"

ملکہ کے حکم پر پریاں ایک بہت بڑی میز لے آئیں جس پر طرح طرح کے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ اس میز کے گرد اگرد سونے کی کرسیاں رکھ دی گئیں۔ پریوں کی ملکہ نے کانت کو درمیان میں بٹھایا اور آپ میز کے ایک طرف بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ملکہ اٹھی، اور پرستان کی بولی میں تمام پریوں کو کانت کی مہربانی کا حال سنایا، جسے سُن کر وہ بہت خوش ہوئیں۔ انھوں نے کانت کو بہت سے کھلونے اور گڑیاں دیں۔ کانت بہت اُچھلا، کودا، ناچا، گایا پریوں نے اُسے طرح طرح کے کھانے کھلائے، پھل دیے کافی رات گذر رہی تو ملکہ نے کہا، "کانت بہت دیر ہو گئی ہے، تمھاری امی جان انتظار کر رہی ہوں گی۔ میں یہ گڑیاں نوکر سے اُٹھوا کر تمھارے گھر پہنچائے دیتی ہوں۔ میری پریاں تمھیں گھر چھوڑ آئیں گی۔" لیکن کانت کا دل یہاں سے جانے کو نہ چاہتا تھا۔ اس نے رو کر کہا، "اوں! اوں! میں تو نہیں جاؤں گا۔"

اتنے میں کانت کی آنکھ کھل گئی۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ نہ وہاں پرستان ہے، نہ محل، نہ پریاں۔ فرش پر لیٹا ہے۔ امی جان سرہانے کھڑی کہہ رہی ہیں، "بیٹا کانت، یہ تم خواب میں کس سے لڑ رہے ہو؟"

(ہمدرد نونہال)

نوگل بھارتی

لوبھی تالاب

بہت سال پہلے کی کہانی ہے۔ افریقہ کے ایک چھوٹے سے گانو میں دو دوست رہتے تھے۔ ایک کا نام تکوما اور دوسرے کا نام کیوکو تھا۔ تکوما بھولا بھالا بے غرض اور بے لوث تھا۔ اس کے بر خلاف کیوکو خود غرض اور مطلب پرست تھا۔ دونوں ہی غریب تھے۔ کسی طرح اپنی گزر اوقات کرتے تھے۔ کبھی کبھی بھوکا بھی سونا پڑتا تھا۔

ایک دن دونوں جنگل سے گزر رہے تھے۔ اچانک تکوما کے دماغ میں خیال آیا اور اس نے اپنے دوست سے کہا "یار! ہم اس جنگل کے درختوں کو توڑ کر ضرورت کے مطابق زمین تیار کر کے کیوں نہ کھیتی باڑی کریں" لیکن کیوکو کو اس کی یہ رائے پسند نہیں آئی۔

اپنے دوست کے ازکار کو اہمیت نہ دیتے ہوئے اس نے خود ہی اکیلے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کیا۔ اُس نے قریب کے گانو سے پھاوڑا، کُدال حاصل کیا اور اپنا کام شروع کیا۔ آخر چھ مہینے کی سخت محنت کے بعد کھیت تیار ہوا۔

یہ بات کیوکو کو جب معلوم ہوئی تو وہ تکوما کے پاس گیا اور کہا "اس کھیت کو دو حصّوں میں تقسیم کرو۔ ایک حصّہ تو لے اور دوسرا مجھے دے۔"

تکوما کو بہت تعجب ہوا۔ اس نے کہا "سارا کام میں نے اکیلے ہی کیا ہے تجھے حصّہ کیسے دوں؟"

"یار! ہم دونوں جانی دوست۔ ایک دوسرے کے سہارے زندگی گزاریں گے۔ اس میں تعجب کیسا" کیوکو نے کہا۔

آخر تکوما نے کھیت کے حصّے کرنے کا یقین دلایا۔ اس وقت بھی کیوکو نے بھولے بھالے تکوما کو پھنسایا۔ کالی اور زرخیز زمین خود لے لی اور بنجر زمین تکوما کو دی۔ تکوما پھر بھی خاموش رہا۔

ہر سال کے مطابق بارش ہوگی۔ اس اُمید پر دونوں نے اپنے اپنے کھیت میں بیج بویا۔ لیکن دونوں کے کھیت میں بارش کا ایک بھی قطرہ نہ برسا۔ دونوں کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ انتظار کرتے کرتے دونوں تھک گئے۔

ایک دفعہ خیالات کے طوفان میں تکوما جنگل میں بہت دور تک گیا۔ اس کے دل پر غم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اچانک اس کا خیال درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے بُڈھے آدمی کی طرف گیا۔ پہلے اُسے بُڈھے سے ڈر لگا پھر ہمت کر کے اس سے پوچھا۔

"حضور! آپ کون ہیں؟ اور اس گھنے جنگل میں کیونکر آنا ہوا؟ کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

تکوما کے حسنِ سلوک سے وہ عجیب بڈھا خوش ہوا اور کہنے لگا "میں بڈھا ضرور ہوں۔ مگر میرے لیے دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں۔ تیرے خلوص سے میں

خوش ہوا۔ تجھے کیا چاہیے، کہہ۔ میں تیری کیسی ہی تمنا ہو پوری کروں گا۔"

تکوما خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔ ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا۔ "حضور! کافی محنت کر کے جنگل میں درختوں کو توڑ کر میں نے ایک کھیت تیار کیا۔ کھیت میں بیج بویا۔ مگر میری کم نصیبی سے کھیت میں آج تک بارش کا ایک بھی قطرہ نہیں برسا۔"

"تیرے دل کی آرزو ضرور پوری ہوگی۔" کبڑے نے کہا۔ "لیکن تجھے ایک کام کرنا ہوگا۔"

"حکم کیجیے حضور!" تکوما نے خوش ہو کر کہا۔ کبڑے نے ایک درخت کی طرف انگلی کر کے کہا۔ "سامنے کے درخت کی ایک پتلی چھڑی توڑ کر لا۔"

تکوما فوراً چھڑی توڑ کر لایا۔ "اب یہ چھڑی میرے بدن پر مار۔" کبڑے نے کہا۔

تکوما نے شرمندگی سے کہا۔ "میں اپنی بھلائی کے لیے آپ پر کس طرح ہاتھ اٹھاؤں۔"

"مجھے چھڑی مارنی ہی ہوگی۔" کبڑے نے غصہ سے کہا۔ مجبوراً تکوما اسے چھڑی سے مارنے لگا۔ ادھر تکوما اس کبڑے کو مار رہا تھا۔ ادھر تکوما کے کھیت میں بارش برس رہی تھی۔ بھرپور بارش ہونے کے بعد کبڑا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

دن کے بعد دن گزر گئے۔ تکوما کے کھیت میں ہری بھری فصل لہلہانے لگی۔ لیکن کیوکو کا کھیت خشک ابھی تک ویسے ہی تھا۔ کیوکو نے زبردستی سے اپنا کھیت تکوما کو دیا۔ اور اس کا کھیت خود لے لیا۔ مگر تعجب کی بات ایسی کہ کیوکو کے قدم کھیت میں پڑتے ہی کھیت پہلے ہی کی طرح خشک ہو گیا۔

کیوکو پھر تکوما کے پاس گیا اور گڑگڑا کر معافی مانگی۔ "بھائی! اپنا کھیت واپس لے لو۔"

تکوما سیدھا سادا تھا۔ اس نے کہا "یار! غم کیوں کر رہا ہے؟ جو ہونا تھا ہوا۔ جو کچھ ہوا وہ بھول جا!

کیوکو کا تیر نشانے پر لگا۔ "تیرے کھیت میں اتنی اچھی بارش کیونکر ہوئی؟ تیرے پاس جادو وغیرہ ہے کیا؟" کیوکو نے رازداری سے پوچھا۔

تکوما نے ساری حقیقت بیان کی اور جہاں کبڑے سے ملاقات ہوئی تھی وہ جگہ بھی اسے دکھائی۔ کیوکو خوشی خوشی گھر لوٹا۔ رات بھر اسے نیند نہیں آئی۔ صبح ہوتے ہی اس نے کبڑے کے پاس جا کر بیدردی سے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کیا اور کہا "خاموشی سے میرے کھیت میں پانی برسا۔ نہیں تو تجھے اپنا ہاتھ دکھاتا ہوں۔"

"میں پانی ضرور برساؤں گا۔ لیکن اس کے لیے تجھے سامنے کے درخت کی باریک چھڑی لا کر مجھے مارنا ہوگا۔ بہت ہی بارش ہوگی۔" کبڑے نے اطمینان سے کہا۔

کیوکو فوراً درخت کی موٹی شاخ توڑ کر لایا اور کبڑے پر برسانے لگا۔ وہ درد سے چلانے لگا۔ مگر اس کے چلانے کی طرف خیال نہ کرتے ہوئے کیوکو اسے پیٹتا ہی رہا۔

ادھر کیوکو کے کھیت میں موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ سارا کھیت پانی میں ڈوب گیا۔ کبڑا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ کیوکو کے کھیت نے تالاب کا روپ اختیار کر لیا۔

کئی سال گزر گئے۔ ان دونوں نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ لیکن وہ تالاب آج بھی آفریقہ میں ہے لوگ اسے لوبھی تالاب کے نام سے پکارتے ہیں۔

پیامی ادبی معمّا

پیامیوں کے بے حد اصرار پر آئندہ ماہ سے پیامی ادبی معمّا شروع کیا جا رہا ہے۔ تفصیلات آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

اشفاق احمد

اللہ کرے اچھا کرے

کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ وہ بہت خوددار رحمدل، اور انصاف پسند تھا اور اسی لیے رعایا بھی اُس سے بہت خوش تھی۔ اُس کے دو شہزادے تھے دونوں ہی خوبصورت اور عقلمند تھے۔

بادشاہ کا ایک وزیر تھا جس کا نام عثمان تھا۔ بادشاہ اُسے بہت چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ بہت ایمان دار اور عقلمند تھا۔ کسی بھی مسئلے کا حل صحیح اور فوراً نکال کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتا تھا۔

ایک دن کی بات ہے، بادشاہ کی ایک انگلی کٹ گئی۔ خون بہنے لگا۔ اس نے حکم دیا کہ مرہم پٹی کرنے کے لیے حکیم کو بلایا جائے اور ساتھ ساتھ وزیر کو بھی اطلاع دی جائے۔ بادشاہ کا حکم ملتے ہی حکیم کو بلایا گیا۔ وزیر بھی جیسے بادشاہ سلامت بہت چاہتے تھے داخل ہوا اور مسکرا کر کہا "اچھا ہوا"۔ بادشاہ غصے سے آگ بگولہ ہو گیا اور کہا "کیا بکتے ہو" وزیر نے کہا "بادشاہ سلامت میں یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ جو بھی کرتا ہے وہ اچھا ہی کرتا ہے"۔ بادشاہ سلامت کی آنکھیں غصے سے لال ہو گئیں۔ "تم مجھے مارنے کے پیچھے پڑے ہو۔ تمھیں شرم نہیں آتی۔ یہاں انگلی کٹی ہے، خون بہہ رہا ہے شدید درد ہے اور تم کہتے ہو اللہ نے اچھا کیا"۔ وزیر کی اس حرکت پر بادشاہ سلامت نے دس سال کی قید کی سزا سنادی۔

اب وزیر دس سال کے لیے قید تھا۔ زمانہ گزرتا گیا۔ وزیر جیل میں اپنی زندگی گزارتا رہا۔ روزانہ معمول کے مطابق بادشاہ اور سپاہی شکار کے لیے جاتے تھے۔ ایک دن اتفاق سے جنگل میں سپاہی بادشاہ سے بچھڑ گئے۔ وہ ایک دوسرے کو ڈھونڈنے لگے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے شام ہو گئی۔ بادشاہ بہت پریشان ہوا اتنے میں کچھ آدمی اُدھر سے نکلے اور بادشاہ سلامت کو پکڑ لیا۔ بادشاہ بہت گھبرایا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو پکارا لیکن ان کا کہیں پتا نہ تھا۔ وہ لوگ بادشاہ کو مندر کی طرف لے گئے۔ انھیں مندر میں بیٹھے بھگوان پر ایک آدمی کی "بلی" چڑھانا تھا اور اسی لیے وہ پکڑ کر لیے جا رہے تھے۔ مندر کے پاس پہنچنے پر "بلی" کرنے والا پنڈت ہتھیار لے کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے پہلے بادشاہ کے پورے جسم کا جائزہ لیا۔ جسم کے ہر عضو کو دیکھا جب انگلیاں دیکھیں تو ایک انگلی کٹی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اور حکم دیا کہ اس آدمی کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ "بلی" کے لائق نہیں ہے۔ اس کی انگلی کٹی ہوئی ہے۔ یہ سن کر بادشاہ کو چھوڑ دیا گیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا وہاں سے فوراً نکل کر محل میں آیا اور اُسی وقت وزیر کو آزاد کر دیا۔

جب وزیر نے پوچھا کہ آپ نے مجھے آزاد کیوں کر دیا تو بادشاہ نے کہا۔

"تم نے سچ کہا تھا اللہ تعالیٰ جو بھی کرتا ہے وہ اچھا ہی کرتا ہے، اگر میری انگلی نہ کٹی ہوتی تو میں آج مارا جاتا۔

سوت کرنی - تاج آباد - ناگپور

انعامی کارٹون

انعامی کارٹون کے سلسلے میں ابھی تک پیامیوں کے خطوط آرہے ہیں۔ اس لیے انعام پانے والے پیامی کا نام آئندہ ماہ میں شائع کیا جائے گا۔

جیمز تھربر
ترجمہ :- مرغوب الزماں

الّو جیسے لیڈر بنایا

ایک وقت کی بات ہے، آدھی رات کو کسی درخت کی ایک شاخ پر ایک الّو بیٹھا تھا۔ دو چھچھوندریں دبے پانو ادھر سے نکلیں۔ انھیں پورا بھروسا تھا کہ اِس اندھیری رات میں انھیں کوئی نہیں دیکھ پائے گا۔ "تم" ! الو نے کہا۔ چھچھوندریں خوف اور حیرت سے وہیں ٹھٹھک گئیں۔ "کون ؟" انھوں نے کہا۔ "تم دونوں اور کون" ! اُلو کی آواز گونجی

حیرت زدہ چھچھوندریں جنگل کی سمت بھاگیں اور انھوں نے جنگل کے سبھی جانوروں کو بتایا۔ "الو سب سے بزرگ اور عقلمند پرندہ ہے کیونکہ وہ سخت اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا ہے اور کسی بھی سوال کا جواب دے سکتا ہے۔" پرندوں کے وزیر کو تو پہلے تعجب ہوا پھر اُس نے کہا "میں چھچھوندروں کی بات کی جانچ کروں گا۔" وہ پرندہ الو کے پاس گیا اور اس کی عقلمندی کا امتحان لینے کی غرض سے اُس نے تین سوالات پوچھے۔

(۱) میرے کتنے پنجے ہیں؟
(۲) "یعنی" کے لیے کوئی دوسرا لفظ؟
(۳) محبوب محبوبہ کے پاس کیوں جاتا ہے؟

الو نے پہلے سوال کے جواب میں کہا کہ "تمھارے پاس دو پنجے ہیں"۔ الو کا جواب بالکل صحیح تھا۔ دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے الو نے کہا "مطلب یہ کہ" یہ جواب بھی صحیح تھا۔ پرندوں کا وزیر حیرت زدہ ہونے لگا۔ تیسرے سوال کے جواب میں الو نے بتایا کہ "محبوب محبوبہ کے پاس اُسے شادی کے لیے منا لینے کی غرض سے جاتا ہے"۔ یہ بات بھی بالکل درست تھی۔

پرندوں کا وزیر لوٹ گیا اور اس نے اعلان کر دیا کہ الو کے بارے میں جو کچھ سنا گیا وہ بالکل صحیح ہے۔ وہ در اصل سب کچھ دیکھ سکتا ہے اور کسی بھی سوال کا صحیح جواب دے سکتا ہے۔ پاس ہی لال لومڑی بیٹھی تھی اس کے چالاک ذہن کو یہ سب ٹھیک نہیں لگا۔ اس نے پوچھا "کیا الو دن میں بھی دیکھ سکتا ہے ؟" اس جاہلانہ سوال پر جنگل کے سبھی جانور ہنس پڑے۔ "بھلا جو رات میں دیکھ سکتا ہے وہ دن میں کیوں نہیں دیکھ سکے گا"۔ انھوں نے لال لومڑی کو مار کر وہاں سے بھگا دیا۔

جنگل کے چرند و پرند نے اپنا ایک سفیر الو کے پاس بھیجا اور اس سے جانوروں کی لیڈری قبول کرنے کی التجا کی۔ ٹھیک دوپہر کے وقت جب سورج آسمان میں چمک رہا تھا۔ الو ان جانوروں کے بیچ آیا۔ الو تو اِس لیے آہستہ آہستہ چل رہا تھا کہ اسے دن میں دکھائی نہیں پڑ رہا تھا لیکن جانوروں نے اس کی آہستہ چال کو شاہانہ چال سمجھا اور اس کے سامنے سلامی دینے لگے۔ الو کی گول گول چمکیلی آنکھوں کو انھوں نے اس کی بزرگی کی علامت سمجھا۔

الو کو دیکھتے ہی مرغی چیخی یہ تو بھگوان ہیں۔

باقی صفحہ ۳۶

قاضی منزل - پورنیہ

شیراز

حج اکبر

رحیمو چاچا اب زندگی کی اس منزل کو طے کر رہے تھے جہاں پہنچ کر انسان کے دل میں ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ خدا کی زیادہ سے زیادہ عبادت کرے تاکہ حشر کے دن رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ وہ روزانہ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر اپنا خوانچہ تیار کرتے اور محلے میں مسجد کے پاس بیٹھ کر بادام اور بھنے ہوئے چنے فروخت کرتے۔ محلے کے بچے ان کے تازہ بھنے ہوئے بادام اور چنے خریدتے۔ انھیں بچوں سے ایک طرح کی رغبت ہو گئی تھی۔ وہ ہر بچے سے پیار و شفقت کا اظہار کرتے۔ بچے بھی ان کی والہانہ محبت کو پا کر بیحد خوش ہوتے۔ ان ہی بچوں میں ایک ننھی بچی تھی سلمیٰ جس کی توتلی آواز کو سن کر وہ بہت خوش ہوتے۔ جس کے چہرے سے معصومانہ بھولاپن ظاہر ہوتا تھا۔ رحیمو چاچا اسے روزانہ اپنی طرف سے تھوڑے سے بادام اور چنے دیا کرتے تھے اور سلمیٰ ان سب چیزوں کو پا کر اپنے ننھے ہاتھوں سے تالی بجا کر خوشی کا اظہار کرتی۔

لیکن اب سلمیٰ جوان ہو چکی تھی اس لیے وہ اب گھر کے آنگن سے باہر قدم نہیں نکالتی تھی۔ سلمیٰ یتیم ہونے کے ساتھ غریب بھی تھی اور بوڑھی نانی کے زیرِ سایہ پل کر جوان ہوئی تھی۔ اس کی نانی گھر گھر جا کر کام کیا کرتی تھی جس سے ان دونوں کے پیٹ کی آگ بجھا کرتی تھی۔ مگر اب نانی پیٹ کی بھوک مٹانے کے ساتھ ہی اس کی شادی کے لیے بھی فکرمند تھیں۔ کئی جگہ رشتے تلاش کیے مگر اس زر پرست دنیا میں دولت کے پجاری بغیر جہیز کے شادی کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ سلمیٰ کا رشتہ طے نہیں ہو پا رہا تھا اور نانی کا یہ خواب کہ سلمیٰ کو دلہن بنا دیکھوں شیشے کی طرح ٹوٹ کر بکھرتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

رحیمو چاچا غریب ضرور تھے لیکن خدا نے انھیں ایک دردمند دل دیا تھا۔ ان کی آخری خواہش تھی کہ وہ ایک بار حج کر آتے اس لیے وہ اپنے خوانچے سے کچھ نہ کچھ بچا کر جمع کیا کرتے تھے۔ اب ان کے پاس اتنی رقم جمع ہو گئی تھی کہ وہ آسانی کے ساتھ حج کر آتے اس لیے وہ حج کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

دوسری طرف وہ سلمیٰ کو بہت چاہتے تھے وہ سلمیٰ کو جب بھی دیکھتے تو انہیں ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ان کی اپنی بچی ہے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ حج کو جانے سے پہلے سلمیٰ کی شادی دیکھ لیں۔ لیکن جب وہ دیکھتے کہ سلمیٰ کی شادی پیسے کی کمی کے باعث رکی پڑی ہے تو وہ بہت اداس ہو جاتے اور بارگاہِ خداوندی میں سلمیٰ کے لیے اچھے رشتے کی دعائیں مانگتے۔ سلمیٰ کی نانی کی اداسی ان سے دیکھی نہیں گئی آخر ایک دن انھوں نے سلمیٰ کی نانی سے کہا،

" تم فکر کیوں کرتی ہو ماں، میں ابھی زندہ ہوں میرے ہوتے ہوئے تمھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس کی شادی کی ذمہ داری لیتا ہوں " اور اسی دن سے وہ سلمیٰ کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ (باقی صفحہ ۳۶)

معرفت: اسٹار اسٹوڈیو منا ہاٹن روڈ آسنسول ۱۳۳۰۱ ء

محمد فاروق کھتری

دھوکا

صبح سویرے کا وقت تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سورج کی کرنیں دریائی سطح پر پڑ رہی تھیں اور ان کے عکس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے دریا کے کنارے سے لے کر افق تک ایک سونے کا چم چم چمکتا ہوا قالین بچھا دیا ہو۔ بڑا ہی خوش گوار ماحول تھا۔ وہیں دریا کے کنارے ایک کچھوا بیٹھا آرام کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک ہرن بھی وہاں پانی پینے آیا۔ وہ بہت جلدی میں تھا کچھوے نے اس سے پوچھا۔ "کہو چودھری ہرن سنگھ کیسے ہو؟"

چودھری ہرن سنگھ نے جواب دیا "بس خدا کا شکر ہے بڑی مزے میں کٹ رہی ہے۔"

"کیا بات ہے آج بہت جلدی میں ہو۔ کہیں جا رہے ہو کیا؟"

"کیا تم نہیں جانتے کچھوے بھائی کہ کل شام جنگل کے بادشاہ شیر کی طرف سے ایک اعلان ہوا تھا۔"

"کیا اعلان بھئی۔ میں نے تو کچھ نہیں سنا۔" کچھوے نے حیرت سے کہا۔

"جنگل کے بادشاہ نے اعلان کیا ہے کہ جنگل کے میدان میں مفت میں عقل بٹنے والی ہے اور عقل کا کوٹہ محدود ہے۔ جو جانور جتنی جلدی آئے گا۔ فائدے میں رہے گا میں بھی اسی میدان میں جا رہا ہوں۔ تاکہ تھوڑی ہی سہی پر عقل مل تو جائے۔ تم بھی چلو نا اور تھوڑی عقل تم بھی لے لو۔" اتنا کہہ کر ہرن سنگھ نے دریا سے تھوڑا پانی پیا اور قلانچیں بھرتا ہوا میدان کی طرف بھاگ نکلا۔

کچھوے نے سوچا کہ کیوں نہ قسمت آزمائی جائے تھوڑی سی عقل مل گئی تو ساری برادری میں عقل مند سمجھا جاؤں گا۔ خوب نام ہوگا۔ یہ سوچ کر کچھوا بھی میدان کی طرف نکل پڑا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد اسے خیال آیا کہ میدان تو یہاں سے بہت دور ہے اور وہ ہرن کی طرح تیز دوڑ بھی نہیں سکتا۔ اسے میدان تک پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔ تب تک تو ساری عقل بٹ چکی ہوگی۔ لہٰذا جانا، نہ جانا برابر ہے۔ عقل بغیر ہی رہ لیں گے۔ اب تک تو رہتے آئے ہیں۔ اسے اپنی سست رفتاری سے بڑی مایوسی ہوئی وہ بے دلی سے اپنے گھر کی طرف لوٹ پڑا۔ وہ ابھی آدھے راستے ہی میں تھا کہ اسے چودھری ہرن سنگھ دکھائی دیا۔ مگر بہت ہی خراب حالت میں۔ جگہ جگہ سے کھال اُدھڑی ہوئی تھی اور اس میں سے گوشت بھی دکھائی دے رہا تھا کئی جگہ سے خون رس رہا تھا۔ کچھوا ششدر رہ گیا۔ اس نے سکتے کے عالم میں ہرن سے پوچھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ اس کی یہ حالت کیسے ہو گئی۔

ہرن سنگھ نے کپکپاتے ہوئی کمزور سی آواز میں کہا "کچھوے بھائی بڑا زبردست دھوکا ہوا۔ بادشاہ کا اعلان دراصل ایک دھوکا تھا۔ شیر، چیتے اور دوسرے خوں خوار درندوں نے پلان بنایا تھا کہ عقل کے مفت بانٹنے کا اعلان کر کے جنگل کے جانوروں کو اکٹھا کیا جائے اور پھر ان پر اچانک حملہ کر کے انھیں کھا لیا جائے۔ خدا کی پناہ کتنا خوفناک منظر تھا بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر نکلا ہوں۔ او... اُز... اُف" ہرن سنگھ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اچانک اسے ایک خون کی قے ہوتی۔ وہ چکرا کر وہیں گرا اور دم توڑ دیا۔

بچو! اس کہانی سے کیا سبق ملتا ہے؟ یہی کہ آج کے زمانے میں کوئی بھی کوئی چیز مفت میں نہیں بانٹتا اور بانٹنے کی بات کرتا بھی ہے تو اس میں اس کا ذاتی مفاد بھی شامل رہتا ہے۔

●●

۱۲-۸ عرفان چیمبرس مولانا آزاد روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

مسلم اقبال

بلا عنوان

اس کہانی کا سب سے اچھا عنوان بتانے والے کو مصنف کی طرف سے ایک سال کے لیے "پیام تعلیم" پیش کیا جائے گا اور دوسرے نمبر کے عنوان بتانے والے کو رسالہ "وقار" پیش کیا جائے گا۔ خط مصنف کو براہ راست بھیجے جائیں۔

مدیر

"دادی اماں! آج کوئی نصیحت آموز کہانی سنایئے۔"
"ٹھیک ہے، آؤ صنوبر، آؤ شاہین، روحی آؤ۔ آؤ — آج تم لوگوں کو ایک اچھی کہانی سناؤں گی۔"
"سنایئے دادی ماں!"
"بچو! آج تمھیں ایسی کہانی سنا رہی ہوں جو ایک جھوٹی کہانی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ جو نصیحت آموز بھی ہے۔ بولو، میرے بیٹے کہو میرے بچے کہو گے نا کہ تم نے اس کہانی سے کیا سیکھا؟"

"ارے دادی ماں! رو رہی ہو، کیا بات ہے، کیا ہوا؟"
"نہیں بیٹے کچھ نہیں" (آنسو پونچھتے ہوئے) دادی ماں نے کہانی شروع کی۔

"بچو! سہارن پور گانو میں حسین رضا نامی ڈاکیا تھا جن کی بیوی کو جمشید پور کے فساد میں بلوائیوں نے صرف اس وجہ سے ہلاک کر دیا تھا کہ وہ اس دن اپنے گانو سے جمشید پور کے لیے آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک اردو کا رسالہ تھا۔ حسین رضا کا ایک لڑکا جمیل اور ایک چار برس کی لڑکی حنا تھی۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ میں اپنے بیٹے کو اونچی تعلیم دلاؤں گا۔ تاکہ کوئی اچھی سی نوکری پائے۔ کہیں وہ بھی میری ہی طرح بی۔ اے تک نہ رہ جائے۔ اور ڈاکیا بن کے کتوں کی طرح در در بھٹکتا رہے۔

لیکن ایک رات خوب زور کی کھانسی اٹھی اور وہ بھی جمیل اور حنا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اپنے پروردگار سے جا ملے۔
جمیل اس وقت نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ پاگل سا ہو گیا۔ گورنمنٹ سے ملے پیسے سے پڑھتا کھاتا رہا۔ وہی جمیل جس پر سارے اسکول کے اساتذہ اور پرنسپل کو فخر تھا۔ اسکول کے لڑکے اس سے دوستی کر کے اپنے آپ پر فخر کیا کرتے۔ لیکن جب اس کے (فائنل) میٹرک کا امتحان دینے کا وقت آیا تو اس کے پاس امتحان کی فیس کے بھی پیسے نہ تھے۔ بہت پریشان ہوا کہ وہ کیا کرے کہ اسے خیال آیا کہ اپنے عزیز دوست عزیز کے پاس چلنا چاہیے جو ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مخلص بھی ہے۔ یہ سوچ کر جمیل اپنے دوست عزیز کے پاس گیا۔ لیکن جانتے ہو اس نے کیا جواب دیا؟
"کیا دادی ماں! اس نے روپے دے دیے نا؟"
"نہیں میرے بیٹے، نہیں دیے بلکہ یہ کہا کہ:
"جان مانگو گے تو جان دے سکتا ہوں، لیکن روپے نہیں، کیوں کہ اب روپے تمھیں کس امید پر دوں۔ تمھارے والدین بھی تو زندہ نہیں کہ ان سے ملنے کی امید ہو۔"
جمیل لاکھ رویا گڑگڑایا، اسے امیدیں دلائیں کہ میں تمھاری ایک ایک پائی ادا کر دوں گا، لیکن اس نے نہ دیے۔ اسی طرح امتحان کے دن گزر گئے۔ جس کا اثر جمیل کے دل پر بہت گہرا پڑا۔

محمد میانہ - کلٹی ضلع بردوان

"ارے دادی ماں! پھر رونے لگیں۔"

"کیا بتاؤں میرے بچے، ایک رات حنا رونے لگی۔ کہنے لگی: "بھیّا مجھے بھوک لگی ہے۔ مجھے کچھ کھانے کو چاہیے۔" کھانا نہ ہونے کی وجہ سے جمیل نے پانی پلاکر اُسے سلا دیا اور دوسری صبح سے گاؤں کے امجد بابو کے یہاں بکریوں کی رکھوالی کرنے لگا۔ کہ اچانک اُس کی طبیعت بہت خراب ہوگئی اور ایسا کمزور ہو گیا کہ اُس سے رکھوالی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ ایک دن پھر حنا رونے لگی۔ کہنے لگی: "بھیّا مجھے روٹی چاہیے۔" بھوک تو جمیل کو بھی لگی تھی۔

جمیل بہت دیر تک سوچتا رہا اور کچھ سوچ کر رحیم بابو کے بنگلے پر گیا۔ وہ اندر داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ گیٹ کے چپراسی نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔ کہا:

"کیا بات ہے؟ کس سے ملنا چاہتے ہو؟"

جمیل نے ساری باتیں چپراسی کو بتا دیں۔

چپراسی نے کہا: "یہیں رہو، میں آتا ہوں۔"

چپراسی نے جاکر اپنے صاحب سے کہا: "بابو! ایک دُبلا پتلا سا لڑکا آیا ہے۔ کہہ رہا ہے: "یتیم ہوں، غریب ہوں۔ آج کئی ہفتوں سے طبیعت خراب ہے۔ اور میری ایک ننھّی مُنّی بہن حنا دو دنوں سے بھوکی ہے یا تو کچھ کھانے کو دے دیں یا کچھ پیسے دے دیں۔"

رحیم بابو نے پاکٹ سے منی بیگ نکالا اور پانچ رُپیے کا نوٹ چپراسی کو دے کر کہا: "جاؤ اسے دے دو۔"

"شاباش! شاباش!! رحیم بابو زندہ باد۔"

سارے بچے ایک ہی بار بول پڑے: "رحیم بابو تو بہت اچھے آدمی تھے۔"

"نہیں میرے بیٹے، انھوں نے رُپیے دیے کہاں؟"

"ارے! وہ کیوں؟"

"جانتے ہو کیا ہوا؟" دادی اماں نے کہا: "ان کا چپراسی رامو رُپیے لے کر جوں ہی جمیل کو دینے کے لیے چلا تھا کہ رحیم بابو کی تیز آواز کان میں پڑی۔ رامو دوڑ کر رحیم بابو کے پاس واپس آیا اور پوچھا: "کیا بات ہے بابو؟"

رحیم بابو بولے: "بات کچھ بھی نہیں۔ رُپیے مجھے دو۔ جاؤ اور جاکر اُس سے پوچھ کر آؤ۔ کیا وہ میٹرک پاس ہے؟"

"ارے دادی اماں! یہ کیا ہوا۔ کیا بھیک بھی اب میٹرک پاس والوں ہی کو ملا کرے گی۔"

دادی اماں کو چپ سی لگ گئی۔

نمک

عطاؤالرحمٰن طارق

چورن زباں نے جو مانگا نمک
کیا دستِ قدرت نے پیدا نمک
ہے ہر زمیں پر یوں تو سستا نمک
نہ پوچھو ضروری ہے کتنا نمک؟
ادھورے ہی رہتے سبھی ذائقے
اگر زندگی میں نہ ہوتا نمک!
تبھی تو یہ شامل ہے پکوان میں
کہ چٹخارے دیتا ہے کیا کیا نمک
اسی بات پر منہ بگڑنے لگا
ہوا دال میں کیسے پھیکا نمک
لو تدبیر ساری اکارت گئی —!
پڑا بھول سے کچھ زیادہ نمک
وفادار ہوں آخری سانس تک
حضور آپ کا میں نے کھایا نمک

۹۴/۴ فاطمہ بائی بنگلہ، کے کے روڈ، جیکب سرکل، بمبئی ۴۰۰۰۱۱

بچوں کی کوششیں



بلّی کے پنجے

چار سوداگر تھے وہ دیہاتوں کے کسانوں سے روئی خریدا کرتے تھے ان روئی کے بنڈلوں کو وہ گودام میں جمع کرتے تھے۔ چوہے ان بنڈلوں کو کاٹ ڈالتے تھے۔ اور روئی کے بنولے کھا لیتے تھے۔

ایک دن سوداگروں نے طے کیا کہ وہ چوہوں کو مارنے کے لیے ایک بلّی خریدیں گے۔ انھوں نے ایک اچھی بلّی خریدی وہ اس کو بہت چاہتے تھے اکثر اس کے ساتھ کھیلا کرتے ہر ایک نے بلّی کے پیر میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں باندھ دی تھیں، ہر پیر ایک سوداگر کے لیے مخصوص تھا۔ ہر گھنٹی مختلف سائز کی تھی، تاکہ وہ یہ جان سکے کہ وہ کس پیر کی دیکھ بھال کر رہا ہیں۔

ایک دن بلّی نے اپنے پیروں سے ایک پیر زخمی۔ وہ درد سے چیخنے لگی۔ جس آدمی کا وہ پیر تھا۔ اس نے زخم پر مرہم لگایا اور تیل میں بھیگے ہوئے کپڑے سے پٹی باندھ دی۔

باورچی خانے میں آگ کے قریب بلّی اسنے کو گرمارہی تھی۔ جب وہ اپنا زخمی پیر بھی گرمانے لگی تو اس کپڑے میں آگ پکڑ لی۔ درد کی وجہ سے بلی گودام کی طرف بھاگی اور کودنے لگی۔ اس طرح روئی کی ساری گٹھریوں میں آگ لگ گئی۔

جب سوداگر گھر واپس آئے تو انھوں نے دیکھا روئی کے سارے بنڈل جل کر راکھ ہوگئے ہیں۔ ان میں سے تین نے چوتھے پر الزام لگایا۔ کہ ہماری ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اسی ٹانگ کی وجہ سے آگ لگی ہے۔ اس لیے تم کو ہمارے روئی کے بنڈلوں کی قیمت ادا کرنی پڑے گی چوتھے شخص نے انکار کر دیا۔ دوسرے تین افراد عدالت گئے اور جج سے شکایت کر دی اور انصاف کرنے کو کہا۔

جج نے کہا بلی کو میرے سامنے پیش کیا جائے۔ جب بلی جج کے سامنے پیش کی گئی تو جج نے اس کے پیروں کو دیکھا اور پھر تینوں آدمیوں سے جنھوں نے شکایت کی تھی پوچھا کہ یہ بلی کیا صرف اسی باندھے ہوئے پیر سے چل سکتی ہے۔

انھوں نے کہا "نہیں"

جج نے پوچھا پھر یہ بلی روئی کے بنڈلوں پر کیسے چل کر پہنچی۔؟

"اپنی تین ٹانگوں سے وہ کودتی ہوئی پہنچی ہوگی" انھوں نے کہا۔

جج نے کہا۔ تین اچھی ٹانگوں پر کودنے سے یہ آگ پھیلی ہے اور یہ تینوں ٹانگیں آپ حضرات ہی کی تھیں۔ اس لیے روئی کی قیمت آپ لوگ چوتھے شخص کو ادا کریں۔ آگ اس ٹانگ سے نہیں پھیلی ہے۔

جن لوگوں نے شکایت کی تھی۔ انھیں چوتھے کی روئی کی قیمت ادا کرنی پڑی وہ پچھتا رہے تھے اور سوچ رہے تھے۔ کاش انھوں نے جج سے شکایت نہ کی ہوتی۔

(انگریزی خیال)

محمد مصطفیٰ اعظمی
جونا بازار اورنگ آباد ۱-۴۳۱

چور لڑکا

ایک مرتبہ کی بات ہے۔ ایک عورت کے چار بچے تھے۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ گرمی میں ایک دن تیسرے پہر وہ اپنے بستر پر سو رہی تھی۔ کچھ عمدہ سیب اور دوسرے پھل اس نے اپنے کمرے میں ایک اونچی الماری کے اوپر ایک ٹوکری میں رکھ دیے تھے۔ سب سے پہلے لڑکے نے انھیں دیکھا۔ وہ بہت لالچی تھا۔ اس نے پھلوں کو چرا کر اکیلے ہی کھا لینے کا پروگرام بنایا۔ وہ چپکے سے کمرے میں گھسا۔ اس نے دیکھا کہ الماری اونچی ہے۔ اور وہ ٹوکری تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ ایک اسٹول لایا اور اس پر چڑھ کر ٹوکری کو پکڑنے کی بہت کوشش کرنے لگا لیکن گر پڑا۔ سارے پھل فرش پر گر گئے۔

ماں نیند سے چونک کر اٹھی اور وہ سب کچھ جان گئی۔ اُس نے لڑکے کو چوری کرنے کے جرم میں دیوار کی طرف منہ کر کے اسٹول پر کھڑا کر دیا اور پھل اپنے دوسرے بچوں کو بانٹ دیے۔ دیکھا بچو تم نے! چور کا کیا نتیجہ ہوا؟"

سعیدہ صفوانہ بیگ۔ کرنول۔

احسان کا بدلہ

سائرہ اپنے چھوٹے سے لان میں بیٹھی ماضی کی یادوں میں غرق تھی اور اس کے دونوں پھول سے بچے شعیب اور شاہد کچھ دوری پر کھیل رہے تھے۔ ننھا شعیب بھاگتا ہوا آیا۔ "ممی ممی وہاں ایک لڑکا بیٹھا ہے"۔ وہ سائرہ سے مخاطب ہوا اور سائرہ اس کے ساتھ اس طرف چلی، دیکھا تو ایک سرخ و سفید رنگت کا بچہ سکے بال سونے کی طرح چمک رہے تھے بیٹھا ہوا تھا ں کی آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں۔ سائرہ کا دل دھڑک گیا۔ اتنا خوبصورت بچہ اندھا تھا۔ "کیا نام ہے بیٹے تمھارا" سائرہ نے پیار سے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ "میرا نام شوکت ہے" وہ لڑکا بولا۔ "کہاں رہتے ہو ماں باپ کہاں ہیں" سائرہ نے ہمدردی سے پوچھا۔ "نہ میرا گھر ہے نہ میرے ماں باپ" لڑکے کی آواز میں سوز تھا۔ سائرہ کا دل رحم کے جذبے سے بھر گیا۔ "کیا کرتے ہو؟" اس نے پوچھا۔ "بیگم جی! میں ایک شیخ جی کے یہاں جھاڑو لگاتا تھا برتن دھوتا تھا اور ان کے چھوٹے لڑکے کو کھلاتا تھا۔ میں اندھا ہوں اس لیے کام ٹھیک سے نہیں کر پاتا تھا شیخ صاحب کی بیگم نے مجھے نکال دیا۔ بیگم جی وہ بہت بے رحم ہیں۔ میں تین دن سے ادھر اُدھر پھر رہا ہوں کہیں کوئی ٹھکانا نہیں" اتنا کہتے کہتے شوکت رو پڑا۔ "نہیں بیٹے رو مت اب تم اِدھر اُدھر نہیں پھروگے میں تمھیں اپنے پاس رکھ لوں گی۔ یہ دونوں جو لڑکے ہیں نا میرے بیٹے ہیں" سائرہ نے کہا۔ "ہاں بیگم جی آپ کے دونوں لڑکے بہت اچھے ہیں انھوں نے مجھے مٹھائی دی ہے۔ یہ دیکھیے" اس نے اپنی مٹھی کھول دی۔ اس میں تین ٹافیاں تھیں۔ سائرہ کچھ نہ بولی وہ پھر نعیم صاحب کو یاد کرنے لگی جو زندگی کے راستے میں اُسے اکیلا چھوڑ کر تین سال پہلے مالک حقیقی سے جا ملے تھے۔ اب ساحرہ کا گذر مکانوں سے ملے کرایہ سے ہوتا تھا۔

سائرہ شوکت کو باہوں میں بھر کر کبھی کبھی پیار سے کہتی "جب میں مروں گی تو وصیت کر جاؤں گی کہ میری آنکھیں میرے بیٹے کو دیدی جائیں" "امّی ایسا مت کہیے" شوکت تڑپ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا، "خدا آپ کا سایا ہم تینوں پر قائم رکھے ویسے بھی آپ نے مجھ پر اتنے احسان کیے ہیں کہ میں قیامت تک نہیں ادا کر سکتا" "پگلا" سائرہ ہنس دیتی "تو بھی ابھی کہتا ہے کہیں ماں بھی بچوں پر احسان کرتی ہے"۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا اور ساحرہ کے جگہ اس کا بڑا بیٹا شعیب بیماری میں فوت کرگیا اس کی سبز آنکھیں نعیم صاحب سے بہت ملتی تھیں۔

ان کے انتقال کے بعد اس کی آنکھیں شوکت کو لگادی گئیں اور سائرہ کے سامنے اس کے مرحوم شوہر اور بیٹے دونوں کی آنکھیں رہنے لگیں۔ وہ کبھی کبھی جب غم سے نڈھال ہو جاتی تو آہ بھر کر کہتی "آہ میں بھی کتنی ڈھیٹ ہوں کہ مرتی نہیں، میں تو سوچتی تھی اپنی آنکھیں شوکت کو دوں گی مگر موت مجھ سے اتنی بے زار ہے کہ مجھے ستا ستا کے مار رہی ہے۔"

سردیوں کی ایک دو پہر تھی سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور سائرہ شاہد اور شوکت کے ساتھ سمندر کے ساحل پر بیٹھی تھی۔ دونوں بچے کچھ دوری پر ریت کے گھروندے بناتے اور آپس میں مذاق کرکے کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ شاید بےرحم سمندر کو ان معصوم بچوں کی یہ اٹھکیلیاں پسند نہیں آئیں ایک ظالم موج زور شور کے ساتھ آئی اور شاہد کو بہا لے گئی مگر شوکت نے شاہد کو کھینچ کر ریت کی طرف دھکا دیا اور خود موج کے ساتھ سمندر سے مل گیا۔ سائرہ نے یہ تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس نے دوڑ کر شاہد کو سینے سے چمٹا لیا اس نے رونے کی کوشش کی مگر آنسو اب اُن آنکھوں میں باقی ہی نہیں تھے۔ صرف ایک ٹیس تھی جو دل میں اُٹھی تھی۔ ہاں شوکت نے اپنا وعدہ نبھا دیا تھا۔

عذرا یاسمین

غفار منزل، نئی دہلی ۲۵

دوست اور دشمن

احمد اور الطاف ہم عمر اور ہم جماعت تھے۔ احمد غریب لڑکا تھا۔ باپ بچپن ہی میں رحلت کرگئے تھے اور امی ہی تھیں جو سخت محنت کرکے اس کا اور اپنا خرچ چلا رہی تھیں۔ احمد کو اپنی غریبی کا احساس تھا اسی لیے وہ دن رات محنت کرتا اور رات کو ماں کے ساتھ اوپر کے کام کرتا۔ اس کے خلاف الطاف ڈاکٹر حسین کا اکلوتا اور لاڈلا لڑکا تھا۔ لاڈ پیار نے اُسے حد سے زیادہ بگاڑ دیا تھا۔ امتحان میں وہ کسی طرح ترقی کے ساتھ پاس ہو ہی جاتا تھا۔ مغرور اتنا تھا کہ اس کی کلاس میں اپنا کوئی نہیں تھا۔ روز آنہ نئے کپڑے بدل کر آتا اُسے احمد سے بہت جلن تھی اور اس غریب کو وہ ہر وقت ستاتا رہتا کوئی ایسا موقع جانے نہ دیتا جب کہ احمد کی غریبی کا مذاق اُڑاتا۔

اس دن سارا اسکول پکنک منانے جارہا تھا۔ پکنک کی جگہ بہت دلکش تھی۔ چاروں طرف ہری بھری پہاڑیاں اور ایک صاف شفاف بہتا دریا۔ لڑکوں کی ضد پر کلاس ٹیچر نے ایک بڑی سی کشتی کرایہ پر لی اور آٹھویں جماعت کے سارے طالب علم اس پر بٹھائے گئے۔ اتفاق سے احمد کو ماسٹر صاحب نے الطاف کے پاس ہی بٹھا دیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا کہ اچانک الطاف بول پڑا "کیوں میاں تمھارے پاس کوئی اور یونی فارم نہیں پانچ سال سے یہی چلا رہے ہو۔ جگہ جگہ پیوند لگا ہے کیا اس حلیے میں اپنی غریبی دکھانا چاہتے ہو۔ ارے بھئی اگر کپڑے نہیں ہیں تو میرے گھر آجاؤ دسیوں جوڑے میرے ادھر اُدھر پڑے ہیں ان میں سے لے لینا کوئی۔" الطاف کی بات پر اس کے ساتھیوں نے زور کا قہقہہ مارا اور احمد آنکھوں میں پانی بھر کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

اچانک قہقہے سب کے حلق میں اٹک گئے۔ الطاف ایک جگر خراش چیخ کے ساتھ ندی میں گر پڑا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ کشتی کسی پتھر سے جو ٹکرائی تو جھٹکا لگا اور الطاف گر پڑا۔ سب ایک دوسرے کا منھ دیکھ رہے تھے، ماسٹر صاحب کی کشتی دور تھی، اچانک احمد کشتی سے پانی میں کود پڑا اور تیرتے ہوئے الطاف کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ الطاف اس سے بھاری

تھا۔ یہی وجہ تھی کہ احمد کا سانس پھولنے لگا اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اس سے پہلے کہ اس کی گرفت کمزور پڑتی ماسٹر صاحب کی کشتی پہنچ گئی اور دونوں کو نکالا گیا دونوں ہی بے ہوش تھے۔ دونوں کو ڈاکٹر حسین کی نرسنگ ہوم میں پہنچا دیا گیا۔ الطاف اور احمد کی مائیں بھی آگئیں۔ احمد کی امّی اپنا آنچل پھیلا کر خدا سے اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے دعا کر رہی تھیں جب الطاف ہوش میں آیا تو اسے ساری حقیقت بتائی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اپنی امّی کا ہاتھ پکڑ کر وہ بولا۔ "امّی اب احمد کیسا ہے پلیز امّی مجھے اس کے پاس لے چلیے" الطاف جب احمد کے پاس پہنچا تو وہ بے ہوش تھا اور اس کی ناک میں آکسیجن پہنچائی جارہی تھی بے اختیار اس کے ہاتھ خدا کے حضور میں دعا کے لیے اٹھ گئے۔ اس نے خدا سے بہت عاجزی سے احمد کے لیے دعا مانگی۔ وہ دعا کر ہی رہا تھا کہ احمد نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولنا شروع کردیں کمرے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی الطاف دوڑ کر احمد سے لپٹ گیا "مجھے معاف کردو بھائی! میں نے تمہیں بہت ستایا ہے خدا کے لیے مجھے معاف کردو میں بہت گناہ گار ہوں" احمد نے مسکرا کر اس کا ہاتھ اپنے کمزور ہاتھوں میں لے لیا۔ "خدا کا شکر ہے تم راہ پر آگئے" اس نے مسکرا کر کہا۔

محمد طارق عابدین
غفار منزل، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

آج کی پڑھائی

تیز پڑھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ کسی کمپنی کے منیجنگ ڈائرکٹر کو روزانہ خطوط کا ایک انبار پڑھنا پڑتا تھا۔ وہ انجینیر تھا اور اُسے انجینیری کی فنی اصطلاحات پڑھنی پڑتی تھیں اس لیے وہ ایک منٹ میں زیادہ سے زیادہ ایک سو ساٹھ الفاظ پڑھ سکتا تھا اور اس کا یہ حال تھا کہ ناول وغیرہ قسم کی ہلکی پھلکی چیزیں بھی وہ تیزی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا تھا۔

اس نے پڑھائی کے ایک ماہر ڈاکٹر سے سبق لینا شروع کیا اس ماہر نے اُسے بہت تیز پڑھنے پر مجبور کیا اور بہت مشکل مضامین پڑھنے کو دیے۔ جب اس کا سبق مکمل ہو گیا تو انجینیر نے اتنی ترقی کی کہ ایک منٹ میں نو سو لفظ پڑھنے لگا۔ ایک اور انجینیر صاحب تھے جو پڑھائی کے دوران کتاب پر دھیان نہیں جما پاتے تھے۔ جب انھوں نے پڑھائی کی رفتار بڑھانے والی مشین کا سہارا لیا تو انھیں مشین کی رفتار کا ساتھ دینے کے لیے کتاب کے صفحے پر اپنی توجہ سختی کے ساتھ مرکوز رکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ تیز پڑھنے سے دھیان جمانے کی قوت بڑھ جاتی ہے

سبھی لوگ تیز سے تیز تر اور زیادہ سمجھداری کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ ان کی آنکھ میں کوئی تکلیف نہ ہو۔

تیز پڑھنے کے لیے بعض مفید مشورے حسب ذیل ہیں۔

پڑھتے وقت اپنا سر دونوں ہاتھوں کے بیچ تھامے رہیے اور سر کو دائیں بائیں مت ہلائیے۔ پڑھتے وقت حرف کے اوپر اُنگلی مت رکھیے۔ خاموش اور پرسکون جگہ بیٹھ کر پڑھیے اور وہ بھی دھیان سے۔ پہلے عبارت کو پڑھ کر لفظوں کے معنی سمجھیے بعد میں لغت دیکھ کر مشکل الفاظ کے معنی کی تصدیق کیجیے۔

محمد عین الحق
اسٹیشن روڈ، کلٹی

ایک چالاک شخص

ایک شہر میں ایک چالاک شخص رہتا تھا۔ ایک دن وہ کھانا کھا رہا تھا۔ کھانے کے وقت اُسے

مکھیاں تنگ کر رہی تھیں۔ مکھیوں سے تنگ آکر اس نے کھانے کی تھالی الٹ دی اور سات مکھیاں اس کی تھالی سے دب کر مر گئیں وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا اور نہایت اکڑ اکڑ کر کہنے لگا "میں بہت بڑا خونی ہوں۔ میں نے ایک وار میں سات کو مار ڈالا ہے۔"

اتفاق کی بات اس وقت قریب سے ایک ڈاکو سردار گزر رہا تھا اس نے جب اس آدمی کی باتیں سنیں تو خیال کیا کہ یہ آدمی بہت طاقتور ہے۔ اس سے بڑا خونی دنیا میں کوئی نہ ہوگا، اس لیے اس کو اپنے گروہ میں شامل کر لینے سے ہماری طاقت بڑھ جائے گی اور ہم بڑی سے بڑی ڈکیتی میں بھی کامیاب رہیں گے۔

ڈاکو کے سردار نے اُسے آزمانے کے لیے اپنے مکان پر دعوت پر بلایا۔ چونکہ اس چالاک شخص کو پہلی بار کھانے کی دعوت ملی تھی اس لیے وہ اپنے ساتھ چند رس گلّے اور ایک عدد چڑیا لے کر سردار کے گھر پہنچا۔ سردار نے اس سے کہا کہ بھائی سنا ہے کہ تم ایک ہی وار میں سات خون کر دیتے ہو اگر یہ سچ ہے تو ذرا اس پتھر کو دبا کر اس میں سے پانی نکال دو اور دوسرا پتھر ندی کے اس کنارے کے پار پھینک دو تو مجھے یقین ہو جائے گا کہ تم واقعی مضبوط اور بہادر انسان ہو۔

اُس چالاک آدمی نے ایک رس گلّا پتھروں کے بیچ میں رکھ کر دبا دیا جس سے اس کا رس پانی کی طرح زمین پر گرنے لگا۔ اس کے بعد تھیلی سے چڑیا کو نکال کر ندی کے اس طرف پھینک دیا۔ چڑیا اُڑ کر ندی کے پار چلی گئی۔ امتحان میں کامیاب ہونے پر اس چالاک آدمی کو ڈاکو نے اپنے گروہ میں شامل کر لیا۔ لیکن جب کبھی ڈکیتی کے لیے اُسے اپنے ساتھ چلنے کو کہتے۔ تو وہ ٹال مٹول کر دیتا۔ آخر ڈاکوؤں کے سردار نے تنگ آکر اُسے ایک روز سوتے میں مار ڈالنے کا پلان بنایا۔ ڈاکو نے ایک رات اس کے کمرے میں گھس کر اس کی چار پائی پر ہزاروں ڈنڈے برسانا شروع کر دیے۔ اس طرح ڈنڈے مار کر انھیں اطمینان ہو گیا کہ اب یہ مزدور مر گیا ہوگا۔ صبح سویرے آکر اُسے پھینک دوں گا۔ یہ سوچ کر جب وہ چلا گیا تو وہ چالاک آدمی چار پائی کے نیچے سے نکل کر بڑے اطمینان کے ساتھ چار پائی پر لیٹ گیا۔

دوسری صبح جب ڈاکوؤں کا سردار اُسے پھینکنے کی غرض سے کمرے میں داخل ہوا تو اُسے زندہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ ڈاکو کو دیکھ کر چالاک آدمی نے کہا کہ تمھارے گھر میں بہت چوہے ہو گئے ہیں آج رات ان چوہوں نے میرے پورے بدن پر اچھل کود کی۔ ان چوہوں کو میں ختم کر دوں گا۔ چالاک آدمی کا جملہ پورا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ ڈاکوؤں کا سردار اس کے سامنے دست بستہ ہو کر کہنے لگا کہ حضور مجھے معاف کر دیں مجھے آپ کی طاقت کا اندازہ ہو گیا اور آج سے آپ ہمارے سردار بن گئے ہم سبھی ڈاکو آپ کے غلام ہیں آپ جو حکم کریں گے ہم لوگ اس کی تعمیل کریں گے۔ سردار کی بات کو سن کر چالاک آدمی نے کہا کہ تم لوگ اگر اپنی بھلائی چاہتے ہو اس خراب کام سے توبہ کر لو اور کسی دوسرے شہر جا کر حلال کی روٹی کما کر کھاؤ۔ ڈاکوؤں نے اپنے نئے سردار کی بات مان لی اور انھوں نے چوری ڈکیتی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی۔

محمد نواب عتیق اطہر زاہدی
اردو ہائی اسکول، رانی گنج، بردوان (ویسٹ بنگال)

ایمانداری

ہواؤں کو چیرتی ہوئی ریل منزل کی طرف بھاگ رہی تھی۔ ڈبے کے سارے لوگ نیند کی آغوش میں تھے۔ لیکن میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ تین روز کے بعد آخر ریل اپنی منزل پہ پہنچی۔

سب لوگ ریل سے اُتر رہے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ میں بھی اُترا۔ مجھے شدّت کی بھوک لگی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے باہر ایک ہوٹل تھا۔ وہاں میں نے اپنی بھوک مٹائی۔ اس کے بعد شہر میں نوکری کی تلاش میں نکلا۔ مگر جہاں جاتا، مایوس ہو کر لوٹتا۔ کوئی کہتا کہ پردیسی کو نوکری نہیں دیں گے۔ دکاندار کہتا کہ میں تم پر کیسے بھروسا کروں۔ اگر میں تمھیں نوکری دوں اور تم میرا سامان لے کر بھاگ گئے تو میں تمھیں کہاں تلاش کروں گا۔ اس وجہ سے میں تمھیں نوکری دینے سے مجبور ہوں۔ اس طرح میں دن بھر نوکری کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ سورج ڈوب رہا تھا اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ میں انجانے راستے پر تیز قدموں سے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ اُس دن میں نے رات پلیٹ فارم پر گزاری۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں، کیا کروں۔ یہاں میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔ میں اپنی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ ریل کی گڑگڑاہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ ریل رُکی اچانک ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، میں چونکا۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو ایک آدمی اپنے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اسے اُٹھا کر میری کار پر رکھ دو میں گھبرا گیا۔ لیکن مجھے ماں کی یہ بات یاد تھی کہ بیٹا کبھی کسی کی بات کو ٹھکرانا نہیں اور میں نے اس کا سامان اُٹھا کر اس کی گاڑی میں رکھ دیا۔ سامان رکھ کر میں واپس چلنے والا ہی تھا کہ اس آدمی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اپنی محنت کی کمائی تو لیتے جاؤ۔" لیکن میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ وہ زبردستی مجھے دو روپے کا نوٹ تھما کر اپنی گاڑی پر بیٹھ گیا اور اپنے ڈرائیور کو چلنے کے لیے اشارہ کیا۔ سیٹھ کی گاڑی دھول اُڑاتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بھاگ رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے گاڑی میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں جانے کے لیے جیسے ہی گھوما میرا پیر کسی چیز سے ٹکرایا۔ اور دھپ کی آواز بھی ہوئی۔ میں چونک گیا۔ میری نظر جب اپنے پیروں پر پڑی تو ایک نیا بریف کیس وہاں نظر آیا۔ اور جھٹ میں بریف کیس اُٹھا کر ایک طرف چل پڑا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر بریف کیس کھولا۔ کھولتے ہی میں چونک گیا۔ اُس میں کچھ زیورات تھے جو بہت قیمتی تھے۔ اُسے دیکھتے ہی میری نیت بدل گئی۔ لیکن دوسری جانب میری ماں کی آواز میرے دماغ میں گونج رہی تھی کہ بیٹا، "اپنی جان دے دینا مگر ایمان پر آنچ نہ آنے دینا" اس لیے میں نے فوراً بریف کیس بند کر دیا۔ میں اس سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اِس بریف کیس کو سیٹھ کے پاس کس طرح پہنچایا جائے۔ پھر میں نے بریف کیس کھولا۔ کھولتے ہی اس بار میری نظر ایک کارڈ پر پڑی جس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ یہی کارڈ مجھے اُس سیٹھ کے پاس پہنچائے گا۔ اُس کارڈ میں اس کا پتا تھا۔ اُس کارڈ کے پتے پر میں چل پڑا۔ ڈرائیور نے گاڑی ایک حویلی کے پاس روک دی اور کہا یہ رہا سیٹھ کا گھر۔ میں نے بریف کیس اٹھا کر ڈرائیور کو اس کا کرایہ ادا کیا۔ اور میں حویلی کے اندر داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سیٹھ بہت ہی پریشان ہے اور میں نے دبی زبان میں "سیٹھ جی" کہہ کر آواز دی سیٹھ چونک گیا۔ اور جھٹ اُن (۲) کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ ارے تم! میرا بریف کیس! تمھیں بتا کیسے ملا؟ میں نے اُسے بتایا کہ پتا مجھے بریف میں رکھے کارڈ سے معلوم ہوا۔ میں نے کہا "بریف کیس کھول کر دیکھ لیجیے۔ سب سامان ٹھیک ہے نا! نہیں بیٹے، اگر تم بے ایمان ہوتے تو یہ میری امانت مجھے واپس نہ کرتے۔ میں تمھاری ایمانداری پر حیران ہوں۔ تم نے میری عزت بچا لی بیٹے۔ کل میری بیٹی کی شادی ہے۔ اس بریف کیس

میں شادی کے زیورات تھے جو تم نے لاکر واپس کیے ہیں۔ اگر زیور نہیں ملتے تو میں کیا منھ دکھاتا آج سے تم میرے بیٹے ہو میں تمھیں اپنے کاروبار میں شامل کروں گا۔ میں تمھاری ہر طرح مدد کرکے تمھیں بڑا آدمی بناؤں گا۔ آؤ میرے ساتھ" سیٹھ نے بڑے فخر سے کہا۔ اور میرے کانوں میں بار بار میری ماں کی آواز گونج رہی تھی کہ بیٹا سب کچھ کھو دینا مگر ایمان نہ کھونا۔

فضل قدر
درجہ نہم، مسلم ہائی اسکول، پٹنہ

بقیہ صفحہ ۲۵ کا

سب جانور چلا اٹھے، "الو بھگوان کی جے"۔ اب جہاں کہیں بھی الو جاتا سبھی چرند و پرند اس کے پیچھے چلتے۔ دن کا وقت، الو کہیں جگہ پر ٹکرایا۔ مگر اکثر جانوروں نے اسے اس کی لیلا سمجھ کر اپنے سر بھی ٹکرائے۔

آگے آگے الو اور پیچھے پیچھے تمام چرند و پرند۔ جلوس آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ سامنے سے ایک ٹرک تیز رفتار سے آرہا تھا۔ باز نے اُسے دور سے ہی دیکھ لیا اور چلایا "خطرہ ....." پرندوں کا وزیر الو کے پاس آیا اور بولا، "حضور عالی! سامنے خطرہ ہے، کیا آپ خوف زدہ نہیں ہیں؟" الو نے کہا نہ "کون، کیسا خطرہ؟" کیونکہ ٹرک تو اُسے نظر نہیں آرہا تھا۔

ٹرک آیا اور گزر گیا۔ تمام چرند و پرند کچلے گئے، کچھ مرے، کچھ زخمی ہوئے۔ الو بھی مارا گیا۔ پرندوں کا بھرم انھیں کافی مہنگا پڑا۔

بقیہ صفحہ ۲۶ کا

خدا خدا کرکے ایک جگہ سلمیٰ کا رشتہ طے ہو گیا مگر سلمیٰ کے سسرال والے دو ہزار نقد سے کم لینے کو تیار نہ تھے۔ انہیں اس بے حس اور بے رحم زمانہ پر رونا آگیا جہاں انسانیت دم توڑ چکی تھی اور لوگ دولت کو پوجنے کی حد تک چاہنے لگے تھے۔ مجبوراً حالات نے انھیں راضی کر لیا۔

آخر وہ دن آگیا جب باراتی سرخ جوڑے میں ملبوس سلمیٰ کو دلہن کے روپ میں لے جانے کے لیے آگئے۔ رخصتی سے پہلے رحیمو چاچا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہو گئی۔ انھیں ایسا لگ رہا تھا کہ سلمیٰ ان کی اپنی بچی ہے، اگر آج ان کی اپنی بچی ہوتی تو کیا وہ اس سے کم اس کی شادی میں خرچ کرتے؟ لیکن سلمیٰ تو انھیں اپنی بیٹی سے زیادہ اپنی لگ رہی تھی۔ ادھر سلمیٰ کو رحیمو چاچا کے روپ میں باپ جیسا شفقت بھرا سہارا مل گیا تھا۔ انھوں نے اسے گلے سے لگا لیا اور باوجود ضبط کے آنسوؤں کو روک نہ سکے ان کی زبان جیسے جکڑ گئی ہو بہت ہی کوشش کے بعد آہستہ سے رندھی ہوئی آواز میں بولے۔

"جاؤ بیٹی ـــ! اب اپنا گھر بساؤ حقیقت میں وہی گھر تمہارا اپنا گھر ہے .... خدا تمہیں اور تمہارے شوہر کو ہمیشہ خوش رکھے۔" اور سلمیٰ ان کے گلے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جو سبھوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے سلمیٰ سب کو روتا چھوڑ کر اپنے سسرال چلی گئی۔

جب سلمیٰ چلی گئی تو انھیں ایسے لگا کہ انھوں نے حج کرنے کے لیے جتنے پیسے جمع کیے تھے اگر ان پیسوں سے وہ حج کر آتے تو اتنی خوشی نہیں ملتی جتنی کہ انہیں آج اس شادی کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے بعد مل رہی ہے ـــ اور ان کے دل میں یہ احساس جاگا کہ وہ آج ہی حج کے فرائض کو ادا کرکے اپنے گھر لوٹے ہیں۔ ـــ اور پھر وہ آنسوؤں کو اپنی قمیص کے دامن میں جذب کرکے مسجد کے جانب چل پڑے تاکہ شکرانے کی نماز ادا کرسکیں

●●





Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage
Regd. No. D(SE)-043 October 19..

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025



بچوں کی مذہبی کتابیں

ہمارا دین (اول، دوم، سوم)	سید شہاب الدین دسنوی (فی حصہ)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اول دوم)	عبد الواحد سندھی (فی حصہ)	۴/۰۰
اسلام کے مشہور امیر البحر	" "	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ (اول، دوم)	" " (فی حصہ)	۴/۵۰
قرآن پاک کیا ہے؟	" "	۳/۰۰
اسلام کیسے شروع ہوا؟	" "	۴/۵۰
رسولِ پاک	" "	۳/۵۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۳/۰۰
رسولِ پاک کے اخلاق	" "	۳/۰۰
اللہ کے خلیل	" "	۲/۵۰
تحسین القرآن	تالیف: خواجہ سید اطاہر سیف مدنی	۴،۵۰
منہاج القرآن	" "	۴/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۵۰
عقائد اسلام	" "	۱/۵۰
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰
آں حضرتؐ	" "	۱/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبد الحیٔ فاروقی	۲/۷۵
نبیوں کے قصے	" "	۲/۲۵
ہمارے رسولؐ	" "	۳/۰۰
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۳/۰۰
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی	۱/۵۰
سرکارِ دو عالم	محمد حسین حسان	۳/۰۰

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دہلی


پیامِ تعلیم

بچوں کے لیے عبدالواحد سندھی جامعی کی کتابیں

پھر میں چگوں کیا خاک
نہایت آسان زبان میں
چھوٹے بچوں کے لیے
ایک کہانی
قیمت: ۱/۵۰

پان کھا کر، طبلہ بجا کر رام نا
ایک مزے دار کہانی
جو خاص طور سے چھوٹے بچوں کے
لیے لکھی گئی ہے
قیمت: ۱/۵۰

تاک دنا دن تا کے سے
چھوٹے بچوں کے لیے
چھوٹے چھوٹے جملوں میں لکھی گئی
مزے دار کہانی
قیمت: ۱/۵۰

بکڑ ڈم کے کو
ایک گدھے نے شیر کو بھگا دیا
بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چھوٹے
بچوں کے لیے۔ قیمت ۱/۵۰

پانچ بونے
پانچ کام چور بونوں
کی کہانی چھوٹے بچوں کے
لیے۔ قیمت: ۱/۵۰

ہپتو چپتو
یہ کہانی بھی چھوٹے بچوں
کے لیے لکھی گئی ہے، انھیں
کی زبان میں۔ قیمت: ۱/۵۰

روٹی کس نے پکائی
چھوٹے بچوں کے لیے انھی
کی زبان میں ایک دلچسپ
کہانی۔ قیمت: ۲/۵۰

بی پنڈکی اور کوا
چھوٹے بچوں کے لیے
آسان زبان میں لکھی
گئی ایک دلچسپ کہانی
قیمت: ۱/۵۰

چیونٹی رانی
کہانی کی کہانی اور معلومات
کی معلومات۔
قیمت ۱/۵۰

جادو کا گھر
چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان
میں لکھی گئی ایک مزے دار
کہانی۔ قیمت ۱/۵۰

بچوں کی کہانیاں
ایک کتاب اور
کئی سب
کہانیاں
سب کی سب مزے دار
قیمت: ۱/۵۰

مدو رانا پردیس چلے
مگر کیسے چلے؟ اور راستے میں کیا
کیا ہوا، یہ تو پڑھنے
سے ہی پتا چلے گا۔
قیمت:
۱/۵۰

قیمت: ۱/۵۰



دہلی
علی گڑھ
بمبئی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

نومبر ۱۹۸۲ء جلد ۲۰ شمارہ ۱۱

اڈیٹر — ولی شاہجہانپوری

قیمت : ۲ روپے // سالانہ : ۱۸ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

بچوں سے باتیں

اکتوبر کے شمارے کے لیے آپ کو انتظار کرنا پڑا تھا، اس کا ہمیں افسوس ہے۔ لیجیے اس بار آپ کا پیامِ تعلیم وقت پر حاضر ہے اور امید یہی ہے کہ آیندہ بھی اسی طرح صحیح وقت پر شائع ہوتا رہے گا۔ انشاء اللہ۔

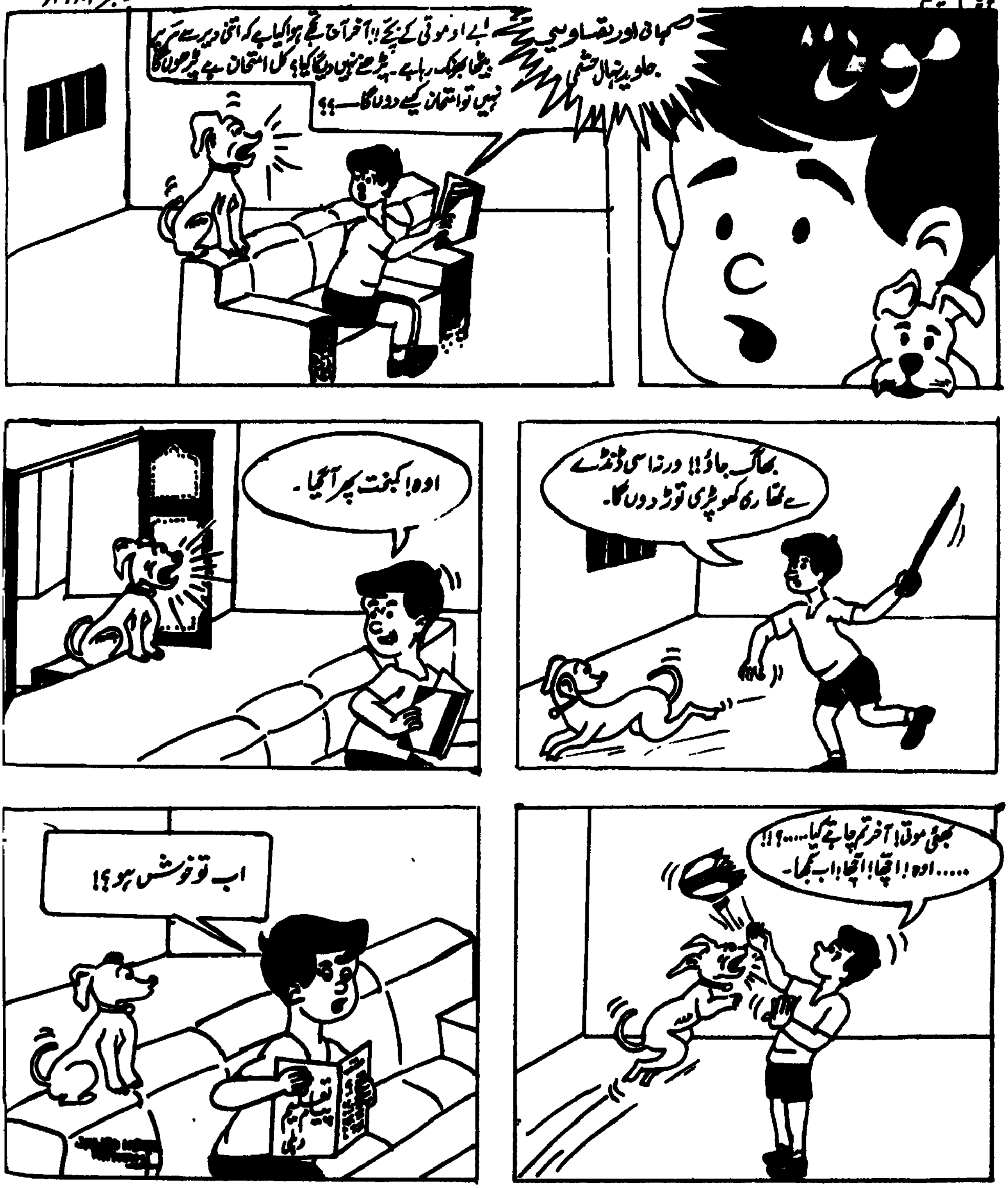
آپ دیکھیں گے کہ نومبر کا پیامِ تعلیم عمدہ عمدہ کہانیوں نظموں اور معلوماتی مضمونوں کے ایک حسین گلدستے کی صورت میں جلوہ گر ہو رہا ہے۔ کہانیوں میں حمید عثمانی کی "شیشے کے ٹکڑے" بھی "دو شکاری" کی طرح ایک دلچسپ کہانی ہے جو آپ کو یقیناً پسند آئے گی۔ ڈاکٹر لطافت علی خاں کا مضمون "ادرک استعمال کرنے کے فائدے" تو آپ کے ساتھ ساتھ آپ کے بڑوں کی بھی پسند کی چیز ثابت ہوگا۔ اس میں صحت سے متعلق روزمرہ کام آنے والی باتیں بتائی گئی ہیں۔

عبداللطیف اعظمی صاحب نے ہماری فرمایش پر پیامِ تعلیم کے پرانے ادیب و محسن جناب حفیظ الدین صاحب کے بارے میں ایک بڑا اچھا مضمون آپ کے لیے لکھا ہے جو اس سلسلۂ مضامین کی پہلی قسط کی صورت میں پیش ہے۔

آپ کو اس بار پیامِ تعلیم میں ایک نئی چیز دیکھنے کو ملے گی۔ "پیامی ادبی معمّا"۔ پیامیوں نے جس طرح اصرار کر کے یہ سلسلہ شروع کرایا ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ اسے قائم رکھنے میں بھی ہمیں اُن کا تعاون ملے گا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی بمبئی برانچ کے ایک سابق انچارج جناب احسان الحق صاحب جو آپ کے پیامِ تعلیم میں بڑے اچھے اچھے مضامین، کہانیاں اور ڈرامے لکھتے رہے ہیں، افسوس! ۱۱ر اکتوبر ۱۹۸۲ء کو ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ ہم اپنے سالمتی کے پس ماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

پرنٹر پبلشر سیّد احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا


موتی
کہانی اور تصاویر جاوید نہال حشمی
ابے او موتی کے بچے!! آخر آج تجھے ہوا کیا ہے کہ اتنی دیر سے تو یہ بیٹھا بھونک رہا ہے۔ پڑھنے نہیں دیگا کیا؟ کل امتحان ہے پڑھوں گا نہیں تو امتحان کیسے دوں گا؟؟
بھاگ جاؤ!! ورنہ اسی ڈنڈے سے تمہارہ کھوپڑی توڑ دوں گا۔
اوہ! کمبخت پھر آگیا۔
بھئی موتی! آخر تم چاہتے کیا......؟!!
.....اوہ! اچھا! اچھا! اب سمجھا۔
اب تو خوش ہو؟!
پیام تعلیم
دہلی

محمد انوار احمد





موسم



بولو کون سا موسم اچھا   سردی گرمی یا برسات
موسم میں سردی کے ہم سب   سردی سے ٹھٹھریں دن رات
گرمی ہو تو کھٹمل مچھر   اتنے جیسے ہو بارات
بارش اپنے ساتھ میں لائے   کیچڑ پانی کی سوغات
موسم اصل میں سب سے اچھا   جس میں برابر ہوں دن رات



موسم اچھا فصلِ بہاری   جس کی اچھی ہے ہر بات
پھول ہیں کھلتے رنگ برنگے   پھلوں کی ہوتی ہے اِفراط
لیکن اس سے بڑھ کر موسم   سنو سمجھ کر تم یہ بات
بچپن کا بھی موسم ہے اِک   اس کی نہ پوچھو تم کچھ بات



اس کی ہے ہر بات نرالی   اس کی انوکھی ہے ہر بات
دیکھو اس کو یوں نہ گنواؤ   سن لو بچے کی ہے یہ بات
اس میں گر کچھ سیکھ نہ لوگے   سمجھو ہوگی تمہاری مات
پھر تم اس کو یاد کروگے   پھر یہ آ نہ سکے گا ہات

بولو کون سا موسم اچھا
سردی گرمی یا برسات



(بہ شکریہ "نونہال" کراچی)

درستی خاں

مناظر صدیقی

بہت دن ہوئے کسی ملک میں ایک کسان رہا کرتا تھا۔ یوں تو اللہ کا دیا اس کے پاس سب کچھ تھا۔ اپنی زمین، اپنا ہل اپنے بیل، غرض کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ بس کمی تھی تو یہ کہ اس کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ اور اس کی بیوی دونوں ہی دن رات اللہ سے دعائیں مانگا کرتے کہ اللہ میاں ان کے ہاں بھی اولاد بھیج دے۔

کسان اب بوڑھا ہو چلا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ وہ جب مر جائے گا تو ان زمینوں پر کون کھیتی باڑی کرے گا! ان بیلوں کو کون چرائے گا اور کون اس کے مکان کی حفاظت کرے گا! اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ اس نے ایسی کون سی غلطی کی ہے جو خدا کو اتنی ناپسند ہے کہ وہ اس کی دعائیں قبول نہیں کرتا۔ کسان کا خیال تھا کہ کوئی آدمی جیسے ہی دعا مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ اسی وقت قبول کر لیتا ہے۔ کبھی وہ سوچتا کہ شاید اُسے دعا مانگنے کا صحیح طریقہ ہی نہیں آتا۔ لیکن یہ سب صحیح نہیں تھا۔ دراصل اللہ تعالیٰ کا ہر کام اُس کی مصلحت کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی اللہ ہی اس بات کو بہتر سمجھتا ہے کہ اس کے بندوں کے لیے کون سی بات کس وقت ہونی چاہیے۔ جب وہ وقت آجاتا ہے تو بندوں کا کام بھی پورا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا اور صحیح وقت آگیا تو کسان کے ہاں بھی اللہ میاں نے ایک ننھا منا بچہ بھیج دیا۔ لیکن جب کسان نے اپنے بیٹے کو دیکھا تو اسے خوشی کے بجائے افسوس ہوا، کیوں کہ اس کا بچہ قد میں صرف ایک انگوٹھے کے برابر تھا۔ کسان سوچنے لگا کہ یہ بچہ یقیناً زیادہ بڑا نہ ہوگا۔ ابھی اگر یہ انگوٹھے کے برابر ہے تو بڑا ہو کر زیادہ سے زیادہ ایک یا ڈیڑھ فٹ کا ہو جائے گا۔ پھر اتنا ننھا منا سا آدمی بھلا کھیتی باڑی کیسے کرے گا۔ بیل تو اس کے قابو میں نہیں آئیں گے، پھر بھلا یہ زمینوں میں ہل کیسے چلائے گا! کھیتوں سے وزنی گٹھے اور اناج گھر تک کیسے پہنچائے گا۔

کسان تو اپنے بیٹے کو دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوا تھا۔



لیکن کسان کی بیوی اپنے بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ بچہ ابھی صرف ایک انگوٹھے کے برابر ہے تو کیا ہوا جیسے جیسے اس کی عمر بڑھے گی ویسے ویسے اس کا قد بھی بڑھتا رہے گا۔ یہی بات اس نے کسان کو بھی سمجھائی۔ آہستہ آہستہ کسان کو بھی صبر آگیا۔ ویسے بھی ماں باپ کے لیے تو ان کی اولاد ہی دنیا بھر میں سب سے اچھی ہوتی ہے۔ کسان بھی اپنے بیٹے سے محبت کرنے لگا۔ کچھ دن بعد تو یہ حالت ہوگئی کہ وہ ہر وقت اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ اس طرح دو تین سال گزر گئے بچہ اب بہت باریک سی آواز میں باتیں کرنے لگا تھا۔ لیکن عجب بات یہ تھی کہ اس کا قد بال برابر بھی نہیں بڑھا تھا۔

اس کا قد اب بھی صرف ایک انگوٹھے کے برابر تھا۔ کسان اس بچّے کو دیکھ دیکھ کر بہت پریشان ہو جاتا۔

ایک دن کسان جب اپنے کھیتوں پر کام کرنے کے لیے گھر سے نکلنے لگا تو بچّے نے بھی ضد کی کہ وہ بھی ساتھ جائے گا پہلے تو کسان نے اپنے بیٹے کو بہت سمجھایا کہ وہ کھیتوں پر نہ جائے، کیوں کہ وہ بہت ننھا منّا سا ہے۔ اُسے اگر کھیلنے کے لیے زمین پر چھوڑ دیا گیا تو وہ بیلوں کے پیروں کے نیچے دب جائے گا اور اگر ساتھ ساتھ گھومنے کے لیے کہا گیا تو وہ تھک جائے گا، لیکن بچّہ کسان کی یہ بات سن کر رونے لگا۔ بچّے کو روتا دیکھ کر کسان سے نہ رہا گیا۔ اس نے بچّے کو اپنے ساتھ لے لیا۔ بچّہ اتنا ننھا منّا تھا کہ کسان اُسے گود میں بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس لیے کسان نے اُسے نئی واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

کھیت میں پہنچنے کے بعد کسان کو خیال آیا کہ اپنے ننھے منے بچّے کو اگر وہ جیب میں رکھے رہے گا تو گرمی سے بچّے کی جان ہی نکل جائے گی، کیوں کہ اُسے تو ہل چلانے کے لیے گرمی اور دھوپ میں دن بھر رہنا ہوگا۔ اس لیے وہ واسکٹ پہن کر تو ہل چلا نہیں سکتا۔ کہیں نہ کہیں واسکٹ کو تہ کر کے رکھنا ہی ہوگا۔ تہ کی ہوئی واسکٹ میں گرمی بھی ہوگی اور ہوا بھی نہیں پہنچے گی، جس سے بچّے کا دم گھٹ جائے گا۔ یہ سب باتیں سوچ کر کسان نے اپنے بچّے کو واسکٹ کی جیب سے نکال کر ایک گھنی سایہ دار جھاڑی کے نیچے بٹھا دیا اور بچّے کو سمجھا دیا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو وہ اس جھاڑی سے باہر نہ نکلے۔ پھر وہ اپنے کام میں لگ گیا۔

دوپہر کو جب کھانا کھانے کے لیے کسان نے ہل چلانا بند کیا اور اُس جھاڑی کی طرف واپس آیا جہاں اس نے اپنا بچّہ چھوڑا تھا تو اسے ایک عجیب ہی منظر دکھائی دیا۔ اُس جھاڑی کے پاس ایک اتنا بڑا آدمی کھڑا تھا کہ کسان پہلی نظر میں اس کی شکل بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کی ٹانگیں کسان کو ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے دو بڑے بڑے درخت پاس پاس کھڑے ہوں۔ اب کسان نے سر اٹھا کر اس آدمی کو دیکھا، تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ آدمی تو درخت سے بھی اونچا ہے۔ اس آدمی کی ہتھیلی کھلی ہوئی تھی جس پر کوئی چیز رکھی تھی اور لمبا آدمی بڑے غور سے اس چیز کو دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو کسان کو وہ چیز نظر نہ آئی، لیکن اسی وقت لمبے آدمی نے چٹکی سے ہتھیلی پر رکھی ہوئی چیز کو اٹھایا تو وہ کسان کا ننھا منّا بچّہ تھا۔ کسان تو اُس آدمی ہی کو دیکھ کر ڈر رہا تھا۔ اب جو کسان نے اُس آدمی کی چٹکی میں اپنے بچّے کو دیکھا تو ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ کسان سمجھ گیا کہ وہ کوئی دیو ہے۔ پھر اس دیو نے پلٹ کر کسان کی طرف دیکھا۔ دیو کسان کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ اس ننھے منّے بچّے کا باپ ہے۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے کسان سے کہا :



"بڑے میاں! ڈرو نہیں۔ یہ تمھارا بیٹا ہے نا، ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اسے پالیں گے پھر یہ بھی ہماری طرح لمبا چوڑا اور طاقت ور بن جائے گا۔ بولو، منظور ہے؟"

دیو نے تو یہ باتیں مسکراتے ہوئے کی تھیں، پھر بھی اس کی آواز کسان کو اتنی خوف ناک اور ڈراونی معلوم ہوئی کہ کسان کی زبان سے ڈر کے مارے کوئی آواز نہ نکلی۔ اُس نے صرف گردن ہلا دی جیسے سر کے اشارے سے دیو کو اپنا بیٹا لے جانے کی اجازت دے رہا ہو۔

دیو بچّے کو لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ وہاں اس کی بیوی اور بچّے بھی اس ننھے منّے بچّے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

اسے اپنے یہاں کی چیزیں کھانے کو دیں۔ پھر وہ بچہ وہیں رہنے لگا۔ اچھی اچھی غذائیں کھا کر وہ خوب تندرست ہوگیا۔ اصل میں بات یہی تھی کہ کسان ایک غریب آدمی تھا۔ اُس کے پاس اتنی دولت نہیں تھی کہ وہ اپنے بچے کو اچھی اچھی چیزیں کھلاتا، لیکن اب وہ جن لوگوں کے پاس رہ رہا تھا، ان کے پاس بہت روپے تھے۔ وہ لوگ حقیقت میں دیو بھی نہیں تھے۔ بس لمبے چوڑے تندرست آدمی تھے۔ کسان چوں کہ خود بھی دبلا پتلا چھوٹے سے قد کا آدمی تھا، اس لیے وہ اپنے کھیت میں اس لمبے چوڑے آدمی کو دیکھ کر دیو ہی سمجھا تھا۔ چوں کہ وہ اسے پہلے ہی دیو سمجھ چکا تھا اس لیے اسے اس آدمی کا قد بھی درختوں سے اونچا نظر آیا۔ حالاں کہ یہ صرف وہم ہی تھا۔

کئی سال تک ان آدمیوں کے پاس رہنے کے بعد کسان کا ننھا منا بچہ ایک تندرست، طاقت ور اور خوب صورت جوان آدمی بن چکا تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے اصلی ماں باپ کون ہیں اور وہ اسے اپنے ساتھ کیسے لائے تھے۔ بچہ جوان ہوگیا تو ایک دن انھوں نے اسے بتا دیا کہ اس کے اصلی ماں باپ کون ہیں اور وہ اسے اپنے ساتھ کیسے لائے تھے۔ اب اسے چاہیے کہ وہ جا کر اپنے اصلی ماں باپ سے بھی ملے۔ چنانچہ وہ بچہ جو اب جوان لڑکا بن چکا تھا اپنے ماں باپ کے پاس پہنچا۔

لڑکا جب اپنے باپ کے پاس اس کے کھیت میں پہنچا تو بوڑھا کسان کھیت میں ہل چلا رہا تھا۔ وہ اب اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ ہل اس سے سنبھل بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے بیل بھی بوڑھے ہو چکے تھے، ان کے لیے بھی اب ایک قدم بڑھانا مشکل تھا۔ لڑکے نے اپنے باپ اور اس کے بیلوں کی جو یہ حالت دیکھی تو اس نے آگے بڑھ کر کسان کو روکا اور سلام کرکے کہا:

"بابا! آپ آرام کیجیے۔ میں ہل چلاؤں گا۔"

کسان تو سمجھتا تھا کہ اس کا بیٹا اتنا ہی ننھا منا سا، بس انگوٹھے کے برابر ہوگا۔ وہ اپنے بیٹے کو پہچان ہی نہیں سکا۔ اس لیے اس نے پوچھا،

"تم کون ہو۔ ہل تم کیوں چلاؤ گے؟"

"میں آپ کا وہی بیٹا ہوں جسے آپ نے ایک لمبے چوڑے آدمی کو دے دیا تھا۔" لڑکے نے کہا۔

"لیکن میرا بیٹا تو بالکل ننھا منا تھا، تم اتنے لمبے چوڑے تندرست جوان آدمی ہو۔ تم میرے بیٹے ہرگز نہیں ہو سکتے۔" کسان نے کہا۔

"آپ یقین کیجیے میں ہی آپ کا بیٹا ہوں۔ بس ان لوگوں کے پاس اچھی اچھی غذائیں کھا کر اتنا تندرست ہوگیا ہوں۔" لڑکے نے کہا۔ پھر بوڑھے کسان کو مجبور کرکے اس نے اسے کھیت سے ہٹا کر ایک سایہ دار درخت کے نیچے بٹھا دیا۔ کھیت میں واپس پہنچ کر خود ہل چلانے لگا۔ لڑکا چوں کہ نوجوان اور تندرست تھا اس نے دیکھتے ہی دیکھتے کھیت میں ہل چلا کر زمین ٹھیک کر دی۔ اس وقت تک شام بھی ہونے لگی تھی، اس لیے اس نے کام ختم کر دیا اور اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا۔ پھر وہ دونوں مل کر گھر آئے جہاں کسان نے اپنی بیوی کو بتایا کہ اُن کا بیٹا لوٹ آیا ہے۔ کسان کی بیوی نے جب لڑکے کو دیکھا تو وہ بھی اپنے بیٹے کو نہیں پہچانی اور کہنے لگی:

"اتنا لمبا چوڑا جوان آدمی ہمارا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو بالکل ننھا منا سا تھا۔"

"اماں! میں آپ ہی کا بیٹا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ بابا نے مجھے کسی آدمی کو دے دیا تھا۔ اس آدمی نے مجھے بڑی محبت سے پالا۔ خوب اچھی اچھی چیزیں کھلائیں۔ میں تندرست ہونے لگا۔ یہاں تک کہ میں اب اتنا بڑا ہوگیا ہوں کہ آپ بھی مجھے نہیں پہچان رہی ہیں۔" لڑکے نے ان دیونما نیک آدمیوں سے سنی ہوئی باتیں کسان کی بیوی کو بتائیں۔ اُسی وقت کسان نے کہا:

"اگر یہ ہمارا بیٹا نہیں بھی ہے تو کیا ہوا۔ اللہ نے ہمیں ایک پلا پلایا بیٹا دے دیا ہے۔ اب اس کے لیے کھانا نکالو۔"

کسان کی بات سن کر اس کی بیوی بھی خاموش ہو رہی

اور دونوں کے لیے کھانا نکالنے لگی۔ کسان اور لڑکا منھ ہاتھ دھوکر کھانا کھانے بیٹھے تو لڑکا اپنے سامنے آنے والی پلیٹ دیکھ کر سوچنے لگا کہ اتنے سے چاولوں میں اس کا پیٹ کیسے بھرے گا! پھر بھی اس نے کھانا شروع کر دیا۔ ذرا سی دیر میں اس کی پلیٹ کے چاول ختم ہوگئے تو اس نے کسان سے اور چاول لانے کے لیے کہا۔ کسان کی بیوی نے جتنے چاول بچے تھے سب نکال کر لڑکے کو دے دیے، لیکن ان چاولوں سے بھی لڑکے کا پیٹ نہیں بھرا تو اس نے پھر چاول مانگے۔ لڑکے کی فرمائش سن کر کسان کی بیوی نے کسان کو اشارے سے جھونپڑی کے اندر بلایا اور کہنے لگی:

"یہ لڑکا کسی بھی طرح ہمارا بیٹا نہیں ہے۔ ہمارا بیٹا کبھی اتنا زیادہ کھانا نہ کھاتا۔ یہ تو پیٹو ہے۔ اگر یہ یہاں رہا تو ہمیں فاقے ہی کرنے پڑیں گے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دشمن نے ہمیں پریشان کرنے کے لیے اس لڑکے کو لکھا پڑھا کر ہمارے پاس بھیج دیا ہے۔ میرا کہنا مانو اور اسے فوراً یہاں سے بھگا دو۔"

کسان بے چارا سیدھا سادا آدمی تھا۔ اسے اپنی بیوی کی باتوں پر یقین آگیا۔ وہ جھونپڑی سے باہر آیا اور کہنے لگا:

"اے لڑکے، تم ہمیں دھوکا دے رہے ہو۔" کسان کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا کہ لڑکے نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا اور کہنے لگا:

"میں نے اماں کی ساری باتیں سن لی ہیں اگر انھیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تو پھر میرا یہاں رہنا بھی ٹھیک نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔"

لڑکا کسان کے پاس سے روانہ ہوگیا، لیکن اسے بڑا افسوس تھا کہ اس کے ماں باپ نے صرف زیادہ کھانے کی وجہ سے اُسے اپنے پاس نہیں رہنے دیا۔ پھر اسے یہ بھی خیال آتا کہ اس میں اس کے ماں باپ کا قصور بھی نہیں، کیوں کہ انھوں نے تو بچپن ہی میں اسے کسی اور کو دے دیا تھا۔ میں جن لوگوں کے پاس رہا انھیں کی باتیں سیکھیں پھر جب بڑا ہو کر ماں باپ کے پاس آیا تو وہ بھلا کیسے پہچانتے اور اس سے محبت کیسے کرتے، کیوں کہ محبت تو ساتھ رہنے اور ایک جیسی عادتوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ رہ گئی کھانے کی بات تو لڑکے نے سوچا کہ میرے ماں باپ تو غریب ہیں، اگر میں ان کے پاس رہتا تو انھیں سچ مچ فاقے ہی کرنے پڑتے یا پھر میں خود بھوکوں مر جاتا۔ ماں باپ نے ٹھیک ہی کیا۔ میں تو کہیں بھی کما کھاؤں گا۔

غرض ایسی ہی باتیں سوچتے سوچتے وہ بڑی دور نکل گیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے گاؤں میں پہنچ گیا۔ اب اُسے بھوک بھی لگ رہی تھی، لیکن کھانا مفت تو ملتا نہیں اسے کہیں نہ کہیں نوکری کرنی تھی۔ چنانچہ اس نے گاؤں والوں سے پوچھا کہ اسے یہاں کوئی نوکری مل سکتی ہے یا نہیں؟ اس گاؤں میں بھی زیادہ تر لوگ غریب ہی تھے۔ شاید کھانے پینے کے لیے ان کے پاس کبھی اچھی غذائیں نہیں تھیں اس لیے وہ لوگ بھی بڑے دبلے پتلے سے نظر آ رہے تھے بہرحال یہاں ایک آدمی نے اسے بتایا کہ گاؤں کے لوہار کے پاس دھونکنی چلانے کی نوکری مل سکتی ہے، لیکن لوہار ہے بڑا کنجوس اور ظالم۔ وہ جس کو نوکر رکھتا ہے اس سے کام تو بہت زیادہ لیتا ہے اور پیسے بہت کم دیتا ہے۔ اس آدمی کی باتیں سن کر لڑکے نے دل میں سوچا کہ اسے اس لوہار کے پاس ضرور نوکری کرنی چاہیے۔ اگر لوہار واقعی ظالم ہے تو اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ لوہار کا پتا پوچھتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گیا۔

لوہار نے دیکھا کہ لڑکا تندرست اور طاقت ور معلوم ہوتا ہے تو وہ اسے فوراً نوکر رکھنے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس نے لڑکے سے پوچھا کہ پہلے تو تم اپنا نام بتاؤ پھر یہ بتاؤ کہ تم تنخواہ کیا لوگے؟

لڑکے کا نام تو کچھ اور تھا، لیکن اس نے سوچا کہ اُسے اپنا اصلی نام نہیں بتانا چاہیے۔ یہ سوچ کر اُس نے کہا، "میرا نام درستی خان ہے، کیوں کہ میں ہر گڑبڑ کو ٹھیک کر دیتا ہوں اور تنخواہ میں تم سے کچھ نہیں لوں گا، لیکن مجھے

ایک پتے بھر چاول کھانے کے لیے دے دیا کرنا۔ پتا میں خود لاؤں گا۔ اگر تم نے پتے بھر چاول نہ دیے تو تمھیں میرے دو گھونسے کھانے پڑیں گے۔"

لوہار نے سوچا کہ سودا سستا ہے۔ ایک پتے بھر چاول دینا کون سی بڑی بات ہے۔ چنانچہ اس نے لڑکے کو ملازم رکھ لیا اور کہنے لگا:

"درستی خان! دیکھنے میں تو تم بہت طاقت ور نظر آتے



ہو۔ اب دیکھیں گے تم یہ دھونکنی کتنی تیز چلا سکتے ہو۔ جتنی تیز دھونکنی چلاؤ گے کوئلے اتنے ہی تیز جلیں گے لوہا جلد گرم ہو گا۔ چلو، بس اب شروع ہو جاؤ۔"

درستی خان لوہار کے پاس دھونکنی چلانے لگا جیسے مشین چل رہی ہو۔ لوہار کو بار بار کوئلے ڈالنے پڑتے۔ شام تک وہ اسی طرح لگاتار دھونکنی چلاتا رہا۔ اس دن لوہار کے کوئلے تو بہت زیادہ جلے، لیکن اس کا کام بھی زیادہ ہوا۔ لوہار تھا تو بہت کنجوس اور لالچی اس نے اور زور سے دھونکنی چلانے کو کہا۔ درستی خاں نے بھی اور زیادہ طاقت استعمال کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دھونکنی کی موٹی زنجیر ٹوٹ گئی۔ زنجیر ٹوٹی تو لوہار کو بہانہ مل گیا وہ کہنے لگا:

"درستی خاں! تم نے تو میری دھونکنی ہی توڑ دی میرا نقصان کر دیا اب میں تمھیں نوکر نہیں رکھوں گا۔"

"میرا تو نقصان ہو گیا ہے۔ مجھے کھانا دینا تو نہیں چاہیے، لیکن تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کس رحم دل آدمی سے پالا پڑا تھا۔ جاؤ پتا لے آؤ۔" لوہار نے کہا۔

درستی خان تھوڑی ہی دیر میں ایک پتا لے کر آگیا۔ پتا دیکھ کر لوہار بہت پریشان ہوا، کیوں کہ درستی خان کیلے کا ایک بہت بڑا پتا لے آیا تھا۔ پتا دیکھ کر لوہار نے اسے کھانا دینے سے انکار کر دیا تو درستی خان نے کہا:

"شرط کے مطابق تو تمھیں میرے دو گھونسے کھانے چاہییں، لیکن میں تمھیں ایک اور موقع دوں گا۔ تم لوہے کی ایک موٹی سی سلاخ مجھے لا دو جسے میں توڑ نہ سکوں۔ اگر میں یہ سلاخ نہ توڑ سکا تو چپ چاپ واپس چلا جاؤں گا۔ اور میں نے سلاخ توڑ دی تو تمھیں پھر میرے گھونسے ضرور کھانے پڑیں گے۔ لوہار نے سوچا کہ اس طرح تو آسانی سے جان بچ رہی ہے۔ لوہے کی سلاخ کو کوئی آدمی بھلا کیسے توڑ سکتا ہے۔ وہ اپنے گودام میں گیا اور ایک موٹی سی لوہے کی سلاخ اٹھا لایا۔ درستی خان نے وہ سلاخ ہاتھ میں لے کر اس کے دونوں سرے پکڑے اور زور لگا کر اسے توڑ دیا۔ یہ حال دیکھ کر لوہار بولا، "یہ تو پتلی سی سلاخ تھی، اسے کوئی بھی توڑ سکتا ہے۔"

"اچھا تو تم لوہے کا موٹا سا ڈنڈا لے آؤ، لیکن میں نے اسے بھی توڑ دیا تو اس بار تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔ تمھیں دو گھونسے ضرور ماروں گا۔ اگر تم ایک ہی گھونسے کے بعد بھاگ لیے تو دوسرا گھونسا میں تمھاری بیوی کو ماروں گا۔" درستی خان نے کہا۔

لوہار اور درستی خان کی بحث سن کر گاؤں کے دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ انھوں نے درستی خان کا اعلان سن کر خوشی کے نعرے لگائے اور سب نے مل کر درستی خان سے کہا کہ اس کا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے۔ لوہار کی بیوی بھی کنجوس، لالچی اور ظالم تھی۔ غرض لوہار اس

بار بہت موٹا ڈنڈا اٹھا لایا، لیکن درستی خان نے اسے بھی توڑ دیا۔ اس کے بعد اس نے لوہار کے چہرے پر ایک گھونسا مارا۔ گھونسا کھاتے ہی لوہار بڑی دور جاکر گرا اور فوراً ہی اٹھ کر بھاگ لیا۔ گانو کے کچھ لوگ لوہار کی بیوی کو بھی تماشا دکھانے کے بہانے بلا لائے تھے۔ انھوں نے درستی خان کو تنہا پاکر لوہار کی لالچی بیوی بھی آگئی ہے۔ درستی خان نے اسے بھی ایک گھونسا رسید کیا وہ بھی لوہار کی طرح دور جاکر گری۔ اس کے بعد تمام گانو والوں نے درستی خان کی دعوت کی، کیونکہ وہ سب لوہار اور اس کی بیوی کو لالچ، کنجوسی اور ظلم کی سزا مل جانے سے بہت خوش تھے۔

ارضِ وطن

ناوک حمزہ پوری

میری نگاہِ شوق میں بھارت کے بَن حسین تر
دنیا کے ہر چمن سے ہے اپنا چمن حسین تر
اپنی زمیں حسین تر، اپنا گگن حسین تر
ارضِ وطن حسین تر

لاتی ہیں اس کی سردیاں صحت کا جام ہاتھ میں
آتی ہیں گرمیاں لیے کیا میٹھے آم ساتھ میں
برسات کی بہار ہے اقبال کی پیام بر
ارضِ وطن حسین تر

ہیں ہر طرح کے آدمی اور ان کی بولیاں جُدا
ہیں دین دھرم مختلف اور اُن کی ٹولیاں جُدا
کثرت میں ان کی ہے مگر وحدت کا رنگ جلوہ گر
ارضِ وطن حسین تر

قوس اُردو لائبریری، حمزہ پور، ڈاکخانہ شیر گھاٹی، گیا (بہار)

عبداللطیف اعظمی

مولوی محمد حفیظ الدین

قسط ۱

بچوں کے استاد اور ادیب

مولوی محمد حفیظ الدین مرحوم بچوں کے مشہور ادیب اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق استاد تھے، ان کا ابھی حال میں، ۱۰ اگست کو انتقال ہو گیا — انتقال کے وقت ان کی عمر کوئی ۸۷ برس کی تھی۔

ناگپور (مہاراشٹر) میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے کامٹی، جو بالکل شروع میں فوجی چھاؤنی تھا، بعد میں وہاں آہستہ آہستہ بہت سے ایسے لوگ بس گئے جن کا تعلق فوج سے نہیں تھا۔ اب وہ قصبہ کپڑے کی صنعت کا بہت بڑا مرکز ہے۔ پڑھائی کا بھی بہت چرچا ہے، ڈیڑھ دو سال ہوئے، میں وہاں گیا تھا۔ یہ دیکھ کر بڑا اچنبھا ہوا کہ اُس چھوٹے سے قصبے میں بی اے، ایم اے کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اتنی زیادہ کہ بعض بڑے بڑے شہروں میں بھی اتنی تعداد نہیں ملے گی۔ یہی نہیں، اچھی خاصی تعداد میں پی۔ ایچ۔ ڈی بھی ہیں۔ یہاں کے نوجوانوں میں علمی اور ادبی کام کرنے کا بڑا شوق ہے۔ اُردو کے اخبار، رسالے اور کتابیں بھی وہاں کے لوگ خوب پڑھتے ہیں۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ لوگوں سے مانگ کر نہیں، خود خرید کر پڑھتے ہیں۔ مولوی محمد حفیظ الدین صاحب اسی قصبے کے رہنے والے تھے۔

حفیظ الدین صاحب نے شروع کی تعلیم یہیں کامٹی میں حاصل کی۔ اس کے بعد عربی کی اونچی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ملک کے مشہور مدرسہ، دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ چلے گئے۔ اس کے بعد اور زیادہ پڑھنے کے لیے مصر کی سب سے بڑی اور مشہور یونیورسٹی جامعہ ازہر جانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے پاسپورٹ بھی بنوا لیا تھا اور مصر روانہ ہونے کے لیے بمبئی پہنچ بھی گئے تھے، مگر کسی کارن نہ جا سکے۔ جب وہاں نہ جا سکے تو جامعہ ملیہ دہلی آ گئے۔ یہاں پر اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے عربی کی تعلیم حاصل کی ہے، انگریزی اور دوسرے نئے علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے خاص انتظام تھا، جسے درجۂ خاص کہتے تھے۔ حفیظ الدین صاحب کا اسی میں داخلہ ہو گیا۔ دو سال پڑھنے کے بعد، چھپائی کا کام سیکھنے کے لیے جامعہ کی طرف سے ان کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھیجا گیا۔

حفیظ صاحب میں کام کرنے کی بہت اچھی صلاحیت تھی اور جو کام بھی ان کو دیا جاتا، بڑی لگن اور شوق سے کرتے۔ محنت بھی خوب کرتے، اس لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے، جو اُس زمانے میں شیخ الجامعہ تھے، ان کو بہت سے انتظامی کام دیے اور کچھ مدت کے بعد اُنھیں بچوں کو پڑھانے کے لیے استاد مقرر کر دیا۔ کچھ عرصے تک مدرسۂ ابتدائی میں چھوٹے بچوں کو پڑھایا، کچھ دن

کے بعد اس سے بڑے طالب علموں کو پڑھانے کے لیے مدرسہ ثانوی میں بھیج دیا گیا۔ غرض ان کو جو کام بھی دیا گیا، اسے بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا۔

جب وہ جامعہ میں پڑھا رہے تھے تو اسی زمانے میں حیدرآباد دکن کی مشہور ریاست کے شہزادے کو تعلیم و تربیت دینے کے لیے اچھے اتالیق کی ضرورت پیش آئی۔ اُس زمانے میں بچّوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جامعہ کو بڑی شہرت حاصل تھی، اس لیے نواب صاحب کی طرف سے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو لکھا گیا تو انھوں نے اس کام کے لیے حفیظ صاحب کو بھیج دیا۔ جب شہزادے بڑے ہو گئے اور حفیظ صاحب کی وہاں ضرورت نہیں رہی تو ذاکر صاحب نے ان کو بلا کر انجمن ترقی اردو علی گڑھ کا نائب سکریٹری مقرر کیا۔ اس زمانے میں ذاکر صاحب علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور انجمن ترقی اردو کے صدر تھے۔ حفیظ صاحب نے کئی سال تک وہاں کام کیا، مگر ذاکر صاحب کے ایک ساتھی اور جامعہ ملیہ کے ایک سابق استاد ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ایک نیا ادارہ قائم کیا اور انگریزی اور اردو میں دو بہت اچھے رسالے نکالے تو اپنی مدد کے لیے حفیظ صاحب کو علی گڑھ سے جامعہ نگر بلا لیا اور اُردو رسالے "اسلام اور عصر جدید" کا نائب اڈیٹر مقرر کیا۔

جب حفیظ صاحب رسالہ "اسلام اور عصر جدید" میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں طالب علموں کے لیے اُردو کا ایک لغت تیار کیا جا رہا تھا۔ اس کام کا بیڑا مرکزی حکومت کے ایک ادارہ 'ترقی اُردو بورڈ' نے اٹھایا تھا اور اس کام کی ذمے داری بمبئی کی مشہور انجمن اسلام کو دے دی تھی جو اُردو کے بہت سے اسکول کامیابی کے ساتھ چلا رہی ہے۔ چونکہ حفیظ صاحب کو بچوں کو پڑھانے اور بچّوں کے لیے آسان زبان میں لکھنے کا لمبا اور اچھا تجربہ تھا، اس لیے کچھ عرصے کے بعد اس کام کو مکمل کرنے کے لیے، انھیں بمبئی بلا لیا گیا، چناں چہ وہ دہلی سے بمبئی چلے گئے اور کئی سال تک وہاں کام کیا اور جب یہ کام پورا ہو گیا تو دلّی واپس آ گئے۔ اب ان کی عمر کافی ہو گئی تھی، اس لیے تمام کاموں سے الگ ہو کر ریٹائر زندگی بسر کرنے لگے۔

انھوں نے بہت پہلے جامعہ نگر میں ایک چھوٹا سا مکان بنا لیا تھا، اُس وقت مرحوم کی بیگم صاحبہ، سب سے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر صلاح الدین، سب سے چھوٹی صاحبزادی، صبیحہ خانم اسی مکان میں تھے اور چھوٹے داماد شمیم جالشی بھی قریب ہی رہتے ہیں، خاندان کے ان افراد کے ساتھ حفیظ صاحب اپنی ریٹائرڈ زندگی بسر کرنے لگے۔ کچھ عرصے کے بعد اپنی منجھلی صاحبزادی ڈاکٹر اختر شارق کے یہاں چلے گئے، جو تمسر (ضلع بھنڈارہ) میں رہتی ہیں۔ اس کے بعد کبھی وہ تمسر میں رہتے اور کبھی اپنے وطن کامٹی میں رہتے جہاں ان کے بھائی، ماسٹر علیم الدین صاحب رہتے ہیں۔ ڈیڑھ دو سال پہلے جب میں کامٹی گیا تھا تو وہیں مرحوم سے ملاقات ہوئی تھی۔

حفیظ الدین صاحب میں ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ نفاست، سادگی اور صفائی ستھرائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ میں نے جامعہ نگر اور کامٹی دونوں جگہ ان کا مکان اور رہن سہن دیکھا ہے۔ اس کو دیکھ کر ذاکر صاحب یاد آجاتے تھے، جو سادگی اور صفائی پر بہت زور دیتے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ حفیظ صاحب پر ذاکر صاحب کی زندگی اور باتوں کا اثر تھا۔ لباس میں بھی ذاکر صاحب کی پسند کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ہمیشہ شیروانی اور ٹوپی میں رہتے اور شیروانی کے تمام بٹن بند ہوتے، ذاکر صاحب ٹوپی اور شیروانی کے بٹنوں کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ جامعہ کا کوئی طالب علم ننگے سر ہوتا تو ضرور ٹوکتے اور اگر شیروانی کا کوئی بٹن کھلا ہو تو خود بند کر دیتے تھے۔ (باقی آئندہ)

امۃ الرحمٰن محسنی

دو شکاری ۲



باب ۱۱

مجھے بستر پر گئے ہوئے ابھی پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ابو بھی اندر آگئے۔ انھوں نے لیمپ روشن کیا۔ آج کل اندھیرا جلدی ہی ہو جاتا تھا اور میرے تخت کے کنارے پر آکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے۔ ہاں تو آج کی رات کون سی کہانی ہوگی۔ میں نے کہا ابو ذرا ایک منٹ ٹھہریے! کیا بات ہے؟ انھوں نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ میرے دماغ میں ایک بات آرہی ہے۔ کیا میں اس کے بارے میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں۔

ہاں ہاں ضرور! انھوں نے کہا۔

جب آپ ہاسپٹل گئے تھے اور شام کو واپسی کے بعد ڈاکٹر حسین نے آپ کو سونے کی گولیاں دی تھیں نا؟

ہاں دی تو سلیپنگ پلس ہی تھیں۔ مگر میں نے وہ استعمال نہیں کی تھیں۔ کیونکہ مجھے ایسی چیزیں کھانا پسند نہیں۔

اچھا یہ بتایئے کہ کیا وجہ اگر وہ تیتروں پر اثر نہ کریں؟ ابو نے افسردگی سے اپنا سر ہلا دیا۔

ٹھہریے تو سہی! ابو! کوئی فائدہ نہیں دانی۔ تم کو بھی اندازہ ہوگا کہ کوئی بھی تیتر وہ بھدا سالال کیپ سول نہیں نگلے گا۔ لیکن ابو ٹھہریے تو سہی! آپ کشمشوں کی بات کیوں بھول رہے ہیں؟

کشمشوں کی بات! کشمشوں کا اس میں کیا پیچ ہے؟

تو سنیے میں نے کہا۔ ہم ایک بھیگی ہوئی ملائم کشمش لیں اور اسے ایک طرف سے کاٹ کر اس میں سے تھوڑا سا گودا نکال لیں اور اس میں آپ کا کیپ سول کھول کر اس کا پاوڈر بھر دیں اور سوئی دھاگہ لے کر کھلی ہوئی جگہ کو احتیاط سے سی دیں۔ جب میں یہ بات کر رہا تھا تو میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ ابو کا منہ مارے حیرت کے کھلتا جا رہا ہے۔

میں نے کہا بس اب اس کے بعد ہمارے پاس ایک صاف ستھری ملائم سی کشمش ہوگی۔ جس میں خواب آور پاوڈر بھرا ہوگا۔ اور وہ کشمش ایک تیتر کو گہری نیند سلانے کے لیے کافی ہوگی۔ کیوں ابو! کیا اس ترکیب سے کام نہیں چلے گا؟

ابو مجھے ایسی حیرت سے تک رہے تھے جیسے وہ کوئی بہت عجیب خواب دیکھ رہے ہوں۔ پیارے بچے۔ میری جان سے زیادہ عزیز!

وہ میری بات سن کر بولے۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے ایک ایسی ترکیب معلوم کر لی ہے جس کی کامیابی میں کوئی شک نہیں۔ یہ ترکیب کامیاب ہوگی۔ ہوگی۔ وہ جوش میں آکر تخت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کسی جذبہ کی وجہ سے ان کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔ وہ پھر آکر میرے بستر پر ایک کنارے پر بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ اپنا سر ہلانے لگے۔

میں نے ان سے پوچھا۔ ابو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ کامیاب ہو جائے گا؟

ابو پُر سکون ہو کر بولے۔ کامیاب نہ ہونے کی وجہ ہی نہیں ہے۔ بس ہم کو اس طریقے سے دو سو کشمشیں تیار کرنی ہوں گی۔ اور پھر جنگل میں جا کر سورج غروب ہونے کے وقت تیتروں کے دانہ کھانے کی جگہ بکھیرنی ہوں گی اور پھر ہم وہاں سے تھوڑے فاصلہ پر جا کر بیٹھ جائیں گے۔ تیتر بسیرا لینے درختوں

مسکن۔ دودھ پور ، علی گڑھ

پر چڑھ جائیں گے اور ان کو محفوظ دیکھ کر چوکیدار بھی اپنے گھروں کو چل دیں گے۔ گولیاں تیتروں پر اثر کرنا شروع کر دیں گی۔ وہ درختوں پہ جمنے کی کوشش کریں گے مگر نیند کے غلبہ سے بے بس ہو کر سنبھل نہیں سکیں گے۔ گرنے لگیں گے اور ایسے گریں گے جیسے ہمارے درخت کے پکے امرود۔ بس پھر ہمیں جا کر انھیں چننا اور لانا ہوگا۔

ابو کیا چننے کے لیے میں بھی آپ کے ساتھ جا سکتا ہوں؟

اب ہم کو پکڑنے کے لیے چوکیدار ہوں گے ہی نہیں۔ ابو میری بات نہ سنتے ہوئے کہے جا رہے تھے۔ ہم کو کسی کا بھی ڈر نہیں ہوگا۔ شام کو بھی اگر کسی چوکیدار نے ہم کو دانہ بکھیرتے ہوئے دیکھ لیا تو وہ سمجھ ہی نہیں پائیں گے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

میں نے اپنی آواز اونچی کر کے کہا۔ ابو! کیا آپ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں گے؟

دانی! میری جان! انھوں نے میرے گھٹنوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔ ان کی آنکھیں اس وقت پوری کھلی ہوئی تھیں اور وہ ایسی چمک رہی تھیں جیسے دو ستارے۔ کہا۔ اگر یہ طریقہ کامیاب ہو گیا تو پوچنگ کی دنیا میں انقلاب آجائے گا۔

ہاں یہ بات تو ہے! مگر ابو کیا آپ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں؟

تمھیں لے جا سکتا ہوں! آخر وہ اپنے حسین خواب سے بیدار ہوئے اور کہا۔ میرے پیارے تم میری ساتھ ضرور جاؤگے۔ تمھاری ہی تو یہ تجویز ہے اور اس تجویز کی کامیابی دیکھنے کے لیے تمھارا وہاں ہونا نہایت ضروری ہے اور پھر ایک دم کھڑے ہو کر بولے۔ وہ گولیاں ہیں کہاں؟ میں نے ان کی جگہ بتلا دی۔

گولیوں کی چھوٹی سی شیشی سنک کے اوپر والی الماری میں رکھی تھی وہ اسے اٹھا لائے اور کھول کر سب کیپ سول میرے کمبل پر الٹ دیے۔ آؤ انھیں گنیں یہ کتنے ہیں۔ ہم دونوں گننے لگے وہ پورے پچاس تھے۔ کہنے لگے یہ تو بہت کم ہیں۔ ہم کو تو پورے دو سو کی ضرورت ہے۔ پھر کچھ سوچ کر کہا۔ نہیں ٹھہرو تو سہی! ہم کو اور کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ دانی ہم ایک کیپ سول کو چار حصوں میں بانٹ لیں گے۔ یعنی ایک کیپ سول کا پاؤڈر چار کشمشوں میں بھریں گے۔ دوسرے لفظوں میں چوتھائی خوراک۔ اس طرح دو سو کشمشوں کو بھرنے کے لیے پچاس کیپ سول کافی ہیں۔

میں نے کسی قدر شک کے ساتھ پوچھا۔ کیا ایک چوتھائی خوراک سے تیتر سو جائیں گے؟

ہاں بالکل پیارے! اتنی تو خود تمھارے لیے کافی ہوگی اور تیتر تو ایک پورے آدمی سے کتنا چھوٹا ہوتا ہے۔

جی ہاں کئی گنا چھوٹا ہوتا ہے۔

اچھا تو ایسے سمجھو! اگر ایک کیپ سول ایک بڑے آدمی کو سونے کے لیے دی جاتی ہے۔ تو تیتر کو سلانے کے لیے اس کا بہت ہی کم حصّہ کافی ہو جائے گا۔

ایک اور بات پوچھتا ہوں۔ کیا صرف دو سو کشمشیں دو سو تیتروں کو گرانے کے لیے کافی ہو جائیں گی؟

کیوں نہیں ہوں گی؟

اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے کچھ پرندے زیادہ کشمشیں کھا جائیں اور کچھ کو ایک بھی نہ ملے۔

تم نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ابو نے کہا۔ تمھارا کہنا بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا ہوگا نہیں۔

دانی تم بے فکر رہو اس کا میں انتظام کر لوں گا۔ ابو آپ اس کا بھی وعدہ کیجیے کہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

دانی تم ضرور ضرور جاؤگے۔ اور ہم اس طریقے کا نام "حسنِ خوابیدہ" رکھیں گے۔ اگر ہم اس ترکیب میں کامیاب ہو گئے تو یہ پوچنگ کی تاریخ میں ایک زبردست کارنامہ ہوگا۔

جب ابو بہت احتیاط سے ایک ایک کیپ سول شیشی میں بھر رہے تھے تو میں خاموش بیٹھا ہوا ان کو دیکھ رہا تھا اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو منصوبہ ہم بنا رہے ہیں اس کو ہم پورا بھی کر سکیں گے اور یہ کہ میں اور ابو سچ مچ شہباز کے قیمتی تیتر سمیٹ ہی لائیں گے۔ مجھے تو اس خیال سے ہی جھرجھریاں سی آ رہی تھیں۔

ابو نے کہا۔ اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا تو کیسا مزہ آئے گا۔ اور کیسا حیرت انگیز کارنامہ ہوگا۔

ابو مجھے تو اس بارے میں سوچنے کی بھی ہمت نہیں

ہو رہی ہے۔ اس خیال ہی سے سنسنی آرہی ہے۔

اور مجھے بھی تو! ابو نے کہا۔ لیکن ہمیں ابھی سے بہت مضبوطی اور سکون سے رہنا چاہیے۔ اور بہت سوچ سمجھ کر غور کر کے اس کا پلان بنانا چاہیے۔ آج بدھ ہے۔ شکار پارٹی سنیچر کو ہے۔

واہ وا! اس کے معنی ہیں کہ کام کرنے کے لیے ابھی ہمارے پاس تین دن ہیں۔

لیکن سنیچر کا دن کہاں ہے؟ اس سے ایک رات پہلے یہ کام کر لینا ہے۔ تاکہ مین شکار کے وقت سے پہلے تیتروں کے غائب ہونے کا ان کو پتا ہی نہ چل سکے۔

ابو جمعہ تو پرسوں ہی کو ہے۔ ہمیں بہت جلد کام شروع کرنا چاہیے۔ جمعہ کی شام سے پہلے ہمیں دو سو کشمشیں تیار کرنی ہیں

ابو کھڑے ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگے پھر بولے ہمیں اپنے پلان پر خوب غور کر لینا چاہیے۔ دیکھو کل کو جمعرات ہے جب میں تمھیں اسکول چھوڑ کر واپس ہوں گا تو کانوے دو پیکٹ کشمشوں کے خرید لاؤں گا اور شام کو ہم انھیں بھگو دیں گے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ تیار کرنے کے لیے ہمارے پاس صرف جمعہ کا دن رہتا ہے۔ میں نے کہا۔ ہر کشمش کو کاٹنا اس میں پاؤڈر بھرنا اسے سوئی دھاگے سے سینا کافی لمبا کام ہے اور میں سارے دن اسکول رہوں گا۔ میں نے کہا۔

نہیں تم اسکول نہیں جاؤ گے۔ ابو نے کہا، جمعہ کے دن تمھیں بہت سخت نزلہ ہوگا اور مجبوراً تمھیں اسکول سے چھٹی لانی ہوگی۔ بہت عمدہ میں نے خوش ہو کر کہا۔

اور پٹرول پمپ بھی ہم جمعہ کے دن بند رکھیں گے۔ ابو کہتے رہے۔ اور ہم پورے دن گھر میں بند رہیں گے اور کشمشوں کو تیار کریں گے۔ اس طرح امید ہے کہ شام تک سب کشمشیں تیار کرلیں گے اور شام کو ٹھیک وقت پر جنگل کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ کیوں؟

ٹھیک ہے نا؟ وہ ایسے کہہ رہے تھے کہ جیسے کوئی جنرل اپنے اسٹاف کو لڑائی کا پلان سمجھا رہا ہو۔

ٹھیک ہے ابو! میں نے کہا۔

اور ہاں دانی! یاد رکھنا اسکول میں اپنے کسی دوست سے بھی اس بارے میں تمھارے منہ سے بھاپ نہ نکلے۔

ابو! آپ کو معلوم ہے میں ایسی بات کبھی کسی سے نہیں کہتا۔

اس کے بعد انھوں نے مجھے شب بخیر کہا۔ پیار کیا اور لیمپ کی روشنی نیچی کر دی۔ مگر میں کافی دیر تک سو نہیں سکا۔ (باقی آئندہ)



نیک دل وزیر

شفیق عابد زاہدی
دفتر روزنامہ انقلاب
بمبئی

ایک بڑے نامور، عقل مند اور سوجھ بوجھ والے بادشاہ کا ایک وزیر تھا جو اپنے بادشاہ کا بڑا مخلص اور وفادار تھا اور بڑی ایمانداری سے حکومت کے کاموں کی دیکھ ریکھ کرتا اور بادشاہ کو نیک مشورہ دیتا تھا۔ بڑا نیک دل اور خدا سے ڈرنے والا آدمی تھا۔ بادشاہ کو اس پر بڑا بھروسا تھا۔ اس لیے بادشاہ اس کو بہت مانتا تھا۔ اُس کی بہت عزت کرتا تھا۔ اور ہر کام میں اُس سے مشورہ لینا ضروری سمجھتا تھا۔

ایک روز دربار میں بادشاہ کے خاص خاص مصاحب اور خود بادشاہ اور وزیر بیٹھے ہوئے اُن فوجیوں کا انتظار کر رہے تھے جو دو تین روز سے ڈاکوؤں کے ایک زبردست گروہ کی گرفتاری کے لیے گئے ہوئے تھے۔ یہ بڑے شورہ پشت اور ظالم و جابر ڈاکو تھے جنھوں نے لوگوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ عوام عاجز تھے۔ پولیس حیران تھی۔ ان ڈاکوؤں نے پہاڑوں کی کھوؤں بھلسیوں میں اپنے چھپ کر رہنے سہنے کا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ جہاں تک ہر شخص کے پہنچنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ سرکاری جاسوس بھی اب تک اُن کا پتا نہ لگا سکے تھے۔ اس لیے بادشاہ نے ان کی گرفتاری کا مسئلہ فوج اور فوجی جاسوسوں کے حوالے کر دیا تھا اور ایک بڑا انعام مقرر کیا تھا۔

ڈاکوؤں کا سردار اور اُس کے بڑے بڑے سبھی ساتھی تقریباً مارے گئے۔ کچھ جان بچا کر ادھر اُدھر بھاگ گئے۔ بڑی تعداد گرفتار ہوگئی۔ جتھا تتر بتر ہوگیا۔ گرفتاروں میں ڈاکو سردار کا ایک نوعمر لڑکا بھی تھا، جو بڑا بھولا بھالا، خوب صورت اور دیکھنے میں نیک لگتا تھا۔ جب یہ لوگ دربار میں لائے گئے تو بادشاہ نے ان سب کو قتل کر ڈالنے کا حکم دے دیا۔ کیوں کہ وہ لوگ اسی لائق تھے۔

قتل ہونے والوں میں وہ لڑکا بھی شامل تھا۔ جس کو ابھی نوجوان بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیوں کہ ابھی اُس کی مونچھ داڑھی کے روئیں بھی نہ پھوٹے تھے۔

نیک دل وزیر کو اُس پر بڑا ترس آ رہا تھا اور جب اُس کے بھی قتل کر دیے جانے کا حکم ہوگیا تو وزیر سے رہا نہ گیا۔ اُس نے عرض کیا۔

"جہاں پناہ! یہ سچ ہے کہ یہ ایک ڈاکو کا لڑکا ہے اگر یہ ڈاکوؤں کے ساتھ رہتا اور جوان ہوتا تو یہ بھی ایک شاطر ڈاکو ہی ہوتا۔ مگر ابھی بے قصور اور رحم و درگزر کے قابل ہے۔ اگر یہ اچھی صحبت میں رہے اور اس کو اخلاقی، شہری اور دینی تعلیم دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ ایک اچھا شہری اور کام کا آدمی نہ بنے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ اس کی جان بخشی فرما کر میرے حوالے کر دیجیے کہ اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا انتظام میں کروں۔ اس پر رحم فرمائیے کہ ابھی نادان ہے۔"

بادشاہ نے کہا:-

"یہ تمھاری بھول ہے۔ بھیڑیے کے بچے کی پرورش اگر آدمی بھی کرے تو آخر کار بھیڑیے کا بچہ بھیڑیا ہی

ہوگا وہ آدمی تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔

تربیت اور تعلیم کا اثر تو اُس پر پڑتا ہے جس میں تربیت اور تعلیم کو قبول کرنے کا مادّہ نسلی طور پر اور اچھے اخلاق کے باعث ہو۔ اس کی آنکھیں ایک ڈاکو کی گود میں کھلیں۔ اُسی میں پلا بڑھا، پروان چڑھا، اپنے گرد و پیش یہی کچھ دیکھتا ہوا اور تعلیم و تربیت کا زمانہ گزار کر اب نوجوانی کی سرحد میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کی گھٹی میں ڈاکا زنی پڑی ہوئی ہے تو اب یہ تمھاری تعلیم و تربیت کو خاک قبول کرے گا! سانپ کے بچّے کو دودھ پلا کر پالنے سے اُس کے دانتوں کے زہر کی تھیلی تو نہیں سوکھ جائے گی۔ ناکارہ، بداصل اور زنگ لگے ہوئے لوہے سے کوئی مستری آج تک اچھی تلوار بنا سکا ہے کہ تم ایک بدنامِ زمانہ ڈاکو کے اُس لڑکے کو شریف شہری بنا سکو گے جو اسی عمر میں اپنے باپ سے سب کچھ سیکھ چکا ہوگا۔

بنجر زمین میں کارآمد بیج بکھیر کر ضائع کرنے سے کیا حاصل ہے؟ سانپ کو مار کر سنپولیے کو پالنا کہاں کی عقل مندی ہے؟

چوں کہ وزیر کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اس لڑکے کو دیکھ کر ایسا ریجھا کہ بادشاہ کی علم و حکمت کی باتوں سے اُس نے سبق نہ لیا اور بار بار رحم کی درخواست کرتا رہا۔ بادشاہ نے مجبور ہو کر اُس لڑکے کی جان بخشی کر دی اور وزیر کے حوالے کر دیا۔

وزیر خوش خوش بادشاہ کا شکریہ ادا کر کے لڑکے کو اپنے گھر لایا۔ باقی سارے ڈاکو قتل کر دیے گئے۔

لڑکے کو وزیر نے اپنا بیٹا بنا لیا۔ ہر طرح کا ساز و سامان فراہم کر کے اس کی تعلیم و تربیت کا بڑا معقول انتظام کیا۔ خود بھی اپنا وقت اس کی تعلیم و تربیت میں صرف کرتا اور کئی استاد و اتالیق مقرر کر دیے۔ لڑکے کو علم و حکمت کے ساتھ فوجی تربیت اور شہ سواری کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور اُسے ایک شاہزادے کی طرح رکھا جانے لگا۔

لڑکا بڑا ذہین اور ہونہار تھا۔ ہر طرح کے علوم و فنون اور شہ سواری، تلوار بازی اور تیر اندازی میں بڑا نام آور ہوا۔ اُستاد خوش تھے کہ اُن کی محنت ٹھکانے لگ رہی تھی۔

اور وزیر بھی اپنی جگہ پر بڑا مسرور تھا کہ آخر کار وہ وقت قریب آ گیا تھا کہ وہ اپنے بادشاہ کے آگے سُرخ رُو ہوگا۔

وہ جب بھی موقع ملتا کہ کچھ نجی باتیں کر سکے تو وہ فخریہ طور پر لڑکے کی کارگزاریاں بیان کرتا اور اُس کے اچھے مستقبل کی اُمید دلاتا۔

وزیر کی باتیں سُن کر بادشاہ مُسکرا دیتا۔

وزیر یہ سمجھتا کہ بادشاہ مطمئن ہو گیا۔ چوں کہ وزیر فطرتاً نیک آدمی تھا اس لیے لڑکے کی ظاہری نیک چلنی اور اُس کی نمایشی سعادت مندیوں سے بہت ہی متاثر تھا۔ جُوں جُوں اُس کا پیار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اور مان جان میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور وہ دن بھی آ ہی گیا کہ اُس ڈاکو بچّے کی تعلیم و تربیت مکمل ہو گئی اور سپہ گری اور شہ سواری کی تعلیم بھی پوری ہو چکی تو وہ دن وزیر کے لیے بڑی خوشی کا تھا۔ اُس نے لڑکے کے استادوں کو انعام و اکرام اور خلعت دے کر مالا مال کر دیا۔

لڑکے کی ہمّت افزائی کی، پیار کیا۔ مال و زر نثار کیا۔

دعوتِ عام کا پروگرام بنایا اور سوچا۔

کل بادشاہ سلامت کو بھی مدعو کروں گا۔ اور ضیافت ہی کے موقعے پر لڑکے کو شاہی خدمت میں پیش کر کے عرض کروں گا کہ:

ہر طرح لڑکے کا امتحان لے لیا جائے۔ اور میری زندگی تک اس کو اس کی لیاقت کے مطابق کوئی عہدہ مرحمت کر دیا جائے۔ اور میرے بعد میری جگہ اِس کو۔

دی جائے کہ یہی میرا وارث ہے اور یہی میری گدّی سنبھالنے کا اہل بھی ہے۔

انتہائی خوشی کا دن تھا۔ نیک دل وزیر یہی کچھ اپنے دل میں سوچتا ہوا رات کو کھا پی کر سو گیا۔

جب تمام نوکر چاکر اور گھر کے سارے لوگ کام دھام سے فارغ ہو کر سو رہے اور سناٹا ہو گیا تو لڑکا چپکے سے اٹھا۔ وزیر اور اس کی بیوی کو سوتے میں قتل کر دیا۔ ہیرے، جواہرات، قیمتی سازو سامان اور جس قدر اشرفیاں اور سونے چاندی کے زیورات جو دو گھوڑوں پر لاد کر لے جا سکتا تھا لے کر چلتا بنا اور دُور دراز خطرناک پہاڑوں کے تنگ و تاریک دَرّوں میں اپنا مسکن بنا لیا اور اپنے باپ کے اُن ساتھیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اکٹھا کر لیا جو قتل اور گرفتاری سے بچ کر روپوش تھے اور کسی اچھے اور تجربہ کار سردار کی تلاش میں تھے۔

ان کو اپنے پیارے سردار کا پیارا لال مل گیا جس سے وہ بچھڑ گئے تھے۔

ڈھیر ساری مال و دولت لے کر آنے والے اس حوصلہ مند، ہمتی جوان کو سب نے اپنے کلیجے سے لگایا اور اس کو اپنا سردار تسلیم کر لیا۔

وہ اپنے باپ سے زیادہ خطرناک، جیالا اور بے حد چالاک ڈاکو نکلا کیوں کہ وہ پڑھا لکھا اور تربیت یافتہ، فوجی تعلیم پائے ہوئے، شہری رہن سہن اور طور و طریق سے واقف تھا۔

بادشاہ کو وزیر کے حسرت ناک انجام سے بہت دُکھ ہوا اور اُس نے وزیر کا بہت غم منایا۔ اس کو ڈاکو کے بیٹے کی اس نمک حرامی پر بہت غصہ آیا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

عرصے تک یہ ڈاکو ہاتھ نہ آیا۔ کوششیں ہزار ہا ہوئیں۔ مگر اس نے بھی جاسوس مقرر کر رکھے تھے اور شاہی کارروائیوں سے باخبر رہتا اور رہنے سہنے کی جگہیں تبدیل کرتا رہتا تھا۔ اس لیے فوج اور پولیس کے حملوں سے محفوظ رہ کر خود انھیں کو نقصان پہنچاتا رہا۔

"نا اہل کی تعلیم و تربیت ایسی ہی ہے جیسے
کسی گنبد پر گولی رکھ کر یہ تصور کر لیا جائے
کہ گولی لڑھکے گی نہیں۔ مگر ایسا کبھی
ممکن نہیں ہے۔"

(گلستان سعدی کی ایک حکایت کا آزاد ترجمہ)

تکمیل نظر فیضی

ایجادات اور اُن کے موجد

نام ایجاد	نام موجد	سنہ ایجاد
آب دوز کشتی	بشنل	۱۷۷۵
بجلی کا لیمپ	جوزف ولسن سوین	۱۷۷۸
بندوق	لارڈ آرم اسٹرانگ	۱۸۳۵
پستول	ساحول کولٹ	۱۸۳۵
ٹائپ رائٹر	ایم نو کالت	۱۸۵۵
ٹینک فوجی	سونٹن	۱۹۱۴
جیٹ طیارہ	فرانک وٹل	۱۹۱۴
چیچک کا ٹیکہ	ڈاکٹر جینر	۱۷۹۴
خوردبین	پروفیسر ایڈورڈ ہیوگز	۱۸۲۸
دُوربین	گلیلو	۱۶۱۰
فاؤنٹین پین	واٹرمین	۱۸۸۳

آشیانہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

حمید عثمانی

شیشے کے ٹکڑے



گھر کے سب ہی لوگ پریشان تھے۔ پریشانی کی بات ہی تھی۔ آدھی رات کے بعد سڑک کی جانب کھلنے والی ایک کھڑکی کھلی ہوئی ملی۔ اس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا کسی نے شیشہ توڑ کر کنڈی کھول لی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جاکر دیکھنے لگے کہ کس کی کیا چیز چوری ہوئی۔

زیادہ تر سامان ڈرائنگ روم اور کھانے کے کمرے سے غائب ہوا تھا۔ کھانے کے کمرے سے ملا ہوا گڈو میاں کا کمرہ تھا۔ وہاں سے ان کی ٹائم پیس غائب تھی۔

چوکی دار کو بلوایا گیا۔ اس نے بیان دیا کہ وہ ہمیشہ کی طرح رات بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد چکر لگاتا رہا تھا۔ لیکن اس کو شبہے کی کوئی چیز نہیں دکھائی دی تھی۔ جس کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا تھا وہ سڑک سے بالکل صاف تو نہیں دکھائی دیتی تھی مگر اس کے آس پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں آہٹ ہونے پر کوئی چھپ سکتا۔

"رات کتے بھی نہیں بھونکے۔" چوکی دار نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ کھویا کھویا سا نظر آتا تھا۔

مالی کی کوٹھری چونکہ باہر کے حصّے میں تھی اس لیے اس کو بھی پوچھ گچھ کے لیے بلوایا گیا۔

۱۸۹ - سبزی منڈی ، الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳

اس نے کہا: "سرکار کل رات تو میں کئی بار باہر نکلا تھا نیند اچٹ سی گئی تھی پھاٹک کے پاس بیٹھا بیڑی پیتا رہا بلکہ ایک بار ٹہلتا ہوا قریب کے چوراہے تک نکل گیا تھا۔"

مکان کی ایک ایک بتّی جلا دی گئی تھی جن پڑوسیوں کو اس طرح بے وقت چلنے پھرنے کی آواز سنائی دی وہ بھی خیریت دریافت کرنے چلے آئے تھے اور دو دو تین تین کی ٹولی میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

گڈّو میاں سب سے بعد میں جاگے۔ کافی دیر تک لوگوں کی باتیں سنتے رہے پھر کچھ سوچ کر اپنے کمرے میں گئے۔ وہاں اپنی چیزیں دیکھتے بھالتے رہے۔ گھڑی کے جانے کا ان کو کوئی خاص غم نہیں تھا مگر جب پتا چلا کہ ان کا کھلونے والا پستول بھی غائب ہے تو انھیں بہت افسوس ہوا۔ فائر کرنے پر اس سے شعلے نکلتے تھے اور دور سے تو وہ بالکل اصلی پستول معلوم ہوتا تھا۔ اب ایسا پستول بھلا کہاں مل سکے گا۔ وہ برآمدے میں منہ بنائے ٹہلتے رہے پھر کھڑکی کے پاس آکر غور سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اچانک ان کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہونے لگی اسی درمیان تھانے خبر کردی گئی۔

—— پولیس والے آئے، انھوں نے اپنی کارروائی شروع کردی۔ داروغہ جی نے پہلے تو پورے مکان کا معائنہ کیا۔ جو کھڑکی کھلی ہوئی ملی تھی اسے بڑی توجہ سے دیکھا۔ لوگوں کو منع کیا کہ اس کو نہ چھوئیں، اس پر سے ابھی انگلیوں کے نشانات لیے جائیں گے۔ داروغہ جی کے لیے برآمدے میں ایک طرف کرسی ڈال دی گئی، انھوں نے اسی جگہ نوکروں کو طلب کیا۔

"میں نے بڑی بڑی ڈکیتیوں کا پتا لگایا ہے مجھ سے کوئی بچ کر نہیں جا سکتا" انھوں نے چھوٹے سے رول نما بید کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد نوکروں سے باری باری سوالات کرنا شروع کیے۔ کتنی تنخواہ ملتی ہے؟ کیا کام کرتے ہیں؟ کب سے کب تک کام کرنا پڑتا ہے۔ رات کو کون رک جاتا ہے؟ اور کون ایسا ہے جو رات کو اپنے گھر واپس چلا جاتا ہے؟ داروغہ جی نے سمجھایا بجھایا ڈرایا دھمکایا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

ادھر یہ باتیں ہورہی تھیں ادھر گڈو میاں اکڑتے ہوئے اپنی ممی کے پاس پہنچے اور پہنچتے ہی بولے

"پتا لگالیا ممی میں نے پتا لگالیا"

"کیا پتا لگالیا؟" ممی نے ان کو سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بھیا آپ بھی یہاں آئیے" گڈو میاں نے آواز دی۔ بھیا آگئے تو انھوں نے اپنا جملہ پورا کیا۔

"ہم نے چور کا پتا لگالیا"

بھیا نے جھلّا کر کہا "تمھیں اسکول میں یہ بھی پتا نہ رہتا ہو کہ اس کی پنسلیں اور ربر کہاں چلے جاتے ہیں وہ بھلا اس چوری کا کیا پتا لگائے گا"

"آپ یقین کیجیے بھیا پتا لگ گیا ہے۔ آپ بس دیکھتے جائیے ابھی کیا کیا ہوتا ہے اور آپ ابھی بھی تو رائے دیجیے۔ دیکھیں آپ کو کتنی کامیابی ہوتی ہے اس مقصے کو حاصل کرنے میں"

"میرے خیال میں تو یہ مالی کا کام معلوم ہوتا ہے" بھیا بولے "اس کا بیان ہے کہ رات وہ کئی بار اٹھا، اسے نیند نہیں آرہی تھی اور ایک بار چوراہے تک بھی ٹہلتا ہوا نکل گیا تھا یہ سب اس نے اپنے بچاؤ کے لیے ایک کہانی گڑھی ہے تاکہ بعد میں اگر کوئی کہے کہ رات مالی کو اس نے ادھر ادھر جاتے ہوئے دیکھا ہے تو اس کو صفائی نہ پیش کرنا پڑے جب وہ چوراہے تک گیا تھا تب ہی اس نے چوری کا مال اپنے کسی ساتھی کے حوالے کر دیا ہوگا"

"اوں ہوں" گڈو میاں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں یہ بات نہیں ممی آپ وعدہ کیجیے انعام دینے کا۔ میں نہ صرف چور کا پتا لگا لوں گا بلکہ سامان بھی برآمد کرادوں گا"

"کیسے؟ سامان کیسے برآمد کرادوگے جو کام پولس والے نہ کر سکے وہ تم کرنے کا دعوا کرتے ہو بہت ہوشیار ہو نا!"

"اور اگر پتا لگا لوں تو؟"

"کیسے پتا لگا لوگے؟ پولس، جسے دن رات اس طرح کے واقعات سے پالا پڑتا ہے وہ تو کچھ نہ کرسکی "کامک" اور جاسوسی کہانیاں پڑھ کر تم اتنے قابل ہو گئے کہ چور پکڑ لوگے، مال برآمد کرا دوگے، پولس والے منھ تکتے رہ جائیں گے"

"اچھا تم دونوں بے کار جھگڑا نہ کرو" ممی نے کہا "تم ہی بتاؤ گڈو کیا انعام لوگے" ان کے لہجے سے پتا چل رہا تھا جیسے وہ یہ بات گڈو کو صرف ٹالنے کے لیے کہہ رہی ہوں۔

"ممی یہ پتا لگا دے تو میں اس کو جتنی یہ مٹھائی کھا سکے گا کھلاؤں گا۔ تنہا اسی کو نہیں اس کے سارے دوستوں کو بھی کھلاؤں گا"

مٹھائی کا نام سنتے ہی گڈو میاں کے منہ میں پانی بھر آیا، انھوں نے خوشامد کرتے ہوئے کہا:

"بھیا تھوڑی سی پیشگی نہ دے دیجیے گا"

"نہیں، ہرگز نہیں۔ ممی گواہ ہیں ان کے سامنے میں وعدہ کرتا ہوں، اِدھر کام اُدھر انعام۔ بولو منظور؟"

"منظور" گڈو میاں کڑک کر بولے "اور امی آپ چھوٹی والی سائیکل دلوانے کا وعدہ کریں، آپ کا کام ہو جائے تب ہی دلوائیے گا بقول بھیا کے، پہلے کام پھر انعام۔"

"یہ بکواس تم ابو کے پاس جا کر کیوں نہیں کرتے۔" بھیا نے گڈو سے کہا۔

"ابھی مذاق اڑا لیں بھیا بعد میں شاباشی دینا پڑے گی آپ کو۔"

"اچھا چلو ممی کی طرف سے بھی میں ہی وعدہ کیے لیتا ہوں سائیکل کا اب دماغ نہ چاٹو۔"

"دیکھیے گا جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے آپ لوگوں کو میری باتوں پر ذرا بھی یقین نہ آرہا ہوگا۔ کچھ اور انتظار کیجیے حقیقت خود ہی سامنے آجائے گی۔"

بھیا کو غصہ آچلا تھا وہ گڈو کا ہاتھ تھام کر کھینچتے ہوئے ابو کے سامنے لے گئے۔

"ابو گڈو کا دعوا ہے کہ وہ چور کا پتا لگائے گا۔"

"اچھا!" ابو نے سگرٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا "اور کہتا ہے کہ سامان بھی برآمد کرادے گا" اور ابو اور بھی نہ جانے کیا کہہ رہا تھا، ہاں یاد آگیا، کہہ رہا تھا جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔"

"تم چور کا پتا بعد میں لگانا پہلے اس محاورے کا مطلب ہی بتا دو" ابو نے گڈو سے پوچھا۔

گڈو میاں سٹپٹا گئے۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولے، محاورے کا مطلب تو شاید نہ بتا سکوں مگر آپ کا سامان تھوڑی دیر میں آواز دے گا اسی سے میں نے کہا ہے کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔"

"تم تو بہت ہوشیار ہو ذرا کوئی اس سے پوچھے کہ اس کو آج جو پتلون پہن کر اسکول جانا ہے وہ کہاں رکھا ہے۔"

گڈو میاں کے پاس اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ اسکول سے واپسی کے بعد تو بس کھیل ہی کی جلدی پڑی رہتی ہے۔ بستہ اُدھر پھینکا، کپڑے موزے جوتے اِدھر اُدھر اچھالے اور بھاگے بیٹ بال لے کر۔ ممی ناشتے کے لیے پکارتی رہ جاتی ہیں۔

گڈو میاں خاموش کھڑے رہے پھر جیسے ہی جواب دینے کے لیے انھوں نے منہ کھولا ماما کی کوٹھری سے ٹائم پیس کے الارم بجنے کی آواز آنا شروع ہو گئی۔

"وہ بولا جادو" گڈو میاں بے تحاشہ اس جانب دوڑے جدھر سے آواز آرہی تھی۔ ایک ایک کرکے سب لوگ وہیں اکٹھا ہو گئے۔

واقعی چور پکڑا جا چکا تھا۔ سامان نے گڈو میاں کے دعوے کے مطابق واقعی آواز دی تھی۔

بھیا کھسیانی ہنسی ہنس رہے تھے۔

ممی نے گڈو کو اپنے قریب کھینچ لیا اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

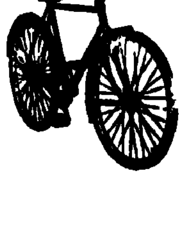
"میرے بیٹے کا سب مذاق اڑا رہے تھے اب کوئی کچھ نہیں بولتا۔ ایسے میں آج ہی سائیکل دلاؤں گی۔"

گڈو میاں بڑے فخر سے سب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ داروغہ جی بھی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قریب پہنچے۔ گڈو میاں ان کی طرف دیکھ مسکرانے لگے گویا کہنا چاہتے ہوں کہ دیکھیے جو کام آپ سے نہ ہو سکا وہ میں نے کر دکھایا۔

داروغہ جی کو ہی مخاطب کر کے انھوں نے کہنا شروع کیا: " ابو کی نظریں بچا کر ہم لوگ 'لان میں کرکٹ کھیلتے ہیں اکثر جب گیند دھکّو کے سے کسی کھڑکی یا دروازے کے شیشے سے ٹکراتا ہے تو شیشے کے ٹکڑے ٹوٹ کر کمرے میں گرتے ہیں۔ آج میں نے دیکھا تو شیشے کے ٹکڑے باہر کی طرف پڑے ہوئے ملے اس وجہ سے میں نے سوچا کہ ہو نہ ہو کسی نے اندر سے کنڈی کھولی شیشہ اس لیے توڑ دیا تاکہ دیکھنے والے سمجھیں کہ کنڈی کھولنے کے لیے شیشہ توڑا گیا ہے۔ اس نے نہ سوچا کہ شیشے پر اگر باہر سے چوٹ پڑتی تو اس کے ٹکڑے اندر کی جانب گرتے پھر جب مالی کا بیان میں نے سنا تو مجھے خیال ہوا کہ چور کو سامان لے جانے کا موقع نہ مل سکا ہوگا۔ سونے سے پہلے میں نے گھڑی میں چھ بجے کا الارم لگایا تھا گھڑی چھ بجے بولتی ہی۔

ماما کی کوٹھڑی کی تلاشی لی گئی تو چھوٹی موٹی اور بھی کئی چیزیں برآمد ہوئیں اُس کو اور اس کے لڑکے کو پولس کے سپرد کر دیا گیا۔

گڈو میاں کو سب نے انعام واکرام دیا۔ بھیّا نے مٹھائی کی دعوت کی۔ گڈو میاں کے سارے دوست اکٹھا ہوئے۔ گڈو میاں نے مزے لے لے کر دوستوں کو اپنا کارنامہ سنایا۔ ممّی نے چھوٹی سی سائیکل اور ابّو نے کرکٹ کا سامان منگا کر دیا اس تاکید کے ساتھ کہ گیند گھر کی طرف نہ آنے پائے ورنہ پٹائی ہوگی۔





بچوں سے خطاب

کوثر انصاری

ماں باپ کا کرو گے جب احترام بچّو!
پا جاؤ گے جہاں میں اعلا مقام بچّو!

اللہ میاں کا ہر دم ہو لب پہ نام بچّو!
وہ شخص ہو سکے گا جنّت مقام بچّو!

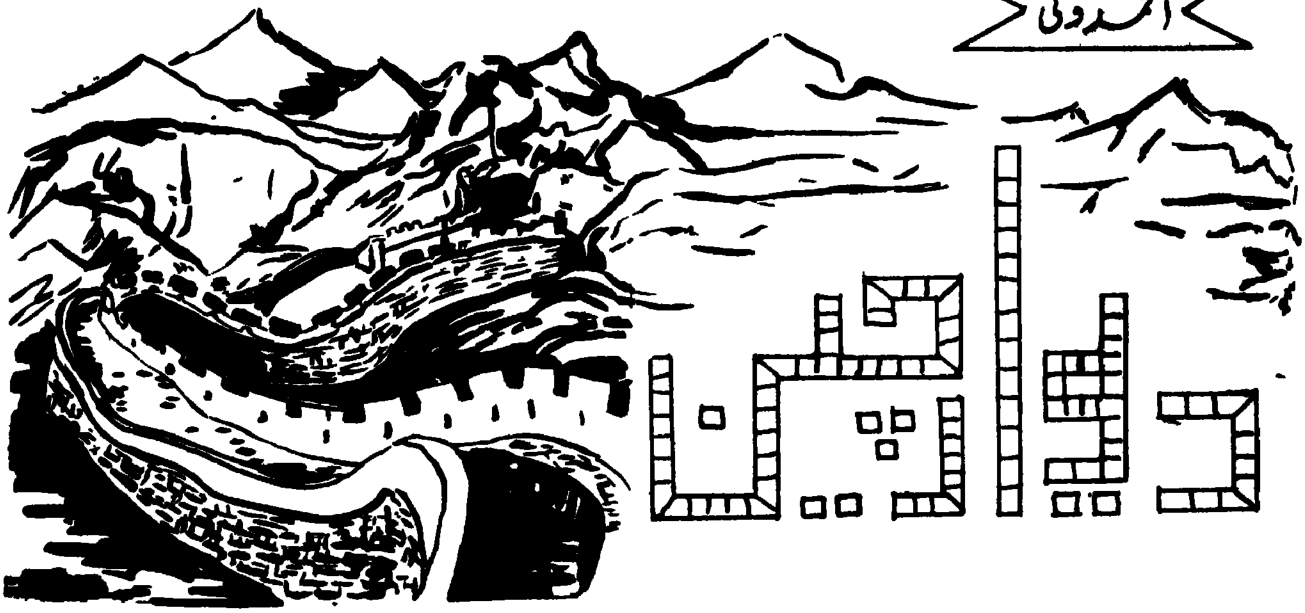
نیکی کی راہ چلنا، اعمال بد سے بچنا!
اس طور ہو سکو گے تم شاد کام بچّو!

علم و ہنر میں کامل ہو جاؤ گے جہاں تم!
عزت سے نام لیں گے سب خاص و عام بچّو!

کوثر یہ نیک عادت ہے سب سے نیک فطرت
اپنے سبھی بڑوں کو کرنا سلام بچّو!

اندھیری نمبر ۱ میونسپل اردو اسکول۔ بمبئی

احمد ولی



دیوار چین

آج کی دنیا عجائبات کی دنیا ہے۔ جدھر نگاہ اٹھائیے آپ کو کوئی نہ کوئی چیز ایسی ضرور نظر آئے گی جسے دیکھ کر عقل حیران رہ جائے۔ پھر بھی ہمیں یہ چیزیں عجیب معلوم نہیں ہوتیں اس کا سبب کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ آج دنیا اتنی ترقی کر چکی ہے اور ہماری معلومات اتنی زیادہ ہوگئی ہیں کہ آج کی بہت عجیب چیزیں بھی عجیب نہیں معلوم ہوتیں۔

آج سے پچاس برس پہلے ہوائی جہاز اور ریڈیو کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب ہوائی جہاز تیار ہوا تو اس وقت کے لوگوں کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ کبھی آسمان پر گڑگڑاہٹ کی آواز ہوتی تھی تو لوگ گھروں میں سے نکل کر بڑی حیرت سے اسے دیکھتے تھے۔ آج دن بھر میں نہ جانے کتنے ہوائی جہاز ہمارے سروں پر سے گزر جاتے ہیں اور ہم پرواہ بھی نہیں کرتے۔ یہی حال ریڈیو کا ہے۔ اسی طرح اور ایسی ایجادیں ہیں جن کو ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

بات یہ ہے کہ انسان جیسے جیسے علم حاصل کرتا جاتا ہے اس کی معلومات بڑھتی جاتی ہیں اور کل کی عجیب چیزیں اسے آج معمولی نظر آنے لگتی ہیں۔

اس کے باوجود بعض چیزیں آج بھی ایسی موجود ہیں جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ انھیں میں چین کی بڑی دیوار بھی ہے جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کی جاتی ہے۔ دیوار چین پورب کے سمندری ساحل سے شروع ہوکر اتری چین کے جنگلوں تک چلی گئی ہے۔ اس کی لمبائی ۱۴۰۰ میل ہے اور یہی اس کی سب سے عجیب خوبی ہے۔ آج کل دنیا میں اتنی لمبی کوئی دیوار کہیں نہیں ہے۔ اس زمانے میں انسان کے پاس جتنے وسائل ہیں ان کی مدد سے چودہ ہزار میل بلکہ اس سے بھی زیادہ لمبی دیوار بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ لیکن آج سے دو ہزار سال قبل جب نہ آمد و رفت کے وسیلے تھے نہ تار اور ٹیلیفون تھے کہ خبر ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جا سکیں، اس وقت اتنی لمبی دیوار کا بنایا جانا یقیناً بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کے بنانے والے کی ہمت اور عزم کا

جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

بتا دیتا ہے۔

یہ دیوار حضرت مسیح سے تین سو سال پہلے یعنی اب سے تقریباً ۲۲۵۲ سال پہلے شہنشاہ شی ہوانگ کے حکم سے بنوائی گئی تھی۔ چین کے اتر میں منگولیا کا علاقہ ہے۔ یہاں کے باشندے تاتاری کہلاتے تھے۔ قتل و غارت گری ان کا پیشہ تھا۔ یہ لوگ چین میں آکر لوٹ مار کرتے تھے۔ شہنشاہ شی ہوانگ نے پہلے تو فوج کے ذریعے تاتاریوں سے ملک کو پاک کیا، لیکن جب بھی موقع ملتا ان کے جتھے ملک میں گھس آتے اور مال اسباب لوٹ کر لے جایا کرتے۔ شی ہوانگ کو اپنی رعایا کا بڑا خیال تھا اس لیے اپنی رعایا کو تاتاریوں سے بچانے کی یہ ترکیب کی کہ ایک اونچی دیوار بنانے کا حکم دے دیا۔ حکم ملنے کی دیر تھی دیوار بنا شروع ہوگئی ہزاروں مزدوروں نے کام شروع کر دیا اور بارہ فٹ چوڑی اور بیس پچیس فٹ اونچی یہ دیوار تیار کر دی جو آج بھی موجود ہے۔ اس دیوار پر ہر ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر اس سرے سے اس سرے تک پندرہ ہزار برجیاں بنائی گئی تھیں جن میں پہرے دار رہا کرتے تھے اور ملک کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ یہ برج چالیس فٹ اونچائی پر بنائے گئے تاکہ دور ہی سے دشمن کے ارادوں کا پتا چل سکے۔

ساری دیوار مٹی اور اینٹوں کی بنی ہوئی ہے اور سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی، جنگل کو روندتی، پہاڑوں کو سر کرتی اور دریاؤں کو عبور کرتی شمالی ریگستان تک چلی گئی ہے۔

اس دیوار کے متعلق ایک اور بھی دلچسپ حکایت مشہور ہے کہتے ہیں کہ شی ہوانگ موت سے بہت ڈرتا تھا اسے کسی نجومی نے بتا دیا تھا کہ اس کی موت کا فرشتہ اُتر کی طرف سے آئے گا اسی نجومی نے شی ہوانگ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ چین کے اُتر میں ایسی دیوار بنا دے کہ موت کا فرشتہ چین میں نہ داخل ہو سکے اس لیے شی ہوانگ نے اس دیوار کے بنائے جانے کا حکم دیا۔ مگر موت سے کہاں بچتا ابھی دیوار پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ شی ہوانگ کے پاس موت کا فرشتہ آپہنچا اور اس کی روح کو قبض کر لیا۔

یہ تو خیر ایک قصہ ہے لیکن دراصل دیوار حملہ آوروں سے بچنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اور آج دیوار چین ڈھائی ہزار برس گزر جانے پر بھی اپنے بنانے والے کی عزم و ہمت اور استقلال کا فسانہ سنائے جا رہی ہے۔ سوائے بعض مقامات کے جہاں یہ دیوار کچھ گر گئی ہے پوری دیوار اچھی حالت میں موجود ہے اور شی ہوانگ کے نام کو زندہ کیے ہوئے ہے۔



"ایک صاحب کے پاس "پیام تعلیم" کا شمارہ ۹ دیکھنے کو ملا، سید محمود نقوی صاحب کا مضمون شمارہ کی جان ہے۔ اپنے مضمون میں نقوی صاحب نے بڑی بات (دنیاوی علم کی اہمیت) کو بچوں کے لیے نہایت آسان طریقہ سے پیش کیا ہے۔ ویسے حق تو یہ ہے کہ بڑے بھی اس حقیقت سے کم واقف ہیں کہ زندگی میں کامیابی کے لیے کتابی علم کافی نہیں۔ دوسرے مضامین بھی ٹھیک ہیں۔ بچوں میں ادبی ذوق اور اعلا اخلاق پیدا کرنے کے لیے رسالہ کے زر سالانہ میں رعایت کریں تو بہتر ہوگا۔"

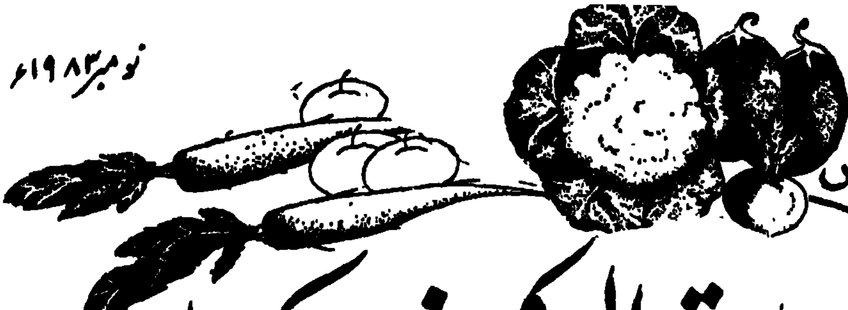
ابو شافع

معرفت "العظیم" ہفت روزہ، ایوت محل

"مسلم سکوں والا مضمون معلوماتی ہے۔ ایک چیز میں تلاش کرتا رہا۔ ہمایوں کی جان ایک سقّہ نے بچائی تھی جس کے بدلہ میں ہمایوں نے ایک دن کی بادشاہت اس سقّہ کو سونپی تھی۔ ایک دن کے سلطان نے چرڑہ کا سکّہ جاری کیا تھا کیا حقیقت ہے؟ اگر اس کا ذکر آجاتا تو مضمون کی قیمت دوبالا ہو جاتی۔"

مقصود احمد مکی

جونی لائن بلاسپور ایم پی ۴۹۵۰۰۱



ڈاکٹر لطافت علی خاں
ایم ڈی (یونانی)

ادرک استعمال کرنے کے فائدے



ادرک ادویات میں قدیم زمانے سے استعمال ہوتی ہے۔ اس کو غذا کے طور پر بھی عرصۂ دراز سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ادرک کا پودا تین چار فٹ اونچا ہوتا ہے۔ اس کے پتے دس انچ لمبے اور ڈیڑھ انچ چوڑے اور نوک دار ہوتے ہیں۔ اس میں پھول بینگنی یا جامنی رنگ کے آتے ہیں۔ اس میں تخم نہیں آتے ہیں۔ ادرک کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے زمین میں گاڑ دیتے ہیں، جب ادرک کے پودے کے پھول آکر غائب ہو جاتے ہیں اور تنے مرجھا جاتے ہیں، تو یہ وقت ادرک کو نکالنے کا اچھا سمجھا جاتا ہے۔ یہ تمام ہندستان میں پائی جاتی ہے۔ اس سے روغن بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ سوکھنے کے بعد یہ سونٹھ بن جاتی ہے اس کا ستر فیصد وزن سوکھنے پر کم ہو جاتا ہے یونانی طب میں سونٹھ کام میں لی جاتی ہے۔

ادرک اس کو ہلکی زردی مائل اور ذائقے میں تیز و چرپری ہوتی ہے۔ یونانی اطبا اس کی تاثیر گرم و خشک بتاتے ہیں۔

ادرک بلغمی امراض میں مفید ہے۔ اس کو بھوک کی کمی، بدہضمی، پیٹ کے اپھارہ و درد، ضعف اعصاب، فالج و لقوہ میں ایک گرام کی مقدار میں تنہا یا شہد میں ملا کر دینے سے فائدہ ہوتا ہے۔ یہ مروڑ پیدا کرنے والی ادویہ کی اصلاح کرتی ہے آنتوں اور معدے کی رطوبات کی وجہ سے جو دست آتے ہیں ان کو بند کرتی ہے۔ پیٹ کے کیڑے مارتی ہے۔ اسکو سیلان الرحم و ضعف باہ میں استعمال کراتے ہیں۔ یہ ذہن و حافظے کو قوی کرتی ہے۔ ریاح کو تحلیل اور پیٹ کو نرم رکھتی ہے۔ اس کو بطور سرمہ پیس کر آنکھ میں لگانے سے پھولا، جالا اور دھند کے جاتے رہتے ہیں۔ اس کو دمہ اور کھانسی میں کھلانا مفید ہے۔ اس کو تیل میں جلا کر اس تیل کی بیرونی طور پر مالش کرنے سے ریاحی درد ختم ہو جاتا ہے۔

ایک تولہ ادرک کے رس کو ایک تولہ شہد میں ملا کر دن میں دوبارہ نیم گرم استعمال کرانے سے کھانسی میں فائدہ ہوتا ہے۔ چھ ماشہ ادرک کو نمک کے ساتھ ایک ہفتے تک مسلسل استعمال کرانے سے ہاضمہ درست ہو جاتا ہے۔ نیز بھوک میں اضافہ اور قبض ختم ہو جاتا ہے۔ ادرک کا رس اور ادرک ملا کر دو چمچے الٹی کے مریض کو پلانے سے الٹی رک جاتی ہے۔ ایک تولہ ادرک کو ایک تولہ شہد میں ملا کر گرم کرکے پلانے سے نزلہ زکام اور حلق کی خراش میں فائدہ ہوتا ہے تین ماشہ سونٹھ کو متواتر ایک ہفتے تک آب تازہ

کے ہمراہ استعمال کرانے سے دانت کا درد ختم ہو جاتا ہے۔ ایک ماشہ ادرک کا سفوف تنہا یا شہد میں ملا کر استعمال کرانے سے کھانا ہضم ہوتا اور پیٹ کے اپھارے کو فائدہ ہوتا ہے۔ اس کا مربہ پیٹ کو صاف کرتا ہے۔ اس کو مقوی باہ معجونوں میں شامل کرتے ہیں۔ یہ حلق کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس کے مضر پہلو کی اصلاح روغن بادام شیریں ملانے سے ہو جاتی ہے۔ طب یونانی میں یہ مختلف صورتوں سے استعمال کرائی جاتی ہے مثلاً جوارش سفوف، لبوب، معجون، مفرجات وغیرہ طب جدید میں اس کو ٹنکچر کی صورت میں استعمال کرایا جاتا ہے۔ غذا کے بطور اس کو دالوں اور سبزیوں میں جو دیر میں ہضم ہوتی ہیں، ہضم جلد ہونے کے لیے مناسب مقدار میں ڈالا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل مرکبات میں یہ دوسری ادویہ کے ساتھ ایک خاص جز کے طور پر پائی جاتی ہے مثلاً جوارش زنجبیل، جوارش کمونی، جوارش جالینوس، جوارش بسباسہ، معجون ذہبیل لبوب کبیر، مفرح اعظم و مفرح کبیر وغیرہ۔

پیامِ تعلیم قمری کیلنڈر ۱۴۰۴ھ

ربیع الثانی / رمضان	ربیع الاول / شعبان / ذی الحجہ	رجب	صفر / ذی قعدہ	جمادی الثانی / شوال	محرم	جمادی الاول	عبد المجید آئینکل				
جمعرات	بدھ	منگل	پیر	اتوار	ہفتہ	جمعہ	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹
جمعہ	جمعرات	بدھ	منگل	پیر	اتوار	ہفتہ	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰
ہفتہ	جمعہ	جمعرات	بدھ	منگل	پیر	اتوار	۳	۱۰	۱۷	۲۴	★
اتوار	ہفتہ	جمعہ	جمعرات	بدھ	منگل	پیر	۴	۱۱	۱۸	۲۵	★
پیر	اتوار	ہفتہ	جمعہ	جمعرات	بدھ	منگل	۵	۱۲	۱۹	۲۶	★
منگل	پیر	اتوار	ہفتہ	جمعہ	جمعرات	بدھ	۶	۱۳	۲۰	۲۷	★
بدھ	منگل	پیر	اتوار	ہفتہ	جمعہ	جمعرات	۷	۱۴	۲۱	۲۸	★

طلحہ بن ابو سلمہ ندوی

انصاف پسند قاضی

جس زمانے میں سندھ پر مرزا شاہ حسن ارغون بادشاہت کرتا تھا، اُس وقت سندھ کا سب سے بڑا شہر بکر تھا۔ مرزا شاہ حسن کے علم اور انصاف کی باتیں سن کر ایران کے شہر شیراز سے ایک آدمی سید شکر اللہ بکر میں آیا۔ مرزا شاہ حسن نے اُس کی قابلیت کو دیکھ کر بکر کا بڑا قاضی مقرر کر دیا۔ سید صاحب نے اس عہدے کو ایسی سچائی اور انصاف سے چلایا کہ آج بھی کتابوں میں سید صاحب کا نام سچائی اور انصاف کے لیے مشہور ہے۔

ایک دفعہ ایک سوداگر عرب سے ایک گھوڑا بیچنے کے لیے بکر میں آیا۔ مرزا شاہ حسن نے گھوڑا پسند کر کے خرید لیا اور حکم دیا کہ گھوڑے کی قیمت خزانچی سے لے لے۔ دوسرے دن صبح کو سوداگر گھوڑے کی قیمت لینے خزانچی کے پاس گیا۔ مگر خزانچی نے رقم دینے سے انکار کر دیا۔ سوداگر بادشاہ کے دربار میں گیا۔ مگر وہاں سے بھی کوئی جواب نہ ملا۔ آخر وہ بے بس ہو کر شہر کے سب سے بڑے قاضی کے پاس پہنچا اور فریاد کی۔ قاضی نے فریاد سن کر بادشاہ یعنی مرزا شاہ حسن کو حکم دیا کہ عدالت میں حاضر ہو۔ اُس وقت بادشاہ کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دینا آسان بات نہ تھی۔ بادشاہ کو قاضی کا حکم عجیب لگا۔ مگر مرزا شاہ حسن عدالت میں حاضر ہوئے۔ قاضی بادشاہ کے ادب و احترام کے لیے اپنی جگہ سے نہیں اُٹھا اور نہ ہی اُسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ قاضی نے سوداگر کی فریاد کا جواب مانگا۔ بادشاہ نے سوداگر سے گھوڑے کی خریداری قبول کی اور گھوڑے کی قیمت فوراً ادا کر دی۔ جب فیصلہ ہو گیا تو قاضی اپنی جگہ سے اُٹھا اور بادشاہ کو ادب سے سلام کیا اور کہا "بادشاہ سلامت! انصاف کے لیے ضروری تھا کہ میں آپ کو عدالت میں طلب کرتا۔ اب فیصلہ ہو چکا ہے تو میری جگہ آپ کی ہے اور میں آپ کا خادم ہوں"۔ مرزا شاہ حسن بادشاہ یہ انصاف دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

بدر جہاں

نوبل پرائز

نوبل پرائز ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو کوئی بھی ایسا کام کرتے ہیں جو دنیا میں امن قائم کرنے میں مددگار ثابت ہو۔ یا کوئی بہت بڑا ادیب، شاعر، فلسفی، یا سائنس داں ہو۔ یہ انعام آٹھ ہزار پونڈ کا ہوتا ہے۔ اس انعام کے جاری کرنے والے شخص کا نام الفرڈ نوبل تھا۔

الفرڈ نوبل سویڈن کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ ایک معمولی تاجر تھا۔ نوبل ۲۱ اکتوبر ۱۸۳۳ء میں اسٹاک ہوم میں پیدا ہوا۔ الفرڈ نوبل نو برس کا ہوا تو اس کے گھر والے اپنی غریبی سے تنگ آکر سینٹ پیٹرس برگ چلے گئے۔ یہ شہر روس کا دارالخلافہ تھا، جسے اب لینن گراڈ کہتے ہیں۔ نوبل نے ابتدائی تعلیم گھر پر رہ کر حاصل کی۔ اس درمیان اس نے پانچ زبانیں سیکھ لی تھیں۔ ۲۹ سال کی عمر میں وہ کیمسٹری کا ماہر ہو گیا اور اس نے نیٹرو گلیسرین ایجاد کی۔ وہ لگاتار محنت کرتا رہا اور مسلسل خطرناک تجربوں کے بعد اس نے ۱۸۶۶ء میں ڈائنامیٹ ایجاد کی یہ بارود کی ایک قسم ہے جس سے بڑے بڑے پہاڑوں اور چٹانوں کا نام و نشان مٹایا جا سکتا ہے۔ ایسی خطرناک چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا بہت مشکل کام تھا، اس لیے نوبل نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ ڈائنامیٹ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکے۔ اب تو اس کے تجربوں اور تجارت کی شہرت دور دور پھیلنے لگی۔ وہ لگاتار سفر میں رہنے لگا۔ لوگ مذاق میں نوبل کو "یورپ کا سب سے بڑا آوارہ گرد" کہتے۔ نوبل نے بہت سی دولت پیدا کی اور اسی طرح اس دولت کو خرچ بھی کیا وہ اپنے ملازموں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتا تھا۔ اُن کے رہنے کے لیے ہوادار مکانات بنواتا، اور اپنے منافع میں سے ان لوگوں کو بھی حصہ دیا کرتا۔

نوبل نے ڈائنامیٹ کی ایجاد اس لیے نہ کی تھی کہ اس سے لڑائیوں میں انسانوں کی جان لی جائے اس نے کئی بار صاف صاف کہا:— "میں نے یہ ایجاد صرف اس لیے کی ہے کہ اس کے ذریعے دنیا بھر میں چٹانیں اور پہاڑوں سے پتھر اکھاڑے جا سکیں۔ کانوں کے اندر سے ہر قسم کی دھات نکالی جا سکے۔" نوبل کو جنگ سے سخت نفرت تھی۔ وہ کبھی یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ دو قومیں ایک دوسرے سے جھگڑا کریں۔ اسی لیے نوبل نے ایک خاص انعام مقرر کیا کہ اگر کوئی شخص ایسا اچھا کام کرے جس سے قوموں میں محبت اور دوستی پیدا ہو، یا اس قسم کی انجمن بنائی جائے جس سے دنیا میں امن قائم ہو تو وہ انعام اسے دیا جائے گا۔

نوبل نے اپنی جائیداد کی وصیت خود لکھی تھی۔ اسی جائداد کی آمدنی سے آج تک ہر سال یہ انعام دیا جاتا ہے۔ ملک، قوم، رنگ و نسل کی کوئی قید نہیں۔ ہر ملک ہر قوم، ہر مذہب ہر فرقے کے لوگ خواہ مرد ہوں یا عورت، اس انعام کو حاصل کر سکتے ہیں۔

۲۲۷ - ایس، این، ہال، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نتیجہ انعامی کارٹون

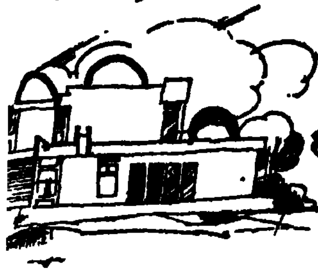
بے شمار آئے ہوئے جوابات میں سے مندرجہ ذیل دو پیامیوں کو انعام کا مستحق سمجھا گیا۔ ان دونوں کو پانچ پانچ روپے کی کتابیں بھجوائی جا رہی ہیں (۱) "یہ آم کیوں نہیں کھاتا۔ اس کی جگہ اگر میری گردن اتنی لمبی ہوتی تو میں یہ سب آم توڑ کھا لیتا۔"

راشد اشرف وانی۔ درگمولہ۔ کپواڑہ (کشمیر)

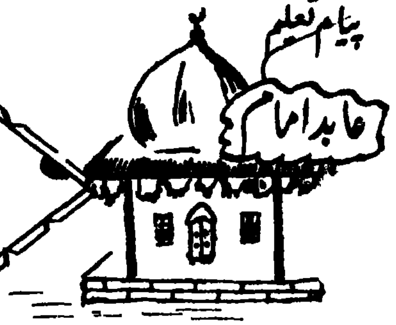
(۲) میرے بھی باپ دادا کا نام کسی دانے پر لکھا ہے یا نہیں۔ ذرا دیکھے۔

ایس، ایس، ایف، آر، نادر

ضلع پریشد اور مڈل اسکول، کالمب ۴۴۵۴۰۱



کردہ کے بزرگ



جس طرح دلّی کا ایک علاقہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی بستی کے نام سے مشہور ہے اسی طرح کوکن میں ایک چھوٹی سی پرانی بستی ہے جو آج کل عام طور پر بابا حسام الدین کی بستی کے نام سے پہچانی جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بستی کو کوکن کے ایک مشہور اور محترم صوفی حضرت بابا سید حسام الدین صاحب قادری کا مولد اور مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے. حسام الدین صاحب کو لوگ بابا حسامیؒ کے نام سے بھی جانتے ہیں کیوں کہ وہ ایک بلند پایہ صوفی شاعر بھی ہیں اور حسامیؔ ان کا تخلص ہے۔ ان کی بستی میں ان کی جو خانقاہ (رہنے کی جگہ) ہے وہ "بیت النور" کے نام سے مشہور ہے۔

بابا حسام الدین کی یہ بستی ایک چھوٹے سے گاؤں کی شکل رکھتی ہے اور اس کا اصلی نام 'کردہ' ہے اور چوں کہ یہاں بہت سے ولیوں اور صوفیوں کے مزارات ہیں اس لیے لوگ اسے احترام اور عقیدت سے کردہ شریف کہتے ہیں. یہ چھوٹی سی گر خوبصورت بستی ہے مہاراشٹر کے ساحلی علاقے کوکن کے ضلع رتناگیری میں داپولی سے تقریباً تیرہ کلومیٹر کے فاصلے پر مشہور تاریخی گاؤں مروڈ کے پاس ناریلوں اور آموں کی چھاؤں میں آباد ہے۔

اس بستی میں بابا حسام الدین صاحب کے خاندانی بزرگانِ کرام کے متعدد مزارات موجود ہیں جن کے باعث کوکن کے ایک قدیم متبرک اور مقدس مقام کی حیثیت سے اس بستی کو دور دور تک شہرت حاصل ہے۔

حسام الدین صاحب کے مورثِ اعلیٰ سید حسام اللہ شاہ صاحب قادریؒ کوئی ڈھائی تین سو برس پہلے بیجاپور سے کوکن میں آئے تھے اور کردہ کی اس بستی میں آباد ہوئے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے ایک کامل ولی اور بڑے پایے کے بزرگ تھے۔ کہتے ہیں کہ زندگی کے آخری ایام میں وہ شہر رتناگیری میں اپنے مرشد' بابا کمال الدین شاہؒ صاحب کی خدمت میں چلے گئے تھے اور وہیں ان کا وصال ہوا تھا۔ ان کا مزار شہر رتناگیری میں آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔ ان کے مرشد کا مزار مبارک بھی رتناگیری ہی میں ہے جو وہاں کے خوب صورت علاقے "مانڈوی" میں لبِ ساحل واقع ہے اور جس کی دیکھ بھال کا کام کئی پشتوں سے ایک ہندو گھرانے کے ذریعے ہوتا چلا آرہا ہے۔

سید حسام اللہ شاہؒ صاحب کے بعد ان کے قادری خاندان میں جتنے بھی دوسرے بزرگانِ کرامؒ ہو چکے ہیں ان سب کے مزارات کردہ ہی کی بستی میں موجود ہیں جن کے نور سے یہ بستی شب و روز جگمگاتی رہتی ہے اور ان مزارات میں خوابیدہ بزرگوں کے روحانی فیوض و برکات ہی کا یہ اثر ہے کہ کردہ کی بستی کو خطۂ کوکن میں روحانیت اور تصوف کا ایک قدیم گہوارہ تصور کیا جاتا ہے۔

اس بستی میں قادری خاندان کے صوفیوں اور ولیوں کے جو مزارات ہیں ان میں سید جلال الدین صاحب قادریؒ کا مزار سب سے زیادہ اہم اور قابلِ ذکر ہے یہ مزار لگ بھگ دو سو برس پرانا ہے۔ سید جلال الدین صاحب' حضرت حسام اللہ شاہ صاحبؒ قادری کے صاحبزادے اور ان کے جانشین تھے۔ وہ اپنے دور کے بہت ہی مشہور بزرگ گزرے ہیں اور متعدد کرامات ان سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ کردہ کی بستی میں قادری گھرانے کے جن بزرگوں کے مزارات ہیں اُن میں سید رکن الدین صاحب قادریؒ، سید احمد صاحب قادریؒ اور سید حسن صاحب قادری وغیرہ کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ ●

ڈمنگر کوارٹرس. مدن گیر روڈ. ڈابھلی۔ ۱۲، ۴۱۵۷

کیسے کیسے لوگ

ابن علی سینا

جاوید اقبال

ابن علی سینا جنھیں مغرب ادی سینا (Avicenna) کے نام سے جانتا ہے، اس قدر بلند پایہ حکیم، طبیب اور عالم گزرے ہیں کہ انھیں شیخ الرئیس کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

شہر بلخ کا رہنے والا ایک شخص عبداللہ، نوح بن منصور کے دور حکومت میں بلخ سے نکل کر بخارا پہنچا اور وہیں سکونت پذیر ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد انھیں قریبی علاقے کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔ انھی عبداللہ کے گھر ۹۸۰ء میں ایک بچے نے آنکھیں کھولیں۔ نام حسین رکھا گیا۔ دس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے قرآن پڑھ لیا اور اچھا خاصا علم سیکھ لیا۔ عمر کو دیکھتے ہوئے لوگ ان کی ذہانت اور علم پر حیرت کا اظہار کرتے۔

علم ریاضی کے حصول کے لیے انھیں ایک حساب کے عالم سبزی فروش کے پاس بھیجا گیا جس سے شیخ نے حساب کا علم حاصل کیا۔ کچھ عرصے بعد شیخ کی ملاقات ایک مشہور فلسفی اور عالم عبداللہ نائیلی سے ہوئی۔ نائیلی سے انھوں نے منطق پڑھی۔ استاد نے جلد ہی اس گوہر کو پہچان لیا اور اُن کے والد کو مشورہ دیا کہ شیخ کی تعلیم کا مناسب اور معقول انتظام کیا جائے۔ آہستہ آہستہ شیخ نے اپنے مطالعے اور استادوں کی مدد سے فلسفہ، منطق اور سائنس کی بہت سی کتابوں کو پڑھا اور ان سے علم حاصل کیا۔ انھوں نے ریاضی اور علم اقلیدس (Geometry) کی مشہور کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ریاضی اور سائنس سے شیخ کو بچپن ہی سے گہری دل چسپی تھی۔

کچھ عرصے بعد شیخ کو علم طب سے دل چسپی پیدا ہوئی اور صرف سولہ سال کی عمر میں طب میں وہ مہارت حاصل کر لی کہ اُس زمانے کے ماہر طبیبوں سے اس فن پر تبادلۂ خیال اور بحث کر سکتے تھے۔ اختراع پسند اور ذہین بچپن سے ہی تھے۔ فن کی بلندیوں اور گہرائیوں کو سمجھنے کے علاوہ شیخ نے طب کے میدان میں کچھ اضافے بھی کیے اور باقاعدگی سے علاج معالجہ بھی شروع کر دیا۔ جلد ہی شیخ کی شہرت پھیلنے لگی۔

مطالعے سے بے انتہا دل چسپی تھی۔ جو کتاب پائی ختم کیے بغیر نہ چھوڑی۔ فلسفہ، منطق (Logic) طب اور ریاضی کے علاوہ ادب سے بھی گہری دل چسپی تھی۔ ہمیشہ نئی نئی کتابوں کی تلاش میں رہتے۔ مشکل سے مشکل کتابوں کو بھی اتنی ہی دل چسپی سے پڑھتے۔ ارسطو کی کتابیں جنھیں سمجھنا عام لوگوں کے لیے انتہائی مشکل تھا، ابن علی سینا کے لیے جد و جہد اور مسلسل کوشش کے بعد اتنی ہی آسان ہو گئی تھیں جتنی اُن کے ہم عصروں کی لکھی کتابیں۔ سچ ہے محنت اور مسلسل جد و جہد سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

بخارا کا حاکم نوح ابن منصور اتفاق سے اُس زمانے میں سخت بیمار پڑا۔ بڑے بڑے اطبّا اور حکیم ہر ممکن کوشش کر کے ہار گئے۔ لیکن حاکم کے اس مرض کا علاج نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ سب کے آخر میں بو علی سینا کو بلایا گیا۔ چنانچہ جس مرض کا علاج دوسرے حکما نہ کر سکے، شیخ کی قابلیت اور

۱۱۳ - مین بازار، جامعہ نگر نئی دہلی

خدا کے حکم سے شیخ کے علاج سے نوح بن منصور کو شفا ہو گئی اور انھیں حاکم کی ملازمت مل گئی۔ ملازمت قبول کرتے وقت شیخ کی نظر شاہی کتب خانے پر تھی۔ صرف اس خیال سے کہ ملازمت کے بعد انھیں اس کتب خانے سے استفادہ کرنے کا موقع مل سکے گا، انھوں نے یہ ملازمت اختیار کر لی۔ شیخ نے موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ان کا بیشتر وقت کتب خانے میں گزرتا۔ یہاں دن رات وہ مطالعے میں مستغرق رہتے۔ کچھ عرصے بعد بڑا حادثہ ہوا۔ کتب خانے میں آگ لگی اور ساری کتابیں جل کر خاک ہو گئیں۔ لیکن شیخ اس وقت تک بیشتر کتابوں کا مطالعہ کر چکے تھے۔

اکیس سال کی عمر میں فن ریاضی پر ایک دقیق کتاب "مجموعہ" لکھی۔ کچھ عرصے بعد فقہ اور قانون پر ایک کتاب "ابرد الاثم" لکھی۔ شیخ بائیس سال کے تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اب شیخ نے سلطان منصور کی ملازمت ترک کر دی اور خوارزم چلے گئے۔ باقی تمام عمر شیخ ایک شہر سے دوسرے شہر سکونت منتقل کرتے رہے۔ کچھ عرصے جرجان میں قیام کیا اور اسی شہر میں طب کی مشہور کتاب "قانون" لکھی۔

شہر 'رے' میں مجد الدّولہ کے دربار سے منسلک ہوئے۔ مجد الدّولہ 'مالی خولیا' کا مریض تھا۔ شیخ نے اس مرض کا کامیاب علاج کیا۔ مجد الدّولہ نے اُنھیں اپنا وزیر بنا لیا۔ کچھ لوگوں کی ناراضی کی بنا پر شیخ کو وزارت سے برطرف کر دیا گیا اور انھیں 'رے' سے نکال دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد اصفہان گئے۔ وہاں اُن کا زبردست استقبال کیا گیا۔ یہیں ۱۰۳۷ء میں انتقال کیا۔

شیخ نے متعدد کتابیں اور رسالے لکھے جو اپنی اپنی جگہ پر مکمل ہیں۔ شیخ کی لکھی طب کی دو مشہور کتابیں "قانون" اور "طبیعیات الشفاء" ہیں جو کہ ضخیم جلدوں میں ہیں اور جن کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

عظیم شخصیتیں

محمد زبیر آفاق

(۱) مشہور سائنس داں نیوٹن تمام لڑکوں سے بہت کم نمبر لیا کرتا تھا اور وہ کئی دفعہ امتحان میں فیل بھی ہوا۔

(۲) سر والٹر اسکاٹ انگلستان کا سب سے اچھا ناول لکھنے والا تھا۔ وہ کبھی اسکول کا کام کر کے نہ لے جاتا۔ اس کے استاد اُس سے ہمیشہ ناراض رہا کرتے۔

(۳) نپولین اپنی جماعت میں بیالیسویں درجے پر رہا کرتا لیکن جو اکتالیس لڑکے پڑھائی میں اُس سے ہوشیار تھے آج اُن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

(۴) جیمز رسل لاویل کو لاپروائی کی بنا پر ہارورڈ یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا۔

(۵) لارڈ کلائیو بنگال کا گورنر بننے سے پہلے ایک معمولی کلرک تھا۔

(۶) نپولین بونا پارٹ فرانس کا شہنشاہ فوج کا ایک معمولی سپاہی تھا۔

(۷) روس کے بڑے لیڈر ٹراٹسکی نے ایک دفعہ حساب میں سَو میں سے صرف دو نمبر حاصل کیے تھے۔

(۸) ہنس اینڈرسن بچوں کا ہر دل عزیز ادیب ایک موچی کا بیٹا تھا۔

(۹) مسولینی اٹلی کا ڈکٹیٹر ایک لوہار کا بیٹا تھا۔

(۱۰) اس زمانے کا سب سے بڑا سائنس داں آئن اسٹائن میٹرک کے امتحان میں فیل ہو گیا تھا۔

(۱۱) قطب الدّین ایبک غلام خاندان شاہی کا بانی جس نے قطب مینار کی بنیاد ڈالی تھی نیشاپور کے قاضی اعظم کے ہاتھوں دو روپے کا فروخت شدہ غلام تھا۔

پیارے بچو! دیکھا آپ نے، عظیم شخصیتیں بچپن میں کیا رہیں اور وقت پر کیا بنیں؟ مسلسل محنت، وقت کی قدر اور علم و فن حاصل کر کے شخصیتیں کیسے چمکتی ہیں؟ آپ بھی کچھ بننے اور چمکنے کے لیے اپنی محنت جاری رکھیے۔

۲۵۰- ابراہیم صاحب اسٹریٹ مسلم پور وانمباڑی (این-اے) این ۷۵۱-۶۳۵



ایک انگریز: (ہوٹل کے بیرے سے) یہاں کھانے کو کیا کیا چیزیں ملتی ہیں؟

بیرہ: پلاؤ، گوشت، قورمہ، بریانی، وغیرہ وغیرہ۔

انگریز: تو بیرا! ہم کو وغیرہ وغیرہ ہی دو۔ یہ کوئی نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔

استاد: بتاؤ، برف کا مونث کیا ہے؟

شاگرد: برفی!

استاد: آج تم نے کسی کے لیے کوئی ایثار کیا ہے؟

شاگرد: جی ہاں! میں نے اپنے حصے کی دوا اپنی بہن کو پلادی۔

ماسٹر صاحب: بچو! سالانہ امتحان آج سے دو ہی دنوں کے بعد ہونے والا ہے۔ اگر کسی کو کچھ پوچھنا ہے تو پوچھ لے۔

ایک لڑکا: ماسٹر صاحب، پرچے کس پریس میں چھپے ہیں؟



مرتبہ: موثق الدین

ادھر ادھر سے

مصنوعی ہڈیاں

چینی کے برتن بنانے والی ایک جرمن فرم چینی کی مٹی سے بھی مصنوعی ہڈیاں بنانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ یہ ہڈیاں جسم میں بالکل اصلی ہڈیوں کی طرح کام کرتی ہیں۔ اور ان ہڈیوں کو ہر ایک قسم کا جسم قبول کر لیتا ہے۔

کنجوسی کی وجہ

اسکاٹ لینڈ کے لوگ دنیا بھر میں کنجوسی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ آپ یقین کریں کہ ایک اسکاٹ ہسپتال میں لایا گیا تو ڈاکٹروں نے اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے کے بعد اعلان کیا کہ یہ شخص مر چکا ہے۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا: "وہ کیسے؟" ڈاکٹر نے جواب دیا کہ اسکاٹ لینڈ کے کسی باشندے کی جیب میں ہاتھ ڈالیں اور وہ خاموشی سے لیٹا رہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ شخص مر چکا ہے۔

زبانوں کا ماہر

اٹلی کے جوزف کاسپر کو ۵۴ زبانوں پر مکمل مہارت حاصل تھی۔ اور اس نے ۴۱ زبانوں اور ۴۶ بولیاں سیکھیں یعنی اس طرح جوزف کاسپر نے اپنی تمام عمر مختلف زبانیں سیکھنے میں صرف کر دی۔

بچوں کی کوششیں



جن کا انعام

برسوں پہلے کی بات ہے ایک گاؤں میں ایک حافظ تھا۔ رہتے تھے۔ گاؤں میں جب ان کی آمدنی کے ذرائع کم ہو گئے تو وہ تلاشِ معاش کے سلسلے میں ایک شہر پہنچے۔ رات سرائے میں گزارنے کے بعد صبح کام کی تلاش میں نکلے۔ حافظ صاحب کی قرأت بھی اچھی تھی۔ چنانچہ شہر کے ایک مدرسے میں ان کو مدرس کی جگہ مل گئی۔ لیکن ان کو ابھی اپنی رہائش اور طعام کا انتظام کرنا تھا۔ چنانچہ مکان کی تلاش میں نکلے۔ ایک محلے میں ایک بنیے کا مکان خالی تھا۔ کرایہ بھی کم تھا لیکن اس مکان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں کوئی شے رہتی ہے۔ کرایہ دار دو چار دن میں مکان چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ جب کہیں اور مکان نہ ملا تو مجبوراً قاری صاحب نے اسی مکان میں رہنا شروع کر دیا۔ انھیں وہاں رہتے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا۔ لیکن کوئی پریشانی کا سامنا نہیں ہوا۔ ایک روز جب حافظ صاحب عشا کی نماز اپنے کمرے ہی میں پڑھ رہے تھے تو انھیں کمرے میں چہل پہل معلوم ہوئی۔ حافظ صاحب نے جب فرض نماز ختم کی اور سلام پھیرا تو دیکھا کہ ان کے پیچھے نمازیوں کی ایک پوری صف موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ حافظ صاحب دعا کو ہاتھ اٹھائیں، ان میں سے ایک نے کہا "آپ کل سے نماز یہیں پڑھا کریں۔ آپ کو ۵ روپے روز ملا کریں گے۔" اُس دن سے حافظ صاحب برابر نماز گھر ہی پڑھتے اور صبح ان کو ۵ روپے سرہانے رکھے مل جاتے۔ اس طرح سے ایک عرصہ گزر گیا۔ آخر ایک دن حافظ صاحب نے اپنے گاؤں جانے کا پروگرام بنایا اور اپنے مقتدیوں سے بھی اجازت چاہی۔ انھوں نے کہا "آپ شوق سے گھر جائیں۔ آپ کو آپ کے گھر پر بھی ۵ روپے روز ملا کریں گے۔" حافظ صاحب گھر واپس آ گئے اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کو روز صبح پانچ روپے مل جاتے تھے۔

اچانک ایک دن ان کو پیسے ملنا بند ہو گئے دو چار روز تو حافظ صاحب نے صبر کیا لیکن جلدی ہی ان کا صبر ٹوٹ گیا۔ اور انھوں نے دوبارہ شہر کا قصد کیا۔ اور اپنے پرانے کرائے کے مکان میں پہنچے۔ اب بنیے نے ان کو مکان دینے سے انکار کر دیا اور کہا "حافظ جی! اب مکان بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے جنات کو عامل صاحب سے ایک بوتل میں بند کروا دیا اور پھر اُس بوتل کو دریا میں پھنکوا دیا ہے۔ اب مکان میں کرایہ دار بڑے آرام سے رہتے ہیں۔ اُس وقت مکان خالی تھا اور جنوں کی وجہ سے کرایہ پر نہیں اٹھتا تھا۔ اس لیے آپ کو دے دیا تھا۔ ہاں مکان خالی ہوتا تو آپ کو ضرور دے دیتا۔ کرایہ ضرور زیادہ پڑتا لیکن مکان خالی نہیں ہے۔"

حافظ صاحب خاموش واپس لوٹ آئے اور دوسرے دن اس بنیے کے بتائے ہوئے پتے کو ڈھونڈتے ہوئے ندی کنارے پہنچ گئے۔ وہاں کچھ لڑکے مویشی چرا رہے تھے۔ ان سے معلوم کیا تو لڑکوں نے ایک جگہ لے جا کر بتایا کہ یہاں پر چار چھ دن پہلے ایک آدمی کچھ گاڑ گیا

ہے۔ دیکھنے سے زمین تازہ کھدی ہوئی معلوم ہوتی تھی حافظ صاحب نے پہلے تو خود اس کو کھودنے کی کوشش کی جب ان سے نہ بنا تو ان چرواہوں کی مدد سے وہاں گڑی ہوئی بوتل نکال لی۔ دیکھا کہ بوتل میں دھواں دھواں سا ہے اور تہ میں کچھ میلا میلا سا پڑا ہے۔ حافظ صاحب بوتل کو لے کر جنگل میں اکیلے چلے گئے۔ کافی دور جانے کے بعد انھوں نے اس بوتل کا کارک کھول دیا۔ ایک دھواں زمین سے آسمان تک لکیر کی شکل میں بن گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دھواں ختم ہوا تو حافظ صاحب کے پاس وہی جانا پہچانا جن کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا حافظ صاحب آپ اپنے گھر جائیں آپ کو آج سے دس روپے روز ملا کریں گے۔ یہ کہہ کر وہ جن غائب ہو گیا اور حافظ صاحب اپنے گھر واپس آ گئے اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔

عظمیٰ عارف
کدورا - جالنا (مہاراشٹر)

ماں باپ کے حقوق

پیارے پیامی بھائی بہنو! حضورؐ نے ماں باپ کے حقوق ادا کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

ماں باپ کو تکلیف نہ پہنچاؤ، چاہے ان کی طرف سے کچھ زیادتی ہی ہو۔ زبان سے اُن کی تعظیم کرو۔ جائز کاموں میں ان کی اطاعت کرو۔ اگر ان کو حاجت ہو تو ہر طرح سے اُن کی خدمت کرو۔ والدین کے انتقال کے بعد اُن کے لیے دعائے مغفرت اور رحمت کرتے رہو۔ نفل عبادات اور خیرات کا ثواب ان کو پہنچاؤ اور ان کے ملنے والوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ۔ ان کے ذمے اگر کوئی قرض ہو اور خدا نے طاقت دی ہو تو اس کو ادا کرو مرنے کے بعد خلاف شرع رونے اور چلانے سے بچو ورنہ ان کو تکلیف ہوگی۔

پیارے پیامی بھائی بہنو! ہم کو اپنے والدین کی اطاعت کرنا چاہیے۔ نہیں تو دنیا تو خراب ہو گی ہی آخرت میں بھی ذلیل و خوار ہونا پڑے گا۔

ایم سیف الدین انصاری الہ آباد

کھیل کی منزل:

ایک نئی سڑک بن رہی تھی۔ سارے مزدور تیزی سے کام کر رہے تھے لیکن ان میں سے ایک مضبوط اور طاقت ور جسم کا نوجوان غضب کی پھرتی دکھا رہا تھا۔ وہ اُس دن سویرے ہی ان مزدوروں کی ٹولی میں شامل ہوا تھا۔ اس کے کام کو دیکھ کر ٹھیکے دار بہت خوش ہوا اور کام ختم ہونے پر اُسے اپنے پاس بلا کر شاباشی دیتے ہوئے بولا، "اے نوجوان! ہم تمھاری محنت سے بہت خوش ہیں" اور پھر اُس نے پاس کھڑے ہوئے اپنے منشی کو اُس نوجوان کو اور مزدوروں سے زیادہ مزدوری دینے کو کہا۔

مگر اس نوجوان نے زیادہ مزدوری لینے سے انکار کر دیا اور اتنا ہی نہیں، اُس نے اپنے حصے کی مزدوری ایک بوڑھے مزدور کو دے دی۔ یہ دیکھ کر ٹھیکے دار حیرت میں پڑ گیا۔ اُس نے نوجوان سے اس کی وجہ پوچھی۔

نوجوان نے مُکّا لہراتے ہوئے بھاری آواز میں کہا، "میں ہر روز مشکل کھیل کھیلتا ہوں۔ یہاں سے گزر رہا تھا تو میرے دل میں آیا کہ چلو کچھ دیر پھاوڑے سے مٹی کھود کر دیکھی جائے۔ آخر یہ بھی تو ایک طرح کا کھیل ہی ہے۔"

ٹھیکے دار کو یہ سُن کر بڑا تعجب ہوا۔ لیکن جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ وہ نوجوان مزدور کوئی اور نہیں بلکہ باکسنگ کا عالمی چمپین محمد علی ہے۔ (ہندی سے ماخوذ)

قاضی شہاب ظہیر۔
آسنسول (مغربی بنگال)



کیوں، تو نے گرفتار کیا مجھ کو اے صیاد
سُن لے مری فریاد سن لے مری فریاد

ہر طرح کی آزادی تھی، جنگل میں تھا میں شاد
اُف! آ پڑی ہے مجھ پہ کیسی نئی اُفتاد
جنگل میں چہکتا تھا یہی رہ گئی ہے یاد
پنجرے میں ہوں قید آج تو فریاد ہے فریاد
تو! کیسے سمجھ سکتا ہے قیدی کی کوئی بات
جنگل میں تھے دن عید تو تھی رات شب برات
آزادیوں سے اُڑنا، خوشیوں کا تھا زمانہ
اپنی خوشی سے آنا، اپنی خوشی سے جانا۔
پنجرے کے اس محل میں جنگل کی اس فضا میں
تفریق ہے خدا کی جیسے سزا جزا میں
احسان زندگی بھر کرتا رہوں گا میں یاد
دے دے مجھے رہائی ہو جاؤں گا میں آزاد

محمد اختر عادل عثمانی کلٹوی
پتیانہ محلہ۔ کلٹی۔ بردوان۔ بنگال

بڑھیا کی خریداری

ایک بڑھیا تھی کانوں کی بہری۔ وہ ایک دن صابن خریدنے کے لیے بازار گئی اور دکان دار کو دس پیسے کا سکہ دیتے ہوئے بولی "مجھے دس پیسے کا صابن دے دو۔"

دُکان دار حساب جوڑنے میں مشغول تھا۔ اس نے تھوڑی دیر کے لیے بڑھیا کی طرف دیکھا! اور بولا "ماں جی آج کل دس پیسے میں کوئی صابن نہیں آتا۔"

"ہاں ہاں" بڑھیا بولی "مجھے کپڑے دھونے کا ہی صابن چاہیے۔" "ارے اماں" دکان دار نے پھر سے سمجھایا۔ "اب وہ زمانہ گیا جب دس پیسے میں صابن مل جاتا تھا۔ اب تو سستے سے سستے صابن کی ایک بٹی بھی دو روپے کی آتی ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو بیٹا" بڑھیا اپنی ہی دُھن میں بولی؛ "پرانے زمانے جیسا خوشبودار صابن اب کہاں! زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ کمبخت ایسا صابن بنانے لگے ہیں کہ خوشبو ہی نہیں ہوتی۔"

اب دکان دار کے جھلّانے کی باری تھی۔ وہ بولا "ارے تم سمجھتی کیوں نہیں؟ میں کہتا ہوں ہماری دُکان میں دس پیسے کا کوئی صابن نہیں ہے۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" بڑھیا پوری بہری تھی۔ اس لیے دُکان دار کی باتیں سمجھے بغیر ہی مسکراتی ہوئی بولی، میں بھی سوچ رہی تھی کہ تم اسے ڈبے میں بند کرکے دے دو تو اچھا رہے کیوں کہ میرے جھولے میں کھانے پینے کا اور سامان بھی ہے۔" اب تک دُکان دار کا پارا آسمان پر چڑھ چکا تھا۔ وہ لپک کر اٹھا اور صابن کی ایک بٹی بڑھیا کے سامنے کاؤنٹر پر پٹکتے ہوئے غصے میں بولا "میرا دماغ مت چاٹ بڑھیا صبح ہی صبح پریشان کر ڈالا۔ یہ لو بٹی اور اپنا منحوس چہرا لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" بڑھیا نے بٹی اٹھائی اور دس پیسے کا سکہ کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے بڑی ہی دھیمی آواز میں بولی: "بھگوان تیرا بھلا کرے گا بیٹا۔ ڈبہ تمھارے پاس نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی بٹی پر کاغذ ہے۔ ایسا شریف دکان دار اس بازار میں شاید ہی کوئی ہو۔ اب تو جب بھی سامان خریدنا ہوگا، تو تیری ہی دکان پر آجایا کروں گی۔" اور دکان دار نے مارے غصے کے اپنا سر پیٹ لیا۔

سید شمس العارفین رضوی
ہائی اسکول ہسپورہ ۸۲۴۱۲۰ اورنگ آباد (بہار)

کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ موتیوں کا جزیرہ کسے کہتے ہیں — بحرین کو۔
۲۔ جواہرات کا جزیرہ کسے کہتے ہیں — آئرلینڈ کو۔
۳۔ دنیا کی چھت کسے کہتے ہیں — سطح مرتفع پامیر کو۔
۴۔ بحرۂ روم کی کنجی کسے کہتے ہیں — جبرالٹر کو۔
۵۔ خدائی شہر کسے کہتے ہیں — روم کو۔
۶۔ تحفۂ نیل کسے کہتے — مصر کو۔
۷۔ متبرک سرزمین کسے کہتے ہیں — فلسطین کو۔
۸۔ ایمپائر سٹی کسے کہتے ہیں — نیو یارک کو۔
۹۔ گلابی شہر کسے کہتے ہیں — جے پور کو۔

۱۰۔ نیلے پہاڑ کسے کہتے ہیں۔ نیلگری کو۔
۱۱۔ دور افتادہ شہر کسے کہتے ہیں — اسا و تبت کو۔
۱۲۔ تاریک برّاعظم کسے کہتے ہیں — افریقہ کو۔
۱۳۔ بہشت بریں کسے کہتے ہیں — کشمیر کو۔
۱۴۔ اُبھرتے سورج کی سرزمین کسے کہتے ہیں۔ جاپان کو۔
۱۵۔ مندروں کا شہر کسے کہتے ہیں — بنارس کو۔
۱۶۔ پانچ دریاؤں کی سرزمین کسے کہتے ہیں — پنجاب کو۔
۱۷۔ سفید ہاتھیوں کی سرزمین کسے کہتے ہیں — سیام کو
۱۸۔ مصیبت چین کسے کہتے ہیں۔ ہوانگ ہو کی وادی کو۔

محمد سیماب بریق اظہر زاہدی
پوسٹ رانی گنج ضلع بردوان (مغربی بنگال)

مور



پیارے رنگ کا پیارا مور
گھر کر آئے گھٹا گھنگھور
جب کبھی شور مچائے مور

چھا جائیں جب کالے بادل
ناچے چھم چھم کر کے مور

سب چڑیوں سے بڑھ چڑھ کر ہے
دل کو خوب لبھائے مور

ہرے ہرے کھیتوں میں جا کر
دانے چن کر کھائے مور

اپنے کالے پیر دیکھ کر
ڈھیروں آنسو روئے مور
پیارے رنگ کا پیارا مور

فرخ ریحان خاں
عرفان منزل بدر باغ علی گڑھ

رسولِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات۔ ماہ وسال کے آئینہ میں

ولادت باسعادت	۲۲ اپریل ۵۷۱ء
دائی حلیمہ سعدیہ کی آغوش میں	ایک ہفتہ بعد
آغوش والدہ میں واپسی	۵ سال کی عمر میں
والدہ ماجدہ کا وصال	۶ 〃 〃 〃 〃
دادا عبدالمطلب کا انتقال	۸ 〃 〃 〃 〃
شام کی جانب پہلا سفر	۱۲ 〃 〃 〃 〃
حضرت خدیجہ سے عقد	۲۵ 〃 〃 〃 〃
غارِ حرا میں عبادت و مراقبہ	۲۷ 〃 〃 〃 〃
وحی کا نزول و خلعتِ نبوّت	۴۰ 〃 〃 〃 〃
چچا ابوطالب کا انتقال	۵۰ 〃 〃 〃 〃
حضرت خدیجہ کا انتقال	۵۰ 〃 〃 〃 〃
حضرت عائشہ سے عقد	۵۰ 〃 〃 〃 〃
واقعۂ معراج	۵۰ 〃 〃 〃 〃
مدینے کی جانب ہجرت	۵۳ 〃 〃 〃 〃
غزوۂ بدر	۵۵ 〃 〃 〃 〃
صلح حدیبیہ	۵۹ 〃 〃 〃 〃
فتح مکہ	۶۰ 〃 〃 〃 〃
خطبۂ حجۃ الوداع	۶۳ 〃 〃 〃 〃
علالت اور وصال	〃 〃 〃 〃 〃

محمد اقبال حسین
پتیانہ کلٹی

پیامی ادبی معمّا نمبر ۱

ایک سَو روپے کے نقد انعامات

دفتر پیام تعلیم میں حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۰ر نومبر ۸۳ء

فیس داخلہ کچھ نہیں۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ لیکن ہر حل کے ساتھ ایک ٹوکن آنا ضروری ہے۔

پہلا انعام : بالکل صحیح حل پر مبلغ ساٹھ روپے۔ دوسرا انعام : ایک غلطی والے حل پر مبلغ چالیس روپے

اشارے :

۱۔ پیامی ادبی معمّے کے حل وصول ہونے کی آخری تاریخ بیس ـــــ ہے۔
۲۔ ـــــ سے بارش کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ (بدلی/بجلی)
۳۔ ـــــ حاصل کرنے کے بعد پھر چین مشکل ہی سے آتا ہے۔ (راج/تاج)
۴۔ اُدھار ـــــ ہوئی رقم کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ (دی/لی)
۵۔ زیادہ ـــــ تندرستی پر بُرا اثر ڈالتا ہے۔ (رونا/سونا)
۶۔ قیمتی ـــــ دیکھتے ہی بعض لوگوں کی نیت خراب ہوجاتی ہے۔ (ہار/مال)
۷۔ عام طور پر لیڈر اپنی ـــــ کی بدولت کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ (تقریر/تعبیر)

ر		م	و	ن
X	ی	ل		ب
X	X	ج	ا	
X	X	X	ی	
X	ا	ن	و	
X	X		ا	
ر				ت

شرائط پیامی ادبی معمّا : (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن آنا لازمی ہے۔ (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے۔ (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کردیا جائے گا۔ (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصّہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی۔ (۵) معمّے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

ٹوکن پیامی اَدبی مُعمّا نمبر ۱

میں اڈیٹر پیام تعلیم کے فیصلے سے متفق ہوں۔

نام ....

پتا ....

اپنے حل اس پتے پر بھیجیے

پیامی ادبی مُعمّا نمبر ۱، ماہنامہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

Licence No. U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage

Regd No. D(SE)-043 November 1983

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲


پیام تعلیم

ماہنامہ
پیامِ تعلیم
نئی دلّی ۲۵

دسمبر ۱۹۸۳ء | جلد ۲۰ | شمارہ ۱۲

ایڈیٹر : ولی شاہجہانپوری

قیمت : ۲ روپے // سالانہ : ۱۸ روپے
غیر ممالک سے ۸۵ روپے

بچّوں سے باتیں

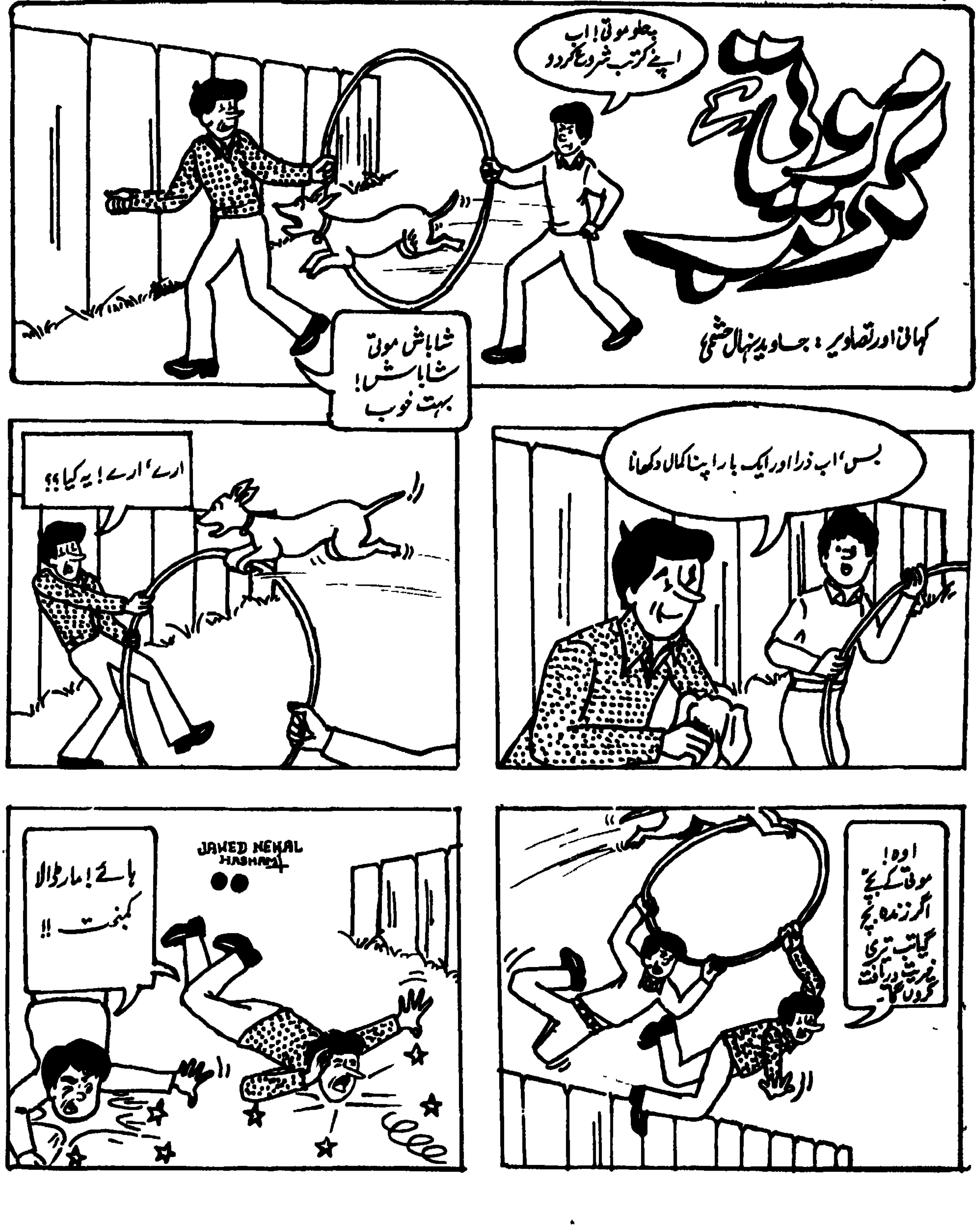
دیکھتے دیکھتے ایک سال گزر گیا۔ اگلے مہینے انشاءاللہ نئے سال میں ملاقات ہوگی۔ ۱۹۸۳ء میں کئی علمی اور ادبی شخصیتوں کی دائمی جدائی کا صدمہ اُٹھانا پڑا۔ ان میں آپ کے جانے پہچانے مضمون نگار احسان الحق اور محمد حفیظ الدین صاحبان بھی تھے۔

اس شمارے میں محمد یوسف پاپا کافی عرصے کے بعد آپ سے مل رہے ہیں۔ یوسف ناظم صاحب کے مضمون "کُتّے" پڑھ کر آپ ضرور لطف لیں گے۔ ڈاکٹر خلیل اللہ خاں کا مضمون "سڑکیں" بھی کافی معلوماتی ہے۔ دو شکاری کا سلسلہ جاری ہے۔ مقدس ایشیا کی سیر ختم ہوگئی۔ ڈاکٹر قنبر احمد رضوی کے آیندہ مضمون کا انتظار ہم بھی کر رہے ہیں، آپ بھی کیجیے۔

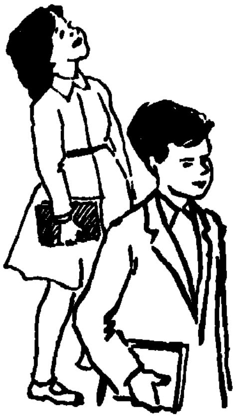
خوشی کی بات ہے کہ پیامی ادبی معمے سے پیامیوں نے دلچسپی دکھائی ہے۔ حل روزانہ موصول ہو رہے ہیں۔ ہمارے بعض ایجنٹ حضرات نے شکایت کی ہے کہ آخری تاریخ کے لیے وقت بہت کم رکھا گیا تھا۔ بات معقول ہے اس لیے ہم نے اس مرتبہ اس کی تاریخ ۱۰ جنوری رکھی ہے تاکہ ایجنٹ حضرات کی شکایت بھی رفع ہو جائے اور آپ کو بھی کتابیں پڑھ کر حل تلاش کرنے کے لیے کافی وقت مل جائے۔ ٹھیک ہے نا؟

کاغذ کی روز بروز بڑھتی ہوئی قیمتوں اور طباعت کے دوسرے اخراجات میں اضافے کی وجہ سے ہمیں پیامِ تعلیم کی قیمت میں اضافہ کرنے پر مجبور ہو جانا پڑا۔ اب اس کا سالانہ چندہ بیس روپے ہوگا اور ایک پرچے کی قیمت ڈھائی روپے ہوگی۔ یہ اضافہ جنوری ۱۹۸۴ء سے ہوگا۔ جن خریداروں کے چندے ختم ہو گئے وہ بھی اور نئے حضرات بھی دسمبر میں اٹھارہ روپے ہی منی آرڈر کے ذریعے چندہ بھیج دیں تو فائدے میں رہیں گے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔


چلو موتی! اب
اپنے کرتب شروع کر دو
کہانی اور تصاویر : جاوید نہال حشمی
شاباش موتی
شاباش!
بہت خوب
بس، اب ذرا اور ایک بار اپنا کمال دکھانا
ارے، ارے! یہ کیا؟؟
اوہ!
موتی کے بچے
اگر زندہ بچ
گیا تب تیری
خیریت دریافت
کروں گا
ہائے! مار ڈالا
کمبخت!!
JAWED NEHAL
HASHAMI

محمد یوسف پاپا



سُندر اچھے بچّے



سُندر سُندر اچھے اچھے
بچّے بچّے بچّے بچّے



آن ہیں بچّے، شان ہیں بچّے
جسم ہیں بچّے، جان ہیں بچّے
کہنے کو شیطان ہیں بچّے
ہر دل کا ارمان ہیں بچّے

سُندر سُندر اچھے اچھے
بچّے بچّے بچّے بچّے

پاس ہیں بچّے، دور ہیں بچّے
پھول ہیں بچّے، نور ہیں بچّے
باتوں میں بھرپور ہیں بچّے
دُنیا میں مشہور ہیں بچّے

سُندر سُندر اچھے اچھے
بچّے بچّے بچّے بچّے



پڑھتے ہیں اسکول میں بچّے
یاد میں بچّے بھول میں بچّے
کھیل رہے ہیں دھول میں بچّے
کودیں سوئمنگ پول میں بچّے

سُندر سُندر اچھے اچھے
بچّے بچّے بچّے بچّے

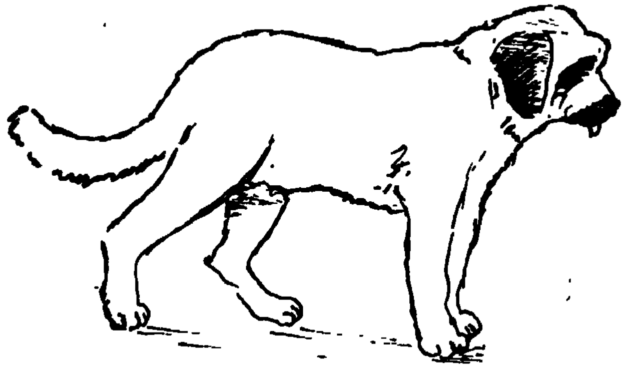
چڑیوں کی چہکار ہیں بچّے
خوشیوں کا سنسار ہیں بچّے
گلشن کی مہکار ہیں بچّے
ہولی کا تیوہار ہیں بچّے

سُندر سُندر اچھے اچھے
بچّے بچّے بچّے بچّے

جامعہ ہائر سکنڈری اسکول، نئی دہلی ۲۵

یوسف ناظم

کُتّا



بُرا مان گئے نا۔ لفظ کُتّا کچھ ہے ہی بُرا۔ ہم تو اسے گالی کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور کتّوں کو بہت حقیر سمجھتے ہیں، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ انسان اور کُتّے کی دوستی بہت پُرانی ہے کہا جاتا ہے آدمی کا سب سے پہلا دوست کُتّا ہے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب آدمی نے مکانوں، بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہنا شروع نہیں کیا تھا۔ اُس وقت شہر ہی نہیں بنے تھے تو بنگلے کہاں سے بنتے۔ آدمی جنگلوں میں رہتا تھا۔ دن بھر دُھوپ کھاتا تھا۔ بہت دھوپ لگتی تھی تو سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھ جاتا تھا بلکہ سو بھی جاتا تھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اسے لوریاں دیتی تھی۔ (لوریوں کی ضرورت بڑی عمر کے لوگوں کو پیش آتی ہے) ہاں رات کے وقت البتہ اُسے غاروں میں پناہ لینی پڑتی تھی۔ غار ہی اُس کے محل تھے۔ یہ تو ٹھیک تھا لیکن اس کی حفاظت، بس اسی وجہ سے آدمی نے کُتّے سے دوستی کرلی۔ اب ہم کہیں گے کہ کُتّا بہت سمجھ دار جانور ہوتا ہے تو پھر تم اور بُرا مانو گے لیکن کُتّے میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ اسے جو سکھاؤ سیکھ لیتا ہے۔ اُن دنوں آدمی کو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے جنگلی جانوروں اور پرندوں کا شکار کرنا پڑتا تھا اور دن بھر مارے مارے پھرتا تب کہیں جاکر ایک شکار اُس کے ہاتھ لگتا۔ اس معاملے میں بھی کُتّا ہی کام آیا۔ آدمی نے اُسے شکار کرنا سکھا دیا۔ کُتّے کو بھی کچھ اور کام تھا نہیں، اُس کا اُس کام میں دل لگ گیا۔ کُتّا شکار کرتا، آدمی پکاتا اور کُتّے کو بھی کھلاتا۔ ساتھ کھانے پینے سے تو دوستی اور بڑھتی ہے۔ کُتّا آدمی کا بالکل ہی گرویدہ ہوگیا اسے دیکھا نہیں کہ دُم ہلا دی۔ کُتّے میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ دُم سے بات کرتا ہے۔ کُتّا دُم ہلائے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ لاڈ پیار کر رہا ہے، خوشامد کر رہا ہے۔ کُتّے کا بھونکنا البتہ بُرا لگتا ہے۔ یہ بھی کوئی بات کرنے کا طریقہ ہے۔ بچّے تو بچے بڑے بھی سہم جاتے ہیں لیکن پالتو کُتّے اپنوں پر نہیں بھونکا کرتے۔ اُنھیں معلوم ہوتا ہے کہ کس پر بھونکنا چاہیے وہ تو چھوٹے بچّوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ کیا مجال جو اُنھیں کوئی ٹیڑھی نظر سے دیکھ لے۔

پُرانے زمانے میں آدمی کی ضرورتیں کم تھیں اس لیے آدمی نے کُتّے سے صرف وہی کام لیا جو اُس وقت ضروری تھا، کھیتی کرنا، شکار کرنا، گھر کی حفاظت کرنا اور آدمی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ شکار تو کُتّا اس لیے بھی کر لیتا تھا کہ اُس کی ناک آدمی کی ناک سے زیادہ مفید تھی۔ یعنی شکار کے معاملے میں۔ اس کے آگے نہیں۔ آدمی شکار سونگھ نہیں سکتا کُتّا سونگھ لیتا ہے۔ اُس کی ناک اُسے بتاتی ہے کہ شکار کدھر ہے۔ شمال میں یا جنوب میں۔ مغرب میں یا مشرق میں۔ بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں وہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ یہ بو کس جانور کی ہے۔ خرگوش کی ہے یا شیر کی۔

۱۹، الہلال، ۱۳۰، باندرہ ریکلیمیشن بمبئی ۵۰

کُتے کی ناک سے آدمی اب خوب فائدہ اُٹھا رہا ہے کُتے اب پولیس کے محکمے میں ملازم رکھے جاتے ہیں۔ ان کا باضابطہ انٹرویو ہوتا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ یہ کسی قاتل یا ڈاکو کو سونگھ سکتے ہیں یا نہیں؟ جیل سے کوئی قیدی بھاگ جاتا ہے تو کُتے ہی سے پوچھا جاتا ہے میاں بتاؤ یہ کلکتہ گیا ہے یا مدراس۔ کتے کو بس بھاگے ہوئے قیدی کی کوئی چیز سنگھانی پڑتی ہے۔

کتوں کی اب ایک باضابطہ پارٹی ہونے لگی ہے اسے پولیس کی زبان میں ڈاگ اسکواڈ کہا جاتا ہے یہ بھی فائر بریگیڈ کی طرح کی ایک چیز ہوتی ہے۔ اس میں کئی کتے ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ تو بمبئی میں جب وکٹوریہ ٹرمینس ریلوے اسٹیشن پر کوئی ہنگامہ ہو رہا تھا اور لوگ قابو میں نہیں آرہے تھے، تو پولیس کو طلب کیا گیا اور پولیس اکیلی نہیں آئی، ڈاگ اسکواڈ کو ساتھ لائی۔ پولیس کو دیکھ کر تو لوگ ڈرے نہیں لیکن ڈاگ اسکواڈ پر جونہی نظر پڑی سارے مسافر دوڑ دوڑ کر ٹرین میں سوار ہو گئے اور خود انجن ڈرائیور بھی تیزی سے ٹرین بھگا لے گیا۔

اور تو اور اب کارخانوں میں چوکیدار نہیں رکھے جاتے، کتے رکھے جاتے ہیں۔ اب کتوں سے کون بحث کرے گا۔ یہ رات بھر کارخانوں کے احاطے میں گشت کرتے رہتے ہیں یا کسی جھاڑی کے پیچھے کچھ سوچتے پڑے رہتے ہیں اور جہاں کوئی کھٹکا ہوا یہ لپکے۔

چور بھی اب کہیں چوری کرنے جاتے ہیں تو پہلے سے معلوم کر لیتے ہیں کہ اس گھر میں کہیں کوئی کتا چوکیدار تو نہیں۔

چوکیدار کتوں کا یوں سمجھو اب ایک امپلائمنٹ اکسچینج ہوتا ہے۔ تم اس آفس پر فون کرو اور کہو کہ اتنے کتے درکار ہیں۔ وہ تمھیں مل جائیں گے اور ان کی ماہانہ تنخواہ کا بل تمھیں اس کمپنی کو ادا کرنا ہوگا جہاں سے یہ کتے منگوائے گئے تھے۔ تم چاہو تو انھیں کرایے پر لو یا چاہو تو خرید لو۔ خریدوگے تو ان کا ایک ماسٹر تمھیں رکھنا ہوگا۔ کتے اسی سے ٹیوشن لیتے ہیں اور اسی کا کہنا مانتے ہیں۔

کتا اتنا وفادار ہوتا ہے کہ اپنے مالک کی جان بچانے کے لیے اپنی جان کی پروا نہیں کرتا۔ پروا تو وہ اس لیے نہیں کرتا کہ اس بچارے کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کام میں اس کی جان چلی جائے گی۔ اُس کی سمجھ بوجھ بھی کچھ محدود ہوتی ہے۔ سمجھدار سے سمجھدار کتا بس ایک حد تک سمجھ سکتا ہے اس کے آگے اُس کی عقل کام نہیں کرتی۔ اسی لیے کتا کتنی ہی کوشش کرے جھاڑ پر نہیں چڑھ سکتا۔

جس طرح آدمیوں میں طرح طرح کے آدمی ہوتے ہیں اُسی طرح کتوں میں بھی طرح طرح کے کتے پائے جاتے ہیں۔ ان میں ایک خاص قسم کا کتا ہوتا ہے جو اندھوں کی مدد کر سکتا ہے۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اگر کتوں کو صحیح راستے پر لگایا گیا تو یہ کارِ ثواب بھی کر سکتے ہیں۔ کچھ کتے پہاڑوں پر پہنچ کر برف کے تودوں میں پھنسے ہوئے آدمیوں کی بھی مدد کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ کچھ کتوں سے بھیڑوں بکریوں کے نگراں کار ہونے کا کام لیا جاتا ہے۔ یوں سمجھو یہ اُن کے گائڈ ہوتے ہیں اور بکریوں کو سمجھاتے ہیں۔ بی بہو اُدھر کہاں جا رہی ہو اُدھر تو بھیڑیے کا خطرہ ہے۔ بکریاں اس کا حکم مان لیتی ہیں جو نہیں مانتی ہیں نقصان اٹھاتی ہیں۔ ان کتوں کو کام کرنے والے کتے کہا جاتا ہے۔ جیسے کہ شکار کرنے والے کتوں کو شکاری کتے کہا جاتا ہے۔

بُلڈاگ کا نام تم نے ضرور سُنا ہوگا۔ یہ بہت بڑا ہوتا ہے یعنی بیل اور کتے کے بیچ کے سائز کا۔ بلڈاگ صرف بیلوں ہی کو نہیں ریچھوں کو بھی للکارنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ لیکن بلڈاگ سے بھی بڑا ایک کتا ہوتا ہے۔ یہ ہمارے ہاں نہیں ہوتا۔ اسے آئرش وولف ہاؤنڈ کہا جاتا ہے۔ جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی بڑا اس کا نام ہے۔ اس کا کم سے کم وزن ۵۰ کلوگرام ہوتا ہے۔ اسے گود میں اُٹھانے کے لیے دو مزدور بلانے پڑتے ہیں۔ کھاتا بھی خوب ہوگا۔ جو بھی اسے پالتا ہوگا اسے روز اس کی دعوت کرنی پڑتی ہوگی — کھانا دعوت ہی میں زیادہ پکتا ہے۔ کبھی موقع

ملے تو اس وولف ہاؤنڈ کی تصویر دیکھیو۔ جی خوش ہوجائے گا۔ اس کے سارے جسم پر خوب لمبے لمبے بال ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے اسے جھالردار اُوورکوٹ پہنا دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کسی چڑیا گھر میں بھی نظر آجائے

تم سمجھتے ہوگے، سب کتے بڑے ہی ہوتے ہیں۔ جی نہیں۔ ان کتوں میں بھی بونے کتے بھی ہوتے ہیں۔ یہ اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ آدمی کے ہاتھ پر بیٹھ سکتے ہیں۔ جیسے کتا نہ ہو بندر کا بچہ ہو۔ یہ بالکل چوہے جیسا دکھائی دیتا ہے لیکن یہ کسی نہ کسی کام آتا ہی ہوگا۔

کتوں کی دُکانیں ہوتی ہیں۔ جہاں کتے بیچے جاتے ہیں اور ان کی مُنہ مانگی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ کچھ کتے تو اتنے قیمتی ہوتے ہیں کہ ان کی بجائے ایک موٹر سائکل یا ٹی وی سیٹ خریدا جا سکتا ہے۔ اب یہ اپنی اپنی مرضی ہے، چاہے کتا خرید و چاہے بھٹ پھٹی۔ تمھارے بھی دوستوں میں سے کسی نہ کسی کے ہاں پالتو کتا ہوگا ہی۔ پالتو کتے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ خود آدمی کی بھی تفریح ہوجاتی ہے۔ صبح سویرے اسے ساتھ لے کر باغ میں جانا پڑتا ہے۔ کتے کو جب تک باہر کی تازی ہوا نہ کھلائی جائے اُس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ کتا اپنے وقت کا بہت پابند ہوتا ہے۔ اور صبح سویرے تیار ہوکر اپنے مالک کے پاس آ کھڑا ہوجاتا ہے کہ چلو میری واک کا وقت ہوگیا۔

واک کرنے والے کتے السیشین ہوتے ہیں یا ٹیریئر، اسپینئل بھی ہوتے ہیں اور فاکس ڈاگ بھی۔ انھیں سڑک پر دیکھ کر ڈرنا نہیں چاہیے لیکن ان کی طرف غصے سے دیکھنا بھی نہیں چاہیے۔

اور باقی جو کتے ہوتے ہیں وہ سڑکوں پر اور گلی کوچوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ ان سے ضرور ڈرنا چاہیے۔ ان کا کوئی مالک نہیں ہوتا اس لیے جو ان کے جی میں آئے کر بیٹھتے ہیں۔ انھیں آوارہ کتے کہا جاتا ہے۔ یہ سارے شہر کو پریشان کرتے ہیں اس لیے کبھی کبھی میونسپلٹی کے ملازم ایک ڈاگ وین لے کر نکلتے ہیں اور اس میں کتوں کو بند کر کے کہیں دُور چلے جاتے ہیں۔ اگر تم سے کوئی پوچھے کہ بتاؤ سب سے زیادہ شور کہاں ہوتا ہے تو فوراً جواب دینا کہ ڈاگ وین میں۔

ماجد رضوی

سردی آئی

مہینا آج اکتوبر کا آیا
زمیں پر لطف اب سورج نے پایا

گھٹا بھادوں کی جو برسا گئی ہے
اب اس پانی سے خنکی آگئی ہے

یہی خنکی نومبر میں پنپ کر
اُٹھا لائے گی کھونٹی سے اَلسٹر

مئی میں جن کو تھی تنزیب بھی بار
لحاف اب ہوگئے ہیں ان کو درکار

مئی کی دھوپ سے آنے تھے چکر
مگر اب دھوپ کو ترسے گا ہر گھر

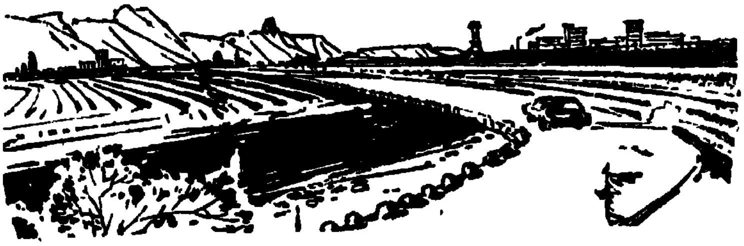
وہی شے جو تھی گرمی میں بری گی
دلوں کو کس قدر مرغوب ہو گی

یہی انسان کی ہے عام حالت
کبھی یکساں نہیں رہتی طبیعت

بدلتے ہیں یہاں دنیا کے نقشے
لگے ہیں ہر طرف خوشیوں کے میلے

بیلی بھیت

ڈاکٹر خلیل اللہ خاں



سڑکیں

بچّو! آپ روزانہ سڑک پر چلتے ہیں۔ سڑک ہی سے اسکول آتے ہیں۔ سڑک ہی کے راستے اپنے دوستوں کے یہاں جاتے ہیں۔ لیکن کیا آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ سڑکیں کیسے بنیں؟ ان کی تاریخ کیا ہے؟ یہ کتنی طرح کی ہوتی ہیں؟ ان کے کیا فوائد ہیں۔

یہ سڑکیں جو آپ دیکھ رہے ہیں کیا پہلے ہی سے بنی تھیں یا تہذیب کے ساتھ ساتھ انسان نے ان کی ایجاد کی۔

زمانہ قدیم میں انسان اپنے رشتہ داروں کے یہاں پیدل جاتا تھا جب اس نے لکڑی کے پہیے کی ایجاد کی تو اس نے گاڑی ضرور بنائی ہوگی اس کے بعد سڑک بنانے کی ضرورت محسوس کی ہوگی۔ سڑک مٹی پاٹ کر بنائی ہوگی پھر پٹا و پر کنکر یا چونے کے پتھر بچھائے ہوں گے اور سڑک کے ذریعے اپنا سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہوگا۔

کیا ہمارے قدما کو بھی اچھی سڑکیں بنانے کا ہنر معلوم تھا؟

موہن جوداڑو اور ہڑپا کی کھدائی سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ 3500 قبل مسیح میں ہندستانیوں کو سڑک بنانے کی سائنس کا علم تھا۔ ہڑپا کی کھدائی میں ایک تانبے کی گاڑی کا ماڈل ملا ہے جس پر گاڑی بان بیٹھا ہے۔ آریوں کے گرنتھوں میں مہا پتھ (MAHAPATHA) کا لفظ ملتا ہے۔ اجا بسار نے ۶۰۰ قبل مسیح میں پٹنے کے قریب راج گیر میں ۶ میٹر چوڑی سڑک بنوائی تھی۔

300 ق م میں کوٹلیہ نے ایک (NATIONAL HIGHWAY) قومی شاہراہ پٹنے سے شمال مغربی صوبہ سرحد تک بنوائی تھی۔ چندر گپت موریہ نے سڑکوں کے بنانے کے لیے ایک محکمہ قائم کیا تھا۔ شہنشاہ اشوک کی حکومت میں سڑکوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ ان کے کنارے برگد کے پیڑ لگے تھے اور آرام گاہیں بنی تھیں

بھارت میں مسلم حکمرانوں نے سڑکوں کی توسیع کے لیے کیا کیا؟

محمد تغلق نے ایک سڑک دہلی سے تغلق آباد تک بنوائی تھی۔ اس وقت سب سے لمبی سڑک لاہور سے سونار گانو (بنگال) کی تھی۔ اس نے سڑکوں کے کنارے سرائیں بنوائی تھیں جن میں ڈاک چوکی بھی ہوتی تھی۔ مغل حکومت میں ۲۴ لمبی سڑکیں ملک کے مختلف حصّوں کو جاتی تھیں۔ شیر شاہ سوری نے کلکتہ سے پشاور تک سڑک بنوائی اس کے کنارے سایہ دار درخت لگوائے۔ اِسے اب گرانڈ ٹرنک روڈ کہا جاتا ہے۔

بچّو! آپ نے جی۔ ٹی۔ روڈ کا نام ضرور سنا ہوگا جو کلکتہ، کانپور دہلی سے گزرتی ہے اور لکھنؤ۔ گورکھپور روڈ کا نام بھی سنا ہوگا۔ بس میں شہر سے گانو تک ضرور سفر کیا ہوگا اور ان راستوں پر ضرور چلے ہوں گے جو ایک گانو کو دوسرے گانو سے ملاتے ہیں۔ جگہ کے لحاظ سے سڑکوں کو کئی قسموں میں ہم تقسیم کرسکتے ہیں۔

۱- قومی شاہراہیں (NATIONAL HIGH WAY)
۲- ریاستی شاہراہیں (STATE HIGH WAYS)
۳- اضلاعی سڑکیں (DISTRICT ROADS)
۴- دیہی سڑکیں (VILLAGE ROADS)

پہلے ہم آپ کو قومی شاہراہوں کے بارے میں بتاتے ہیں اس طرح کی سڑک جی۔ ٹی۔ روڈ ہے کیونکہ یہ ملک کے اہم بڑے شہروں کو ملاتی ہے۔ یہ آگے چل کر پاکستان میں پیشاور جاتی ہے یعنی ایسی سڑکوں کا تعلق پڑوسی ملکوں کی سڑکوں سے بھی ہوتا ہے۔ ان سے فوجی گاڑیاں اور

۴۵۰ بالدہ روڈ نشاط گنج لکھنؤ

اور مال لے جانے والے ٹرک ہر وقت گزرا کرتے ہیں اس لیے ان کا چوڑا ہونا اشد ضروری ہے۔ یہ عام طور سے ۸ میٹر چوڑی ہوتی ہیں اور دونوں طرف ڈیڑھ میٹر چوڑی پٹی ہوتی ہے۔

ریاستی شاہراہیں

یہ صوبے کے اہم بڑے شہروں کو ملاتی ہیں اور خود جاکر قومی شاہراہوں سے مل جاتی ہیں جیسے لکھنؤ کانپور روڈ۔ کانپور میں یہ ٹرک جی ٹی روڈ سے مل جاتی ہے۔ یہ شہروں سے ہوکر گزرتی ہیں اس لیے ان کے دونوں طرف لوگوں کے چلنے کے لیے سمنٹ اور کانکریٹ کے فٹ پاتھ ہوتے ہیں۔

جب تم پک نک کے لیے شہر سے گانو کی طرف گئے ہوں گے تو دیکھا ہوگا کہ ٹرک کے کنارے بہت سے گانو آباد ہیں جہاں سے سبزی اور اناج گاڑیوں کے ذریعے شہر کو آرہا ہے۔ ایسی سڑکوں کو ضلع کی سڑکیں کہتے ہیں یہ ضلع کے اندر گانووں سے منڈی کو سامان پہنچانے اور آمد و رفت کے لیے ہوتی ہیں ان پر ضلع کے خاص خاص بڑے قصبے بسے ہوتے ہیں۔ یہ سڑکیں پیداوار والے خطے کو ضلع کی سڑکوں یا ریلوے سے ملاتی ہیں اور خاص مقاموں کو ضلع کے صدر مقام سے ملاتی ہیں۔ ان کی دیکھ بھال ضلع بورڈ کرتا ہے۔

تم میں سے کچھ لوگ گانو کے بھی رہنے والے ہوں گے اور تم اپنے دوستوں سے ملنے دوسرے گانو میں کسی پگ ڈنڈی۔ گلیارے یا ٹرک سے جاتے ہوگے ان سڑکوں کو (VILLAGE ROADS) دیہی سڑکیں کہتے ہیں۔ یہ سڑکیں ایک گانو کو دوسرے گانووں سے ملاتی ہیں یا ریلوے اسٹیشن یا ضلع کے ہیڈ کوارٹر کو لے جاتی ہیں۔ یہ زیادہ تر کچی ہوتی ہیں لیکن ان کی اہمیت گانو کے ترقیاتی پروگراموں کے لیے بہت ہے۔

بچو! جب تم نے شہر سے دیہات کا سڑک کے ذریعے سفر کیا ہوگا تو کہیں کہیں راستے میں مزدوروں کے جتھے ملے ہوں گے جو سڑک کی مرمت کر رہے ہوں گے۔ کسی سڑک پر تارکول بچھائی جا رہی ہوگی اور کہیں بجری ڈالی جا رہی ہوگی اور کہیں صرف مٹی ہی سے پٹائی ہو رہی ہوگی۔ جیسی سڑک ویسی اس کی مرمت، بناوٹ کے لحاظ سے ہم سڑکوں کو اس طرح تقسیم کر سکتے ہیں۔

کچی سڑکیں

دیہات کے لیے یہ سڑکیں بہت زیادہ کارآمد ہیں۔ یہ کم خرچ میں آسانی سے بنائی جا سکتی ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا بارش میں ان پر کیچڑ ہو جاتی ہے اور گرمیوں میں خوب دھول اڑتی ہے۔

کنکڑ کی سڑکیں

مٹی کی پٹائی کے بعد کنکڑ کی کٹائی سے بنائی جاتی ہیں۔ یہ ہمارے ملک کے دیہاتوں کے لیے زیادہ مناسب ہیں۔ ۸

ڈامر کی سڑکیں BLACK TOP ROADS

ان سڑکوں کی سطح پر تارکول کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ سڑکیں شہروں اور قصبوں میں مقبول ہیں۔ قومی شاہراہیں اور ریاستی شاہراہیں اسی طرح کی ہوتی ہیں۔

سمنٹ اور کانکریٹ کی سڑکیں CEMENT CONCRETE ROADS

یہ دوسری طرح کی سڑکوں سے بہتر ہوتی ہیں۔ یہ اونچے پیمانے پر بہت استعمال میں آتی ہیں۔ یہ زیادہ دن تک چلتی ہیں اور ان کی دیکھ بھال میں بھی کم خرچ ہوتا ہے لیکن ان پر چلنے والی گاڑیاں گھڑگھڑاہٹ کی آواز پیدا کرتی ہیں۔

پہاڑی سڑکیں HILL ROADS

بچو۔ کیا تم کبھی نینی تال۔ الموڑہ یا کسی دوسرے پہاڑی مقام پر گئے ہو۔ کیا تم نے وہاں کی سڑکوں کی بناوٹ پر دھیان دیا ہے کہیں یک دم اونچائی پر چڑھ جاتی ہے اور پھر ڈھالو جگہ پر اتر کر آتی ہے کھڈ سے بالکل سٹ کر گزرتی ہے۔ پہاڑی سڑکیں پہاڑ کاٹ کر بنائی جاتی ہیں۔ ان کو بنانا۔ ڈیزائن کرنا اور ان کی دیکھ ریکھ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ بہت خطرناک ہوتی ہیں اور اکثر حادثے ہو جاتے ہیں۔

بچو۔ کیا تم نے کبھی اہل کاروں کو اسٹینڈ پر میز رکھ کر پرکار سے نقشے بناتے اور لوہے کی چین سے پیمائش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہ جونیر انجینئر اور ان کے تحت کام کرنے والے نئی سڑکوں کے لیے منصوبہ بناتے ہیں۔ نئی سڑکوں کے لیے منصوبہ بنانا اور ڈیزائن کرنا روڈ پروجکٹ کہلاتا ہے اس کو ہم ان خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ سروے یا پیمائش	SURVEY
۲۔ نقشوں کی تیاری	PREPARATION OF MAPS
۳۔ آراضی کا حاصل کرنا	ACQUISITION OF LAND
۴۔ روڈ الائنگ منٹ	ROAD ALIGMENT

۵- مٹی کا کام EARTH WORK
۶- ٹریفک سروے TRAFFIC SURVEY
۷- تخمینہ ESTIMATES

بچو- کیا تم نے اس جگہ کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے دیکھا ہے جہاں سے نئی سڑک نکلنے والی ہے۔ جس طرح سے کوئی نیا مکان بناتا ہے تو مناسب جگہ کو منتخب کرتا ہے۔ پاس پڑوس کے لوگوں کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ خرچ ہونے والی رقم کا پہلے ہی سے حساب لگا لیتا ہے۔ اسی طرح نئی سڑک بنانے سے پہلے LOCATION لوکیشن کا منتخب کرنا اور آنکڑے اکٹھا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زمین کیسی ہے۔ کھدائی اور بٹائی میں زیادہ خرچ تو نہیں بیٹھے گا۔ پاس پڑوس کے قدرتی ذرائع کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہیں کہ نئی سڑک کن ندی اور نالوں کو کہاں کاٹے گی کم سے کم پل بنانے پڑیں۔ پانی اور دوسری ضرورت کی اشیا آسانی سے مل سکیں۔ پہلے ہم سروے (SURVEY) کرتے ہیں PLANE TABLE پلین ٹیبل پرکار — لوہے کی چین اور (STEEL TAP) اسٹیل کے فیتے کی مدد سے (ROUGH SURVEY) رف سروے کیا جاتا ہے اور (ROUGH LEVEL) رف لیول بھی لیا جاتا ہے جس سے کھدائی اور بٹائی کا موٹا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد آخری ہم (FINAL LOCATION SURVEY) آخری مقامی سروے کرتے ہیں اور (CENTRAL LINE) سینٹرل لائن کھینچتے ہیں اور آخری منصوبہ اور ڈیزائن بناتے ہیں اور لاگت نکالتے ہیں۔

بچو- تم جانتے ہو بغیر جنگل جھاڑیوں کو صاف کیے نہیں نکالی جا سکتی بل ڈوزر- ٹرکٹروں اور ٹرکوں کی مدد سے ہم (SITE) سائٹ صاف کرتے ہیں۔ ٹیلوں کو کاٹنے- گڈھوں کو بھرنے اور زمین کو برابر کرنے کے لیے (ROAD MACHINERY) روڈ مشینری کا استعمال کرتے ہیں اور DOZER، GRADER اور ROLLER کو کام میں لاتے ہیں۔ سینٹرل لائن پر داغ بیل لگاتے ہیں۔ تم نے سڑک بنتے وقت رسی سے داغ بیل لگانے کے بعد دونوں طرف کے گڈھوں سے مٹی نکال کر پٹائی کرتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا اور کھدائی کے لیے بانس اور دوسری چیزیں گڑی ہوئی دیکھی ہوں گی۔ اس کام کو CONSTRUCTION SURVEY تعمیری سروے کہا جاتا ہے۔

بچو- جب کوئی نیا مکان بناتا ہے تو وہ مکان کا نقشہ بنوا لیتا ہے اور اس کے مطابق تعمیری کام کرتا ہے اسی طرح سڑک بنانے کے سلسلہ میں ہمیں کئی طرح کے نقشے بنانے پڑتے ہیں۔

نئی سڑک جہاں سے نکل رہی ہے اس کے پاس پڑوس کے بڑے گانو ہر طرح کی نئی سڑکیں۔ پانی کے ذرائع- کنویں- اسپتال اور تھانے وغیرہ تم جاننا ضروری سمجھوگے کیوں کہ ان سے تعمیری کام کے وقت مدد ملتی ہے اس سلسلہ میں ہم TOPOGRAPHICAL ٹاپوگرافیکل نقشے بناتے ہیں اور ان میں (CONTOUR) کنٹور بھی دکھاتے ہیں۔

بچو- تم چاہو گے کہ نئی سڑک سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچے اس کے لیے ہم کو (POPULATION MAPS) آبادی سے متعلق نقشے بنانا ضروری ہیں جن میں اس خطہ کی آبادی دکھائی جاتی ہے۔ تم یہ بھی چاہو گے کہ نئی سڑک سے اس خطہ کی تجارت- انڈسٹری اور ایگریکلچر زیادہ سے زیادہ بڑھ سکے اس کے لیے (AGRICULTURAL) ایگریکلچر اور انڈسٹریل نقشے بھی بنانے ضروری ہیں۔

ہم (PROPOSED PLAN) تجویز کیے ہوئے منصوبہ میں (DETAILED SECTION OF PROPOSED ROADS) تجویز کی ہوئی سڑک کا تفصیلی سکشن دکھاتے ہیں جن میں مٹی کے کام اور کھدائی کو دھیان میں رکھتے ہوئے پلوں اور ریلوے کراسنگ کو (RAILWAY CROSSING) الگ (SHEET) کاغذ پر دکھاتے ہیں۔

بچو- تم جانتے ہوگے کہ نہر جس زمین سے نکلتی ہے وہ زمین سرکار لے لیتی ہے اور زمین کے مالکوں کو اس کے بدلے زمین دے دیتی ہے یا پھر معاوضہ۔ اسی طرح سڑک کے بنانے کے لیے بھی زمین لے لی جاتی ہے اور یہ دھیان میں رکھا جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچے اور کم سے کم لوگوں کو نقصان۔ ایسی زمین نہ لی جائے جو کھیتی کے کام آ رہی ہو یا جس کو فروغ دیا جا چکا ہو۔ کچھ زمین عارضی طور پر سڑک کے دونوں طرف ایسی بھی لی جاتی ہیں جو گڈھے کھودنے کے کام میں آتی ہے جو سڑک بن جانے کے بعد کاشتکاروں کو پٹہ پر اٹھا دی جاتی ہے اس کو (ACQUISITION OF LAND) اراضی حاصل کرنا کہتے ہیں۔

بچو- جب تم ایک گانو سے دوسرے گانو جاتے ہو تو چھوٹے راستے اور سیدھے راستے پر یا پگڈنڈی پر چلنے کی کوشش کرتے ہو۔ اسی طرح جب سڑک بنائی جاتی ہے تو یہ دھیان میں رکھا جاتا ہے کہ چھوٹا اور سیدھا راستہ منتخب کیا جائے لیکن یہ ناممکن ہوتا ہے کیونکہ نئی سڑک سے مخصوص قصبوں

زیادہ سے زیادہ گاؤں۔ ریلوے اسٹیشن۔ تجارتی مرکزوں کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے۔ ہم سینٹرل لائن پہلے منصوبہ پر بناتے ہیں پھر SITE سائٹ پر نئی سڑک ندی اور نالوں کو بھی کاٹ سکتی ہے لیکن سڑک ایسی جگہ نکالی جائے جہاں ندی کی گہرائی کم سے کم ہو اور پل بنانے میں آسانی رہے اور جہاں تک ممکن ہو کم سے کم پل بنائے جائیں تو لاگت کم بیٹھے گی۔ نئی سڑک ریلوے لائن کو بھی کاٹ سکتی ہے اس کے لیے ہم کو ریلوے کراسنگ بنانے ہوں گے۔ ہم کو دھیان میں رکھنا ہوگا کہ سڑک ریلوے لائن کو زاویہ قائمہ (RIGHT ANGLE) پر کاٹے اور کم سے کم کراسنگ بنانا پڑیں۔ اگر ہم سڑک کو گھنے جنگل سے گزاریں گے تو ہم کو بہت سے مشکلات پیش آئیں گی۔ ہم کو سڑک ایسی جگہ سے گزارنا چاہیے جہاں سڑک بنانے کا سامان آسانی سے مل سکے۔ جہاں تک ہو سڑک کو ٹیڑھا میڑھا نہ بنایا جائے اور کٹاؤ اور پٹاؤ کی کم سے کم ضرورت پڑے۔ اس پورے عمل کو ہم روڈ الائنگ منٹ (ROAD ALIGMENT) کہتے ہیں۔

بچو۔ تم نے شرم دان ضرور کیا ہوگا اور گاؤں کا گلیارا بنایا ہوگا۔ تم نے ادھر ادھر سے مٹی کھودی ہوگی اور سڑک پاٹی ہوگی لیکن کسی ایک جگہ سے مٹی نہیں لی ہوگی۔ اسی طرح سڑک بنانے میں گہری کھدائی نہیں کی جاتی ہے اور کھدائی سے نکلی مٹی کے ڈھیر پر سڑک نکالتے ہیں (CUTTING) کٹاؤ سے نکلی ہوئی مٹی کو بھراؤ میں استعمال کیا جاتا ہے اس کو مٹی کا کام یا (EARTH WORK) کہتے ہیں۔

بچو۔ کوئی کام ہم فائدہ ہی کے لیے کرتے ہیں۔ اس لیے ہم پہلے ہی سے سروے کر لیتے ہیں کہ سڑک بننے کے بعد کیسی اور کتنی ٹریفک اس راستے سے گزرے گی اور اس نئی سڑک سے خطہ میں تجارت اور انڈسٹری کی ترقی پر کیا اثر پڑے گا۔ اس کام کو ٹریفک سروے کہتے ہیں۔

بچو۔ اب ہم تم کو کچھ تخمینہ (ESTIMATES) کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں۔ نئی سڑک بنانے کے لیے سرکار کو بہت پیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے اس لیے لاگت کا موٹا اندازہ پہلے سے لگا لیا جاتا ہے اور اپنے بجٹ کے مطابق دھیرے دھیرے سڑک بنائی ہوتی ہے۔ اس لاگت کو ہم ان خانوں میں بانٹ سکتے ہیں۔

۱۔ زمین خریدنے کا خرچ
۲۔ جنگل، جھاڑیوں اور سائٹ (SITE) صاف کرنے کا خرچ۔
۳۔ کھدائی اور پٹائی کا خرچ۔
۴۔ سڑک کے بنانے میں جو سامان استعمال ہو (کنکریٹ۔ اینٹ۔ بالو۔ تارکول وغیرہ کا خرچ
۵۔ پلوں اور (RAILWAY CROSING) ریلوے کراسنگ بنانے کا خرچ
۶۔ کلومیٹرا ور حدود کے تعین کے لیے پتھر لگانے کا خرچ۔
۷۔ TEMPORARY STORES عارضی اسٹورس اور سائٹ بلڈنگ بنانے کا خرچ۔

بچو۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بارش میں کچھ سڑکوں پر پانی بھر جاتا ہے اور تم کو اسکول آنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ سڑک بناتے وقت یہ دھیان رہے کہ سڑک کا ایسا (DESIGN) ڈیزائن کیا جائے کہ سڑک پر بارش کا پانی نہ ٹھہرنے پائے۔ ایک اچھی سڑک ہمیشہ سوکھی رہتی ہے۔ اس میں اچھا اُتار۔ چڑھاؤ ہوتا ہے ٹریفک کے چلنے میں آسانی ہوتی ہے اور دیکھ بھال میں کم خرچ ہوتا ہے۔

بچو۔ کیا تم نے یہ بھی کبھی سوچا ہے۔ سرکار سڑکیں بنانے اور ان کی دیکھ بھال پر اتنا زور کیوں دیتی ہے۔ ان سے عوام کا کیا فائدہ ہے۔

ہمارا ملک اتنا وسیع ہے کہ ہم جگہ جگہ ملیٹری نہیں کھڑی کر سکتے ہیں۔ لڑائی کے وقت اچھی سڑکوں کا جال ملک کی حفاظت میں بہت مدد کرتا ہے اور فوج فوراً موقع پر پہنچ جاتی ہے۔ ملک کے اندر اچھے انتظام کے لیے بھی سڑکوں کی بہت ضرورت ہے کیونکہ پولیس اور فوج دنگے فساد کی جگہ فوراً بھیجی جا سکتی ہے۔

سڑکوں سے آمد و رفت میں بہت مدد ملتی ہے۔ سڑکیں ملک کی تجارت اور مالی حالت درست کرنے میں بہت مدد کرتی ہیں۔ سڑکیں ریلوے اور ہوائی راستہ کے لیے (FEEDER) فیڈر کا کام کرتی ہیں۔ جتنا اچھا ملک میں سڑکوں کا جال بچھا ہوگا اتنا ہی ملک ترقی یافتہ ہوگا۔

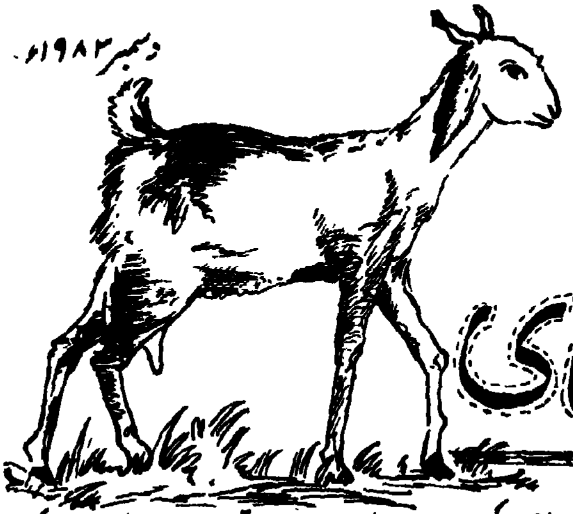
بھارت ایک زراعتی ملک ہے اس کی مالی ترقی سڑکوں پر منحصر ہے اس لیے ہم کو ملک میں اچھی سے اچھی اور زیادہ سے زیادہ سڑکیں بنانا ہے تاکہ ہمارا ملک بین الاقوامی دوڑ میں سب سے آگے نکل سکے۔

ضروری اعلان

طباعت اور کاغذ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے ہمیں مجبوراً پیام تعلیم کی قیمت میں اضافہ کرنا پڑ رہا ہے اب جنوری ۸۴ء سے عام شمارے کی قیمت ۲/۵۰ روپے ہوگی اور سالانہ ۲۰/ روپے ہوگی۔

مناظر صدیقی

آرو کی بکری



بہت دنوں پہلے کا ذکر ہے کہ یورپ کے کسی گانو میں رحیمو نامی ایک شخص رہتا تھا۔ وہ نرم بالوں والے جانوروں کی کھالیں بیچ کر زندگی گزارتا۔ اس کا چھوٹا سا خاندان گانو میں بڑے آرام کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس خاندان کو نہ تو دولت مند کہا جا سکتا تھا اور نہ غریب۔ ان کے پاس بہت بڑی زمینیں نہیں تھیں کہ ان پر کاشت کرتے اور ڈھیر سارا روپیا کماتے، نہ بے شمار مویشی تھے کہ ان کا دودھ بیچتے۔ نہ گھوڑا گاڑی تھی نہ بیل گاڑی۔ اس کے باوجود انھیں قرض مانگنے یا کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ رحیمو بہت عقل مند آدمی تھا۔ اس نے اپنے بچوں کی تربیت بھی اس طرح کی تھی کہ یہ بچے کبھی کسی چیز کے لیے ضد نہیں کرتے تھے۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا آرو اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا اور اس کی دونوں بیٹیاں مریم اور نوٹیلا اپنی ماں کے ساتھ گھر کا کام کاج نمٹاتی تھیں۔ تینوں بہن بھائیوں میں آرو سب سے بڑا تھا۔ مریم اس سے چھوٹی تھی اور نوٹیلا سب سے چھوٹی۔

ایک مرتبہ کیا ہوا کہ اس کے علاقے میں بہت کم برف باری ہوئی۔ حالانکہ ہر سال تو اس علاقے میں اتنی برف پڑتی کہ اس گانو تک پہنچنے والے تمام راستے برف کی وجہ سے بند ہو جاتے۔ البتہ اس برف باری کی وجہ سے پورے علاقے میں سردیوں کے دوران ہونے والی فصل اچھی ہوتی تھی۔ اس مرتبہ برف باری کم ہوئی تو فصلیں بھی خراب ہو گئیں، اتنا اناج ہی پیدا نہیں ہوا کہ گانو والے اپنی سال بھر کی ضرورت کے مطابق اناج کا ذخیرہ کر لیں۔ فصلیں خراب ہوئیں تو پورے علاقے میں قحط پڑ گیا۔ لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے دوسرے شہروں میں جا کر رہنے لگے لیکن رحیمو نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا گانو ہرگز نہیں چھوڑے گا۔ قحط کی وجہ سے اس کا کاروبار بھی بند ہو گیا، کیوں کہ جب لوگوں کے پاس کھانے تک کو نہ تھا تو رحیمو سے نرم بالوں والے جانوروں کی کھالیں کون خریدتا!

قحط کی وجہ سے دھیرے دھیرے رحیمو کے وہ تمام پیسے خرچ ہو گئے جو اس نے کئی برسوں کی محنت کے بعد اپنے بچوں کی شادی بیاہ کے لیے جمع کیے تھے۔ جب جمع پونجی ختم ہو گئی تو گھر کی چیزیں بکنے کی نوبت آ گئی۔ ساری قیمتی چیزیں بک چکیں، لیکن قحط کا زور پھر بھی نہیں ٹوٹا۔ اب رحیمو کے پاس صرف ایک بکری رہ گئی تھی۔ یہ بکری بھی بوڑھی ہو چکی تھی۔ اب تو یہ دودھ بھی بہت کم دیتی تھی۔ چنانچہ رحیمو نے اس بکری کو بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ بکری رحیمو کی دونوں بیٹیوں مریم اور دیلیا

کی چہیتی تھی۔ خاص طور پر نوٹیلا کو تو اس سے بڑی محبت تھی۔رحیمو کو معلوم تھا کہ اگر بکری بیچنے کے لیے اس نے نوٹیلا کو راضی نہ کیا تو وہ بہت روئے گی۔اس لیے اس نے ایک دن نوٹیلا کو بلا کر سمجھایا کہ بکری بوڑھی ہو چکی ہے اب وہ اتنا دودھ بھی نہیں دیتی کہ پورے خاندان کے لیے کافی ہو۔اس لیے اُسے بیچ دینا ہی مناسب ہے۔جیسے ہی قحط کا اثر کم ہوگا،نوٹیلا کے لیے نئی بکری خرید لی جائے گی۔نوٹیلا نے بڑی مشکل سے اجازت دی، ساتھ ہی یہ وعدہ بھی لے لیا کہ جلد سے جلد اس کے لیے نئی بکری خریدلی جائے گی۔

نوٹیلا سے اجازت ملنے کے بعد رحیمو نے گاؤں کے ایک قسائی کو بلایا تاکہ بکری اس کے ہاتھ فروخت کردے۔ قسائی نے بکری کی قیمت صرف چند روپے لگائی۔ رحیمو کا خیال تھا کہ یہ قیمت بہت کم ہے۔ اتنی رقم میں تو صرف اس کا ایک مہینے کا خرچ ہی چل سکتا تھا۔پھر اُسے خیال آیا کہ اگر بکری کو دوسرے بڑے شہر میں لے جاکر بیچا جائے تو اس کی اچھی قیمت مل جائے گی۔اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ اسے لے کر شہر چلا جائے اور جانوروں کی منڈی میں اسے فروخت کردے اور کوشش کرے کہ اس کی قیمت پندرہ رُپے لگے۔ اگر یہ قیمت نہ مل سکے تو کم سے کم دس رُپے ضرور ہونے چاہییں۔ رحیمو کو یقین تھا کہ شہر میں گوشت مہنگا ہوتا ہے اس لیے وہاں کے قسائی یقیناً زیادہ قیمت دے دیں گے۔

آرد دوسرے دن صبح صبح گاؤں سے شہر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس نے بکری کے گلے میں ایک مضبوط رسّی باندھی تاکہ بکری کہیں بھاگ نہ جائے۔ اس کی ماں نے دو روٹیاں اور پنیر کے چند ٹکڑے ایک پوٹلی میں باندھ کر اس کے ساتھ کر دیے تاکہ راستے میں بھوک لگے تو انھیں کھالے۔



آرد نے جب رسّی پکڑ کر بکری کو اُٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ ہمیشہ کی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی۔اس نے ہمیشہ کی طرح محبّت سے آرد کے ہاتھوں کو اپنی زبان سے چاٹا اور آرد کے ساتھ چلنے لگی۔بکریوں کو انسانوں پر پورا بھروسا ہوتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ انسان ہمیشہ اس کا اور اُس جیسی بکریوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔وہ انھیں پیٹ بھر کر کھانے کو دیتے ہیں۔ درندوں اور جنگلی جانوروں سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اُس نے کبھی بکریاں کٹتے دیکھی نہیں تھیں اس لیے وہ انسانوں کو اپنا دوست سمجھتی تھی۔ اس لیے وہ خاموشی سے آرد کے ساتھ چل رہی تھی۔جب تک وہ لوگ گاؤں کے بازار سے گزرتے رہے بکری بھی چُپ چاپ آرد کے ساتھ چلتی رہی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید آرد اُسے روزانہ کی طرح چرانے کے لیے جنگل میں لے جارہا ہے، لیکن جب آرد شہر جانے والی سڑک پر پہنچا اور اس نے جنگل کے بجائے شہر کا رُخ کیا تو بکری کو بڑی حیرت ہوئی، اس نے گردن

اُٹھا کر آرو کی طرف دیکھا جیسے اُس سے پوچھنا چاہتی ہو کہ یہ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ لیکن شاید اُسے فوراً ہی خیال آگیا کہ بکریاں سوالات نہیں کیا کرتیں۔ اسی لیے وہ بھی خاموش رہی، البتہ حیرت سے چاروں طرف دیکھتی رہی۔ اُسے آج بڑی نئی نئی چیزیں نظر آرہی تھیں۔ نئے نئے مکانات جن کی چھتیں گھاس پھوس کی تھیں، نئے نئے جنگل۔ ایک جگہ راستے میں ایک کُتا بھونکتے ہوئے ان کی طرف لپکا، جسے آرو نے اپنی لکڑی دکھا کر بھگادیا یہ بات بھی بکری کے لیے نئی تھی، کیوں کہ گانو کے کتے تو گانو کی بکریوں سے مانوس ہو چکے تھے۔ وہ کبھی ان بکریوں پر نہیں بھونکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اُن کی طرف گردن اُٹھا کر دیکھ لیتے تھے اور پھر سو جاتے یا اپنی راہ چلے جاتے۔

آرو جب اپنی بکری کے ساتھ گھر سے چلا تھا تو موسم نہایت اچھا تھا، ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گانو سے بڑی دور تک بھی ہر طرف دھوپ ہی دھوپ نظر آرہی تھی اور دھوپ بھی اتنی تیز تھی کہ آرو کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نظر آنے لگی تھیں۔ اب وہ دونوں اپنے گانو سے کافی دور پہنچ چکے تھے۔ اُس وقت اچانک ہی موسم تبدیل ہو گیا۔ مشرق کی طرف سے اچانک بادل نظر آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے بادلوں سے سارا آسمان چھپ گیا۔ اب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں بھی چلنے لگیں۔ آرو سمجھ رہا تھا کہ ہلکی بوندا باندی ہوگی، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ بوندا باندی تیز اور موسلا دھار بارش میں تبدیل ہو گئی۔ اب ہر طرف اندھیرا سا پھیل گیا۔ آرو کو ایسی جگہ کی تلاش ہوئی جہاں وہ اپنی بکری کے ساتھ پناہ لے سکے۔ بکریاں تو یوں بھی پانی سے بہت گھبراتی ہیں۔ آرو نے پناہ تلاش کرنے کے لیے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اُسے قریب ہی ایک بڑا سایادار درخت نظر آگیا۔ آرو اُس درخت کی طرف بڑھا ہی تھا کہ بارش کے ساتھ اولے پڑنے لگے۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا اُس درخت کے نیچے تو پہنچ گیا، لیکن اتنی دیر میں اچھی خاصی برف باری شروع ہو گئی تھی۔ اب آرو نے سوچا کہ صرف اس درخت کے نیچے پناہ لینا مناسب نہیں ہوگا۔ اُسے جلد سے جلد کسی بستی میں پہنچنا چاہیے چناں چہ وہ اپنی بکری کو گھسیٹتا ہوا اتنی جلدی جلدی چلنے لگا جیسے دوڑ رہا ہو۔ بے چاری بکری بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس سردی سے بچنے کے لیے کسی محفوظ مقام پر پہنچنا ضروری ہے۔ وہ بھی موسم کی اس اچانک تبدیلی سے واقف تھی۔ آخر اس کی عمر بھی تو اس وقت بارہ سال تھی۔ اس نے کئی سردیاں دیکھی تھیں، اُسے معلوم تھا کہ اس پہاڑی علاقے میں موسم کتنی جلدی جلدی تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہ بھی آرو کے ساتھ دوڑتی رہی، لیکن جب اس کے پیر برف میں دھنسنے لگے تو اس نے ایک مرتبہ پھر آرو کی طرف دیکھا، جیسے اس بار اس سے پوچھنا چاہتی ہو کہ آخر ہم اس خراب موسم میں گھر سے باہر ہی کیوں نکلے ہیں؟ لیکن بے چاری بولتی کیسے، اس لیے خاموش ہی رہی۔

آرو کا خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی کسان اپنی گاڑی میں اِدھر سے ضرور گزرے گا اور اسے بھی اپنے ساتھ بٹھالے گا، لیکن اِدھر کوئی بھی نہیں آیا۔ اتنی دیر میں برف باری طوفانی شکل اختیار کر چکی تھی، ہر طرف برف روئی کے گالوں کی طرح اُڑ رہی تھی۔ برف باری کے ساتھ ساتھ تیز ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اب تو آرو کو راستہ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا نہ اُسے سمتوں کا اندازہ رہا تھا کہ مشرق کدھر ہے اور مغرب کدھر۔

بکری اس برف باری سے گھبرا کر چیخنے لگی تھی۔ اس کی چیخیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے وہ

دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہو۔ اب بکری سے چلّایا بھی نہیں جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنے اگلے پیروں کو موڑ کر زمین سے ٹیکا دیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت بکری اپنے دِل میں سوچ رہی ہو کہ جن انسانوں کو وہ اپنا دوست سمجھتی تھی اور اُن پر بھروسا کرتی تھی، انھی انسانوں میں سے ایک نے اُسے بالکل اُسی طرح دھوکا دیا جیسے یہ انسان آپس میں ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔ یہ سب باتیں وہ صاف صاف کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس لیے بس مَیں مَیں کرکے چیختی رہی۔

آرو بھی اب سمجھ چکا تھا کہ یہ کوئی معمولی برف باری نہیں، اچھا خاصا طوفان ہے اور اگر انھیں فوراً کوئی پناہ گاہ نہ ملی تو وہ اور اس کی بکری دونوں ہی اس برف میں قلفی کی طرح جم کر رہ جائیں گے۔ وہ دِل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ اُس کی اور اس کی بے زبان بکری کی جان بچ جائے۔ اچانک اُسے اپنے راستے میں برف کا ایک گول اور لمبوترا سا ٹیلا نظر آیا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ وہ راستہ بھٹک چکا ہے اور سڑک سے ہٹ کر کھیتوں کے درمیان پہنچ چکا ہے۔ ہر طرف برف ہی برف پھیلی ہوئی تھی، آرو یہ اندازہ نہ لگا



سکا کہ سڑک اس سے کتنی دُور ہے۔ اس نے ٹیلے کو جو غور سے دیکھا تو اُسے پتا چلا کہ یہ تو سوکھی گھاس کا بڑا سا ڈھیر ہے، اوپر برف جم جانے کی وجہ سے برف کا ٹیلا نظر آرہا تھا۔ آرو نے فوراً ہی اس ڈھیر میں پناہ لینے کا فیصلا کیا اور اپنی لاٹھی سے برف اور سوکھی گھاس ہٹانے لگا۔ بڑی محنت اور مشکل سے آرو نے اس ڈھیر میں اتنی جگہ بنا ہی لی کہ وہ اور اس کی بکری اس میں پناہ لے سکیں۔

ڈھیر میں بنائی ہوئی جگہ میں جب وہ دونوں داخل ہوئے تو اُن کی جان میں جان آئی۔ اب باہر چاہے جتنی بھی سردی ہو وہ دونوں تو اس گھاس کے نیچے سردی سے محفوظ تھے۔ آرو نے اپنی جگہ بنانے کے لیے جتنی گھاس ہٹائی تھی وہ بھی اس نے گھسیٹ کر سامنے کی طرف جمع کرلی۔ اِس طرح اب یہ سوکھی گھاس اُن کے لیے ایک اچھا خاصا گرم کمرہ بن چکی تھی جس میں تازہ ہوا کے لیے ایک کھڑکی بھی بن گئی تھی۔ اِدھر بکری نے جو اتنی ساری گھاس دیکھی تو اُسے بھی اطمینان ہو گیا کہ اب آسانی سے پیٹ بھر جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے گھاس پر مُنھ مارا اور اپنا پیٹ بھرنے لگی۔ جب اس کا پیٹ بھر گیا تو ایک طرف آرام سے بیٹھ گئی۔ آرو کو جب اپنے کام سے فرصت ہوئی تو اُسے بھی بھوک لگنے لگی۔ اس نے بھی پوٹلی میں بندھی ہوئی روٹیاں نکال کر کھالیں۔ یہ جگہ اتنی گرم تھی کہ پیٹ بھر جانے کے بعد آرو کو نیند آنے لگی۔ لیکن یہاں اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ آرام سے لیٹ جاتا۔ بکری اس کے برابر ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ اونگھنے لگا اور بکری سے ٹک کر بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا۔

بڑی دیر تک سونے کے بعد جب آرو کی آنکھ کھلی تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ آرو نے

ہوا کے لیے گھاس کے ڈھیر میں جو کھڑکی سی بنائی تھی وہ بھی برف باری کی وجہ سے بند ہوگئی تھی۔ اس لیے اندر ہوا بالکل نہیں آرہی تھی۔ اس طرح وہ سردی سے تو بچ گئے تھے، لیکن تازہ ہوا بھی تو ہر جان دار کے لیے ضروری ہوتی ہے اور ہوا چوں کہ اندر آ ہی نہیں رہی تھی اس لیے آرو کا دم گھٹنے لگا۔ بکری بھی کچھ بے چین سی نظر آرہی تھی۔ آرو نے اپنی لاٹھی سے ایک مرتبہ پھر برف میں سوراخ بنایا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر اب بھی طوفان تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا جس کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس وقت دن ہے یا رات ہو چکی ہے۔

بہرحال جب تازہ ہوا ملنے سے انھیں کچھ اطمینان ہوا تو آرو کو پھر بھوک لگنے لگی۔ روٹیاں تو وہ کھا چکا تھا۔ بڑی دیر سوچنے کے بعد اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ بکری کا دودھ پی کر ہی پیٹ بھر لے، لیکن اس کے پاس کوئی برتن نہیں تھا۔ مجبوراً اُس نے بکری کے تھنوں سے منھ لگا کر ہی دودھ پی لیا۔

اب خاموش بیٹھے بیٹھے اس کا دِل گھبرانے لگا تھا۔ اس نے بکری کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "پیاری بکری، دیکھو تو ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔" بکری بے چاری کیا جواب دیتی۔ اس کے پاس تو آرو کی ہر بات کا جواب صرف ایک تھا یعنی وہ اپنی زبان میں بس مَیں، مَیں، مَیں کر کے چُپ ہو جاتی۔

بکری کا دودھ پیتے اور بار بار تازہ ہوا کے لیے سُوراخ بناتے ہوئے تین دن گزر گئے۔ چوتھے دن آرو نے جب ایک مرتبہ پھر تازہ ہوا کے لیے سوراخ بنایا تو اسے باہر سورج کی روشنی بھی نظر آئی اور گاڑیاں چلنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ اب آرو نے جلدی جلدی راستہ صاف کیا اور اپنی بکری کو لے کر ڈھیر سے باہر نکل آیا۔ باہر ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ شہر جا کر بکری بیچ دے، لیکن فوراً ہی اُسے خیال آیا کہ اتنی اچھی بکری کو جس نے تین دن تک اپنا دودھ پلا پلا کر اس کی جان بچائی ہے، وہ کیسے بیچ سکے گا؟ یہ خیال آتے ہی اُس نے شہر جانے کا ارادہ بدل دیا اور واپس اپنے گاؤں کی طرف چل دیا۔



آرو اور اس کی بکری جب واپس اپنے گھر پہنچے تو آرو کے باپ رحیمو اُس کی دونوں بہنوں مریم، نوئیلا اور اس کی ماں نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور بتایا کہ وہ سب لوگ تو آرو کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ اتنے بڑے طوفان میں وہ زندہ نہیں بچ سکتا۔ پھر آرو نے انھیں بتایا کہ پچھلے تین دن اُس نے کس طرح گزارے اور بکری نے کس طرح اپنا دودھ پلا کر اس کی جان بچائی۔ جس کے بدلے اس نے بکری کو بیچنے کا ارادہ بدل دیا۔ سارا واقعہ سُن کر آرو کی ماں نے کہا:

"واقعی ہم سے تو یہ جانور ہی اچھا ہے۔ ہم انسانوں نے تو ذرا سا دودھ کم ہوتے ہی اُسے

عبداللطیف اعظمی

(آخری قسط)

مولوی محمد حفیظ الدین

بچّوں کے اُستاد اور ادیب

"پیام تعلیم" کے پچھلے پرچے میں مولوی محمد حفیظ الدینؒ صاحب کی زندگی کے حالات آپ پڑھ چکے ہیں اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کتنے اچھے استاد تھے اور طالب علم ان کو کتنا پسند کرتے تھے۔ اب ہم آپ کو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ انھوں نے کتنا کچھ اور کیا کچھ بچّوں کے لیے لکھا ہے۔

پچھلی مرتبہ ایک ضروری بات لکھنے کا موقع نہیں ملا تھا، وہ یہ کہ جامعہ میں جب کبھی باہر سے کوئی اہم مہمان آتا تھا تو عام طور پر ان کی آؤ بھگت اسکول کے بچے کرتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اسکول کے بچّوں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت پر خاص دھیان دیتے تھے، اسی لیے جامعہ کے اسکولوں کو بڑی شہرت حاصل تھی اور اس میں پڑھنے کے لیے ملک کے کونے کونے سے بچّے آتے تھے۔ اور ان کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ ان سب کا داخلہ نہیں ہو پاتا تھا اور بہت سے بچے مایوس ہو کر واپس چلے جاتے تھے۔

حفیظ صاحب کو چوں کہ بچّوں کی زبان لکھنے کا بڑا اچھا سلیقہ آتا تھا، اس لیے جامعہ میں جب کوئی مہمان آتا تو ان کے خیر مقدم یا استقبال کے لیے

۹۴۳، ذاکر نگر، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵



سپاسنامہ لکھنے کا کام انھیں کو سپرد کیا جاتا۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب جامعہ ملیہ سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں تھا، مگر جامعہ نگر ہی میں رہتے تھے، تو اس زمانے میں بھی اگر کوئی اہم مہمان آتے اور ان کو سپاسنامہ دیا جاتا، تب بھی یہ خدمت حفیظ صاحب سے ہی لی جاتی۔ چنانچہ مرحوم کے کاغذات میں ہمیں ایک سپاس نامے کی نقل ملی ہے جس کا تعلق اسی زمانے سے ہے جب وہ تمام کاموں سے بے تعلق ہو کر گھر پر آرام کر رہے تھے۔ یہ ۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ سعودی عرب سے ایک اہم مہمان "شیخ یوسف فوزان" جو وہاں کی حکومت کے وزیر بھی تھے، دہلی تشریف لائے اور جامعہ دیکھنے کے لیے یہاں بھی آئے اور بچّوں کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ ہر مرتبہ کی طرح اس مرتبہ بھی ان کی خدمت میں بچّوں کے ایک نمائندے نے سپاسنامہ پڑھ کر سنایا اور ان کو پیش کیا۔ حفیظ الدینؒ صاحب کی زبان اور لکھنے کا انداز کتنا اچھا ہوتا تھا،

اس کو بتلانے کے لیے، اس کے شروع کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے، ذرا غور سے پڑھیے:

"چاہیے تو یہ تھا کہ ہم آپ کا خیر مقدم اپنی پیاری اور دینی زبان عربی میں کرتے جو اسلامی تعلیمات کی امین ہے، لیکن ہمارا جی چاہتا ہے کہ اپنی مادری زبان اُردو ہی میں کریں، جسے ہمارے ادیب آبِ کوثر میں ڈھلی، شیریں اور پاکیزہ زبان کہتے ہیں۔ ایک ادیب نے تو یہاں تک مبالغہ کیا ہے کہ:

احمد پاک کی خاطر اسے منظور تھی
ورنہ قرآن بھی آتا بہ زبانِ دہلی

اچھا ہے، ہم دل کی بات دلّی ہی کی زبان میں کہیں اور بجائے "اہلاً سہلاً مرحباً بکم" کے غالب بہت مشہور مگر جذبات کے صحیح ترجمان شعر میں کہیں:

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

آپ کو اپنے پیارے رسالے "پیام تعلیم" کے سابق اڈیٹر، محمد حسین حسّان مرحوم یاد ہوں گے، جنھوں نے اپنی دن ورات کی محنت سے اس رسالے کو بڑی ترقی دی۔ انھوں نے بھی حفیظ صاحب کی طرح پہلے لکھنؤ کے ندوۃ العلما میں تعلیم حاصل کی تھی اور بعد میں جامعہ کے درجۂ خاص میں داخلہ لیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان خوب دوستی تھی اور دونوں ایک دوسرے کی بات ٹالتے نہیں تھے۔ چنانچہ حسین حسّان مرحوم کے کہنے پر حفیظ صاحب نے پیام تعلیم کے لیے بہت سے دلچسپ اور معلوماتی مضمون لکھے تھے، مثلاً اگست ۱۹۶۴ء میں امتحان کے نام سے [illegible] ۱۹۶۵ء میں "مرچیں" کے عنوان سے مئی ۱۹۶۵ء میں حالی کی سوویں سال گرہ"، ستمبر ۱۹۶۵ء میں "جامعہ کے ایک استاد"، اختر حسن فاروقی صاحب کی وفات پر ان کے بارے میں، جنوری ۱۹۶۶ء کے سالنامے میں "سچی کہانیاں"۔ نومبر ۱۹۶۷ء میں حسین حسّان مرحوم کی یاد میں پیام تعلیم کا خاص نمبر شائع ہوا تو اس میں بھی حفیظ صاحب کا ایک مضمون: آخری تصویر کے عنوان سے چھپا۔ افسوس کہ جگہ کی کمی کی وجہ سے ہم ان مضمونوں سے نمونے کے طور پر کوئی اقتباس نہیں دے رہے ہیں، ورنہ آپ کو معلوم ہوتا کہ ان کے مضامین کتنے اچھے ہوتے تھے۔

حفیظ الدین صاحب نے بچوں کے لیے کتابیں بھی لکھی ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں: رام چندر جی (دو حصے)، شکنتلا، مزے دار کہانیاں، مہاتما گاندھی، مولانا روم کی کہانیاں۔ یہ کتابیں ہم نے بہت ڈھونڈیں مگر صرف آخر کی دو مل سکیں۔ پہلی کتاب "مہاتما گاندھی" سب سے پہلے جنوری ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کے کئی اڈیشن شائع ہوئے۔ نام سے آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ یہ باپو کے بارے میں ہے اور اس میں باپو کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ شروع میں باپو کی پوتی تارا گاندھی کا پیش لفظ ہے جس میں کتاب کی تعریف کرنے کے بعد حفیظ الدین صاحب کو مبارک دی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے: "اس کتاب کی اُردو، میٹھی اور آسان ہے اور اس ڈھنگ سے لکھی گئی ہے کہ چھوٹے بچے اسے بڑے مزے کے ساتھ پڑھ سکیں۔ مصنف نے باپو جی کی زندگی کے خاص واقعات کے ساتھ ساتھ ان کے اصولوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔" آگے چل کر اور لکھا ہے: "مصنف نے یہ کتاب لکھ کر بہت اچھا اور مفید کام کیا ہے۔" آخر میں حفیظ صاحب کو مبارک باد دیتے ہوئے لکھا ہے:

"محمد حفیظ الدین صاحب مصنف کو میری دلی مبارکباد۔ میں آشا کرتی ہوں کہ یہ کتاب "مہاتما گاندھی" بہت مقبول ہوگی۔"

دوسری کتاب "مولانا روم کی کہانیاں" بہت دل چسپ اور سبق آموز ہے۔ "سبق آموز" کے معنی تو آپ جانتے ہی ہوں گے، یعنی ایسی کہانیاں جن سے سبق ملتا ہے، پڑھنے والا کچھ سیکھتا ہے ایسی باتیں سیکھتا ہے جن سے زندگی میں بہت فائدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح مولانا روم کو بھی جان لیجیے اور ان کی جس کتاب سے یہ کہانیاں لکھی گئی ہیں، اس کے بارے میں بھی کچھ سن لیجیے اور زیادہ

بہتر ہوگا کہ خود حفیظ صاحب کی زبانی سنیے۔ اس کتاب کے بالکل شروع میں انھوں نے لکھا ہے: "یہ کہانیاں مولانا روم کی مثنوی سے چنی گئی ہیں۔ مثنوی کی چھ بڑی بڑی جلدیں ہیں، یہ کتاب شعروں میں لکھی گئی ہے، کوئی پچیس ہزار شعر اس میں ہوں گے۔ مولانا روم کا مشہور نام جلال الدین ہے، اصلی نام محمد بن محمد حسین ہے۔ یوں مولانا کا وطن بلخ تھا، مگر بچپن ہی میں روم جا بسے۔ اس زمانے میں ایشیائے کوچک کو روم کہتے تھے۔ مولانا ۱۲۰۷ء میں پیدا ہوئے اور بڑی عمر پائی"۔ اس طرح ساڑھے تین صفحے ان کے بارے میں لکھے ہیں اور آخر میں لکھا ہے: "مولانا نے انسانوں کی خدمت اور دل کی پاکی پر بہت زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ محبت دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے"۔ اس کتاب میں کل ۱۲ کہانیاں ہیں اور سب کی سب پڑھنے کے لائق ہیں۔ پہلے یہ کہانیاں ہندی میں چھپی تھیں، ۱۹۷۹ء میں پہلی مرتبہ اردو میں شائع ہوئیں۔ حفیظ صاحب کی یہ سب سے آخری کتاب ہے

حفیظ الدین صاحب نے پہلے درجے سے آٹھویں درجے تک کے لیے درسی کتابیں بھی لکھی ہیں، جنھیں آندھرا پردیش اور راجستھان کی انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا اور ایک عرصے تک وہاں کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک جامعی سے امید رکھی جا سکتی ہیں اور جامعہ کے ایک استاد کی کتابوں میں ہونی چاہییں۔

[بقیہ صفحہ ۱۵]

قسائی کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن ہماری بکری نے ہمارے اس ظلم کے بدلے میں بھی ہم پر احسان کیا۔ تم نے بہت اچھا کیا جو واپس لوٹ آئے"۔

رحیمو نے کہا "اب ہم اس بکری کو کبھی نہیں بیچیں گے، اس نے تمھاری جان بچائی ہے۔ اب چاہے یہ بکری بالکل ہی دودھ نہ دے تب بھی

کوثر بھگوت پوری



تتلی

گُل بوٹے پہ آئے تتلی
آہٹ ہو اُڑ جائے تتلی

شوخ دَھنک سے پَر چمکا کر
من سب کا للچائے تتلی

جنگل جنگل گلشن گلشن
جا کر دُھوم مچائے تتلی

بچّے اپنی سمت بُلائیں
اور بہت اِترائے تتلی

جانے پھُولوں کی تھالی میں
کیا کھا کر اُڑ جائے تتلی

جیسے سُورج کی کرنوں سے
سارے رنگ چُرائے تتلی

(بھگوت پور، ضلع سستی پور (بہار))

دو شکاری

(قسط ۱۰)

امۃ الرحمن محسنی



باب ۱۲

جمعہ کے دن صبح کو چھ بجے ابو نے مجھے جگایا تو ایک دم مجھے یاد آگیا کہ آج وہ اہم ترین دن ہے جس کا مجھے بڑی بے چینی سے انتظار تھا اور اس دن سے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ اور آج ہی وہ دن بھی تھا کہ جس لمحہ سے میری آنکھ کھلی تھی میرے پیٹ میں تتلیاں بلکہ اس سے بھی کوئی زوردار چیز اڑتی اور بھاگتی پھر رہی تھی۔ شاید وہ کوئی سانپ ہی رہا ہوگا۔

کپڑے بدلنے کے بعد سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ دفتر سے وہ سائن جس پر لکھا ہوا ہے کہ "معاف کیجیے بند ہے" لا کر پٹرول کے ایک پمپ پر لٹکا دیا تھا۔ پھر ہاتھ منہ دھو کر جلدی جلدی ناشتہ کیا اور پھر ہم دونوں کشمشوں کی تیاری میں جٹ گئے۔

ابو کشمشیں جمعرات ہی کو لے آئے تھے۔ اسکول سے واپسی پر میں نے ان کو پانی میں بھگو دیا تھا رات بھر بھیگ کر اب وہ نرم ملائم اور موٹی ہو گئی تھیں۔ جیسے ہی ایک کشمش کا منہ کاٹا جاتا اس میں سے گودا نکلنے لگتا تھا۔ ضرورت کے مطابق اس میں سے گودا نکال لیا جاتا تھا۔

میں کشمشوں کا منہ کاٹ کر اس میں سے گودا نکالتا تھا۔ ابو ایک کیپ سول کھول کر اسے کاغذ پر الٹ دیتے تھے اور چاقو کی نوک سے اسے چار حصوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور چار کشمشوں میں بھر کر انھیں کالے دھاگے سے سی دیتے تھے۔ اور سارے کام میں ان کا سینا ہی سب سے مشکل کام تھا جو زیادہ تر ابو ہی کر رہے تھے ایک کشمش کو مکمل کرنے میں تقریباً دو منٹ لگ جاتے تھے۔ مجھے اس کام میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔

مسکن دودھ پور علی گڑھ

ابو سینے بھی جاتے تھے اور باتیں بھی کرتے جاتے تھے کہنے لگے "تمھاری امی سلائی میں بہت ماہر تھیں۔ اگر وہ ہوتیں تو یہ سب بہت جلد تیار کر ڈالتیں۔"

میں کچھ نہیں بولا۔ جب وہ میری امی کی باتیں کیا کرتے تھے تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہوں۔

دانی! وہ کہہ رہے تھے "جو کچھ میں پہنتا تھا وہ سب خود سیتی تھیں۔"

"جرابیں اور سوئیٹر بھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں وہ بھی۔ لیکن یہ چیزیں سی نہیں جاتیں۔ بُنی جاتی ہیں۔" انھوں نے کہا۔ "جب وہ بنائی کرتی تھیں تو ان کا ہاتھ بہت تیز چلتا تھا۔ سلائیاں ان کے ہاتھوں میں ایسی تیز حرکت کرتی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ اڑ رہی ہیں۔ بس ہیولے سے دکھائی دیتے تھے۔ میں اپنے کام پر سے آکر شام کو انھیں بُنتا ہوا دیکھا کرتا تھا اور وہ بُنتے میں باتیں کرتی رہتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ ہمارے تین بچے ہوں گے۔ ایک لڑکا تمھارا۔ دوسری لڑکی میری اور تیسرا بچہ ہم دونوں کا۔" تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر میں نے پوچھا "ابو جب امی تھیں تو کیا آپ اکثر وہاں جاتے تھے یا کبھی کبھی؟"

تمھارا مطلب ہے پوچنگ کے لیے؟ جی ہاں!

"اکثر!" ابو نے کہا۔ "بلکہ ہفتے میں کم از کم دو دفعہ! تو کیا امی آپ کے جانے کا برا نہیں مانتی تھیں"

"برا! بالکل نہیں۔ وہ خود میرے ساتھ جاتی تھیں۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ ہوتی تھیں۔ بس تمھارے پیدا ہونے سے کچھ دن پہلے جانا چھوڑا تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ اب مجھ سے زیادہ

تیز بھاگا نہیں جاتا۔"

یہ بات میرے لیے بہت عجیب اور غیر معمولی تھی تھوڑی دیر تک میں سوچتا رہا پھر میں نے پوچھا: "کیا وہ صرف اس لیے آپ کے ساتھ جاتی تھیں کہ انھیں آپ سے محبت تھی اور وہ آپ کے ساتھ رہنا چاہتی تھیں یا انھیں پوچنگ بہت پسند تھی؟" "وہ دونوں وجہوں سے جاتی تھیں۔" ابو نے بتایا۔

اس وقت یہ حقیقت پوری طرح میرے سامنے آئی کہ ان کو امّی کی موت کا کتنا گہرا صدمہ پہنچا ہوگا۔

میں نے پوچھا: "ابو آپ کو ان کے گولی لگنے کا ڈر نہیں ہوتا تھا؟"

"کیوں نہیں ہوتا تھا۔ مگر دانی! ان کے ساتھ ہونے کا احساس بھی عجیب ہوتا تھا۔ دوسرے تمھاری ماں کو یہ شکار پسند بھی بہت تھا۔" دوپہر تک ہم دونوں نے ایک سو چھتیس کشمشیں تیار کرلی تھیں۔ ابو نے کہا: "ہمارا زیادہ کام نبٹ گیا ہے آؤ اب کھانا کھانے کی چھٹی کریں۔" ہم نے کھانا گرم کیا اور اپنے گھر کے چبوترے پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ آج کھانے میں میری پسندیدہ مچھلیاں تھیں۔ انھیں دیکھ کر میں خوش تو ہوا مگر مجھ سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا تھا۔

"ابو نے کہا کیا بات ہے تم کھا کیوں نہیں رہے ہو؟"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو!" انھوں نے کہا۔ جب میں پہلی مرتبہ گیا تھا تو یہ ہی حال میرا بھی تھا۔ میں اس وقت تمھاری ہی عمر کا تھا شاید کچھ بڑا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز اماں نے مچھلی پکائی تھی اور وہ مجھے بے حد پسند تھی۔ مگر اس دن میرے پیٹ میں ایسے گولے بھرے ہوئے تھے کہ مجھ سے ایک نوالہ بھی نہیں کھایا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی اس وقت ایسا ہی محسوس کر رہے ہو گے۔"

"میرے پیٹ میں تو ابو! سانپ بھرے ہوئے ہیں جو کلبلانے سے رکتے ہی نہیں۔"

"میرا حال بھی روز جیسا نہیں ہے۔" ابو نے کہا۔ "اور یہ کام بھی تو ہمیشہ جیسا نہیں ہے۔"

"جی ہاں۔ ابو! یہ کام روز جیسا نہیں ہے۔"

"دانی یہ تو پوچنگ کی تاریخ کا ایک عظیم الشان اور انوکھا واقعہ ہوگا۔"

"ابو اس بارے میں زیادہ کچھ نہ کہیے۔ سن کر میرے پیٹ میں زیادہ گولے پھرنے لگتے ہیں۔ ہم یہاں سے کس وقت روانہ ہوں گے؟" میں نے حساب لگایا کہ ہمیں سورج غروب ہونے سے پندرہ منٹ پہلے جنگل میں پہنچ جانا چاہیے۔ اگر ہم دیر سے پہنچے تو تیتر بسیرا لینے چلے جائیں گے۔ اور پھر جانا بے کار ہوگا۔

"سورج غروب ہونے کا کیا وقت ہے؟" میں نے پوچھا۔

آج کل ٹھیک ساڑھے سات بجے غروب ہوجاتا ہے اس حساب سے ہمیں سوا سات بجے وہاں موجود ہونا چاہیے اور جنگل تک پہنچنے میں ڈیڑھ گھنٹہ لگتا ہے۔ اس لیے یہاں سے سوا چھ بجے چل دینا ہوگا۔

ابو! اب ہمیں اپنا کام جلد ختم کرلینا چاہیے۔ ہمارے پاس باسٹھ کشمشیں ابھی باقی ہیں۔

ہم نے دو گھنٹے میں سب کشمشیں ختم کرلی تھیں۔ اس کے بعد بھی ہمارے پاس دو گھنٹے باقی تھے۔ تیار کی ہوئی کشمشیں ایک سفید پلیٹ میں سجی ہوئی میز پر رکھی تھیں۔ ابو انھیں دیکھ کر کہہ رہے تھے: "یہ کیسی اچھی لگ رہی ہیں۔"

"تیتروں کو بھی ضرور اچھی لگیں گی۔" ہم گھر سے باہر آ کر ورک شاپ کے پاس ٹہلنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ابو نے کہا۔

"آؤ اندر چلیں اور جانے کی تیاری کریں۔" جیسے ہی ہم جانے کے لیے مڑے ایک اسٹیشن ویگن پمپ کے سامنے آکر رکی۔ اس میں سات آٹھ بچے آئس کریم کھاتے نظر آرہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ سے ایک خوبصورت خاتون نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا "میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ نے چھٹی کر رکھی ہے۔ مگر میری گاڑی کی ٹنکی بالکل خالی ہے۔ اگر آپ اسے بھر دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

ابو نے مجھ سے کہا۔ "بھر دو! مگر پھرتی سے کام ختم کرکے آجاؤ۔"

آفس سے چابی لاکر میں نے ایک پمپ کھولا۔ اور

گاڑی کا ٹینک بھر دیا۔ جب پیسے لینے لگا تو خاتون نے کہا۔ "تم ہمیشہ تو اتنے سویرے چھٹی نہیں کیا کرتے۔ کیا آج کوئی خاص بات ہے"؟

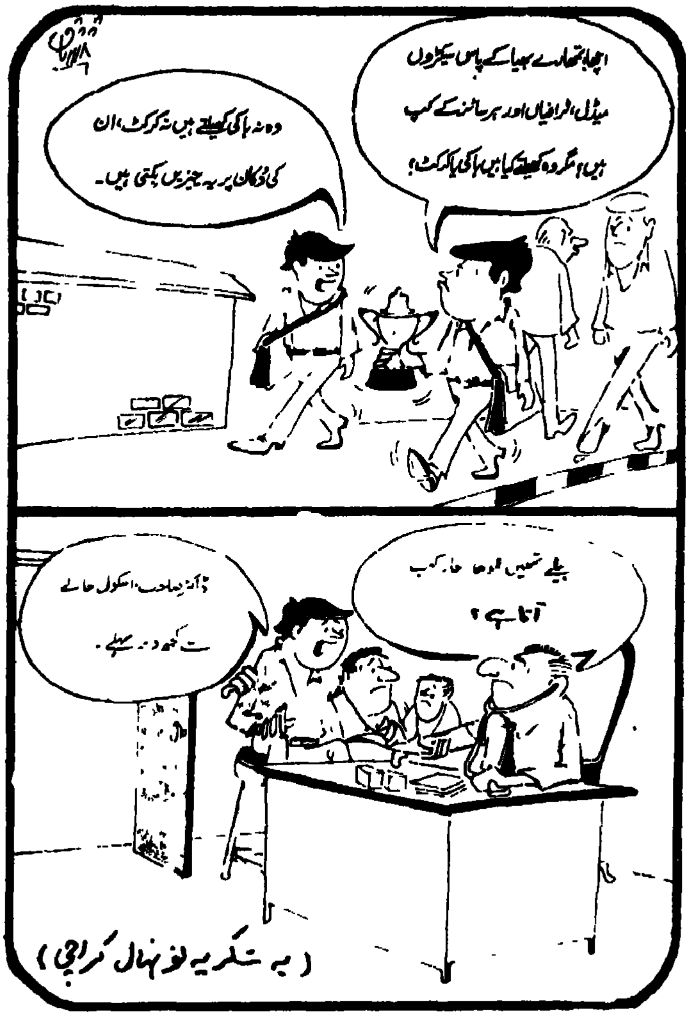
جی ہاں! آج ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔ میں بھی ابو کے ساتھ جا رہا ہوں۔ میں جلدی کی وجہ سے کبھی ایک پیر پر کھڑا ہوتا کبھی دوسرے پر۔

کیا بات ہے! خاتون نے مجھے دیکھ کر کہا: "تم تو بالکل خرگوش کی طرح اچھل رہے ہو۔ کیا ڈینٹسٹ کے یہاں جا رہے ہو"؟

"نہیں!" میں نے کہا۔ "ڈینٹسٹ کے یہاں تو نہیں کہیں اور جانا ہے۔ اچھا تو میں چلتا ہوں شکریہ"!

اور میں تیز چلتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گاڑی بھی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

(باقی آئندہ)

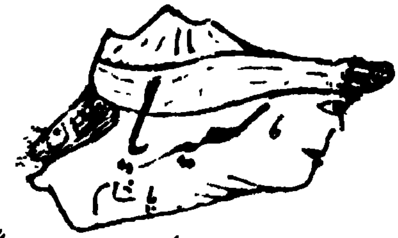


(بہ شکریہ نونہال کراچی)

ڈاکٹر قنبر رضوی (آخری قسط)

مقدس ایشیا

بحر روم کے ساحل پر انار و سنتروں کے باغوں انگور کی بیلوں کو پار کرتے ہوئے شیرون کی پہاڑیوں پر پہنچے۔ ایک فوجی خیمے سے دمشق کے پاس ایک خوبصورت جوان نکلا جس کی پشت سے ایک بچہ لپٹا ہوا تھا۔ میں نے مقدس ایشیا سے پوچھا کہ یہ جوان کون ہے؟ مقدس ایشیا نے کہا یہ سیریا ہے اس کے حلب کے شیشے کی مشہور صنعت دنیا میں مشہور ہے۔ اس کے پیچھے لبنان لپٹا ہوا ہے۔ یہ اپنی اور لبنان دونوں کی حفاظت کرتا ہے میں نے کہا یہ تو بہت خوفزدہ ہے۔ مقدس ایشیا نے کہا یہ بچوں کے آپس کے جھگڑوں سے تنگ ہے۔ سیریا نے ہماری مہمان نوازی کرنی چاہی۔ میں نے معذرت کی اور درخواست کی کہ آپ اپنے خیمے میں تشریف



لے جائیں۔ مقدس ایشیا کے ساتھ میں ریگستانی حصے کو پار کر کے آگے بڑھا تھا کہ کسی نے شاہانہ وقار سے ہم کو سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا

ایشیا: یہ مغربی ملوکیت میں ملبوس اردن یا جارڈن ہے۔ جو جارڈن کی گھاٹی اور عراق کے درمیان ہے۔ اس کے مغرب میں اسرائیل یہودیوں کا ملک ہے اس کی تاریخ انجیل کی تاریخ ہے۔



میں: آیئے اے ہاشمی شہنشاہیت کے جارڈن۔ آپ کو اس ریگستانی ماحول میں عمان سے یروشلم تک کتنی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

جارڈن: جی ہاں ایک لاکھ مربع کلومیٹر سے بھی کم رقبے پر ۲۷ لاکھ سے زیادہ آبادی حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے لے کر آج تک کی تہذیب کے نقوش کی حفاظت۔ یہودی جارحیت کا مقابلہ یہ سب میرے لیے ایک بڑی کشمکش سے کم نہیں۔ میں ۱۹۴۶ء میں آزاد ہوا کہ ہر طرف سے دفاع کرنی پڑی۔

میں نے مقدس ایشیا کی طرف دیکھا۔ ایشیا نے کہا ہاں ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی یہودی حکومت قائم ہوئی۔ اس وقت سے ہمارے مغرب میں سکون نہیں ہم لوگ جارڈن کی وادی کے اس پار حضرت عیسیٰ کی پیدائش گاہ یروشلم میں مسجد اقصیٰ کے پاس پہنچے ہی تھے کہ مغربی یروشلم کی طرف سے ایک حسین لڑکی جدید امریکی لباس میں ہیروں کے ترشے ہوئے زیورات سے آراستہ خوبصورت سنتروں کی ایک ٹوکری لیے ہوئے آتی دکھائی دی۔ قریب آکر اس نے مقدس ایشیا کی مزاج پرسی کی۔

میں: مقدس ایشیا آپ کی تعریف؟

ایشیا: یہی ہے یہودیوں کی لاج
اسرائیل جس کو پہلے فلسطین
کہتے تھے۔



میں: محترمہ آپ تو بہت نازک اور
مختصر نظر آتی ہیں۔

اسرائیل: جی ہاں! میرا رقبہ صرف
۲۰،۷۰۰ مربع کلومیٹر ہے اور
آبادی ۴۳½ لاکھ ہے۔

میں: مگر سنا ہے آپ بہت دولتمند ہیں

اسرائیل: جی یہ تو لوگ اس لیے کہتے
ہیں کہ ہمارے یہاں ہیروں
کو تراشنے کی صنعت کو فروغ دیا جارہا
ہے۔ ویسے ہم بحرِ روم کے ساحلی میدانوں
فلسطیا اور سماریا پر سبزیوں، سنتروں، شہتوت
اور زیتون کی کاشت کرتے ہیں۔

میں: محترمہ! آپ کے پڑوس آپ سے خائف
کیوں ہیں؟

اسرائیل: میں بھلا کسی کو کیا نقصان پہنچا سکتی ہوں۔
میں تو صرف قدیم یہودی علاقوں کو حاصل
کرنا چاہتی ہوں یہ تو فلسطینوں نے عربوں کو
ہمارے خلاف بھڑکا دیا ہے۔

مقدس ایشیا نے کہا: "بیٹی! خدا نے جب تمہیں سب
کچھ دے رکھا ہے تو تم اپنے گھر میں سکون سے رہو۔
فلسطینیوں کو بھی کچھ ٹھکانا ملنا چاہیے۔ تم میل جول
اور محبت سے رہو تاکہ تمہارے والدین کا نام بدنام
نہ ہو۔"

ہم لوگ سیناء کے ریگستان کو پار کر کے نہر سویز
تک پہنچے۔ ایشیا اور افریقہ گلے مل کر رخصت ہوئے۔ دن
بھر تھکان اور دوڑ دھوپ سے سورج کا بھی
منہ لال ہو چکا تھا۔ ہم بحرِ قلزم سے ہو کر جدہ پہنچے۔ اذان
کی آواز آرہی تھی۔ ہم دونوں نے مکہ کی طرف رخ
کیا۔ دیکھا صحنِ کعبہ سے دستار باندھے عبا زیب تن
کیے پُر وقار انداز میں ایک عرب اَحسنت اَمرحبا!
کہہ کے ہمارا استقبال کر رہا ہے۔ ارد گرد اور بھی کچھ
عرب مختلف انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا
مقدس ایشیا یہ کون لوگ ہیں۔

ایشیا: آپ سے ملیے انھیں سعودی عرب کہتے ہیں۔ ان
کے مشرق میں خلیج فارس پر واقع کویت۔ بحرین
ضحیٰ۔ قطر۔ امارت عربیہ اور جنوب میں عمان
ویمن کھڑے ہیں۔

میں: مقدس ایشیا مجھے تو اس سرزمین پر آپ کا
تقدس بہت نورانی نظر آرہا ہے۔

ایشیا: دراصل یہ مکہ ہی اسلام
کے پیغمبر محمدؐ صاحب کی
جائے پیدائش اور
یہ کعبہ قدیم عبادت گاہ
ہے جس کو
ساری
دنیا



کے مسلمانوں نے اپنا روحانی مرکز بنا رکھا ہے۔
یہاں سے شمال میں مدینہ ہے جہاں حضرت محمد صلعم کی
آخری آرام گاہ ہے۔

میں: سعودی عرب! آپ خوش قسمت ہیں کہ اس

سرزمیں سے آپ وابستہ ہیں۔ آپ تو بہت وسیع وعریض بھی دکھائی دیتے ہیں۔

سعودی عرب: لاریب! میرا رقبہ ۲۱,۴۹,۶۹۰ مربع کلومیٹر ہے۔ مگر زیادہ حصے پر نفد اور ربع الخالی کا ریگستان پھیلا ہوا ہے۔ چمکتے سورج کی تیز روشنی اور گرمی سے سب جسم جھلسا ہوا ہے۔

یمن: مگر صحرائے عرب تو قدیم بھی ہے اور معدنیات کا مخزن بھی؟

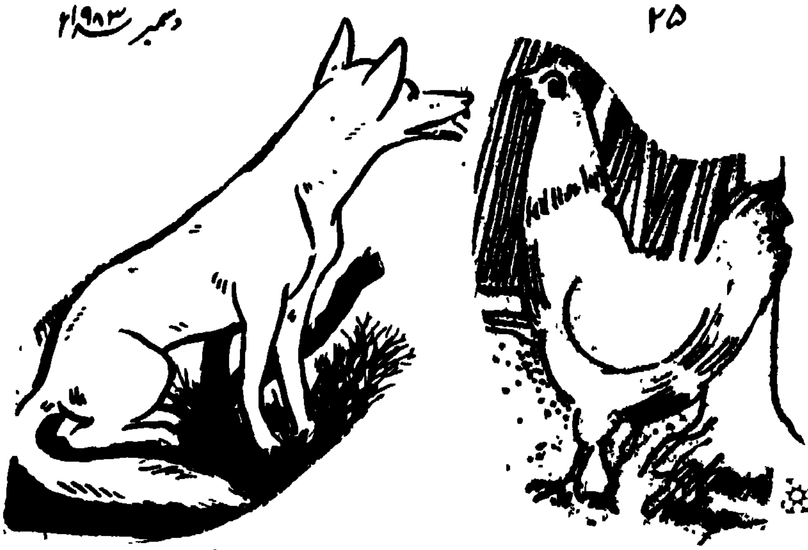
سعودی عرب: ہاں قدرت نے ہم عربوں پر رحمت نازل کی۔ معدنی سونا بھی دیا ہے اور رقیق سونا بھی، پٹرول اور معدنی تیل کی شکل میں۔ ہمارے بھائیوں کویت، بحرین، قطر، امارت عرب عمان اور یمن وغیرہ سب کو اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ صحرائے عرب دنیا کا قدیم ترین قطعہ ارض ہے اس لیے یہاں لوہا، سونا اور چاندی بھی حاصل کر لیتے ہیں یہاں معدنی تیل کا دنیا کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔

سرخ سورج شام کی سیاہ چادر میں منہ چھپا رہا تھا۔ یمن نے مقدس ایشیا کو اس عظیم سرمایہ اور دولت کے لیے مبارک باد پیش کی اور یہ دعا کرتے ہوئے کہ ایشیا کے غریب بچوں پر خدا کی رحمت ہو ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کر اپنے مرکز کی طرف لوٹ آئے۔

براہ کرم پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ہر مہینے کی ۱۰ تاریخ کو دے دیا کیجیے بصورت دیگر تعمیل ممکن نہ ہو سکے گی۔
سرکولیشن منیجر

پیام تعلیم شمسی کیلنڈر ۱۹۸۴ء

عبدالمجید آنیکل					جنوری اپریل جولائی	اکتوبر	مئی	فروری اگست	مارچ نومبر	جون	ستمبر دسمبر
۲۹	۲۲	۱۵	۸	۱	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
۳۰	۲۳	۱۶	۹	۲	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار
۳۱	۲۴	۱۷	۱۰	۳	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر
✡	۲۵	۱۸	۱۱	۴	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل
✡	۲۶	۱۹	۱۲	۵	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ
✡	۲۷	۲۰	۱۳	۶	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات
✡	۲۸	۲۱	۱۴	۷	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ



ارشد علی ارشد

بُرائی کا نتیجہ

شہر سے دور ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جس پر ایک مُرغی اور اُس کا ایک بچہ کالو آرام سے زندگی گزار رہے تھے مُرغی بہت خوبصورت تھی۔ اُس کا رنگ لال تھا۔ آس پاس رہنے والے جانور اور پرندے اسے لال مُرغی کہہ کر پکارتے تھے۔ لال مُرغی بہت ہوشیار تھی وہ کالو کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی وہ اُسے جھونپڑی میں کبھی اکیلا نہیں چھوڑتی اور باہر جاتے وقت جھونپڑی میں تالا لگانا بھی نہیں بھولتی تھی۔

اس پہاڑی سے تھوڑی دور ایک دوسری پہاڑی پر ٹرّو نام کی ایک لومڑی اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ ٹرّو بہت کمین فطرت تھی ہر وقت اپنی نگاہ لال مُرغی پر رکھتی طرح طرح سے اُس نے لال مُرغی کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔

لال مُرغی ہمیشہ اپنے ساتھ ایک چھوٹا تھیلا رکھتی تھی۔ جس میں قینچی اور سوئی تاگا رہتا۔ اس تھیلے کو وہ گلے میں لٹکائے رہتی۔ کالو اکثر پوچھا کرتا "ماں! تم یہ تھیلا ہمیشہ اپنے ساتھ کیوں رکھتی ہو؟" "پتا نہیں کب کام آجائے" لال مرغی اتنا کہہ کر اُسے بہلا دیتی۔

ٹرّو نے جب بھی لال مرغی پکڑنی چاہی وہ اسے نہ پکڑ سکی۔ اسی لیے ہر وقت وہ کھسیانی رہتی ایک دن اس نے تہیہ کیا کہ اب وہ لال مُرغی کو کسی نہ کسی طرح پکڑ کر لائے گی اور ماں سے کہا "چولھے پر پتیلے میں پانی چڑھا دو۔ آج مجھے لال مُرغی کو ضرور پکڑنا ہے۔ آج میں خالی ہاتھ گھر نہیں لوٹوں گی جب آؤں پانی کھولتا ہوا ملے۔"

"ناراض نہ ہو میری بچی، پانی کھولتا ملے گا مگر وہ لال مُرغی پکڑی جائے تب نا!"

"آج وہ وقت آگیا ہے" کہتی ہوئی ٹرّو غصّے میں گھر سے باہر نکل گئی۔

ادھر لال مُرغی کالو کے ساتھ جھونپڑے سے نکلی۔ کنڈی لگائی اور چل دی۔ اُسے اپنے بیمار دوست کو دیکھنے جانا تھا اس لیے وہ جلدی میں تھی۔ جب تک ٹرّو آئی مُرغی جا چکی تھی۔ غصّے میں ٹرّو اس کے گھر کے چکّر لگانے لگی۔ پھر دروازہ کو دھکا دیا۔ آگے کا دروازہ تو نہیں کھلا لیکن پیچھے کا دروازہ ایک ہی جھٹکے میں کھل گیا۔ "لگتا ہے آج کنڈی لگانا بھول گئی" ٹرّو نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔ اور جھونپڑی میں آکر مُرغی کو پکڑنے کے طریقے سوچنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد لال مُرغی نے جھونپڑی میں آکر اندر سے کنڈی بند کر لی۔ جیسے ہی وہ گھومی لومڑی کو بیٹھا دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "آج بچ کر کہاں جائے گی" کہتے ہوئے مکّار ٹرّو لال مُرغی کی طرف بڑھی۔ پلک جھپکتے ہی مرغی کالو کو ساتھ لے کر اُڑی اور مچان پر جا بیٹھی اور اس نے چین کی سانس لی۔ وہ کالو سے غصّے میں بولی "تم نے پچھلے دروازہ کی کنڈی نہیں لگائی تھی"۔ کالو سہما ہوا تھا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بے بس لومڑی مچان کے نیچے غصّے میں ٹہلنے لگی۔ اس کی زبان لپلپا رہی تھی اور وہ اپنی وحشت ناک آنکھوں سے کالو اور مُرغی کو گھور رہی تھی۔ لومڑی کی بھیانک شکل دیکھ کر کالو گھبرا گیا اور مچان سے نیچے گر گیا۔ جیسے ہی وہ گرا فوراً ہی لومڑی نے اُسے دبوچ لیا۔ اپنے پیارے بچّے کی خاطر مُرغی بھی نیچے اُتر آئی۔ ٹرّو

نے دونوں کو بڑی تھیلی میں بند کیا اور کمر پر لاد کر چل دی۔ لومڑی کبھی محنت تو کرتی نہیں تھی جلد ہی تھک گئی۔ ثرّو کا تھکان کی وجہ سے بُرا حال تھا اُس کا حلق سوکھنے لگا اُس نے تھیلی کو ایک پیڑ کے نیچے رکھا اور پانی پینے چلی گئی۔

لال مُرغی بچاؤ کے طریقے سوچنے لگی۔ فوراً ہی اُس کا دھیان اپنے گلے میں لٹکے ہوئے تھیلے پر گیا۔ اس نے قینچی نکال کر تھیلی کو کاٹا۔ پہلے کالو کو باہر نکالا اور پھر خود باہر آگئی جلد ہی وہ ایک بڑا اور ایک چھوٹا پتھر ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئی۔ دونوں پتھروں کو تھیلی میں ڈال کر اسے سوئی تاگے کی مدد سے سی دیا۔ اور کالو کے ساتھ تیزی سے بھاگ گئی۔ لومڑی جب پانی پی کر واپس آئی تو اُس نے تھیلی کو صحیح سلامت پایا وہ بے فکری سے تھیلی کندھے پہ ڈال کر گھر کی طرف چل دی۔ گھر پہنچتے پہنچتے وہ بہت تھک گئی تھی۔

”ماں! پانی کھول رہا ہے نا؟“ گھر میں داخل ہوتے ہی ثرّو لومڑی نے اپنی ماں سے پوچھا۔

”ہاں بہت دیر سے کھول رہا ہے“ اُس کی ماں نے جواب دیا۔

”آج ایک نہیں دونوں پکڑ میں آگئے، لال مُرغی بھی اور اس کا بچّہ بھی۔ انھیں پکا کر رات کو مزے سے کھائیں گے“

ثرّو خوشی سے پاگل ہو رہی تھی اُس نے بنا دیکھے ہی اونچا ہاتھ کر کے تھیلی کو پانی میں ڈال دیا۔ اُبلتے ہوئے پانی میں دو پتھر گرے اور ابلتا ہوا پانی اُچھل کر دونوں ماں، بیٹی کے جسم پر آپڑا۔ وہ دونوں کھولتے ہوئے پانی سے جل اٹھیں اور وہیں بے ہوش ہوگئیں۔ جب ان کو ہوش آیا تو ان کے پورے بدن پر آبلے ہی آبلے تھے۔ ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ڈاکٹر کے پاس جا کر مرہم پٹی کروائیں علاج نہ ہونے کی وجہ سے زخم خراب ہوگئے اور ثرّو اور ثرّو کی ماں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔



● اُستاد: تنویر! یہ تمھارے گھر کا کام ہے۔ کل اسے ہر حالت میں مکمل کر کے لانا۔"

تنویر: مگر ماسٹر جی! ہم تو آج کل اپنی آنٹی کے گھر رہ رہے ہیں۔

● منور: ابّو مجھے آپ اپنی جیسی آواز نکالنا سکھا دیں۔

ابّو: وہ کیوں؟

منور: (معصومیت سے) تاکہ فون کے ذریعے اسکول سے چھٹی لے لیا کروں۔

● امتحان کی تیاری میں مصروف طارق نے اپنے والد سے پوچھا: "پاپا! دریائے نیل کہاں ہے؟"

والد اخبار پڑھنے میں مگن تھے۔ جلدی سے بولے: اپنی امی سے پوچھو۔ وہی چیزیں اِدھر اُدھر رکھ دیتی ہیں۔

سید شمس العارفین رضوی، (رہپورہ، اورنگ آباد)

● مالک: ہمارے کارخانے میں ہر کام بجلی سے ہوتا ہے۔"

نوکر: جی ہاں تب ہی آپ کو تنخواہ دیتے ہوئے جھٹکا لگتا ہے۔

شنو بنت ہنر، ۳۸۵، شاہ گنج، الہ آباد ۳

قلمی دوستی

محمد ندیم شعبانی عمر ۷ سال
مشغلہ: پیام تعلیم، کھلونا اور نور پڑھنا اسکول جانا
پتا: معرفت تاج ہومیو سنٹر ۱۳ محمد علی روڈ۔ رانی گنج۔ بردوان۔

سید افسر حسن عمر ۱۲ سال
مشغلہ: پیام تعلیم پڑھنا۔ نماز پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔
پتا: مسعود حسن ویسٹ بلاک نیو کریم گنج گیا (بہار)

محمد شاہین عمر ۱۰ سال
مشغلہ: پیام تعلیم پڑھنا۔ قصے سُننا۔ ماں باپ کی اطاعت کرنا۔
پتا: محمد شاہین اختر گیاوی۔ مدرسہ شرفیہ۔ عماد پور، رفیع گنج اورنگ آباد

محمد اختر عادل عثمانی عمر ۱۴ سال
مشغلہ: قلمی دوستی کرنا۔ تعلیمی تاش کھیلنا۔ فٹ بال کھیلنا۔
پتا: معرفت محمد منیر الدین محلہ پتیانہ نزد بینک، کلٹی، ضلع بردوان

شفیق احمد صدیقی
مشغلہ: کرکٹ کھیلنا، کتابیں پڑھنا، پیام تعلیم کا مطالعہ کرنا۔
پتا: شفیق احمد صدیقی روشن منزل روشن گیٹ، اورنگ آباد۔

فیروز سعید
مشغلہ: قلمی دوستی کرنا، ادبی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔
پتا: نئی بستی، رحمت نگر، برن پور، بردوان ۷۱۳۳۲۵

فضل الرحمن صدیقی
مشغلہ: قلمی دوستی کرنا۔ نماز پڑھنا۔
پتا: محلہ رنگریزان، خورجہ (یوپی)

ابو طارق عمر ۷ سال
مشغلہ: نماز پڑھنا۔ اسکول جانا۔ کہانی سننا۔
پتا: لوہرسن بازار۔ لوہرسن۔ بستی۔ یوپی



ادھر ادھر

بارہ برس کی عمر میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ

لندن ۳ اکتوبر آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل کی جانے والی ایک طالبہ کو وہاں کے قیام کے لیے ایک خاص گھر دیا جائے گا اس لیے کہ اس کی عمر صرف ۱۲ برس ہے۔ علم الحساب میں یہ لڑکی بہت تیز ہے اور اس نے یونیورسٹی میں داخلے کا امتحان صرف دس برس کی عمر میں پاس کر لیا تھا اور اس میں بہت اچھے نمبر حاصل کیے تھے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل کی جانے والی یہ سب سے کم عمر طالبہ یا طالب علم ہے۔

مکئی کا بھٹہ:

مکئی کا بھٹہ اس پر دانوں کی قطاریں ہمیشہ جفت تعداد (جو دو سے برابر تقسیم ہو جائے) میں پائی جاتی ہیں۔ طاق (جو دو سے تقسیم نہ ہو) تعداد والا بھٹہ بہت ہی کم ہوتا ہے۔

چالیس پونڈ کا بیج:

کیا آپ نے کبھی کسی ایک ایسے درخت کے بارے میں سنا ہے جس کا بیج چالیس پونڈ وزن کا ہوتا ہے آئیے ہم آپ کو بتائیں اس درخت کا نام "دو ہرے ناریل کا درخت" (DOUBLE COCONUT) ہے۔

معرفت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ بمبئی ۳

یہ درخت صرف بحر ہند کے جزیرہ "سیچلس" میں پایا جاتا ہے

مصنوعی گوشت کی ایجاد

سویابین نامی سیم جیسی پھلیوں کے آٹے سے TVP کے نام سے مصنوعی گوشت ایجاد کیا گیا ہے جو مشرقی اور جنوبی ایشیا کے ممالک میں بہت مقبول ہوا ہے یہ مصنوعی گوشت کا حقیقی نعم البدل ہے، بلکہ اکثر ایسے لوگوں کے لیے جو چکنائی ہضم کر سکتے ہیں یہ اصل گوشت سے زیادہ صحت مند اور قوت بخش ہے۔

ہونہار طالب علم (پربھنی)

شری شیواجی کالج پربھنی کا ہونہار طالب علم لئیق الرحمن خان پٹھان نے مارچ ۸۳ء کے بارہویں سائنس کے امتحان میں امتیازی شان سے کامیابی حاصل کی۔

مذکورہ امتحان میں چھ سو میں سے ۳۸۵ مارکس حاصل کیے اور مرہٹواڑہ ڈویژن کی میرٹ لسٹ میں سرفہرست جگہ حاصل کی۔



لئیق الرحمن

نیشنل ہائی اسکول داپولی کی کامیابی

بزم اردو چپلون (مہاراشٹر) کی طرف سے منعقدہ ۱۹۸۳ء کے سالانہ تحریری مقابلے میں نیشنل ہائی اسکول داپولی ضلع رتنا گیری کے درجۂ دہم کی دو ذہین اور ہونہار طالبات خالدہ ابراہیم سرنگ اور ریحانہ عباس مجوانے گروپ سوم کے بالترتیب اول اور سوم انعامات حاصل کر کے مسلسل تیسری بار "قاسم احمد پرکار شیلڈ" جیت لی ہے۔ ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۲ء میں بھی یہ شیلڈ انھی دو بچیوں نے حاصل کیا تھا۔

بچوں کی کوششیں



ایسے تھے باپو

رابندر ناتھ ٹیگور ایک مشہور نظم نگار تو تھے ہی، لیکن وہ ایک مشہور مصوّر بھی تھے۔ ایک دفعہ ہمارے پیارے باپو نے ان کے گھر قیام کیا۔ باپو کی آمد سے ٹیگور جی بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے ان کے سونے کے لیے ایک خوب صورت کمرے کا انتظام کیا۔ اس کمرے میں ٹیگور جی کے بنائے ہوئے بہت سے خوبصورت پورٹریٹ کمرے کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ لیکن باپو جب اس کمرے میں داخل ہوئے تو ان تصویروں کو دیکھ کر ان کا دل کھٹا ہو گیا۔ رات کو سوتے وقت انھوں نے وہ تمام تصاویر اُتار کر ایک کونے میں رکھ دیں۔ اور بے فکر ہو کر سو گئے۔

صبح کو جب نوکر اُن کے کمرے میں بیڈ ٹی لے کر آیا تو تصویروں کو ایک کونے میں پڑا دیکھ کر اسے بہت تعجب ہوا۔ اس نے یہ اطلاع اپنے مالک ٹیگور جی کو دی۔ ان کو بہت تعجب ہوا لیکن باپو سے سوال کرنے کی ہمت ان میں نہ ہوئی۔ لیکن بار بار ان کے دل میں خیال آتا رہا، ''کیا باپو کو قدرتی نظاروں سے پیار نہیں ہے۔''

باپو کو روز صبح چہل قدمی کرنے کی عادت تھی اس لیے جب دوسرے دن باپو چہل قدمی کرنے نکلے تو ٹیگور جی بھی ان کے ساتھ ہوئے۔ باپو کو قدرتی نظاروں سے پیار ہے کہ نہیں؟ یہ جاننے کے لیے کبھی دور جا کر طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی طرف اشارا کر کے ٹیگور جی نے باپو سے پوچھا: ''باپو، آپ کو صبح کا طلوع ہوتا آفتاب یہ قدرتی دل کش منظر بھلا نہیں لگ رہا۔''

باپو نے ایک نظر آفتاب کی طرف دیکھا، پھر بہت سنجیدگی سے بولے: ''ٹیگور، یہ منظر خوبصورت تو ہے، لیکن میں اس میں کھو کر اپنا قیمتی وقت کیوں خراب کروں۔ اتنے وقت میں تو میں اپنے وطن کی خوش حالی کے لیے بہت کچھ سوچ سکتا ہوں۔ اور پھر، میرے وطن میں تو خود ہی لاکھوں کروڑوں نونہال بچے ہیں، میں ان کا چہرہ اسی سورج کی طرح چمکتا دیکھنا چاہتا ہوں، جو آئندہ ہمارے وطن کا مستقبل ہے۔''

باپو کا اتنا خوب صورت جواب سن کر ٹیگور جی بالکل خاموش ہو گئے۔ اپنے وطن کے لیے باپو کے دل میں اتنی عزت اتنی لگن دیکھ کر ٹیگور جی بہت متاثر ہوئے۔

اب ان کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ رات کو سوتے وقت باپو نے تصویریں کیوں اتاری ہوں گی۔

ایسے تھے باپو ایسی ہوتی تھیں ان کی باتیں۔

شنو بنت ہنر
۲۸۵، شاہ گنج، الہ آباد

التجا

دینے والے تو نے سب کچھ دے دیا
کس قدر احسان دنیا پر کیا

ہر طرف ہے زندگی ہی زندگی
شاخ پر کھلتی ہے نرمی سے کلی
میرے خالق میرے آقا اے خدا
مجھ سے سن لے آج میری التجا
علم سے ہر گھر مثال طور ہو
ملک سے سب کی غریبی دُور ہو
ہر طرف ہو ملک میں امن واماں
ہر زباں پر ہو خوشی کی داستان

سید شمیم خاں
شرپور، بہار شریف (نالندہ)

غرور:

امجد اور شاہد ایک ہی درجے کے طالب علم تھے اور دونوں بہت اچھے دوست تھے۔ شاہد پڑھنے میں کند ذہن تھا اور امجد ذہین تھا سبھی ماسٹر امجد سے بہت خوش رہتے تھے۔ شاہد رات میں کئی کئی گھنٹے کتابیں پڑھتا تاکہ اس سے بھی سارے استاد خوش رہیں۔ دونوں ساتھ ساتھ اسکول آتے اور ساتھ ساتھ ہی اسکول کا کام کرتے۔ اسی طرح دن بیتتے رہے۔ اور ششماہی امتحان کا زمانہ آگیا۔

امتحان میں امجد پورے درجے میں اول آیا تھا اور شاہد دوم۔ دوسرا نمبر بھی اچھا رہتا ہے۔ لیکن شاہد اپنے آپ ہی شرم محسوس کرنے لگا اور اس نے پختہ ارادہ کیا کہ انشاءاللہ آئندہ وہ بھی اول آئے گا۔

امجد پورے درجے میں اکڑتا پھرنے لگا وہ اب کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دوست شاہد سے بھی منہ موڑنے لگا۔

ماسٹر طارق صاحب بھی اس کی ساری حرکتیں دیکھتے اور سوچتے امجد کو سمجھایا جائے۔ لیکن پھر انھوں نے طے کیا کہ درجے میں ہی سمجھاؤں تاکہ سب بچے اُن کی نصیحت سے کچھ حاصل کریں۔

روز کی طرح آج بھی ماسٹر طارق صاحب درجے میں داخل ہوئے سب بچے تعظیماً کھڑے ہو گئے پھر ماسٹر صاحب کا اشارہ پاکر بیٹھ گئے۔

بچو آج تم لوگ اپنی اپنی کتابیں بند رکھو۔ کیوں کہ آج میں تم لوگوں کو نصیحت کروں گا۔ سب بچے خاموشی سے اپنے استاد کی طرف دیکھنے لگے۔

بچو آج سے بہت دن پہلے کی بات ہے۔ بہت دن کیا اس سے بھی پہلے کی جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کیا۔ آدمؑ کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا۔ اور فرشتوں کو حکم دیا کہ سجدہ کرو آدم کو اور فرشتے اللہ کا حکم سنتے ہی سجدے میں گر گئے۔ لیکن انھیں میں سے ایک فرشتے جس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

بچو کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کا نام کیا تھا۔ جی ہاں میں بتا سکتا ہوں امجد کھڑا ہو گیا اور کہا: "اس کا نام شیطان ہے۔ ہاں وہ شیطان ہی تھا جس نے اللہ کا حکم نہیں مانا۔ جانتے ہو اس نے کیا کہا تھا۔ سب بچے ایک ساتھ بول اٹھے۔ اس نے کہا کہ آدم مٹی سے بنے ہیں اور میں آگ کا بنا ہوا ہوں۔ شیطان نے غرور سے اپنی گردن اکڑ لی۔ اللہ تعالیٰ کو غرور پسند نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ملعون قرار دیا اور اب وہ ہمیں بہکاتا ہے۔ اچھے کام کو چھوڑ کر برے کام کی طرف لے جاتا ہے اتنا کہہ کر ماسٹر صاحب درجے سے نکل گئے۔

دوسرے روز سے ماسٹر صاحب نے اسی کتاب کو دوبارہ شروع کرا دیا۔ امجد پڑھنے میں اب کم توجہ دیتا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ جو کتاب ایک بار پڑھ لیتا ہے وہ اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔

سالانہ امتحان کی تیاری شروع ہو گئی۔ شاہد جان لگا کر محنت کرنے لگا اس کے سب پرچے ہی اچھے ہوئے تھے اور امجد کا پہلا پرچہ ہی خراب ہو گیا۔ لیکن اسے اب بھی اطمینان تھا کہ وہ اگلے پرچے میں اس سے زیادہ نمبر لے آئے گا۔ لیکن دوسرا پرچہ بھی ویسا ہی رہا۔

اب وہ پڑھنے میں کوشش کرنے لگا۔ اسی پر مجھے ایک شعر یاد آگیا ع عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن، آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے۔ جو وقت ایک بار گزر جاتا ہے وہ دوبارہ واپس نہیں آتا۔ آج امتحان کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ شاہد راستے میں اللہ کو یاد کرتا ہوا اسکول کو چل دیا۔ سب کے ہاتھوں میں نتیجہ دے دیا گیا۔ شاہد خدا کو یاد کرکے نتیجہ دیکھنے لگا۔ اوّل۔ وہ خوشی سے جھوم گیا۔ امجد نے ڈرتے ڈرتے اپنا نتیجہ پڑھا وہ فیل تھا۔ اسے چکر آنے لگا۔ لیکن اس کے نتیجے میں کچھ اور لکھا تھا وہ اسے پڑھنے لگا۔ "امجد تم جانتے ہو کہ غرور اللہ کو پسند نہیں ہے پھر بھی تمھیں بہت غرور تھا اور اب غرور کا نتیجہ تمھارے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن تمھارا ششماہی کا نتیجہ دیکھتے ہوئے تمھیں پاس کیا جاتا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ تم آئندہ محنت سے پڑھو گے اور تم میں غرور نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ امجد بہت ہی نادم ہوا اور ماسٹر صاحب سے معافی مانگنے کے لیے چل پڑا۔ درست ہے اگر صبح کا بھولا شام کو واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ پیام تعلیم پڑھنے والے بچوں سے گزارش کروں گا کہ اگر انھیں اس میں کچھ نصیحت ملے تو اسے ضرور اختیار کریں۔ اور اگر مجھ سے قلمی دوستی کرنا چاہیں تو اس پتے پر خط لکھیں۔

فیاض احمد معرفت انوار احمد اعظمی
نزد کوہ نور ہوٹل جوہو لین، اندھیری بمبئی ۵۸۰۰۰۴

شیر کا شکار

ہمیں بچپن سے شکار کھیلنے کا بے حد شوق تھا لیکن ہم اب تک ایک معمولی سی چڑیا کو بھی نہیں مار سکے۔ ہم روز خدا سے دعا کرتے تھے کہ ہمیں بھی شکار کا کوئی اچھا موقع مل جائے اور ہمارا بھی نام شکاریوں میں آجائے۔

ایک دن شام کے وقت ہم چائے سے شغل کر رہے تھے کہ اتنے میں ہمارا دوست شامی بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا ارے یار! کیا تم نے سنا ہمارے شہر کے پاس ایک آدم خور شیر آگیا ہے۔ وہ اب تک بہت سے آدمیوں کو کھا چکا ہے۔ کل رات ہی اُس نے دو آدمیوں کا کام تمام کر دیا۔ اس آدم خور شیر کی آمد سے ہمیں تو اتنی خوشی ملی کہ بیان نہیں کر سکتے۔ خدا نے آخر ہماری سُن لی تھی۔ ہم نے جلدی سے چائے کی پیالی ختم کرکے، والد کے کمرے سے ان کی رائفل اور کارتوس کی پیٹی اٹھائے اپنے دوست کے ساتھ چل پڑے۔

دُور دُور تک شیر کا نشان نہ ملا۔ ہمارے محلے کے پیچھے کا راستہ ڈھلوان تھا۔ جس میں جھونپڑیاں تھیں۔ ہم جب وہاں پہنچے ایک عورت چلاتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔ ارے رات ہی اُس درندے نے میرے بچے کو کھا لیا۔ یہ سُن کر ہمیں افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ اُس عورت سے ہم نے تفصیل سے راستہ معلوم کیا۔ جدھر سے شیر گزرا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہم ستانے کے لیے بیٹھے۔ سامنے بڑی بڑی پتھریلی چٹانیں تھیں۔ اتنے میں مجھے مٹی میں کسی جانور کے پنجوں کے نشان دکھائی دیے۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ وہ واقعی شیر کے پیروں کے نشان تھے۔ بس کیا تھا ہمارے بدن میں خوشی کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ لیکن ساتھ ساتھ خوف بھی ہونے لگا۔ ابھی ہم اس سلسلے میں گفتگو کر رہے تھے کہ پیچھے سے دہاڑ کی آواز آئی۔ اور جب پھر کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ خونخوار شیر تھوڑی دور ایک چٹان پر کھڑا ہے۔ میں خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا تھا یہاں تک کہ ہم ابھی تک مچان بھی نہیں بنا پائے تھے۔ ایک چھوٹے سے درخت کی طرف اشارہ کرکے میں نے شامی سے کہا کہ ہم اس پر بیٹھ کر شیر کو ماریں گے۔ شامی کہنے لگا کہ جلدی سے کارتوس بندوق میں بھرو۔ خوف کی وجہ سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔

ہاتھ تھرتھرا رہا تھا۔ لیکن شامی مجھے دیکھے بغیر کارتوس بھر رہا تھا۔ جب ہم دونوں اس کام سے فارغ ہوئے تو شامی نے مجھے گولی داغنے کو کہا۔ لیکن خوف کی وجہ سے مجھے رائفل بھی اٹھانی بھاری تھی۔ جیسے تیسے میں نے بندوق اٹھائی اور گولی چلانے کی سوچی۔ پھر شیر کی دہاڑ سنائی دی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو خونخوار شیر ہمارے قریب ایک بڑی چٹان پر کھڑا ہمیں گھور رہا تھا۔ ہماری رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ شامی نے شیر کا نشانہ لے کر ایک گولی چلادی۔ وہ گولی شیر کے کان کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ اب شیر اور زیادہ خطرناک ہوچکا تھا۔ اور اپنا پیر سمیٹ کر جست لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے ایک گولی داغی۔ اور وہ شیر کے دائیں بازو میں لگی۔ وہ لنگڑا کر اچھلا، اور ہمارے قریب ایک جھاڑی کے پیچھے آگیا میں گھبرا گیا اور پھر میں نے گولی چلانے کی تیاری کی لیکن گھبراہٹ میں میرا پیر پھسل گیا اور دھڑ سے زمین پر گرا شیر نے شکاری کو بے بس دیکھ کر چھلانگ لگائی اور میرے قریب آگیا۔ مارے دہشت کے میں نے آنکھ بند کر لی اور گولی چلادی۔ گولی ٹھیک اس کے سینے پر لگی اور شیر اپنی آخری زبردست دہاڑ کے ساتھ گرا اور ڈھیر ہوگیا۔ اس کی دہاڑ سے گانو کے سارے لوگ جمع ہو گئے اور آناً فاناً پولیس وغیرہ بھی آگئی۔ دوسرے بڑے بڑے شکاری ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے، ہم خوشی سے پھولے نہ سمار ہے تھے۔ اس شکار سے ہمیں بہت بڑا رتبہ ملا اور ہم فخر سے سینہ تانے کھڑے تھے کہ اتنے میں کہیں سے ایک جنگلی بلی کودی اور میرے پیر پر دھپ سے گری۔ ہم تو پہلے سے مغرور کھڑے تھے اور بلی کو جب ایک ہاتھ مارا تو ایک زبردست تھپڑ ہمارے گال پر پڑا۔ اسی اثنا میں ہماری آنکھ کھل گئی کیا دیکھتے ہیں باجی غصہ سے آگ بگولہ ہو کر کہہ رہی ہیں کہ یہ نیند میں ہاتھا پائی کیوں کر رہے ہو۔ جس جنگلی بلی کو ہم مار رہے تھے وہ حقیقت میں ہماری باجی تھیں۔ اور شیر کا شکار والا واقعہ ایک خواب تھا۔ اور ہم نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے بستر کو چھوڑا۔

رعنا انیس۔ آمبوری۔ مدراس

ندامت کے آنسو

حامد نے جب سے ہوش سنبھالا ہر ایک کی زبان پر اپنی بدصورتی کے چرچے ہی سنے۔ بدشکل ہونے کی وجہ سے محلے کے لڑکے اس کے ساتھ کھیلنا تو کیا بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے ہونٹ موٹے، بدنما لمبے کان اور بھدی سی ناک تھی۔ رنگ بھی اس کا سانولا تھا۔ کچھ لڑکوں نے اسے کلوا کا لقب دے رکھا تھا۔ کلاس میں کوئی بھی لڑکا اس کو اپنے پاس بیٹھنے نہیں دیتا تھا، وہ پچھلی بنچ پر تنہا بیٹھا کرتا تھا۔

حامد بہت ذہین تھا۔ قدرت نے صورت کی کمی اس کو ذہانت بخش کر پوری کر دی تھی۔ اپنے کلاس میں وہ سب سے تیز تھا۔ امتحان میں اسے سبھی لڑکوں سے زیادہ نمبر ملتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسکول کے سبھی ٹیچر اس کو بہت چاہتے تھے۔ اور دوسرے لڑکوں سے اس کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔ کلاس کا مانیٹر عبید، جو شہر کے مشہور وکیل کا لڑکا تھا، وہ حامد سے بہت جلتا تھا۔ حامد کی تعریفیں سننا اس کو ذرا بھی پسند نہ تھا۔ وہ اسے طرح طرح سے تکلیفیں پہنچاتا اور ہر وقت اس کو ٹیچروں کی نظر سے گرانے کی ترکیبیں سوچتا رہتا یہاں تک کہ کبھی چوری اور کبھی جھگڑے لڑائی کا الزام لگا کر اس کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتا۔

سالانہ امتحان ہو رہے تھے۔ امتحان کا دوسرا دن تھا۔ امتحان ختم ہونے کے بعد کچھ لڑکے امتحان گاہ سے باہر کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ انھیں میں عبید بھی تھا۔ وہ بہت پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے

دوستوں کو بتایا کہ آج اس کا پرچہ خراب ہوگیا ہے شاید پاس ہونے کے لائق نمبر بھی نہ ملیں۔ اس کی بات سن کر اس کے سبھی دوست افسوس ظاہر کر رہے تھے۔ اتنے میں حامد بھی گیٹ سے باہر نکلتا ہوا دکھائی پڑا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح آج بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جب وہ قریب سے گزرنے لگا تو عبید اس سے کڑک کر بولا:

"ابے او کلوا ..... ادھر آ ..... پرچہ کیسا ہوا ہے تیرا؟" حامد رکا اور عبید کے قریب آتے ہوئے بولا "عبید بھائی میرا پرچہ تو بہت اچھا ہوا ہے ..... سوال تو سبھی آسان تھے ..... کیوں تمھارا پرچہ تو ٹھیک ہوا ہے نا؟"

عبید کے دل میں چنگاری تو پہلے ہی سے سلگ رہی تھی، حامد کی بات سن کر اس کے اندر حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ بھوکے شیر کی طرح اس پر پل پڑا اور لات گھونسوں کی بارش کرنے لگا۔ دور کھڑے پولیس والوں کی نظر جب ان پر پڑی تو وہ فوراً ان کی طرف لپکے لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی عبید ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ پولیس کے خوف سے بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔ سڑک پار کرتے وقت اچانک ایک تیز رفتار کار نے اسے آ ہی لیا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن بچ نہ سکا۔ کار کے پہیے اس کے سر سے گزر گئے۔ سر سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ فوراً بھیڑ جمع ہو گئی۔ کچھ لوگ جلدی سے اسے رکشے میں ڈال کر اسپتال پہنچے۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور کہا "جسم سے خون کافی نکل چکا ہے فوری طور پر اسے خون کی سخت ضرورت ہے، افسوس کہ ہمارے یہاں بلڈ بینک میں اس وقت خون نہیں ہے۔ مریض کے گھر والے اور دوست وغیرہ اپنا خون چیک کرائیں جن کا خون مریض کے خون سے مل جائے گا ان کا خون نکال کر اسے پہنچایا جائے گا، اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ مریض کی حالت تشویش ناک ہوتی جا رہی ہے۔"

اب تک وکیل صاحب عبید کی امی کو لے کر اسپتال پہنچ چکے تھے۔ حامد کو بھی اس حادثے کی خبر ملی، وہ بھی فوراً اسپتال پہنچا۔ جب ڈاکٹر نے خون دینے کی بات پھر کہی تو جھٹ حامد نے اپنا بازو قریب کھڑی ہوئی نرس کی طرف کر دیا۔ نرس نے ایک سرنج میں اس کے بازو سے تھوڑا سا خون لے لیا۔ اور اس کا نام فائل میں درج کیا۔ پھر یکے بعد دیگرے عبید کے گھر والوں اور دوستوں نے اپنے خون نکلوائے۔ نرس نے سبھی کا نام لکھا اور فائل سمیٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

عبید کے سبھی دوستوں کی نظر حامد پر تھی۔ کچھ تو حقارت اور غصے سے اسے گھور رہے تھے، کچھ حیرت اور تعجب سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے، حامد ایک طرف سہما سہما کھڑا عبید کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے پریشانی اور بے چینی کے آثار جھلک رہے تھے۔ کمرے میں عبید کے دوست احباب اور دیگر لوگوں کا ہجوم ہونے کے باوجود ایک دم سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی عبید کی ماں کی ہلکی ہلکی سسکی ابھرتی۔ کمرے کے خاموش ماحول میں شاید وہ بھی خلل اندازی نہیں کرنا چاہتی تھی کیوں کہ اپنے سینے میں مچلتے ہوئے طوفان کو سسکیوں میں تبدیل کرنے کی برابر کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد کمرے میں نرس داخل ہوئی خاموشی کو چیرتی ہوئی اس کی آواز گونجی۔

"حامد کون ہیں؟ ان کا خون مریض کے خون سے مل گیا ہے ..... وہ میرے ساتھ آئیں ان کا خون لیا جائے گا۔"

حامد نے جب اپنا نام سنا تو اسے عجیب سا لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا خون عبید کے خون سے مل گیا ہے۔ وہ حیرت سے کبھی عبید کے دوستوں کی طرف اور کبھی وکیل کی طرف دیکھتا، وکیل صاحب اپنی پرنم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے رندھے ہوئے گلے سے حامد سے بولے "جاؤ بیٹے حامد ..... اپنا خون دے دو ..... عبید کے لیے تمھاری یہ بہت بڑی قربانی ہوگی ..... ہم تمھارا احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔" حامد کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ آپس میں چپکے ہوئے اس کے بھدے ہونٹ کھلے۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نرس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور

اُسے لے کر کمرے سے باہر ہو گئی۔

رات کے تقریباً دو بج رہے تھے۔ کمرے میں وکیل صاحب، اُن کے گھر والے، عبید کے چند دوست اور حامد رہ گئے تھے۔ اُن کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ عبید کے جسم میں اب حرکت آ گئی تھی۔ وہ کبھی ہاتھ جھٹکتا، کبھی پاؤں کو اِدھر اُدھر کرتا۔ اس کے منہ سے بے خیالی میں کچھ جملے نکل رہے تھے جو سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی، پھر ایک انگڑائی کے ساتھ اس نے آنکھیں کھول دیں جس کے سبھی منتظر تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھنے لگا۔ جب اس کی نظر قریب کھڑے ہوئے حامد پر پڑی تو چند لمحے تک وہ اس کو گھورتا رہا، اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ کافی کمزور ہونے کے باوجود اس نے چیخ کر کہا۔ "یہ کمبخت یہاں کیوں کھڑا ہے..... میں کہاں ہوں؟" وکیل صاحب نے بیٹے کا سر گود میں لیتے ہوئے کہا۔ "عبید بیٹے! تم اسپتال میں ہو، کل شام ایک کار کے حادثے میں تم زخمی ہو گئے تھے۔ تمھارے جسم سے خون بہت سا نکل چکا تھا۔ تمھیں خون کی سخت ضرورت تھی بھائیوں نے اپنا خون چیک کروایا لیکن کسی کا خون تمھارے جسم کے قابل ثابت نہ ہو سکا۔ حامد کا خون تمھارے خون سے مل گیا، اسی کا خون تمھاری رگوں میں پہنچا کر تمھاری جان بچائی گئی ہے، بیٹے! تم جس سے نفرت کرتے ہو، اس نے تمھارے لیے کتنی بڑی قربانی دی ہے ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اپنے محسن کا شکریہ ادا کرو بیٹے، یہ وہی حامد تو ہے جو اسکول میں تمھارے دوستوں کے مذاق کا نشانہ بنتا تھا، جنھوں نے چن چن کر اس کے نام رکھ چھوڑے تھے۔ اسے سب بدصورت کہتے ہیں نا، لیکن مجھے تو اس کے چہرے پر بڑا نور دکھائی دے رہا ہے۔ دیکھو اس کے چہرے پر کتنی دل کشی ہے۔" عبید کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اس نے قریب کھڑے حامد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں رکھ لیا اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور آنسوؤں کے موٹے قطرے اس کے گالوں پہ بہنے لگے۔

زبیدہ لے ذکی

اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں

پیامی ادبی معما نمبر ۲ کا صحیح جواب
ذیل کی کتابوں میں ہی ملے گا

مچھیرا اور اس کی بیوی	عبدالواحد سندھی	۲/۵۰
آؤ ڈراما کریں	پروفیسر محمد مجیب	۲/۰
جوہر قابل	مسعود احمد برکاتی	۳/۰
پہیلیاں	ڈاکٹر سیفی پریمی	۰/۸۰
گاندھی بابا کی کہانی	قدسیہ زیدی	۴/۰
بچوں کی کہانیاں	عبدالواحد سندھی	۱/۵۰
بندر اور نائی	"	۲/۵۰
مینڈک اور کوا	"	۱/۵۰
اک دنا دن تا کے سے	"	۱/۵۰
جادو کا گھر	"	۱/۵۰
لومڑی کا گھر	"	۱/۵۰
پانچ بونے	"	۱/۵۰
میاں ڈھینچو کے بچے	ترجمہ: قرۃ العین حیدر	۱/۵۰
جن حسن عبدالرحمٰن (اوّل)	"	۲/۵۰
جن حسن عبدالرحمٰن (دوم)	"	۲/۵۰
تین اناڑی	عصمت چغتائی	۳/۰
ہار کی تلاش	ریاض احمد خاں	۶/۰
دُم کٹا سانپ	محمد قاسم صدیقی	۱/۰
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۴/۵۰

کتابیں حاصل کرنے کے پتے:

۱. مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵
۲. مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ دہلی ۶
۳. مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
۴. مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

پیامی ادبی معما نمبر ۱ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل: ۱- نومبر ۲- بجلی ۳- راج ۴- نی ۵- سونا ۶- ہار ۷- تعبیر

مقابلے میں حصہ لینے والے تمام پیامیوں کو شکستِ فاش

صحیح حل کوئی موصول نہیں ہوا

ایک غلطی پر پہلا انعام حاصل کرنے والے چار خوش نصیب

فی کس ۱۵/- روپے دیے گئے۔

۱۔ ستیہ پال کلک۔ ڈاک خانہ کلک ضلع کٹھوعہ۔ جے اینڈ کے۔
۲۔ ایس۔ ایم۔ اقبال ۲۰۱ کوارٹر بلڈنگ، فسٹ فلور روم نمبر ۵ پائپ روڈ کرلا بمبئی ۷۰
۳۔ قاضی سعید الدین۔ مقام و پوسٹ پارسی تاکلی۔ آکولہ۔ مہاراشٹر۔
۴۔ سعید احمد رضوان۔ گورنمنٹ اردو ہائر پرائمری اسکول۔ آنیکل۔ بنگلور۔

دو غلطیوں پر دوسرا انعام حاصل کرنے والے بیس خوش نصیب

رقم میں اضافہ کرکے فی کس ۲/۲۵ روپے دیے گئے۔

۱۔ فرزانہ ناہید سلطان پورہ بہار۔ ۲۔ محمد عمران، بیگم سرائے الہ آباد۔ ۳۔ محمد سمیع، جوگیشوری بمبئی ۶۰۔ ۴۔ ریحان احمد، درگا پورہ کٹیہار۔ ۵۔ تنویر احمد مالیرکوٹلہ۔ ۶۔ امتیاز احمد انصاری، بھٹی جرولی سلطانپور۔ ۷۔ اعجاز حسین، سہسرام بہار۔ ۸۔ خالد اقبال حشمی کامٹی نارہ۔ ۹۔ سعادت علی خاں علی گڑھ۔ ۱۰۔ ابن فرات، بہادر گنج بہار۔ ۱۱۔ اشفاق احمد ناگپور۔ ۱۲۔ نازنین فاطمہ اورنگ آباد۔ ۱۳۔ شیخ احمد دونڈائچہ دھولیہ۔ ۱۴۔ محمد اسد منظور احمد بھیونڈی تھانہ۔ ۱۵۔ محمد اشرف علی کلٹی بردوان۔ ۱۶۔ ایس۔ ایس۔ این۔ آر نادر۔ ایوت محل مہاراشٹر۔ ۱۷۔ ثمینہ شاہین، اورنگ آباد مہاراشٹر۔ ۱۸۔ فیاض الدین، بابو نگر احمد آباد۔ ۱۹۔ برجیس قدر بہرام نگر باندرہ بمبئی۔ ۲۰۔ روشن آرا مدھوبنی پورنیہ۔

نوٹ:- یاد رکھیے ایسے حل مقابلے میں شریک نہیں کیے جاسکیں گے جن کے ساتھ "کوپن" نہیں ہوگا۔

۲۔ کوپن پر پتا لکھنے کے علاوہ لفافے کی پشت پر اور اپنے حل کے نیچے پورا پتا صاف صاف لکھیے اور اگر ممکن ہو تو پتا انگریزی میں بھی لکھیے۔

پیامی اَدبی مُعمّا نمبر۲

دفتر پیام تعلیم میں
حل وصول ہونے
کی آخری تاریخ
۱۰ر جنوری ۱۹۸۴ء

فیس داخلہ کچھ نہیں۔
آپ جتنے حل چاہیں بھیج
سکتے ہیں۔ لیکن ہر حل
کے ساتھ ایک ٹوکن آنا
ضروری ہے۔

ایک سَو روپے کے نقد انعامات

پہلا انعام: بالکل صحیح حل پر مبلغ ساٹھ روپے۔ دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر مبلغ چالیس روپے

تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں، جو لفظ آپ صحیح سمجھتے ہوں صرف اُسے ہی نمبروار لکھیے

۱۔ ظاہر ہے وہ ـــــ نہ کر سکا۔ (اقرار / انکار)

۲۔ آدمی جب کچھ کرنا چاہے تو اسے پہلے سے ـــــ لینا چاہیے۔ (سوچ / سمجھ)

۳۔ ـــــ دانت اور اس کے نازک کُھروں سے بھلا کسی کو کیا ڈر لگتا۔ (خوفناک / چمک دار)

۴۔ گواہ سے اس کے ـــــ پوچھے اور بیٹھ گئے۔ (سوال / مزاج)

۵۔ وہ میرے بھائی سے ـــــ بھی ہیں۔ (چھوٹے / موٹے)

۶۔ اور ـــــ اتنا بڑھ جاتا کہ دونوں کی بول چال تک بند رہتی۔ (کھنچاؤ / تناؤ)

۷۔ وہ اس ـــــ نہیں کہ اُسے اچھی اچھی چیزیں دی جائیں۔ (لائق / قابل)

ادھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں صحیح جواب صفحہ ۳۵ کی کتابوں میں ہی ملے گا

شرائط پیامی ادبی معمّا: (۱) فیس داخلہ کچھ نہیں۔ البتہ ہر حل کے ساتھ چھپا ہوا پیامی ادبی معمّا کا ٹوکن آنا لازمی ہے۔ (۲) حل روشنائی سے صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیے۔ مشکوک یا کٹے پھٹے حل قابلِ قبول نہ ہوں گے۔ (۳) اگر کسی انعام کے مستحق ایک سے زیادہ پیامی ہوں گے تو انعام برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ (۴) ایک پیامی کو ایک ہی انعام یا اس کا ایک ہی حصّہ دیا جائے گا۔ بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی۔ (۵) معمے کے متعلق تمام معاملات میں اڈیٹر پیام تعلیم کا فیصلہ آخری اور قابلِ قبول ہوگا۔

اپنے حل اِس پتے پر بھیجیے

پیامی ادبی مُعمّا نمبر ۲، ماہنامہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹوکن پیامی اَدبی مُعمّا نمبر ۲

میں اڈیٹر پیام تعلیم کے فیصلے سے
متفق ہوں۔

نام ....

پتا ....


بیس نکات کا یہ مقصود
کنبہ ہو سب کا محدود
davp 83/312

مکتبہ جامعہ بک کلب

کا

ممبر بن کر اُردو کی اَدبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے

ہمیں یقین ہے کہ اُردو ادب سے دل چسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

قواعد وضوابط :

۱۔ بک کلب کی فیس رکنیت پانچ روپے (Rs.5/=) ہوگی۔

۲۔ بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ چندہ آٹھ روپے (Rs.8/=) ہے صرف چار روپے (Rs.4/=) سالانہ چندہ لیا جائے گا۔

۳۔ ہر ممبر کو مطبوعاتِ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) 25 % اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اُردو کی کتابوں کی خریداری پر 6¼ % کمیشن دیا جائے گا۔ (ہر فرمایش پر کلب کی ممبری کا حوالہ دینا ضروری ہوگا۔)

۴۔ بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جا سکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کی ممبر نہیں بن سکتی۔

۵۔ ممبری کے دوران، ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔

۶۔ کتابیں بذریعہ وی۔پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجاتِ روانگی کتب ممبر کے ذمّے ہوں گے۔

۷۔ گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر پچھلا حساب صاف کرے اور آیندہ کے لیے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔

۸۔ بک کلب کی رکنیت کی مدّت پوری ہو جانے کے باوجود اگر کسی ممبر نے اپنی طرف سے کتابوں کا آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتاب بھیج کر حساب صاف کر دیں گے۔

ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یا اس کی کسی بھی شاخ سے حاصل کر سکتے ہیں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی 110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار، دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

Licence No: U(SE)-021 to Post without pre-payment of postage

Regd. No. D(SE)-043 December 19[illegible]

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲